

وَلَا تَقْرَأُ الْفُرْقَانَ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ وَسَلِّمْ وَلَا تَخْشِ فِئَةً النَّاسِ  
(قرآن کریم)

وَإِذَا قَرَأْتَ فَأَنْصِتُوا (الحديث)

# حَسُنَ الْكَلَامُ

فی

ترك القراءة خلف الإمام

جلد اول

جس میں قرآن کریم، صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ و تابعینؓ اور دیگر  
جمہور فقہاء اور محدثین عظامؒ سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ امام کے پیچھے کسی نماز میں کسی بھی قسم  
کی قرأت عموماً اور سورۃ فاتحہ کی قرأت خصوصاً ممنوع ہے اور جہری نمازوں میں تو امام کے پیچھے  
قرأت کرنا قرآن کریم، حدیث صحیح اور اجماع کے خلاف ہے اور فی نفسہ منکر اور مذموم ہے اور  
جہری نمازوں میں حضرات ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ نیز عقلی اور قیاسی دلائل سے اس مسئلہ  
پر فیصلہ کن بحث کی گئی ہے اور فریق ثانی کو مسکت جوابات دیے گئے ہیں اور اس طبع میں خیر الکلام  
اور الاعتصام میں کیے گئے اعتراضات کے جوابات کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا گیا ہے۔

تالیف

ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صفدر

جملہ حقوق بحق مکتبہ صفدریہ گوہر انوالہ محفوظ ہیں۔  
 طبع دہم جون ۲۰۰۶ء

نام کتاب ————— احسن الکلام فی ترک القرۃ خلف الامام

مؤلف ————— شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد رفیع خان صفدر دام مجدہم

تعداد ————— ایک ہزار

مطبع ————— فائن بکس پرنٹرز لاہور

ناشر ————— مکتبہ صفدریہ نزد مدرسہ فقیر العلوم گھنٹہ گھر گوہر انوالہ

قیمت ————— دو سو پچیس روپے

### ملنے کے تہ

- |  |   |
|--|---|
| ○ مکتبہ صفدریہ نزد گھنٹہ گھر گوہر انوالہ                     | ○ مکتبہ امدادیہ ملتان                   |
| ○ مکتبہ حلیمیہ جامعہ بنوریہ سائٹ کراچی                       | ○ مکتبہ حقانیہ ملتان                    |
| ○ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور                             | ○ مکتبہ مجیدیہ ملتان                    |
| ○ مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور                       | ○ مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور         |
| ○ مکتبہ خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی                      | ○ اسلامی کتب خانہ اڈا گامی ایبٹ آباد    |
| ○ مکتبہ العارفی جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد              | ○ مکتبہ فریدیہ ای سیون اسلام آباد       |
| ○ مکتبہ رشیدیہ حسن مارکیٹ نیوز روڈ مینگورہ                   | ○ دارالکتب عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور |
| ○ مکتبہ نعمانیہ کبیر مارکیٹ مکی مروت                         | ○ مدینہ کتب گھر اردو بازار گوہر انوالہ  |
| ○ مکتبہ قاسمیہ جمشید روڈ نزد جامع مسجد بنوری ٹاؤن کراچی      |   |
| ○ مکتبہ فاروقیہ حنفیہ عقب فائر بریکیٹ اردو بازار گوہر انوالہ |   |

کتب گھر شاہ جی مارکیٹ ٹکڑہ





# فہرست مضامین

۴۶	دیب چہ طبع دوم
۵۲	دیب چہ طبع اول
۵۲	سخن ہائے گفتنی
۵۲	سبب تالیف
۵۸	اختلافی مسائل میں ہمارا نظریہ
۶۱	توثیق و تضعیف کا معیار ہے
۶۱	اسانید کے ترجمہ کا معیار ہے
۶۲	حضرات فقہاء و محدثین اور ائمہ دین کا احترام
۶۳	ضروری التماس
۶۵	مقدمہ
	جو حضرات صحابہ کرام تمام نمازوں میں امام کے
۶۶	پیچھے قراۃ کے قائل نہ تھے۔
۶۶	جو جہری نمازوں میں قائل نہ تھے۔
	جو حضرات تابعین تمام نمازوں میں قراۃ
۶۶	خلف الامام کے قائل نہ تھے۔
۶۶	جو جہری نمازوں میں قائل نہ تھے۔
۶۶	مسئلہ خلف الامام اور حضرات اتباع تابعین
۶۷	حضرات ائمہ اربعہ اور مسئلہ خلف الامام
۶۷	حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مسلک
۶۸	امام موصوفؒ فقہاء اور محدثین کی نگاہ میں
۷۰	امام محمدؒ کا مسلک بھی یہی تھا

## تصدیقات علمائے کرام

۱۰	حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب
۱۸	حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب
۲۰	حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی
۲۰	حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی
۲۱	حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ صاحب
۲۳	حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کراچی
۲۴	حضرت مولانا خیر محمد صاحب
۲۵	حضرت مولانا احمد علی صاحب
۲۶	حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب
۲۷	حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب درخواستی
۲۷	حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب بہبودی
۲۸	حضرت مولانا سلطان محمود صاحب
۲۹	حضرت مولانا عبدالحق صاحب اکوڑہ خٹک
۳۰	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سرگودھوی
۳۱	حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد نصیر الدین صاحب غوثی
۳۲	حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی
۳۳	حضرت مولانا محمد عبدالرشید صاحب نعمانی
۳۴	حضرت مفتی رشید احمد صاحب
۳۵	دیب چہ طبع سوم

- ان کی شخصیت ۷۰
- امام ابو یوسفؒ کا مذہب بھی یہی تھا ۷۱
- ان کی ذات ائمہ کی نظر میں ۷۱
- حضرت امام مالکؒ کا مسلک ۷۲
- ان کی جلالت شان؟ ۷۲
- حضرت امام شافعیؒ کا مسلک ۷۳
- ان کی دینی خدمات اور امامت ۷۳
- ان کا مسلک سمجھنے میں غلط فہمی ہوتی ہے۔ ۷۳
- امام داؤد بن علی الظاہریؒ کا مسلک ۷۵
- امام شافعیؒ کی اپنی عبارتیں ۷۶
- اس غلط فہمی کا اصلی سبب کیا ہے؟ ۷۷
- مؤلف خیر الکلام کی تاویلات { ۷۸ تا ۸۵
- اور ان کے مسکت جوابات { ۸۵ تا ۸۸
- حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک، ان کا پایہ؟ ۸۶
- امام ابراہیم بن خنیسؒ کا مسلک، ان کا درجہ؟ ۸۷
- امام زہریؒ کا مسلک اور درجہ ۸۸
- امام ثوریؒ کا مسلک اور رتبہ ۸۹
- امام لیث بن سعدؒ کا مسلک اور شان ۸۹
- امام ابن مبارکؒ کا مسلک اور فضیلت ۸۹
- امام اوذاعیؒ کا مسلک اور جلالت ۹۰
- امام اسحاق بن ابیہرہؒ کا مسلک اور رتبہ ۹۱
- سفیان بن عیینہؒ کا مسلک اور شان ۹۱
- امام شمس الدین ابن قدامہ الحنبلیؒ ۹۲
- شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مسلک اور درجہ ۹۳
- شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا مسلک اور رتبہ ۹۴
- حافظ ابن القیمؒ کا مسلک اور شان ۹۶
- حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا مسلک ۹۷
- امام احمدؒ کے زمانے تک ائمہ اسلام میں اس کا کوئی بھی قائل نہ تھا کہ تارک قرآن خلف الامام کی نماز فاسد اور باطل ہے۔ ۱۰۰
- مؤلف خیر الکلام کی توجہات کا جواب ۱۰۱
- حضرت امام ترمذیؒ کی ایک قابل حل عبارت ۱۰۶
- امام عینیؒ کا دہم اور اس کا ازالہ ۱۰۸
- باب اول ۱۱۰
- قرآن کریم کے آداب میں سے ایک ادب { ۱۱۱
- یہ ہے کہ قرأت کے وقت خاموشی اختیار کی جائے { ۱۱۱
- قرآن کریم کا سننا بعض اوقات خود پڑھنے سے { ۱۱۶
- زیادہ افضل ہے۔ { ۱۱۶
- آیت وَ اِذْ اَقْرَأَ الْقُرْآنَ... الایۃ خلف الامام { ۱۱۹
- کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ { ۱۱۹
- قرآن کا نمبر اول پر مصداق صرف سورۃ فاتحہ ہے ۱۲۰
- حضرات صحابہ کرامؓ کی تفسیر کا حکم کیا ہے؟ ۱۲۱
- آیت کی تفسیر حضرت ابن مسعودؓ سے ۱۲۲
- فہم تفسیر میں ابن مسعودؓ کا رتبہ حضرات خلفائے راشدینؓ سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ ۱۲۲
- ابن مسعودؓ کی پہلی روایت ۱۲۴



- ۱۵۷ علامہ زنجشیریؒ کی تفسیر اور ان کا درجہ؟
- ۱۵۸ حافظ ابن کثیرؒ کی تفسیر اور ان کا درجہ؟
- ۱۵۹ علامہ ابو السعودؒ کی تفسیر اور ان کا درجہ؟
- ۱۶۰ امام ابو نعیمؒ کی تفسیر اور ان کا درجہ؟
- ۱۶۱ علامہ محمود اوسؒ کی تفسیر اور ان کا درجہ؟
- ۱۶۲ امام بیہقیؒ کی تفسیر
- ۱۶۳ قاضی شوکانیؒ کی تفسیر
- ۱۶۴ حافظ ابو عمر بن عبد البرؒ کی تفسیر
- ۱۶۵ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی تفسیر
- ۱۶۶ اس تفسیر پر فریق ثانی کے اعتراضات
- ۱۶۷ پہلا اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۶۸ دوسرا اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۶۹ تیسرا اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۷۰ چوتھا اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۷۱ پانچواں اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۷۲ چھٹا اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۷۳ ساتواں اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۷۴ آٹھواں اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۷۵ نواں اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۷۶ دسواں اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۷۷ استماع کا معنی
- ۱۷۸ انصات کا معنی
- ۱۷۹ سکوت کا معنی
- ۱۸۰ آہستہ پڑھنا بھی انصات و استماع کے
- ۱۲۶ ابن مسعودؓ کی دوسری روایت
- ۱۲۸ حضرت ابن عباسؓ کا رتبہ
- ۱۲۸ ان کی پہلی روایت
- ۱۳۲ حضرت ابن عباسؓ کی دوسری روایت
- ۱۳۴ حضرات تابعینؓ کی تفسیر کا مقام
- ۱۳۴ حضرت مجاہدؒ کا رتبہ اور ان کی تفسیر
- ۱۳۴ ان کی پہلی روایت
- ۱۳۵ ان کی دوسری روایت
- ۱۳۶ ان کی تیسری روایت
- ۱۳۸ حضرت سعید بن المسیبؒ کی روایت
- ۱۳۹ حضرت حسن بصریؒ کی روایت
- ۱۴۰ حضرت ابو العالیہ ریاحیؒ کی روایت
- ۱۴۱ حضرت امام زہریؒ کی روایت
- ۱۴۲ حضرت عبید بن عفرہؒ اور عطاء بن ابی ریحانؒ کی روایت
- ۱۴۳ محمد بن کعبؒ کی روایت
- ۱۴۵ حدیث مرسل
- ۱۴۹ بعض تابعینؓ اور تبع تابعینؓ کے مراسیل
- ۱۵۲ دیگر تابعینؓ و اتباع تابعینؓ سے اس کی تفسیر
- ۱۵۳ مشہور مفسرین کرامؒ اور محدثین عظامؒ کی تفسیر
- ۱۵۴ ابن المسیبؒ کا مرسل عند الشافعیؒ بھی صحیح ہے (الترغی)
- ۱۵۴ قرینہ سے ظاہر مرسل بھی صحیح ہے (حجۃ اللہ الباقیہ)
- ۱۵۵ امام ابن جریرؒ کی تفسیر اور ان کا درجہ؟
- ۱۵۶ امام بغویؒ کی تفسیر اور ان کا درجہ؟

- چوتھا اعتراض کہ محدثین کا ایک گروہ اس {  
 زیادت میں کلام کرتا ہے اور اس کا جواب ۲۵۷
- اس زیادت کو کن کن محدثین نے صحیح {  
 کہا ہے؟ ۲۵۷
- پانچواں اعتراض کہ یہ روایت مسند نہیں ہے {  
 اور اس کا جواب ۲۶۰
- چھٹا اعتراض کہ اس میں قرأت سے ماخذ {  
 علی الفا تم مراد ہے اور اس کا جواب ۲۶۳
- دوسری حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے ۲۶۷
- اس پر پہلا اعتراض ابو خالد کا تفرقہ اور {  
 اس کا جواب ۲۶۹
- دوسرا اعتراض محمد بن عجلان میں کلام اور {  
 تدلیس کا جواب ۲۷۰
- تیسری حدیث حضرت انسؓ سے ۲۷۳
- چوتھی حدیث ۲۷۷
- اس پر پہلا اعتراض ابن اکیثم کی جہالت {  
 اور اس کا جواب ۲۸۰
- اس پر دوسرا اعتراض کہ یہ زہری کا درج {  
 ہے اور اس کا جواب ۲۸۱
- اس پر تیسرا اعتراض اور اس کا جواب ۲۸۷
- پانچویں حدیث ۲۸۸
- چھٹی حدیث ۲۹۱
- ساتویں حدیث ۲۹۳

- سراسر منافی ہے ۱۹۹
- گیارہواں اعتراض اور اس کا جواب ۲۰۰
- بارہواں اعتراض اور اس کا جواب ۲۰۱
- تیرہواں اعتراض اور اس کا جواب ۲۰۳
- چودھواں اعتراض اور اس کا جواب ۲۰۸
- سکات امام کی فیصلہ کن بحث ۲۰۹ تا ۲۱۸
- پندرہواں اعتراض اور اس کا جواب ۲۱۸ تا ۲۲۵
- سولہواں اعتراض اور اس کا جواب ۲۲۵
- سترہواں اعتراض اور اس کا جواب ۲۲۶
- اٹھارہواں اعتراض اور اس کا جواب ۲۲۸
- انیسواں اعتراض اور اس کا جواب ۲۲۸
- بیسواں اعتراض اور اس کا جواب ۲۳۰
- باب دوم ۲۳۳
- حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث ۲۳۳
- اس کی مختلف سندیں ۲۳۴ تا ۲۳۸
- اس حدیث پر پہلا اعتراض، سلیمان تیمی کی {  
 تدلیس اور اس کا جواب ۲۳۹
- اس حدیث پر دوسرا اعتراض (کہ وہ متفق ہیں) {  
 اور اس کا جواب ۲۴۱
- اس حدیث پر تیسرا اعتراض قائد کی تدلیس {  
 اور اس کا جواب ۲۴۹
- صحیحین میں تدلیس مضر نہیں ۲۴۹
- بعض روایات کی تدلیس مضر نہیں ہے ۲۵۱



۳۲۷	مراسیل صحابہ بالاتفاق حجت ہیں	۲۹۵	آٹھویں حدیث
۳۲۸	کبار تابعین کے مراسیل حجت ہیں	۲۹۸	امام بیہقی کا اعتراض، خالد الطحان کی غلطی کا جواب
۳۲۹	اس حدیث پر دوسرا اعتراض اور اس کا جواب	۲۹۹	نویں حدیث
۳۳۰	اس حدیث پر تیسرا اعتراض اور اس کا جواب	۳۰۳	دسویں حدیث
۳۳۱	اس حدیث پر چوتھا اعتراض اور اس کا جواب	۳۰۸	پہلا اعتراض کہ ابو سحاق السبئی مدلس و مختلط تھے اور اس کا جواب
۳۳۲	اس حدیث پر پانچواں اعتراض اور اس کا جواب	۳۱۰	دوسرا اعتراض کہ اسرائیل نے ان سے اختلاط کے بعد عمت کی ہے اس کا جواب
۳۳۳	اس حدیث پر چھٹا اعتراض اور اس کا جواب	۳۱۲	اس حدیث کا شاہد
۳۳۴	اس حدیث پر ساتواں اعتراض اور اس کا جواب	۳۱۳	اس روایت پر تیسرا اعتراض کہ یہ مضطر اور اس کا جواب
۳۳۵	اس حدیث پر آٹھواں اعتراض اور اس کا جواب	۳۱۵	اس روایت پر چوتھا اعتراض اور اس کا جواب
۳۳۷	اس حدیث پر نوواں اعتراض اور اس کا جواب	۳۱۷	اس روایت پر پانچواں اعتراض اور اس کا جواب
۳۳۸	اس حدیث پر دسواں اعتراض اور اس کا جواب	۳۱۸	گیارہویں حدیث
۳۳۹	اس حدیث پر اسی اعتراض اور اس کا جواب	۳۲۰	اس حدیث پر پہلے اعتراض کی پہلی شق کا جواب
۳۴۰	اس حدیث پر دسواں اعتراض اور اس کا جواب	۳۲۳	اس حدیث پر پہلے اعتراض کی دوسری شق کا جواب
۳۴۱	اس حدیث پر اسی اعتراض اور اس کا جواب	۳۲۴	اس حدیث پر پہلے اعتراض کی تیسری شق کا جواب
۳۴۲	اس حدیث پر اسی اعتراض اور اس کا جواب	۳۲۵	بصورت مرسل بھی یہ روایت حجت ہے
۳۴۳	اس حدیث پر اسی اعتراض اور اس کا جواب	۳۲۶	حضرت عبداللہ بن شداد صغار صحابہ میں سے تھے

- ۳۷۵ اس پر اعتراض اور اس کا جواب  
 ۳۷۶ حضرت ابن مسعودؓ کے آثار  
 ۳۷۸ ان پر اعتراض اور اس کا جواب  
 ۳۸۰ حضرت ابن عباسؓ کا اثر  
 ۳۸۲ { حضرت ابن عباسؓ کا ایکس اور اثر اور  
 اس کی وضاحت  
 ۳۸۴ حضرات خلفائے راشدینؓ کا اثر  
 ۳۸۶ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ کا اثر  
 ۳۸۸ اس پر اعتراض اور اس کا جواب  
 ۳۹۰ حضرت سعید بن ابی وقاصؓ کا اثر  
 ۳۹۱ اس پر اعتراض اور اس کا جواب  
 ۳۹۲ لطیفہ  
 ۳۹۵ آثار تابعینؓ  
 ۳۹۵ حضرت علقمہ بن قیسؓ کا اثر  
 ۳۹۶ اس پر اعتراض اور اس کا جواب  
 ۳۹۷ حضرت عمرو بن موملؓ وغیرہ کا اثر  
 ۳۹۸ حضرت اسود بن یزیدؓ کا اثر  
 ۴۰۰ حضرت سید بن غفلہؓ کا اثر  
 ۴۰۰ اس پر اعتراض اور اس کا جواب  
 ۴۰۱ حضرت نافع بن جبیرؓ کا اثر  
 ۴۰۲ حضرت سعید بن المسیبؓ کا اثر  
 ۴۰۲ اس پر اعتراض اور اس کا جواب  
 ۴۰۳ حضرت سعید بن جبیرؓ کا اثر

- ۳۴۸ مترصدین حدیث  
 ۳۵۰ اس پر پہلا اعتراض اور اس کا جواب  
 ۳۵۱ اس پر دوسرا اعتراض اور اس کا جواب  
 ۳۵۲ مؤلف خیر الکلام کا صریح بہتان  
 ۳۵۳ اٹھارہویں حدیث  
 ۳۵۳ کتاب الآثار سے اس کی تائید  
 ۳۵۳ اس کی سند صحیح ہے  
 ۳۵۴ انیسویں حدیث  
 ۳۵۶ بیسویں حدیث  
 ۳۵۷ اس پر اعتراض اور اس کا جواب  
 ۳۶۰ اکیسویں حدیث  
 ۳۶۱ بطور شاہد پہلی حدیث  
 ۳۶۲ دوسری حدیث  
 ۳۶۳ تیسری حدیث  
 ۳۶۵ چوتھی حدیث  
 ۳۶۸ تیسرا باب  
 ۳۶۸ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ کے آثار اور  
 علم و فقہ میں حضرات صحابہ کرامؓ کی نمایاں اور  
 مشہور ہستیاں  
 ۳۷۰ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اثر  
 ۳۷۱ اس پر اعتراض اور اس کا جواب  
 ۳۷۲ حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ کا اثر  
 ۳۷۳ حضرت زید بن ثابتؓ کا اثر



۴۰۹	جہود کی روایتوں کا معیار کیا ہے؟	۴۰۳	اس پر اعتراض اور اس کا جواب
۴۱۰	حضرات محدثین کرامؒ اور فقہائے عقیقہ	۴۰۴	حضرت عروہ بن زبیر کا اثر
۴۱۲	چوتھا باب	۴۰۴	حضرت ابراہیم نخعی کا اثر
	(عقلی، ترجیحی اور قیاسی دلائل)	۴۰۵	حضرت قاسم بن محمد کا اثر
۴۱۲ و ۴۱۳	پہلی دلیل دوسری اور تیسری دلیل	۴۰۶	حضرت امام اوزاعی کا اثر
۴۱۵ و ۴۱۴	چوتھی اور پانچویں دلیل	۴۰۶	حضرت سفیان ثوری کا اثر
۴۱۶ و ۴۱۵	چھٹی اور ساتویں دلیل	۴۰۷	حضرت لیث بن سعد کا اثر
۴۱۸ و ۴۱۷	آٹھویں دلیل — نویں دلیل	۴۰۷	حضرت عبداللہ بن مبارک کا اثر
۴۱۹	دسویں اور گیارھویں دلیل	۴۰۷	حضرت عبداللہ بن وہب کا اثر
۴۲۰	بارھویں دلیل	۴۰۸	حضرت سفیان عیینہ کا اثر
۴۲۳	فرقہ ثانی سے اخلاص کے ساتھ استدعار	۴۰۸	حضرت اسحاق بن راہویہ کا اثر

آخری التماس ۴۲۴

تَمَّ يَعُوْنِ اللّٰهُ تَعَالٰی

## تصدیقاتِ علمائِ کرام

فخر الامثال قدوة الصالحا حکیم الاسلام الحاج الحافظ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب امت کا تم

مہتمم دارالعلوم، دیوبند۔

مخدوم و محترم زاد مجد کم

سلام مسنون نبی از مقرون۔ گھڑ سے رخصت ہو کر بعافیت لاہور اور وہاں سے دیوبند پہنچا۔ احسن الکلام کا مطالعہ یاد اور شوق طبعی دامن گیر تھا۔ ماشاء اللہ تعالیٰ مسئلہ فاتحہ میں اسے ایک بحر ذخار پایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس سعی و محنت کو قبول فرمائے اور امت کی طرف سے آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

میں نے حسب وعدہ تقریظ لکھنے کا ارادہ کیا۔ لکھنے بیٹھا تو غیر متوقع طریق پر تحریر طویل ہو گئی جو احسن الکلام سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھا۔ تقریباً پانچ صفحے فل سکیپ کے ہو گئے۔ اور تقریظ کی صورت نہ رہی۔ اب دو صورتیں ہیں یا تو آپ اس میں سے وہ زائد حصہ حذف فرمائیں جس میں خالی اہل حدیث کو ناصحانہ خطاب ہے اور اگر اسے غیر ضروری نہ سمجھیں تو دوسری صورت یہ ہے کہ اسے تقریظ کے بجائے کتاب کا مقدمہ بنا دیجیے جو میری طرف سے ہو جائے گا۔ مقدمہ کے لیے یہ تحریر موزوں رہے گی، جو بھی صورت مناسب ہو کر لی جائے۔

میں بحمد اللہ تعالیٰ بعافیت ہوں۔ اُس شب کی مہل نوازی کا شکر گزار ہوں۔ والسلام

محمد طیب

دیوبند  
۲۵/۴/۷۵ھ



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فَلْيَسِّرْ عِبَادَ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ (سُورَةُ الزُّمَرِ)

محترم الفاضل مولانا محمد سرفراز خاں صاحب دَام بِالْمَجْدِ وَالْفَوْاضِلِ کی لطیف ترین تالیف احسن الکلام فی ترک قرآۃ الفاتحہ خلف الامام سے استفادہ کا شرف میسر ہوا۔ مطالعہ کے وقت ہر اگلی سطر پر آنکھوں میں نور دل میں سرور اور روح میں تلج یقین بڑھتا جاتا تھا، اثبات مسئلہ کے سلسلہ میں مصنف نے سلاست بیان زور استدلال منصفانہ تنقید اور عادلانہ مدافعت سے مسئلہ کے تحقیقی اور الزامی دونوں پہلوؤں کو مضبوط اور مستحکم کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ کتاب کا مثبت حصہ بہت زیادہ دل آویز ہے جس میں متین انداز کے ساتھ مضبوط دلائل اور موثر شواہد سے مسئلہ کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا اور ساتھ ہی مسئلہ کے دفاعی پہلو سے بھی صرف نظر نہیں کیا۔ کیونکہ مثبت پہلو کے ساتھ جب تک اس کا منفی پہلو صاف نہ ہو مسئلہ من کل الوجوہ مستحکم نہیں ہوتا۔ مصنف نے جہاں مثبت پہلو سے ماننے والوں کے لیے سینہ کی ٹھنڈک کا سامان ہم پہنچایا ہے۔ وہیں منفی پہلو کے دفاع سے نہ ماننے والوں اور ان طعنہ زوروں کا منہ بند کر کے ان پر حجت بھی تمام کر دی ہے جنہیں فاتحہ اور ترک فاتحہ سے زیادہ صرف گروہی تعصب اور اس کا تفوق ہی زیادہ سے زیادہ پیش نظر ہے۔ لیکن ان کے مقابلے میں یہ تردید مسئلہ کے کسی اجتہادی پہلو کی تردید نہیں بلکہ ان کے تخیلات اور غیر معتدل رویہ کی تردید ہے ورنہ ایک فروعی اور ایک اجتہادی اور اوپر سے مختلف فیہ مسئلہ کے ایک پہلو کے اثبات و تحقیق پر اتنا زور دیا جانا ظاہر ہے کہ مسئلہ کی جانب مخالف اور اس کے ماننے والوں کی تردید یا مخالفت کے لیے نہیں ہے نہ ہونا چاہیے اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے فروعی مسائل نہ تو تبلیغی ہیں کہ انہیں دوسروں تک پہنچایا جانا اور ان کا منوایا جانا ضروری ہو اور نہ معاذ اللہ تکذیبی ہیں کہ مخالف راستے رکھنے والوں کو جھٹلایا جانا اور ان کی تکذیب کیا جانا

روا ہو بلکہ محض ترجیحی ہیں جن میں حق و باطل کا نہیں محض خطا و صواب کا اختلاف ہے وہ بھی علی الاطلاق نہیں بلکہ اپنا صواب بھی احتمال خطا کے ساتھ اور دوسروں کی خطا بھی احتمال صواب کے ساتھ مفید ہے اور پھر اس میں بھی دوسرے کی یہ متحمل خطا اس یقین کے ساتھ ہے کہ وہ اور اس کے ماننے والے اس پر مستحق اجر و ثواب اور مستوجب نجات و فلاح بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے دو جہتیں مسائل میں جن میں جانب مخالف باطل بھی نہ ہو وہ خطا قطعی بھی نہ ہو اور پر سے نجات و اجر کا استحقاق بھی یقینی ہو کسی فریق کو یہ حق کیسے مل سکتا ہے کہ وہ مسئلہ کی مخالف سمت کے ساتھ طعنہ زنی اور تشنیع سے پیش آئے یا اسے باطل قرار دے کر ماننے والوں کو مبطل قرار دے۔ اور اس کے بالمقابل اپنی مسئلہ جانب کی دعوت و تبلیغ کرنے لگے۔ فریقین کو اگر حق پہنچتا ہے تو صرف یہ کہ وہ وجہ و دلائل سے اپنی مسئلہ جانب کو مسلک سنت ثابت کرتے ہوئے اس کی ترجیح واضح کر دیں جس کا منشا صرف یہ ہے کہ وہ اپنے کو تہمت بدعت سے بری ثابت کر کے دائرہ سنت میں محدود کیے ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ مسئلہ کی جس سمت کو انھوں نے اختیار کیا ہے وہ ہوائے نفس سے نہیں بلکہ وجہ شرعیہ ہے۔ اس ترجیحی سلسلہ میں فریق ثانی کا ابطال یا معاذ اللہ تعالیٰ اضلال کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا کہ اس کی طرف التفات کی کوئی وجہ ہو بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان فروعی اختلافات میں سرے سے فریق بندی ہی نہیں ہے کہ فریق اول اور فریق ثانی کی بحث شروع کر کے بل میں مبارزہ کی زور آزمائیاں دکھلائی جائیں۔ فاتحہ خلف الامام ہو یا آمین بالجہد بالسرا، رفع یدین ہو یا ترجیع اذان وغیرہ ان میں ہر مسئلہ کا مثبت اور منفی پہلو ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو ہیں۔ مسئلے دو نہیں ہیں اور وہ پہلو بھی روایتی اور درایتی بحث سے سامنے آتے ہیں۔ شریعت نے بالاستقلال ابتدا ہی سے یکدم دو متضاد پہلو عمل کے لیے سامنے نہیں رکھے۔ اب یہ دو پہلو خواہ زمانے کے تفاوت سے سامنے آئے کہ ابتدا میں ایک پہلو صاحب شریعت کے زیر عمل آیا اور آخر میں دوسرا جس سے نسخ و منسوخ کی بحث پیدا ہوئی یا عزیمت و رخصت کے فرق سے سامنے آئے جس سے اولیٰ غیر اولیٰ کی بحث پیدا ہوئی یا تساوی کے ساتھ سامنے لائے گئے جس سے دونوں پہلوؤں میں



تجئیر کی بحث پیدا ہوئی، بہر حال کسی بھی معیار سے سامنے آئے ہوں ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو رہیں گے۔ جس میں ناسخ منسوخ اولیٰ غیر اولیٰ افضل غیر افضل عربیت، رخصت تجئیر و عدم تجئیر کے معیار سے ترجیحات سامنے آتی رہیں گی اور وہ اپنے اپنے وقت اور ظرف اور کیف و کم کی ترجیحات کے ساتھ امت کے زیر عمل آتے رہیں گے جس سے پیغمبر صادق و مصدوق کا کوئی ارشاد اور ارشاد کا کوئی پہلو متروک العمل نہ رہے گا بلکہ ہر پہلو امت کے کسی نہ کسی طبقہ میں زیر عمل رہے گا اور اس طرح پوری اُمت نبی کے پورے ارشادات کی حامل اور عامل رہے گی۔ اندریں صورت ایک روایت دوسری روایت کی ایک حدیث دوسری حدیث کی اور ایک آیت دوسری آیت ہی کی خود ہی فریق نہیں ٹھہرتی چہ جائیکہ رجال حدیث یا حاملین آیت و روایت باہم ایک دوسرے کے فریق قرار پائیں اور آپس میں نبرد آزما ہوں۔ اور ہل من مبارکہ کہ پہلوانوں کی طرح اکھاڑوں میں اتریں اور نبرد آزما ہونے کے جوہر دکھلائیں گویا آیات و روایات اسلحہ ہیں۔ حاملین آیات و روایات جنگی سپاہی اور شریعت ان کا میدان مبارزہ و مقابلہ، ظاہر ہے کہ حتیٰ طور پر سب سے پہلے اسلحہ نکراتے ہیں پھر سپاہی تو اس مبارزت طلبی کا مطلب یہ ہوا کہ خود آیات و روایات میں کوئی حقیقی تعارض اور تضادم ہے جس کی مجبوری سے حاملین آیات و روایات کو بھی باہم ٹکرائنا پڑا۔ حالانکہ یہ صورت حال خود کتاب و سنت مدفوع ہے اگر عیاذ باللہ تعالیٰ ان مختلف فیہ مسائل کی ذاتی خاصیت ہی یہ نبرد آزما ہونے اور مبارزت طلبی ہوتی تو حضرات صحابہ و تابعین و ائمہ مجتہدین اور علمائے راسخین کو تو اس لڑائی بھڑائی اور چیلنجوں سے ایک لمحہ کی بھی فرصت نہ ملتی۔ کیونکہ وہ تو ان مسائل میں مجتہد اور مدعی کی حیثیت رکھتے تھے اور مدعی کو اپنے دعوے پر بہ نسبت ناقل اور تابع کے زیادہ جہود اور استقلال ہوتا ہے جب ناقل اور تابع محض ہو کر ہمیں ان لڑائیوں سے فرصت نہیں تو مدعیوں کو تو ایک سیکنڈ کے لیے بھی ان ہل من مبارزہ کے چیلنج سے ہمت نہ ملنی چاہئے تھی۔ اور ان کی لڑائی ہم سے کہیں زیادہ شدید اور مدید ہونی چاہیے تھی۔ لیکن صورت واقعہ برعکس ہے کہ قرون اولیٰ میں ان عملی اور فردعی مسائل کی جو انب و شقوق میں ترجیح و اختلاف کے باوجود ان حضرات کے قلوب میں ہل من مبارزہ اور چیلنج کا تصور تک نہیں ملتا چہ جائیکہ تضادم کا کوئی عمل دستیاب ہو اس لیے بلا جھجک کہا جاسکتا ہے کہ یہ ہماری مبارزہ طلبیاں اور شرعی لائنوں میں نبرد آزما ہونے کی مثال ان مسائل کی خاصیت نہیں بلکہ محض ہمارے نفوس کی شرارتیں ہیں جن میں جذبات نفس



نکالنے کا جب کہیں اور موقع نہیں ملتا تو ہم یہ کار خیر اس شرعی میدان میں انجام دے لیتے ہیں۔ بنیے کی مارتراؤ کی ڈنڈی۔ اس لیے میں تو اس تصور پر ہوں کہ جب صورت تعارض کے باوجود ایک حدیث دوسری حدیث کا فریق نہیں تو ان مسائل کے سلسلے میں مرجعین کا کوئی طبقہ کوئی دوسرے طبقہ کا فریق کیسے قرار پاسکتا ہے؟ میرے خیال میں کوئی شافعی، مالکی، اہل حدیث ان مسائل کی ترجیحات کی حد تک نہ حنفی کا فریق ہے اور نہ حنفی ان میں سے کسی کا ان میں اگر ترجیحاتی بحثیں ہیں تو وہ علمی اور نظری طور پر ایک حق کو دوسرے حق پر راجح قرار دینے کی ہیں۔ نہ کہ حق کو باطل کے مقابلے پر اختیار کرنے کی جن کا لڑائی یا چیلنجوں سے تعلق ہو۔ ہاں اگر ان مرجعین کے مقابلے میں کوئی طبقہ فریق کی حیثیت رکھتا ہے تو وہ طاعنوں تشنیع کنندوں اور ان افراد کا ہے جو کسی بھی اجتہادی شق کی تقبیح اور مذمت کے لیے مذہب و مشرب کے نام پر کھڑے ہوں۔ سو اس قسم کے طاعن اور تبرائی حضرات جس طرح تارکین فائتہ خلف الامام کے فریق ہیں۔ اسی طرح قارئین فائتہ خلف الامام کے بھی فریق ہیں۔ کیونکہ فائتہ اور ترک فائتہ تو حدیثی مسلک ہے لیکن طعن پر فائتہ یا ترک فائتہ (بائیں طور کہ پڑھنے یا نہ پڑھنے والے کو مطعون کیا جائے) نہ حدیثی مسلک ہے نہ قرآنی نہ فقہی نہ کلامی۔ اس لیے اگر تارکین فائتہ اور قارئین فائتہ حامل بالحدیث ہونے کی وجہ سے اہل حق ہیں تو یہ طاعنیں فائتہ و ترک فائتہ کسی سمت کے بھی ہوں۔ ان اہل حق کے فریق ہیں جن کا تقابل نہ فائتہ سے ہے نہ ترک فائتہ سے بلکہ حق اور اہل حق سے ہے۔ پس ایسے لوگ بلاشبہ تردید کے بھی مستحق ہیں اور تکذیب کے بھی درحالیکہ یہ تردید و تکذیب نہ کسی مسئلہ کی ہوگی نہ مسئلہ کی کسی اجتہادی شق کی بلکہ صرف ان افراد کی اور ان کے غیر معتدل کلام اور کلام کے اس رویہ کی جس کا تعلق کسی حق سے نہیں بلکہ صرف ان کے جذبات نفس سے ہے۔

مصنف مدوح نے اپنی اس متین کتاب میں اگر کہیں رد و قسح سے کام لیا ہے تو وہ درحقیقت اسی طبقہ کے مقابلے پر ہے جو مسائل کو مسائل کی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ جذبات نفس کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ بقول شخصہ کہ وہ نہ آئین بالبحر پر لڑتا ہے۔ نہ آئین بالسر پر بلکہ صرف آئین بالشر پر اس لیے وہ دونوں قسم کی آئین والوں کا فریق مقابل ہے۔ کیونکہ آئین کی پہلی دو قسمیں تو روایات میں ملتی ہیں لیکن تیسری سے قرآن و حدیث خالی ہیں۔ اس کا وجود اگر ہے تو صرف ان لوگوں کے نفس میں ہو سکتا ہے اور بس پس مصنف کو یقیناً کسی اجتہادی مسئلہ کی شق کی بھی تردید کا حق نہیں لیکن بالیقین



ایسے طعنہ زن اور ان کی ایسی غلط روشوں اور مطاعن کی تردید بلکہ تکذیب کا حق ضرور پہنچتا ہے۔ جو مسئلہ کے بجائے اپنے نفس کی مصلحت کو آگے رکھتے ہوں اور دلائل سے گزر کر جذبات کو مسئلہ کی کافی دلیل خیال کر رہے ہوں اگر مصنف نے ایسے لوگوں کی تردید کا فرض احسن الکلام کے ساتھ ادا کیا تو بلاشبہ انھیں اس کا حق تھا اور انھوں نے حق ادا کر دیا۔

اگر طعنہ زن حضرات کو حدیث کے نام پر زور آزمائی کا ایسا ہی شوق دامن گیر ہے تو انھیں چاہیے کہ وہ پہلے منکرین حدیث سے ٹھیں اور نفس حدیث کے موقف کو تھامنے میں یہ زور آزمائی دکھلائیں۔ وہ ان سے کیا ملنا چاہتے ہیں جو خود ہی حدیث، فن حدیث، فقہ حدیث اور ائمہ حدیث کے متبع اور ایک فانی گرویدہ و معتقد کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے یہاں حدیث رسول ہی نہیں رجال حدیث تک کی بے پناہ عظمت و بزرگی اور مخلصانہ پیروی کے جذبہ کو قائم رکھنا ایمان کا جزو و اعظم ہے۔ میزان طعنہ زن حضرات کو اگر واقعی تبلیغ حق کا جذبہ بے چین کیے ہوئے ہے تو وہ منکروں کو اصول اسلام اور اصل دین کی تبلیغ فرمائیں جس کی تبلیغ ضروری ہے تو فروعی مسائل کب ہیں کہ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو اس کے مختار کی جانب سے ہٹا کر اپنی مختار جانب پر لانے کی کوشش کرے نیز اگر تردید ضروری ہے تو غیر اسلامی اصول کی ضروری ہے نہ کہ کسی اجتہادی شق کی سمت مخالف کی جس میں ہمہ وقت صواب کا احتمال قائم رہتا ہے اور اس پر چلنے والا ہر وقت اجر و نجات کا مستحق ہوتا ہے۔ پس تبلیغی سرگرمیاں اور بغض فی اللہ کے مجاہدانہ چیلنجوں کو اگر کام میں لانا ہے تو مخترعین دین، مخترعین کتاب و سنت اور مستحضرین اسلام کے مقابلہ میں لانا چاہئے نہ کہ فاتحہ وغیرہ جیسے فروعی اور اجتہادی مسائل کی ترجیحی شقوق و جوانب کے نام پر خود معتقدین دین و ائمہ دین کے مقابلہ پر میں تو سمجھتا ہوں کہ جو حضرات ان فروعی مسائل کو محض ترجیحی اور عملی مسلک جان کر ان پر سچے دل سے عمل پیرا ہیں خواہ وہ اہل فقہ ہوں یا اہل حدیث۔ انھیں اس دوران میں کسی خفی غیر خفی اور اس کی تسلیم کردہ جانب کا قصور تک بھی نہ آتا ہو گا۔ چہ جائیکہ وہ اس کے خلاف غم و غصہ سے مغلوب ہو کر چیلنجوں کی عبارتوں سے اپنے ذہنوں کو مشتوش کرتے ہوں اور ہل من مبارزہ کے دھیان میں غرق ہوں۔ استفسار مسئلہ کے وقت دیا تھا اپنے نزدیک جو پہلو راجح ہو اسے راجح بتلانا اور مرجوح کو مرجوح کہنا اور چیز ہے اور مرجوح کا ابطال اور افساد کرنا یا اس کے ماننے والے کی تفسیل و

تفسیق کرنا اور چیز ہے۔ پہلا کام اہل حق کا ہے اور دوسرا اہل حق کے مقابل فریق کا۔ بہر حال جیسا کہ ایک  
 حنفی کو فاتحہ خلف الامام کے ماننے والے کو مبطل یا باطل پرست کہنے کی جرأت نہ ہونی چاہیے  
 ایسے ہی کسی غیر حنفی کو ترک فاتحہ اور اس کے ماننے والوں کو باطل پرست یا مبطل یا ضال یا  
 فاسق کہنے کی جرأت نہ ہونی چاہیے کہ یہ اسم فسوق بعد الایمان اور غیر محتاط تعبیر ہم نالائقوں  
 ہی تک محدود نہیں رہتی دوترک جاتی ہے جس کی زد سے کوئی بڑے سے بڑا بھی نہیں بچا رہتا۔  
 کیونکہ عیاذ باللہ اگر ترک فاتحہ خلف الامام کوئی ضال یا گمراہی ہے تو یہ ضلالت بہت پرانی اور  
 بہت سوں کی ہے۔ ۷

مرا برندی عشق آں فضول عیب کند

کہ اعتراض براسرار علم غیب کند

ہاں اس حد تک ہم طعنہ زنیوں کے ممنوع کرم بھی ہیں کہ اگر وہ طعن و تشنیع کی راہ سے اس  
 مسئلہ کو اپنے جذبات اور شکوک کی آماجگاہ نہ بناتے اور ایک فریق کی حیثیت سے سامنے نہ  
 آتے تو مصنف محترم مولانا محمد سرفراز خاں صاحب کے ان دقیق علوم اور اسالیب بیان سے  
 ہم مستفید بھی نہ ہو سکتے جو اس حیلہ سے انھوں نے اپنی کتاب احسن الکلام میں رقم فرمائے  
 ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر جہل علم سے نہ نکلے تو علم کے مخفی گوشے واشگاف نہیں ہو سکتے  
 اگر کذب۔ صدق سے ٹکرنے کھاتے تو صدق کی مخفی قوت نمایاں نہیں ہو سکتی اگر کفر اسلام سے  
 نہ نکلے تو اسلام کے مخفی گوشے دنیا کو اپنا نور نہ دکھلا سکتے بہر حال جب تک اضداد اپنے اصول  
 سے نہ بھڑیں اصول کا وجود و ثبوت نمایاں نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حق تعالیٰ نے اس عالم کو عالم  
 اضداد بنایا ہے اور ہر اصول کے پیچھے اس کی ضد لگا دی ہے تاکہ وہ اس سے ٹکراتی ہے  
 اور اس حیلہ سے اصول کی عظمت و قوت لپکتی رہے بایں معنی تکوینی طور پر طاعنوں اور  
 منکروں کا وجود بھی مجموعہ کائنات کے لیے ایک خشن ہے اور ضروری ہے وہ اگر دلوں میں سو  
 اور شبہات نہ ڈالیں تو اہل عرفان سے ان کے دفعیہ کی علمی تدبیریں بھی نمایاں نہ ہوں میشل  
 مشہور ہے کہ ”ادب سیکھا جاتا ہے بے ادبوں سے“ یعنی وہ ذریعہ ادب دانی بن جاتے ہیں سو  
 علم بھی بہت حد تک جہل سے ہی سیکھا جاتا ہے۔ یعنی جہل اور اس کے پیدا کردہ شکوک و شبہات



بھی بہت حد تک ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اہل علم کی گرم جوشی آمادگی اور ان کے انکارِ علم کا جس سے مخلوق خدا علم سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ پس اس حد تک اس طبقہ کا ہم سب ہی کو ممنون ہونا چاہیے کہ علم کے بہت سے مخفی گوشے ان کے سبب سے سامنے آگئے اور اس شر میں سے ایک خیر ہمارے لیے نکل آئی۔ شر اپنی ذات سے شر سہی مگر مجبوعہ عالم اور اہل معاملہ کے لیے نسبتاً وہی خیر ہے۔ مگر محض خدا تعالیٰ کے فضل سے نہ کہ شر کے خیر ہونے سے۔ اس لیے تکوینی طور پر تو ہم طعنہ زدنوں کے ممنون ہوں گے کہ ان کی بدولت کتنے ہی علم کے مخفی گوشے ہمیں دستیاب ہو گئے مگر حقیقی طور پر ہم مصنف احسن الکلام کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس جیلہ سے مسئلہ فاتحہ کے تحقیقی اور دفاعی دونوں پہلوؤں کو بہت حد تک صاف کر دیا ہے جو موافق اور مخالف دونوں طبقوں کے لیے علمی حیثیت سے کارآمد ہوں گے۔ اگر خلاف رائے رکھنے والے حضرات کے لیے ان دلائل سے شفا ہو گئی تو ان کے خلاف میں شدت باقی نہ رہے گی خواہ وہ اپنے ہی مسلک پر عمل پیرا ہیں سو یہ کونسا کم نفع ہے اور اگر ان دلائل کے کسی مقدمہ کو کمزور یا کراںھوں نے جواب کے طور پر اسے واضح کیا تو ہم سب کے لیے ایک مزید علم کا اضافہ ہوگا اور یہ کونسا قلیل نفع ہے جو زنی علما کا مصداق ہو، بہر صورت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب اس تالیف لطیف کے لیے سرفراز ہوئے ہیں تو وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں اور احسن الکلام بحیثیت مجموعی حقیقتاً احسن الکلام ہے۔ حق تعالیٰ اس احسن الکلام کو حسن قبول سے سرفراز فرمائے اور اسے یتبعون احسنہ کا مصداق بنائے۔ آمین

محمد طیب غفرلہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

یکم ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ

سید المناظرین سید العلماء  
حضرت مولانا سید مہدی حسن رحمہ اللہ تعالیٰ  
سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند  
بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

وبعد۔ آج دنیا جس دور سے گزر رہی ہے خصوصاً مسلمان عالم جن کٹھن مراحل سے گزر رہے ہیں۔ اس کا وقتی اور ہنگامی اقتضایہ تھا کہ وہ امت جس کا خدا ایک۔ رسول ایک، قرآن ایک۔ کعبہ ایک ہے سرچڑ کر بیٹھتی اور ان امراض کا علاج تلاش کرتی جن امراض میں مسلمان مبتلا ہیں جن کی وجہ سے ان پر زندگی دو بھرا اور وبال ہے۔ تحریکات گمراہ کن اور فتنہ خیز دین کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ نہیں، نہیں بلکہ دریا کی موجوں کی طرح پلے بپلے موجیں مار رہے ہیں جن کی لہروں کا اثر ساحل دریا سے باہر بھی کافی ہے۔ بحر مگھ کو ش کہ اس رہا ہے پُرانہ خطر است  
باقیاط قدم نہ کہ جائے شور و شر است  
ہمیں کہ اب یہاں چسپاں تصور کن  
کہ سیل می رسد و خانہ تو بگر گذر است  
بجائے اس کے آج بھی تشنہ و افراق کی صورتیں پیدا کر کے شقاق و خلاف کے راستے کو ہموار کیا  
جاتا : ع وہ بچنے کس طرح بیٹھیں کہ جب بیٹھا نہیں جاتا

اس پر طرہ یہ کہ اس کو دینی خدمت تصور کیا جاتا ہے جو مسائل برسہا برس سے ایسے چلے آتے ہیں جن پر ہر زبان میں خامہ فرسائی ہو چکی ہے اور قلوب کی روشنائی خشک ہو چکی ہے۔ انھیں اختلافی مسائل میں سے فاتحہ خلف الامام کا پرانا مسئلہ ہے کوئی نئی اور جدید تحقیق نہیں ہے جس کو دنیا کے مسائل پیش کیا جاتے اور وہ اس سے مستفید ہو۔ لیکن جن حضرات کی طبیعت ثانیہ یہ ہو گئی ہو کہ اختلاف وسیع ہوتا رہے وہ کب گوارا کر سکتے ہیں کہ خاموش رہیں اور اپنی تحقیق کے مطابق عمل کرتے رہیں لیکن ایسا نہیں بلکہ دور حاضر کے ہمارے دینی بھائی اہل حدیث حد اعتدال سے باہر ہو کر اسی کے دیرپے ہو گئے کہ جو امام کے پیچھے۔ الحمد نہ پڑھے اس کی نماز باطل ہے اور جب نماز ہی نہیں ہوتی تو تارکین صلوٰۃ ہیں بلکہ قصد اس جرم کے مرتکب ہیں جو بجائے خود باعث نجات ہونے کے



موجبِ خسران اُخروی ہے۔ یہ اپنی جگہ پر کہاں تک صحیح ہے۔ اس کو انھیں کے قلوب زیادہ محسوس کرتے ہوں گے کہ امتِ محمدیہ کی ایک بہت بڑی جماعت کی نماز پر پُطُلان کا حکم لگا کر کیا دین کی خدمت ہے، جن میں حضراتِ صحابہ کرامؓ، تابعینؓ و تبع تابعینؓ وغیرہم کی کافی تعداد داخل ہے۔ ایسی صورتِ حال پر اس کی ضرورت تھی کہ اس مسئلہ کے ہر پہلو پر از سر نو متانت و سنجیدگی، تہذیب و شائستگی کے ساتھ محدثانہ طریق سے روشنی ڈالی جائے جو پہلو آج اگر نہیں ان کو آج اگر کر دیا جائے تاکہ انصاف پسند اور علم پرور حضرات کی بصیرت دقیقہ رس اس کو دیکھ کر اَحْسَنَت کہ اٹھے :۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آخر آمد ز پس پردہٴ تفسیر پدید!

اس ضرورت کا احساس انجی محترم فاضل نوجوان مولانا محمد سرفراز خاں صدقہ رس حدی خطیب جامع مسجد گکھڑ منڈی نے کیا اور اس مسئلہ پر محققانہ و منصفانہ بحث کر کے کتابی صورت میں اس کو شائع کیا جو احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الہام کے نام سے موسوم ہے جس کے دو حصے ہیں۔ میں نے جزو اول کا اول سے آخر تک لفظ بہ لفظ اور جزو ثانی کا مختلف مقامات سے مطالعہ کیا ہے۔ خوبی اسلوب و انداز بیان، زبان کی صفائی کے ساتھ دلائل و براہین پر منصفانہ نظر ڈالی ہے۔ فاضل موصوف نے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ معترضین کے شبہات کا جواب عالمانہ دیا ہے اور تحقیق کے ساتھ مجادلانہ طریق اختیار نہیں کیا کہ کتاب کی افادیت میں کمی واقع ہو۔ اپنے ہر دعویٰ کو براہین سے مدلل کیا ہے کہ مخالفین حضرات کو بھی اگر ان کے یہاں علم و انصاف کی قدر و قیمت ہے تو تسلیم کر لینے اور سکوت اختیار کر لینے کے سوا چارہ کار نہیں ہے اس محنت و عرق ریزی اور تحقیق و تنقید کی جملہ اخاف کی طرف سے فاضل موصوف کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور بے انصاف مخالفین کی ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ ان کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے اور مخلوق کے طریقِ رشد و ہدایت کا رہبر بنائے۔ طلباء و عوام کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ علماء بھی اس کتاب کے مطالعہ سے دریغ نہ فرمائیں کہ براہین و دلائل اور آثار و اقوال ائمہ یکجائی طور پر اس کتاب میں ملیں گے۔ بعض مباحث ایسے بھی اس کتاب میں ملیں گے جو بڑی عرق ریزی اور کافی مطالعہ کتب

بمشکل حاصل ہو سکتے ہیں جن کو فاضل مولف نے بہت خوبی کے ساتھ اپنے اپنے موقع پر پیش کیا ہے اس لیے ہر اس شخص کو اس کتاب سے استفادہ کرنا چاہیے جو حنفیت سے وابستہ ہو تاکہ اپنے مذہب کی صداقت خصوصاً مسئلہ فاتحہ خلف الامام میں ہویدا اور نمایاں ہو جائے۔ طباعت و کتابت کی کہیں کہیں کوتاہیاں ہیں جو اشاعت آئندہ میں دور ہو جائیں گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

احقر الزمن

السید مہدی حسن غفرلہ خادم دارالافتاء الواقعہ

بدارالعلوم دیوبند۔ ۳/۷/۱۳۵۵ھ

شیخ العرب العجم رأس الاثقیاء مجاہد ملت  
حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ  
سابق شیخ الحدیث دارالعلوم، دیوبند۔

حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب کی تحریر سے میں حرف بحرف موافقت کرتا ہوں اور دعا کرتا  
ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا محمد سرفراز خاں صاحب موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین  
تنگ اسلاف حسین احمد غفرلہ  
مدرس دارالعلوم، دیوبند

رئیس المحققین قاصد البدعت محی السننہ شیخ الحدیث  
حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی دامت برکاتہم (میتواں گدھ پانی)

میتو

۱۲ فریقہ، ۱۳۴۲ھ

فاضل محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ  
آپ کا قیمتی پیر (احسن الکلام) مجھے بروقت مل گیا تھا۔ اس عنایت کے لیے میں



آپ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اپنی بے اطمینانی کی وجہ سے میں اب تک آپ کی کتاب پڑھی نہیں پڑھ سکا پھر بھی متعدد مقامات سے کئی کئی ورق پڑھے، آپ کی محنت و جانکاہی پر دل سے دعا نکلی۔ میں نے آپ کی کتاب کو اس لحاظ سے بہت زیادہ پسند کیا کہ آپ نے انہیں اصول کو سامنے رکھ کر جوابات دیے ہیں جن اصول کی بنیاد پر معترضین نے اعتراضات کیے ہیں۔ بالخصوص آپ نے تحقیق الکلام کی طرف جو خصوصی توجہ فرمائی اس کے لیے آپ خاص طور پر مستحق مبارکباد ہیں۔ اس لیے کہ ہماری جماعت کے سہل و تغافل کی وجہ سے اس کو لا جواب سمجھا جا رہا تھا۔ حق تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

چونکہ یہ کتاب مقابلہ پر لکھی گئی ہے اور فریق مخالف صرف نکتہ چینی ہی کے خیال سے اس کو دیکھ گا، اس لیے مخالف کی نگاہ پڑنے سے پیشتر بعض ایسی باتیں جو میرے خیال میں صحیح نہیں معلوم ہوتیں۔ ان کی نشاندہی کرتا ہوں۔ آپ بھی غور فرمائیں۔ اگر آپ کو بھی مجھ سے اتفاق ہو تو فہما ورنہ جانے دیجیے۔

چونکہ میں نے مسلسل پوری کتاب نہیں پڑھی اس لیے کیفیت ما اتفاق جہاں جہاں جوابات مجھے کھٹکی ہے اس کو میں نے نوٹ کر لیا ہے۔

حبیب الرحمن الاعظمی

نوٹ: حضرت نے تین صفحات پر مشتمل تحریر میں متعدد اغلاط کی نشاندہی کی تھی جن کی اب بحمد اللہ تعالیٰ تصحیح کر لی گئی ہے۔ صفحہ

حضرت مولانا مفتی فقیہ الاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سابق مفتی اعظم جامعہ رشیدیہ منگل پور تلمیذ و مرید حضرت شیخ الاسلام

بخدمت جناب مولانا مولوی محمد سر فراز خاں صاحب بارک اللہ تعالیٰ فی عمرہ و علمہ و عملہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اما بعد گزارش کہ احسن الکلام، تبرید النواظر، گلدستہ توحید، دل کا سرور میں نے پڑھوا کر سنی ہیں۔ ماشاء اللہ تعالیٰ آپ بہت وسیع النظر ہیں اور ذہین۔ حافظہ و فہم بہت پایا ہے، مگر معام نہیں یہ سب کتب جن کے حوالے آپ

نے دیے ہیں۔ کیا یہ سب آپ کے پاس موجود ہیں؟ جب میری بیٹی تھی تو آثار السنن و جامع الآئینہ  
 نبوی والیضاح الاولہ و ہدایت المعتدی۔ والفرقان دیوبندی۔ وانوار نعمانیہ و ستہ ضروریہ فیض لوی  
 کا مطالعہ کیا تھا۔ مگر تحقیق الکلام کا جواب مصنف مرحوم کی زندگی میں کسی نے نہ لکھا۔ البتہ  
 ابکار المنن کا جواب مولانا عبدالرشید ابن نبویؒ نے لکھا تھا۔ جس کا قلمی نسخہ انھوں نے مجھ کو بھی  
 بھیجا تھا۔ جو جالندھر مولوی خیر محمد صاحب کے مکتبہ میں انقلاب کے وقت وہیں رہ گیا۔ ہمارے  
 مدرسہ کی سب کتب اور مولوی خیر محمد صاحب کے مدرسہ کی کتب انقلاب میں سب ضائع  
 ہو گئیں۔ معلوم ہوا کہ ایک مجلسی طلاق ثلاثہ کی بابت آپ کتاب شائع کرنے کو ہیں؟ تیار ہونے  
 پر پتہ کرنا۔ مولوی حبیب الرحمن اعظمی مدرس مدرسہ میو بھجن ناتھ ضلع اعظم گڑھ نے طلاق ثلاثہ  
 کی بابت دو جلد میں کتاب لکھی ہے۔ جس میں علامہ ابن قیمؒ وغیر مقلدین کے جواب دیے ہیں۔  
 وہ کتاب بھی وطن میں ضائع ہو گئی۔ شاید آپ کی نظر سے گزری ہے یا نہیں۔ ابکار المنن کا جواب  
 ابن نبوی طبع نہیں کرا سکے۔ غریب ہونے کے سبب قلمی تین نسخے تیار کیے تھے۔ ایک نسخہ  
 مجھ کو بھیجا اور ایک مبارک پوری صاحب کو اور ایک اپنے پاس رکھا۔ حضرت شیخ الہند فرماتے  
 تھے کہ امام بخاریؒ بڑے ذہین تھے۔ تھوڑا سا ذہن اور ہوتا تو امام ابو حنیفہؒ کے برابر ہوجاتے۔  
 امام نوویؒ کے متعلق فرماتے تھے کہ ان کا ذہن طویل و عریض تو بہت ہے مگر امام اعظم رحمہ  
 کے عمیق ذہن تک پہنچ نہیں سکتے۔ فقط آپ کے حوالہ جات بقید صفحات لکھنے سے یہ  
 معلوم ہوتا ہے کہ آپ پیر چنڈا کے مکتبہ میں لکھ رہے ہیں یا مکتبہ مدرسہ دیوبند میں کیا یہ سب  
 کتب آپ کے پاس ہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ والسلام فقط

خادم حبیب اللہ خلف حضرت مفتی رح

خادم طلبہ جامعہ رشیدیہ۔ ۵ شوال ۱۳۷۴ھ



فقیر وقت المحقق المدقق  
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب  
مفتی اعظم پاکستان

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى

مولانا ابوالزہاد محمد سرفراز خاں صاحب تصدیق کی محققانہ تازہ تصنیف ”احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الامام“ دیکھنے کا موقع ملا جو اپنے موضوع میں بے نظیر کتاب ہے۔ طرز بیان نہایت سلیس ہے اور اس مسئلہ میں غلو و تعدی کرنے والوں کا بہترین جواب ہے۔

مسئلہ قراءۃ فاتحہ خلف الامام ان مسائل میں سے ہے جن میں حضرات صحابہ و تابعین کے زمانے سے اختلاف اور بحثیں چلی آتی ہیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں مستقل کتابیں اور رسالے اس موضوع پر لکھے گئے ہیں اور ایسے اجتہادی اختلافات میں تمام اہل حق کا مسلک یہی ہوتا ہے کہ ان کے جس پہلو کو وہ رائج سمجھتے ہیں اس کو اختیار کر لیتے ہیں اور دوسری جانب پر طعن و تشنیع اور زبان درازی جائز نہیں سمجھتے۔ علمی بحث و تحیص کا مقام آتا ہے تو اس میں مناظرانہ بحثیں بھی ملتی ہیں مگر اس نظر سے نہیں کہ ان کا حریف باطل پرست یا گمراہ ہے۔ اور اجتہادی اختلافات کا تمام اہل سنت و الجماعت کے نزدیک یہی مقام ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آج کل کی فضا میں جہاں کفر و الحاد کے طوفان نہی نئی شکلوں سے اٹھ رہے ہیں۔ سرے سے حدیث ہی کو ناقابل عمل ٹھہرایا جا رہا ہے۔ قرآن میں طرح طرح کی معنوی تحریفات کے لیے ادارے بنائے جا رہے ہیں، کسی خدا ترس ذمی علم کے لیے اس کا کوئی موقع نہ تھا کہ ان پرانی بحثوں کو تازہ کر کے ایک نیا فتنہ قرآن و حدیث کے ماننے والوں اہل سنت میں پیدا کرتا۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ بعض نا عاقبت انہیں کم علم لوگ جو اپنے آپ کو فرقہ اہل حدیث سے منسوب کرتے ہیں اور درحقیقت انصاف پسند اہل حدیث بھی ان کے طرز عمل سے متنفر ہیں۔ کفر و الحاد کے دنیا میں پھیلنے سے ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کی فکریں صرف اس میں مبذول رہتی ہیں کہ خفی مسلمان کو گمراہ، بے نماز بلکہ کافر و مشرک قرار دیں۔ اسی قسم کے بعض لوگوں نے حال میں کچھ رسائل شائع کر کے مسلمانوں

میں انتشار و اختلاف کا دروازہ کھولا تو ہمارے محترم مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صاحب نے ضرورت محسوس فرما کر زمانہ حال کے طرز اور سلیبس اردو زبان میں اس موضوع پر دو جلدوں میں یہ ضخیم کتاب تصنیف فرما کر مسئلہ کے ہر پہلو کو خوب واضح فرمادیا۔ اس سے پہلے جتنی کتابیں اردو زبان میں بھی اس مسئلہ کے متعلق نظر سے گذری ہیں اقل تو ان میں پوری مباحث کے لیے جامع کم ہیں۔ پھر خالص قدیم علمی زبان میں ہیں آج کل عوام کیلئے ان سے استفادہ مشکل ہے اس کتاب میں فاضل نے ماشاء اللہ تعالیٰ بڑی خوبی سے تمام جوانب کی رعایت رکھ کر اس کے حسن کو دو بالا کر دیا ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ عنا وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء وقبّل منہ مسعاہ۔

۲۵ شوال ۱۳۷۲ھ  
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

## علامہ عصرا مام المناظرین اشافا العلماء حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ سابق مہتمم مدرسہ عربیہ خمد المدارس، ملتان، مغربی پاکستان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

بعد حمد و صلوة۔ مسئلہ قرآنہ خلف الامام سلف و خلف میں ہمیشہ مختلف فیہا رہا ہے۔ مگر اس کا اختلاف اولیت و غیر اولیت تک محدود رہا۔ مثبتین حضرات نے تارکین قرآنہ پر بطلان صلوة کا جارحانہ حربہ کبھی استعمال نہیں فرمایا۔ البتہ ہمارے زمانے کے اکثر غیر معتدل اہل حدیث علما جمہور سلف و خلف کے خلاف بڑی شد و مد سے اپنی تحریر و تقریر میں اس دلائل و حربہ کو استعمال کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ بایں ضرورت جمہور کی طرف سے بھی اصلاحی طور پر تحقیقی و جوابی رسائل کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو معاندین کے لیے مسکت اور منصفین کے لیے قانع تھا۔ مگر بعض رسائل میں جزوی مباحث پر کلام تھا اور بعض میں قدر ضرورت پر اکتفا تھا۔ اس لیے ہنوز ضرورت تھی کہ اس مسئلہ میں ایسی جامع اور مسکت کتاب شائع ہو جو تمام مباحث پر حاوی ہو۔ سو بھرحمہ اللہ تعالیٰ فاضل نورجوان حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب سرحدی خطیب جامع مسجد گھڑ منڈی ضلع



گو جانوالہ نے کتاب احسن الکلام فی ترک القراۃ خلف الامام ہر دو جلد تصنیف فرما کر احسن طریق سے اس ضرورت کو پورا فرمادیا۔

امام شافعیؒ کے مذہب کی تحقیق اہل بیت اور رواۃ احادیث کے تراجم و وفیات اور ہر ہر مبحث پر محققانہ و منصفانہ تفصیلی دلائل و براہین اس کتاب کی خصوصیات ہیں مجھے سفر و علالت کے دوران میں صرف جلد اول کے مطالعہ کا حرفاً حرفاً موقع مل سکا۔ بفضلہ تعالیٰ اس مسئلہ کے متعلق فریقین کے بہت سے رسائل دیکھنے کا موقع مجھے بھی میسر آیا ہے اس لیے بلا تکلف عارض ہوں کہ میرے نزدیک یہ کتاب اس مسئلہ کے تمام مباحث پر حاوی اور جامع ہے۔ کوئی مبحث اس میں تشنہ نہیں چھوڑا گیا۔ فریقین کے لیے اس کا مطالعہ نافع ہوگا۔ خصوصاً حنفی المذہب علماء و طلباء کو خود زیر مطالعہ رکھنا اور اس سے استفادہ کرنا ضروری ہے اور اس کی اشاعت میں سعی کرنا مذہبی فریضہ کے مرادف ہے۔ حق تعالیٰ اس کتاب کو مفید عام اور نافع تام بنادے۔ اور حضرت مولف علامہ دَامَ فِیضُہ کو جزا بر احسن عطا فرماتے ہوئے اس قسم کے دیگر مسائل پر محققانہ رسائل تصنیف فرمانے کی توفیق مزید شامل حال رکھے۔ آمین ثم آمین۔

احقر خیر محمد عفا اللہ عنہ

مہتمم مدرسہ عربیہ خیر المدارس، ملتان ۹ ذیقعد ۱۳۸۷ھ

شیخ کامل رئیس المجاہدین مفسر قرآن کریم  
حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ  
امیر انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ

بِسْمِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اَصْطَفٰی۔ اَتَابَعُ

میں نے احسن الکلام فی ترک القراۃ خلف الامام مصنف مولانا ابوالزہد محمد سر فراز خاں صاحب دامت معالیہم کی دونوں جلدوں کو متعدد مقامات سے بغور پڑھا ہے، مولانا ممدوح نے بحث اور عرق ریزی سے اپنے مجوزہ موضوع کو دلائل و براہین سے مدلل فرمایا ہے۔ اگر اس عنوان

کے مخالفین انصاف اور تقویٰ سے کام لیں تو انہیں سوائے سکوت اور سر تسلیم کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہ ہو۔ بارگاہ الہی میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور مخالفت کرنے والوں کی ہدایت فریاد بنائے۔ آمین یا اللہ العالمین۔

العارض احقر الانام احمد علی عفی عنہ لاہوری ۱۳۷۲ھ شوال

## امید موحدین سید المناظرین الحافظ الحجۃ حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب دام فیضہم سابق مدرس دارالعلوم دیوبند و حال شیخ الحدیث گوجرانوالہ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد عرض ہے کہ مجھے محترم دوست مولانا محمد سرفراز خان صاحب کی کتاب الاجواب احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الامام کے مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا جس کے بعد میں کتاب موصوف کی مندرجہ ذیل خوبوں اور خصوصیات پر مطلع ہوا:

- ۱۔ استیعاب اطراف میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ ۲۔ زور استدلال میں بے مثال ہے۔
- ۳۔ جامعیت مضامین میں بحر محیط ہے و معترضین کے اعتراضات کے جوابات میں دیوار فولاد ہے۔
- ۴۔ مصنف کے تبحر علمی کا زندہ ثبوت ہے۔

وبارک اللہ فی عمرہ و علمہ و شانہ و صلاتہ عما شان و حفظہ من آفات الزمان و عصمہ من شر الحاسدین و اصحاب العداوان۔

العبد ابو عبید اللہ شمس الدین عفی عنہ ۱۳۷۲ھ شوال

شیخ طریقت حافظ الحدیث علامہ حضرت مولانا شیخ القرآن الحدیث محمد عبد اللہ صاحب  
درخواستی دام مجدہم مہتمم مدرسہ عربیہ مخزن العلوم خانپور

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ وحدہ والصلوۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ  
وصلی الہ وصحبہ وجمیع من اقتفی اثرہ۔ اما بعد، فقد رأیت رسالۃ احسن الکلام



من تالیف المولوی محمد سرفراز خاں صفدر فرستہ موشحاً بدلائل و خطایا عن  
الجدل فجزی اللہ تعالیٰ المؤلف احسن الجزاء وارجو من اللہ تعالیٰ ان ینتفع به العوام  
والخواص وان یتزک اهل الجدل الجدل قال الذبی صلی اللہ علیہ وسلم ما ضل  
قوم بعدہ ہدیٰ کانوا علیہ الا وتوالجدل الخ بکی شجرہ الاسلام من علما ثہ فہما  
اکثرثوا لہاراً وامن بکاثہ۔ فاکثرہم مستحسن لخطا ثہ مستقبیح لصواب غیرہ۔  
فایہم المرجوفینا لدینہ وایہم الموثوق فینا برأیہ ہدایۃ الدین ضلوا وقد بانفت  
نخسارتہم فبا عوا الدین بالدنیا فہما رجحت تجارتہم۔

حزیرہ افقر الی اللہ محمد عبد اللہ درخواستی

مہتمم مدرسۃ العربیہ مخزن العلوم خانیپور

استاذ الاساتذہ محقق وقت الفقیہ حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد عبد الرحمن صلی اللہ علیہ وسلم  
سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور

بسم الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفوا۔ اما بعد۔

احقر نے رسالہ احسن الکلام مؤلف مولانا محمد سرفراز خاں صاحب بعض بعض مقامات سے  
دیکھا۔ اس مختصر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مؤلف سلمہ نے استدلال اور تنقید میں تحقیق اور ثبات سے  
کام لیا ہے۔ طعن و تشنیع سے (جو آج کل کے بعض حضرات نے اختیار کر رکھا ہے) اجتناب کیا ہے۔  
حقیقت یہ ہے کہ ایسے مسائل مختلف فیہا میں طعن و تشنیع ایک امر قبیح کا ارتکاب ہے۔ اللہ  
تعالیٰ مسلمانوں کو اور خصوصاً حضرات علما کو اس سے محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف سلمہ کی اس  
تالیف کو قبول اور مخلوق خدا کو اس سے مستفید و مستفیض فرمائے۔ اللہم وفقنا لما تحب  
وترضی من القول والعمل والہدی انک علی کل شئی قدير۔

العبد الاحقر

عبد الرحمن غفرلہ

از بہبودی ملک مالاکیمیل پور ۱۸ شوال ۱۳۴۱ھ

شیخ المعقول والمنقول علامہ دہر فرید عصر حضرت مولانا شیخ القرآن

والحیث محمد سلطان محمد صاحب <sup>تعالیٰ</sup>

الحمد لله رب العالمین والصلاة والسلام على رسول الله الكريم وعلى آله اجمعين

اما بعد۔ میں کتاب احسن الکلام کو بالاستیعاب تو نہیں دیکھ سکا۔ لیکن اس کی دونوں جلدوں کے بعض بعض مقاموں کو نہایت غور و تدبیر کے ساتھ پڑھا ہے اور پڑھنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ درج ذیل ہے :

۱۔ مسئلہ فاتحہ خلف الامام میں مولانا محمد سر فزاخاں صاحب کے دو فریضے تھے۔ پہلا فریضہ اپنے دعوے کو دلائل سے واضح کرنا۔ دوسرا فریضہ فریق مخالف کے دلائل کا جواب دینا۔ مولف صاحب نے ان دونوں فریضوں کے ادا کرنے میں کمال کر دیا ہے۔ اپنے دعوے کو دلائل عقلیہ و نقلیہ سے روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔ فریق مقابل کو ان کے دلائل کے جوابات عقلیہ و نقلیہ وہ نظارہ دکھایا ہے جو تادم زیست ان کی نظروں سے غائب ہو ہی نہیں سکے گا۔

۲۔ طرز بیان نہایت ہی سلیس و عام فہم ہے صرف اُردو خواں بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۳۔ اس مسئلہ کے متعلق بہت سے رسائل لکھے گئے ہیں لیکن احسن الکلام جیسا مفصل و

جامع دلائل عقلیہ و نقلیہ میری نظر سے کوئی دوسرا رسالہ نہیں گزرا۔

اب میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی اس خدمت کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔

آمین۔ و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

خادم العلماء

سلطان محمد عفی عنہ

ناظم مدرسہ علوم نبوت (کھیلہ شیخاں) گجرات

سابق صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی



## نمونہ سلف بقیّت الخلف حضرت مولانا محمد عبدالحق صاحب فاضل

مہتمم مدرسہ حقانیہ اکوڑہ خشک ضلع پشاور

حضرت علامہ زید مجدکم - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ - گرامی نامہ وصول پایا۔ حسب  
الحکم احسن الکلام کے بعض مقامات دیکھے گئے۔ افسوس کہ نہایت عظیم الفرصتی کی وجہ سے  
مکمل کتاب کا مطالعہ نہ ہو سکا۔ تاہم جستہ جستہ مقامات کو بغور دیکھا گیا۔ بزرگوارم! ایسی  
جامع اور مسئلہ کے ہر پہلو پر حاوی کتاب پر تقریظی جملے لکھنا میرے خیال میں سورج کے  
سامنے چراغ دکھانا ہے لیکن محض تعمیل حکم کی غرض سے چند جملے تحریر کیے جاتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

الْحَمْدُ لِمَنْ تَفَرَّدَ بِالنِّقَدِ۔ فَكُلُّ شَيْءٍ مَّا سِوَاهُ مُسَبُّوهُ بِالْعَدَمِ وَالصَّلَوةِ

وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ مَصَابِيحِ الْفَلَاحِ

ابا بعد تمام مشاغل میں افضل و بہترین مشغلہ خلوص نیت کے ساتھ علوم دینیہ اور مسائل شرعیہ

کی تحقیق ہے جو افضل العبادت میں محسوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلاف نے اسی کو اپنی زندگی کا اہم  
نصب العین اور اپنی تمام سرگرمیوں کا محور قرار دیا تھا۔ اور قیمتی عمروں کو اسی مبارک مشغلہ میں فنا کیا ہے۔  
بالخصوص ایسے مسائل شرعیہ میں علمی تحقیقات کو امت کے سامنے پیش کرنا جن میں امت کے نقطہ ہائے  
نظر سلف و خلف مختلف ہے ہوں۔ علوم دینیہ کی بہترین خدمت اور امت کے ساتھ انتہائی درجہ کی خیر خواہی  
ہے جو ہر طرح قابل قدر اور لائق ستائش ہے کہ اسی میں امت کے مختلف النحیال حضرات کے خیالات  
کی ایک حد تک اصلاح اور طالب عمل کے لیے ایک واضح شاہراہ متعین ہو جانے کے قوی امکانات  
پائے جاتے ہیں۔ مسئلہ قرات خلف الامام بھی چونکہ ان معرکہ الارار مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے۔  
جس میں ہر زمانے کے اکابرین ملت نے اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔ اور اس پر طبع آزمائی فرمائی  
ہے۔ جزا ہم اللہ تعالیٰ اعنا خیر الجزا لیکن زیادہ تر ہدف ملامت اس مسئلہ میں علماء اخاف ہی کو بنایا  
جا چکا ہے اور بنایا جا رہا ہے کہ صحیح احادیث کے ہوتے ہوئے بھی علماء اخاف قرات خلف الامام  
پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں۔ اور احادیث نبویہ سے کھلی ہوئی مخالفت کر رہے ہیں

حالانکہ مسئلہ کے تحقیقی اور استدلالی پہلو پر اگر انصاف سے نظر ڈالی جائے تو اخلاف اس مسئلہ میں نہ اپنی رائے میں متفرق ہیں۔ اور نہ شاہراہ اور جادۂ حق سے ان کے قدم ہٹتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ اس اہم موضوع پر ایک ایسی علمی تحقیق پیش کی جائے جو نہ صرف توضیح مسئلہ کے لیے مفید ہو۔ بلکہ اظہار حق فی ہذا الباب کے لیے برہان ساطع کی حیثیت بھی رکھتی ہو۔ خدا تعالیٰ جزا و خیر دے۔ مصنف احسن الکلام حضرت علامہ مولانا ابوالزہد محمد سر فراز خاں صفدر صاحب کو کہ اس نے اس ضرورت کو پورا فرمادیا۔ اور اپنی علمی تحقیقات کو اس مسئلہ کے بارے میں ایک ایسی کتاب کی شکل میں علماء امت کے سامنے پیش فرمایا جس کے متعلق یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کچھلی تمام ان کتابوں سے یہ کتاب مستغنی کر دینے والی ہے، جو اس مسئلہ کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ کتاب اپنے حسن ترتیب اور مضامین کی ثنائی اور مکمل تشریح مسئلہ کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیات کی حامل ہے جن کی وجہ سے کتاب اس قابل ہو گئی ہے کہ اہل انصاف عموماً اخلاف خصوصاً اس کو اپنے لیے بیش بہا تحفہ اور مبارک ہدیہ سمجھیں۔ سب سے زیادہ قابل ستائش اور لائق تحسین خصوصیت یہ ہے کہ ملت کے بلند پایہ علماء کرام اور ائمہ عظام کے صحیح اقوال پیش کیے گئے ہیں۔ مدعی کے اثبات اور تحقیق انتساب کے لیے مستند نقول سے کام لیا گیا ہے۔ نیز مخالفین حضرات کے اعتراضات کے جوابات ایسے تسلی بخش طریقہ سے دیے گئے ہیں جو انصاف پسند حضرات کے لیے موجب تسکین ہیں۔ امید کہ اہل علم حضرات اس کتاب سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف مدظلہ کی اس سعی و کوشش کو قبول فرمائیں اور اس کا خیر کے بدلہ میں ان کو اجر جزیل عطا فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔ وصلى الله تعالى على خير خلقه محمد وآله وصحبه اجمعين۔

عبدالحی عفی عنہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خشک ضلع پشاور (سرحد) اشوال

پیر کامل عالم بمشیل حامی سنت حاجی بدعت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

سابق مہتمم مدرسہ عربیہ سراج العلوم سرگودھا

الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهُ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَا نَبِيَّ بَعْدَهُ۔ اَمَّا بَعْدُ فَذٰلِكَ دُنْيَا مِیْن مَّنْقُولَات



اور تعامل کو دیکھا جاتا ہے۔ قرآنہ خلف الامام کے بارے میں قرن اول سے لے کر آج تک اہل اسلام کا عدم فرضیت پر جمہور کا تعامل رہا ہے۔ ائمہ مجتہدین میں سے امام شافعیؒ سب سے زیادہ نمازوں میں (وجوب قرآنہ فاتحہ کے دعوے میں) منفرد ہیں۔ اسی واسطے محققین شوافع اس کے قائل نہیں۔ منقولات میں سے جہری (بلکہ جملہ) صلوات میں واذا قرأ القرآن فاستمعوا له وانصتوا نقص قطعی ہے۔ اطلاق الفاظ سے قطع نظر خود شان نزول بھی آیت کا تصریح ائمہ کرام حصہ نماز ہے۔ سب سے زیادہ نمازوں میں آثار مرفوعہ و موقوفہ کے تبادر سے عدم قرآنہ مقتدری ثابت ہوتی ہے بلکہ بعض آثار میں وحیدین بھی موجود ہیں۔ مجتہدین حضرات کی جانب سے (اصولۃ الایہ بقائتہ) الکتاب پیش کی جاتی ہے جو حضرت جابرؓ اور امام احمدؓ اور سفیانؓ جیسے حلیل القدر حضرات منفرد کے حق میں فرما رہے ہیں۔ باقی جتنی حدیثیں قرآنہ خلف الامام کے متعلق بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں بعض صحیح نہیں اور جو صحیح ہیں وہ دلالت علی المقصود پر صریح نہیں۔ بایں ہمہ اخاف کی طرف سے جب کبھی اس مسئلہ پر کچھ لکھا گیا ان کی اس میں دفاعی حیثیت ہے۔ اقدام ہمیشہ مجتہدین حضرات سے ہوتا رہا وہ بھی اس طعن کیساتھ کہ اخاف کی نماز مردود اور باطل ہے وغیرہ وغیرہ۔ بقول مرتاکیا نہ کرتا۔ مجبوراً کچھ نہ کچھ لکھنا پڑا۔ حضرت محقق مولانا محمد سر فراز خاں صدقہ زید علیہ نے اس بارے میں ایک مبسوط کتاب احسن الکلام لکھی ہے۔ اس میں بلا مبالغہ محقق مصنف نے بغیر تعصب کے میر حاصل بخش فرمائی ہیں اور اس مسئلہ کے مالہ و ماعلیہ پر کلام مشہج فرماتی ہے: ع

آخر آمد بود فخر الاولین!

شاید اس کے بعد کسی راہ اور مردود کو قلم اٹھانے کا موقع بھی نہ ملے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے صالت باقیات میں اس تصنیف لطیف سے اضافہ فرمادے اور عامۃ المسلمین کو متمتع فرماوے آمین ثم آمین۔  
احقر ابو سعید محمد شفیع عفی عنہ سرگودھا۔

اُسوۃ صاحبین شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد نصیر الدین صاحب غور غشتی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی۔ میں نے کتاب حسن الکلام کی دونوں جلدوں کا مطالعہ کیا نہایت عمدہ اور مفید کتاب ہے اہل اسلام کو مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کا

مطالعہ کریں خصوصاً احناف کو (اور ان احناف کو تو علی الخصوص) اس کا مطالعہ ضروری ہے جو کہ اپنے مذہب کے معتبرات سے ناواقف ہیں۔ وصلى الله على رسوله وخير خلقه محمد وعلى آله واصحابه وجميع امتہ اجمعين۔

مسکین نصیر الدین غورغشوی

## اُستادُ العلماءِ برأسِ المحققین حضرت مولانا محمد شمس الحق صاحبِ افغانی دامت برکاتہم

ترنگ زنی ضلع پشاور

سابق وزیرِ معارف شرعیہ ریاست ہائے متحدہ بلوچستان شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند و شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ اجمیل حالاً شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاول پور

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ نَحْمَدُكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ كَرَّمَكَ اللَّهُ مَا بَعْدَ أَحْسَنِ الْكَلَامِ فِي

تَرَكَ الْقُرْآنُ خَلْفَ الْأَمَلِ تصنیف مولانا ابوالزہرہ محمد سرفراز خاں صفدر کو میں نے بغور خط کیا۔ اس مسئلہ پر قبل ازیں نفیاً و اثباتاً کافی رسائل واجزائے لکھے گئے ہیں لیکن ان سب میں زیر تبصرہ کتاب کی شانِ نزالی ہے۔ مصنف علام کو حفاظتِ اصول و فروع دین و رد غلو غالین و تحریفات مبتدعین میں ایک ممتاز ملکہ حاصل ہے۔ شکر اللہ تعالیٰ مساعیہ احسنہ الکلام کے درجہ میں اور بنیادی اجزاء اٹھ ہیں۔ پہلے حصہ میں مذہب حنفی یعنی منہجیت فاتحہ خلف الامام کو کتاب اللہ و احادیث رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و آثار صحابہ و تابعین و تبع تابعین اور اولہ عقلیہ قیاسیہ و اجتہادیہ ثابت کیا گیا ہے۔ یہ اس حصے کے بنیادی چار اجزاء ہیں۔ دوسرے حصہ میں مخالفین کی دعویٰ کثرت فاتحہ کے دلائل قرآنیہ، حدیثیہ، اثریہ اور عقلیہ کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ دوسرے حصے کے بنیادی چار اجزاء ہیں۔ گویا پہلے حصے میں مذہب حنفیہ کے مثبت پہلو کا بیان ہے اور دوسرے



حقہ میں منفی پہلو کا۔

بہر حال یہ کتاب بلحاظ کثرت مواد، سلاست بیان و ضبط و لائل و رد اشکالات مخالفین اور جامعیت جمیع ابحاث متعلقہ بالموضوع کے لحاظ سے اپنی شان میں بے نظیر ہے۔  
میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف علام کی اس خدمت کو قبول فرمائیں اور مسلمانوں کو اس کتاب سے نفع اٹھانے کی توفیق بخشے۔ آمین

شمس الحق افغانی عفا اللہ عنہ  
جامعہ اسلامیہ بہاولپور

۲۵ محرم ۱۳۹۶ھ

۱۶ مئی ۱۹۷۶ء

## محقق جلیل فاضل لبیب حضرت علامہ مولانا محمد عبدالرشید صانعا دافینوہم

باسمہ سبحانہ و بجمہ الام بعد

بجرامی خدمت مخدوم و مکرم حضرت مولانا صفدر صاحب متع اللہ تعالیٰ المسلمین بفیوضہم  
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔  
وہر کا تہم۔

بفضلہ تعالیٰ آپ کی گراں قدر تصنیف نبیفت احسن الکلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا گیا کہ مطالعہ  
سرسری تھا قیلولہ کے وقت تاہم مستفید ہوا۔ دل سے دعا نکلی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی مشکوٰۃ  
فرماتے۔ آپ نے بحث کا خوب احاطہ کیا۔ بڑی اچھی کتاب لکھی۔ تحقیق الکلام کے جواب کا قرض  
جو حنفیوں کے ذمے چلا آتا تھا مع شے زائد ادا کر دیا۔ جزاک اللہ تعالیٰ عتدا و عن سائر المسلمین  
خیراً۔ گو بعض جگہ بحث کا رنگ غیر مقلدوں (نام نہاد اہلحدیث) کی طرح متعنتانہ ہو گیا، مگر اس  
سلسلہ میں غالباً آپ کا اندر یہ ہو گا کہ خصم نے اس طرز پر مجبور کیا کہ قدیم زمانے سے خصم نے ظلم  
کا یہی طریق اپنا رکھا ہے۔ والہا دی اظلم۔ والسلام

خاکسار نغانی از کراچی

۲۹ شعبان ۱۳۹۵ھ

نوٹ: حضرت علام نے چند غلطیوں کی نشاندہی فرمائی جن کی اب اصلاح کر لی گئی ہے۔ (صفدر)

حضرت العلامة فقیہ جلیل مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم

مہتمم اشرف المدارس ناظم آباد، کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ احسن الکلام کی تحقیق عمیق اور جامعیت دیکھ کر  
بہت مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس محنت کو قبول فرمائیں۔ فقط والسلام

رشید احمد

از اشرف المدارس ناظم آباد، کراچی

۱۳ رمضان ۱۳۹۸ھ

نوٹ: حضرت مفتی صاحب نے بھی چند اغلاط کی اصلاح کا مشورہ دیا۔ جن کی

اس طبع میں اصلاح کر دی گئی ہے۔ (صدقہ)



## دیباچہ طبع سوم

مُبَسِّمًا وَمُحَمَّدًا وَمُصَلِّيًا

اما بعد راقمِ اِثیم اللہ تعالیٰ کے بے حد و لا شمار انعامات و احسانات کا شکریہ کس زبان سے ادا کرے کہ اُس نے محض اپنے فضل و کرم سے اس گنہگار کو جہاں اور جتنی اور مغنوی انعامات سے نوازا وہاں دین کی خدمت اور تالیفِ کتب کا زترین موقع بھی مرحمت فرمایا اور بفضلہ تعالیٰ راقمِ اِثیم کی ہر سہ کتاب اپنی اپنی جگہ مفید ثابت ہوئی۔ فی اللہ تعالیٰ الحمد زیرِ نظر کتاب احسن الکلام کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی سے جو شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی۔ وہ پاک و ہند کے جید اور نامی گرامی علماء کرام کی عمدہ آرا اور بلند پایہ تصدیقات سے بالکل عیاں ہے اور ان حضرات میں سے بعض وہ بزرگ ہستیاں ہیں کہ علمی اور تحقیقی طور پر وہ بین الاقوامی شہرت و حیثیت رکھتی ہیں اور ان کے علم پر عوام تو کیا بلکہ خواص اور مزید براں خواص الخواص کو بھی کلی اعتماد ہے۔ اس دیباچہ میں ہم نہایت ہی اختصار کے ساتھ چند ضروری باتیں عرض کرتے ہیں۔

۱۔ طبع دوم کے دیباچہ میں ہم نے یہ گزارش کی تھی کہ جو حضرات (ان کا نقطہ نظر خواہ کچھ ہی) ہماری کوتاہیوں پر ہمیں آگاہ کریں گے تو ہم ان کا شکریہ ادا کریں گے۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ ہماری یہ آواز صد ابصر ثابت نہیں ہوئی۔ بلکہ خاصی مفید رہی ہے۔ چنانچہ فاضلِ جلیل محقق العصر حضرت العلامة مولانا محمد عبدالرشید صاحبِ نعمانی دامت برکاتہم اور عالمِ بحرِ بنوۃ سلفِ فقہیہؒ

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت فیوضہم کہ اچھی نے بعض اغلاط کی نشاندہی کی جن کی اب تصحیح کر دی گئی ہے اور ہم ان حضرات کے ممنون احسان ہیں۔ اسی طرح ہمارے کرم فرما معترف صاحب نے ترجمان الحدیث میں ایک راوی کی تعیین کے بارے میں غلطی بتائی ہے۔ ہم نے اس کی بھی اصلاح کر دی ہے اور وہ بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں بایں ہمہ اب بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ طبع ہذا اغلاط سے بالکل مبتلا ہے۔ بھلا انسان کا کام اور وہ بھی راقم اثیم جیسے بے بضاعت اور پُر تقصیر کا کام غلطی سے کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ

تم تو چھوٹوں کے طلب گار نظر آتے ہو

میسر دامن میں تو کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں

مگر اب بھی ہم شرح صدر کے ساتھ کہتے ہیں کہ معقول اغلاط کی نشاندہی پر ہم ہر وقت شکرگزاری کے لئے تیار ہیں۔

۳۔ احسن الکلام کے معرض وجود میں آنے کی وجہ سبب تالیف میں باحوالہ مفصل مذکور ہے کہ فریق ثانی امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا فرض قرار دیتا ہے اور نہ پڑھنے والوں کی نماز کو ناقص کا عدم، بیکار اور باطل قرار دیتا ہے۔ اور خفیوں کو بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ کے خطاب سے نوازتا ہے اور حتیٰ کہ احناف کی عورتوں سے بلا طلاق غیر مقلدوں کا نکاح جائز قرار دیتا ہے اور امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے والوں کو کافر اور مخلد فی النار تک ناروا فتووں سے رگیدتا ہے۔ اور ظاہر امر ہے کہ فرضیت قطعی دلیل کے بغیر تو ہر گز ثابت نہیں ہو سکتی اور اہل علم جانتے ہیں کہ قطعی دلیل نص قرآنی، خبر متواتر اور اجماع ہی ہے ان کے علاوہ اور کوئی دلیل قطعی نہیں مگر یقین جانیے کہ فریق مخالف اپنے اس باطل اور بے بنیاد دعوے پر ایک بھی حوالہ اور دلیل نہیں پیش کر سکا اور نہ تا قیامت پیش کر سکتا ہے اور جو غیر متعلق اور بے جان دلائل انھوں نے پیش کیے ہیں ان کا حال احسن الکلام سے بفضلہ تعالیٰ بخوبی واضح ہو چکا ہے اور کتاب کو پڑھنے والا ہر منصف مزاج اس کو سمجھ سکتا ہے۔

۴۔ ترجمان الحدیث میں عین اس دور میں جبکہ تحریک ختم نبوت اپنے عروج پر تھی مسلمان تو کیا حتیٰ کہ خود کو مسلمان کہلانے والے طبقے بھی مرزائیوں کو کافر قرار دینے کے سلسلے میں



قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے اور ہمارے کرم فرما ترجمان الحدیث میں قسط وار احسن الکلام پر برسے ہیں اور اس میں کثیرے نکالنے میں مصروف تھے اور تحریک ختم نبوت کے قائد اور روح رواں حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری المتوفی ۱۳۹۷ھ کو ان کے استاد محترم کی کتاب "نبیل الفرقین" ص ۷۰ کے ایک حوالہ کے پیش نظر بلاوجہ ان الفاظ سے خطاب کیا جا رہا تھا کہ کیا حضرت (مولانا سید محمد انور شاہ صاحب) کا شمیر گئی اور ان کے تلامذہ بالخصوص حضرت بنوری یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اہل بدینہ کا مسلک ترک رفع الیدین تھا ؟ بلقلم (ترجمان الحدیث بابت ماہ نومبر ۱۹۷۴ء، ص ۳۷)۔ ہر سجدہ آدمی بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ایک خالص اسلامی اور مذہبی تحریک کے قائد کو تحریک کے دور میں ان کے استاد محترم کا حوالہ نکال کر کوسنا اور مطعون کرنا اور وہ بھی محض ایک فرعی مسئلہ میں کیا معنی رکھتا ہے ؟ لیکن اس متعصبانہ کا روائی سے اُن کی شخصیت اور عظمت میں کیا فرق پڑا ؟ آخر انھیں کی مبارک قیادت میں یہ مشکل ترین مسئلہ حل ہوا اور قانونی طور پر مرزائیوں کے ہر دو فرقے (قادیانی اور لاہوری) کا فرقرار دیے گئے۔ ولنعلم ما قیل ۷

جنہیں حقیقہ سمجھ کر بچھا دیا تم نے

وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

۴۔ جہور اہل اسلام اور ان میں سے علی الخصوص احناف کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم اس مسئلہ کو اختلافی مسئلہ سمجھتے ہیں اور صرف یہ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ سمیت کسی بھی قسم کی قرأت ممنوع اور مکروہ ہے۔ نہ تو وہ اس مسئلہ میں کسی کی تکفیر کرتے ہیں اور نہ کسی کی منکوحہ بیوی چھیننے کا فتویٰ دیتے ہیں اور نہ کسی کو اس مسئلہ کی وجہ سے فی النار والسرقتک پہنچاتے ہیں مگر فریق ثانی کو لفظ مکروہ بھی خاصا چبھتا ہے۔ چنانچہ ترجمان الحدیث ص ۱۸ بابت ماہ جولائی ۱۹۷۳ء میں مشہور مؤرخ اسلام اور حنفی عالم کا شکوہ ان الفاظ سے کیا گیا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی سے سبھی اہل علم واقف ہیں کسی دور میں ان کا مشہور قول تھا کہ آدمی عیسائی ہو سکتا ہے، غیر مقلد نہیں ہو سکتا یہ بزرگ فاتحہ خلف الامام کو مکروہ خیال کرتے تھے..... الخ بقول ناقل حضرت مولانا شبلی مرحوم کا مشہور قول آخر بلاوجہ توہرگز نہیں ہو سکتا۔ یقیناً اس کی تہ میں کچھ ہوگا اور انھوں نے ضرور کچھ محسوس کیا ہوگا۔ نیز اگر واقعی احناف کی نماز کا لایعنی، بے کار اور باطل ہے اور وہ بھی محض اس لیے کہ وہ امام کے پیچھے سورۃ

فاتحہ نہیں پڑھتے اور نہ اس کے قائل ہیں۔ اور مبتدی طالب علم بھی یہ جانتے ہیں کہ جو حکم امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کا ہے وہی حکم نہ پڑھنے کا حکم دینے کا ہے اور ہر محقق حنفی یہی کچھ کہتا ہے تو غیر مقلدین حضرات اپنے شیخ الکمل مولانا سید ندیر حسین صاحب (المتوفی ۱۳۲۰ھ) کی زندگی بھر کی جمعہ کی نمازوں کے بارے میں کیا فتویٰ صادر فرماتے ہیں کہ آیا ان کی نمازیں ادا ہوئیں یا نہیں؟ کیونکہ لکھنے والوں نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ بلکہ مدت العرشا ہی مسجد (دہلی) کے حنفی امام کے پیچھے نماز جمعہ ادا فرماتے رہے۔ (مقدمہ معیار الحق ص ۱۲۷) اس سے یہ بات بالکل روشن اور عیاں ہو گئی کہ غیر مقلدین حضرات کے شیخ الکمل نہ صرف یہ کہ حنفی امام کو مسلمان سمجھتے بلکہ ان کو اپنے سے بہتر قرار دے کر مدت العمر ان کی اقتدا میں جمعہ کی نماز ادا کرتے رہے۔ لہذا غیر مقلدین حضرات کو اس ناروا غلو اور بے بنیاد دعوے فوراً رجوع کر لینا چاہیے کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کی قرأت نہ کرنے والے اور اسی طرح اس کو ضروری نہ قرار دینے والے مسلمان نہیں یا کم از کم بہتر مسلمان نہیں یا بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ ہیں کیونکہ اس باطل نظریہ سے اخلاف کا تو کچھ نہیں بچو تا۔ البتہ خود ان کے اکابر اس کی زد میں آتے ہیں اور اس باطل دعوے سے خود ان کے بزرگوں کا دامن علم و تقویٰ مطعون و مجروح ہوتا ہے۔ غور کرنا خود ان کا کام ہے:۔

اگر کچھ کم ہے جو کچھ ہو چکا بیدار کرنے کو  
تو کل افسانہ عبرت کے عنوان اور بھی ہوں گے

۵۔ ترجمان الحدیث میں کئی قسطوں میں احسن الکلام پر اکثر وہی اعتراضات قدرے تشریح کے ساتھ بد مزہ سے بد مزہ کر کے پیش کیے گئے ہیں جن کے اصولی طور پر مدلل جوابات بحوالہ احسن الکلام میں مذکور ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت قتادہ مدلس ہیں۔ حضرت ابواسحاق مختلط اور مدلس ہیں۔ محدث ابوالنہیر مدلس ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ ضعیف ہیں۔ محمد بن اسحاق اور نافع اور علامہ ابن عبد الرحمن ثقہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ انہیں یہ کہ فلاں آدمی کے بارے میں احسن الکلام میں تضعیف یا تہشیق کا فلاں جملہ نقل نہیں کیا گیا اور فلاں عبارت کا معنی غلط کیا ہے اور فلاں موقوف حدیث کو مرفوع بنا دیا ہے اور فلاں حوالے میں کتب بیونت کی ہے اور فلاں عبارت کا صحیح مطلب مولف احسن الکلام اپنی جہالت



کی وجہ سے نہیں سمجھ سکا اور فلاں جگہ دجل و قلیس سے کام لیا ہے اور فلاں عبارت کو سیاق و سباق سے الگ کر کے مطلب لیا ہے اور فلاں مقام پر راوی کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن اسی راوی کو متنبہ اور شاہد میں پیش کر کے اس سے احتجاج کیا ہے اور ہمارے فلاں راوی کو ضعیف کہہ دیا ہے اور فلاں راوی کو اپنے ہاتھ کے کرتب سے ثقہ کر دکھایا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن بحوالہ اللہ تعالیٰ اہل علم اور سمجھدار حضرات احسن الکلام کے مضبوط اور ٹھوس دلائل اور روشن حوالوں اور اس کی عمدہ ترتیب اور سلاست سے بخوبی واقف ہیں اور ان تمام رکیک شبہات کا رد اس میں مذکور ہے۔ ہمیں مزید کچھ کہنے اور لکھنے کی مطلقاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ محض کیڑے نکالنے اور اعتراضات کرنے سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ پتھر دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب سیتار تھ پرکاش کے چودھویں باب میں بسم اللہ سے لے کر والناس تک قرآن کریم پر اعتراضات کیے ہیں۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) لیکن اس سے کلام اللہ تعالیٰ کی صداقت و عظمت پر کیا زبردستی یا پڑ سکتی ہے؟ منکرین حدیث مجموعی طور پر کتب حدیث پر بیستے رہتے ہیں مگر اس سے دینی کتب کے اس عظیم ذخیرہ میں کیا کمی اور نقص پیدا ہو سکتا ہے؟ خود غیر مقلد حضرات فقہ حنفی کی مشہور اور متداول کتابوں پر اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کتاب حقیقۃ الفقہ اور نتائج التقليد وغیرہ میں اس امر کا واضح اور واضح ثبوت موجود ہے۔ اور فتاویٰ عالمگیری پر ان کی طرف سے جو اعتراضات کیے گئے ہیں وہ تو قریب کے حلقوں میں پان فروشوں اور انڈے فروشوں تک پہنچ چکے ہیں لیکن اس سے ان کو بجز اپنے دل ماؤف کی بھڑاس نکالنے کے اور کیا فائدہ؟ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ تمام کتابیں بھی موجود ہیں اور ان میں مذکور ہزار ہا مسائل بھی موجود ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق برابر فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اسی طرح اگر بعض مہربانوں کی طرف سے احسن الکلام پر بھی کچھ لایعنی سوالات ہوئے ہیں یا ہوتے ہیں تو اس سے اس کے صحیح دعاوی اور قوی دلائل اور حکم برہین میں کیا فرق پڑتا ہے۔ اہل خرد جانتے ہیں کہ نہری لفاظی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا

غواص کو مطلب تک صدف سے کہہ کرے

۱۔ ہماری دانست میں ترجمان الحدیث میں احسن الکلام پر کیے گئے جملہ اعتراضات میں

صرف دو باتیں علمی طور پر قابل توجہ ہیں۔ ممکن ہے بعض اہل علم کو ان سے مغالطہ پیدا ہو۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہاں نقل کر کے قدرے تفصیل سے ان کے جوابات عرض کر دیے جائیں تاکہ کسی کو غلط فہمی پیدا نہ ہو اور صحیح بات بھی سامنے آجائے۔

اقل ہم نے احسن الکلام میں اسرائیل عن ابی اسحاق کی ایک سند سے استدلال کیا تھا۔ اس سچ گرفت کرتے ہوئے ترجمان الحدیث ماہ جون ۱۹۷۴ء میں صفحہ ۲۸ تا ۲۹ اس مشہور محدث اور صحیحین کے مرکزی راوی امام ابواسحاق کے اختلاط اور ان کی تدلیس پر خاصی لا حاصل بحث کی ہے جس کی چند اہم اور مرکزی باتیں یہ ہیں:

(۱) حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ بخاری میں ان سے بجز ان کے اصحاب قدمائے اور کوئی روایت میں نہیں دیکھی۔ (ہدی الساری جلد ۲ ص ۱۹۹)

(۲) ابواسحاق مدلس تھے اور ان کا غنہ صحت حدیث کے منافی ہے اور آخر عمر میں اختلاط اور تغیر کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ (ترجمان مذکور ص ۲۸)

(۳) زہیر کی روایت عن ابی اسحاق امام بخاری اور محدث مبارکپوری کے نزدیک صحیح ہے۔ کیونکہ امام ابوداؤد زہیر عن ابی اسحاق کو اسرائیل عن ابی اسحاق سے بدرجہا بہتر قرار دیتے ہیں اور بقول امام احمد اسرائیل نے ابواسحاق سے اختلاط کے بعد بھی سنا ہے۔ (ص ۲۷) لہذا ان کو ان پر کوئی مزیت حاصل نہیں۔  
الجواب: یہ جو کچھ لکھا گیا ہے دفع الوقتی کے سوا کچھ نہیں ترتیب وار جوابات ملاحظہ کیجیے:

(۱) خود حافظ ابن حجر ہی امام ابوزرعرہ امام ابو حاتم رحمہ اور امام احمد رحمہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ زہیر نے ابواسحاق رحمہ سے آخر عمر میں ابواسحاق رحمہ کے غلط ہونے کے بعد سماعت کی ہے۔ (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۵۲)

اور زہیر کی ابواسحاق رحمہ سے بخاری ج ۱، ص ۲۷، ج ۱ ص ۳۹، ج ۱ ص ۲۲۷ وغیرہ میں باتیں موجود ہیں اور حافظ ابن حجر رحمہ زکریا بن ابی زائدہ رحمہ کے بارے میں امام احمد رحمہ اور محدث عجل رحمہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے ابواسحاق رحمہ سے آخر عمر میں سماعت کی ہے۔

(دیکھیے تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۳۰)

اور زکریا بن ابی زائدہ رحمہ کی ابواسحاق رحمہ سے روایت بخاری ج ۱ ص ۲۲۲ وغیرہ میں موجود ہے۔



اور خود معترض مذکور امام ابو داؤد درج کی تحقیق کے پیش نظر اسرائیل رح کی ابواسحاق رح سے روایت ان کے اختلاط کے بعد بھی تسلیم کرتے ہیں اور بخاری ج ۱ ص ۵۰۵ و ۵۱۲ وغیرہ میں اسرائیل رح عن ابی اسحاق رح کی سند سے کئی روایات موجود ہیں پھر یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ بخاری میں ابواسحق رح کے ان قدیم شاگردوں کی روایات ہی مذکور ہیں جنہوں نے ان سے اختلاط سے قبل سماعت کی ہے۔ بس یہی کہا جائے گا کہ ابواسحق رح ایسے مختلط ہوئے ہی نہیں کہ ثقاہت سے گرجائیں اور اسرائیل رح کی روایت ابواسحاق رح سے اثبت اور راجح ہے۔ ہاں بعض کے نزدیک اگر آخر عمر میں ان کے حافظہ میں کچھ تغیر ہوا ہے تو اس دور میں نہ سیر نے ان سے سماعت کی ہے۔

(۲) اگرچہ امام بخاری رح اور مبارک پوری صاحب کے نزدیک نہ میر عن ابی اسحق رح کی روایت راجح ہے مگر امام ابو زرعہ رح، امام ابو حاتم رح، امام احمد رح اور امام ترمذی رح وغیرہم حضرات کی تحقیق کے لحاظ سے نہ میر کی ابواسحاق رح سے روایت کمزور ہے اور ابو داؤد رح کے علاوہ باقی تقریباً تمام حضرات اسرائیل رح عن ابی اسحاق رح کو اصح اور راجح قرار دیتے ہیں اور اس کے متعلق احسن الکلام میں واضح حوالے موجود ہیں وہیں ملاحظہ کر لیں۔ یہاں ان کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

(۳) اسرائیل رح کے بارے میں امام احمد رح کی یہ رائے کہ انھوں نے ابواسحاق رح سے آخر عمر میں سماعت کی منفرد رائے ہے اور باقی حضرات اسرائیل رح عن ابی اسحاق رح کو اثبت کہتے ہیں لہذا جمہور کے نزدیک اسرائیل عن ابی اسحق رح کی سند بلاشبہ صحیح اور راجح ہے۔

دوم۔ احسن الکلام میں ابوالزبیر عن جابر کی ایک سند سے احتجاج کیا گیا تھا اس پر کلام کرتے ہوئے ترجمان الحدیث ماہ فروری ۱۹۷۴ء تا ۲۹ ماہ مارچ ۱۹۷۴ء ص ۳۸ تا ۴۸ میں مشہور محدث ابوالزبیر (محمد بن مسلم بن تدریس) کے عنعنہ پر طویل اور ناکام بحث کی ہے جس کے مرکزی نکات یہ ہیں:

(۱) ابوالزبیر مدلس تھے اور محدثین کرام رح کی خاصی جماعت نے ان کے مدلس ہونے کا ذکر کیا ہے اور بعض محدثین کے حوالے بھی انھوں نے ذکر کیے ہیں۔

(۲) ابوالزبیر کی لیث رح کے طریق اور سند سے عنعنہ والی روایت تو صحیح اور قابل قبول ہے مگر اس کے علاوہ ابوالزبیر رح کی کوئی روایت جو عنعنہ سے ہو قابل قبول نہیں ہے اس پر

بھی چند حوالے انھوں نے نقل کیے ہیں۔

(۳) ابوالزبیرؓ کی جن روایات میں تحدیث ہے وہ تو قابل قبول ہیں اور جن روایات میں ان کا عنعنہ ہے اور وہ لیکٹ کے طریق سے بھی نہیں تو چونکہ دیگر حضرات صحابہ کرام رض سے بھی وہ روایات مروی ہیں۔ بنا بریں اگر ابوالزبیرؓ کے سماع کی تصریح ان مخصوص الفاظ سے نہ بھی ملے تب بھی صحت حدیث پر کوئی حرف نہیں آتا۔ (محصلاً)

الجواب۔ معترض صاحب نے یہ جو کچھ بھی کہا ہے ان کو سودمند نہیں ہے۔

اول تو اس لیے کہ بلاشبہ ابوالزبیرؓ کا نام مدلسین کی فہرست میں موجود ہے۔ اس کا کسی کو انکار نہیں جتنے حوالے اس سلسلہ میں معترض صاحب نے نقل کیے ہیں اگر ہم چاہیں تو بحمد اللہ تعالیٰ ان سے دو گئے حوالے مزید نقل کر سکتے ہیں لیکن ابوالزبیرؓ رح ان مدلسین میں شامل ہیں جن کی تدلیس مضر نہیں اور احسن الکلام میں توجہ النظر کے حوالہ سے اس کی بحث موجود ہے جس کی قدر سے تفصیل یہ ہے کہ علامہ جزائریؒ نے حافظ ابن حزمؒ کے حوالہ سے مدلسین کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ پہلی قسم ان مدلسین کی ہے جو حافظ و عادل ہوں اور ان کے بارے میں وہ تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

وسواء قال اخبرنا فلان او قال عن فلان  
او قال فلان عن فلان كل ذلك واجب قبوله  
ما لم يتيقن انه اور د حدیثاً بعينه  
ایراد غیر مسند فان ايقنا ذلك  
تركنا ذلك الحديث وحده فقط و  
اخذنا سائر رواياته.....  
وهذا النوع منهم كان حلة  
اصحاب الحديث وائمة المسلمين  
كالحسن البصري وابي اسحاق  
السبيعي وقتاده بن دعامة وعمر  
بن دينار وسليمان الاعمش وابي  
اور برابر ہے کہ وہ مدلس اخبرنا فلاں کہے یا  
عن فلاں کہے یا قال فلاں عن فلاں کہے ان سب  
صورتوں میں اس کی روایت واجب القبول ہے  
جب تک کہ یہ یقین نہ کر لیا جائے کہ اس نے کوئی  
حدیث غیر مسند پیش کی ہے اور جب ہمیں اس کی  
یقین ہو جائے کہ اس نے فلاں حدیث مسند بیان  
نہیں کی تو ہم صرف وہی روایت اس کی ترک کریں گے  
اور باقی اس کی تمام روایات لیں گے.....  
اور اس قسم میں بڑے بڑے محدثین اور ائمہ المسلمین  
شامل ہیں جیسے حسن بصریؒ ابواسحاق السبیعیؒ  
قادہ بن دعامہ، عمرو بن دینار، سلیمان الاعمش،



الزبیر وسفیان الثوری وسفیان بن عیینہ  
عیینۃ ۱۵ کتاب الاحکام فی

اصول الاحکام ج ۲ ص ۱۲۱ لابن  
حزم وتوجیہ النظر ص ۲۵۱ للجزائری

۱ اہل علم جانتے ہیں کہ بیشتر صحیح احادیث کے روایات یہی حضرات ہیں اس عبارت سے یہ ضابطہ معلوم ہوا کہ ان مذکور حضرات کی جن میں ابو الزبیر رحمہ بھی شامل ہیں معنعن احادیث مطلقاً قابل قبول ہیں اور ان کی صحت میں کوئی کلام نہیں اور امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ وغیرہ چوٹی کے محدثین نے ان حضرات کی معنعن روایات سے استدلال کیا ہے چنانچہ حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ

وفي الصحيح قطعة من الاحتجاج  
بمعنة المدلس كابي الزبير عن جابر  
وسفیان عن عمرو بن دينار ونظائر  
كثيرة لذلك - (تمهيد سنن ابی داود،  
جلد ۷ ص ۹۸)

امام بخاریؒ نے ابو الزبیرؒ کی مقرون بعظم کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ جلد ۱ ص ۲۹۱ اور  
جلد ۱ ص ۹۸ و جلد ۱ ص ۲۳۳ میں ابو الزبیرؒ عن جابر رضی کو متابعات میں پیش کیا ہے اور اسی طرح جلد  
۱ ص ۱۷۴ میں بھی لیکن کتابت کی غلطی سے ابو الزبیرؒ کی جگہ ابو زید لکھا گیا ہے۔

(دیکھیے مصری نسخہ بخاری مع شرح فتح الباری جلد ۳ ص ۲۳۱ و عمدة القاری جلد ۸ ص ۱۲)  
بلکہ امام بخاری رحمہ نے ابو الزبیرؒ عن جابر رضی کی سند سے احتجاج بھی کیا ہے۔ اہل علم بخیر جانتے  
ہیں کہ امام بخاری رحمہ فقہی مسائل بیان کرنے کے لیے باب ترجمہ اور عنوان قائم کرتے ہیں اور علماء  
کا مشہور مقولہ ہے فقہ البخاری فی الابواب والتراجم۔ پھر اس دعوے کے اثبات کے لیے  
کبھی تو وہ مسند اور مرفوع روایت پیش کرتے ہیں اور کبھی معلق روایت اور کوئی اثر  
نقل کرتے ہیں اور اس طریقے سے وہ اپنے دعوے کو مدلل اور مبرہن کرتے ہیں۔ امام بخاریؒ





احتجاج کیا ہے کیا ان میں سے ہر ہر روایت کسی اور صحابی سے بھی امام مسلمؒ نے روایت کی ہے تاکہ ان کی معنعن روایات پر حرف نہ آئے ؟ اگر معترض صاحب صحیح مسلم میں سے انھیں مضامین کی روایت جو ابوالزہیر رحمہن جابر رضی کے طریق سے مروی ہیں دیگر حضرات صحابہ کرام رضی کی روایات سے باحوالہ بتادیں تو ہم علمی اور تحقیقی طور پر ان کے احسان مند ہوں گے۔ دو چار روایتوں میں ایسا کر دکھانا کوئی کمال نہ ہوگا۔ ہر ہر روایت اور مضمون میں یہ مطلوب ہے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے اور یقین جانے کہ وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکیں گے تو اس سے لازم آیا ہی سمجھا جائے گا کہ مسلم شریف کی بے شائبہ شہادتیں ان کے اس غلط نظریہ سے غیر صحیح قرار پائیں گی اور صحیحین کی صحت کے بارے میں ان حضرات کا دعویٰ محض زبانی جمع خیرچ تصور ہوگا جیسا کہ مخفی نہیں۔

اس کے علاوہ اور بھی سطحی قسم کے اعتراضات اور بزرگم خود جو ابابا تہرجان الحدیث میں موجود اور مذکور ہیں لیکن ہمارا دیا تھا یہ نظریہ ہے کہ ان سے کسی اہل علم اور صاحب بصیرت آدمی کو کوئی شبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہذا ہم ان کو نقل کر کے قارئین کرام کے اذہان کو بلاوجہ اور بے ضرورت پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ وصلى الله تعالى على خير خلقه محمد وعلى آله واصحابه واتباعه الى يوم الدين وبارك وسلم۔

احقر الناس

ابوالزہیر محمد سرفراز

۱۴ صفر ۱۴۰۰ھ

۵ جنوری ۱۹۸۰ء

## دیباچہ طبع دوم

الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفَى وَسَلَّمَ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى

(۱) بعض غیر مقلدین حضرات نے یہ بے جان دعویٰ کیا تھا کہ جس شخص نے ہر رکعت میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز بے کار، باطل اور کالعدم ہے اور اس پر تمام دنیا کے احاف کو کھلا چیلنج بھی کیا تھا۔ راقم اشیم نے ان کے اس غلو کے رد میں ٹھوس دلائل کے ساتھ دو جلدوں میں مبسوط کتاب احسن الکلام لکھی جس کو نہ صرف یہ کہ عام تعلیم یافتہ حضرات ہی نے پسند کیا بلکہ ہندو پاک کے متبحر اور نامور علماء کرام نے اس کی بیحد تعریف کی اور اپنی زرین اور قیمتی آرا اور تصدیقات سے راقم کی عزت افزائی کی اور کتاب کی اغلاط کی طرف بھی توجہ دلائی جو بمقتضائے بشریت کچھ تو راقم سے اوکچھ کتابت کی وجہ سے اور بعض کاپیوں اور پروفوں کی کما حقہ تصحیح نہ ہو سکنے کی وجہ سے باقی رہ گئی تھیں جن حضرات نے نمایاں غلطیوں کی نشاندہی کی ان میں علی الخصوص سنہ العلماء رئیس المحققین حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا ابو عبیدہ غلام سرور صاحب دام مجید (چمن ضلع گجرات) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور راقم تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

(۲) جہاں ان حضرات نے اس کتاب کے مضبوط دلائل اور براہین اور حسن ترتیب کی شاندار تحسین کی وہاں غیر مقلدین حضرات نے اس پر ضرورت سے زیادہ غم و غصہ کا اظہار فرمایا چنانچہ



ان کی جماعت کے چوٹی کے مدرس عالم اور سابق شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ فیصل آباد نے ایک مستقل کتاب خیر الکلام تحریر فرمائی جس میں جوابات کا بیشتر حصہ محض سینہ زاد جوابات اور صدی نسخوں پر مشتمل ہے۔ اس کا یہ احتمال ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یوں لینا چاہیے۔ اور اس کا مطلب یوں بھی لیا جاسکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر بات ہے کہ احسن الکلام کے ٹھوس اور معنی خیز حوالوں کا جواب محض احتمالات اور سینہ زاد باتوں سے نہیں ہو سکتا یہاں ٹھوس حوالہ جات درکار تھے اور یہی ان کے بس کا روگ نہ تھا اور روایات کے بارے میں وہ ساری کتاب میں ایک ہی ضابطہ سے کام لیتے رہے ہیں وہ یہ کہ جرح مفسر کو بھی جرح مبہم گردان کر اور ایک دو حوالے راوی کی توثیق کے نقل کر کے یہ فیصلہ صادر فرماتے ہے کہ لہذا جو جرح مؤلف احسن الکلام نے کی ہے وہ مبہم ہے اور توثیق کے بعد اس کا کوئی اعتبار نہیں اور کہیں تطرق کا سہارا لیکر حدیث کو حسن بنا ڈالا ہے۔ خیر ہم نے بقدر وسعت طبع ثانی میں اس کا خوب جائزہ لیا ہے۔ مؤلف خیر الکلام نے احسن الکلام کو لوگوں کی نظروں سے گرانے کیلئے اور اپنی جماعت کے جذباتی حضرات کے جذبات کو اُجھانے کیلئے آخر میں سترہ عدد مناقشہ بھی مسج فرمائے ہیں جن کا ذکر کتابیں پہلے بھی ہونے پر خیال میں مناسب مقامات پر کر چکے ہیں اور یہ چیز ان کے پیش نظر رہی ہے کہ احسن الکلام کی اغلاط ان کے حواریوں کے ذہن میں انقش فی الحجر ہو جائیں اور اس کتاب سے اور اس کے مصنف سے بدظنی پیدا ہو جائے۔ مثلاً ایک جگہ یہ تھا کہ حضرت امام عبداللہ بن المبارکؒ حضرت امام بخاریؒ کے استاد الاستاذ تھے۔ الاستاد کا لفظ کتابت سے چھوٹ گیا تو اس پر مناقشہ کھڑا کر لیا گیا کہ اس مؤلف کو یہ بھی معلوم نہیں کہ امام ابن مبارکؒ، امام بخاریؒ کے استاد نہیں ہیں۔ اور ایک مقام پر فقہاً امامت کا جملہ غلطی سے رہ گیا تو اس پر بھی خوب مصالحہ لگا کر مناقشہ کی عمارت کھڑی کر دی گئی اور ایک جگہ قتادہ کا نام سند سے چھوٹ گیا تو اس کو کئی مقامات پر انھوں نے اُجاگر کیا اور یہ لکھا کہ چونکہ یہ تیسرے درجہ کے مدلس تھے۔ تب ان کو گرا دیا گیا ہے۔ حالانکہ راقم نے خود احسن الکلام میں باحوالہ یہ لکھا ہے کہ قتادہؒ کی تدلیس سرے سے مضرب نہیں تو پھر اس کو حذف کرنے کا راقم کو کیا فائدہ تھا؟ و علیٰ ہذا القیاس۔ اکثر مناقشہ اسی نہج کے ہیں اور جہاں بعض عبارتیں مجمل اور مختصر تھیں۔

اب ان کی تشریح کر دی گئی ہے اور جہاں اغلاط معقول نظر آئیں۔ ان کی اصلاح کر لی گئی ہے۔ ہم نے جب ان کی کتاب میں اسی نہج کے بلکہ ان سے سنگین تر مناقشات کا تتبع کیا تو تقریباً ساٹھ سے زیادہ نظر آئے۔ اگر ضرورت پڑی اور ہم مجبور کر دیے گئے تو الگ ان کو شایع کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ ورنہ علمی اور تحقیقی میدان میں ہم اس طعنہ باری کو پسند نہیں کرتے اور نہ اس کا اثر اچھا رہتا ہے۔ ان مناقشات کو انھوں نے فہرست کتاب میں غلط بیانیوں، تحریفیات اور مغالطات وغیرہ سے تعبیر کر کے اپنے دل کی خوب بھڑاس نکالی ہے۔ سچ ہے کُلُّ اِنَّا عِیَّتْ رَشَعٌ بِمَا فِیْہِ۔

(۳) غیر مقلدین حضرات جب بخوبی یہ محسوس کر لیا کہ خیر الکلام تو احسن الکلام کا معقول جواب نہیں اور علماء تو کیا جذباتی مزاج جماعتی کارکن بھی اس سے مطمئن نہیں ہو سکتے تو ایک صاحب نے الاعتصام میں قسط وار احسن الکلام کی تردید شروع کر دی جس میں انھوں نے علمی اور تحقیقی سطح سے بہت ہی نیچے اتر کر محض تعصب مذہبی کا مظاہرہ کیا ہے اور اس میں بیشتر وہی باتیں دہرائی ہیں جو پہلے حضرات مسئلہ خلف الامام کے سلسلہ میں لکھ اور کہ چکے ہیں۔ ہاں البتہ یہ سب کچھ انھوں نے صرف جذبات اور تعلیٰ کی صورت میں ادا کیا ہے ان کی قابل جواب باتوں کا ذکر ہم نے کتاب میں کر دیا ہے۔ باقی لایعنی باتوں کی طرف مطلقاً توجہ نہیں کی۔ البتہ انھوں نے الاعتصام اور مغالطات احسن الکلام میں جو باتیں خوب کھل کر چیلنج بازی کی شکل میں کہی ہیں وہ اصولاً و اختصاراً یہ ہیں:

(۱) مؤلف احسن الکلام نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی عبارت سے دھوکا دیا ہے

..... الخ

اس کا جواب اور حضرت شاہ صاحب کی پوری عبارت ہم نے طبع دوم میں ذکر کر دی ہے اور واضح کیا ہے کہ غلطی کس کی ہے؟

(۲) کہ مؤلف احسن الکلام نے محمد بن خازم کی امام ابن حبان سے یہ توثیق تو نقل کر دی ہے کہ وہ ثقہ اور متقن تھا مگر آخر کا یہ قول نقل نہیں کیا کہ وہ ضعیف مرجع تھا اور یہ بددیانتی ہے۔ (محصلاً)



مگر یہ بیچارے اصول حدیث سے بالکل کورے ہیں۔ محمد بن خازمؒ بخاری اور مسلم کے مرکزی راوی ہیں اور اصول حدیث کے رو سے ثقہ راوی کا خارجی یا جہمی معتزلی یا مرجئی وغیرہ ہونا اس کی ثقاہت پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا اور صحیحین میں ایسے راوی بکثرت موجود ہیں۔ تدریب الراوی اور ہدایت السائل میں ان کی کچھ نشاندہی کی گئی ہے اور خود مؤلف خیر الکلام ص ۲۹۰ میں لکھتے ہیں: ”کہ ارجار وغیرہ بدعات کے اعتراضات سے ثقہ ہونے میں خلل پیدا نہیں ہوتا..... الخ“

یہ قاعدہ ہمارے پیش نظر تھا اور اس لیے ہم نے یہ جملہ نقل نہیں کیا اور خود جناب قاضی مقبول احمد صاحب کا یہ عالم ہے (اور حیرت ہے کہ الاعتصام کے ذمہ داروں نے بھی اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کی) کہ عبد الرحمن بن محمد بن زیاد جو صحاح ستہ کے راوی ہیں ان سے متعلق لکھا ہے کہ انتہا درجہ کے ضعیف ہیں۔ (الاعتصام ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۸ کالم ۳۔) (۳) کہ مؤلف احسن الکلام نے راویوں کے بارے میں توثیق و تضعیف نقل کرنے میں خیانت اور بددیانتی سے کام لیا ہے۔ مثلاً فلاں ضعیف راوی کے بارے میں فلاں امام نے کہا ہے کہ وہ ثقہ ہے مگر اس قول کو وہ نقل نہیں کرتا اور فلاں ثقہ راوی کو فلاں امام نے ضعیف یا وہمی وغیرہ کہا ہے۔ اس کو بھی وہ پی گیا ہے۔ (مصلہ)

اور الاعتصام میں ان صاحب کا بیشتر مضمون اسی عمارت پر کھڑا ہے اور خوب جذباتی رنگ میں صفحہ صفحہ پر اس کو نمایاں کیا گیا ہے مگر صد افسوس ہے کہ احسن الکلام کی اس عبارت کا ذکر تک نہیں کیا۔ حالانکہ ان کا اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ اس کا حوالہ دیتے۔ چنانچہ عبارت یوں ہے: ”ہم نے بعض مقامات پر ثقہ راویوں سے متعلق ثقاہت اور عدالت کے اقوال تو نقل کر دیے ہیں، لیکن اگر بعض ائمہ کا کوئی جرحی کلمہ ملا ہے تو وہ نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی ضعیف اور کمزور راوی کے بارے میں کسی امام کا کوئی توثیق کا جملہ ملا ہے تو اس کو بھی درخور اعتدال نہیں سمجھا کیونکہ فن رجال سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے حضرات بھی بخوبی اس امر سے واقف ہیں کہ ایسا کوئی بھی ثقہ جس پر جرح کا کوئی کلمہ منقول نہ ہو یا ایسا ضعیف جس کو کسی ایک شخص نے بھی ثقہ نہ کہا ہو کبریت احر کے مترادف ہے۔ حضرات

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کس سے مخفی ہے؟ اور الصحابة کلہم عدول کے جملہ سے کون اہل علم و اوقاف ہے؟ مگر خوارج و روافض کا نظریہ بھی ان کے بارے میں پوشیدہ نہیں ہے۔ بایں ہمہ ہم نے توثیق و تضعیف میں جمہور ائمہ جرح و تعدیل اور اکثر ائمہ حدیث کا ساتھ اور دامن نہیں چھوڑا مشہور ہے کہ: ع زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو انتہی بلفظہ

(احسن الکلام جلد اول، طبع اول ص ۱)

یہ عبارت بار بار پڑھیے اور داد دیجیے قاضی مقبول احمد صاحب کے دواویلا کی کہ مؤلف احسن الکلام نے روایت کے بارے میں بددیانتی کی ہے فلاں راوی کے بارے میں فلاں قول ترک کر دیا ہے اور فلاں راوی کے بارے میں فلاں امام کا حوالہ چھوڑ دیا ہے اور الاعتصام میں قاضی صاحب کا زیادہ زور اسی پر صرف ہوا ہے۔ ان کو یہ تو حق تھا کہ اس قاعدہ کو دلائل سے غلط ثابت کرتے۔ لیکن اس واضح عبارت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مؤلف احسن الکلام کو بددیانت ثابت کرنا خالص تعصب کا مظاہرہ یا اپنے ناخواندہ حواریوں کو خوش کرنے کا ایک مذموم ڈھنگ ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ مؤلف احسن الکلام کو کالمین سے خوشہ چینی کا موقع ملا ہے اور اصول و ضوابط کو سمجھنے کی اللہ تعالیٰ نے اس کو اہلیت مرحمت فرمائی ہے۔ (۴) عبد اللہ بن نافع بن عمار کے متعلق جو توثیق کے الفاظ مؤلف احسن الکلام نے نقل کیے ہیں اس میں دھوکہ اور بددیانتی سے کام لیا ہے۔ (محصلاً)

الحجاب۔ اصل بات یہ ہے کہ تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۵۰ اور ۵۱ میں (نمبر ۹۷ اور ۹۸) دو راوی ہیں۔ ایک کا نام عبد اللہ بن نافع بن عمار ہے اور دوسرے کا نام عبد اللہ بن نافع بن ابی نافع الصائغ الخزومی ہے۔ غلطی سے ثانی کا ترجمہ پہلے کے ترجمہ میں نقل ہو گیا ہے۔ اور اب طبع دوم میں اس کو بالکل کاٹ دیا گیا ہے۔ ایسے ہم نام راویوں کے بارے میں بڑے بڑے اکابر محدثین سے غلطیاں چلی آ رہی ہیں۔ نہ تو ان کو کسی نے دعوت مبارزت دی اور نہ بددیانت کہا ہے اور ان کی بات ہی چھوڑیے خود مؤلف خیر الکلام بعض مقامات میں اس غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ خیر الکلام ص ۴۲۴ میں لکھتے ہیں: کہ دوسرا راوی اس میں علی بن احمد الحامی مقرئ ہے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں ابن ابی الفوارس کہتے



ہیں۔ ضعیف جداً سخت ضعیف ہے۔“

(میزان جلد ۲، ص ۲۱۷، لسان المیزان جلد ۲، ص ۱۹۲)

لیکن یہ مؤلف خیر الکلام کی غلطی اور نرا دہم ہے۔ کیونکہ ابن ابی الفوارس نے جس کی تضعیف کی ہے وہ علی بن احمد بن ابی القیس المقرئ الرفاعی ہے جس کی وفات ۳۵۲ھ میں ہوئی ہے۔ دیکھیے: (لسان المیزان جلد ۲، ص ۱۹۲) اور ہماری پیش کردہ سند میں علی بن احمد بن عمر بن حفص ابو الحسن المقرئ المعروف بابن الحامی ہیں جن کی وفات ۴۱۷ھ میں ہوئی ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ بغدادی جلد ۱۱، ص ۳۳۰)

الغرض ہم نام راویوں کے بارے میں ایسے اوہام کا پیش آجانا کوئی مستبعد بات نہیں ہے اور نہ کسی دیانت دار عالم نے آج تک ایسے امور میں کسی کو چیلنج کیا ہے۔

(۵) بایں ہمہ ہم نے الاعتصام میں پیش کیے گئے اعتراضات میں سے جو قابل جواب تھے ان کی قدرے وضاحت کر دی ہے اور ہم ان غیر مقلدین حضرات کے ممنون ہیں کہ انھوں نے احسن الکلام پر ناقدانہ نگاہ ڈالی گو ان کا نظریہ ان کا مذہبی تعصب ہے تاہم وہ شکر یہ کے مستحق ہیں۔

(۶) مؤلف خیر الکلام سے ہم بجا توقع رکھ سکتے تھے کہ وہ اپنی جماعت کے مدرس عالم اور شیخ الحدیث ہیں کہ وہ اپنی جماعت کے ان غالی لوگوں کو ناصحانہ طور پر ترک غلو کا کوئی مفید مشورہ دے دیتے اور چند سطریں اس پر بھی تحریر فرما دیتے کہ جو لوگ ترک قرآن خلف الامام کی صورت میں لوگوں کی نمازوں کو باطل، بے کلام اور کالعدم کہتے ہیں وہ اعتدال کی راہ اختیار کریں۔ اختلافی مسائل میں یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے لیکن یقین جانیے کہ انھوں نے صحیح طور پر آج کل کی عدالتی وکالت کا حق ادا کر دیا ہے کہ ہر طرح سے اپنے منوکل کو خواہ وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو سچا ثابت کیا جائے یہ الگ بات ہے کہ عدالت اس کی راتے سے متفق نہ ہو اور اس کو مجرم گردان کر قرار واقعی سزا دے۔ اپنی جماعت کے تمام عیبوں پر پردہ ڈال کر اس کو برحق قرار دینے پر بلاوجہ ایٹری چوٹی کا زور لگانا کوئی مستحسن امر نہیں ہے۔ ان سے تو خیر الکلام کے صاحب مقدمہ ہی قدرے اچھے رہے کہ انھوں نے ص ۷۷ میں کچھ اشارہ

کیا ہے اگرچہ اپنی جماعت کے چیلنج کو مدافعت کہ کر حق پوشی کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مجھے اعتراف ہے کہ اس سلسلے میں ہمارے بھائیوں کے حملوں کی مدافعت میں رد کے طور پر جماعت اہل حدیث کے ایک قلیل طبقے کا ایسا رویہ ضرور رہا کیا جو غیر معتدل ہونے کے علاوہ مسلک اہل حدیث کے شایان شان نہ تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غلو کے مقابلہ میں غلو ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔“ ۱۰

اگر تو کسی حنفی نے تمام روئے زمین کے غیر مقلدین حضرات کو ایسا کوئی چیلنج کیا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھتا ہے۔ اس کی نماز باطل ہے، بیکار ہے، کالعدم ہے۔ تو وہ بلا شک اس کو مدافعت سے تعبیر کر سکتے ہیں اور اگر ایسا نہیں کیا تو یہ خالص جماعتی ملی بھگت ہی ہے کہ سیدھی سادھی بات میں تاویل کا پیوند لگا کر اس کو حق ثابت کیا جائے۔ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ اَنْفُسِنَا۔

(۷) اگرچہ اپنی دانست کے مطابق ہم نے اب کتاب کو اغلاط سے پاک کر دیا ہے۔ تاہم ان حضرات کا (خواہ ان کا نقطہ نظر کچھ ہی ہو) شکریہ ادا کریں گے جو ہمیں ہمارے کوتاہیوں کا آگاہ کریں گے۔ اور ہمیں معقول اغلاط کی درستی میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ انشاء اللہ العزیز۔ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی اٰخِرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهِ وَاَصْحَابِهِ اَجْمَعِينَ ۝

ابوالتراب  
۲۴ شوال ۱۳۸۴ھ  
۲۸ فروری ۱۹۶۵ء



# دیباچہ طبع اول

کتاب احسن الکلام جلد اول و دوم کی تالیف و ترتیب میں گو بڑی محنت اور کوشش سے کام لیا گیا تھا مگر اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس کو صفت اول کے محقق اور جید علماء کرام بھی بے حد پسند فرمائیں گے جیسا کہ تصدیقات اور تقاریط سے بھی ظاہر ہے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اُس نے اس حقیر سے یہ خدمت لی ہے۔ ورنہ من انعم کم من داعم۔

میں اپنی اس کتاب کا حضرت الاستاد المحقق، المدقق، الفقیہ، المحدث، شیخ المعقول، والمنقول مولانا عبد القدیر صاحب کیمیل پوری دامت برکاتہم (حال اوکاڑہ) کے نام گرامی سے انتساب کرتا ہوں کیونکہ اس حقیر کا دینی کتب کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق حضرت موصوف کی خالص توجہ اور نوازش کا رہین منت ہے اور اکثر بڑی اور دقیق کتابیں راقم نے حضرت سے ہی پڑھی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو تادیر سلامت رکھے اور دین کی خدمت کا مزید موقع دے۔ ع

”وَبِرَحْمَةِ اللَّهِ عَبْدًا قَالَ آمِينَ“

احقر

ابوالزاید

۱۸ ذوالقعدہ ۱۳۷۴ھ

۹ جولائی ۱۹۵۵ء

# سخن ہائے گفتنی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ - وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ  
وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ ط

عالم انسانی میں ہر چیز کا وجود اسباب و علل اور محرکات و دواعی کے وجود پر موقوف ہے۔ جب تک علت وجود اپنے تمام لوازم کے ساتھ معرض وجود میں نہ آجائے کسی چیز کا عالم وجود میں آنا ممکن نہیں یہ ایک عقلی اور فطری قاعدہ ہے۔ اور انسانی افعال و اغراض کا ناگزیر محور جس کے گرد انسان کے سبب افعال چکر لگاتے اور گھومتے رہتے ہیں۔

## سبب تالیف

علی اور علی، فنی اور تحقیقی لحاظ سے قرآۃ الفاتحہ خلف الامام کا مسئلہ اپنے مثبت اور منفی پہلو کے اعتبار سے قرن اول سے تاہنوز بحث و تمحیص اور تطبیق و ترجیح کا محتاج رہا ہے۔ حضرات ائمہ دین و محققین علماء نے مختلف زمانوں اور متعدد زبانوں میں اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کی ہے۔ محرم اور مہج پہلو اور راجح و مرجوح گوشہ کی تلاش اور جستجو میں انھوں نے انتہائی کوشش اور کاوش کی ہے۔ اور سینکڑوں کتابیں اور رسالے اس پر لکھے گئے ہیں۔ مگر اس خاص شکل و صورت



اور ترتیب کے ساتھ نہایت سہل اور آسان طریقہ پر اس کتاب کو پیش کرنے کا بڑا سبب فریق ثانی کی حد سے زیادہ تجاوز اور گرم گفتاری ہے۔ اس کا یہ دعویٰ ہے۔ کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا۔ اس کی نماز بالکل نہیں ہوتی۔ اور بعض نے تو یہاں تک غلو سے کام لیا کہ جملہ احناف کو بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ کے خطاب سے نوازا ہے۔

اور بعض نے قسم اور حلف اٹھا کر کہا کہ حنفیوں کی نماز نہیں ہوتی۔ اور ہم نے ان میں سے بعض کو سلسلہ تقریر و درس حدیث اور ربی مجلسوں میں منطق یونان سے بھی استعانت کرتے دیکھا ہے اور یوں صفائی و کبریٰ جوڑ کر نتیجہ نکالتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا۔ قرأت سورۃ فاتحہ نہیں کرتا۔ اس کی نماز نہیں ہوتی اور من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر کہ جس شخص نے دیدہ و دانستہ نماز ترک کی وہ کافر ہو گیا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ ترک کرنے والا کافر ہے۔ (گو بعض بڑے مخاط اور منصف مزاج حضرات کے نزدیک عملی طور پر یہی وہ کافر ہو گیا۔ مگر یہ ضرور) اور ہمارے زمانے کے ایک صاحب نے جو اپنی جماعت لے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگو بی (المتوفی ۱۳۲۳ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں بعض مدعیان عمل بالحدیث نے یہ غوغا مچایا کہ حنفیہ مفسدین صلوٰۃ اور بے نمازیں۔ (ہدایت المہندی ص ۲)

۱۔ حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب (المتوفی ۱۳۱۷ھ) لکھتے ہیں: کہ بالخصوص قسم کھا کر کہے کہ حنفیوں کی نماز نہیں ہوتی۔ ان کی بیبیوں سے غیر مقلدین کو بلا طلاق نکاح جائز ہے۔۔۔ الخ (تنقیح التفتیح ص ۳۵) ۲۔ ایک غیر مقلد مگر منصف مزاج عالم ایسے ہی ایک غالی اور بے باک مفتی کا حوالہ دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں: "اول تحریر ایک ہمارے ہی علماء اہل حدیث کی پرچہ تنظیم میں طبع ہوئی تھی جس میں مولانا موصوف نے مدرک رکوع کے اعتقاد والوں کو غلط فی التارک رکوع کا حکم صادر فرما دیا تھا۔ نتیجہ اس طرح نکالا تھا کہ مدرک رکوع سے فاتحہ مفقود ہوتی ہے۔ لہذا اس کی نماز نہیں۔ جس کی نماز نہیں وہ بے نماز ہے، بے نماز کافر ہے اور وہ غلط فی التارک ہے۔" (بلفظہ) اتام رکوع فی ادراک رکوع ص ۱، طبع کردہ منبر رسالہ صحیفہ المدینہ ص ۱، مؤلف خیر الکلام نے بزعم خود چند دلائل پیش کیے ہیں پھر لکھتے ہیں: لہذا فاتحہ ہر نمازی پر خواہ امام ہو یا منفر دیا مقتدی فرض ہوگی۔ (ص ۵۱۲)۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ اس فرض کے منکر اور تارک پر فتویٰ کیا صادر ہوگا؟ آیا وہ مسلمان رہے گا یا نامسلم؟ (العیاذ باللہ) کیونکہ اصول کے لحاظ سے فرض کا منکر مسلمان نہیں بننا چاہیے۔ دیکھیے کیا فتویٰ صادر ہوتا ہے؟

کے روح رواں اور چوٹی کے مناظر و مبلغ سمجھے جاتے ہیں۔ پنجاب کے ایک مشہور قصبہ میں دورانِ تقریر یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز ہرگز نہیں ہوتی۔ آؤ ہمارے ساتھ اس مسئلہ پر مباہلہ کر لو۔

آپ اس کتاب میں پوری تفصیل سے پڑھیں گے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ ترک کرنے کے قابل کون کون ہیں؟ نہ معلوم مباہلہ کس کس سے ہوگا؟ اور تاسف بالائے تاسف یہ کہ مباہلہ بھی فَجَعَلَ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ط کے الفاظ کے ساتھ اور لطف یہ ہے کہ وہ صاحب نہ بیوی رکھتے ہیں اور نہ بچے۔ گویا آیت مباہلہ میں نَذُّوْا اَبْنَاءَنَا وَ اَبْنَاءَ كُمْ وَ نِسَاءَنَا وَ نِسَاءَكُمْ کا ان کے نزدیک کوئی مفہوم ہی نہیں۔ اور اب کراچی سے ایک کتابچہ کو شائع ہوا جس کا نام ہے ”فصل الخطاب فی قرأۃ فاتحۃ الكتاب“ جو کتب خانہ بلدیہ ۱۹۱۱ء نیو کلا تھ مارکیٹ، کراچی (پاکستان) کی طرف سے شائع ہوا ہے، جس میں انھوں نے انتہائی فراخ دلی کے ساتھ تمام روئے زمین کے احناف کو انعامی چیلنج کیا ہے۔ اور روئے زمین کی چیدہ چیدہ ہستیوں کو نام بہ نام لکھا ہے۔ اصل الفاظ میں ان کا اعلان یہ ہے:

انعامی چیلنج: تمام دنیا کے حنفی حضرات کو کھلا اور انعامی چیلنج دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اہل حدیث امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کا خاص لفظ حدیث مرفوع صریح صحیح حسن سے (بحوالہ کتب صحاح ستہ وما وافق بہا) دکھاتے ہیں۔ ایسا ہی وہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے نہ پڑھنے کا خاص لفظ حدیث مرفوع صریح صحیح حسن سے (بحوالہ کتب صحاح ستہ وما وافق بہا) میلان مناظرہ میں دکھادیں تو ہم ان کو اس حق محنت، داد ہمت، تمنعہ صداقت کے صلہ میں فاتحہ کے ہر حرف کے بدلے میں مبلغ ایک سو روپے دینے کو تیار ہیں۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

کیا ہے روئے زمین پر کوئی زندہ دل حنفی جو میدانِ مناظرہ میں اسے اور امام کے پیچھے خاص لفظ فاتحہ کے نہ پڑھنے کا دکھا کر مبلغ پانچ سو روپیہ انعام حاصل کرے (دیدہ باید) اس انعامی چیلنج کو شائع کیے ہوئے آج تیرہ سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے اور تقریباً یہ چیلنج بارہ ہزار کی تعداد میں طبع کر کے علماء اور جہلاء کے ہاتھوں میں پہنچا چکے ہیں۔ دیوبند، ڈابھیل، ہندوستان پاکستان کے احناف کے بڑے بڑے مدارس میں بھی پہنچ چکا ہے۔ احناف کے مقتدر علماء



مفتی کفایت اللہ صاحب (المتوفی ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق یکم جنوری ۱۹۵۳ء) مولانا حسین احمد صاحب مدنی (المتوفی ۱۲ رجب الدی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ) اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ (المتوفی ۱۲ صفر ۱۳۷۹ھ مطابق ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۹ء) کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے۔ لیکن اس وقت تک کسی حنفی کو یہ جرأت نہ ہوئی اور نہ ہی آئندہ ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ کہ وہ دنیا کی کسی کتاب سے ایک حدیث ہی بموجب شرائط مندرجہ در چیلنج کر کے انعام حاصل کرنے کے علاوہ مذہب حنفی پر احسان کرتا۔ لیکن کتنا کہاں سے۔ جب کہ اس طرح کی ایک حدیث کسی دنیا کی اسلامی کتب میں موجود نہ ہو اور یقیناً نہ ہو۔ (انتہی بلفظہ فصل الخطاب ص ۸) اس شاہی اور فرار خدا نہ انعامی چیلنج کے بعد اسی کتابچے کے آخری صفحہ پر یہ اعلان ان الفاظ سے دہرایا گیا ہے۔

**تمام دنیا کے علماء احناف کو کھلا چیلنج** ہم تمام علماء احناف ہند، سندھ، پنجاب، بنگال، خراسان، عربستان، چین، جاپان، افریقہ، امریکہ، آسٹریلیا، یورپ، مصر، عراق وغیرہ کو بذریعہ چیلنج و اشتہار ہذا کے دعوت دیتے ہیں کہ ان مسائل مندرجہ ذیل کو کسی آیت یا حدیث صحیح مرفوع متصل سے اور وہ حدیث جس مسئلہ کے ثبوت میں پیش کریں۔ نص صریح ہو صحاح و ماوافقی بہا سے ثابت فرمائیں تو ہم ان کو اس حق محنت، ادب و ہمت، تمنعہ صداقت کے صلہ میں ہر آیت اور حدیث کے بدلہ میں پچیس روپے انعام دیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

(۱) آل حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقتدیوں کو سورۃ فاتحہ کے پڑھنے سے منع کرنا۔  
(پھر نو عدد مسائل اور لکھ کر اور تلك عشرة کاملۃ تحریر فرما کر بحث کو اس اعلان پر ختم کیا ہے)  
هَلْ مِنْ قَبَارِئِشٍ كَرِئَةٍ - یعنی کیا ہے روئے زمین پر کوئی زندہ دل اور خوش نصیب حنفی بھائی جو میدان میں کودے اور ہم سے سینکڑوں روپے کا انعام حاصل کرے۔ (دیکھ باید)  
(انتہی بلفظہ فصل الخطاب ص ۸)

اور اب فصل الخطاب ص ۸ کے جدید ایڈیشن میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے، کا عدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ (بلفظہ)

ان تمام اقتباسات کو پیش نظر رکھ کر پڑھ لکھے آدمی کو ضرور یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے والے کافر اور گمراہ ہیں اور نماز پڑھتے ہوئے بھی وہ بے نماز اور اقل درجہ یہ ہے کہ وہ بلا دلیل ہیں حتیٰ کہ ان کے ساتھ لعنة الله على الكاذبین کے الفاظ سے مباہلہ کرنا بھی کارِ ثواب اور جائز ہے اور عوام پر اشتہار می رعب ڈالنے کے لیے انعام چیلنج بھی دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ راقم الحروف کو بھی خالی الذہن ہو کر محض اپنی قلبی تسکین اور سنت رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیروی کرنے کی خاطر سینکڑوں کتابوں کے ہزاروں اوراق اٹھنے پڑے ہیں اور صد ہا رسائل اور کتابچوں کی ورق گردانی کرنا پڑی ہے تاکہ دلائل کی صحت اور سقم کا موازنہ کر کے نجاتِ آخروی کی فکر کی جاتے۔ لیکن میں نے فریقِ ثانی کے جملہ دعووں کو بالکل بے حقیقت، مبالغہ آمیز اور انتہائی غلو پر مبنی پایا ہے۔ گو مسئلہ زیر بحث میں ائمہ دین کا اختلاف رہا ہے، مگر جو بے اصل دعویٰ فریقِ ثانی کے اہل علم حضرات نے کیے ہیں وہ بالکل بے اصل ہیں اور ان حضرات کی ان کارستانیوں پر مطلع ہونے کے بعد قرین انصاف تو یہ تھا کہ ہم بھی اپنی لمن ترانیوں آجائے اور ان کی سرابی حقیقت کو الم نشرح کرتے ہوئے کہہ دیتے۔

محتسب خم شکست من براد

السن بالسن وانجروح قصاص

لیکن قرآن کریم کی تعلیم اور حدیث نبویؐ کے صریح ارشادات اور جن اکابر سے ہمیں لگاؤ اور تعلق ہے ان سے ربط و نسبت ہمیں ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اس قسم کی لچر پوچ اور فتنہ انگیز باتیں کہتے پھریں۔ ہمیں تو اصلیت اور حقیقت کو بے نقاب اور آشکارا کرنا ہے اور بس اور اس کتاب کی تالیف و ترتیب سے جو ناراضگی فریقِ ثانی کو پیدا ہوگی اس کے متعلق صرف اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ج:

”اے باد صبا ایں ہمہ آوردہ قُست“

یہ بات تو پوری تفصیل کے ساتھ اپنے موقع پر بیان ہوگی کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ ترک کرنے والے صرف ہم احناف ہی نہیں، بلکہ جمہور صحابہ کرام رضوانہ علیہم اجمعین و تابعین رحمہم اجمعین اور اکثر سلف و خلف کی معیت سے ہمارا دامن تحقیق وابستہ ہے۔ اور جمہور اپنے اس محقق نظریہ پر نص



قرآنی اور بے شمار حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ اور ایسے اختلافی مسائل میں (خصوصاً جن میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دین کا اختلاف ہو) ہمارا یہ منصفانہ عندیہ ہے کہ جو بات ظاہر قرآن کریم و حدیث اور جہور کے عمل کے مطابق ہوتی ہے۔ ہم نہ صرف یہ کہ اس کے سامنے تسلیم خم کر دیتے ہیں بلکہ اس کو اپنا دینی سرمایہ اور باعث صداقت و بختیہ ہیں اور جن مسائل میں طرفین کے پاس قرآن و حدیث کے دلائل ہوں۔ ہم اس پہلو کو جو قرآن و سنت کے قریب تر ہوتا ہے۔ اختیار کرتے ہیں۔ اور اپنے مسلک کی تائید میں تطبیق اور ترجیح کے ٹھوس دلائل پیش کرتے ہیں اور فریق ثانی کے حق میں غلط مویشگافی اور غیر محتاط لفظ زبان سے نکالنا ہرگز جائز نہیں سمجھتے اور تمام مسائل اختلافیہ اور اجتہادیہ میں ہمارا یہی نظریہ ہے جس کی مزید تحقیق آپ کو راقم الحروف کی کتاب الکلام المفید فی اثبات التقلید میں ملے گی۔ مع ہذا معصوم ہونے کا دعویٰ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ والعصمة بید اللہ تعالیٰ وحده۔

ہم حیران ہیں کہ مسئلہ زیر بحث میں تکفیر اور تفسیل کس کی ہوگی؟ اور تحقیق و تجمل کس کی؟ بے سند اور بے دلیل ہونے کا الزام کس پر عائد ہوگا؟ اور لعنۃ اللہ علی الکاذبین کے الفاظ سے مباہلہ کس سے ہوگا؟ کیونکہ مسئلہ کے اختلافی ہونے میں فریق ثانی کا بھی اتفاق ہے۔ چنانچہ حضرت امام بیہقی رحم (المتوفی ۴۵۶ھ) نے اس مسئلہ پر ایک مستقل کتاب (کتاب القراءۃ) لکھی ہے۔ اس میں تحریر کرتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس وقت تک باقاعدہ اس مسئلہ میں اختلاف چلا آتا ہے۔

(کتاب القراءۃ ص ۱۲۶)

اور مولانا مبارک پوری صاحب المتوفی ۱۳۵۳ھ جن کی کتاب تحقیق الکلام پر فریق ثانی کے مسئلہ زیر بحث پر مناظرہ کا دار و مدار ہے امام خطابی رحم (المتوفی ۳۸۸ھ) کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

ولا لفظہ: فی مسئلۃ معروفۃ مشہورۃ بما فیہا من الاختلاف منذ عصر الصحابۃ  
رضی الی یومنا ہذا۔ یعنی یہ مسئلہ معروف و مشہور ہے۔ اس میں اختلاف حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے تا ہنوز چلا آتا ہے۔ (کتاب القراءۃ ص ۱۲۶)

۲۔ یہ بحث امام خطابی رحم (المتوفی ۳۸۸ھ) کی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ علمائے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے امام کے پیچھے قراءۃ کرنے کو واجب کہا ہے اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ وہ امام کے تحریرات نہیں کیا کرتے تھے اور فقہائے تین قول ہیں:

(باقی ص پر)

”کہ اس مسئلہ میں صحابہ کرام کا اختلاف تھا۔ ایک گروہ وجوب قرآنہ خلف الامام کا قائل تھا تو دوسرا منکر۔ اس لیے فقہاً اور ائمہ کا بھی اس میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ مطلقاً وجوب کا قائل ہے اور دوسرا مطلقاً مانعت کا۔ تیسرا گروہ ستری نمازوں میں قائل ہے اور چہری نمازوں میں قائل نہیں ہے۔“

(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷)

اندریں حالات انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ فریق ثانی جس پہلو کو حق اور صحیح سمجھتا۔ شدت کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہوتا۔ لیکن تکفیر اور تفسیق وغیرہ اور تعدی و تجاوز کے الفاظ سے گریز کرتا نہ تو مباہلہ کا چیلنج دیتا اور نہ حلفیہ طہمچہ دوسرے فریق کو بے نماز اور مفسدین صلوة کا خطاب دیتا اور ایسے اختلافی مسئلہ میں سنجیدگی اور متانت سے کام لیتے ہوئے تعصب، عناد غلو اور زبان درازی سے اجتناب کرتا، مگر کاش کہ اس نے ایسا نہ کیا۔

ہمارا اندھا چو نکہ عامۃ المسلمین کو مسئلہ زیر بحث سے شناسا کرنا ہے۔ اس لیے ہم نے عوام کی رعایت کرتے ہوئے نہایت سہل اور حتی الوسع سلیس زبان استعمال کی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر عربی عبارات پیش نہیں کی گئیں بلکہ ان کے حوالہ درج کر دینے پر اکتفا کی گئی ہے۔ ہاں البتہ جہاں کسی خاص مصلحت سے اصل عربی عبارت پیش کرنا ضروری معلوم ہوا ہے تو وہاں اصل عبارت نقل کر کے اس کا ترجمہ بھی ساتھ ہی لکھ دیا ہے تاکہ خواص اور عوام دونوں برابر استفادہ کر سکیں۔

ہم نے بعض مقامات پر حتی الوسع متانت اور سنجیدگی کو مد نظر رکھتے ہوئے بعض علمی چوٹیں بھی کی ہیں جن سے ان اکابر کے طرز استدلال کی خامی اور اس کا نقص واضح کرنا مقصود ہے اور جن سے بڑے بڑے اکابر کے خیالات اور نفسی میلانات کی پردہ درمی ضرور ہوگی لیکن پردہ درمی کے بغیر درون پردہ کا نظارہ کس نے کیا ہے؟ ورنہ عا شاؤ کلا ہمارے اس علمی اور تحقیقی طنز سے نہ سلف صاحبین سے بذہنی ہے اور نہ تمسخر اور نہ زمانہ حال کے حضرات کی دل آزاری۔ واللہ علی ما نقول شہید۔

(بقیہ صفحہ ۱) امام کھول، اوزاعی، شافعی اور ابو ثور فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے چہری اور ستری سب نمازوں میں قرآن کرنا ضروری ہے اور امام نہ چہری، مالک، عبداللہ بن المبارک، احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں کہ مقتدی ستری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآن کرے لیکن چہری نمازوں میں قرآن نہ کرے۔ اور امام سفیان ثوری اور اصحاب الزہری یہ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے کوئی شخص قرآن نہ کرے۔ امام جہر سے قرآن کر رہا ہو یا آہستہ۔ ۱ھ

(معالم السنن جلد ۲ ص ۳۹۴ طبع مصر)



ہم نے اپنے استدلال میں جملہ پیش کردہ احادیث اور آثار کی اسانید نقل کر کے ہر روایت اور اثر کے جملہ راویوں کی کتب اسماء الرجال سے توثیق نقل کر دی ہے تاکہ پڑھنے والوں کو ہر قسم کی گمراہی نہ رہے اور دشواری پیش نہ آئے۔ البتہ متابعات اور شواہد میں نیز ضمنی اور استطرادی ابجاث میں روایات کی توثیق کا التزام نہیں کیا گیا اور فریق ثانی کی طرف سے جملہ نقل کردہ روایات و اثبات میں جو ضعف و کمزور اور مجروح و متکلم فیہ راوی ہیں۔ ان پر کتب رجال سے جرحی کلام نقل کر دیا ہے تاکہ بلند و بالا دعاوی کرنے والوں کو اپنے دلائل کا معیار بھی معلوم ہو جائے اور جن حضرات صحابہ کرام رض و تابعین اور ائمہ دین کی مسئلہ زیر بحث میں معیت جہود کو حاصل ہے۔ ان کی ثقاہت اور بعض صفات عالیہ کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے تاکہ عوام کو بھی یہ بات بخوبی معلوم ہو جائے کہ ان اکابر کا اسلام اور مسلمانوں میں کیا رتبہ ہے؟

ہم نے بعض مقامات پر ائمہ جرح و تعدیل اور جہود محدثین کرام کے مسئلہ اور طے شدہ اصول و ضوابط کے عین مطابق ثقہ راویوں سے متعلق ثقاہت اور عدالت کے اقوال تو نقل کر دیے ہیں لیکن اگر بعض ائمہ کا کوئی جرحی کلمہ ملا ہے تو وہ نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی ضعیف اور کمزور راوی کے بارے میں کسی امام کا کوئی توثیق کا جملہ ملا ہے تو اس کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ کیونکہ فن رجال سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے حضرات بھی بخوبی اس امر سے واقف ہیں کہ کوئی بھی ایسا ثقہ جس پر جرح کا کوئی کلمہ منقول نہ ہو یا ایسا ضعیف جس کو کسی ایک نے بھی ثقہ نہ کہا ہو کہ بہت اچھے مترادف ہے۔ حضرات صحابہ کرام کا رتبہ کس سے مخفی ہے؟ اور الصحابة کلہم عدول کے جملہ سے کون اہل علم ناواقف ہے؟ مگر خوارج اور روافض کا نظریہ بھی ان کے بارے میں پوشیدہ نہیں ہے۔ بایں ہمہ ہم نے توثیق و تضعیف میں جہود ائمہ جرح و تعدیل اور اکثر ائمہ حدیث کا ساتھ اور دامن نہیں چھوڑا۔ مشہور ہے کہ زبان خلق کو نقارۃ خدا سمجھو

تا حد ممکن اسانید کو پورا پورا نقل کیا گیا ہے اور ترجمہ میں اخبارنا، خبرنی، حدثنا، حدثنی، قال فلاں عن فلاں، روى فلاں اور روى عن فلاں وغیرہ اصطلاحات کی پوری رعایت رکھی گئی ہے تاکہ ایک طرف نقل سند کے سلسلہ میں کسی قسم کی غیانت واقع نہ ہو۔ اور دوسری طرف سندات کو دیکھ کر صحیح و ضعیف، متصل اور منقطع وغیرہ کا فرق سمجھنے کی اہلیت رکھنے

دواؤں کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر حجتی کتابیں دستیاب ہو سکی ہیں۔ ان کے حوالے درج کر دیے گئے ہیں۔ بعض متن میں اور بعض حاشیہ میں (تاکہ اصل عبارت کی ترتیب اور تسلسل میں گنجلک اور اضطراب پیدا نہ ہو) اور یہ حوالے اس لیے درج کیے گئے ہیں تاکہ جو کتاب بھی آسانی کے ساتھ کسی صاحب کو میسر اور دستیاب ہو سکے۔ اس کی طرف مراجعت کر کے اصل عبارت یا اس کا ترجمہ بنظر انصاف دیکھ لیا جائے اور اکثر تاریخی واقعات اور ضمنی اجاث کو حاشیہ پر درج کر دیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والے حضرات اصل مضمون کو مرتب اور مربوط طور پر یکجا کر سکیں۔ اور مزید تفصیل اور تشریح کے لیے حاشیہ دیکھ لیں۔ بنابرین توضیح بیان، دفعہ شبہ، دفعہ ابہام، توشیح رجال، جرح روایات اور دیگر نہایت ضروری امور کے لیے بہت سے تشریحی حواشی بڑھادیے گئے ہیں تاکہ خواص کے علاوہ عوام کے لیے بھی یہ کتاب چراغ راہ کا کام دے۔

حضرات سلف صالحین کی عبارات کے پہلو بہ پہلو ہم نے فریق ثانی کی عبارات اور تحریرات سے بھی استفادہ کیا ہے اور ان کی عبارتیں اپنی تائید میں نقل کی ہیں۔ مگر ان کی عبارات سے احتجاج کرنے میں سینہ زوری سے کام نہیں لیا گیا بلکہ ان سے جو منطوق اور مفہوم کے لحاظ سے ہمارے سمجھ میں آیا ہے وہ لکھ دیا ہے۔ ہاں اگر کسی موقع پر مناظرانہ رنگ میں ان کی عبارت کی تشریح میں طنز اور ظرافت کے طور پر کچھ لکھا گیا ہے تو اس کا انکار نہیں، لیکن بحمد اللہ تعالیٰ انصاف کا دامن حتی الوسع ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ والعصمة بید اللہ تعالیٰ وحدہ۔

ع: یہ اپنی حد نظر ہے کسی کی مید کہاں

جہاں تک انسانی اور امکانی کوشش کا تعلق ہے۔ حوالہ جات کی تصحیح کا پورا التزام کیا گیا ہے۔ معذرا اگر جلد اور صفحہ کا نمبر اور ہندسہ کسی وجہ سے بدل جائے تو غوغا آرائی کے بجائے اس کی تصحیح کر لی جائے۔ دل میں پورا احترام موجود ہے اور ارادہ بھی تھا کہ محدثین کرام، فقہائے عظام اور ارباب جرح و تعدیل کے ناموں کے پہلے امام علامہ حافظ اور شیخ و حضرت وغیرہ کے توصیفی الفاظ لکھے جائیں، مگر ان کے ناموں کے بار بار آنے سے ہر جگہ ایسا لکھنا ایک دشوار امر ہے۔ لہذا اس فعل کو گستاخی پر حمل نہ کیا جائے، بلکہ ایک مجبوری امر سمجھا جائے اور جہاں ہم نے راویوں



کے ناموں میں تصحیف اور غلطی کو درست کیا ہے اور اس پر تاریخی اور ٹھوس واقعات اور شہادتیں نقل کی ہیں۔ ان کو بنظر انصاف دیکھا جائے اور جلد بازی سے ہرگز کام نہ لیا جائے۔ اور اگر کسی مقام پر طرز استدلال میں کوئی خامی یا کمزوری نظر آئے تو قصور اور لغزش کو مجھ سے منسوب کریں نہ کہ ہمارے سلف و خلف سے۔ کیونکہ

میرے ساقی نے عطا کی ہے نئے بے در و وفا  
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

اس کے علاوہ کہیں کہیں میرے اپنے استنباطات اور اجتہادات بھی ہوں گے۔ ان میں غلطی کا واقع ہونا بہت اغلب ہے۔ اور ان کو یوں سمجھنا چاہیے کہ :

”چند رخ راہ ہیں مسندل نہیں ہیں“

مسئلہ زیر بحث کی اہمیت کے پیش نظر اس کے کسی گوشہ کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا میرے لیے اپنی تہی مائیگی اور بے بضاعتی کے باعث چھوٹا سا منہ بڑی بات کا مصداق ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس مسئلہ پر ایسے حضرات خاصہ فرمائی کرتے جو خود بھی کچھ ہوتے۔ یہاں اپنا حال یہ ہے کہ اس پر کچھ لکھنا ہی اس بڑے اہم اور مبارک کام کی توہین ہے لیکن جب میں نے اس مسئلہ کے جمع و ترتیب اور تحقیق و تمحیص کے لیے قدم اٹھایا تو صورت حال کا یہ نقشہ دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ کوئی اور طاقت ہے جو بے اختیار یہ کام لے رہی ہے۔

مری طلب بھی اسی کے کرم کا صدقہ ہے

قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

ضروری التماس : حتی الوسع میں نے اس مسئلہ کے ہر پہلو کو مکمل اور واضح کرنے میں انتہائی کوشش کی ہے لیکن باوجود اس کے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کتاب اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے آخری کتاب ہے۔ یا باوجود اتنی محنت اور کاوش اٹھانے کے یہ کتاب غلطیوں سے بالکل میرا ہے کیونکہ اقل تو انسان کا کوئی کام لغزش اور خطا سے یوں بھی خالی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ خطا اور نسیان انسان کا خمیر ہے۔ اور پھر کام بھی اس بندۂ عاجز کا جو سراپا تقصیر و خطا ہو۔ اس کی نسبت بالکل صحت کا دعویٰ کس طرح ہو سکتا ہے ؟ لہذا التماس ہے کہ

مجدد کو ہدف ملامت بنانے کے بجائے منصفانہ تنقید کے اصول پر میری راہنمائی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو غلط بات کی تلافی کرنے اور حق کے تسلیم کرنے میں مجھے کوئی تامل نہ ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔  
الغرض کتاب کی معنوی صورت ہو یا صورتی، بہر حال نگاہ مقصود پر رکھیے اور میری کوتاہیوں پر مجھے مطلع کیجیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ۵

نغمہ کجا و من کجا  
ز سخن بہانہ ایست  
سوئے قطری کشم ناقہ بے زمام را

دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ قلب میں اپنی محبت، ارادہ میں قوت، جسم میں صحت اور عمر میں درازی عطا فرمائے اور کتاب و سنت کی پیروی اور حضرات سلف صالحین کی اتباع اور اطاعت کا صحیح جذبہ مرحمت فرمائے اور ہر نیک عمل میں اخلاص و احسان کی توفیق دے۔ اگر یہ مقصد حاصل ہو جائے تو کتاب کا ہر عیب حسن ہے اور اگر یہ نہ ہو تو تمام خوبیاں بے معنی ہیں اور اس فقیر بے زاد اور ماہی بے آب اور تہی دست علم و عمل کی خدائے برتر و بزرگ سے نہایت اخلاص سے یہ دعا ہے کہ جب تک دنیا میں زندہ رکھنا ہے تو اپنی رضا اور خوشنودی کی توفیق دے۔ اور جب دنیا سے اٹھنا منظور ہو تو خاتمہ بالآخر ہو۔ ۵

خدا سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبر

یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ط

ابوالزاہد محمد سر فر از خاں صفدر

خطیب جامع گگھر، ضلع گوہر انوالہ

۲۰ رجب ۱۳۷۲ھ

۱۵ مارچ ۱۹۵۵ء



## مقدمہ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى خَاتَمِ الْأَنْبِيَاءِ  
وَالْمُرْسَلِينَ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ الْمُهْدِينَ وَعَلَى جَمِيعِ أُمَّتِهِ  
وَالْوَثِقَةِ الْمُقَرَّبِينَ الَّذِينَ بَلَّغُوا كَلَامَ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَأَحَادِيثَ  
رَحْمَةِ تِلْكَ الْعَالَمِينَ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً لِيَدْخُلُوا بِهَا جَنَّاتِ الْخُلْدِ وَالْبَسَاتِينِ

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصول موضوعہ کے طور پر محل نزاع کو اور اس کے اہم اجزائے بحث کو متعین کر لیا جائے۔ تاکہ مسئلہ زیر بحث کی تہ تک پہنچنے میں وقت پیش نہ آئے۔ سو ہماری تحقیق یہ ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے نہ جہری نمازوں میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کی گنجائش ہے۔ اور نہ ستری نمازوں میں۔ مقتدی کا وظیفہ تمام نمازوں میں یہ ہے کہ پوری و جمعی اور نہایت خاموشی کے ساتھ امام کی قرآۃ کی طرف توجہ کرے، سنے یا نہ سنے، ہمارے اس دعویٰ پر نص قرآنی موجود ہے جس کا معنی اجماع اور اتفاق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرآۃ سے منع کیا گیا ہے۔ اور صحیح و صریح اور مرفوع قولی اور فعلی حدیثیں بھی اس پر موجود ہیں اور حضرات خلفائے راشدین اور ان کے علاوہ جہور صحابہ کرام رضوانا علیہم اجمعین و تابعین رحمہم اجمعین اور محدثین رحمہم اجمعین و فقہاء رحمہم اجمعین کی اکثریت بھی ہمارے ساتھ ہے۔ خصوصاً جہری نمازوں میں۔ ان میں ہر ایک امر کی پوری تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

## حضرات صحابہ کرام رض

وہ حضرات صحابہ کرام رض جو امام کے پیچھے تمام نمازوں میں قرآن کے قائل نہ تھے؛  
حضرات خلفائے راشدین رض، حضرت عبداللہ بن عمر رض، حضرت جابر بن عبداللہ رض، حضرت  
زید بن ثابت رض، حضرت عبداللہ بن مسعود رض، حضرت ابوالدرداء رض اور حضرت عبداللہ بن  
عباس رض وغیرہ۔

اور وہ حضرات جو ہماری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآن کے قائل نہ تھے۔ ان میں؛  
حضرت عائشہ رض اور حضرت ابوہریرہ رض وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ غرض کہ امام  
کے ساتھ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا حضرات صحابہ کرام رض میں شایع نہ تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ لکھتے ہیں کہ

زیرا کہ خواندن فاتحہ با امام در صحابہ رض چنانچہ امام کے ساتھ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا  
شایع نبود۔ (مصطفیٰ جلد ۱ ص ۱۳۱ طبع رحیمیہ ملی) حضرات صحابہ کرام رض میں شایع نہ تھا۔

## حضرات تابعین رحمہ

جو تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرآن کے قائل نہ تھے۔ ان میں سے حضرت سید رحمہ بن غفلہ رض،  
سعید بن جبیر رحمہ، سعید بن المسیب رحمہ، محمد بن سیرین رحمہ، اسود بن یزید رحمہ، علقمہ بن قیس رحمہ اور حضرت  
ابراہیم نخعی رحمہ وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔

اور جو اکابر ہماری نمازوں میں قائل نہ تھے۔ ان میں حضرت عروہ بن زبیر رض، قاسم بن محمد رض،  
امام زہری رحمہ، نافع بن جبیر رض، حسن بصری رحمہ، مجاہد بن جبر رحمہ، محمد بن کعب القرظی رحمہ، ابو حلیہ  
ریاحی رحمہ اور امام شعبی رحمہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

## حضرات اتباع تابعین رحمہ

جو حضرات مطلقاً امام کے پیچھے قرآن کے قائل نہ تھے۔ ان میں حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ،  
سفیان ثوری رحمہ اور امام اوزاعی رحمہ وغیرہ مشہور و معروف ہیں۔ و علیٰ ہذا القیاس۔ امام  
لیث بن سعد رحمہ اور عبداللہ بن وہب رحمہ مشہور ائمہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اور قرأت  
خلف الامام کے قائل نہیں ہیں۔ اور امام بخاری رحمہ کے استاد الامام حضرت عبداللہ بن مساکن رحمہ



جہری نمازوں میں قرآنہ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ ان کے علاوہ بے شمار اتباع تابعین ہیں، جن کا احصار اور احاطہ اگر محال نہیں تو آسانی کے ساتھ ممکن بھی نہیں ہے۔ ان تمام اکابر کے اقوال و مسالک پورے حوالہ جات کے ساتھ اور ایک ایک سند مع توثیق و ات اور دفع شبہات و تصحیح کے ساتھ اپنے موقع پر پوری بسط کے ساتھ بیان ہوں گے۔  
انشاء اللہ العزیز۔

### حضرات ائمہ اربعہ رحمہ

چونکہ ائمہ اربعہ کے پیروکار ہر دور میں اکثریت کے ساتھ رہے ہیں اور آج بھی اکثریت مقلدین حضرت ائمہ اربعہ رحمہ کی ہے۔ اس لیے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم ان حضرات کا مسلک بھی عرض کر دیں۔ اور ان کے بعد ان جلیل القدر مستویوں کا نظریہ بھی تحریر کر دیں جن کے بارے میں فریق ثانی کو خاص طور پر غلط فہمی ہوتی ہے اور ان ائمہ کرام رحمہ میں سے علی الخصوص حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ کا ذکر پہلے مناسب ہے، جو علم، عمر، تقویٰ و ریح اور شرفِ تابعیت کے حاصل کرنے میں دوسرے جملہ ائمہ سے خاص درجہ اور فضیلت کے مالک تھے۔

### حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ (المتوفی ۱۵۰ھ)

امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کے مطلقاً قائل نہ تھے۔ نہ جہری نمازوں میں اور نہ ستر میں۔ چنانچہ مولانا عبد الرحمن صاحب مبارک پور رحمہ تحریر فرماتے ہیں کہ امام محمد رحمہ موطا میں لکھتے ہیں: ”کہ امام کے پیچھے قرآن نہ کرنی چاہیے خواہ امام جہر سے قرآن کرتا ہو یا آہستہ، اسی پر عام اتفاق و اجماع کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ کا مسلک اور مذہب بھی یہی ہے۔“

۱۔ تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص: ۲۵۸۔ یہ عبارت موطا امام محمد رحمہ ص ۹۴۔ جامع المسانید جلد ۱ ص ۳۴۔ فتح القدیر جلد ۲ ص ۲۴۱۔ اور روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ وغیرہ میں بھی نقل کی گئی ہے۔

۲۔ امام موصوف سے متعلق بھی نہ جاننے والوں اور متعصب لوگوں نے کیا الزام نہیں لگائے؟ کسی نے ان کو ضعیف کہا اور کسی نے یتیم فی الحدیث کے خطاب سے نوازا۔ لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ علامہ ذہبی رحمہ (المتوفی ۴۸۸ھ) ان کے بارے میں لکھتے ہیں: ”کہ وہ الامام الاعظم، (باقی اگلے صفحہ پر)“

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) فقیہ العراق، امام متورع، عالم، عامل، متقی اور کیرا نشان تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۵۸)۔ حافظ ابن عبد البر (المتوفی ۴۴۳ھ) فرماتے ہیں کہ امام وکیع رحمہ نے ان سے بہت سی حدیثیں سنی ہیں۔ (کتاب الانتصار ۲ ص ۱۵) اور لکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے امام موصوف سے روایتیں کیں اور ان کی توثیق و تعریف کی۔ وہ ان سے بہت زیادہ ہیں جنہوں نے (بلا وجہ) ان میں کلام کیا ہے۔ (مختصر کتاب العلم ص ۱۹۲) امام ابن معین رحمہ (المتوفی ۲۴۳ھ) فرماتے ہیں کہ امام موصوف ثقہ تھے۔ وہ صرف اسی حدیث کو بیان کرتے تھے جو ان کو اچھی طرح یاد ہوتی تھی۔ امام عبد اللہ بن المبارک رحمہ فرماتے ہیں کہ ہم نے فقہ میں امام ابو حنیفہ رحمہ جیسا کوئی اور نہیں دیکھا۔ امام الحجرج والقیل، یحییٰ بن سفیان (المتوفی ۱۹۸ھ) فرماتے ہیں ہم نے قدوس کی تہذیب نہیں کہتے، ہم نے امام موصوف سے بہتر رائے اور بات کسی کی نہیں سنی۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۲۹)۔ امام شافعی رحمہ فرماتے ہیں کہ تمام لوگ فقہ میں امام ابو حنیفہ رحمہ کے خیال اور نحو چیں ہیں۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۳۴۶) تہذیب جلد ۱ ص ۲۲۹)۔ علامہ تاج الدین سبکی رحمہ (المتوفی ۷۴۱ھ) لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کی فقہ بڑی مشکل اور دقیق ہے (طبقات کبریٰ جلد ۲ ص ۱۴۴)۔ سبکی اسی وجہ سے نااہل اور سطحی قسم کے لوگ ان کی فقہ سے نفرت کرتے ہیں۔ علامہ خطیب بغدادی (المتوفی ۴۴۳ھ) باوجود امام موصوف پر انتہائی جرح نقل کرنے کے ان کی ذاتی خوبیوں اور علمی قابلیتوں کا انکار نہیں کر سکے اور صاف لکھتے ہیں کہ علم عقائد اور کلام میں لوگ ابو حنیفہ رحمہ کے خیال اور نحو سچیں ہیں۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۱۸۱)۔ مشہور محدث اسرائیل (المتوفی ۱۶۲ھ) کا بیان ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ کیا ہی خوب مرد تھے جنہوں نے ہر ایسی حدیث کو اچھی طرح سے یاد کیا جس سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہو سکتا ہے۔ اور وہ بڑی احتیاط کرنے والے اور فقہی مسائل پر عبور کرنے والے تھے (بغدادی جلد ۱ ص ۳۲۹) امام ابن معین رحمہ فرماتے تھے کہ علماء تو صرف چار ہیں۔ سفیان ثوری، ابو حنیفہ رحمہ، مالک اور ازاعی (البیہ والنہایہ، جلد ۱ ص ۱۱۶) حافظ ابن کثیر رحمہ (المتوفی ۷۴۴ھ)۔ امام موصوف کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں۔ الامام، فقیہ العراق، احمد ائمہ الاسلام و السادة الاعلام، احاد ارکان العلماء۔ احد لائمتہ الاربع اصحاب المذاهب المتبعۃ، امام عبد اللہ بن داؤد الخریزی (المتوفی ۲۱۳ھ) کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں کے لیے مناسب ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ کے لیے نمازیں دعا کیا کریں کیونکہ انہوں نے فقہ اور سنت کو محفوظ رکھا جو لوگوں تک پہنچی۔ امام سفیان ثوری رحمہ اور عبد اللہ بن المبارک فرماتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں



فائدہ: اس عبارت سے امام محمدؒ (المتوفی ۱۸۹ھ) کا مسلک بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ

(بقیہ حاشیہ) سب روتے زمین پر بستے والوں سے بڑھ کر فقہ جاننے والے امام ابو حنیفہؒ تھے۔ امام مکی بن ابراہیمؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ رحمہ اللہ علم اہل الارض تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۰) علامہ ابن خلدونؒ (المتوفی ۸۰۸ھ) لکھتے ہیں کہ امام موصوف علم حدیث کے بڑے مجتہدین میں سے تھے (مقدمہ ص ۴۵) اور لکھتے ہیں کہ فقہ میں ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ کوئی دوسرا ان کی نظیر نہیں ہو سکتا۔ اور ان کے تمام ہم عصر علمائے ان کی اس فضیلت کا اقرار کیا ہے۔ خاص طور پر امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے۔ (مقدمہ ص ۴۴) علامہ محمد طاہرؒ (المتوفی ۹۸۶ھ) لکھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک امام موصوف کی مقبولیت کا کوئی خاص راز اور بھید نہ ہوتا۔ تو امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ) کا ایک نصف حصہ کبھی ان کی تقلید پر مجتمع نہ ہوتا (مکملہ مجمع البحار جلد ۳ ص ۵۴) مولانا مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن معینؒ، امام شعبہؒ اور سفیان ثوریؒ رحمہم سب ان کی توثیق کرتے ہیں۔ (تحقیق الکلام ص ۱۴) نیز تحریر فرماتے ہیں کہ حدیث (کی قیود اور شرائط) کے بارے میں جتنی تشدید پابندی اور احتیاط امام ابو حنیفہؒ نے کی ہے اور کسی نے اس کا ثبوت نہیں دیا۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۲ ص ۱۵) ہم نے اپنی کتاب مقام ابی حنیفہؒ میں امام صاحبؒ کے امام حدیث و فقہ ہونے پر باحوالہ سیر حاصل بحث کی ہے اور عناد و تعصب کی وجہ سے جن لوگوں نے ان پر اعتراضات کیے ہیں ان کے ٹھوس جوابات بھی ہم نے اسی کتاب میں عرض کر دیے ہیں۔

نواب صدیقی حسن خاں صاحبؒ (المتوفی ۱۳۰۷ھ) رقم طراز ہیں:

امام اعظم ابو حنیفہؒ رحمہ اللہ کو فی دینی چنانکہ در علم دین منصب امامت دار۔ ہم چنان در زہد و عبادت امام سالکان است۔ (نقصا جمیہ و الاحرار من تذکار جنود الابرار ص ۹۳)۔

حضرت اگر امام موصوف میں کوئی خوبی نہ ہوتی۔ تو امت کی اکثریت کے علاوہ امام یحییٰ بن سعیدؒ ناظران امام دکیع بن الجراحؒ، امام ابن معینؒ، یحییٰ بن زکریاؒ وغیرہ ایسے امام حدیث کبھی ان کی تقلید نہ کرتے۔ (دیکھیے طائفہ منصورہ) شاید نواب صاحبؒ نے بھی امام اعظم کا خطاب متعصب لوگوں کے توحش کو کم کرنے کے لیے اختیار فرمایا ہے اور علامہ ذہبیؒ بھی ان کی تعریف الامام الاعظم سے شروع کرتے ہیں۔ "وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْلَامُ"۔ بعض قاصر اور غیر بالغ نظروں نے امام محمدؒ کی شخصیت کو بھی پہچانا نہیں۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ میرے (باقی اگلے صفحہ پر)

بھی کسی نماز میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے قائل نہ تھے۔ اور یہی مضمون ان کی کتاب الآثار ص ۲۱ میں بھی منقول ہے جن لوگوں نے امام محمدؒ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ وہ سترمی نمازوں میں مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھے کو مستحسن سمجھتے تھے۔ وہ غلطی پر ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن ہمام رحمہ (المتوفی ۷۸۸ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ جو لوگ امام محمدؒ کا یہ مذہب نقل کرتے ہیں کہ وہ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ کو جائز اور مستحسن سمجھتے ہیں وہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں۔

(فقید حاشیہ کچلا صفحہ) والد نے تیس ہزار درہم چھوڑے تھے، پندرہ ہزار میں نے نحو، شعر اور ادب کی تعلیم پر صرف کیے اور پندرہ ہزار حدیث اور فقہ کی تعلیم پر (بغدادی جلد ۲ ص ۱۷۳) امام شافعی رحمہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمدؒ سے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا ہے۔ اور اگر وہ نہ ہوتے تو مجھ پر علم کی اتنی راہیں نہ کھلتیں جتنی اب کھلی ہیں۔ اور میں نے امام محمدؒ سے بڑا کوئی شخص کتاب اللہ کا عالم نہیں دیکھا۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۳۲۳) امام ابو عیینہ کا بیان ہے کہ میں نے امام محمدؒ سے بڑا کوئی کتاب اللہ کا عالم نہیں دیکھا (بغدادی جلد ۲ ص ۱۷۵) امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس سے کوئی مشکل مسئلہ پوچھا جائے اور اس کے تیوروں پر پل نہ پڑے ہوں۔ البتہ ہاں محمدؒ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (ابن خلکان جلد ۲ ص ۴۵) امام شافعیؒ سے پوچھا گیا کہ آپ نے امام مالکؒ اور امام محمدؒ..... دونوں کی رفا کی ہے۔ ان دونوں میں بڑا فقیہ کون ہے؟ فرمایا امام محمدؒ باعتبار نفس کے امام مالکؒ سے بڑے فقیہ ہیں۔ (شذرات الذہب جلد ۲ ص ۳۲۲) اس سے ملتے جلتے الفاظ یحییٰ بن صالح رحمہ سے بھی منقول ہیں (بغدادی جلد ۲ ص ۱۷۵) امام دارقطنیؒ (المتوفی ۳۸۵ھ) باوجود متعصب ہونے کے امام محمدؒ کو ثقات اور حفاظ حدیث میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بیس عد وثقات اور حفاظ حدیث نے بیان کی ہے جن میں امام محمد بن الحسن الشیبانی، یحییٰ بن سعید القطان، عبد اللہ بن المبارک، عبد الرحمن بن مہدی، اور ابن وہب وغیرہ شامل ہیں (بحوالہ نصب الرأیہ جلد ۱ ص ۴۰۹) امام دارقطنیؒ ان کو ثقات اور حفاظ میں پہلے نمبر پر بیان کرتے ہیں۔ ۵۔

تیرے نام سے ابستہ کر رہا ہوں

میری انتہائے نگارش یہی ہے

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں امام محمدؒ سے زیادہ عقلمند کوئی نہیں دیکھا (البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۲۰۷) امام ابن عجمہؒ فرماتے ہیں کہ امام محمد بن الحسن فقیہ اور عالم تھے۔ انھوں نے امام مالکؒ سے بہت حدیثیں لکھی ہیں اور اسی طرح ثوریؒ وغیرہ بھی۔ (الانتصار ص ۱۶)

لے صاحب درفتار نے لکھا ہے کہ امام محمدؒ کی طرف یہ نسبت کہ وہ امام کے پیچھے (باقی اگلے صفحہ پر)



ان کا قول حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اور امام ابو یوسف رحمہ کی طرح ممانعت کا ہے۔ (بجائے فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۷)  
 امام ابو یوسف (المتوفی ۱۸۳ھ) کا مسکب بھی اس سے واضح کاف اور آشکارا ہو گیا ہے کہ وہ بھی جملہ  
 نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) قرآن کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ضعیف ہے اور علامہ شامیؒ لکھتے ہیں کہ امام محمدؒ  
 نے کتاب الآثار میں تصریح کی ہے کہ ہم جہری اور ستری..... کسی نماز میں امام کے پیچھے قرآن کے قائل نہیں ہیں۔  
 ودعوی الاحتیاط ممنوعہ بل اور یہ دعویٰ کہ امام کے پیچھے قرآن کرنے میں  
 الاحتیاط ترک القراءة لعنه العمل احتیاط ہے تو یہ دعویٰ ممنوع ہے بلکہ احتیاط ترک  
 باقوی الدلیلین ۱۵۔ قرآن میں ہے کیونکہ یہاں دو دلیلوں میں سے قوی تر

(رد المحتار جلد ۱ ص ۳۶۶) دلیل پر عمل ہو رہا ہے۔

۱۵ امام ابو یوسفؒ کے بارے میں فریق ثانی بعض محدثین کا ترک کوہ کا جملہ لیے لیے پھرتا ہے۔ حالانکہ بات  
 یہ نہیں ہے۔ امام نسائی رحمہ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (ضعفاء صغیر ص ۵)۔ امام بیہقی لکھتے ہیں: وہ  
 ثقہ تھے (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۳۴۳) حافظ عبدالقادر القزلباشیؒ (المتوفی ۷۵۵ھ) فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ اور امام  
 ابن معینؒ اور امام علی بن المدینی رحمہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں۔ (الجواهر المضیۃ جلد ۲ ص ۲۲۱)

علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن معین رحمہ اور امام احمد بن حنبلؒ اور علی بن مدینیؒ سب کا اس بات  
 پر اتفاق ہے کہ امام ابو یوسفؒ ثقہ تھے۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۲۳) علامہ ذہبیؒ ان کو امام العلماء اور فقیہ القراءین  
 لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۶۹) امام مزنی رحمہ کا بیان ہے کہ فقہاء اور اصحاب الرائے میں وہ سب سے  
 زیادہ حدیث کی اتباع کرنے والے تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۱۸) امام ابن قتیبہؒ (المتوفی ۲۷۶ھ)۔  
 ان کو صاحب سنت اور حافظ لکھتے ہیں۔ (معارف ابن قتیبہ ص ۱۷) امام ابن معینؒ ان کو صاحب حدیث اور  
 صاحب سنت کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۶۹) اور ان سے یہ بھی منعول ہے کہ اصحاب رائے میں وہ سب سے  
 زیادہ حدیثیں روایت کرنے والے اور اثبت فی الحدیث تھے۔ (ایضاً) علامہ ابن خلکانؒ (المتوفی ۷۸۱ھ) لکھتے  
 ہیں کہ امام ابو یوسفؒ حافظ اور کثیر الحدیث تھے (ابن خلکان جلد ۲ ص ۳۰۳) علامہ عبدالقادرؒ (المتوفی ۷۹۹ھ) لکھتے  
 کہ مشرق سے مغرب تک قضاۃ کی تقرری ان کے سپرد تھی (الجواهر المضیۃ جلد ۲ ص ۲۲۱) امام ابن جریرؒ ابن جوزیؒ اور  
 ابن جبانؒ ان کو عالم حافظ اور فقیہ کہتے ہیں (مقدمہ زبلی ص ۱۸) اور امام بیہقیؒ بن معینؒ سے امام ابو یوسفؒ کے

**حضرت امام مالکؒ (المتوفی ۱۷۹ھ)** بھی امام کے پیچھے پھر نمازوں میں مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے حق میں نہ تھے۔ اور ستر نمازوں میں گو امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کی مقتدی کو اجازت دیتے ہیں۔ لیکن مع نذر وجوب کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ ستر نمازوں میں وجوب قرآن خلف الامام کے قائل نہ تھے۔  
(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷)

(بقیہ حاشیہ) بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا ثقہ صدوق (مناقب کردری جلد ۱ ص ۲۲ و مناقب موفق ۱۹۲) امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ مجھے جب طلبِ حدیث کا شوق حاصل ہوا تو سب سے پہلے میں قاضی ابویوسفؒ کی خدمت میں حاضر ہوا (بغدادی جلد ۱ ص ۱۲۵) امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ وہ شیخ اور متقن تھے۔ (لسان المیزان جلد ۱ ص ۱۳) علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ وہ حسن الحدیث ہیں (تلخیص المستدرک جلد ۱ ص ۳) امام ابن عبدالبرؒ امام طبرانی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابویوسفؒ فقیہ عالم اور حافظ تھے پچاس اور ساٹھ تک حدیثیں وہ ایک مجلس میں یاد کر لیا کرتے تھے اور وہ کثیر الحدیث تھے۔

### (الانتقاء ص ۱۷۲)

۱ امام مالکؒ کا یہ مذہب و مسلک ان کی مشہور کتاب موطا ص ۲۹ اور تفسیر کبیر جلد ۴ ص ۵۰ و معالم التنزیل جلد ۳ ص ۶۲۳ و روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ و فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۷ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۵ وغیرہ میں منقول ہے۔

۲ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، فقیہ الامت، شیخ الاسلام اور امام دار ہجرت تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۳) امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ اگر امام مالکؒ اور ابن عیینہؒ نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہو جاتا امام ابن وہبؒ فرماتے ہیں اگر امام مالکؒ اور امام لیثؒ نہ ہوتے تو ہم گمراہ ہو جاتے۔ (تذکرہ ص ۱۹۴)

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں۔ میں نے امام اسحاق بن ابراہیمؒ کو کہتے سنا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر امام مالکؒ، امام ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ کسی مسئلہ پر متفق ہو جائیں تو وہی مسئلہ حق اور سنت ہو گا۔ اگرچہ اس میں نص موجود نہ بھی ہو۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۵) واقع السطور کہتا ہے کہ امام ثوریؒ اور اوزاعیؒ سب نمازوں میں اور امام مالکؒ پھر نمازوں میں ہمارے ساتھ ہیں اور ستر نمازوں میں بھی وجوب کے قائل نہیں ہیں۔ لہذا اس مسئلہ میں یہی مسئلہ حق اور سنت ہے اور نص قرآنی اور احادیث صحیحہ کے صریح حوالے اسکی مستزاد ہیں جو سونے پر سہاگہ ہے۔



حضرت امام شافعیؒ (المتوفی ۲۰۴ھ) امام موصوف کا مسئلہ زیر بحث میں صحیح مسلک کیا تھا؟ اس کے سمجھنے اور نقل کرنے میں بڑے بڑے ائمہ فن نے بھیج دریچ غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اور اس کو ایک معمر اور عقدہ لائیکل بنا دیا ہے۔ کسی نے یہ کہہ دیا کہ امام موصوف سب نمازوں میں قرآن الفاتحہ خلف الامام کے وجوب کے قائل تھے۔ اور کسی نے کہہ دیا کہ ان کا قیوم قول یہ ہے کہ جسری (بقیہ حاشیہ) امام عبد الرحمن بن مہدیؒ، امام مالکؒ پر کسی کو ترجیح نہ دیتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۱۸۷) علامہ ابن سعد فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ ثقہ، مامون، ثبت، متورع، فقیہ، عالم اور حجت تھے۔

(تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۱۸۷)

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد الاثنتہ الاربعہ، اصحاب المذہب المتبعہ تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۱۸۷) امام ابن عبد البرؒ نے کتاب الانتقار میں کم و بیش ۶۴ صفحات میں ان کے فضائل بیان کیے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ فرماتے ہیں۔ امام دار ہجرت و امامے از ائمہ مذاہب (تقصیر جلد ۹) لہ علامہ فہمی ان کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں۔ الامام العلم۔ جبر الامت اور ناصر السنۃ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۲۹) امام سنی بن راہونہؒ فرماتے ہیں۔ مجھ سے امام احمدؒ نے فرمایا۔ آؤ تمہیں ایسا شخص بتاؤں جس کا نظیر اور ثقیل تم نے نہیں دیکھا ہوگا۔ پھر مجھے امام موصوف کے پاس لے گئے۔ بغدادی جلد ۲ ص ۶۹، امام ابو ثورؒ فرماتے ہیں میں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ خود انھوں نے بھی اپنا نظیر نہیں دیکھا ہوگا۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۲۹)۔ امام ابن عبد الحکمؒ لکھتے ہیں کہ امام شافعیؒ ہر بات میں حجت ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۸۷)

امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ احد العلماء ثقہ اور مامون تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۸۷) حافظ ابن کثیرؒ نے ان کی ایسے شاندار الفاظ اور عبارات سے تعریف کی اور عقیدت کے پھول برسائے ہیں جن کے واقعی امام موصوف اہل اور مستحق ہیں۔ (دیکھیے البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۲۵) علامہ ابن عبد البرؒ نے ابن عبد الحکمؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ صاحب سنت و اثر اہل فضل و فصاحت اور مضبوط عقل کے مالک تھے۔

(الانتقار ص ۷۳)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں۔ امام شافعیؒ ہم افضل وقت وہم اعلم عہد وہم حجة الامم وہم مقدم الامم۔ (تقصیر ص ۹۳) یہ قول علامہ بدر الدین علیؒ نے عمدۃ القاری جلد ۳ ص ۶۳ میں اور اسی طرح دوسرے ائمہ نے بھی نقل کیا ہے۔

نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت نہ کی جائے۔ اور قول جدید یہ ہے کہ جہری ہوں یا ستری، تمام نمازوں میں قرآن واجب ہے۔ اور کسی نے یہ کہہ دیا کہ امام موصوف کے دو قول ہیں۔ ایک جہری نمازوں میں ممانعت کا اور دوسرا اجازت کا۔ لیکن حقیقت ان تمام باتوں کے بالکل عکس ہے۔

امام موفق الدین ابن قدامہ الحنبلیؒ (المتوفی ۶۲۰ھ) تحریر فرماتے ہیں:

وجملة ذلك ان القراءة غير واجبة  
على المأموم فيما جهر به الامام ولا فيها  
استربه نص عليه احمد في رواية  
الجماعة وبذلك قال الزهری والنووی  
وابن عیینہ ومالك وابو حنیفہ وأخی  
اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مقتدی پر قرأت واجب  
نہیں نہ جہری نمازوں اور نہ ستری میں امام احمدؒ  
بن حنبلؒ نے صراحت کے ساتھ یہ بیان کیا ہے جیسا کہ  
علماء کی ایک جماعت نے ان سے نقل کیا ہے اور امام  
نہرہمیؒ، فورہمیؒ، سفیان بن عیینہؒ، مالکؒ، ابو حنیفہؒ اور

یہ قول امام بیہقیؒ نے (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۴) میں اور دوسرے اکابر نے بھی نقل کیا ہے جن میں حافظ  
ابن کثیر بھی ہیں۔ (تفسیر جلد ۲ ص ۲۸۳)

یہ قول امام مزنیؒ (المتوفی ۲۶۴ھ) نے مختصر منی جلد ۱ ص ۴۸ میں امام بیہقیؒ نے (کتاب القراءۃ ص ۱) میں  
اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے (تنوع العبادات ص ۴) میں نقل کیا ہے۔

آپ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک پر تھے اور سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے تلامذہ میں تھے۔  
حدیث، فقہ، تفسیر اور طبقات روایات کے متبحر اور بے مثل عالم تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب یوں ہے۔  
عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ الدمشقی جو الفقیہ، الزاہد، الامام، شیخ الاسلام اور احوال اعلام تھے۔ علامہ  
ابن خبارؒ کا بیان ہے کہ وہ امام الحنابلہ، ثقہ، حجت، نبیل، غزیر الفضل، کامل العقل اور شدید التثبت تھے۔

امام ابو شامہؒ کہتے ہیں کہ وہ شیخ الحنابلہ، امام من ائمة المسلمين، علم من اعلام الدين في العلم والعمل تھے۔ محدث  
ضد۔ لکھتے ہیں کہ وہ علوم قرآن و حدیث، فقہ و علم خلافت کے امام اور یکتائے روزگار تھے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ  
کہتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ کے بعد ملک شام میں ان سے بڑا کوئی امام داخل نہیں ہوا۔ علامہ ذہبیؒ نے ان کے اوصاف

حمیدہ پر دو مستقل جلدیں لکھی ہیں۔ (ترجمہ الشیخ فی بدر المنفی ص ۶، ۳، ۴) علامہ عز الدین بن عبدالسلامؒ (المتوفی  
۶۶۰ھ) فرماتے ہیں۔ میں نے اسلام میں دو کتا بوں کی مثال نہیں دیکھی۔ ایک محلی (علامہ ابن حزمؒ) (المتوفی ۵۵۰ھ)



وقال الشافعي وداؤد لعموم قوله عليه السلام لا صلوة لمن لا يقرأ بفاتحة الكتاب غير أنه خص في حال الجهل بالامر بالانصات فبقيا على العموم - (مغني ابن قدامة جلد ۱ ص ۱۸۱)

اسحاق اسی کے قائل ہیں۔ امام شافعیؒ اور داؤد فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث کہ جس شخص نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہ ہوگی۔ عام ہے مگر جہری نمازیں اس حدیث سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان میں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور جہری نمازوں کے علاوہ یہ حدیث اپنے عموم پر باقی رہے گی۔

اس عبارت سے یہ امر بالکل عیاں ہو جاتا ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ نص قرآنی اور حدیث صحیحہ ائمتہ کے خلاف ہے۔ اس عبارت سے جس طرح امام شافعیؒ کا مسلک واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح امام داؤد ظاہری کا مسلک بھی نمایاں ہو جاتا ہے کہ وہ بھی جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرآن کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے فاتحہ الکتاب کا پڑھنا انصاف مامور بہ کے منافی ہے۔ ممکن ہے کسی صاحب کو یہ شبہ پیدا ہو کہ ہو سکتا ہے امام ابن قدامہ ہی کو امام شافعیؒ کے مسلک کے سمجھنے اور نقل کرنے میں غلطی واقع ہوئی ہو۔ اس لیے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود امام شافعیؒ کی تحریروں سے اس مسئلہ کو حل

بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) اور دوسری مغنی ابن قدامہ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۳۲۵ و لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۰۸) حافظ تقی الدین علی بن عبد الکافیؒ (المتوفی ۷۵۶ھ) لکھتے ہیں کہ مغنی ابن قدامہ حنبلی کی بلند پایہ اور معتد کتاب ہے (شفاء السقام ۲ ص ۱۲۹) اور حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ وہ شیخ الاسلام تھے۔ جمہیہ اور معتدل کے بغیر باقی تمام فرقہ ان کی مقبولیت، تعظیم اور امامت پر متفق ہیں (اجتماع البحیرش الاسلامیہ ص ۶۹ طبع امرتسر) لہ امام داؤد بن علیؒ (المتوفی ۶۷۰ھ) علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ اصحاب ظاہر کے امام متوجع، عابد اور زاہد تھے (بغدادی جلد ۸ ص ۳۶۹)

علامہ ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ ان کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں۔ المحافظ، الفقیہ، المجتہد اور

فقیہ اہل الظاہر۔

(تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۳۶)

کردیں۔ امام موصوف تحریر فرماتے ہیں:

والصمد في ترك القراءة بام القرآن  
والخطأ سوءاً في ان لا تجزئ ركعة

الابها او بشئ معها الا ما يدكر  
من المأموم انشاء الله تعالى۔

(کتاب الامم جلد ۱ ص ۹۹)

سورۃ فاتحہ کا دیکھ دانستہ ترک کرنا اور بھول کر  
ترک کرنا دونوں کا حکم ایک ہے کہ کوئی رکعت سورۃ  
فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنے کے  
بغیر جائز نہیں ہو سکتی۔ ہاں مگر مقتدی کا حکم آگے  
ذکر کیا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔

امام موصوف کی اس عبارت کو بار بار پڑھتے اور ملاحظہ کیجئے کہ مقتدی کے لیے سورۃ  
فاتحہ کے پڑھنے کو کیوں متثنیٰ قرار دیتے ہیں؟ اگر مقتدی کے لیے بھی سورۃ فاتحہ کا پڑھنا  
ویسا ہی ضروری ہے جیسا کہ امام اور منفرد کے لیے تو ان کی اس تفریق کا کیا مطلب؟ پھر آگے  
تحریر فرماتے ہیں:

فواجب علی من صلی منفرداً او

اماماً ان یقرأ بام القرآن فی کل رکعة

لا یجوز له غیرها و احب ان یقرأ

معها شيئاً آیه او اکثر و سا ذکر

المأموم انشاء الله تعالى۔

(کتاب الامم جلد ۱ ص ۹۳)

سو منفرد اور امام پر واجب ہے کہ وہ ہر رکعت  
میں سورۃ فاتحہ پڑھیں اس کے علاوہ کوئی اور سورۃ  
کفایت نہیں کر سکتی اور میں اس کو بھی زیادہ  
پسند کرتا ہوں کہ سورۃ فاتحہ کے علاوہ کچھ اور بھی  
پڑھیں ایک آیت ہو یا اس سے زیادہ۔ اور میں  
مقتدی کا حکم آگے بیان کر دوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس عبارت میں بھی امام موصوف، امام اور منفرد کی تصریح کرتے ہوئے ان کا یہ فریضہ اور  
وظیفہ بتلاتے ہیں کہ ان کو نماز کی ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھنی ضروری ہے۔ مگر یہ بھی تصریح  
کرتے ہیں کہ مقتدی کا وظیفہ اور ثبوتی کچھ اور ہی ہے۔ جس پر ہر نماز اور ہر رکعت میں سورۃ  
فاتحہ کا پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ میں انشاء اللہ العزیز خود اس کا حکم  
بیان کر دوں گا۔ وہ کونسا حکم ہے جس کا دو مرتبہ وعدہ کیا ہے؟ تحریر فرماتے ہیں۔

اور ہم کہتے ہیں کہ ہر وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی

جائے اور امام ایسی قرآن کریم جو سنی نہ جاتی ہو

و نحن نقول کل صلوة صلیت

خلف الامام والامام یقرأ قرآن لا



یسمع فیہا قرأت فیہا۔ تو مقتدی ایسی نمازیں قرأت کرے۔

(کتاب الامم جلد ۷ ص ۱۵۳)

امام شافعیؒ کی یہ عبارت اس بات کو واشگاف کرتی ہے کہ مقتدی کو جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنا درست نہیں ہے اور نہ واجب ہے۔ بلکہ مقتدی صرف ان نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھ سکتا ہے جن میں امام کی قرأت نہ سنی جاسکتی ہو اور وہ ستری نماز ہے۔ اسی لیے انھوں نے قرأت لا یسمع ارشاد فرما کر جہری اور ستری نمازوں میں مقتدی کا وظیفہ متعین کر دیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص اس کا دعویٰ کرے کہ حضرت امام شافعیؒ تمام نمازوں میں مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ کے وجوب کے قائل ہیں تو وہ نہ صرف یہ کہ خوش فہمی اور غلطی کا شکار ہے بلکہ اس کو تعدیل مزاج کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔

فائدہ: راقم الحروف کہتا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کی تعیین میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے اور قول قدیم و جدید کا جو جھگڑا چل نکلا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہی کچھ اور ہے۔ وہ یہ کہ امام الحرمینؒ (المتوفی ۲۴۷ھ) وغیرہ نے غلطی سے کتاب الامم کو امام شافعیؒ کی کتب قدیمہ میں شامل سمجھ لیا ہے۔ اور دوسرے ائمہ نے بھی اس امام عالی مقام کی جلالت شان کی وجہ سے اس بات پر بھروسہ اور اعتماد کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ ان کی غلطی ہے اور یہ سارا جھگڑا ہی اس مفروض پر مبنی ہے۔ ہم اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی اس تاریخی غلطی پر دو تاریخی شہادتیں نقل کرتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ثم انتقل منها الى مصر فاقام بها الى ان مات في هذه السنة (۳۲۰ھ) وحسن كتاب الامم وهو من كتبه الجديدة لانها من رواية الربيع بن سليمان وهو مصري

پھر حضرت امام شافعیؒ بغداد سے مصر کی طرف روانہ ہوئے اور وہیں اقامت پذیر ہوئے حتیٰ کہ ۳۲۰ھ میں اسی جگہ ان کی وفات ہوئی اور مصر میں ہی انھوں نے کتاب الامم تصنیف کی ہے اور وہ ان کی جدید کتابوں میں ہے۔

لہٰذا ان کا نام عبدالملک، ابوالمعالی کنیت، اور الجویسی (ان کے والد ابو محمد عبداللہ الجویسیؒ کی طرف) نسبت ہے۔ یہ امام غزالیؒ (المتوفی ۵۰۵ھ) کے استاد تھے۔ حدیث، فقہ اور اصول اور دیگر علوم اور فنون میں پانپانظر نہیں رکھتے تھے۔ اپنے زمانہ میں علماء شوافع کے سربراہ تھے۔ حرم مکہ اور حرم مدینہ میں عرصہ دراز تک علوم اسلامیہ کی تعلیم دیتے رہے۔ اس لیے امام الحرمین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ (الجواہر المفصیہ جلد ۲ ص ۲۳۶-۲۳۷ و فوائد البیہ ص ۲۲۲ طبع مصر)

وقد زعم امام الحرمين وغيره  
انها من القديم وهذا بعيد وعجيب  
من مثله -

البدایہ والنہایۃ جلد ۱۰ ص ۲۵۲) الحرمین ایسے امام سے بڑی ہی بعید اور نرالی بات ہے۔

حافظ موصوف کی یہ عبارت بڑی واضح اور صاف ہے کہ امام الحرمینؒ وغیرہ کا یہ دعویٰ کرنا کہ یہ کتاب یعنی کتاب لام، امام شافعیؒ کی قدیم کتابوں میں شامل ہے نہ صرف تاریخی لحاظ سے باطل اور مردود ہے بلکہ اس کے مدعی صواب سے بڑے دور اور بڑی عجیب بات کے مرتکب ہوئے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں بنا بر اس مفروض کے اجازت کا قول امام شافعیؒ کا قول جدید قرار دیا ہے لیکن چونکہ البدایہ والنہایہ تفسیر کے بعد کی تصنیف ہے جیسا کہ خود انہوں نے البدایہ میں اس کی تصریح کی ہے۔ اس لیے ان کی اس جدید تاریخی تحقیق کے بعد تفسیر کا حوالہ قابل التفات نہیں ہے۔

دوسری شہادت امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۹۱۱ھ) کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ثم خرج الى مصر وصنف بها كتابه  
پھر حضرت امام شافعیؒ مصر کی طرف روانہ ہوئے۔

الجدیدۃ کا اہم الخ (حسن المحاضرہ جلد ۱ ص ۱۲) اور وہاں کتب جدیدہ تصنیف کیں جن میں کتاب الام بھی ہے

ان تاریخی شہادتوں سے ثابت ہو گیا کہ کتاب لام حضرت امام شافعیؒ کی کتب جدیدہ میں ہے۔ اور امام کے پیچھے مقتدی کا سورۃ فاتحہ کو جہری نمازوں میں ترک کرنا ان کا قول جدید ہے نہ کہ قول قدیم۔

مصنف خیر الکلام نے ان ٹھوس حوالہ جات سے اپنے جواب کے سلسلہ میں جو مخلص تلاش کیا

وہ یہ ہے:

(۱) کہ امام شافعیؒ مصر میں پانچ سال رہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے مصر جا کر پہلے ہی فتویٰ دیا ہو مگر

بعد میں اس سے رجوع کیا ہو جیسا کہ ہم نے انور شاہ صاحبؒ عبارت میں نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ نے وفات سے دو سال قبل مقتدی کو جہری نماز میں قرآن کے روکنے سے رجوع کیا ہے بس محض اس عبارت کا مصری کتاب میں ہونا آخری قول ہونے کی کیسے دلیل بن سکتا ہے بلکہ اس جگہ تصریح کی

ضرورت ہے۔ اھ (خیر الکلام ص ۲۴)

(۲) مختصر مرنی امام شافعیؒ کے ان مسائل کا مجموعہ ہے جو مصر میں بیان فرمائے اور اختیار کیے ہیں۔



(ضعی الاسلام جلد ۲ ص ۹۱) بلکہ مرنی رحمہ الامام شافعی رحمہ کے مصری شاگردوں سے ہے۔ (ضعی الاسلام جلد ۲ ص ۲۲۲)  
(خیر الکلام ص ۲)

(۳) امام بیہقی رحمہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ کا صحیح قول یہی ہے کہ قرأت واجب ہے امام جہر کرے یا نہ کرے۔ (خیر الکلام ص ۲)

(۴) امام ترمذی رحمہ نے لکھا ہے کہ اگر فاتحہ نہ پڑھی جائے تو نماز کسی کام کی نہیں رہتی اکیلا پورا امام کے پیچھے ہو امام شافعی رحمہ اور امام اسحاق رحمہ اور ان کے علاوہ اور علماء کا یہی مسلک ہے۔ (خیر الکلام ص ۲)

(۵) امام ابن عبد البر رحمہ فرماتے ہیں کہ فاتحہ خلف الامام کے واجب ہونے کے مندرجہ ذیل ائمہ قائل ہیں امام اوزاعی رحمہ، امام لیث رحمہ بن سعد رحمہ امام شافعی رحمہ جب مصر میں گئے اور یہی ان کے اکثر شاگردوں کا مذہب ہے۔ ان سے امام مرنی رحمہ اور امام بو لیطی رحمہ ہیں امام ابو ثور رحمہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

(تمہید ابن عبد البر - تحقیق) (خیر الکلام ص ۲)

(۶) کتاب الامام کی پہلی اور دوسری عبارت میں تصریح نہیں کہ مقتدی پر جہری نمازوں میں فاتحہ واجب نہیں منفرد اور امام کے متعلق دو احتمال ہیں ایک یہ کہ ان پر صرف فاتحہ واجب ہو۔ دوسرا یہ کہ ان پر فاتحہ اور رازاد دونوں واجب ہوں مگر مقتدی کے بارے میں دو احتمال نہیں صرف ایک ہی احتمال ہے۔ (محصلة خیر الکلام ص ۲۵، ۲۶)

(۷) کتاب الامام کی تیسری عبارت میں فاتحہ کا ذکر نہیں مطلق قرآن کا ذکر ہے۔ (محصلة خیر الکلام ص ۲)  
(۸) البدایہ والنہایہ تفسیر سے پہلے کی کتاب ہے۔ کیونکہ تفسیر میں دو جگہ اس کا حوالہ دیا ہے۔

(محصلة خیر الکلام ص ۲۷، ۲۸)

(۹) حافظ ابن کثیر رحمہ لکھتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ مقتدی جہری نماز میں بھی پڑھے اسی طرح امام لیث رحمہ، امام اوزاعی رحمہ، امام ابن عون رحمہ امام کحول رحمہ اور امام ابو ثور رحمہ سے بھی مروی ہے۔  
(جلد ۱ حق ۶) (خیر الکلام ص ۲)

(۱۰) معالم التنزیل میں ہے کہ ایک جماعت کے نزدیک قرآن واجب ہے خواہ امام قرآن بلند آواز سے پڑھ رہا ہو یا آہستہ یہ قول حضرت عمر رضی، حضرت عثمان رضی، حضرت علی رضی، حضرت ابن عباس رضی اور معاذ رضی سے مروی ہے امام اوزاعی رحمہ اور امام شافعی رحمہ کا بھی یہی قول ہے۔ (خیر الکلام ص ۲۸، ۲۹)  
(۱۱) علامہ ابن قدامہ رحمہ ایک جگہ یہ نقل فرماتے ہیں کہ امام کے لیے فاتحہ کے بعد سکتہ کرنا مستحب ہے تاکہ اس

میں آرام کرے اور مقتدی فاتحہ پڑھ لے تاکہ مقتدی کی طرف سے امام کے ساتھ ساتھ پڑھنے سے منازعہ واقع نہ ہو۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، امام اسحاق کا یہی مذہب ہے۔ (خیر الکلام ص ۲۵)

**اجواب :** ہم بفضلہ تعالیٰ خیر الکلام کے ترتیب وار جوابات عرض کرتے ہیں غور فرمائیں۔  
(۱) ٹھوس تاریخی حوالوں اور شہادتوں کو رد کرنے کے لیے صرف ہو سکتا ہے۔۔۔۔ الخ

کوئی جواب نہیں۔ مصنف خیر الکلام پر اخلاقی طور پر لازم تھا کہ وہ صراحت کے ساتھ دو تاریخی اور ٹھوس حوالوں کے ساتھ یہ نقل فرماتے کہ فلاں کتاب حضرت امام شافعیؒ نے کتاب الام کے بعد لکھی ہے اور اس میں یہ لکھا ہے کہ مقتدی پر سورہ فاتحہ یا قرآۃ کا پڑھنا واجب ہے اور عبارت یہ ہے۔ جب وہ ایسا نہیں کر سکے تو یقیناً کامل رکھیں کہ کتاب الام کی صریح عبارتوں کا جواب تاہنوز کوئی نہیں ہوا۔ رہا حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کا حوالہ تو وہ مؤلف

خیر الکلام کو چنداں مفید نہیں ہے کیونکہ اس میں صرف اس قدر ہے کہ امام شافعیؒ نے وفات سے دو سال پہلے مقتدی کے لیے جہری نمازوں میں ترک قرآۃ سے رجوع کیا ہے۔ اس سے وجوب کیسے ثابت ہوا؟ چنانچہ خود مؤلف خیر الکلام حضرت شاہ صاحبؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ پھر مجھے علم نہیں کہ امام شافعیؒ نے جہری میں وجوب پسند کیا جیسے کہ شافعیہؒ کا مسلک ہے یا صرف استحباب کو۔ (فیض الباری جلد ۲ ص ۲۶۱) اور فصل الخطاب میں فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں امام شافعیؒ بھی جہری نمازوں میں صرف پڑھنے کو پسند کرتے ہیں فرض نہیں سمجھتے۔ (خیر الکلام ص ۲) باقی رہا فیض الباری جلد ۱ ص ۳۵۳ کا حوالہ جس میں لکھا ہے کہ امام شافعیؒ وفات سے دو سال پہلے مقتدی پر قرآۃ کے وجوب کے قائل ہو گئے تھے۔ (محصلاً) تو ظن غالب یہ ہے کہ یہ مترجم صاحب کی غلطی ہے جنہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کی املاقی تقریر کو اپنی صوابدید کے مطابق عربی کا جامہ پہنایا ہے ورنہ یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ جلد اول میں وجوب کا حکم بیان فرمائیں اور جلد ثانی میں فرمائیں کہ مجھے کوئی علم نہیں کہ آیا وہ وجوب کے قائل تھے یا استحباب کے؟ اور فصل الخطاب میں یہ فیصلہ صادر فرمائیں کہ امام شافعیؒ جہری نمازوں میں صرف پڑھنے کو پسند کرتے تھے فرض نہیں سمجھتے تھے۔ غور فرمائیے کہ تحقیقی طور پر اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ اور خود مولانا سید انور شاہ صاحبؒ کہتے ہیں:



ونقل ابن تیمیہ الاجماع عندہ  
یدل علی ان وجوب القراءة فی  
الجمعیۃ خلاف الاجماع اولم ینہب  
الیہ احد من اهل الاسلام۔ اھ  
کہ حافظ ابن تیمیہ نے امام احمد بن حنبلؒ سے  
اجماع نقل کیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا  
ہے کہ جہری نمازوں میں وجوب قرآن خلاف  
اجماع ہے یا اہل اسلام میں سے اس کا ایک شخص  
(فیض الباری جلد ۲ ص ۲۷۲) بھی قائل نہیں ہے۔

پھر کیونکر سمجھ لیا جائے کہ ان کے نزدیک امام شافعیؒ جہری نمازوں میں وجوب قرآن کے قائل  
ہیں اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ واقعی امام شافعیؒ وفات سے دو سال پہلے مقتدی کے لیے وجوب  
قرآن کے قائل ہو گئے تھے تب بھی ایک بات نہایت ہی قابل توجہ ہے وہ یہ کہ تقریباً پچاس سال  
تک جو نمازیں حضرت امام شافعیؒ نے پڑھی ہیں جن میں وہ جہری نمازوں میں قرآن خلاف الامام کے  
قائل نہ تھے کیا ان کی وہ نمازیں درست اور صحیح ہیں یا نہیں؟ اور کیا صرف دوسرے حضرات کی  
نمازیں ہی جن میں قرآن فاتحہ نہ کی گئی ہو باطل کا لعدم اور بیکار ہیں یا حضرت امام شافعیؒ کی ان نمازوں  
کا بھی یہی حشر ہے؟ اگر کسی اور کی تحقیق بھی دیا تاؤ ہی ہو جو وفات سے دو سال قبل تک حضرت امام  
شافعیؒ کی بھی توفرماتی ہے کہ اس کی نماز کیوں کا لعدم، بیکار اور باطل ہوگی؟ یا یہ چورن اور  
امرت دھار صرف حنفیوں کے لیے ریزرو اور وقف ہے۔ کیا خوب؟

ابھی کیا ہے ابھی تو ابتدا ہے دیکھتے جاؤ

ہمارے حال پر یاروں کے احسان اور بھی تنگ

(۲) چونکہ باقر صاحب خیر الکلام حضرت امام شافعیؒ مصر میں پانچ سال رہے تھے اس  
لیے اگر مختصر مزنی ان کے مصری مسائل کا مجموعہ بھی ہو اور مزنی ان کے مصری شاگرد بھی ہوں تب  
بھی اس سے یہ کیونکر ثابت ہو کہ یہ مجموعہ کتاب الام سے بھی بعد کا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ یہ  
پہلے کا ہو اور کتاب الام ان کی صحیح طور سے کتب جدیدہ میں ہو اور امام مزنیؒ نے باوجود مصری  
ہونے کے مختصر مزنی کی تدوین کتاب الام سے پہلے کی ہو۔ یہ جواب صحیح ہونے کے علاوہ مصنف  
خیر الکلام کی اپنی پسند کا بھی ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ اگرچہ  
امام مزنیؒ اور امام بولیطیؒ صاحب شافعی رحمہ اور بڑے پائے کے محدث اور فقیہ تھے۔

لیکن ربیع بن سلیمان المرادی رحمہ (المتوفی ۲۷۰ھ) کو ان دونوں پر ترجیح ہے۔ چنانچہ امام خلیلیؒ فرماتے ہیں کہ

ثقة متفق عليه والمزني مع جلالة  
ربيع بن سليمان ثقة اور متفق عليه ہیں اور  
استعان على ما فات عن الشافعي بكتاب  
امام مزنی رحمہ نے باوجود جلالت شان کے جو مسائل  
الربيع وقال مسئلة من كبار اصحاب  
امام شافعیؒ کے ان سے چھوٹ گئے تھے ان میں  
الشافعي رح - (۱۵)  
ربيع کی کتاب سے استعانت کی ہے اور مسلمہ  
فرماتے ہیں کہ ربیع امام شافعیؒ کے بڑے اصحاب میں  
تہذیب التہذیب جلد ۳،  
ص ۲۴۶) شمار کیے جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام مزنی کو حضرت امام شافعیؒ کے تمام مسائل معلوم نہ تھے بلکہ ان سے کچھ چھوٹ بھی گئے تھے اور امام شافعیؒ کے مسائل میں وہ ربیع بن سلیمان رحمہ کے خوشہ چیں تھے۔ پھر کیوں نہ ہو کہ حضرت امام شافعیؒ کے مسائل میں امام ربیع بن سلیمانؒ پر اعتماد کیا جاتے جن پر خود امام مزنیؒ نے اعتماد کیا ہے۔ اور مولیٰ احمد بن مصطفیٰ المعروف بطاش کبریٰ زادہ رحمہ (المتوفی ۱۹۴۲ھ) لکھتے ہیں کہ

الربيع بن سليمان — الثقة الثابت  
ربيع بن سليمان — جو کچھ بھی روایت کرتے  
فیما یروید حتی رجوا روايته عند تعارض  
ہیں اس میں وہ ثقہ اور ثابت ہیں حتیٰ کہ محدثین رحمہ  
المنزني مع علوقدر المنزني علماً و دیناً و  
نے ان کی روایت کو مزنیؒ کی روایت پر جب کہ دونوں  
جلالة - ۵۱  
کی روایت کا تعارض ہو ترجیح دی ہے۔ حالانکہ امام  
مزنیؒ علم اور دین اور جلالت میں بلند مرتبہ تھے۔  
(مفتاح السعادة ومصباح السيادة جلد ۲  
ص ۱۶۲ طبع حیدرآباد دکن)

اس سے بھی ثابت ہوا کہ جب امام ربیع اور امام مزنیؒ کی روایت میں تعارض ہو تو محدثین کرام کے نزدیک امام ربیع بن سلیمانؒ کی روایت کو ترجیح ہوتی ہے۔ اور امام ابوالحسین رحمہ فرماتے ہیں کہ

البويطي كان يقول الربيع اثبت في  
امام بویطی فرماتے تھے کہ امام شافعیؒ سے روایت



الشافعی رحمہ منی ۱۵ (تمہید النہذیب کرنے میں ربیعؒ مجھ سے بھی زیادہ اثبات ہیں۔

جلد ۳ ص ۲۳۶)

قطع نظر کتاب الام اور مختصر منی اور مختصر بولیطی کے تقدم و تاخر کے خود امام بولیطیؒ اور محدثین کے فیصلے کی رو سے امام ربیع بن سلیمانؒ کی روایت کو تاریخی اور صریح حوالوں کے پیش نظر ترجیح ہے۔ اس لیے اگر بالفرض تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کتاب الام پہلے کی ہے اور مختصر منیؒ اور مختصر بولیطیؒ بعد کی ہیں تب بھی ترجیح امام ربیع بن سلیمان ہی کی روایت کو ہوگی جو کتاب الام کے اور امام شافعیؒ کے مسائل کے راوی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بقول حافظ ابن تیمیہؒ خلاق اصحاب الشافعیؒ مثلاً امام رازیؒ اور ابن عبد السلامؒ وغیرہ نے اسی پر عمل کیا ہے کہ جہرمی نمازوں میں قرآن خلف الامام درست نہیں۔ (عبارت آگے آ رہی ہے)

(۵۴۳ د ۵) کا جواب یہ ہے کہ یہ سب حوالے اس امر پر مبنی ہیں کہ مختصر منیؒ اور مختصر بولیطیؒ (جو امام یوسف بن یحییٰ البولیطیؒ (المتوفی ۲۳۱ھ) کی تالیف ہے) کے حوالوں کو غلطی سے ربیع بن سلیمانؒ کی روایت پر ترجیح دی گئی ہے اور اسی غلطی کے نتیجہ میں حضرت امام شافعیؒ کو وجوب قرآن خلف الامام کا قائل گردانا گیا ہے اور مصنف خیر الکلام نے تحقیق الکلام کے حوالہ سے بحوالہ تمہید ابن عبد البرؒ امام شافعیؒ سے وجوب کا جو قول نقل کیا ہے اس میں خصوصیت سے یہ درج ہے کہ امام شافعیؒ کے اکثر شاگردوں کا یہی مذہب ہے جن میں امام منیؒ رحمہ اور بولیطیؒ بھی ہیں۔ بس یہیں سے اس غلطی کی بنیاد قائم ہوتی ہے کہ امام منیؒ اور امام بولیطیؒ کے آئینہ میں حضرت امام شافعیؒ کا مذہب اور مسلک متعین کرنے کی شدید غلطی کی گئی ہے۔ اور اسی پر پیچ دیہیچ غلطیاں مرتب ہوتی ہیں؛ مثلاً

سخن شناس نہ دلبر اخطا میں جا است

(۶) حضرت امام شافعیؒ توصاف طور پر یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ کا جان بوجھ کر ترک کرنا یا خطائے ترک کرنا دونوں اس حکم میں برابر ہیں کہ کوئی رکعت سورہ فاتحہ یا سورہ فاتحہ اور کچھ دیگر حصۃ قرآن کے بغیر جائز نہیں۔ ہاں مگر مقتدی کا حکم الگ ہے جو آگے بیان ہوگا اور دوسری عبارت میں تصریح کرتے ہیں کہ امام ومنفرد دونوں پر ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ

واجب ہے اس کے بغیر کوئی اور سورت جائز نہیں اور اس سے زیادہ ایک آیت یا اکثر ٹرھیں تو مجھے پسند ہے۔ ہاں مگر مقتدی کا حکم کچھ اور ہے اور میں خود اس کو بیان کر دوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ ان عبارتوں میں تو وہ صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ امام اور منفرد دونوں پر واجب ہے۔ اور اس سے مازاد واجب نہیں بلکہ بہتر ہے جب سورۃ فاتحہ اور مازد کا الگ الگ حکم بیان فرما رہے ہیں کہ ایک واجب ہے اور دوسرا مستحب (وَأَحَبُّ) تو پھر یہ احتمال حضرت امام شافعیؒ کی عبارت میں کہاں سے پیدا ہوا۔ دوسرا یہ کہ ان پر فاتحہ اور مازد دونوں واجب ہوں۔

۱۱۔ (خیر الکلام: ص ۲۵) اسی کو کہتے ہیں توجیہ القول بمالایرضی بقائلہ۔ اور پھر مصنف خیر الکلام کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ کتاب الام سے حضرت امام شافعیؒ کا وہ حوالہ جس کا دودفعہ انھوں نے وعدہ فرمایا ہے نکال کر تفسیر حروف تہا کے کہ یہ لو امام شافعیؒ کی معہود عبارت یہ ہے جس میں ہماری خانہ ساز توجیہ کی تصدیق ہو رہی ہے۔ مصنف خیر الکلام کو معلوم ہونا چاہیے کہ خواجہ خواجہ کچھ لکھ دینے سے جواب نہیں ہو جایا کرتا۔ حضرت امام شافعیؒ کی یہ دونوں عبارتیں سورۃ فاتحہ اور ہر رکعت اور امام و منفرد کے واضح الفاظ کے ساتھ بالکل صریح ہیں اور مقتدی اور ماموم کی استثناء اور وعدہ بھی ان میں صاف طور پر موجود ہے جس کا ایک ایک حرف پکار پکار کر رہا ہے کہ صاحب خیر الکلام کی تاویل بالکل سینہ زوری پر مبنی ہے اور قطعاً باطل اور مردود ہے۔ علی دنیا میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

(۷) بلا شک کتاب الام کی تیسری عبارت میں مطلق قرآۃ کا ذکر ہے لیکن حضرت امام شافعیؒ نے جن پہلی دو عبارتوں میں وعدہ فرمایا ہے۔ ان میں اُم القرآن کی تصریح موجود ہے اور و نحن نقول سے اسی وعدہ کو انھوں نے پورا کیا ہے۔ مصنف خیر الکلام اور ان کی جماعت کا اخلاقی فرض ہے کہ اگر یہ عبارت ان کے دومرتبہ وعدہ کے ایقانے لیے نہیں تو بتلائیں کہ کتاب الام میں وہ کونسی عبارت ہے جس کے ساتھ حضرت امام شافعیؒ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا ہے؟ (دیدہ باید)

(۸) البدایہ والنہایہ اور تفسیر ابن کثیرؒ کی ان عبارت سے قدر مشترک یہ ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو کلمۃ البدایہ تفسیر ابن کثیرؒ سے مقدم ہے اور نہ مکمل طور پر تفسیر اس سے پہلے کی ہے۔ کچھ



اجزاء اُس کے پہلے لکھے گئے اور کچھ حصص اُس کے پہلے تصنیف ہوئے اور مناسب مواقع پر ایک کے حوالے دوسری کتاب میں ذکر کر دیے گئے لیکن بایں ہمہ اس سے کتاب الام کے صریح حوالوں اور امام ربیع بن سلیمان کی راجح روایت پر کوئی زد نہیں پڑتی جیسا کہ پہلے عرض کر دیا گیا ہے کہ کتاب الام ٹھوس تاریخی شہادتوں کی بنا پر امام موصوف کی کتب جدیدہ میں سے ہے اور امام ربیع کی روایت کو ترجیح ہوتی ہے۔

(۱۰، ۹) کا جواب یہ ہے کہ یہ ساری تحقیق اس بات پر مبنی ہے کہ امام مزنی اور امام یوطی کی روایت کو ترجیح دی گئی ہے اور ہم باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ اصل غلطی کا سبب ہی یہ غلط نظریہ ہے۔ سچ ہے کہ ۷

نشت اول چوں نہد معار کج

تا شریا میرود دیوار کج

(۱۱) کا جواب یہ ہے کہ اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت امام شافعیؒ جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے قرآن کے قائل نہ تھے بلکہ امام کے سورۃ فاتحہ ختم کر چکنے کے بعد سکتہ میں سورۃ فاتحہ کے قائل تھے کیونکہ بحالت جہر امام مقتدی کی قرآن خلاف اجماع اور شاذ ہے۔ یہ عبارت تو مؤلف خیر الکلام کے مدعی کے مطابق نہیں۔ وہ تو جہر میں بھی قرآن فرض قرار دیتے ہیں۔ اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ وقال فی الجدید یقرأ الفاتحة فقط فی سکنات الامام امام شافعیؒ کا قول جدید یہ ہے کہ مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھے لیکن سکنات امام میں۔ (۱۲)

(تفسیر جلد ۲، ص ۲۸۰)

اس سے معلوم ہوا کہ بحالت جہر امام شافعیؒ بھی مقتدی کے لیے قرآن کے قائل نہ تھے اور ہم نے اسی کتاب میں باحوالہ مبسوط بحث کر دی ہے کہ سکنات امام کا (جن میں مقتدی قرآن کر سکیں) شریعت سے کوئی ثبوت نہیں جس کا کوئی معقول جواب مؤلف مذکور نے نہیں دیا۔ الغرض امام شافعیؒ کی کتاب الام کی احسن الکلام میں پیش کردہ عبارات اپنے مدلول پر بالکل نص صریح یعنی اور تاویلات بارہ کو بالکل قریب نہیں آنے دیتیں۔ یوں تعصب و عناد اور انکار وجود کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے جب تک نگاہ تعصب نہ بدلے گی نظریات میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہو سکتی: ۷

نہ تم بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی !  
میں کیسے احتیاب انقلاب آسمان کر لوں !

**امام احمد بن حنبلؒ:** (المتوفی ۲۴۱ھ) کا مسلک یہ ہے کہ وہ بھی جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرآنہ کے قائل نہ تھے۔ بلکہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآنہ کرنے کو شاذ اور خلاف اجماع فرماتے تھے۔ اور سب سے جہری نمازوں میں وجوب کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ مولانا مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ تمام نمازوں میں مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرآنہ کو واجب نہیں سمجھتے تھے۔ (تحفۃ الاحوذی، جلد ۱ ص ۲۵۷)

۱۔ علامہ ذہبیؒ ان کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں: شیخ الاسلام سید المسلمین، الحافظ اور المجتہد (تذکرہ جلد ۲) محدث ابراہیم حمیریؒ کہا کرتے تھے کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے اولین اور آخرین کے علوم جمع کر دیے ہیں (ایضاً) امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے: میں نے بغداد میں امام احمدؒ سے بڑا فقیہ و عالم اور افضل کوئی نہیں دیکھا۔ (بغدادی جلد ۲ ص ۳۱۹، تذکرہ جلد ۲ ص ۱۸، البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۳۲۵) اور نیز فرماتے ہیں کہ جب میں بغداد سے نکلا تو میں نے امام احمدؒ سے بڑا فقیہ، زہاد اور متوسل اور عالم کوئی وہاں نہیں چھوڑا (تہذیب التہذیب ص ۷۳) علامہ خطیب ان کی تعریف یوں کرتے ہیں: امام المحدثین، الناصر للمدین، المناضل (یعنی ملافعت کرنے والے) عن السنۃ اور الصابر فی المحنت (بغدادی جلد ۲ ص ۴۱۲) نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: امام احمدؒ امام سنت و مقتدا تھے ملت است (تقصیر ص ۹۴)

۲۔ امام احمدؒ کا یہ مسلک معنی ابن قدامہ جلد ۱ ص ۶۰۶، تنوع العبادات ص ۸۶، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵۔ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷ وغیرہ میں مذکور ہے۔

۳۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۹، تنوع العبادات ص ۸۷ میں اس کی تصریح ہے۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

بخلاف وجوبہا فی حال البصر فانہ  
یعنی سورۃ فاتحہ کا جہری نمازوں میں امام کے پیچھے  
شاذ حتیٰ نقل احمدؒ الإجماع علی  
بطور وجوب پڑھنا شاذ ہے۔ حتیٰ کہ امام احمدؒ نے اس  
کے خلاف اجماع اور اتفاق نقل کیا ہے۔  
(فتاویٰ: ۲ ص ۱۴۹)  
(نوٹ: اگلے صفحہ پر دیکھیے)



ائمہ اربعہ کے مسلک کی تشریح کے بعد ضرورت تو باقی نہیں رہتی کہ ہم دوسرے ائمہ محدثین اور فقہائے حوالے پیش کریں۔ بھلا حضرات ائمہ اربعہ کے اقوال کی موجودگی میں اور کس کے قول کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ان میں اکثریت ان ائمہ کی ہے جو حضرات ائمہ اربعہ میں سے کسی نہ کسی امام کے مقلد اور ان کی علمی تحقیق کے خوشہ چیں تھے۔ مگر چونکہ فریق ثانی کی طرف سے بعض ائمہ کے مسلک نقل کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اس لیے ہم بعض ائمہ کے اقوال عرض کرتے ہیں۔

ان میں وہ ائمہ کرام بھی شامل ہیں جو خود مستقل طور پر امام تھے اور انہوں نے کسی کی تقلید نہیں کی، بلکہ عرصہ دراز تک ان کی تقلید ہوتی رہی ہے۔

**امام ابراہیم النخعی:** (المتوفی ۹۶ھ) کسی نماز میں امام کے پیچھے قرآن سورہ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔ (معنی ابن قدامہ: ۱ ص ۶۰۶، البحر المحیط النقی جلد ۲ ص ۱۶۹، شرح مقنع جلد ۲ ص ۱۱) ان کی پوری عبارت مع تشریح کے باب سوم میں ذکر کی جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

(نوٹ پچھلا صفحہ) مصنف خیر الکلام (دیکھو ص ۳۱) کا یہ کہنا کہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امام کے ساتھ ساتھ نہ پڑھے بلکہ سکنات میں پڑھے (محصلاً) قطعاً باطل اور مردود ہے کیونکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ سکنات کے قائل نہیں ہیں جیسا کہ ان کے حوالہ سے آگے اپنے مقام پر بحث آئیگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ پھر ان کی مرضی کے خلاف ان کی عبارت کا مطلب لینا کہاں کا انصاف ہے؟ اور شیخ منصور علی ناصف لکھتے ہیں:

فلو فاتحة على الماء موم وعليه الجهم ورو  
مالك وابو حنيفة واحمد (غاية الماء مول جلد  
ص ۱۸۳، شرح التاج الجامع للاصول)  
مقتدی پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا لازم نہیں ہے یہی  
جمہور اہل اسلام اور ابو حنیفہ اور امام احمد کا مسلک  
اور مذہب ہے۔

۱۔ امام نووی (المتوفی ۶۷۷ھ) لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق۔ جلالت شان اور فقیہی کمال پر سبکی اتفاق ہے۔  
امام شعبی نے اہل دنائے وقت کہا کہ ابراہیم نے اپنے بعد اپنے سے بڑا عالم اور فقیہ کوئی نہیں چھوڑا۔ لوگوں نے کہا کہ کیا حسن  
بصری اور ابن سیرین بھی نہیں؟ تو شعبی نے کہا کہ نہ صرف حسن بصری اور ابن سیرین بلکہ اہل بصرہ، کوفہ، حجاز اور شام  
میں کوئی بھی نہیں۔ (تہذیب الاسرار واللغات جلد ۱ ص ۴۸) علم حدیث میں ان کے اس قدر وسیع معلومات تھے کہ مشہور  
حدیث اعمش رحمہ کا بیان ہے کہ میں نے جب کبھی ابراہیم رحمہ کے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

امام زہریؒ: (المتوفی ۲۴۰ھ) بھری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآن سورہ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔  
(کتاب القراءة ص ۷۵، مغنی ابن قدامہ جلد ۱ ص ۴۰۹، شرح مقنع جلد ۱ ص ۱۸)

(بقیہ کچلا صفحہ) سامنے کوئی حدیث پیش کی تو انھوں نے اس میں میرے معلومات اور بڑھائے۔ بڑے  
بڑے فقہاء فقہی مسائل میں اس کی طرف رجوع کرتے تھے۔ سعید بن جبیرؒ کے پاس جب کوئی فتویٰ پوچھنے  
کے لیے آتا تو اس سے کہتے، ابراہیمؒ کی موجودگی میں مجھ سے پوچھتے ہو؟

الودائلؒ کے پاس جب کوئی مستفتی آتا تو اس کو ابراہیمؒ کے پاس بھیج دیتے۔ اور اس سے کہ  
دیتے۔ جب وہ جواب دیں مجھے بتانا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۱ ص ۱۸۹) وہ اتنے محتاط تھے کہ  
اکثر یہ فرمایا کرتے تھے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب لوگ قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور اب  
یہ زمانہ ہے کہ جس کا دل چاہتا ہے مفسر بن بیٹھتا ہے۔ مجھے زیادہ پسند ہے کہ علم کے متعلق ایک  
کلمہ بھنی سے نہ نکالوں جس زمانہ میں میں فقیہ ہوا وہ بہت ہی انحطاط کا زمانہ ہے۔ (طبقات الکبریٰ شعرا  
جلد ۱ ص ۲۰۹) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ فقیہ العراق اور صاحب اخلاص بلند پایہ علماء میں تھے اور احادیث  
کے پرکھنے میں وہ صراف اور نقاد تھے۔ اور گمنامی کی زندگی کو بہت پسند کرتے تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۶۹)

امام زہریؒ، امام ابن مدینیؒ کا بیان ہے کہ جاز میں ثقات کا سارا علم زہریؒ اور عمرو بن دینارؒ کے درمیان تقسیم  
تھا۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۹۹) عمر بن عبد العزیزؒ فرمایا کرتے تھے کہ اب زہریؒ سے زیادہ سنت ماضیہ کا جاننے والا  
کوئی نہیں رہا (ایضاً) عمرو بن دینارؒ جو وہ بھی بہت بڑے محدث تھے فرماتے تھے کہ میں نے زہریؒ سے زیادہ  
حدیث میں کسی کو انص نہیں دیکھا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۴۸) فقہ میں وہ بہت بلند مقام رکھتے تھے۔

مدینہ کے ساتوں مشہور فقہاء کا علم ان کے سینہ میں محفوظ تھا۔ (ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۵) اسی فقہی کمال کی وجہ سے وہ

مدینہ کی مجلس افتائے مسند نشین تھے۔ ان کے فتاویٰ کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ محمد بن نوحؒ نے فقہی ترتیب سے ان کو  
تین ضخیم جلدوں میں جمع کیا تھا۔ (اعلام الموقعین جلد ۱ ص ۲۶) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ امام زہریؒ کے زمانہ  
میں ان سے بڑھ کر بڑا حافظ حدیث، عالم اور احادیث کی جمع و ترتیب کرنے والا اور کوئی نہ تھا (کتاب القیۃ

ص ۷۵) حافظ ابن کثیرؒ ان کو احاد الاعلام من ائمة الاسلام اور تابعی جلیل واعلم الناس لکھتے ہیں۔ (البدایہ  
النہایہ جلد ۱ ص ۳۴) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ زہریؒ ہمارے نزدیک حدیث تفسیر اور رجال کی توثیق کرنے  
کے امام ہیں۔ (الرسالہ للامام الشافعیؒ ص ۶۴) اور حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ امام زہریؒ (بقیہ اگلے صفحہ پر)



اور اسی طرح امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۶۱ھ)۔

## امام لیث بن سعد (المتوفی ۱۷۵ھ) امام عبد اللہ بن المبارک (المتوفی ۱۸۱ھ)

(بقیہ پچھلا صفحہ) اپنے وقت میں سنت اور حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۵)۔  
 امام سفیان ثوری، علامہ ذہبی، ان کو الامام، شیخ الاسلام، سید الحفاظ اور الفقیہ کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱۹ ص ۱۹۰)۔  
 امام شعبہ و ابن معین اور ایک بہت بڑی جماعت یہ کہتی ہے کہ سفیان فن حدیث میں امیر المؤمنین تھے۔  
 ابن مبارک فرماتے ہیں کہ میں نے گیارہ السوشیوخ سے احادیث کی سماعت کی ہے جن میں سفیان ثوری سے افضل کوئی بھی نہ تھا۔ ان کی تعریف و توصیف کے لیے یہ الفاظ کیا کم ہیں؟ شعبہ فرماتے ہیں۔ سفیان مجھ سے بڑے حافظ ہیں۔ ورنہ فرماتے ہیں: سفیان نے اپنا نظیر خود بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ امام احمد فرماتے تھے میرے نزدیک سفیان سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ اس سرزمین پر کوئی ایسا نہیں رہا جس نے تمام امت متفق ہو۔ ہاں مگر وہ صرف سفیان ثوری ہی ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۱)۔

امام قسطلی فرماتے ہیں کہ سفیان ثوری، امام مالک سے سب چیزوں میں بڑھ کر ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۱)۔  
 علامہ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ ائمہ مسلمین کے بہت بڑے امام اور اعلام دین کے بہت بڑے علم تھے۔ سنبل ان کی امامت پر اتفاق ہے۔ (بغدادی جلد ۹ ص ۱۵۲، تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۱۴) حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وہ ائمۃ الاسلام اور عابد متقی اور بے شمار تابعین سے روایتیں کرنے والے تھے۔ (البدایہ النہایہ جلد ۱ ص ۱۳۲)۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ امام سفیان ثوری از اصحاب مذاہب متبوعہ بود و محدث جلیل و عارف نبیل علم را با سلوک یکجا داشت۔ (تقصار ص ۲۷)۔

امام لیث بن سعد علامہ ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ امام احمد ان کو کثیر العلم اور صحیح الحدیث کہتے تھے۔ ابن مدینی ان کو ثقہ اور ثبت کہتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۴۶۱) ابن وہب کا بیان ہے کہ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ہم نے لیث سے بڑا کوئی فقیہ نہیں دیکھا۔ (ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۳)۔

امام نووی کا بیان ہے کہ لیث کی مہارت فقہ پر علما کا اجماع ہے۔ اس کمال فقہ کے باعث اپنے زمانہ میں مصر کے سب سے بڑے مفتی ہی تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۱۷۷) علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ وہ الامام، الحافظ اور دیار مصر کے علماء کے شیخ اور رئیس تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۷۷) یحییٰ بن بکیر کا بیان ہے کہ لیث سے زیادہ کامل اور فقیہ البدن (باقی اگلے صفحہ پر نمبر بھی)

## امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۵۷ھ)

(بقیہ اور نمبر پچھلے صفحہ) میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ سعید بن ایوب کہتے ہیں اگر امام مالکؒ اور لیثؒ کسی موقع پر مجتمع ہوتے تو مالک کو ان کے سامنے لب کشائی کی ہمت نہ ہوتی۔ (بغدادی جلد ۱۳ ص ۶) امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ لیثؒ امام مالکؒ سے زیادہ احادیث اور آثار کا اتباع کرتے تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲) حافظ ابن کثیرؒ ان کو امام فی الفقہ والحديث والقرآن سے یاد کرتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۱۶۶) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ لیثؒ کثیر العلم اور صحیح الحدیث تھے۔ اور نیز فرمایا کہ اہل مصر میں ان سے زیادہ اصح الحدیث اور کوئی نہ تھا (بغدادی جلد ۱۳ ص ۱۲)

۱۴ امام عبد اللہ بن المبارکؒ علامہ ذہبیؒ ان کو امام العللۃ الحافظ، شیخ الاسلام، فخر المجاہدین اور قدوة الزاہدین لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۵۳) امام ابن جبارؒ کا بیان ہے کہ ان میں اہل علم کے اتنے خصائل جمع ہو گئے تھے کہ ان کے زمانہ میں تمام روئے زمین پر کسی میں مجتمع نہ ہوئے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۳۸۶) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی امامت اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ تمام چیزوں میں امام تھے ان کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی ہے اور ان کی محبت کی وجہ سے بخشش کی توقع کی جاتی ہے۔ علامہ ابن سعدؒ ان کو مقتدا رجعت اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۸۵) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ حفظ فقہ، عربیت، زہد، شجاعت اور شعر کے مسلم امام تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۱۰۱) علامہ خطیبؒ فرماتے ہیں کہ وہ علم میں حتیٰ پرستوں کے گروہ میں تھے۔ اور حفظ وزہد کے ساتھ متصف تھے۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۱۵۲) مولانا مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے۔ (تحفۃ الاخوان جلد ۱ ص ۲۲۰)

۱۵ امام اوزاعیؒ: علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ شیخ الاسلام اور حافظ تھے۔ اور وہ اس قابل تھے کہ ان کو وقت کا خلیفہ بنایا جاتا۔ امام ابواسحاق فرارزیؒ کا بیان ہے کہ اگر تمام امت کا خلیفہ منتخب کرنے کا اختیار مجھے دیا جائے تو میں امام اوزاعیؒ کا انتخاب کروں گا۔ اہل شام اور اندلس میں ایک عرصہ تک ان کی تقلید ہوتی رہی۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۶۸) امام ابو زرؒ فرماتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ سے فقہ اور دین کی بہت سی روایتیں منقول ہیں۔ اسی علمی قابلیت کی وجہ سے وہ اہل شام کے مفتی اعظم تھے۔ امام ابن ہمدیؒ کا بیان ہے۔ حدیث کے مرکزی امام صرف چار ہیں۔ امام اوزاعیؒ (۲) امام مالکؒ (۳) امام ثوریؒ (۴) امام حماد بن زیدؒ۔ نیز ان کا بیان ہے کہ اہل شام میں ان سے بڑا کوئی سنت کا عالم نہ تھا۔ تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۲۳۹) حافظ ابن کثیرؒ ان کو امام الجلیل علامۃ الوقت اور فقیہ اہل الشام لکھتے ہیں۔ امام عبید اللہ بن عبد اللہؒ فرماتے ہیں: (بقیہ اگلے صفحہ پر)



امام اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۳۷ھ) اور امام سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۹۸ھ) وغیرہ ہر نمازوں میں مطلقاً اور سرسری میں وجوب کے قائل نہ تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اختصاراً اپنے اس دعوے کی دلیل بھی عرض کر دیں۔ چنانچہ امام موفق الدین ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں:

(بقیہ پچھلا صفحہ) میں نے امام اوزاعی سے بڑا عقلمند، پرہیزگار، عالم، فصیح، باوقار، حلیم اور خاموش طبع کوئی اور نہیں دیکھا۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۱۵) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ وہ امام الشافعیؒ فی وقتہ اور احد ائمۃ الدنیا تھے۔ (اجتماع الجیوش الاسلامیہ ص ۸۰)

لے امام اسحاق بن راہویہ، علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ حافظ کبیر عالم نیشاپور بلکہ حبلہ اہل مشرق کے شیخ تھے۔ محدث ابو زرعہ کا بیان ہے کہ ان سے بڑا کوئی حافظ دیکھنے میں نہیں آیا۔ ابو حاتم کا بیان ہے کہ ان کے اتقان اور اصابت رائے پر آفرین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت بڑا حافظ عطا فرمایا تھا۔ (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۱۹)

امام ابن خزیمہؒ کا بیان ہے کہ اگر وہ تابعین کے زمانہ میں ہوتے تو وہ یقیناً ان کے علم اور فقہ کا اقرار کرتے۔ امام احمد ان کو امام من ائمۃ المسلمین کہتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۳۵۰) ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانے میں فقہ، علم اور حفظ میں کینا تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۱۶) سعید بن ذویبؒ کا بیان ہے کہ وہ عذیم النظیر تھے۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۳۵۰)

۳ امام سفیان بن عیینہؒ: امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ اگر امام مالکؒ اور سفیان بن عیینہؒ نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہو جاتا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۱۹) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی امامت جلالت شان اور عظمت پر سب کا اتفاق ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عیینہؒ سے بڑا کوئی عالم سنن نہیں دیکھا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۲۳)

ابن حماد حنبلی انھیں شیخ المجاز اور احد الاعلام کہتے ہیں: ابن ناصر الدینؒ کہتے ہیں: سفیان بن عیینہؒ امام عالی مقام اور حرم محترم کے محدث تھے۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۳۵۴) ابن وہبؒ لکھتے تھے۔ میں نے سفیان بن عیینہؒ سے بڑا کوئی شخص قرآن مجید کا عالم نہیں دیکھا۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۱۵۲)

علامہ ذہبیؒ ان کو علامہ، الحافظ اور شیخ الاسلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ امام، حافظ، حجت، وسیع العلم اور بلند قدر تھے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سفیان بن عیینہؒ سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا کہ فتویٰ دینے میں احتیاط کرتا ہو اور حدیث کی تفسیر میں بھی ان سے بہتر کوئی نہیں دیکھا۔ (تذکرہ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۴۲)

وجملہ ذلك ان القراءة غير واجبة  
على العموم فيما جهر به الامام ولا فيما ستر  
به نقص عليه احمد في رواية الجماعة و  
بذلك قال الزهري والثوري وابن عيينة  
ومالك وابو حنيفة واسحاق بن راهويه  
(مغنی جلد ۱ ص ۴)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ کا امام کے پیچھے پڑھنا  
نہ جہری نمازوں میں واجب ہے، نہ سری میں، ایک  
بڑی جماعت نے امام احمد سے اس کی تصریح نقل کی ہے  
اور یہی امام زہری، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ،  
مالک، ابو حنیفہ اور اسحاق بن راہویہ کا مسلک اور  
مذہب ہے۔

**امام شمس الدین ابن قدامہ الحنبلی:** (المتوفی ۶۸۲ھ جن کا نام عبد الرحمن بن ابی عمر محمد بن  
احمد بن محمد بن قدامہ ہے۔ علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ وہ الامام اور شیخ الاسلام تھے تذکرہ جلد ۲ ص ۲۶۳)  
فرماتے ہیں کہ

ولا تجب القراءة على المأموم هذا قول اكثر  
اهل العلم ومن كان لا يرى القراءة خلف  
الامام علي وابن عباس وابن مسعود والوسعي  
وزيد بن ثابت وعقبة بن عامر وجابر بن  
عمر وحذيفة بن اليمان وبه يقول الثوري  
ابن عيينة واصحاب الرأي ومالك والزهري والاسود  
وابراهيم وسعيد بن جبيل قال ابن سيرين  
لا اعلم من السنة القراءة خلف الامام  
اھ (شرح مقنع جلد ۲ ص ۱ طبع مصر)

اور مقتدی پر قرآن واجب نہیں ہے اور یہی اکثر  
اہل علم کا قول ہے اور جو حضرات قرآن خلف الامام کے  
قائل نہ تھے ان میں خصوصیت سے حضرت علی، حضرت  
ابن عباس، حضرت ابن مسعود، ابو سعید، زید بن ثابت  
عقبة بن عامر، جابر بن عمر، حذیفہ بن الیمان قابل  
ذکر ہیں اور یہی قول امام سفیان ثوری، سفیان بن  
عیینہ، فقہار حنفیہ امام مالک، زہری،  
اسود، ابراہیم و سعید بن جبیر کا ہے اور محمد بن سیرین  
فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ قرآن خلف الامام سنت ہو۔

یہ حوالہ بھی اس بات کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ اکثر اہل علم کے نزدیک مقتدی پر قرأت  
واجب نہیں ہے اور حضرات صحابہ کرام اور تابعین و تابع تابعین میں مذکورین حضرات قرآن  
خلف الامام کے قائل نہ تھے اور امام محمد بن سیرین قرآن خلف الامام کو خلاف سنت قرار دیتے  
ہیں اور ہم پہلے مغنی کے حوالہ سے عرض کر چکے ہیں کہ امام احمد، امام زہری، امام سفیان بن عیینہ



امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام اسحاق بن راہویہؒ سب حضرات کے نزدیک مقتدی پر جہری اور سترہ کسی نماز میں قرآن واجب نہیں ہے۔ اور قاضی شوکانی نے تصریح کی ہے کہ امام اسحاق بن راہویہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ وغیرہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآن کے قائل نہ تھے۔  
(نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۲۳)

مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں:

وقال الزهري ومالك وابن المبارك  
واحمد واسحاق يقرأ فيما سرفيه  
الامام ولا يقرأ فيما جهر به۔  
امام زہری، امام مالک، ابن المبارک، احمد اور اسحاق فرماتے ہیں کہ جن نمازوں میں امام آہستہ قرأت کرتا ہو، ان میں مقتدی قرآن کر سکتا ہے اور جہری نمازوں

(تحفة الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵) میں مقتدی کے لیے اس کی گنجائش نہیں ہے۔  
امام ابن قدامہ کے حوالہ سے ابھی نقل کیا جا چکا ہے اور مبارک پوری صاحبؒ کے حوالہ سے عنقریب آئے گا کہ یہ آئمہ باوجودیکہ سترہ نمازوں میں قرآن خلف الامام کے قائل تھے۔ لیکن وجوب کے قائل نہ تھے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ: (مفتی ۵۹۱ھ) بھی مقتدی کے لیے قرأت کو درست نہیں سمجھتے

تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

ان كان ما موما ينصت الى قراءة  
الامام ويفهمها۔  
اگر نماز پڑھنے والا مقتدی ہے تو اس کو امام کی قرأت کے لیے خاموش رہنا چاہیے اور اس کی قرأت

(فتیۃ الطالبین، طبع مصر، ص ۶۴) کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اگر ظاہری الفاظ پر نگاہ ڈالی جائے تو ان سے یہی متبادر ہو سکتا ہے کہ موصوف مقتدی کا تمام نمازوں میں یہ وظیفہ تیار ہے ہیں کہ وہ نہایت توجہ اور دلجمعی کے ساتھ امام کی قرأت کو سنے اور خود خاموش رہے اور اگر اس امر پر بھی وہ بیان رکھا جائے کہ صاحب موصوف امام احمد بن حنبلؒ کے مقلد تھے۔ تو اس عبارت سے علامہ ذہبیؒ ان کو اشیخ اور القدوة لکھتے ہیں۔ (مذکرہ جلد ۲ ص ۱۷۲) علامہ سیوطیؒ ان کو اشیخ لکھتے ہیں۔

(تاریخ الخلفاء ص ۳۰۵) اور حافظ ابن القیمؒ ان کو اشیخ الامام العارف اور قدوة العارفين لکھتے ہیں (اجتماع البحیث الاسلامیہ ص ۱) نواب صاحبؒ ان کو امام الصوفیہ لکھتے ہیں۔ (الجنة فی الاسوة الحسنة بالسنة ص ۳)

۵۷ اگلے صفحہ پر دیکھئے

سے جہری نمازوں میں ممانعت ثابت ہوگی۔ اور چونکہ امام احمد ستری نمازوں میں وجوب قرآن کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے صاحب منصوص کامسک بھی یہی ہوگا۔

**شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (المتوفی ۷۲۸ھ)** مسند خلف الامام پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ امام کے جہر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ پڑھے اور مقتدی سنیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام جہری نمازوں میں جب **وَلَا الضَّالِّينَ** پڑھتا ہے تو مقتدی بھی آمین کہتے ہیں اور ستری نمازوں میں چونکہ مقتدی سنتے نہیں۔ اس لیے وہ آمین بھی نہیں کہتے۔ اگر امام بھی قرأت کر رہا ہو اور مقتدی بھی پڑھتے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امام کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ تم ایسے لوگوں کو سننا جو اس کے لیے آمادہ نہیں اور ایسی قوم کو خطبہ اور وعظ کو جو توجہ نہیں کرتی۔ اور یہ ایسی کھلی حماقت ہے جس سے شریعت مطہرہ کا دامن بالکل پاک ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص خطبہ امام کو قرات باتیں کر رہا ہو تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے گدھے پر کتابوں کا بوجھ لادا گیا ہو۔ ایسا ہی وہ شخص ہے جو جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتا ہو۔

(فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، جلد ۲ ص ۱۴)

یعنی نہ گدھا کتابوں سے منتفع ہو سکتا ہے اور نہ مقتدی قرأت امام سے۔ غور کیجئے کہ کتنی نازک تشبیہ ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والوں کو گدھے سے مثال دی گئی ہے۔

(بڑا کچھ صفحہ کا) نواب صاحب فرماتے ہیں کہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کہ در طبقات صوفیہ سرخیل طوائف اولیاء انجام کار در مذہب احمد بن حنبل انتقال بر حمت الہی فرمود اور انیز در مجتہدین شمرده اند جم غفیر از حنفیہ قدیم و حدیثاً مریدان خانوادہ و اخذ طریق اوست۔ (ہدایۃ السائل ص ۲۸۷)

لے علامہ ذہبیؒ ان کی تعریف ان الفاظ سے کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام، العلامة، الحافظ، الناقد، المفسر، المجتہد، عالی قدر رئیس الزہاد، یگانہ در راں، بحر العلوم، الذکی، الشجاع، السخی اور لکھتے ہیں کہ مخالف اور موافق سب ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۲۷۸)

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ وہ شیخ الاسلام، امام الائمہ اور مجتہد مطلق تھے۔ علامہ

ابن حجر دم کے بعد شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے ہم پایہ کوئی امام پیدا نہیں ہوا۔ (تقصیر ص ۶)

مولانا محمد امجد علیؒ یہ سب لکھتے ہیں: شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ علماء اسلام میں ملخاظ جامعیت علوم و فنون خصوصاً ممتاز ہیں۔ (تفسیر واضح البیان ص ۳)



قارئین کرام! اگر جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآن کرنے کی کچھ بھی اجازت ہوتی یا شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے خزانہ معلومات میں ممانعت پر کوئی وزنی دلیل اور امت کی اکثریت کی معیت نہ ہوتی تو یقیناً وہ کبھی ایسی نازک تشبیہ نہ نقل کرتے اور یہی شیخ الاسلام ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرماتے ہیں :

والد مر یا ستماع قرآن الامام و  
الانصات له مذکور فی القرآن و فی  
السنة الصحيحة وهو اجماع الامة  
فیمازاد علی الفاتحة وهو قول جمیع  
السلف من الصحابة فی الفاتحة وغیرها  
وهو احد قولی الشافعی واختار طائفة  
من حدّاق اصحابہ كالرازی و ابی  
محمد بن عبد السلام فان القراءة مع  
جہل الامام منکر مخالف القرآن و  
السنة وما کان علیہ عامة الصحابة  
(تنوع العبادات ص ۸)

کے خلاف بھی ہے۔ اور فی نفسہ بڑا بھی ہے اور اکثر حضرات صحابہ کرام کے تعامل کے بھی سراسر خلاف ہے۔  
حضرت امام شافعی وغیرہ کا مسلک پوری تفصیل کے ساتھ پہلے نقل کیا جا چکا ہے، عادیہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اور شیخ الاسلام کی عبارت بھی بڑی صاف اور واضح ہے۔ مزید تشریح کی محتاج نہیں ہے اور ہم شیخ الاسلام کے حوالہ سے پہلے نقل کر آئے ہیں کہ امام احمد سے وہ نقل کرتے ہیں کہ جہری نمازوں میں مقتدی کا امام کے پیچھے قرآن کرنا شاذ بھی ہے اور خلاف اجماع بھی۔ اور لکھتے ہیں کہ امام احمد کے نزدیک نہ جہری نمازوں میں مقتدی پر قرأت واجب ہے اور نہ ستری نمازوں میں۔  
(تنوع العبادات ص ۸)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ ستری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآن کرنے کے قائل تھے جیسا کہ

انھوں نے اپنے فتاویٰ (جلد ۲ ص ۱۴۹) میں اس کی تصریح کی ہے، لیکن چونکہ وہ حنبلی تھے اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ ان کا مسلک بھی امام احمد بن حنبلؒ کی طرح صرف استحباب کا ہونا چاہیے، نہ کہ وجوب کا۔ اور امام ابن قدامہ کی عبارت ستری نمازوں میں عدم وجوب کی پہلے نقل کی جا چکی ہے۔ مؤلف خیر الکلام ص ۳۲ پر لکھتے ہیں کہ ان کے ہاں سکنا ت امام میں پڑھنے سے بھی فرض ادا ہو جاتا ہے (محصلاً) لیکن اپنے مقام پر تفصیل کے ساتھ آئے گا کہ شیخ الاسلام سکنا ت کے قائل نہیں ہیں اس لیے یہ توجیہ مردو ہے۔ رہا شیخ الاسلام کا حنبلی ہونا؛ تو اس پر سینکڑوں حوالے نقل کیے جا سکتے ہیں مگر ہم صرف نواب صدیقی حسن خاں صاحب کے ایک حوالے پر اکتفا کرتے ہیں کہ شیخ الاسلام کو شیخ الخبا بلہ لکھتے ہیں۔  
(الجنة في الاسوة الحسنة بالسنة ص ۳)

حافظ ابن القیمؒ: (المتوفی ۷۵۱ھ) مسئلہ خلف الامام کی تحقیق میں ارشاد فرماتے ہیں: کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مقتدی پر سے سجدہ سہو ساقط کر دیا ہے۔ بایں طور کہ امام کے پیچھے مقتدی کے بھولنے سے مقتدی پر سہو لازم نہ ہو گا۔ یعنی جب امام کی نماز صحیح ہو گئی تو مقتدی کی نماز بھی صحیح ہوگی۔ اسی طرح آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتدی پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا بھی ساقط کر دیا ہے، کیونکہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے۔ آگے لکھتے ہیں:  
فقراءة الامام وسننہ قراءة لمن خلفه  
یعنی امام کی قراۃ مقتدیوں کی قراۃ ہے اور امام

وسننہ له۔ (کتاب الروح لمن القیم ص ۱۶۶) کاسترہ مقتدیوں کا سترہ ہے (ذان کو الگ قراۃ کی ضرورت ہے اور نہ سترہ کی)

اٹھائی ہے۔ حتیٰ کہ علم حدیث، تفسیر اور فقہ میں وہ کبار ائمہ میں شمار ہوتے ہیں۔ (بغیۃ الوعاة ص ۲۵) ملا علی قاری حنفی المتوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں کہ حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیمؒ کا براہیل السنۃ والجماعت میں تھے۔ اور اس امت کے اولیاء میں ان دونوں کا شمار ہوتا ہے۔ (جمع الوسائل شرح شامل طبع مصر، جلد ۱ ص ۲۰) نواب صدیقی حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ وہ المتکلم الحافظ اور الامام تھے۔ (دلیل الطالب ص ۹) اور دوسرے مقام پر یوں بھول برساتے ہیں۔ علامہ کبیر مجتہد مطلق تمام علوم و فنون میں اپنے معاصرین پر تفوق رکھنے والے اور مذاہب کے جاننے میں تمام آفاق میں مشہور اور علوم کے سمندر تھے۔ (نقصار ص ۸)



یہ مضمون بھی نہایت روشن ہے اور غیر مبہم۔ مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ؟ (المتوفی ۱۱۷۶ھ) ان کو بھی بعض حضرات نے (جن میں مولانا عبدالرحمن صاحب مبارک پورؒ بھی شامل ہیں۔ دیکھیے تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۷ وغیرہ) مجوزین قرآن خلف الامام میں شامل کر لیا ہے۔ حالانکہ معاملہ یوں نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

فان جہل الامام لم یقرأ الا عند الرسکة وان خافت فله الخيرة۔  
اگر امام جہر سے قرأت کرتا ہو تو مقتدی کو اس کے پیچھے قرآن نہیں کرنی چاہیے، ہاں مگر سکتا امام میں اور

(حجة الله البالغة جلد ۲ ص ۷ طبع مصر) سترے نمازوں میں مقتدی کو اختیار ہے چاہے پڑھے چاہے نہ پڑھے۔ اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: **وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا** ولالت نمی دار و مگر در جہر۔ (انفاس العارفين ص ۱) یہ بحث تو اپنے مقام پر آئے گی کہ سکتا امام کا کیا کہاں اور کتنا ثبوت ہے؟ اور یہ بھی کہ آیت مذکورہ سترے نمازوں کو بھی شامل ہے نہ کہ فقط جہری نمازوں کو۔ لیکن یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔ کہ شاہ صاحب قرآن خلف الامام کے جہری نمازوں میں مطلقاً اور سترے نمازوں میں وجوب کے قائل نہ تھے۔

قاضی مقبول احمد صاحب نے مغالطات احسن الکلام ص ۱ اور الاعتصام ص ۱۳۱ اگست ۱۹۶۲ء، ص ۵۵ کالم ۳ میں خاصا وادیا کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصنف احسن الکلام نے حضرت شاہ ولی صاحب کی عبارت کے نقل کرنے میں خیانت کی ہے۔ اور حضرت شاہ صاحب کی غلط ترجمانی کی بخلاف اس کے مولانا عبدالرحمن صاحب مبارک پورؒ نے صحیح ترجمانی کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کی یہ عبارت، مضمون کرلی گئی ہے اور اگر پڑھے تو سورہ فاتحہ کو اس طرح پڑھے کہ امام کو خلیفان میں ڈال دے۔ اور میرے نزدیک یہ بہتر قول ہے۔ (حجة الله البالغة ج ۲ ص ۷ مغالطات احسن الکلام ص ۱۳۱) نواب صاحب لکھتے ہیں: کہ وہ المحدث اور المشہور تھے۔ (اکسیر ص ۱) نیز لکھتے ہیں کہ وہ الشیخ الاجل اور المحدث تھے۔ (الجنة ص ۳) مولانا میرزا گوئیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد اس وقت تک ہندوستان میں تو ایسا شخص نہیں ہوا۔ کہ اسے امام کہہ سکیں اور دوسرے نمائندگان خدا جانے۔

اور الاعتصام میں لکھتے ہیں کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مولانا عبد الرحمن صاحب مبارکپوری کی یہ عبارت بھی نقل کر دی جاتے تاکہ قارئین اچھی طرح اندازہ فرما سکیں کہ شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ کا مسلک بیان کرنے میں کس نے غلطی کی ہے۔ مولانا مبارک پوری نے یا مولانا سرفراز نے؟

مولانا عبد الرحمن مبارک پوری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی باوجود حقیقی المنہ ہونے کے امام کے پیچھے الجھ پڑھنے کو اولی الاقوال بتایا ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۵) آپ دونوں عبارتیں ملاحظہ فرمائیں اور بتائیں کہ کیا مولانا عبد الرحمن مبارک پوری نے شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کی غلط ترجمانی کی ہے یا مولوی سرفراز نے؟

الجواب: قاضی صاحب غصہ جانے دیجئے احسن الکلام کے ٹھوس دلائل اور حکم براہین نے آپ کے اور آپ کی جماعت کے دماغ کو ضرور موقوف کر دیا ہے اور دل کی بھر اس نکالنے کے اور اپنے متعصب حواریوں کو یہ باور کرانے کے لیے کہ مغالطات احسن الکلام ہماری طرف سے مکمل جواب ہے یا الاعتصام میں سوچے سمجھے چند مضامین درج کر کے احسن الکلام کا جواب تصور کر لینا علمی دنیا میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ ہاں اپنے جذباتی حواریوں کو جماعت میں منسلک رکھنے کے لیے قدرے سنبھالا ہو سکتا ہے۔ مگر تاہم کے ہر لوگ دلائل دیکھا کرتے ہیں۔ ہم حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی مکمل عبارت نقل کرتے ہیں اور قارئین کرام سے التماس کرتے ہیں کہ وہ انصاف سے فرمائیں کہ حضرت شاہ صاحب کی عبارت میں خیانت کس نے کی ہے؟ آیا مولانا مبارک پوری صاحب اور ان کے وکیل قاضی مقبول احمد صاحب نے یا سرفراز نے؟ حضرت شاہ صاحب کی عبارت مع ترجمہ یہ ہے:

وان کان مأموراً بواجب علیہ الانصاف	اور اگر وہ مقتدی ہو تو اس پر خاموش رہنا اور سننے
والاستماع فان جہل الامام لم یقرأ الا	کے لیے توجہ کرنا واجب ہے۔ پس اگر امام جہل سے پڑھے تو
عند الاستماعة وان خافت فله الخیر فان	مقتدی قرآن نہ کرے مگر سکتے ہیں اور اگر امام آہستہ پڑھے
قرأ فليقرأ الفاتحة قرأ (یشوش علی الامام	تو مقتدی کو اختیار ہے پس اگر مقتدی پڑھے تو فاتحہ پڑھے
وهذا ولی الاقوال عندی وبہ یفہم بین	اس طرح کہ امام کو خلل میں نہ ڈالے اور یہ میرے نزدیک سب سے
احادیث الباب والشر فیہ مانص علیہ من	بہتر قول ہے اور نہ ہی اس باب کی حدیثیں باہم جمع کی جاسکتی
ان القرآۃ مع الامام تشوش علیہ وتنفوت	ہیں اور راز اس میں یہ ہے کہ مشارع نے صراحت کے ساتھ



التدبر وتخالف تعظیم القرآن ولعزم  
علیہم ان یقرؤا سرائر العامة متى  
ارادوا ان یصحوا الحروف بالجمع  
كانت لهم لجة مشوشة فجل في  
النهي عن التشویش ولم يعزم علیهم مایؤد  
الی المنهی وابقی خیرة لمن استطاع و  
ذلك غایتہ الرحمة بالامة انتهى۔

(حجة الله البالغة جلد ۲ ص ۷ طبع مصر)

بتایا ہے کہ امام کے ساتھ قرآن کریم اس کو خلل میں ڈالتا ہے  
اور تدبیر کو فوت کر دیتا ہے اور تعظیم قرآن کے مخالف ہے۔  
اور تاکید ان کو نہیں فرمایا کہ وہ ضرور آہستہ پڑھیں کیونکہ  
عام لوگ جب مل کر تصحیح حروف کا ارادہ کریں گے تو ان کی  
آواز بلند ہوگی جو باعث تشویش ہوگی سو اس تشویش کی  
نہی میں تو تاکید کی ہے مگر آہستہ پڑھنے کی تاکید نہیں کی  
جو اس منوع پیر تک ان کو پہنچائے اور اختیار دیا گیا ہے کہ جو  
پڑھ سکتا ہے پڑھے اور یہ امت کے ساتھ انتہائی رحمت ہے۔

یہ تمام خط کشیدہ عبارت قاضی مقبول احمد صاحب شیر مادر سمجھ کر پنی گئے ہیں جس سے ستری نمازوں  
میں قرآن کرنے اور نہ کرنے کے اختیار کا راز کھلتا ہے۔ اور فان قرأ فليقل الخ کا (جو دل خافت  
قله الخيرة کی تفسیر ہے) معنی اور اگر پڑھے الخ کر کے اپنی لیاقت کا ثبوت دیا ہے اور غصہ سم  
پر آ رہا ہے کہ غلط ترجمانی ہم نے کی ہے۔ یہ ہے فریق ثانی کے علماء کا علم اور لیاقت سبحان اللہ تعالیٰ  
قاضی صاحب! حضرت شاہ صاحب حروف فلک کے ساتھ (جو تفسیر اور ترتیب کے لیے ہوتا ہے)  
یہ فرماتے ہیں کہ اگر مقتدی نے ستری نمازوں میں پڑھنے کی شق کو اختیار کیا تو اس طرح فاتحہ پڑھے کہ  
امام کے لیے باعث تشویش نہ ہو حرف واؤ کے ساتھ بیان نہیں کر رہے جس کا معنی اور اگر پڑھے  
الخ اور والسرفیہ سے آہستہ پڑھنے کا اور الخيرة کا راز بیان فرمایا ہے۔ حضرت شاہ صاحب  
نے تمام ستری اور جہری نمازوں میں سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کو اولی الاقوال نہیں فرمایا جیسا کہ مبارکپوری صاحب  
دھوکہ کھایا ہے اور قاضی صاحب موصوف دھوکہ دہی پر کمر بستہ ہیں کسی عربی کے ماہر ثالث سے فیصلہ  
کولیں کہ اس کا مطلب سرفراز ٹھیک بیان کر رہا ہے؟ یا مبارکپوری صاحب جو فرماتے ہیں وہ درست ہے؟  
جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی  
خدا نے مجھ کو دیا ہے دل خبیر و بصیر!

قارئین کرام! آپ کو اس ماسبق بحث سے یہ اندازہ بہ خوبی ہو گیا ہو گا کہ حضرات صحابہ  
کرام اور تابعین و تبع تابعین اور ائمہ اربعہ اور ان کے علاوہ امت کی اکثریت کے نزدیک

جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرأت کو جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ وہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کا سورۃ فاتحہ پڑھنا شاذ، مخالف قرآن و سنت اور مخالف اجماع سمجھتے تھے اور ستر نمازوں میں بھی اُمت کی اکثریت وجوب قرأت کی قائل نہ تھی۔ اس بحث کے پیش نظر فریق ثانی کے یہ باطل اور بے بنیاد دعاوی کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے والے بے نماز مفسدین صلوٰۃ اور تارکِ سنت ہیں اور ان کے ساتھ مباہلہ تک کرنا بھی صحیح ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہ کہاں تک صحیح ہیں؟ اور ان کے غلو آمیز اور شرانگیز گستاخانہ کلمات سے کون امام بچ سکتا ہے؟ ہم نے محض نمونہ کے طور پر بعض حضرات ائمہ کی عبارتیں مقدمہ میں درج کی ہیں۔ ان کے علاوہ باب اول میں آیت کی تفسیر میں حضرات تابعین و تابعین کے جو آثار بیان ہوں گے۔ نیز باب سوم میں آثار حضرات صحابہ و تابعین کے تحت جو آثار ذکر کیے جائیں گے۔ وہ ان کے علاوہ ہیں اور اگر آپ کی نزاکت طبع و قلبت فرصت کا خیال دل کی گہرائیوں میں دب دب کرنے اُبھرتا تو ہم ان کو بھی مقدمہ میں جگہ دیتے۔ کیونکہ یہ

رہ رواں راستگی راہ نیست  
عشق ہم راہ ہست ہم خود منزل است

اب ہم مقدمہ میں انہی اقتباسات پر اکتفا کرتے ہوئے صرف حضرت امام احمد بن حنبل کی ایک جامع و مانع عبارت نقل کرتے ہیں۔ بغور پڑھیے۔ امام ابن قدامہ فرماتے ہیں:

قال احمد ما سمعنا احداً من اهل الاسلام يقول ان الامام اذا جهر بالقراءة لم يجزئ صلوة من صلي خلفه اذا لم يقرأ وقال هذا النبي صلى الله عليه وسلم واصحابه والتابعون وهذا ما لى في اهل الحجاز وهذا الثوري

امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ ہم نے اہل اسلام میں کسی سے نہیں سنا۔ جو یہ کہتا ہو کہ جب امام جہر سے قرأت کرتا ہو اور مقتدی اس کے پیچھے قرأت نہ کرے تو مقتدی کی نماز باطل اور فاسد ہو جاتی ہے اور فرمایا یہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ اور یہ آپ کے صحابہ اور تابعین ہیں اور یہ امام مالک ہیں اہل حبشہ میں اور یہ امام ثوری ہیں

لہ اور نواب صدیقی حسن خان صاحب دارقطنی کے حوالہ سے ایک روایت رجالہ کلام ثقات کے الفاظ سے نقل کر کے آگے لکھتے ہیں کہ حدیث دلیل اسنت بر عدم قرأت چیز در پس امام در حالت جہرام و لهذا احمد گفته ما سمعنا احداً يقول ان الامام اذا جهر بالقراءة لم يجزئ صلوة من لم يقرأ۔ اھ (ہدایۃ السائل ص ۱۹۳)



اہل عراق میں اور یہ امام اوزاعی ہیں اہل شام میں اور یہ  
امام لیث بن سعد ہیں اہل مصر میں ان میں سے کسی نے  
یہ نہیں کہا کہ جب کوئی شخص نماز پڑھے اور اس کا امام  
قرآن کرے اور مقتدی خود قرآن نہ کرے تو اس کی نماز  
باطل اور فاسد ہو جاتی ہے۔

فی اهل العراق وهذا الراعى في اهل الشام  
وهذا الليث في اهل مصر ما قالوا الرجل  
صلى وقرا امامه ولم يقرأ هو صلواته  
باطلة۔ (مغنی ابن قدامہ ج ۱ ص ۱۳۰ میں بھی ہے)  
یہ عبارت شرح متفق جلد ۲ ص ۱۳۰ میں بھی ہے

### درماندگی:

مصنف خیر الکلام نے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی اس واضح اور صریح عبارت کا جو جو  
دیا ہے اس کو پڑھ کر ان کی علمی حالت پر بے ساختہ ترس آتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ  
(۱) اس کا مطلب بھی یہی لینا چاہیے کہ امام کے ساتھ ساتھ پڑھنا کسی کے نزدیک ضروری نہیں  
بلکہ قرآن کا فرض ہے (جن کے ہاں قرآن فرض ہے) سکتا میں ادا ہو سکتا ہے۔ (الخ) (خیر الکلام ص ۳۲)  
(۲) یا امام احمد بن حنبلؒ کی عبارت کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ یہ مسئلہ اختلافی ہے اس لیے کسی کی تحقیق  
میں فاتحہ فرض نہ ہو تو وہ جہری نمازوں میں نہ پڑھے تو اس کی نماز ہو جاتی ہے باقی رہا یہ سوال کہ امام  
صاحب نے جہر کی قید کیوں لگائی ہے اس اختلافی مسئلہ میں تو جہر اور ستر برابر ہے اس کی وجہ یہ ہے  
کہ ستری نمازوں میں منع کی چونکہ کوئی دلیل نہیں اس واسطے بعض علماء نے اس کو اختلافی مسئلہ  
قرار نہیں دیا بلکہ اتفاقی سمجھ کر یہ فتویٰ لگایا کہ ستری نمازوں میں جو شخص نہ پڑھے اس کی نماز باطل  
ہے۔ الخ (ص ۳۲ خیر الکلام)

(۳) بعض حنفیہ (احسن الکلام ص ۲۴) نے علامہ کی عبارت سے قرآن امام پڑھ رہا ہو کا  
جملہ حذف کر دیا ہے پھر امام احمد بن حنبلؒ سے یہاں اوزاعی اور لیث کا نام بھی نقل کر دیا ہے حالانکہ  
امام ابن عبد البرؒ نے ان دونوں سے فاتحہ کی فرضیت نقل کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ  
کو ان کے اس قول کا علم نہیں۔ الخ (ص ۳۳ و ۳۴)

الجواب : یہ ہے فریق ثانی کے رئیس المحدثین قدوة السالکین اور استاذ الاساتذہ کا

جواب جس میں ایک رتی جان بھی نہیں ہے۔ ترتیب وار سنیں :

۱۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ سکتا کا مسئلہ نہیں بیان فرما رہے بلکہ تصریح کرتے ہیں جہری

نمازوں میں امام کے پیچھے مطلق قرآن نہ کرنے والے کی نماز تمام اہل اسلام کے نزدیک جائز ہے اور اس کا ایک شخص بھی منکر اور مخالف نہیں ہے۔ اگر امام احمد بن حنبل کے علم میں یہ ہوتا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (یا کوئی اور) اس کا مخالف ہے تو باوجود قرب زمانے کے بلکہ امام شافعیؒ کا شاگرد ہونے کے (دیکھیے تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۷۷) کبھی یہ دعویٰ نہ کرتے کہ اہل اسلام میں اس کا کوئی قائل نہیں ہے چودھویں صدی کے مجتہدین کا تو انھیں کوئی علم نہ تھا تا کہ ان کے لیے کوئی گنجائش چھوڑ دیتے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا یہ ارشاد امام شافعیؒ کے مسلک کی وضاحت کے لیے ایک مستقل دلیل ہے اور اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے کہ امام کے پیچھے قرأت ترک کر نیوالے کی نماز بالکل صحیح ہے۔

۲۔ امام احمد بن حنبلؒ تو جہری نمازوں میں تمام اہل اسلام کا اتفاق نقل فرماتے ہیں۔ پھر ان کی عبارت کا مطلب چونکہ یہ مسئلہ اختلافی ہے انہی کس طرح صحیح ہوا۔ رہا سہری نمازوں کے بارے میں مصنف خیر الکلام کا یہ فرمانا کہ چونکہ دلیل نہیں..... انہی (محصلاً) ممکن ہے اس چونکہ سے ان کے حواری تو شاید مطمئن ہو جائیں مگر علمی دنیا کبھی اس چونکہ سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سہری نمازوں میں بھی عدم قرأت کی دلیل ایک نہیں کئی ٹھوس دلائل ہیں اور صرف ایک برہان نہیں بلکہ متعدد براہین موجود ہیں۔ اور یہ مسئلہ بھی خاصا اختلافی ہے اور جو حضرات پڑھنے کے قائل ہیں۔ مثلاً: امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ تو وہ بھی سہری نمازوں میں وجوب کے قائل نہیں ہیں سوا محمے گئے چنے چند حضرات کے کوئی امام سہری نمازوں میں قرآن نہ کرنے والے کی نماز کے بطلان کا ہرگز قائل نہیں اور یہی جمہور کا مسلک ہے۔

۳۔ قدوة السالکین کا تعصب ملاحظہ ہو کہ یہ حسن ظنی ان کے قلب مبارک میں پیدا ہی نہیں ہوتی کہ یہ لفظ چھوٹ گیا ہے بلکہ فرماتے ہیں حذف کر دیا ہے اور خیر الکلام ص ۵۵۹ مناقشہ ۹ میں لکھا ہے کہ اس عبارت میں سے جملہ وقرآن احاصہ اور اس کا امام پڑھتا ہو چھوڑ دیا ہے تاکہ جہری و سہری سب نمازوں کو یہ فتویٰ شامل ہو۔ انتہی بلفظہ۔ فریق ثانی کے رئیس المحدثین کو معلوم ہونا چاہیے کہ احسن الکلام جلد ۱ ص ۲۳ پر جہاں یہ عبارت نقل کی گئی ہے اس کے ترجمہ میں یہ لفظ موجود ہیں کہ جب امام جہر سے قرآن کرتا ہو انہی اس کی موجودگی میں یہ احتمال کہاں سے اور کیونکہ پیدا ہوا کہ سہری نمازیں بھی اس میں شامل ہوں جب کہ راقم کے نزدیک سہری کو یہ شامل ہی نہیں تو سب کو شامل



ہونے کا کیا معنی؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ چار سو صفحات کی کتاب میں کسی ایک آدھ جملہ کا چھوٹ جانا یا کتابت میں غلطی کا واقع ہونا غیر اغلب نہیں ہوتا۔ آپ کے فرہین مبارک سے اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِنَّہٗ کیوں نکل گیا؟ باقی امام عبدالبرؒ سے بدرجہا زیادہ امام احمد بن حنبلؒ امام اوزاعیؒ اور امام لیثؒ کے مسلک کو جانتے ہیں۔ مجتہد مطلق بھی ہیں اور قرب زمانہ بھی ہے اور یہ حوالہ علامہ ابن قدامہؒ کے علاوہ اور دیگر ثقہ اور ثبت حضرات محدثین عظام نے بھی نقل فرمایا ہے۔ اس لیے اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبلؒ کا علم بالکل صحیح ہے اور توفیق خیر الکلام کی بات پر گاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔

### اقرار کے ساتھ انکار کی دم:

مصنف خیر الکلام نے جب نجفی یہ ٹھوس ٹھوس کر لیا کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی اس ٹھوس اور واضح عبارت کے جواب میں میری کہی ہوئی سینہ زادیاتیں ناکام ہیں تو آخر میں اقرار بھی کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ پس زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ کے قول کا مطلب وہی ہے جو ناقل (سرفراز) نے سمجھا ہے تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ امام احمد بن حنبلؒ نے آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی تاویل کی ہے اور صحابہ کرام کے اقوال ان کو بسند صحیح نہیں پہنچے۔ مگر امام بخاریؒ اور دیگر محدثین کو وہ اقوال بسند صحیح پہنچ گئے اس لیے انھوں نے آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول لا صلوة لمن لم یقرأ بفاتحة الكتاب جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہے۔ اس کی تاویل نہیں کی جیسا کہ امام احمد بن حنبلؒ نے تاویل کی ہے۔ الی ان قال بہر صورت اس اختلافی مسئلہ میں ایک امام کی رائے ہے جو دوسرے ائمہ حدیث خصوصاً امام بخاریؒ (جو بنقل حافظ ابن حجر امام احمد سے فقہ اور حدیث میں بیگن سے زیادہ ہیں۔ مقدمہ فتح الباری ص ۵۷۲) کی رائے کے خلاف ہے پس کسی صورت میں یہ قابل التفات نہیں۔ (خیر الکلام ص ۳۵۳ و ۳۵۴)

الجواب: حضرت امام احمد بن حنبلؒ اس مقام پر اہل اسلام کا متفقہ فیصلہ اور ائمہ مذکورین کا اجماع نقل کر رہے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے والے کی نماز فاسد اور باطل ہونے کا کوئی قائل نہیں۔ حدیث کی تاویل اور عدم تاویل کا ذکر وہ یہاں نہیں فرما رہے وہ تو اہل اسلام کا متفقہ فیصلہ نقل فرما رہے ہیں اور حضرات صحابہ کرام کے اقوال اگر امام احمد بن حنبلؒ کو بسند صحیح نہیں پہنچے تو

اور کس کو پہنچے ہیں؟ اور جو اقوال حضرت امام بخاریؒ کو بقول مصنف خیر الکلام بسند صحیح پہنچے ہیں ان کا حال بھی اپنے مقام پر احسن الکلام جلد دوم میں واضح کر دیا گیا ہے جن کو مؤلف مذکور نے تنکوں کا سہارا دے کر تھامنے کی بے جاسعی کی ہے مگر سب سے پہلے پھر بھی نہیں۔ رہا یہ کہ امام بخاریؒ امام احمد بن حنبلؒ سے بیس گنا فقہ و حدیث میں زیادہ ہیں۔ صرف عقیدت کی نقل سے کچھ نہیں بنتا۔ اس کا قائل اور اس کا درجہ معلوم ہونا چاہیے اور اس کی علمی شہرت اور اکثر امت کا اعتماد باحوالہ درکار ہے۔ محض نقل کی حیثیت کیا ہے؟ اور اگر وہ کوئی معتبر امام ہے تو یہ صرف ان کی غلو فی العقیدت کا اظہار ہے۔ حضرت امام بخاریؒ کا جو مقام حدیث و فقہ میں ہے اس کا کون منکر ہے یا ہو سکتا ہے؟ لیکن حدیث و فقہ میں جو مقام حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا ہے وہ حضرت امام بخاریؒ کا نہیں ہے اس لیے کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ بالاتفاق ائمہ مجتہدین میں شمار ہوتے ہیں اور حضرت امام بخاریؒ کے متعلق مختلف آراء ہیں کوئی ان کو مجتہد مطلق کہتا ہے اور کوئی مجتہد فی المذہب کہتا ہے۔ اور امام نسبیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ ان کو شافعی بتاتے ہیں ہم نے بقدر ضرورت طائفہ منصورہ میں اس پر باحوالہ بحث کی ہے اور امام بخاریؒ بقول حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فقہی مسائل میں امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے خوشہ چین اور ان کی کتب سے استمداد کرتے ہیں۔ اس لیے دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے لیے دونوں دل کا نور اور آنکھوں کا سرور ہیں مگر فرق مراتب ضرور ہے لہذا حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے اس واضح اور روشن حوالہ کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور نہ علمی دنیا میں اس کو باور کرنے کے لیے کوئی تیار ہے۔ اور یہ صرف امام حضرت احمد بن حنبلؒ ہی کی رائے نہیں بلکہ جمہور حضرات صحابہ کرامؓ تابعینؓ اتباع تابعینؓ اور ائمہ دینؓ کی رائے ہے اور اتنی بڑی ذہنی رائے ہے جس نے فریق ثانی کے اس غلو اور بے جا تعصب کا بھیجا نکال دیا ہے کہ قرآنہ خلف الامام نہ کرنے والوں کی ناز بے کار، باطل اور کالعدم ہے۔ اس لیے امام احمد بن حنبلؒ کی اس مسئلہ میں لاعلمی کا دعویٰ (جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے) بالکل بے بنیاد اور سراسر مردود ہے۔ عجب نہیں کہ مؤلف مذکور یہ کہہ دیں: مگر میں نے تو اپنا فائدہ انکار میں دیکھا

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ عظامؓ اور بعض دیگر ائمہ (جن سے آپ ماسبق حواشی میں اچھی طرح روشناس ہو چکے ہیں) کا یہ فیصلہ دیکھ لیجئے۔



اور فریق ثانی کے مفسدین صلوٰۃ اور بے نماز ہونے کے خالص متعصبانہ فتوے اور مباہلہ کے اعلان اور فراخ دلی سے انعامی چیلنج ملاحظہ کر لیجیے اور پھر فرمائیے کہ تکفیر کس کی ہوگی؟ اور بے نماز کون ہوگا؟ مفسد صلوٰۃ کون ہوگا؟ اور مباہلہ کس سے ہوگا؟ تارک سنت کون ہوگا اور انعامی شاہی چیلنج کا مستحق کون ہوگا؟ افسوس ہے کہ فریق ثانی نے تعصب اور کم فہمی کی وجہ سے ایسا ایٹیم بم ایجاد کر لیا کہ اس کی زد سے نہ بڑے بڑے ائمہ بچ سکتے ہیں اور نہ حضرات تابعینؓ بلکہ حضرات صحابہ کرامؓ اور حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات گرامی بھی ان کے لایعنی فتوؤں سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ ثم العیاذ باللہ تعالیٰ) دیکھئے اس ناروا فتوے کی زد سے کون بچ سکتا ہے؟ ۵

متابع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی

یہ کس کافر کا غمزہ خوں ریز ہے ساقی !

باوجود اس کے کہ حق جہور کے ساتھ ہے اور سو فیصدی ان کی رائے درست اور صحیح ہے۔ مگر وہ فریق ثانی کی طرح اس مسئلہ میں (بلکہ دیگر تمام اختلافی مسائل میں) نہ تو مؤرخین قرآنہ خلف الامام کی تکفیر کرتے ہیں اور نہ قسم اٹھا کر ان کو بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ کہتے ہیں اور نہ ان کو مباہلہ کا چیلنج دیتے ہیں۔ بلکہ جن اکابر (مثلاً امام بخاریؒ و امام بیہقیؒ وغیرہ) نے اپنی انتہائی وسعت اور کوشش صرف کر کے جہور کی رائے کے ساتھ اختلاف رائے کیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان کو معذور تصور کرتے ہیں بلکہ ماحوجہ بھی سمجھتے ہیں اور ائمہ دین اور دیگر حضرات سلف صالحینؓ کی نسبت بدظنی اور سبوتاژ اعتقاد کو کسی طرح بھی روا نہیں سمجھتے؛ ۵

وفاؤں کے ہزاروں دے چکے ہیں امتحان تک

مگر وہ ہیں کہ اس سبھی ہیں ہم سے ہدگماں اب تک

اگر یہ نظر انصاف دیکھا جائے تو فریق ثانی کے بے بنیاد اور پادر ہوا دعویٰ اور فتوؤں کا جواب تو اس مقدمہ ہی سے پورا ہو جاتا ہے اور مزید کوئی چیز پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مگر چونکہ ہم تہیہ کر چکے ہیں کہ مسئلہ زیر بحث کو پوری طرح بے نقاب کرنا ہے۔ اس لیے ہم مقدمہ کے بعد اصل بحث اور اس کے دلائل عرض کرتے ہیں۔ لیکن باب اول شروع کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم امام ترمذیؒ (المتوفی ۳۲۰ھ) اور علامہ بدر الدین علینیؒ

(المتوفی ۸۵۵ھ) کی بعض عبارتوں کو یہیں حل کرتے جاتیں، جن سے بہت ممکن ہے کہ بعض اہل علم کو مغالطہ لگ جائے اور طالب علموں کا غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا تو بہت اغلب ہے، رہے وہ حضرات جو غلط فہمی اور مغالطہ کو متابع عزیز سمجھ کر سیلہ سے لگاتے پھرتے ہیں۔ ان کے لیے ہمارے پاس کوئی علاج اور دوا موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی صرف اسی کو ہدایت دیتا ہے جو دل میں اس کی ترپ اور جذبہ پیدا کرے۔ اور عملاً اس کی طرف پیش قدمی کرے ورنہ اس دربار عالی سے بھی محرومی کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

یہ بزم ہے یاں کو تاہ دستی میں ہے محرومی  
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی لہے

امام ترمذی تحریر فرماتے ہیں: اکثر اہل علم جن میں حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ شامل ہیں اور خاص طور پر امام مالکؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، شافعیؒ، احمدؒ اور اسحاقؒ کا یہ مسلک ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قراۃ کرنی چاہیے (ترمذی جلد ۱ ص ۱۲۱) ہم پہلے امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام عبداللہ بن مبارکؒ امام اسحاقؒ (پچھلے صفحے کے حاشیہ) امام ترمذیؒ، علامہ ذہبیؒ ان کو امام اور حافظ لکھتے ہیں۔ صحاح ستہ میں جو مشہور کتاب الجامع ہے۔ وہ انہی کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ کتاب العللؒ بھی انھوں نے لکھی ہے۔ حافظہ میں وہ ضرب المثل تھے۔ (تذکرہ ۲۵ ص ۱۲) مگر افسوس یہ امام عالی مقام بھی جرح سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ علامہ ابن حزمؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ترمذی صاحب الجامع مجہول ہیں (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۱۱۸) اگر امام ترمذیؒ مجہول ہیں تو دنیا میں معروف کون ہوگا؟

علامہ بدر الدین عینیؒ، مولانا عبدالحی صاحب لکھنؤیؒ (المتوفی ۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں کہ وہ امام، عالم، علامہ عالم بالعربیۃ والتصرف اور حافظ لغت تھے۔ نیز لکھتے ہیں کہ اگر ان میں مذہبی تعصب نہ ہوتا تو کیا خوب ہوتا (فوائد البیہ قن ۲) بعض غیر مقلد حضرات علامہ عینیؒ کے تعصب پر مولانا لکھنؤیؒ کی یہ عبارت لیے لیے پھرتے ہیں۔ لیکن یہ تو فراموش کہ ذہبیؒ تعصب کون امام بچ سکتا ہے۔ علامہ ذہبیؒ جن کے بعد آج تک کوئی ناقد رجال پیدا نہیں ہوا۔ اور حافظ الدین ابن حجرؒ بھی ان کے ناقد روایات ہونے پر نہ صرف اعتقاد کرتے ہیں بلکہ ان کے خوشہ چین بھی ہیں۔ (شرح نجمۃ الفکر ص ۱۱) معہذا شیخ الاسلام تاج الدین سبکیؒ لکھتے ہیں کہ ذہبیؒ بڑے متعصب ہیں وہ ہمارے استاد ہیں اور ہم پر ان کا حق ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا حق ان پر مقدم ہے ہم جو کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی حنفی یا شافعی کے حق میں ذہبی



بن راہویہ کا مسلک پوری وضاحت سے نقل کرتے ہیں کہ ہماری نمازوں میں ان میں کوئی بھی قرآنہ خلف الامام کا قائل نہ تھا اور ستر ستری نمازوں میں امام مالکؒ، امام احمدؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ وغیرہ وجوب قرآنہ کے قائل نہ تھے۔ اور خود امام ترمذیؒ نے امام عبداللہ بن مبارکؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں: بعض لوگوں نے تشدد سے کام لیا ہے لیکن میرے نزدیک جس شخص نے امام کے پیچھے قرآنہ نہ کی اس کی نماز صحیح ہے۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۴۸)

اندریں حالات اگر کسی کو امام ترمذیؒ کی اس عبارت سے کوئی شک اور شبہ پیدا ہو۔ تو ہرگز صحیح نہیں۔ المعصوم من عصمہ اللہ تعالیٰ۔ لیجیہ ہم آپ کو ترمذیؒ کی اسی عبارت کی شرح مولانا مبارک پوری صاحبؒ کے حوالہ سے سناتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

فیہ اجمال ومقصودہ ان ھو لاء  
الثمة کلہم یرون القرآۃ خلف الامام  
اما فی جمیع الصلوٰۃ و فی الصلوٰۃ السنیۃ  
فقط و اما علی مبیل الوجوب او علی مبیل  
الاستحباب والاستحسان۔  
کہ امام ترمذیؒ کا یہ قول مجمل ہے۔ ان کی مراد یہ ہے کہ یہ ائمہ مذکورین امام کے پیچھے قرآنہ کے قائل تھے۔ بعض سب نمازوں میں اور بعض صرف ستری نمازوں میں۔ بعض وجوب کے قائل تھے اور بعض صرف استحباب اور استحسان کے۔

(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۳)

اور تصریح کرتے ہیں کہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرآنہ کے وجوب کے قائل نہ تھے۔ (ایضاً ص ۲۵۷) اور لکھتے ہیں کہ امام عبداللہ بن مبارکؒ بھی امام کے پیچھے وجوب قرآنہ کے قائل نہ تھے۔ (ایضاً ص ۲۵۷)

ربا یہ کہ تمام نمازوں میں قرآنہ خلف الامام کا قائل کون تھا؟ اور پھر خاص طور پر وجوب کا جہان تک راقم الحروف کے حدود مطالعہ کا تعلق ہے۔ ان ائمہ میں سے جن کا تذکرہ امام ترمذیؒ نے کیا ہے۔ ایک بھی ایسا نہیں جو تمام نمازوں میں قرآنہ خلف الامام کا قائل ہو اور خاص طور پر وجوب۔ اگر مولانا مبارک پوری صاحبؒ کو امام شافعیؒ کے مسلک میں غلط فہمی ہوتی ہو۔ تو ہم پوری وضاحت اور (پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) کا قول مسموع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ شافعیوں اور حنفیوں کے حق میں اکثر تعصب سے کام لیتے ہیں۔ (طبقات اکبر جلد ۲ ص ۱۹۱) والعصمة بید اللہ تعالیٰ وحدہ۔

اور صراحت کے ساتھ امام شافعیؒ کا مسلک عرض کر چکے ہیں۔ علامہ عینیؒ لکھتے ہیں کہ

واستدل بهذا الحديث عبد الله  
يعني حضرت عبادۃ کی (لا صلوة لمن لم يقرأ  
بن المبارک والا وزاعی ومالك والشافعی  
ولحمہ واستحق ابو ثور وداود علی وجہ  
قرۃ الفاتحة خلف الامام فی جمیع الصلوات  
انتہی بلفظہ۔ (عمدة القاری ج ۳ ص ۶۳)  
اور امام داودؒ ظاہری نے یہ استدلال کیا ہے کہ تمام  
نمازوں میں قرأت فاتحہ خلف الامام واجب ہے۔

اس عبارت سے غلط فہمی پیدا نہ ہونی چاہیے:

اولاً اس لیے کہ ہم ان حضرات ائمہ کرامؒ کی عبارتیں پوری تشریح کے ساتھ اور خود فریق  
ثانی کے محدث جلیل اور وکیل اعظم مولانا مبارک پوری صاحبؒ کے اقرار کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ یہ ائمہ  
تمام نمازوں میں وجوب قرۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ امام ابو ثورؒ کے علاوہ باقی ائمہ کرامؒ  
کی عبارتیں پہلے نقل کی جا چکی ہیں اور ان کا مسئلہ زیر بحث کے متعلق محقق مسلک بھی عرض کیا جا  
چکا ہے۔ امام ابو ثورؒ کا صحیح مسلک علی التعمین معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی  
پیش کردہ سابق عبارتوں سے بظاہر یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ جہری نمازوں میں وہ بھی امام کے پیچھے قرۃ  
کو شاذ اور خلاف اجماع ہی سمجھتے ہوں گے اور اسی صفحہ کے حاشیہ سے انکا مسلک یہ معلوم ہوتا ہے  
کہ اس مسئلہ میں ان کی رائے اور تحقیق وہی تھی جو حضرت امام شافعیؒ کی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔  
وثانیاً علامہ عینیؒ کی اسی عبارت پر گرفت کرتے ہوئے مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں:

لہ امام ابو ثورؒ (المتوفی ۲۴۰ھ) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں: کہ وہ الامام، المجتہد اور المافظ تھے۔ امام شافعیؒ ان کو ثقہ  
اور مامون اور احد الفقہاء کہتے ہیں۔ امام ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ وہ فقہ، علم، ورع، فضیلت، تصنیف کتب  
اور تشریح سنت میں دنیا کے اماموں میں ایک تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۸۶) علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد  
الثقاف المأمونین ومن الائمة الاعلام فی الدین تھے۔ (بغدادی جلد ۴ ص ۶۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ پہلے  
اپنی رائے اور فقر پر کار بند تھے۔ جب حضرت امام شافعیؒ رحمۃ اللہ علیہ بغداد تشریف لے گئے تو امام  
موصوف نے اپنے مسلک سے رجوع کر لیا اور امام شافعیؒ کے پاس آتے جاتے رہے۔ (تہذیب جلد ۱ ص ۱۱)  
اس سے بظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ کا مسلک اختیار کیا تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔



میں کتنا ہوں کہ یہ امام بدرالدین عینی کا وہم ہے کیونکہ  
عبد اللہ بن مبارک امام کے پیچھے وجوب قراءۃ کے قائلین میں  
نہ تھے جیسا کہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے اور اسی طرح حضرت  
امام مالکؒ اور امام احمد بھی تمام نمازوں میں سورۃ فاتحہ  
کے امام کے پیچھے پڑھنے کے وجوب کے قائل نہ  
تھے۔

قلت هذا وهم من العيني فان  
عبد الله بن المبارك لم يكن من القائلين  
بوجوب القراءة خلف الامام كما عرفت  
وكذا الامام مالك والامام احمد  
لعمري لو قائلين بوجوب قراءة الفاتحة  
خلف الامام في جميع الصلوات۔ انتهى  
(تحفة الاحوذ جلد ۱ ص ۲۵)

مولانا مبارکپوری صاحبؒ کا یہ ارشاد فرمانا بالکل صحیح ہے۔ یہ یقیناً علامہ عینی کا وہم اور ان کے سر  
قلم کا نتیجہ ہے۔ ورنہ دلائل اور براہین کے رو سے ان ائمہ کا جن کا ذکر علامہ موصوف نے کیا ہے مسلک  
بالدلائل نہایت شرح و بسط کے ساتھ اپنے موقع پر بیان ہو گا اور اجمالی طور پر بقدر کفایت مقدمہ  
میں ذکر ہو چکا ہے۔

ہمیں اچھی طرح اس امر کا احساس ہے کہ سلسلہ کلام دراز سے دراز تہہ ہوتا جا رہا ہے اور شاید کہ آپ مقسمہ  
کی طوالت سے ہی گھبرا جائیں۔ حالانکہ ہم نے ابھی بہت کچھ عرض کرنا ہے۔ اس لیے ہم مقدمہ کو انہی اقتباسات  
پر ختم کرتے ہیں اور فریق ثانی کی خدمت میں نہایت اخلاص سے عرض کرتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا غیر مختلط لفظ  
زبان سے نہ نکالے جس کی زد میں اکثر امت اور جمہور سلف صالحینؒ آجائیں کیونکہ ہم لوگوں تک حدیث  
کے پہنچانے کا واحد ذریعہ ہی یہی لوگ ہیں اور ان پر برسنے والا گویا بالواسطہ حدیث پر برس رہا ہے۔  
اور ان کی گستاخی کرنے والا کبھی حدیث رسول کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا:۔  
تا دامن آ کے چاک گریباں نے دم لیا  
ہے دامن اور جیب میں رشتہ قریب کا

نوٹ: قرآن کریم کی ضروری تشریح حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ کے فوائد سے ماخوذ  
ہے اور طبقات ابن سعد، شذرات الذہب، تہذیب اللسان اور ابن خلکان وغیرہ میرے پیش نظر نہیں ہیں۔ ان  
کتابوں کے حوالے تابعین اور غلامان اسلام سے ماخوذ ہیں۔ باقی جملہ کتابوں سے میں نے براہ راست استفادہ کیا ہے۔  
اللہ ما شاء اللہ تعالیٰ اور حوالہ جات میں صحت کی ہر ممکن کوشش مد نظر رکھی گئی ہے۔  
ابوالنزاہد

## باب اول

اصل دین آمد کلام اللہ معظم داشتن  
پس حدیث مصطفیٰ بر جاں سلم داشتن

اہل اسلام سے یہ بات ہرگز مخفی نہیں کہ جو مرتبہ، درجہ اور قطعیت اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کی کتاب کو حاصل ہے۔ وہ یقیناً دنیا میں کسی اور کلام اور کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دلائل اور براہین کے موقع پر مسلمانوں کے ہاں سب سے پہلا نمبر صرف قرآن کریم کو حاصل ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم کا ایک ایک حرف اور ایک ایک جملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اس میں کسی انسان کی دماغی محنت اور کاوش کو کوئی دخل نہیں ہے۔ بخلاف احادیث کے کیونکہ پہلے ہر حدیث کو نقل بالتواتر کا درجہ حاصل نہیں ہے جیسا کہ قرآن کریم کو حاصل ہے اور پھر احادیث میں نقل بالمعنی کا بھی کافی دخل ہے جیسا کہ فن حدیث سے تعلق رکھنے والوں پر یہ بات مخفی نہیں ہے۔ لہذا یہ امر یقینی ہے کہ جس گروہ کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے ثبوت ہوگا۔ اس کا مسلک حق اور صحیح ہوگا اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ امام کے چچے قرآن لے بلکہ امام سیوطی وغیرہ نے تو یہاں تک دعوے کیا ہے فان اکثر الاحادیث مروی بالمعنی۔ (الاقتراف) یعنی اکثر احادیث جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بقید الفاظ مروی نہیں ہیں۔ بلکہ راویوں نے احادیث کے معانی کو اپنے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔



ترک کرنے پر جمہور کے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب سے قطعی اور محکم دلیل موجود ہے۔

## قرآن کریم کے آداب :

اس سے قبل کہ ہم قرآن کریم کی وہ آیت اور اس کی تفسیر اور تشریح نقل کریں جس سے ہم استدلال کرتے ہیں یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کے عمومی آداب پر غور اور فکر کر لیں کہ جس وقت اور جس مقام پر قرآن کریم کی قرات اور تعلیم و تدریس اور تلاوت ہوتی ہو وہاں سامعین کو کیا کرنا چاہیے؟ اور اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا ادب سکھایا ہے؟ اگر اسی ایک پہلو پر سرسری غور کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ کافی حد تک بحث اسی سے حل اور طے ہو جائے۔ ہم قرآن کریم کی چند آیات اور احادیث اور علماء کرام کی بعض عبارتیں اور نقول عرض کرتے ہیں جن سے سامعین کے آداب پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ اور قرآن کریم کے آداب کا قابلِ تعظیم پہلو بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ ملاحظہ کریں۔

(۱) شروع شروع میں جس وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کریم لاتے۔ ان کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی دل میں پڑھتے جاتے تھے تاکہ جلد اسے یاد کر لیں اور سیکھ لیں۔ مبادا حضرت جبرائیل چلے جائیں اور وحی پوری طرح محفوظ نہ ہو سکے۔ ظاہر بات ہے کہ اس صورت میں پوری طرح سننے اور سمجھنے میں دقت ہوتی تھی۔ ارشاد ہوا کہ آپ ہمہ تن متوجہ ہو کر سنیں۔ جس وقت حضرت جبرائیل پڑھیں۔ آپ اس وقت خاموش ہو کر توجہ کریں اور سنیں اور زبان مبارک کو حرکت نہ دیں۔ قرآن کریم کا حرف بحرف جمع کرنا اور آپ کی ذات سے پڑھوانا ہمارے ذمے ہے۔ آیات ملاحظہ کریں :

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝  
إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ  
فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝  
(پ ۲۹ - قیمۃ ۱۰)

نہ حرکت دیجیے قرآن کے پڑھنے میں اپنی زبان کو تاکہ  
آپ جلدی اس کو سیکھ لیں۔ اس کا جمع کرنا اور اس کا  
(آپ کی زبان سے) پڑھنا ہمارے ذمہ ہے اور جب ہم (زبان  
فرشتہ) پڑھیں تو آپ ان کے پڑھنے کی اتباع کریں۔ پھر

ہمارا ذمہ ہے اس کو کھول کر بتلانا

ان آیات سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی تعلیم و تدریس اور تلاوت کے وقت سامعین کو خاموش رہ کر پوری

و جمعی اور توجہ کے ساتھ قاری اور تالی کی قرآن سننی چاہیے۔ کیونکہ قرآن کریم کے آداب اور اتباع اور اس کی تعظیم و تحکیم کا یہی واضح پہلو ہے۔

مصنف خیر الکلام نے اپنی عادت کے مطابق کہ چپ نہ رہ سکوں یہ فرمایا ہے کہ اس آیت کا قرآن کریم کی تعظیم و احترام سے کوئی تعلق نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ آپ کو اس سے پہلے قرآنی آداب کا علم نہ تھا۔ اور یہ بات سراسر غلط ہے اور نیز لازم آئے گا کہ استاد جب تک سبق ختم نہ کرے شاگرد کا پڑھنا بے ادبی ہو تو پھر پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ ہی چھوڑ دیا جائے بلکہ اس کا مطلب جیسا کہ بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے یہ ہے کہ قرآن کے اتانے سے آپ کو سخت تکلیف برداشت کرنی پڑتی تھی۔

(بخاری جلد ۱ ص ۳۶۳) (مجموعہ خیر الکلام ص ۳۶۳)

### الجواب:

یہ جو کچھ کہا ہے محض دفع الوقتی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ  
 هذا تعلیم من الله عز وجل لرسوله  
 صلی اللہ علیہ وسلم فی کیفیتہ تلقیہ الوحی  
 من الملك فانہ کان یبادر الی اخذہ ویسابق  
 الملك فی قرآنہ فامرہ الله عز وجل اذا جاءہ  
 الملك بالوحی ان یستمع لہ وتکفل الله ان  
 یجمعہ فی صدرہ .... الخ  
 اس میں آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم دی گئی ہے کہ فرشتہ سے وحی کس کیفیت سے حاصل کرنی ہے کیونکہ آپ وحی کے لینے میں جلدی کرتے اور فرشتہ سے اس کی قرآن میں مسابقت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ جب فرشتہ وحی لائے تو آپ توجہ فرمائیں اور قرآن پاک کو آپ کے سینہ میں محفوظ کر دینے کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود اٹھالیا ہے۔  
 (تفسیر جلد ۲ ص ۴۲۹)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ اس آیت کے نزول سے پہلے اس طرح پڑھنے کو خلاف ادب نہ سمجھتے تھے لیکن آپ پر واضح کر دیا گیا ہے کہ آپ کا کام استماع ہے ساتھ ساتھ پڑھنا نہیں ہے باقی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہمارے مطلب کے خلاف نہیں ہے کیونکہ آپ اسی خیال سے پڑھتے تھے کہ مبادا بھول نہ جاؤں سو آپ پر منکشف کر دیا گیا کہ آپ بھولیں گے بھی نہیں اور اس طرح قرآن کریم کا ادب بھی ملحوظ رہے گا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف خیر الکلام



الف باتا پڑھنے والے ابجد خوانوں کو ذہن مبارک میں جگہ دیے ہوتے ہیں جبھی تو فرماتے ہیں کہ پڑھنا پڑھنا ختم ہو جائے گا۔ بات اُن کی ہو رہی ہے جو سن کر تدبر اور قرآن کریم کے مضمون پر غور و خوض کر سکیں اور ان کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ پہلے سن لیں پھر لب کشائی کریں۔ بچوں کی بات نہیں ہو رہی۔

(۲) ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ سے خطاب

فرمایا ہے :

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا  
اور آپ جلدی نہ کریں قرآن کے لینے میں جب تک  
پورا نہ ہو جایا کرے اس کا اتنا۔ اور کہیے اسے میرے رب  
(پ ۱۶ طہ رکوع ۷) زیادہ کر علم مسید اور سمجھ۔

یہ آیت بھی اس امر کو صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ تلاوت اور قرأت قرآن کریم کے وقت سامعین کو پورے تدبر اور انہماک کے ساتھ قرآن سننا چاہیے اور خود ساتھ ساتھ پڑھنے کی کوشش اور کاوش نہیں کرنی چاہیے۔

(۳) بعثت محمدی سے پہلے جنوں کو کچھ آسمانی خبریں معلوم ہو جاتی تھیں۔ جب اُن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر وحی آنا شروع ہوئی تو وہ سلسلہ بند ہو گیا اور بہت کثرت سے شہب کی مار پڑنے لگی۔ جنوں کو خیال ہوا کہ ضرور کوئی نیا واقعہ رونما ہوا ہے جس کی وجہ سے آسمانی خبروں پر بہت زیادہ سخت پہرے بٹھلائے گئے ہیں۔ اسی کی تلاش و جستجو کے لیے جنوں کے مختلف گروہ مشرق و مغرب میں پھیل پڑے۔ ان میں سے ایک جماعت بطنِ نخلہ (مکہ مکرمہ کے پاس ایک مقام کا نام ہے) کی طرف سے گذری۔ وہاں اتفاق سے اس وقت اُن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ نماز فجر ادا کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جنوں کی اس ٹکڑی کا رخ قرآن کریم سننے کے لیے ادھر پھیر دیا۔ قرآن کریم کی آواز ان کو بہت عجیب اور موثر و دلکش معلوم ہوئی اور اس کی عظمت اور عظمت دلوں پر چھا گئی۔ آپس میں کہنے لگے کہ چپ رہو اور خاموشی کے ساتھ یہ کلام پاک سنو۔ آخر قرآن کریم نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا۔ وہ سمجھ گئے کہ یہی نئی چیز ہے جس نے جنوں کو آسمانی خبروں سے روکا ہے۔ بہر حال جب اُن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرآن کریم پڑھ کر فارغ ہوتے تو یہ لوگ

اپنے دلوں میں ایمان و ایقان کا موجزن سمندر کے گرداپس ہوتے اور اپنی قوم کو نصیحت کی جبر کی پوری تفصیل سورہ جن میں کی گئی ہے اور آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی اسی سورت کے ذریعہ سے ان کا پورا قصہ اور واقعہ بتلایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ  
يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ أَن طَلَبْنَا حَضْرُوهُ  
قَالُوا أَلْأَصْنَافُ أَجَلٌ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَى  
قَوْمِهِمْ مُنْذِرِينَ -

اور جب متوجہ کر دیا۔ ہم نے جنوں کا ایک گروہ آپ کی طرف وہ سننے لگے قرآن، پھر جب وہ وہاں پہنچے، تو لے چُپ اور خاموش رہو۔ پھر جب قرآن ختم ہوا تو اپنی قوم کی طرف چلے گئے تاکہ ان کو خدا تعالیٰ کی مخالفت

(پارہ ۲۶، احقاف ۴) اور عذاب سے ڈرائیں

اللہ تعالیٰ نے اس مضمون میں جنوں کے اس گروہ کی تعریف بیان کی ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ پوری توجہ کے ساتھ خاموش رہ کر قرآن کریم کی قرات سنی بلکہ اس کا خیر پر دوسروں کو بھی آمادہ کیا اور مرد مومن کی بھی یہی عادت اور خصلت ہونی چاہیے کہ قرات قرآن کے وقت خود چپ رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرے۔ مولف خیر الکلام کہتے ہیں کہ یہ خاموشی ادب و احترام کے لیے نہ تھی، تحقیق حال کے لیے تھی کیونکہ دوسری جگہ ثابت ہے کہ جب آپ نے سورہ رحمن پڑھی تو جنات جواب دیتے تھے۔ (محصلہ ص ۳۶۴)

الجواب:

جنوں کا خاموش رہنا خالص ادب اور احترام کے لیے تھا اگرچہ وہ اس وقت تک مسلمان نہ تھے مگر بات سمجھنے کی اور خدائی کلام کی تعظیم کی اہلیت ان میں تھی۔ علاوہ انہیں قرآن کریم کے مضامین پر مطلع ہونا اور اس سے آگاہی حاصل کرنا آپ کو کیوں ناگوار ہے! آپ بھی استماع و انصات سے کام لیں۔ رہا سورہ رحمن میں جنوں کا جواب تو یقین رکھیے کہ وہ ساتھ ساتھ سورہ رحمن ہرگز نہ پڑھتے تھے۔ جب آپ فَبَآئِيَ آذَانَ رَبِّيْكَ الْآيَةِ کی قرات مکمل کر چکے تو اس کے بعد جنات تائید میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اقرار کرتے تھے جیسا کہ مقتدی جہری نمازوں میں آمین کہہ کر تائید کرتے ہیں کیونکہ ساتھ ساتھ پڑھنا تو خلاف اجماع اور شاذ ہے۔ حکما مت اور سکنا ت کا صحیح احادیث میں کہیں وجود نہیں ہے۔



(۴) اللہ تعالیٰ کافروں اور مشرکوں کے ایک بُرے منصوبے کا تذکرہ یوں کرتا ہے اور اس کے

بعد ان کو سزا کا مستوجب قرار دیتا ہے:

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا

اور کافروں اور منکروں نے کہا۔ اس قرآن کے صفے

الْقُرْآنِ وَالْغَوَافِیَةِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَبُونَ۔

کے لیے کان مت دھرو اور قرآن کے وقت شور

(پارہ ۲۴، حصہ السجدہ ۴)

غل مچا دو تاکہ تم غالب ہو جاؤ۔

اگرچہ مشرکین کا قرآن کریم کو نہ سننا اور قرأت کے وقت شور و غل مچانا، معاندانہ اور مخالفانہ طور

پر تھا اور حضرات مجازین قرآنہ خلف الامام کو قرآن کریم سے یقیناً عداوت اور عناد نہیں ہوتا اور نہ

اُن کا پڑھنا من کل الوجوہ ان کافروں کے شور و غل کے برابر ہے۔ اور گو وہ اندر روتے دیانت پڑھتے

ہیں لیکن دیکھنا صرف یہ پہلو ہے کہ قرآن کریم کی قرآنہ اور تلاوت کے وقت خود پڑھنا کیا باعثِ مخالفت و

منازعت اور تشویش و ماتھا پائی کا سبب ہے یا نہیں؟ اگر ایسا ہے اور یقیناً ہے تو ایسے موقع پر

خود قرآن کریم کا پڑھنا آداب قرآن کریم کے خلاف اور موجب تشویش و ماتھا ہوگا، لہذا حق اور صواب

یہی ہے کہ تلاوت قرآن کریم کے وقت خاموش رہ کر اس کا ادب و احترام ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مؤلف

خیر الکلام کا یہ کہنا کہ جن باتوں کی شریعت نے اجازت دی ہے وہ کیونکر بے ادبی ہیں۔ (محصلہ ص ۳۶)

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بھری نمازوں میں امام کے ساتھ ساتھ قرأت کرنے کا کسی شرعی دلیل سے ثبوت

نہیں ہے اور یہ خلاف اجماع ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :

هَذَا حَالُ هَؤُلَاءِ الْجَاهِلَةِ مِنَ الْكُفَّارِ

ان جاہل کافروں اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں

وَمِنْ سَلَكِ مَسْلَكِهِمْ عِنْدَ سَمَاعِ الْقُرْآنِ وَقَدْ

کا یہ حال ہے کہ وہ قرآن کی قرآنہ کے وقت خاموشی اور

أَمَرَ اللَّهُ عِبَادَهُ الْمُؤْمِنِينَ بِخُلُوفِ ذَلِكَ فَقَالُوا

سکوت اختیار نہیں کرتے اور شور و غل مچاتے ہیں اور مؤمنین

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا

کو اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف حکم دیا ہے کہ جب قرآن

لَعَلَّكُمْ تَرْحَمُونَ۔

مجید پڑھا جائے تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو

(تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۸۹ مع المعالم)

تاکہ تم پر رحمت نازل کی جائے۔

حافظ صاحب کی عبارت سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ قرآنہ قرآن کے وقت مومنوں کا کام

دلچسپی کے ساتھ اس کو سننا ہے اور جابل کافر اور ان کے پیروکار اس ضابطہ کو ملحوظ نہیں رکھتے بلکہ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

(۵) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

”اے ابن مسعود! مجھے قرآن کریم پڑھ کر سناؤ۔ ابن مسعود فرماتے ہیں: میں نے کہا حضرت! کیا میں آپ کو قرآن پڑھ کر سناؤں؟ حالانکہ آپ پر قرآن کریم نازل ہوا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ انی اشتی ان اسمعه من غیری — میرا دل چاہتا ہے کہ کسی دوسرے سے قرآن سنوں“ (مسلم جلد ۱ ص ۲۷۰)

یہ روایت بخاری جلد ۲ ص ۶۵۹ اور ترمذی جلد ۲ ص ۱۲۷ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود نے سورۃ نساء کا کافی حصہ پڑھ کر سنایا اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پورے ذوق و شوق سے سنا۔ امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں اس سے جو احکام اور فوائد اخذ ہو سکتے ہیں۔ ان کی تفصیل کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

منها استحباب استماع القراءة و الاصفاء لها والبقاء عند تلاوتها و استحباب طلب القراءة من غیره لیستمع له وهو بالغ فی الفہم والتدبر من قرآنہ بنفسہ۔ (نووی شرح مسلم ج ۱ ص ۲۷۰) ہے۔

ان فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن کریم کا بغور سننا اور توجہ کرنا اور ردنا اور تدبر کرنا پسندیدہ بات ہے اور یہ بھی مستحب ہے کہ دوسرے سے قرآن کریم سننے اور دوسرے سے سننا خود پڑھنے سے فہم و تدبر میں زیادہ مدد و معاون ہے۔

یعنی اگرچہ قرآن کریم کا پڑھنا کار ثواب ہے لیکن جس طرح دوسرے سے سننے میں فہم و تدبر اور غور و فکر کا موقع ملتا ہے۔ وہ یقیناً خود پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے خود پڑھنے کے بجائے بعض اوقات دوسرے سے سننا افضل اور اعلیٰ ہے۔

مولف خیر الکلام کہتے ہیں کہ یہ نماز میں نہ تھا اور آپ نے کمال توجہ سے سنا آخر میں آپ نے ردنا شروع کیا اور فرمایا بس اتنا ہی کافی ہے معلوم ہوا کہ مناسب کلمہ کہنا بے ادبی نہیں ورنہ بحجہ تحریمہ کا پڑھنا خلاف ادب ہوگا۔ (محصلہ ص ۳۷۵)



## الجواب:

ہم نے کب کہا ہے کہ وہ نماز میں تھے۔ بتلانا تو صرف قرآن کریم کی تعظیم کا پہلو ہے۔ دیکھیے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باقرار شما کس غور سے آخر تک سنا اور رونا شروع کر دیا۔ یہی اس کے تدبیر اور استماع کا لازمی نتیجہ تھا اور آپ نے حَسْبُكَ کہ بس اتنا ہی کافی ہے آخر میں فرمایا ہے۔ درمیان میں اور ساتھ ساتھ نہیں فرمایا۔ باقی تجرید تحریر یہ فرض ہے۔ اس کو واجب لغیرہ کے لیے (یعنی خاموشی جو قرآن کے استماع کے لیے ہے) نہیں چھوڑا جاسکتا اور ساتھ ساتھ پڑھنا تو منکر اور شاذ ہے۔ حکماء۔

قرآن کریم کے مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ مَثَلًا — کہ جس نے ایک نیکی کی اس کو دس گنا ثواب ملے گا۔ قاعدہ سے عموماً اور اس صحیح حدیث سے خصوصاً کہ جو شخص قرآن کریم کا ایک حرف پڑھے گا۔ اس کو دس نیکیاں عطا ہوں گی (ترمذی جلد ۲ ص ۱۱۵) یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ خود پڑھنے والا دس نیکیوں کا مستحق ہے لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے سے قرآن سننے والے کو بیس نیکیاں ملتی ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

من استمع الى آية من كتاب الله  
جو آدمی قرآن کدیر کی ایک آیت سنتا ہے اس  
كتب له حسنة مضاعفة (الحديث) کے لیے دہرا اجر لکھا جاتا ہے۔

(رواہ احمد فی مسندہ - ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۸۱)

چونکہ مقتدی پر انصاف واجب ہے اس لیے اس حدیث کے رُوسے اس کو دہرا اجر ملیگا اور غیر حافظ جب حافظ کی قرآن سننے کے لیے توجہ کرے تو اس حدیث کے رُوسے وہ بھی دہرے اجر کا مستحق ہے۔ خدا تعالیٰ کے ہاں کیا کمی ہے؟

مؤلف خیر الکلام کا طنزاً یہ کہنا کہ غیر حافظوں کے لیے یہ نسخہ اکسیر ہے..... الخ (ص ۳۸۰)  
محض تسکین قلب کا سامان ہے اور بس۔ ملاحظہ کیجیے کس طرح صرف اپنی فاسد رائے سے حدیث کو روکیا جا رہا ہے۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) صرف بطور تائید ایک روایت اور ملاحظہ کریں: آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ان الله يحب الصمت عند تلاوة القرآن وعند الزحف وعند الجنازة۔ تین مقامات پر اللہ تعالیٰ خاموشی کو پسند کرتا ہے۔ ان میں سے ایک قرآن کریم کی قرآنہ کا، دوسرا لڑائی کا اور تیسرا جنازہ کا وقت ہے۔ (اخرجہ ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۱۶)

احسن الکلام طبع اول میں وعنده تلاوة القرآن (الحديث) کر دیا گیا تھا جس پر مؤلف خیر الکلام نے اعتراض کیا کہ مؤلف احسن الکلام نے چالاکی کر کے وعنده الزحف .... الخ کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ لڑائی کے وقت ذکر اللہ قرآن سے ثابت ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انصاف اور ذکر جمع ہو سکتے ہیں چونکہ یہ ہماری تائید میں ہے۔ لہذا احسن الکلام والا اس کو کھا گیا ہے۔ (مصلحہ ص ۵۶۹)

**الجواب:**

وعنده الزحف کا جملہ ہمارے ہرگز خلاف نہیں ہے کیونکہ لڑائی کے موقع پر مختلف اوقات ہوتے ہیں کبھی ذکر کا حکم ہے اور کبھی انصاف کا اور کبھی ذکر قلبی اور استعانت وغیرہ کا۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مرفوع روایت نقل کرتے ہیں جس میں یہ بھی ہے کہ پس جب تم کافروں سے ملو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو یاد کرو اور جب وہ شور و غل کریں تو تم خاموش رہو۔

(تفسیر جلد ۲ ص ۳۱۶)

اور ایک دوسری حدیث میں یٰٰذَا كُنْ فِي مَعْنَىٰ يَوْمٍ كَرِهْتَ مِينَ: اى لا يشغله ذلك الحال عن ذكرى ودعائى واستعانتى (ايضاً) یعنی لڑائی میں وہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس سے مانگنے اور استعانت سے بے پروا نہ ہو تو اس میں ذکر اور انصاف دونوں جمع نہیں ہونے بلکہ دونوں اپنے اپنے موقع پر ہیں اور حیرت ہے کہ ان کو الحدیث کی اصطلاح بھی معلوم نہیں جیسی تو کہتے ہیں کہ حذف کر دیا ہے جس کا مطلب ہے کہ آخر تک حدیث پڑھو اور اس کو ملحوظ رکھو۔

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ

دل الكتاب والسنة والاجماع على ان الاستماع افضل من القراءة۔ کتاب و سنت اور اجماع امت سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ قرآن کریم کی قرأت کو سننا خود پڑھنے سے

(مقارنہ جلد ۲ ص ۱۳۳) زیادہ اعلیٰ اور افضل ہے۔

الحاصل قرآن کریم وحدیث اور اقوال ائمہؒ سے یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ قرآن کریم کی



تلاوت اور قرأت کے وقت سامعین کو ہمہ تن گوش ہو کر اس کی طرف توجہ اور تدبیر کرنا چاہیے۔ اور صرف یہی پہلو قرآن کریم کی توقیر و تعظیم پر علی وجہ الاثم دلالت کرتا ہے۔

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ وہ قرآن کریم کے عمومی آداب پر مشتمل ہے۔ اور اس سے عام قاعدہ اور ضابطہ بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ اب ہم تخصیص کے ساتھ امام کے پیچھے قرأت کی مانعت پر قرآن کریم کی آیت پیش کرتے ہیں۔ پھر اس کی تفسیر و تشریح اور شان نزول حضرات صحابہ کرام و تابعین اور معتبر مفسرین سے نقل کریں گے۔ اور فریق ثانی کی طرف اس پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں۔ ان کو نقل کر کے ان کی حقیقت کو بقدر وسعت الم نشرح کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

### قرآۃ خلف الامام اور قرآن کریم:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔

اور جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو۔ تاکہ تم پر رحم ہو۔

(پارہ ۹، اعراف ۴)

جہو راہل اسلام کا بیان ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسئلہ خلف الامام پر روشنی ڈالی ہے کہ جب امام قرآن کریم کی قرآۃ کر رہا ہو تو اس وقت مقتدیوں کا وظیفہ صرف یہ ہے کہ نہایت توجہ کے ساتھ اس کی طرف کان لگائے رہیں اور خود خاموش رہیں۔ امام کا وظیفہ قرأت کرنا اور مقتدیوں کا وظیفہ خاموشی کے ساتھ توجہ کرنا ہے اور ان کو استماع اور انصات کے علاوہ قرأت کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ الحمد سے لے کر والناس تک سب قرآن ہے۔ لیکن قرآن کریم صحیح احادیث، حضرات صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال کی روشنی میں دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کا خاص اطلاق کس سورت پر ہوا ہے؟ اور قرآن کا اولین اور بالذات مصداق کونسا حصہ ہے؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ أَتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَافِ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ (پارہ ۱۱، الحجرات ۴)

اور البتہ دی میں ہم نے آپ کو سات آیتیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور دیا قرآن بڑے درجہ کا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ام القرآن ہی السبع المثانی والقرآن العظیم۔  
کہ ان سات آیتوں اور قرآن عظیم کا مصداق سورۃ فاتحہ ہے۔

(بخاری جلد ۲ ص ۶۸۳ اور اسی کے قریب الفاظ دارمی ص ۴۳۲ طبع دمشق میں ہیں)

اس کے علاوہ حضرت ابوسعید بن المعلیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ وغیرہ سے بخاری و موطا، امام مالک وغیرہ میں مرفوعاً صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ قرآن عظیم کا پہلے نمبر پر مصداق ام الكتاب ام القرآن اور سورۃ فاتحہ ہے۔ اور یہی حضرت عمر، علی، ابن مسعود، ابن عباس، ابراہیم نخعی، عبد اللہ بن عبید بن عمیر، ابن ابی ملیکہ شہر بن حوشب، حسن بصری، مجاہد اور قتادہ وغیرہ اکابر سے مروی ہے اور اسی کو امام ابن جریر اور حافظ ابن کثیر ترجیح دیتے ہیں اور لکھتے ہیں:

فلذا نص فی ان الفاتحة هی السبع المثانی والقرآن العظیم۔  
کہ یہ روایات اور اقوال مفسرین اس بات پر نص ہیں کہ سبع مثانی اور قرآن عظیم کا اولین مصداق سورۃ فاتحہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد ۲ ص ۵۵)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ قرآن کریم کی سبب سورتوں سے افضل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا پڑھنا ہر نماز میں لازم قرار دیا گیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے (جو احادیث سے ثابت ہے) کہ تورات انجیل اور زبور بلکہ قرآن کریم میں اس جیسی مزیت اور فضیلت والی اور کوئی سورت نازل نہیں کی گئی اور یہ بالکل متنع ہے کہ استماع اور انصات کا حکم سورۃ فاتحہ کو شامل نہ ہو۔ حالانکہ استماع اور انصات کی آیت اس کو کئی طور سے شامل ہے کہ یہ آیت مطلق ہے اور سورۃ فاتحہ اس کا ایک حصہ ہے اور یہ کہ آیت عام ہے اور یہ اس کا جزو ہے (اور یہ کہ آیت مجمل ہے اور حدیث اس کی تفسیر ہے کہ اس سے مراد سورۃ فاتحہ ہے۔ (صفہ)

علاوہ بریں اس کی قرآۃ اکثر اور مشہور ہے اور یہ تمام سورتوں سے افضل ہے۔ پھر آگے لکھتے ہیں: فان قوله واذ اقرئ القرآن یتناولها یعنی واذ اقرئ القرآن کی آیت جس طرح اپنی لفظی ولا یتناول غیرها اظہر لفظاً ومعناً۔ اور معنوی حیثیت سے سورۃ فاتحہ کو شامل ہے اس

(فتاویٰ جلد ۱ ص ۱۴۳) طرح وہ قرآن کی کسی دوسری سورت کو شامل نہیں ہے۔ اس تحقیق سے یہ امر بالکل واضح اور ہموار ہو جاتا ہے کہ واذ اقرئ القرآن



کا صحیح، اصلی اور بالذات مصادیق صرف سورۃ فاتحہ ہے۔ لہذا یہ حکم سورۃ فاتحہ پر مخصوصاً اور دیگر سورۃ پر عموماً حاوی ہے۔ اور اس لحاظ سے مقتدیوں کو امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کا ترک کرنا اصل ہوگا۔ اور باقی سورۃوں کو ترک کر اس کی فروع، امام نسائی نے (جلد ۱ ص ۱۰۶ میں) جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیث (جس کی پوری تفصیل اپنے مقام پر آئے گی) انشاء اللہ العزیم اذا قرأ فانصتوا کو (کہ جب امام قرآن کرے تو تم مقتدی خاموش رہو) قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر اور تاویل میں نقل کر کے یہ بات پایہ تکمیل کو پہنچا دی ہے کہ گویا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی قرآن کی اس آیت کو نماز اور نمازیوں کے حق میں ہی سمجھتے تھے۔ اب آپ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور معتد مفسرین کرام سے اس آیت کی تفسیر سن لیجیے کہ وہ کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

اس سے قبل کہ ہم اس آیت کی تفسیر حضرات صحابہ کرام سے نقل کریں۔ یہ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ حضرات صحابہ کی تفسیر کا رتبہ، درجہ اور حیثیت کیا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے نزدیک صحابی کی تفسیر مسند اور مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتی ہے۔ (مستدرک ج ۱ ص ۱۲۳) اور یہی امام حاکم رحمہ اللہ کی اپنی تحقیق ہے۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۲) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ اکثر علماء کے نزدیک صحابی کی تفسیر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۲۳۳) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں: وتفسیر الصحابی حجة۔ (زاد المعاد جلد ۱ ص ۵۲) علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں وتفسیر الصحابی مرفوع۔ (تدریب الراوی ص ۶۵) علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں جس صحابی نے نزول وحی کا زمانہ پایا ہو۔ اس کا کسی آیت سے متعلق یہ کہنا کہ یہ فلاں اور فلاں حکم میں نازل ہوئی۔ یہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ (توجیہ النظر ص ۱۶۵)

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں:

وكذا احكم اقوالهم في التفسير فانها  
اصوب من اقوال من بعدهم وقد ذهب  
بعض اهل العلم الى ان تفسيرهم في حكم  
المرفوع۔  
یعنی حضرات صحابہ کرامؓ کی تفسیر بعد کے آلہ والے  
مفسرین سے بہت زیادہ صحیح اور صواب ہے حتیٰ کہ بعض  
(بلکہ اکثر) علماء کی تحقیق یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ کی تفسیر  
مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔

(الجنة في الاسوة الحسنة بالسنة ص ۹)

## حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۳۲ھ)

سے قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیروں منقول ہے:

لے یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ آفتاب نبوت سے اکتساب نور کرنے کے بعد تمام حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نجوم ہدایت تھے۔ مگر بعض کو ایسے جزوی فضائل حاصل تھے کہ دوسرا کوئی ان میں ان کا ہم پایہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان میں ایک شخصیت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے۔ ان حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مصلحین قرآن میں سب سے پہلے ان کا بیان کیا ہے (بخاری جلد ۱ ص ۵۳۱ و مسلم جلد ۲ ص ۲۹۳) اور فرمایا ہے جس چیز کو تمہارے لیے ابن مسعود رضی اللہ عنہ پسند کرتے ہیں میں اس پر راضی ہوں۔ (مسند رک جلد ۳ ص ۱۹۱ صحیح) نیز فرمایا اگر بغیر مشورہ کے تمہارے لیے میں خلیفہ کا انتخاب کروں تو وہ صرف ابن مسعود ہی ہوں گے اور جس چیز کو ابن مسعود تمہارے لیے پسند نہ کرے میں بھی اس کو تمہارے لیے پسند نہیں کروں گا۔ (الاستیعاب جلد ۱ ص ۳۵۹) اور فرمایا ابن مسعود کے عہد اور تحقیق کو مضبوطی سے قائم رکھو۔ (ایضاً) حضرت عقبہ بن عمرو فرماتے تھے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد میں نے ما اُنزل اللہ (یعنی جو کچھ خدا تعالیٰ نے نازل کیا ہے) کا ابن مسعود رضی اللہ عنہ بڑا عالم کوئی نہیں دیکھا۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیوں نہ ہو۔ وہ ہر وقت حضور کے پاس رہتے تھے اور حضورؐ ان سے کسی وقت حجاب نہیں کرتے تھے۔ (مسلم ۲ ص ۲۹۳) مشہور تابعی شفیق رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ میں ابن مسعودؓ پر کسی صحابی کو ترجیح نہیں دیتا۔ (مسند رک جلد ۳ ص ۳۱۹) یہی وجہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ علی رؤس الاشہاد فرمایا کرتے تھے۔ اس خدا کی قسم جس کے بغیر کوئی دوسرا اللہ نہیں۔ قرآن کریم کی کوئی سورت اور کوئی آیت ایسی نہیں جس کا شان نزول مجھے معلوم نہ ہو کہ کس موقع اور کس حالت میں نازل ہوئی ہے اور میں کتاب اللہ کا اپنے سے بڑا عالم کسی کو نہیں پاتا۔ (بخاری جلد ۲ ص ۴۲۸ و مسلم ۲ ص ۲۹۳) اور فرمایا تمام صحابہؓ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ان سب سے کتاب اللہ کا بڑا عالم ہوں۔ (ایضاً) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضرات خلفائے راشدینؓ سے بھی کتاب اللہ کے بڑے عالم ہیں۔ (شرح مسلم جلد ۲ ص ۲۹۳) اور اہل علم میں ان پر وہ حضرات کسی کو فضیلت نہ دیتے تھے۔ (مفتاح السعادة جلد ۱ ص ۳۵۳) حضرت عمرؓ نے ان کو علم کا انبار کہا۔ اور اہل کوفہ کی طرف تعلیم قرآن کے لیے ارسال کیا۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۱۴۴) بعض حضرات نے مسئلہ رفع یدین کے پیش نظر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر متعدد مسائل میں نسیان کا الزام عائد کیا ہے۔ لیکن نسیان تو انسان کی فطرت اور خمیر میں ودیعت کیا گیا ہے۔ جو اولاد آدم کو باپ سے بطور ورثہ ملا ہے۔ اگر نسیان (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ)



(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

سے محض نسیان ہی مراد ہے تو دوسروں کا ذکر بعد میں ہو گا۔ کیا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ ارشاد نہیں فرمایا: انما انابشی افشی کما تنسون اور اگر نسیان سے مراد بعض مسائل اور احادیث سے لاعلمی ہے تو یہ قصور صرف حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا نہیں بلکہ دوسرے بھی اس بات میں ان کے شریک ہیں۔ کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو وراثت جدہ کی بابت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حکم طاعون سے متعلق بلکہ رفع یدین کے مرکزی راوی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو مسح علی الخفین کے مسئلہ سے ناواقف اور لاعلمی نہ تھی؟ اور کیا یہ اکابر عموماً اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس لیے قابل اعتماد نہ رہے۔ کہ انھوں نے مسح علی الخفین (دیکھیے موطا ص ۱۲) جیسے مسئلہ سے جس کا ثبوت متواتر احادیث اور تعامل امت سے ثابت ہے۔ لاعلمی ظاہر کی بلکہ انکار کیا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ فرماتے ہیں کہ ابن عمر اشک المسح علی الخفین مع قدیم صحبتہ و کثرة روايته اھ (فتح الباری جلد ۱ ص ۲۳۵ طبع مصر) کہ بے بیشک حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مسح علی الخفین کا انکار کیا حالانکہ وہ پرانے صحابی اور کثیر الراوی تھے۔ باقی باتوں کا ذکر تو روایات اور احادیث سے متعلق ہے اور یہ تفصیل کا مقام نہیں۔ لیکن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر جو یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ معوذتین کو قرآن کریم کی سورتیں نہیں سمجھتے تھے۔ یہ خالص افتراء اور بہتان ہے۔ علامہ ابن حزم لکھتے ہیں کہ

کل ما روی عن ابن مسعود من ان المعوذتین و امر القرآن لمریکونافی مصحفہ  
جنتی روایتیں بھی ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس مضمون کی نقل کی گئی ہیں کہ معوذتین اور امر القرآن ان کے مصحف میں نہ تھیں تو وہ خالص جھوٹی اور جعلی فکذب موضوع (و یصح)۔

(محلّی ابن حزم جلد ۱ ص ۱۳) ہیں جو کسی طرح صحیح نہیں ہیں۔

امام نووی رحمہ اور علامہ سیوطی رحمہ لکھتے ہیں:

وما نقل عن ابن مسعود باطل  
معوذتین کے قرآن میں نہ ہونے کی جنتی روایتیں  
ابن مسعود کی طرف منسوب ہیں وہ سب باطل اور غیبر  
لیس بصحیح۔

(شرح المہذب جلد ۱ ص ۱۹۱ و اتقان ج ۱ ص ۱۹۱) صحیح ہیں۔

امام سبکی فرماتے ہیں کہ دلیل قاطع اس پر قائم ہے کہ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر جھوٹ باندھا گیا ہے اور وہ

اس سے بالکل بری ہیں۔ (طبقات جلد ۲ ص ۲۰۶)

پہلی روایت: امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں۔ ہم سے ابو کریمؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے محارب بنی نے بیان کیا۔ وہ داؤد بن ابی ہند سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ یسیر بن جابر سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا:

۱۔ ان کا ترجمہ عنقریب آ رہا ہے۔

۲۔ ابو کریم کا نام محمد بن العلاء ہے۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الثقة اور محدث کو فہم لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۷۲) امام نسائی رحمہ اللہ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابو عمرو الخفافؒ کا بیان ہے کہ میں نے اسحاق رحمہ اللہ بن ابراہیم رحمہ اللہ کے بعد ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں دیکھا۔ محدث مسلمہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸۶)

۳۔ محارب بنی کا نام یحییٰ بن یعلیٰ ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ ان کو ثقہ کہتے ہیں اور ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۱۱ ص ۳۰۳) اور کسی کی جرح ان پر منقول نہیں ہے۔ قاضی مقبول احمد صاحب نے اس روایت پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محارب بنی دو ہیں۔ ایک یعلیٰ بن یعلیٰ جن کی توثیق مولانا سرافراز صاحب نے فرمائی ہے اور دوسرے عبد الرحمن بن محمد بن زیاد جو انتہا درجہ کے ضعیف ہیں اور قوی احتمال ہے کہ مولانا نے ضعیف محارب بنی کی توثیق کر کے اپنا مطلب نکال لیا ہو۔ (محصلہ الاعتصام ۲۸ ستمبر ۱۹۷۲ء ص ۱۷۱ کالم ۳) الجواب: راقم نے یعلیٰ بن یعلیٰ رحمہ اللہ کی توثیق نہیں نقل کی بلکہ یحییٰ بن یعلیٰ المحارب بنی رحمہ اللہ کی توثیق نقل کی ہے اور اس سند میں یہی محارب بنی ہیں۔ ہم محض قاضی صاحب کی تسلی کے لیے عبد الرحمن بن محمد بن زیاد المحارب بنی کے متعلق بھی یہ عرض کیے دیتے ہیں کہ وہ انتہائی درجہ کے ضعیف نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہیں۔

اولاً۔ اس لیے کہ یہ بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کے مرکزی راوی ہیں کیا فریق ثانی کے نزدیک صحاح ستہ کے مرکزی راوی بھی انتہا درجہ کے ضعیف ہوتے ہیں؟ یہ ہے غیر مقلدین حضرات کا علم و دیانت۔ سبحان اللہ تعالیٰ۔ اگرچہ ان کے بارے میں بعض نے مضطرب کثیر الغلط اور مبہم وغیرہ کے الفاظ لکھے ہیں لیکن امام ابن معینؒ، نسائیؒ اور ابو حاتمؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام وکیعؒ فرماتے ہیں کہ طویل احادیث کے وہ بڑے حافظ تھے۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن شاپرؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ عثمان بن ابی شیبہؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ محدث بزارؒ اور دارقطنیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ عجلؒ ان کو لا بائس بہ کہتے ہیں اور ساجیؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ (ملتقط تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۲۶۶)۔ (باقی صفحہ ۱۲۵)



صلیٰ ابن مسعود فسمع انا سابقاً و  
مع الامام فلما انصرف قال اما ان لکم  
ان تفهموا اما ان لکم ان تعقلوا و اذا  
قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا کما  
امرکم اللہ تعالیٰ۔  
(تفسیر ابن جریر جلد ۹ ص ۱۳۱)  
کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود نے نماز پڑھی اور چند  
آدمیوں کو امام کے ساتھ قرآن کریم سنا۔ جب آپ نماز  
سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ وہ وقت ابھی نہیں  
آیا کہ تم سمجھو اور عقل سے کام لو اور جب قرآن کریم کی قرآن  
ہوتی ہو تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو جیسا  
کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے۔

یہ روایت وضاحت سے یہ بات ثابت کرتی ہے کہ پڑھنے والے امام کے پیچھے قرآن کریم پڑھتے اور حضرت  
ابن مسعود نے ان کو فہم و عقل سے کام نہ لینے پر تنبیہ کرتے ہوئے قرآن سے منع کیا اور یہ بات بھی عیاں کی گئی  
کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو استماع اور انصات کا حکم دیا ہے۔ جو امام کے ساتھ اس کی  
امت میں نماز ادا کر رہے ہوں اور یہ وہی ابن مسعود ہیں جو کتاب اللہ کے عالم ہونے میں تمام حضرات صحابہ  
(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) قاضی صاحب مؤلف احسن الکلام سے بے شک اختلاف رکھیے، مگر صحاح ستہ کے ثقہ راوی کو تو  
انتہاء درجہ کا ضعیف نہ قرار دیکھیے۔

تھ داؤد بن ابی ہند کو امام احمد، سفیان ثوری، ابن معین، ابوصالح اور نسائی ثقہ کہتے ہیں۔ یعقوب بن ابی شیبہ ان کو  
ثقل اور ثبت کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو متقین میں شمار کرتے ہیں۔ ابن خراش ان کو ثقہ اور ابن سعد ثقہ اور کثیر الحدیث  
کہتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۳ ص ۲۰۷) وہابی ان کو امام اور الثبت کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۳۷)۔  
یہ یسیر بن جابر، ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن سعد ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام علی ان کو من ثقات اصحاب  
عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں۔ بخاری بن حوشب ان کو صحابی بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سہ میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔  
(تمذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۷۹) حافظ ابو عمر بن عبدالبر بھی ان کو صحابی بتلاتے ہیں۔

(الاستیعاب جلد ۲ ص ۶۱)

نوٹ: تفسیر ابن جریر اور ابن کثیر کے بعض نسخوں میں کاتب کی غلطی سے بشیر بن جابر لکھا گیا ہے  
جو قطعاً غلط ہے مسند احمد جلد ۳ ص ۳۸۳ اور مسند طحاوی ص ۵۱ اور صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۹ میں ایک  
دوسری حدیث کی سند میں یسیر بن جابر ہی آیا ہے جو صحیح ہے مزید تشریح کے لیے نووی جلد ۱ ص ۳۹۔  
اور تجربہ اسرار الصحابہ للذہبی جلد ۲ ص ۱۵ وغیرہ کی طرف مراجعت کیجیے۔

کرام حتی کہ حضرات خلفائے راشدینؓ سے بھی بڑھے ہوئے تھے اور جن کو ہر سورت اور ہر آیت کا شان نزول بخوبی معلوم تھا۔ مولف خیر الکلام نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ شان نزول میں بیان کر رہے بلکہ استدلال کر رہے ہیں اور استدلال بھی ان کی بے جا حرکت پر تھا کیونکہ وہ امام کے ساتھ ساتھ جہر کے ساتھ پڑھتے تھے جیسا کہ لفظ استماع سے معلوم ہوتا ہے..... الخ (مجلد ۵ ص ۳۵)۔

### الجواب:

حضرت ابن مسعودؓ تو کہا امر کہ اللہ سے اس کا شان نزول بیان فرما رہے اور اگر استدلال بھی مان لیا جائے تو ماوشما کا استدلال تو نہیں بلکہ حضرت ابن مسعودؓ صحابی کا استدلال ہے جو پہلے درجہ کے مفسر ہیں۔ اور مقتدیوں کی بیجا حرکت امام کے ساتھ قرآن تھی نہ کہ جہر۔ جیسا کہ یقرؤن کے الفاظ اس پر دال ہیں اور حضرت ابن مسعودؓ کے ارشاد میں لفظ انصات اس کی واضح دلیل ہے اور حضرت ابن مسعودؓ نے قرآن کی اس بیجا حرکت سے انہیں منع فرمایا ہے اور مطلق قرآن پر جہر کا اطلاق محض مجازی طور پر ہوتا ہے جس کے لیے قرینہ صارفہ درکار ہے اور وہ یہاں مفقود ہے۔

دوسری روایت۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں۔ ہم سے ابو الحسن، محمد بن حسین بن داؤد علویؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے ابو الحسن علی بن محمد بن حماد بن حشاد العدلؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں۔ مجھ سے محمد بن حسین انماطی بغدادیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے یحییٰ بن ایوبؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے عبد الوہاب ثقفیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے

امام ابو بکر احمد بن حسین البیہقیؒ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ، العلامة اور شیخ خراسان لکھتے ہیں (تذکرہ ص ۳۹)۔

جلیل القدر عالم اور بڑے پایہ کے صوفی تھے۔ (بغدادی جلد ۱۳ ص ۲۲۸) علامہ ذہبیؒ ان کو امام بیہقیؒ کے مشائخ اور زمرہ محدثین میں بیان کرتے ہیں۔ (تذکرہ ص ۲۰۹)۔

علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الکبیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ص ۲۹)۔

ثقفی تھے۔ (بغدادی جلد ۲ ص ۲۲۸)۔

علی بن مدینیؒ اور ابو حاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ اور حسین بن فہمؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن قانعؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۱۸۸)۔

الحافظ الامام اور ثقہ تھے۔ (تذکرہ ص ۲۹) آخر عمر میں ان کے دماغ میں کچھ فتور آ گیا تھا۔ (تقریباً ص ۲۹) (باقی اگلے صفحہ پر)



یوں نے بیان کیا۔ وہ منصورؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابو وائلؓ سے روایت کرتے ہیں؛  
 قال عبد الله في القراءة خلف الامام  
 انصت للقرآن كما احسرت فان في القراءة  
 لشغل وسيكفيك ذلك الامام  
 کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ امام کے  
 پیچھے خاموشی اختیار کرو۔ جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔  
 کیونکہ خود پڑھنے کی وجہ سے امام کی قرآن سننے سے آدمی  
 رہ جاتا ہے اور امام کا پڑھنا ہی تمہیں کافی ہے۔ (الکتاب  
 القراءة ص ۳۷)

قرآن کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔)

حضرت ابن مسعودؓ کی یہ روایت صحیح ہے جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں اور خطاب ان لوگوں کو  
 تھا جو امام کے پیچھے اس کی اقتدا کر رہے تھے۔ جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے اور یہ سہمی و جہری تمام  
 نمازوں کو شامل اور فاتحہ وغیرہ سب کو حاوی ہے اس میں قرأت کو مانا زاد علی الفاہم پر  
 پر حمل کرنا جیسا کہ قاضی مقبول احمد صاحبؒ نے کیا ہے سراسر باطل ہے اور اس روایت میں گو  
 اُمرت ہے لیکن پہلی روایت میں تصریح ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور امر بھی واذ قرئ القرآن۔  
 الآتية سے واضح ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے اسی مضمون کی روایتیں مختلف اسانید سے اور بھی مروی  
 ہیں مگر ہمارا مقصد استیعاب نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہما (المتوفی ۳۷ھ) سے اس آیت کی تفسیر  
 میں متعدد روایات مروی ہیں۔ مگر ہم یہاں صرف دو روایتیں نقل کرتے ہیں۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) لیکن اس فتور کے زمانہ میں انھوں نے کوئی روایت بیان نہیں کی۔ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۱۶۱)  
 لہ ثقہ، ثبت اور حجت تھے۔ (تقریب ص ۴۷)

۵ الامام الحافظ اور الحجۃ تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۳۳) ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ وہ بڑے متقن تھے تدلیس  
 نہیں کرتے تھے۔ عجلؒ ان کو ثقہ، ثبت اور حجت کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۱۰ ص ۱۵۱)

۶ ابو وائلؓ ان کا نام شقیق بن سلمہؒ ہے۔ ابن معینؒ کہتے ہیں وہ ایسے ثقہ تھے کہ ان کے مثل سے متعلق  
 سوال نہیں ہو سکتا۔ امام وکیعؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن

حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ تدلیس نہیں کرتے تھے۔ (ایضاً ص ۳۷)

۷ تمام حضرات صحابہ کرامؓ میں قرآن تفسیر میں حضرت ابن مسعودؓ کے بعد نبی حضرت عباسؓ کا آتا ہے۔ اور کیوں نہ  
 (بقیہ اگلے صفحہ پر)

**پہلی روایت:** امام بیہقی فرماتے ہیں ہم سے ابو نکریم ابن ابی اسحاق مزی نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں ہم سے ابو اسحاق محمد بن محمد بن عبدوس نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے عثمان بن سعید نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے عبد اللہ بن صالح بن مسعود

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ! اس کو دین کی سمجھ اور قرآن کریم کی تفسیر اور تاویل کی مہارت عطا فرما۔ (مسند احمد جلد ۸ ص ۳۲) قال الہیثمی

رجالہ رجال الصحیح مجمع الزوائد جلد ۹ ص ۲۷۷ و صحیح ابن کثیر البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۲۹۹ حضرت ابن عمر رض فرماتے ہیں کہ وہ اعلم الناس بما انزل علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ (ایضاً البدایہ جلد ۸ ص ۳۰۱)۔

علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ دین کے امام علم کا سمندر اور بہت بڑے عالم تھے۔ (تذکرہ ص ۳۱) یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر ایسے محقق اور صاحب بصیرت بھی قرآن کریم کی تفسیر میں ان کی طرف مراجعت کرتے تھے۔ (بخاری ۲ ص ۴۳۳)۔

۱۔ علامہ ذہبی انکو مسند نیشاپور لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۲۵) علامہ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ ادیب و مورخ کثیر العلوم تھے اور علاقہ نیشاپور میں علم حدیث کا درس دیتے تھے (بغدادی جلد ۴ ص ۲۳۹) علامہ سبکی نے طبقات جلد ۲ ص ۹ میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور علامہ ذہبی ان کو مسند نیشاپور لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۳۹) علامہ ذہبی ان کو الامام اور المجتہد لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۱)۔

۲۔ امام ابن معین انکو ثقہ اور ابوحاتم صدوق کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو مستقیم الحدیث کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۵ ص ۳۵۵) عبد الملک بن شعیب ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ ابوزر عہد انکو حسن الحدیث اور ابن عدی مستقیم الحدیث کہتے ہیں مسلک بن قاسم انکو اس پر کہتے ہوئے ان کی توثیق کرتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۵۹) امام ابن معین نے ان کو ثبت فی کتاب کہا ہے (تہذیب جلد ۵ ص ۲۶۰) یعقوب بن سفیان انکو الرجل الصالح کہتے ہیں (تہذیب جلد ۵ ص ۲۵۹) ابوبارون الخریزی فرماتے ہیں کہ میں ابوصالح سے اُتبت اور کوئی نہیں دیکھا اور ابن القطان فرماتے ہیں کہ وہ صدوق ہیں۔

ان پر ایسا کوئی الزام ثابت نہیں ہوا جسکا جسکی وجہ سے انکی حدیث ساقط الاعتبار ہو۔ ہاں وہ مختلف فیدویں (فحیدۃ حسن) انکی حدیث حسن (ایضاً ص ۲) حافظ ابن حجر نے اس کی نشان دہی کی ہے کہ یہ صحیح بخاری کے راوی ہیں (ایضاً) اور صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۰۶۳ میں انکی روایت موجود ہے اور بن خضرات محدثین کرام نے ان میں کلام کیا ہے تو اسکی اصل وجہ ان کا ایک شعر یہ شہرہ سی تھا جس کا نام خالد بن نبیح تھا، ابوصالح عبد اللہ

بن صالح کا کوئی قصور نہیں ہے۔ تہذیب التہذیب (جلد ۵ ص ۲۵۹) وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے اور امام بخاری نے ابوب النضر اور جزیر القراءہ وغیرہ میں ان سے باقائدہ احتجاج کیا ہے فرق ثانی کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ محض تعصب کی وجہ سے ایسے مسلم راویوں کو بھی مجروح اور ضعیف گردانتے

کے درپے ہے۔ امام حاکم انکی سند سے ایک حدیث کو صحیح الاسناد اور فضیلت صحیح کہتے ہیں (مستدرک ۲ ص ۱۹۹) اور انکی سند سے ایک روایت کو علامہ ذہبی سند قوی کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۵ ص ۳۵۵) اور حافظ ابن کثیر انکی سند ایک حدیث کو اسناد جید سے تعبیر کرتے ہیں۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۵ و تفسیر جلد ۳ ص ۲۲۸) قاضی مقبول احمد صاحب لکھتے ہیں کہ ابن عدی نے ان کو مستقیم الحدیث کہا



وہ کہتے ہیں مجھ سے معاویہ بن صالحؓ نے بیان کیا۔ وہ علی بن ابی طلحہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ

عن ابن عباسؓ فی قوله تعالیٰ واذا قرأ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحموا فرضی نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔  
حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اذا قرأ القرآن آتوا

(کتاب القراءة ص ۳۳)

یعنی فی المصلوة المفروضة

حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ اس آیت میں اتعاج اور انصات کا جو حکم آیا ہے وہ شان نزول کے لحاظ سے صرف فرضی نماز کو شامل ہے اور یہی اس کا شان نزول ہے۔ گو غیر فرضی نمازوں (مثلاً نماز عید و تراویح وغیرہ) اور خطبہ کو بھی عموم الفاظ کے لحاظ سے شامل ہے۔ تنبیہ: علی بن ابی طلحہ ہاشمیؓ کی براہ راست حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے سماعت نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ حضرت مجاہد بن جبرؓ اور سعید بن جبیرؓ کی وساطت سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں اور یہ دونوں ثقہ ہیں (جیسا کہ اپنے موقع پر ذکر ہوگا) اس لیے یہ روایت بلا شک و شبہ (پچھلے صفحہ کا باقی) ہے مگر ساتھ ہی کہا ہے کہ سند اور متن میں غلطی کر جاتا ہے۔ عمدۃ جہوٹ نہیں کہتے۔ (تہذیب جلد ۵ ص ۲۵۶) اس لیے عبداللہ بن صالحؓ پر شدید جرح موجود ہے۔ ۱۔ محصلہ الاعتصام ۲۱ ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۱۰۲ کالم ۲، مگر جہور محدثین کی تعدیل کے مقابلہ میں صرف ابن عدیؒ کا یہ بیان ادنیٰ جرح بھی نہیں چر جائیکہ شدید جرح ہو۔

۲۔ علامہ خطیبؒ ان کو ثقات میں بیان کرتے ہیں (بغدادی جلد ۱۱ ص ۴۲) امام احمدؒ ان کو ثقہ اور ابن عدیؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابو زرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۲۰۹) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام الفقید اور قاضی اندلس لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۶۶) حاکمؒ ان کی سند سے ایک روایت کو صحیح سے (مستدرک ص ۱۰۶) اور ذہبیؒ حسن الاسناد، اور صالح الاسناد سے تعبیر کرتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۵۲، ۳۵۳) بلکہ ذہبیؒ بھی ان کی ایک سند کو صحیح کہتے ہیں (تخصیص المستدرک جلد ۲ ص ۵۱) اور سیوطیؒ ان کی سند سے ایک روایت کو اسناد صحیح سے تعبیر کرتے ہیں (تاریخ الخلفاء ص ۱۰۶) اور مستدرک جلد ۲ ص ۱۰۶ میں ایک روایت کی سندیوں سے۔ عبد اللہ بن صالح عن معاویہ بن صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباسؓ..... الخ امام حاکمؒ اور ذہبیؒ دونوں فرماتے ہیں صحیح۔

۳۔ امام نسائیؒ ان کی لیس بہ بائیس سے توثیق کرتے ہیں (میزان جلد ۲ ص ۲۲) ابو داؤدؒ ان کو مستقیم الحدیث کہتے ہیں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

صحیح اور معتبر ہے۔ (دیکھیے مزید تحقیق کے لیے میزان الاعتدال ۲ ص ۲۲۸ فتح الباری ۸ ص ۳۳۲) ،  
تہذیب التہذیب ۷ ص ۳۳۹، اور تفسیر اتقان ج ۱ ص ۱۸۸  
علی بن ابی طلحہ کے اس تفسیری صحیفہ کو صحیح اور معتبر سمجھتے ہوئے امام ابو جعفر نخاس نے اپنی کتاب  
النسخ والمنسوخ میں استفادہ کیا ہے (اتقان جلد ۱ ص ۱۸۸) اور اسی صحیفہ سے امام بخاری نے  
صحیح میں اور امام ابن جریر و ابن ابی حاتم اور امام ابن المنذر وغیرہ نے تفاسیر میں خوشہ چینی کی  
ہے۔ (فتح الباری جلد ۸ ص ۳۳۸)

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں: اماروایت از ابن عباس بطریق مختلفہ آمدہ اجد  
آنها طریق معاویہ بن صالح از علی بن ابی طلحہ از ابن عباس است، بخاری در صحیح خود اعتماد بر ہمیں  
طریق کردہ پس بس۔ (اکسیر فی اصول التفسیر ص ۱۱)

مصنف خیر الکلام نے اس سے جو مخلص تلاش کیا وہ یہ ہے کہ علی بن ابی طلحہ کی ابن عباس  
سے باقر مصنف احسن الکلام سماعت نہیں۔ لہذا یہ منقطع ہے اور مجاہد اور سعید بن جبیر  
کا واسطہ تفسیری صحیفہ میں ہے جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ یہ اسی صحیفہ کی روایت ہے۔  
تو اتصال ثابت نہیں ہو سکتا۔ پھر امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہے کہ لہ اشياء منکرات۔

(میزان جلد ۲ ص ۲۲۸) اس کے لیے کچھ منکر چیزیں بھی ہیں اور متن کے لحاظ سے اس میں کوئی ذکر  
نہیں کہ مقتدی کو آیا جہر سے روکا گیا ہے یا حکام کہ نے یا شور ڈالنے سے اور یہ بھی احتمال ہے کہ آیت  
فرضی نماز جمعہ اور عید سب کو شامل ہو۔ اس صورت میں نماز کو دوسرے مقامات پر ترجیح نہ ہوگی۔

(محصلاً خیر الکلام ص ۳۴۷ و ۳۴۸)

### الجواب:

ہم نے باحوالہ ثابت کیا ہے کہ علی بن ابی طلحہ صحیح مسلم کا ردی وثقہ ہے اور اس نے مجاہد اور  
سعید بن جبیر کے واسطہ سے حضرت ابن عباس سے تفسیر حاصل کی ہے اور اسی کو امام حاکم اور  
ناقدین رجال علامہ ذہبی وغیرہ صحیح کہتے ہیں جیسا کہ باحوالہ گذر چکا ہے اور ہم نے باحوالہ نواب  
(بقیہ پچھلا صفحہ) ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ محدث علی ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۳۹)  
اور صحیح مسلم جلد ۱ ص ۴۶۵ میں ان کی روایت موجود ہے۔



صاحب سے یہ ذکر کیا ہے کہ ابن عباس کی روایت کے طرق تو متعدد ہیں مگر اجماعاً ترین طریقہ معاویہ بن صالح از علی بن ابی طلحہ از ابن عباس ہے اور اسی طریق پر امام بخاری نے اعتماد کیا ہے۔ صحیفہ کی قید مؤلف خیر الکلام کی محض سینہ زاد ہے۔ جس کی پرکاشہ بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ روایت اصول حدیث کے رُوسے بالکل صحیح اور متصل ہے۔ رہا امام احمد کا یہ فرمانا کہ لہ اشياء منکرات تو بجا ہے لیکن اس کی وجہ ان کا روایت میں ضعف نہیں بلکہ اس لیے کہ

ولکن له رأى سوء كان يرمى السيف  
(تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۲۷)  
ان کی رائے اچھی نہ تھی کیونکہ وہ خلیفہ کے مقابلہ  
خروج کو جائز سمجھتے تھے۔

اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ

ونقل البخاری من تفسيره رواية  
معاوية بن صالح عنه عن ابن عباس شيئاً  
كثيراً في التراجع وغيره ولكن لا يسميه  
يقول قال ابن عباس اويذكر عن ابن عباس  
وقد وقفت على السبب الذي قال فيه  
ابوداؤد يرمى السيف اه  
(تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۲۷)  
امام بخاری نے اپنی تفسیر میں معاویہ بن صالح عن  
علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس کے طریق سے اپنے ابواب کے  
ترجمہ وغیرہ میں بہت زیادہ روایتیں نقل کی ہیں لیکن وہ  
ان کا نام نہیں لیتے بلکہ کہہ دیتے ہیں کہ ابن عباس نے فرمایا  
یا ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے اور میں اس کی وجہ پر مطلع  
ہرچکا ہوں وہ یہ ہے کہ امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ وہ بادشاہ  
کے خلاف تلوار کے استعمال کی اجازت دیتے تھے۔

ان کے ایسے خیالات اشیا منکرات کی مد میں ہیں اور ایسے راوی جو شیعہ، مرجی اور قدری وغیرہ ہیں  
صحیحین میں ان کی بے شمار روایتیں موجود ہیں۔ یہ ان کی ضعف کی وجہ نہیں ہے اہل علم سے یہ امر  
مخفی نہیں ہے اگر ضرورت پڑی تو ہم انشاء اللہ تعالیٰ اس کی تفصیل عرض کریں گے اور اس ارشاد  
سے مقتدی کو قرآن سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ وَاذْكُرْ مَعِيَ... الا یہ اس کا واضح قرینہ ہے۔ باقی ہجر  
اور شور و غل وغیرہ حضرات صحابہ کرام سے جماعتی رنگ میں حضور کے پیچھے نہ ہوتا تھا۔ افراد کا  
معاملہ الگ ہے اور نماز میں قرأت سے منع کرنا اس آیت کا اولین مصداق ہے کیونکہ جمعہ اور  
غید وغیرہ کا حکم ہجرت کے بعد نازل ہوا ہے اور آیت مکی ہے۔ ہاں ضمنی طور پر وہ بھی اس میں  
داخل ہیں کیونکہ بقول مؤلف خیر الکلام شان نزول کے حکم میں اس قسم کی وسعت ہوتی ہے۔

دوسری روایت: امام بیہقی فرماتے ہیں۔ ہم سے ابو الحسن علی بن محمد بن عبد اللہ بن بشران نے بغداد میں بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں۔ ہم سے ابو جعفر محمد بن عمرو الرزاز نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے سعدان بن نصر نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں ہم سے مسکین بن بکیر الحرفی نے بیان کیا۔ وہ ثابت بن عجلان سے روایت کرتے ہیں۔ وہ سعید بن جبیر سے اور وہ عبد اللہ بن عباس سے انھوں نے فرمایا:

المؤمن في سعة من الاستماع اليه  
الاد في صلوة مفروضة او المكتوبة او يوم  
جمعة او يوم فطر او يوم اضحى يعني واذا  
قرئ القرآن .... الآية  
کہ آیت واذا قرئ القرآن کے پیش نظر مؤمن  
پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کو گنجائش ہے کہ سنے  
یا نہ سنے مگر مفروضہ نماز جمعہ، عید الفطر، عید الاضحی  
کے موقع پر اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔  
(کتاب القراءة ص ۷)

(ان حالات میں اس کو بہر حال خاموش رہنا اور استماع کرنا ضروری ہے)

۱۔ امام خطیبؒ ان کو ثقہ، صدوق، ثبت، حسن الاخلاق اور تام المرؤہ لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۱۲ ص ۹۹)

۲۔ علامہ بغدادیؒ ان کو ثقہ اور ثبت لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۲ ص ۱۳۲)

۳۔ امام ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور دارقطنیؒ ان کو ثقہ اور مأمون لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۹ ص ۲۰۵)

۴۔ امام احمدؒ اور ابن معینؒ ان کی لا بائس کہتے ہوئے توثیق کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ اور ابن شاپہؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن عمارؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صالح الحدیث اور لا بائس بہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ حدیث کے حافظ تھے۔ قاضی مقبول احمد صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ تقریب میں اس کو خطا کار کہا ہے اور امام احمدؒ اور ابو احمدؒ نے اس کو بہت دہمی اور کثیر الخطا کہا ہے۔ (محصلہ الاعتصام ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۷۵ کالم ۱) لہذا اس حدیث پر کسی طرح اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ (ایضاً)

الجواب۔ ان کا وہم اور خطا وغیرہ جو کچھ ہے مطلق نہیں ہے بلکہ صرف سعید بن عبد العزیزؒ کی روایت میں ہے۔ چنانچہ خود ابو احمدؒ نے تصریح کی ہے ومن این کان مسکین یضبط عن سعید ۸۱۔ (تہذیب جلد ۱ ص ۱۸۱) کہ مسکین کو سعیدؒ کی روایت میں ضبط کیوں سے نصیب ہوا؟ اور اس سند میں روایت ثابت بن عجلان سے ہے نہ کہ سعید سے۔ ۵۔ امام احمدؒ اور ابن معینؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ رقم اور نسائی لیس بد بائس سے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب جلد ۳ ص ۷۸) لہذا ان کا ذکر عقربہ سے گناہ انشاء اللہ تعالیٰ۔



حضرت ابن عباسؓ کی سابق روایت سے معلوم ہو چکا ہے کہ آیت مذکورہ کا شان نزول فرضی ہے۔ اور اس روایت میں وہ عموم الفاظ کے پیش نظر جمعہ اور عیدین کی نماز اور خطبہ وغیرہ کا حکم بھی استماع و انصات بیان کرتے ہیں اور اس کی پوری تحقیق اپنے مقام پر آگئے گی کہ نصوص میں عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے۔ نہ کہ خصوص اسباب کا۔ اور یہ کہ کوئی آیت شان نزول پر مقید نہیں ہوتی۔ اسی طرح کے مضمون کی روایت حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن مغفل وغیرہ سے بھی مروی ہے کہ اس آیت کا حکم امام کے پیچھے اقتداء کرنے والا کو ہے۔ مگر حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کے بعد کچھ کہنے کی مطلقاً حاجت باقی نہیں رہتی، کیونکہ قرآن کریم کی تفسیر کے متعلق ان کا مقام تمام حضرات صحابہ کرامؓ سے علی الاطلاق بہت اونچا اور بلند ہے اور سند کے لحاظ سے بھی یہ روایتیں سو فی صدی صحیح ہیں جیسا کہ آپ پوری تفصیل سے پڑھ چکے ہیں۔ مصنف خیر الکلام سے نہ تو جواب بن سکا ہے اور نہ خاموشی گوارا فرما سکے ہیں کیونکہ ملا ابراہیمؒ باشند کہ چپ نشود۔ وہ لکھتے ہیں کہ بعض حنفیہ نے آیت کے شان نزول میں صحابہ کرامؓ سے صرف دو قول نقل کیے ہیں۔ ایک عبداللہ بن مسعود کا قول ہے۔ دوسرا عبداللہ بن عباسؓ کا ہے حالانکہ ابن عباسؓ سے بسند صحیح اور ابن مسعودؓ سے پانچ اسانید کے ساتھ اگرچہ بعض اسانید میں انفرادی طور پر کچھ کلام ہے مگر مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرأت خلف الامام کے قائل تھے پس ان دو صحابہؓ سے صرف اس قدر مروی ہونے سے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں ہے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ آیت نمازی کو قرأت سے روکنے کے لیے ہے۔ (محصل خیر الکلام ص ۳۳۳، ۳۳۴)

### الجواب:

روایت تو صرف ایک صحابی کی بھی کافی ہوتی ہے جب کہ سند صحیح ہو آپ کو دو صحابہؓ کی روایت سے کیوں تسلی نہیں ہوتی؟ اور یہ روایتیں صحیح اسانید کے ساتھ ہیں اور ہیں حضرت ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ سے جو فن تفسیر میں پہلا درجہ رکھتے ہیں اگر ان کی روایتیں معتبر نہیں تو نہ معلوم آپ کے نزدیک کس کی مروی روایتیں معتبر ہوں گی؟ یقین رکھیے کہ یہ کوئی جواب نہیں ہے ممکن ہے کہ آپ کے حواری اس قدر مطمئن ہو جائیں مگر ایک رتی جان بھی اس میں نہیں ہے باقی حضرت ابن مسعودؓ سے ایک روایت بھی قرأت خلف الامام کے جواز کی ثابت نہیں تفصیل اپنے مقام پر مذکور ہے اور

حضرت ابن عباسؓ کی روایتیں متعارض ہیں۔ صحیح روایت ترکِ قرآنہ کی ہے جیسا کہ ابھی مذکور ہوا اور اپنے مقام پر آگے بھی آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس کے بعد ہم بعض تابعینؓ کی چند روایات اس آیت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔ قرآن کریم کی تفسیر میں قرآن، حدیث اور صحابہؓ کے بعد تابعین کی تفسیر قابلِ حجت ہے اور یہی اکثر ائمہ سے منقول ہے۔ خصوصاً مجاہد بن جبرؒ کی تفسیر کیونکہ وہ فن تفسیر کے امام تھے۔ سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے۔ جب مجاہدؒ کی تفسیر تھامے پاس پہنچ جائے تو پھر کسی کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ اور ان کے بعد سعید بن جبیرؒ، عکرمہؒ، عطاء بن ابی رباحؒ، حسن بصریؒ، مسروقؒ، سعید بن المسیبؒ، ابو العلاء ربیع بن انسؒ، قتادہؒ اور ضحاک بن مزاحمؒ وغیرہ کا درجہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۵۱۴)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: وہكذا تفسیر للتابعی حجة (الجنہ ص ۹۶) صحابی کی طرح تابعی کی تفسیر بھی حجت ہے۔

حضرت مجاہد بن جبرؒ: (المتوفی ۱۲۰ھ) سے

پہلی روایت: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ وہ فقیہ، عالم، ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ (طبقات ابن سعد ۵ ص ۲۱۴) امام ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ علم کا طرفہ تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۸۵) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی امامت اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ خصیفؒ کا بیان ہے کہ مجاہدؒ تفسیر کے سب سے بڑے عالم ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۸۵) جبرالامت حفرة ابن عمرؓ ان کے حفظ کے اتنے معترف تھے کہ فرماتے تھے کہ کاش نافع کا حفظ تمہاری ہی طرح ہوتا (شذرات ص ۱۲۵) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احلامۃ التابعین والمفسرین تھے اور حضرت ابن عباسؓ کے ارشد تلامذہ میں تھے اور اپنے زمانہ میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم تھے (البدایۃ والنہایۃ جلد ۹ ص ۲۲۴) اور ان کے فقہی کمال کے لیے یہ سند کافی ہے۔ کہ مخزن علوم مکہ کی جماعت افتار کے ایک معزز رکن تھے۔ (اعلام الموقعین جلد ۱ ص ۳۳) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں: ابن تیمیہؒ گفتہ اعلم الناس بالتفسیر اہل مکہ لانہم اصحاب عبد اللہ بن عباسؓ کما جاہد۔ آگے لکھتے ہیں۔ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ اور دیگر اہل علم نے ان کی تفسیر پر کلی اعتماد کیا ہے (اکسیر ص ۱۱)

لے یہ وہی امام ہیں جن کو احکام کہتے ہیں اور جن کی کتاب مستدرک شائع ہو چکی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)



ہم سے حافظ ابو علی حسینؒ بن علیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو علی موصلیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن ابوبکر مقدسیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یحییٰ بن سعیدؒ نے بیان کیا۔ وہ سفیانؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابوباشم اسماعیل بن کثیرؒ نے بیان کیا۔ وہ مجاہد بن جبرؒ سے روایت کرتے ہیں کہ اذا قرئ القرآن فاستمعوا له قال فی الصلوۃ۔ (کتاب القراءة ص ۳۷) و اذا قرئ القرآن..... الاۃ

### دوسری روایت:

امام بیہقیؒ سے لے کر محمد بن ابوبکر مقدسیؒ تک وہی سند ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے اشعث بن عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے (بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الحافظ الکبیر اور امام الحدیث تھے۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۲۶) لہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ حفظ اتقان، ورع، مذکرۃ ائمہ اور کثرت تصنیف میں گورے سبقت لے گئے تھے (بعد دی جلد ۸ ص ۷) ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ اور محدث اسلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۱۱)۔ لہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الثقا اور محدث جزیرہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۴۶) لہ امام یحییٰ بن سعید بن القطانؒ اور ابو زرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صالح الحدیث اور ابن قانعؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۷) لہ امام الجرح والتعلیل ذہبیؒ ان کو الامام، العلم اور تید الحفاظ لکھتے ہیں۔ نسائیؒ فرماتے ہیں کہ مالکؒ، شعبہؒ اور یحییٰ بن سعیدؒ حدیث رسول کے امین تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۷۷) علامہ ابن سعدؒ رح لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ، ثبت، حجت، بلند مرتبہ اور مامون تھے۔ خلیلؒ کہتے ہیں وہ بلا کسی اختلاف کے مسلم امام تھے (تہذیب ۱۱ ص ۲۱۹) لہ امام سفیانؒ ثوریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

لہ امام احمدؒ، نسائیؒ، یعقوب بن شیبہؒ، یعقوب بن سفیانؒ اور غزالیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صاحب الحدیث کہتے ہیں اور ابن جبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۳۲۷)

لہ امام ابن معینؒ اور ابو داؤدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ (ابن ابی شیبہ) سے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ ابن جبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۳۵۶)

شعبہ نے بیان کیا وہ حمید اعرجؓ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت مجاہدؒ سے واذا قرئ القرآن فاستمعوا قال فی الصلوۃ (کتاب القراءة ص ۷۷) انھوں نے فرمایا کہ واذا قرئ القرآن کا شان نزول نماز ہے۔

### تیسری روایت :

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے قاضی عبد الرحمن بن حسنؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے آدم بن ابی ایاسؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے ورقانہؒ نے بیان کیا۔ وہ ابن ابی نجیحؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت مجاہدؒ سے

قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الصلوۃ فسمع قرآنہ فتی من الونصار فنزل واذ قرئ القرآن (الایتہ)  
وہ فرماتے ہیں کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز میں قرأت کر رہے تھے۔ آپ کے ساتھ ایک انصاری بھی پڑھتا رہا۔ اس پر اذا قرئ القرآن الایتہ نازل ہوئی۔  
(کتاب القراءة ص ۷۷)

۱۔ ذہبیؒ ان کو الحجۃ، الحافظ اور شیخ الاسلام کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۸۱) سفیان ثوریؒ ان کو امیر المؤمنین فی الحدیث کہتے تھے۔ (کتاب العلل امام ترمذی جلد ۲ ص ۲۳۸)

۲۔ امام ابن معینؒ، ابو زرعہؒ، ابو داؤدؒ، ابن خیر الشیخؒ، عیسیٰ ابن بخاریؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ نسائیؒ (واباس یسکتے ہیں۔ ابن سعد ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔) (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۴۷)

۳۔ امام حاکمؒ نے اس سند سے (مسند رک جلد ۲ ص ۴۵، ۴۶، ۲۵۹، ۲۶۰، ۵۲۱، ۳۵۳، ۲۶۶، ۲۶۷، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱۵۲۶، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸، ۱۵۲۹، ۱۵۳۰، ۱۵۳۱، ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۳۶، ۱۵۳۷، ۱۵۳۸، ۱۵۳۹، ۱۵۴۰، ۱۵۴۱، ۱۵۴۲، ۱۵۴۳، ۱۵۴۴، ۱۵۴۵، ۱۵۴۶، ۱۵۴۷، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹، ۱۵۵۰، ۱۵۵۱، ۱۵۵۲، ۱۵۵۳، ۱۵۵۴، ۱۵۵۵، ۱۵۵۶، ۱۵۵۷، ۱۵۵۸، ۱۵۵۹، ۱۵۶۰، ۱۵۶۱، ۱۵۶۲، ۱۵۶۳، ۱۵۶۴، ۱۵۶۵، ۱۵۶۶، ۱۵۶۷، ۱۵۶۸، ۱۵۶۹، ۱۵۷۰، ۱۵۷۱، ۱۵۷۲، ۱۵۷۳، ۱۵۷۴، ۱۵۷۵، ۱۵۷۶، ۱۵۷۷، ۱۵۷۸، ۱۵۷۹، ۱۵۸۰، ۱۵۸۱، ۱۵۸۲، ۱۵۸۳، ۱۵۸۴، ۱۵۸۵، ۱۵۸۶، ۱۵۸۷، ۱۵۸۸، ۱۵۸۹، ۱۵۹۰، ۱۵۹۱، ۱۵۹۲، ۱۵۹۳، ۱۵۹۴، ۱۵۹۵، ۱۵۹۶، ۱۵۹۷، ۱۵۹۸، ۱۵۹۹، ۱۶۰۰، ۱۶۰۱، ۱۶۰۲



اس روایت سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے قرآن کرنا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں معمول نہ تھا۔ ورنہ صرف ایک ہی انصاری کے پڑھنے کا کیا مطلب ہے اور جب حکم نازل ہوا تو نہ پڑھنے والوں کو کچھ نہ کہا۔ بلکہ منع کیا تو پڑھنے والے ہی کو منع کیا اور آیت کا شان نزول بھی حضرت مجاہدؒ نے وضاحت سے بیان فرمادیا ہے اور اسی مضمون کی ایک روایت امام زہریؒ سے بھی منقول ہے۔ (کتاب القراءات ص ۷)

حضرت امام بیہقیؒ اور مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ نے اس اثر کو منقطع کہہ کر غلطی سے کرنے کی ناکام کوشش کی ہے جو بے سود ہے۔ اولاً اس لیے امام ابن مہنیؒ فرماتے ہیں: کہ مجاہدؒ کا مرسل عطار کے مرسل سے مجھے کہیں زیادہ پسند ہے۔ (تہذیب المتذیب جلد ۱ ص ۲۰۲) امام سیاحیؒ بن سعید بن القطانؒ کہتے ہیں: مجاہدؒ کا مرسل مجھے طاؤسؒ کے مرسل سے زیادہ پسند ہے۔ (تدریب الراوی ص ۳۲۹) کتاب العلل ترمذی ص ۳۲۹) جب ائمہ جرح و تعدیل ان کے مرسل پر کامل اعتماد کرتے ہیں۔ تو نفاذ خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے؟

وثانیاً علماء اخاف کے نزدیک اور جہور اہل اسلام اور دوسری صدی سے قبل تمام محدثین کرامؒ کے نزدیک تنہا مرسل قابل حجت ہوتا ہے جیسا کہ اپنے مقام پر آئے گا۔ اور جب دوسری روایات سے (گو مرسل ہی کیوں نہ ہوں) وہ معتضد اور قوی ہو جاتے تو فریق ثانی کے نزدیک بھی وہ حجت ہے۔ اور مبارک پوری صاحبؒ کو اس کا اقرار ہے (دیکھیے تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۹۱) اور اگر حضرت ابن مسعودؓ و ابن عباسؓ وغیرہ کی صحیح روایات سے مجھے انقطاع کا یہ بہانہ رفع (مجھے صفحہ کا حاشیہ ۵) ابن ابی بنیح ر، امام احمدؒ، ابو زرہؒ، ابن معینؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن جابرؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ امام سفیانؒ اور ابو حاتمؒ ان کی تفسیر کی بڑی قدر کرتے تھے (تہذیب المتذیب جلد ۱ ص ۵۳۷)

لے جو پہلے شان نزول کے سلسلہ میں پیش کی گئی ہیں جن کا استدلالی رنگ نہیں جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۳۵ میں) ناکام بہانہ کیا ہے۔ حضرت مجاہدؒ اور ان دونوں حضرات صحابہؒ کے اثر میں شان نزول ہونے کے بارے میں کوئی فرق نہیں ہے اور جہور حضرات صحابہؒ ان کے ساتھ ہیں جیسا کہ ان کا مرسل حجت ہے اس طرح ان کی تفسیر بھی حجت ہے اور کسی صحیح روایت ان کا قرآن خلف الامامؒ کرنا ثابت نہیں ہے۔ جزیرہ القرآۃ ص ۱۰۱ کا حوالہ بالکل بے سند ہے۔ اس لیے اس کو اس صحیح اور مستند روایات کا جواب تصور کرنا بے سود ہے۔

نہ ہو۔ تو کسی دوسرے جہان اور دوسری جون کی انتظار کیجیے۔

وَالشَّامُ شَافِعِيٌّ، بخاری، ابن تیمیہ وغیرہ کلی طور پر مجاہد کی تفسیر پر اعتماد کرتے ہیں اور نواب صاحب کا حوالہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ لہذا ان کا یہ عذر بار بار اور رکیک تاویل قابل سماعت نہیں ہے حضرت مجاہد کی اور بھی متعدد روایات باسانید صحیحہ مروی ہیں مگر ہم صرف ان پر ہی اکتفا کرتے ہیں: وفيها كفاية لمن له هداية۔

### حضرت سعید بن المسیبؓ (المتوفی ۹۴ھ)

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے ابو یعلیٰ موصیؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے محمد بن ابوبکر مقدمیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے عبد الرحمن بن محمدؒ ملے امام نوویؒ لکھتے ہیں۔ ان کی امامت اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ ابن حبانؒ لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ میں اہل مدینہ کے سردار تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۲)۔ حافظ ذہبیؒ ان کو امام شیخ الاسلام اور اجلہ تابعین میں لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۴ ص ۴۸) ابن حنبلؒ لکھتے ہیں کہ ان کی ذات میں حدیث، فقہ، زہد و ورع اور عبادت اور جملہ علمی و عملی کمالات جمع تھے۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۱۳) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ علی الاطلاق وہ سید التابعین تھے اور حضرت ابن عمرؓ ان کو احد المتقین کہتے تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۹۹) امام بخاریؒ بن سعید فرمایا کرتے تھے۔ ہم قرآن کی تفسیر میں رائے کو دخل نہیں دیتے صرف وہی کہہ سکتے ہیں۔ جس کا ہمیں علم ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۸) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ان کے تمام مراسیل صحیح ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۵) امام حاکمؒ لکھتے ہیں کہ تمام مراسیل میں صحیح تر مراسیل ان کے ہیں۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۲۵) امام بیہقیؒ ان کے مراسیل کو اصح المراسیل کہتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۲۱) علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں کہ مراسیل میں سے صحیح ترین مرسل سعید بن المسیبؓ کا ہے (توجیہ النظر ص ۱۶) امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ ان کے مراسیل صحیح ترین ہیں۔ (مقدمۃ فتح الملہم ص ۳) امام شافعیؒ باوجودیکہ وہ دیگر تابعین کے مراسیل میں کلام کرتے ہیں مگر حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل کی طرح وہ سعید بن المسیبؓ کے مرسل کو حجت اور صحیح مانتے ہیں۔ (مقدمۃ فتح الملہم ص ۳۵) ذہبیؒ ان کو حافظ الکبیر الامام العلم اور الشہیر کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۳) علی بن المدینیؒ کا بیان ہے کہ ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا۔ اگر میں رکن حطیم اور مقام ابراہیمؑ کے درمیان کھڑا ہو کر قسم کھاؤں تب بھی یہی کہوں گا کہ میں نے ان جیہ یا ان سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا۔ (شذرات ص ۳۵ و تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۵) علامہ سمعانیؒ لکھتے ہیں کہ پختہ کار حافظ صاحب تقویٰ اور جامع حدیث تھے۔ (کتاب الانساب ص ۹۶)



نے بیان کیا۔ وہ حماد بن سلمہ سے روایت کرتے ہیں اور وہ قتادہؒ سے اور وہ سعید بن المسیبؒ سے وہ فرماتے ہیں واذ قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا قال فی الصلوٰۃ (کتاب الفرائض ۵۷) کہ آیت واذ قرئ القرآن الآیۃ کا شان نزول نماز ہے۔

### حضرت حسن بصریؒ (المتوفی ۱۱۰ھ)

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا وہ بیان کرتے ہیں ہم سے ابو یعلیٰ موصلیؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے محمد بن ابوبکر مقدمیؒ نے بیان کیا علامہ ذہبیؒ ان کو امام، الحافظ، المحدث اور شیخ الاسلام کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۸۹) آخر میں ان کے حافظہ میں معمولی فتور آ گیا تھا۔ (تقریب ص ۱۸) لیکن اس سے ان کی حدیث اور روایت پر مطلقاً اثر نہیں پڑتا۔ اس کی مزید تحقیق اپنے مقام پر آئے گی، امام احمد فرماتے ہیں جب کسی شخص کو دیکھو کہ وہ حماد بن سلمہ کے حق میں کچھ کہتا ہے تو اس کو منافق سمجھنا (فاتحہ علی الاسلام) تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹) یہی الفاظ امام ابن معینؒ سے بھی منقول ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۷) نواب صاحب لکھتے ہیں: گریہ حماد بن سلمہؒ امام است تفرؤش ما دام کہ در مردیش مانع از اصول نبوی و مضر نیست۔ (بدور الابلہ ص ۳۳)

۵ حضرت قتادہؒ کا ترجمہ جلد ۱ ص ۲۲۵ میں مذکور ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

۳ علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ وہ جامع کمالات عالم بلند مرتبت رفیع المنزلت، فقیہ مامون عابد زاهد وسیع العلم فصیح و بلیغ، حسین اور جلیل تھے۔ (طبقات جلد ۱ ص ۱۱۵) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ علم کا سمندر فقیہ النفس کبیر الشہداء عظیم النظر اور بلیغ التذکر تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۶۲) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی جلالت شان پر سب کا اتفاق ہے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۱۶۱) ابوبکر الہندیؒ کا بیان ہے کہ جب تک وہ ایک سورت کی تفسیر اور شان نزول وغیرہ پوری طرح واقفیت حاصل نہ کر لیتے تھے۔ اس وقت تک آگے نہ بڑھتے تھے۔ (شذرات جلد ۱ ص ۱۳۷) فقہ کے بہت بڑے امام تھے اور بصرہ کے مفتی اعظم تھے۔ قتادہؒ کا بیان ہے کہ حسن بصریؒ حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم تھے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۱ ص ۱۱۸) امام حاکمؒ نے حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ امام الفقیہ المشہور الحدیث بعین الکبار، الاجلار اور علم و عمل اور اخلاص میں یکتا تھے (البیہ والنبایہ جلد ۱ ص ۲۶۸) نواب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں۔ حسن بصریؒ و محمد بن کعب القرظیؒ و ابوالعالیہ المرادیؒ وغیرہ میں ہما قدما و مفسرین اند و غالب اقول ایشان شتفی از صحابہ بودہ است۔ (اکسیر ص ۱۱)

کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے یوسف بن یعقوب نے بیان کیا وہ شعبہ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ منصور سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت حسن بصری سے۔ انھوں نے فرمایا: واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا فی الصلوٰۃ۔ (کتاب القراءۃ ص ۸) کہ واذا قرئ القرآن کا شان نزول نماز ہے۔

### حضرت ابو العالیہ الریاحی (نام رفیع بن مہران تھا۔ المتوفی ۱۳۹ھ)

امام بیہقی فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہ نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم سے حافظ ابو علی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے ابو یعلیٰ (موصلی) نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے محمد بن ابوبکر مقدسی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے عبد الوہاب نے بیان کیا۔ وہ حجاز سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت ابو العالیہ الریاحی سے، انھوں نے فرمایا:

۱۔ امام ابن معین، ابو داؤد، یعقوب بن شیبہ اور خلیفہ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتم ان کو شیخ کہتے ہیں اور ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۴۳) باقی جملہ روایات کی توثیق چلے نقل کی جا چکی ہے۔

۲۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ وہ کبار تابعین میں تھے۔ ابو القاسم طبرانی کا بیان ہے کہ ان کی توثیق پر مسند ائین ہے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۵) ابوبکر بن ابی داؤد کا بیان ہے کہ حضرات صحابہ کے بعد ابو العالیہ سے بڑھ کر عالم قرآن کوئی نہ تھا۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۵۸) ابن حبان ان کو مفسر قرآن لکھتے ہیں (شذرات جلد ۱ ص ۱۰۲)

علامہ ابن سعد ان کو کثیر الحدیث لکھتے ہیں (طبقات جلد ۵ ص ۸۵) خود امام بیہقی ان کی تمقہ فی الصلوٰۃ کی حدیث کے علاوہ باقی تمام احادیث کو صحیح اور مستقیم تسلیم کرتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۴) امام علی

فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور کبار تابعین میں تھے۔ امام ابن عدی فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف فی الصلوٰۃ کے علاوہ ابو العالیہ کی باقی تمام احادیث مستقیم اور صالح ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۸۵) مولیٰ

طاش کبریٰ زادہ لکھتے ہیں کہ وہ کبار تابعین میں تھے، آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات کے صرف دو سال بعد مسلمان ہوئے تھے اور حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے تھے اور حضرت عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی ہے اور

قرآن کریم حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن عباسؓ سے پڑھا تھا اور صحیح روایت سے ثابت ہے کہ تین مرتبہ انھوں نے قرآن کریم حضرت عمرؓ پر پیش کیا تھا۔ (منقول السعادة جلد ۱ ص ۳۹۴) اور اسی کے قریب تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۸۵ میں ہے۔ (نمبر ۳ اور نمبر ۴ اگلے صفحہ پر دیکھیے)



كان النبي صلى الله عليه وسلم اذا

کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے

صلى قرأ فقراً اصحابه فنزلت

تو ساتھ ساتھ آپ کے حضرات صحابہ بھی قرأت کرتے تھے۔

فاستمعوا له الآية فسكت القوم و

جب واذا قرئ القرآن (الآية) نازل ہوتی تو حضرات

قرأ النبي صلى الله عليه وسلم۔

صحابہ کرام نے خاموشی اختیار کر لی اور خباب رسول خدا صلی

(كتاب القراءة ص ۷)

اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرأت کیا کرتے تھے۔

امام بیہقیؒ علامہ حازمیؒ (المتوفی ۷۵۰ھ) اور مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ نے اس روایت کے

منقطع ہونے کا ناکام بہانہ کیا ہے اور یہی کچھ مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۵ میں کہا ہے لیکن یہ

صحیح نہیں ہے۔ اولاً: اس لیے کہ مرسل حجت ہے اور مرسل معتضد بلا اختلاف حجت ہے جیسا

کہ بیان ہو چکا ہے۔

وثانياً: اگر اس کو ابوالعالیہؒ کی تفسیر بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں جس کی تائید

کئی محقق مفسرین کرامؒ سے آگے آ رہی ہے۔ خود مؤلف خیر الکلام ص ۷۷ میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

مگر معترض کو معلوم ہونا چاہیے کہ کسی آیت کی تفسیر اگر کسی تابعی سے ثابت ہو اور ایک بڑے

مفسر نے بھی اس کی تصدیق کی ہو اور کسی صحابی اور تابعی سے اس کی تردید وارد نہ ہوتی ہو

تو اس کی صحت میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ اور اسی صفحہ کے آخر میں لکھتے ہیں کہ ایک تفسیر کے

مقابلہ میں محض اشکل سچ بات بنانا درست نہیں۔ لہذا ان کو اپنے تجویز کردہ نسخہ پر عمل کرنا چاہیے

کہ بیہنگ لگے نہ پھٹک لگی۔

حضرت امام زہریؒ:

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے

۱۳ ان کا ترجمہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کی ذیل میں نقل کر دیا گیا ہے۔

۱۴ ماجرب بن مخلد کو امام ابن معینؒ صالح کہتے ہیں۔ محدث ساجیؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ اور نیز کہتے ہیں کہ وہ معرو

۱۵ مشہور تھے۔ ابن جبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۲۳) باقی روایات کا حال اور توثیق

آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔

۱۶ امام زہریؒ اور امام عبد اللہ بن مبارکؒ کا ترجمہ مقدمہ میں عرض کیا جا چکا ہے اور بقیہ روایات کا عنقریب گزر چکا ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

حافظ ابو علی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے حسن بن سفیان نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے حبان بن موسیٰ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے عبد اللہ بن مبارک نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے یونس نے بیان کیا وہ امام زہری سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ

قال لا یقرأ من وراء الامام فیما یجہر بہ الامام یکفیلہم قرأۃ الامام وان لم یسمعہم صوتہ ولکنہم یقرؤون فیما لا یجہر بہ سرّاً فی انفسہم ولا یصلح لاحد خلفہ ان یقرأ معہ فیما جہس بہ سرّاً ولا علانۃ قال اللہ واذ اقرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون (کتاب القراءة ص ۵)

امام کے پیچھے ہری نمازوں میں مقتدیوں کو قرات کرنے کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔ امام کا پڑھنا ہی مقتدیوں کو کافی ہے۔ چاہے وہ مقتدیوں کو کچھ بھی نہ سنا تا ہوا ان کو نہ تو ہر سے پڑھنا جائز ہے اور نہ آہستہ۔ ہاں ستری نمازوں میں وہ اپنے دل میں قرات کر سکتے ہیں اور ہری نمازوں میں اس لیے منع ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب قرآن پڑھا جاتا ہو تو تم خاموش ہو کر اس کی طرف توجہ کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

ستری اور ہری نمازوں کا بیان اپنی جگہ پر ہو گا۔ لیکن بہر حال امام زہری بھی آیت مذکورہ کا شان نزول مسئلہ قرأت خلف الامام بتاتے ہیں۔ سکناات میں پڑھنے کا کسی صحیح حدیث سے ثبوت نہیں اور یہ استدلالی رنگ نہیں بلکہ شان نزول ذکر ہو رہا ہے۔ مرسل زہری اگرچہ تنہا حجت نہیں ہوتا مگر اس سے دیگر مراسیل کی تائید مطلوب ہے اور دوسرے مراسیل کے ساتھ مل کر یہ مرسل مسئلہ زیر بحث پر صراحت سے روشنی ڈالتے ہیں۔

(پچھلے صفحہ کا باقی) صرف تین راوی باقی ہیں۔ ان کی توثیق سن لیجئے۔ حسن بن سفیان علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ، الامام ابو شیخ خراسان لکھتے ہیں۔ امام حاکمؒ کا بیان ہے کہ وہ خراسان کے محدث اور اپنے تمام معاصرین پر ثبت، کثرت روایت، فہم، فقہ، ادب اور دیگر علوم میں فائق تھے۔ (تذکرہ ۲ ص ۲۴۵)۔ حبان بن موسیٰ، ابراہیم بن الجندیؒ ان کی زبانی بہ سے توثیق کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۱۴۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۶) یونس بن یزیدؒ علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ اور ثبت لکھتے ہیں۔ اور احمد بن صالحؒ کا بیان ہے کہ ہم امام زہریؒ کے تلامذہ میں یونسؒ کو ترجیح نہیں دیتے۔ امام احمدؒ فرماتے تھے کہ وہ ثقہ ہیں۔

(تذکرہ جلد ۱ ص ۱۵۳)



عبد بن عمیر (المتوفی ۳۵ھ) اور عطاء بن ابی رباح (المتوفی ۱۱۳ھ)؛  
 امام ابن جریر فرماتے ہیں ہم سے حمید بن مسعد نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے بشر بن الفضل  
 نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے جریر بن عوف نے بیان کیا۔ وہ طلحہ بن عبد بن کریم سے روایت کرتے ہیں۔  
 وہ کہتے ہیں میں نے عبد بن عمیر اور عطاء بن ابی رباح کو آپس میں باتیں کرتے دیکھا۔ حالانکہ ایک  
 واعظ وعظ کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ آپ ذکر کیوں نہیں سنتے اور کیوں وعید کے مستوجب  
 ہو رہے ہیں؟ لیکن ان دونوں نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور پھر گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ میں  
 نے پھر کہا۔ انھوں نے پھر میری طرف دیکھا اور باتوں میں مشغول ہو گئے میں نے سہ بارہ ان سے  
 کہا۔ مگر ان دونوں نے کہا:

انما ذلك في الصلوة يعني واذا  
 قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا  
 یعنی جو آیت واذا قرئ القرآن فاستمعوا له  
 وانصتوا تمہارے پیش نظر ہے۔ اس کا شان نزول  
 (تفسیر ابن جریر جلد ۹ ص ۱۰۱ و ابن کثیر ج ۳ ص ۶۲) نماز ہے نہ کہ وعظ وعام تلاوت۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے باتیں کرنا اور قرأت کرنا ممنوع ہے کیونکہ یہ استماع وانصا  
 کے خلاف ہے اور اس آیت کریمہ کا شان نزول ہی نماز ہے۔ خارج از نماز باتوں کو یہ شامل نہیں ہے۔

۱۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ عالم، واعظ اور کبار القدر تھے (تذکرہ جلد ۱ ص ۴۵) امام ابن معینؒ اور ابو زرؒ  
 کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ عجلان کو ثقہ من کبار التابعینؒ کہتے ہیں۔ حضرت ابن  
 عمرؓ کی مجلس وعظ میں حاضر ہوتے اور ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۷۱)

۲۔ ذہبیؒ ان کو مفتی اہل مکہ اور محدث، القدودہ اور العلم لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۹۲) ابن حبانؒ ان کو  
 علم فقہ وریع اور فضیلت میں تابعین کے سردار لکھتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ ان کو ثبت، مجتہد، امام اور کبار القدر  
 لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۰۰) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ کبار اور ثقات و بلند پایہ  
 تابعین میں تھے۔ دونوں صحابہؓ سے ان کی ملاقات ہوئی ہے۔ نیز ابن سعدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ ثقہ،  
 فقیہ عالم اور کثیر الحدیث تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۳۶)

۳۔ ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور نسانی ثقہ کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۹)

۴۔ امام ذہبیؒ ان کو امام، الثقة، الحافظ اور العابد کہتے ہیں امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ بصرہ میں ثبت ان پر ختم تھا۔  
 (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۸۲) (باقی نمبر ۶۵ کے صفحہ پر دیکھئے)

## حضرت محمد بن کعب القرظی (المتوفی ۸۸ھ) :

امام بیہقی فرماتے ہیں ہم سے ابو نصر عمر بن عبد العزیز بن عمر بن قتادہ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے ابو منصور عباس بن فضل نصری نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے احمد بن محمد نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے سعید بن منصور نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو معشر نے بیان کیا۔ وہ محمد بن کعب (القرظی) سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ حضرات صحابہ کرامؓ ان حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کرتے تھے۔ جب آپ قرأت کرتے تھے تو وہ بھی ساتھ ساتھ قرأت

(نمبرہ و پچھلے صفحہ کے حاشیہ) ۵ علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۴۶)

۱۵ امام احمد اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں اور ابن جبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۶) ابن جبانؒ کہتے ہیں کہ وہ علم و فقر میں مدینہ کے فاضل ترین علمائیں تھے (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۴۲) امام نوویؒ لکھتے ہیں۔ وہ بڑے اور ائمہ تابعین میں تھے (تہذیب الاسما جلد ۱ قسم اول ص ۹) حافظ عجمیؒ ان کو ثقہ، رجل صالح اور عالم قرآن کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ، عالم اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ عون بن عبد اللہؒ کا بیان ہے کہ میں نے تفسیر قرآن کا ان سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۶۰) تہذیب التہذیب، جلد ۹ ص ۴۲۔ علامہ ذہبیؒ ان کو مفسر قرآن لکھتے ہیں۔ (دول الاسلام جلد ۵ ص ۵۷) حافظ ابن کثیرؒ ان کو عالم تفسیر قرآن، صالح اور عابد لکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۵۷) جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ایک پیش گوئی فرمائی تھی کہ بنو قریظہ میں ایک شخص پیدا ہوگا جو فن تفسیر میں اپنا نظیر نہ رکھتا ہوگا۔ ائمہ کا خیال ہے کہ یہ محمد بن کعب قرظیؒ کے حق میں تھی۔ (البدایہ جلد ۴ ص ۲۴۳)۔ مولانا مبارک پوریؒ حنا لکھتے ہیں: مدینہ طیبہ میں محمد بن کعب کے بعد زید بن اسلمؒ جیسا مفسر قرآن کوئی اور نہ تھا۔ (تحفۃ الاحوذ جلد ۱ ص ۴۱۶)

۱۶ امام بیہقیؒ کے شیخ ہیں۔ ان کی سند سے ایک حدیث کی امام بیہقیؒ تصحیح کرتے ہیں (دیکھیے سنن الکبریٰ ج ۱ ص ۱۶۹) ۱۷ ثقہ اور مشہور تھے (تقریب ص ۱۹۱) ۱۸ امام دارقطنیؒ ان کی توثیق کرتے ہیں اور ان پر کسی کی جرح منقول نہیں ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۵۸) ۱۹ ابوجہمؒ ان کو ثقہ من الثبتین الاثبات کہتے ہیں۔ ابن نمیرؒ اور ابن خراشؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن قانعؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ خلیلیؒ کہتے ہیں ان کے ثقہ ہونے پر سب اتفاق ہے (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۹۴-۹۵) ابو معشرؒ کو بعض محدثینؒ روایت حدیث (بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)



کرتے جاتے۔ اس پر سورۃ اعراف کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ  
وَأَنْصِتُوا (الذیۃ) (کتاب القراءۃ ص ۷۷)  
کہ جب قرآن کریم کی قرأت کی جاتی ہو تو تم توجہ  
کرو اور خاموش رہو۔

### حدیث مرسل:

مرسل حدیث سے احتجاج اور عدم احتجاج کی بحث اسی کتاب میں آگے اپنے مقام پر آ رہی ہے  
(انشاء اللہ تعالیٰ) یہاں بقدر ضرورت تھوڑی سی بحث مناسب معلوم ہوتی ہے تاکہ بات ذرا واضح  
ہو جائے اور یہ حوالے آگے ذکر نہ کیے جائیں گے تاکہ فکر لازم نہ آئے۔ امام سیوطیؒ علامہ قاسم  
بن قطلوبغا محدث جزائریؒ اور مولانا عثمانیؒ نقل کرتے ہیں:

کمزور سمجھتے تھے۔ مگر امام احمد ان کو صالح محلہ الصدق کہتے تھے۔ ابن معینؒ کہتے ہیں۔ ان سے حدیثیں لکھی جاسکتی  
ہیں۔ ابو زرؒ ان کو صدوق فی الحدیث کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ کہتے ہیں ان سے بڑے بڑے ثقات نے روایات کی  
ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۲۹ و تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۲۲۷) امام نعیمؒ گن کو کتیس اور حافظ کہتے ہیں  
(تہذیب ص ۲۷) علامہ ذہبیؒ ان کو علم کا ظرف سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ امام نسائی نے ان سے احتجاج کیا ہے  
(تذکرہ جلد ۲ ص ۲۱۶) حافظ بن حجرؒ ان کو ابو داؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کا راوی بتاتے ہیں (تہذیب جلد ۱ ص ۲۱۹)  
ان کے متعلق یہ اختلاف صرف روایت حدیث کے بارے میں ہے فن تفسیر میں وہ بلا اختلاف اور بلا مدافعت  
مسلم امام تھے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ، محمد بن عثمان بن ابی شیبہؒ، امام علی بن المدینیؒ اور عمرو بن علی  
انفلاس وغیرہ کہتے ہیں کہ ابو معشرؒ کی وہ روایات جو تفسیر کے سلسلہ میں ہیں اور خاص طور پر وہ جو محمد بن  
قتیسؒ اور محمد بن کعبؒ سے نقل کرتے ہیں۔ وہ بلا چون و چرا صحیح، معتبر اور قابل حجت ہیں۔ (تہذیب التہذیب  
جلد ۱۰ ص ۲۲۷ و ص ۲۲۸) محصلہ) مبارک پوری صاحب نے ان کی جو تضعیف نقل کی ہے وہ ان کے لیے چنداں  
مفید نہیں۔ کیونکہ محدثین جب ان کو کمزور کہتے ہیں تو صرف روایت حدیث کے بارے میں اور ہم نے جو روایت  
نقل کی ہے وہ تفسیر کے بارے میں ہے اور خاص طور پر محمد بن کعب قرظیؒ سے ہے اور ان کی روایت کو اس حد  
میں بلا قبل و قال محدثین تسلیم کرتے ہیں۔ مؤلف خیر الکلام نے اپنی عادت کے مطابق محدثین کی جرح تو نقل کر دی  
ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۳۵۹) مگر تفسیر کے بارے میں ان کی روایت کے قابل اعتبار ہونے کا کوئی معقول جواب  
نہیں دے سکے اور لکھتے ہیں کہ جس حدیث کو محدثین کی شرائط کے مطابق محمد بن کعبؒ سے بیان کریں ان سے چند

وقال ابن جریر اجمع التابعون  
باسرهم علی قبول المرسل ولم یأت عنہم  
انکارہ ولا عن احد من الائمة بعدہم الی  
رأس المائتین قال ابن عبد البر کأنه یعنی  
الشافعی اول من ردہ اھ (تدریس اللغات  
ص ۲۳۵ منیة الاملی ص ۲۰ توجیہ النظر  
ومقدمہ فتم الملمع ص ۳۲)

امام ابن جریر نے فرمایا کہ تابعین سب کے سب اس  
امر پر متفق تھے کہ مرسل قابل احتجاج ہے تابعین سے  
لے کر دوسری صدی کے آخر تک ائمہ میں سے کسی نے  
مرسل کے قبول کرنے کا انکار نہیں کیا۔ امام ابن عبد البر  
فرماتے ہیں کہ گویا امام شافعی ہی پہلے وہ بزرگ ہیں جنہوں  
نے مرسل کے ساتھ احتجاج کا انکار کیا ہے۔

اس سے صاف طور پر یہ بات واضح ہو گئی کہ دوسری صدی کے آخر تک تابعین اور ائمہ دین میں  
سے کوئی بھی مرسل حدیث سے احتجاج کا منکر نہ تھا۔ تعجب ہے کہ فریق ثانی کے نزدیک یہ اجماع و حجت  
نہیں لیکن دوسری صدی کے بعد کا نظریہ قابل قبول ہے اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اور امت کی  
اکثریت کا لحاظ قرن اول میں لیا جائے گا..... الخ ص ۵۳)

الحمد للہ تعالیٰ کہ قرن اول والے مرسل کو بلا قیل وقال تسلیم کرتے تھے۔ اور اس پر ان کا اجماع ہے۔  
نواب صدیق حسن خاں صاحب اور علامہ جزائری لکھتے ہیں:

حدیثیں صالح پائی گئی ہیں..... الخ مگر ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ محدثین کرام ہی ان کی محمد بن کوئسے  
روایتوں کو صالح کہتے ہیں اور یہ بھی انہیں میں سے ہے اور بالکل صالح ہے اور امام کے پیچھے قرأت ترک  
کرنے کے سلسلے میں ہے قرأت ہو یا کلام ہو جو ہر دو آہستہ اور اس کا شان نزول ہی یہ بتاتے ہیں۔ قاضی  
مقبول احمد صاحب کو بلا وجہ غصہ آ گیا ہے کہ اس کو امام بخاری منکر الحدیث کہتے ہیں اور مصنف احسن الکلام  
خود لکھتا ہے کہ جس کو امام بخاری منکر الحدیث کہیں اس سے روایت نہیں لی جاسکتی۔ (محصلہ الاعتصام ،  
۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء) لیکن محدثین نے ان کی تفسیر کی روایت کو اور اسی طرح تاریخی روایت کو حجت مانا ہے۔  
تفسیر کے بارے میں تو حوالہ گزر چکا ہے تاریخ کے متعلق سنیں۔ امام خلیل فرماتے ہیں:

وتاریخہ احتجاج بہ الاثمتہ وضعفہ فی الحدیث اھ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۲۲)

اور ان سے تاریخ میں ائمہ نے احتجاج کیا ہے اور حدیث میں اس کو اس کو ضعیف سمجھا ہے جیسا کہ محمد بن اسماعیل  
کہ حدیث احکام میں ضعیف ہے مگر مغازی کا امام ہے۔ اس کے احادیث احکام میں ضعیف ہونے سے اس کے تاریخ  
میں معتبر ہونے پر کیا زور پڑتی ہے؟ فکذا ہذا۔



مراسیل کے ساتھ گذشتہ زمانہ میں علماء و احتجاء  
کیا کرتے تھے۔ مثلاً امام سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ  
اور امام ابو داؤدؒ جب امام شافعیؒ آتے تو انھوں نے  
مرسل کی حجت میں کلام کیا۔

واما المراسیل فقد کان یحتج بہا  
العلماء فیما مضی مثل سفیان الثوریؒ  
ومالكؒ والذہبیؒ حتی جاء الشافعیؒ فکلم  
فیہ اھ

۲۳۹۵  
(المحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ من توجیہ النظر)

امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ

فاذا لم یکن مسند ضد المرسل  
ولم یوجد مسند فالمرسل یحتج بہ  
ولیس ہو مثل المتصل فی القوة۔

(رسالہ ابوداؤد، ص ۵)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ مراسیل سے احتجاج اور عدم احتجاج کے بارے میں بحث کرتے  
ہوئے لکھتے ہیں کہ

بہر حال مراسیل کے قبول اور رد کرنے میں لوگوں  
نے اختلاف کیا ہے اور صحیح تر قول یہ ہے کہ مراسیل  
میں مقبول و مردود اور موقوف سبھی اقسام ہیں سو  
جس کے حال سے یہ معلوم ہوا کہ وہ ثقہ ہی سے  
ارسال کرتا ہے تو اس کا مرسل قبول کیا جائے گا اور  
جو ثقہ اور غیر ثقہ سب سے ارسال کرتا ہے اور  
جس سے اس نے حدیث مرسل روایت کی ہے۔  
اس کا علم نہیں تو ایسی مرسل حدیث موقوف ہوگی  
اور جو مراسیل ثقات کی روایت کے خلاف ہوں تو  
وہ مردود ہوں گے اور جب مرسل دو طریقوں سے  
مردی ہو ایک مرسل الگ شیوخ سے اور دوسرا الگ

واما المراسیل قد تنازع الناس  
فی قبولها و ردھا و اصح الاقوال ان  
منہا المقبول والمردود ومنہا الموقوف  
فمن علم من حالہ انه لا یرسل الا  
عن ثقۃ قبل مرسلہ ومن عرف انه  
یرسل عن الثقۃ وغیر الثقۃ کان ارسالہ  
روایۃ عن من لا یعرف حالہ فہذا موقوف  
وما کان من المراسیل مخالفا لما رواہ  
الثقات کان مردودا و اذا کان المرسل  
من وجہین کل من الراویین اخذ العلم  
عن شیوخ اخر فہذا یدل علی صدقہ

فان مثل ذلك لا يتصور في العادة تماثل  
الخطأ فيه وتعتمد الكذب احد  
(منهاج السنة جلد ۲ ص ۱۱)

تو یہ اس کے صدق پر دلالت کرتا ہے کیونکہ عادتاً اس  
میں خطا اور جان بوجھ کر جھوٹ بولنے کا تصور نہیں کیا  
جاسکتا۔

امام نووی پہلے ان حضرات کا ذکر کرتے ہیں جو مرسل کو قابل استلال نہیں گردانتے۔ آگے ارشاد  
فرماتے ہیں کہ

ومذهب مالك وابي حنيفة واحمد  
واكثر الفقهاء انه يمتنع بهومذهب الشافعي  
انه اذا انضم الى المرسل ما يعضده  
احتج به وذلك بان يروى مستنداً  
او مرسلًا من جهة اخرى او يعمل  
به بعض الصحابة واكثر العلماء  
(مقدمہ نووی بر شرح مسلم ص ۱)

امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام احمد اور اکثر  
فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ مرسل قابل احتجاج ہے اور  
امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ اگر مرسل کے ساتھ  
کوئی تقویت کی چیز مل جاتے تو وہ حجت ہوگا مثلاً  
یہ کہ وہ مسنداً بھی مروی ہو یا دوسرے طریق سے  
وہ مرسل روایت کیا گیا ہو یا بعض حضرات صحابہ کرام رض  
یا اکثر علماء نے اس پر عمل کیا ہو

حضرت امام شافعی نے یہ بحث اپنی کتاب الرسائل فی اصول الفقہ ص ۱ طبع بولاق میں  
کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ مرسل معتقد کے حجت ہونے کے امام موصوف بھی قائل ہیں  
اور اس کی ان کے نزدیک چند شرطیں ہیں جن کا اختصار کے ساتھ امام نووی نے تذکرہ فرمایا ہے  
ایک شرط یہ ہے کہ

وزاد في الاعتضاد ان يوافق قول  
صحابي او يفتي اكثر العلماء به مقتضاه  
... الم (تدريب الراوي ص ۱۲)

امام شافعی نے اعتضاد کے لیے یہ شرط زائد کیا  
کی ہے کہ وہ کسی صحابی کے قول کے موافق ہو یا اکثر علماء  
نے اس کے مقتضی پر فتویٰ دیا ہو۔

امام ابن الجوزی اپنی کتاب التحقیق میں اور محدث خطیب بغدادی اپنی تالیف  
الجامع فی ادب الراوی والسامع میں امام احمد بن حنبل سے نقل کرتے ہیں۔  
ربما كان المرسل اقوى من  
المسند (شرح نقایہ جلد ۱ ص ۱ طبع بہند)  
بسا اوقات حدیث مرسل مسند سے قوی تر  
ہوتی ہے۔



اور عہد حاضر کے محقق علامہ زاہد الکوثری (المتوفی ۱۳۵۷ھ) لکھتے ہیں کہ

والا محتاج بالمرسل کان سنة  
متوارثۃ جرت علیہ الامۃ فی القدر  
الفاضلۃ حتی قال ابن جبرین رد المرسل  
مطلقاً بدعتہ ثبت فی رأس المائتین ۱۵  
کما ذکرہ الباجی فی اصولہ وابن عبدالبر  
فی التمهید وابن رجب فی شرح علل الترمذی ۱۶  
مرسل کے ساتھ احتجاج کرنا ایک ایسا متوارث طریق  
تھا جس پر قرون فاضلہ میں امت عمل پیرا رہی ہے امام ابن  
جبرین نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مطلقاً مرسل کو رد کر دینا بدعت  
ہے جو دوسری صدی کے آخر میں ایجاد ہوئی جیسا کہ علامہ  
باجی نے اپنے اصول میں اور ابن عبدالبر نے تمہید میں اور  
ابن رجب نے شرح علل ترمذی میں ذکر کیا ہے۔

(تانیب الخطیب ص ۱۵ طبع مصر)

تقلید شخصی تو بقول فریق ثانی چوتھی صدی کے بعد کی بدعت ہے مگر مطلقاً مرسل کو رد کرنا دوسری  
صدی کے بعد کی بدعت نکلی ان تمام اقتباسات سے یہ بات بالکل مبہین ہو چکی ہے کہ مرسل حدیث  
کے حجت ہونے نہ ہونے کا جھگڑا تو دوسری صدی کے بعد سے تاپنوز چلا آ رہا ہے مگر دوسری صدی  
تک ساری امت مرسل کو حجت سمجھتی تھی۔ لہذا محض مرسل کہہ کر ہستی کو غلامی چاہنا جیسا کہ فریق ثانی  
کر رہا ہے آسان نہیں ہے حق بات یہ ہے کہ مرسل جبکہ اس کی سند صحیح ہو اور کسی مرفوع متصل روایت  
کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ بالکل حجت ہے۔

### بعض حضرات تابعین اور تبع تابعین کے مراسیل:

علمی اور تحقیقی طور پر بعض حضرات تابعین اور اتباع تابعین ایسے بھی ہیں جن کے مراسیل کو امت  
مسلمہ نے مجبوشی قبول کیا ہے حتیٰ کہ خود حضرت امام شافعیؒ نے بھی ان کو تسلیم کیا ہے اور وہی اس  
کے رد کرنے میں پیش پیش ہیں۔ چنانچہ امام شافعیؒ کا مشہور قول یہ بتایا گیا ہے کہ وہ حضرت  
سعید بن المسیب کے مرسل کو حجت مانتے ہیں۔ (تدریب الراوی ص ۱۲۰)

اور امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ سعید بن المسیب کے مراسیل اصح ترین ہیں۔

(تدریب ص ۱۲۳)

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ سعید بن المسیب کے مراسیل صحیح ترین ہیں اور ابوبکر بن عیسیٰؒ کے

(ایضاً ص ۱۲۳ و ص ۱۲۴)

مراسیل لا بأس بہا ہیں۔

اور امام ابن معینؒ نے فرمایا کہ مر اسیل ابراہیم نخعیؒ مجھے شعبیؒ کے مر اسیل سے زیادہ محبوب ہیں۔  
 (ایضاً ص ۱۲۷) اور امام المحثین علی بن المدینیؒ فرماتے ہیں کہ حسن بصریؒ کے مر اسیل جن کو ان سے ثقہ  
 راوی نقل کریں بالکل صحیح ہوتے ہیں۔ (ایضاً) اور علی بن المدینیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے مجاہد کے مر اسیل،  
 عطاء کے مر اسیل سے کئی درجہ زیادہ پسند ہیں (ایضاً ص ۱۲۳) اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مر اسیل  
 ایک دوسرے کی نسبت سے صحیح تر ہوتے ہیں مگر بعض ایسے بھی ہیں جو فی نفسہ صحیح بلکہ اصح ہیں۔  
 لہذا مؤلف خیر الکلام کا یہ بہانہ کہ ترجیح سے اعتماد سمجھ لیا حالانکہ ضعیف پر ضعیف کو بھی ترجیح ہوتی  
 ہے۔ اسی ان قال یاد رکھنا چاہیے کہ مرسل کو مرسل سے اس وقت قوت ہوتی ہے جب دونوں کبار تابعینؒ  
 سے ہوں..... الخ (ص ۳۵۳) محض اپنے قلب کی تسکین کا سامان ہے اور ناخواندہ حواریوں کو طفل تسلی  
 دینا ہے اور بس کیونکہ ان مر اسیل میں مطلقاً بعض مر اسیل فی نفسہا صحیح ہیں اور اعتضاد کے لیے  
 کیا رتباہین کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ محض مؤلف مذکور کی اختراع ہے کیونکہ حضرات ائمہ ثلاثہؒ اور  
 دوسری صدی تک کی ساری امت تو ویسے ہی مرسل کو حجت مانتی ہے اور امام شافعیؒ مرسل  
 مقتضد کو (جو بعض حضرات صحابہ کرام یا اکثر علماء کے عمل کے موافق ہو) حجت سمجھتے ہیں اور امام کے  
 پیچھے قرأت کا ترک کرنا خصوصاً جہری نمازوں میں نہ صرف یہ کہ بعض حضرات صحابہ کرام کے عمل سے  
 مؤید ہے بلکہ جمہور صحابہ کرام کا یہی معمول تھا اور بقول حافظ ابن تیمیہؒ جہری نمازوں میں ترک قرأت پر  
 اجماع امت ہے لہذا ہر حیثیت سے یہ مر اسیل حجت ہیں لا شک فیہا۔

فائدہ۔ اگرچہ بعض محدثینؒ نے مرسل اور منقطع میں اصطلاحی طور پر کچھ فرق کیا ہے لیکن علامہ  
 جزائریؒ لکھتے ہیں:

وقد اطلق المرسل علی المنقطع من  
 ائمة الحديث ابو ذرعة وابو حاتم  
 والدارقطني۔ اھ (توجیہ ص ۲۳۳)  
 حدیث منقطع پر مرسل کا اطلاق ان ائمہ حدیث  
 نے کیا ہے امام ابو ذرعةؒ، امام ابو حاتمؒ اور امام دارقطنیؒ

مؤلف خیر الکلام نے حضرت مجاہد کے اثر کے بارے میں امام بیہقیؒ کی کتاب القراءۃ ص ۷۷ کے  
 حوالہ سے جو یہ لکھا ہے کہ یہ منقطع ہے اور منقطع ضعیف کی قسم ہوتی ہے (محصلہ ص ۳۵۳)  
 محض طفل تسلی ہے کیونکہ مرسل فی نفسہ صحیح قول کی بنا پر حجت ہے اور حکم منقطع و مرسل ایک



وغیر الامام رکتاب القراءة ص ۶۸ جزأ المقناة ص ۶۸) امام کے پیچھے ہو یا اکیلا۔

جواب :- اس کی سند میں زیاد بن ابی زیاد جصاص ہے امام ابن معین اور ابن مدینی اس کو لیس  
بشيئہ کہتے ہیں نسائی اور دارقطنی اس کو مترک کہتے ہیں ابوزرعه اس کو واہی کہتے ہیں علامہ ذہبی  
فرماتے ہیں کہ اس کے ضعیف ہونے پر سب کا اجماع اور اتفاق ہے (میزان جلد ۱ ص ۲۵۶) و تہذیب  
جلد ۲ ص ۳۶۸) مؤلف خیر الکلام نے بھی علامہ ذہبی کا حوالہ نقل کیا ہے (ص ۲۱۲) یہ روایت بھی نہایت  
کمزور اور ضعیف ہے اور ان کی ایک روایت یوں ہے لا تجوز صلاة الا بفتح الكتاب وآيتين  
فصاعداً (کتاب القراءة ص ۶۸) کہ نماز سورۃ فاتحہ اور دو آیتوں اور اس سے کچھ زیادہ کے بغیر صحیح  
نہیں ہوتی۔ لیکن اس میں ایک تو خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے اور دوسرا اس میں و آیتین  
فصاعداً کی زیادت موجود ہے۔

لطیفہ :- حضرت عمران بن حصینؓ سے مرفوعاً ایک روایت مروی ہے کہ ظہر کی نماز میں ایک  
شخص نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد  
آپؐ نے فرمایا کس نے میرے ساتھ نماز عت اور باقتیابی کی ہے؟ غرضیکہ آپؐ امام کے پیچھے قرأت  
کرنے سے منع کر دیا (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۲) اس روایت پر فریق ثانی کی طرف سے جن میں امام دارقطنی  
بھی ہیں یہ اعتراض ہوا ہے کہ سند میں حجاج بن ارطاة ہے اور وہ ضعیف ہے ہم نے حجاج بن  
ارطاة سے کوئی روایت نہیں لی۔ لیکن فریق ثانی کی ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ حجاج بن ارطاة، ابوداؤد،  
ترمذی، نسائی اور مسلم وغیرہ کے روایات میں ہیں (ازالہ ستر ص ۱۲۱) علامہ ذہبی ان کا احد الاعلام اور علم کا  
ظرف لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۵۵) ابوزرعه اور ترمذی ان کی توثیق کرتے ہیں (تہذیب جلد ۱ ص ۱۹۶)۔  
امام نوویؒ کہتے ہیں کان بارعافی الحفظ والعلم کہ حفظ اور علم میں وہ بلند پایہ کہتے تھے۔  
و تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۱۵۳) امام ترمذیؒ ان کی ایک حدیث کو حسن کہتے ہوئے تحسین کرتے ہیں (جلد ۱ ص ۱۵۳)  
بلکہ ایک حدیث کو حسن صحیح کہتے ہیں (جلد ۱ ص ۱۵۳) افسوس ہے کہ ان کی روایت تو فریق ثانی کے  
نزدیک حجت نہیں ہے لیکن زیادہ کی روایت حجت ہے جو لیس بشیئہ ہے اور اس کی تضعیف  
پر اجماع ہے ان کی ایک روایت یوں ہے کہ ظہر کی نماز میں ایک شخص نے سبیح اسود جلد ۱ ص ۱۵۳  
کی سیرت آپؐ کے پیچھے پڑھی تھی (مسلم جلد ۱ ص ۱۵۳، نسائی جلد ۱ ص ۱۵۳، ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۵۳) چونکہ لغت



توفیق ہے اس لیے قرآن کو جہد کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا اور پڑھنے والا بھی صرف ایک شخص تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس نے قرآن کی نماز میں کی تھی جو سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو بھی گوارا نہیں کیا اور پوری تحقیق گزرتی ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہو تب ہی مخصوص سبب کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اور منازعت و مخالفت میں قرأتِ سورۃ فاتحہ اور دوسری تمام سورتیں یکساں ہیں کیونکہ علت ایک ہے اور ما زاد علی الفاتحہ کو منازعت کے لیے متعین کر دینا اور سورۃ فاتحہ کو اس سے خارج تصور کرنا دعویٰ بلا دلیل ہے جو بہر حال مردود ہے۔

حضرت ہشام بن عامر کا اثر: حمید بن ہلال سے مروی ہے وہ کہتے ہیں۔  
ان ہشام بن عامر قرآن فقیل لہ القراءۃ کہ ہشام بن عامر نے قرأت کی ان سے پوچھا گیا کہ خلف الامام قال انا لنفعل رکاب القراءۃ آپ اہم کے پیچھے قرأت کرتے ہیں؟ فرمایا ہاں ہم مکمل السنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۸۱ یوں ہی کرتے ہیں۔

جواب: یہ اثر بھی قابل التفات نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں البحر بہاری ہے اور عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ کذاب تھا وثالثاً اس بات میں اختلاف ہے کہ حمید بن ہلال کی ہشام بن عامر سے ملاقات ثابت ہے یا نہیں؟ اہم الباقی کہتے ہیں ملاقات ثابت نہیں ہے اور ان کی روایت مرسل ہے (دیکھئے تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۱۸۱ و جلد ۱۱ ص ۱۸۱) وثالثاً اس اثر میں سورۃ فاتحہ کا ذکر نہیں بلکہ مطلق قرأت کا ذکر ہے فرق ثانی کا دعویٰ صرف سورۃ فاتحہ کی قرأت کا ہے نہ کہ مطلق قرأت کا۔

حضرت معاذ بن جبل کا اثر: ایک سائل نے حضرت معاذ سے قرآن خلف الامام کے متعلق سوال کیا۔

قال اذا قرأ فاتحاً بفاتحة الكتاب وقل هو الله احد واذا لم تسمع قارئاً فنفسك ولا تؤذ من عن يمينك ولا من عن شمالك السنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۹  
انہوں نے فرمایا کہ جب اہم قرأت کرے تو تم بھی سورۃ فاتحہ اور قل هو الله احد پڑھا کرو اور جب اس کی قرآن نہ سنا تو دل میں پڑھا کرو دائیں اور بائیں پہلو والوں کو ازیت نہ دیا کرو۔

جواب: یہ اثر بھی قابل استدلال نہیں ہو سکتا اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں احمد بن محمد



واقع ہے حافظ ابن حجرؒ ایک سند کے متعلق جس میں احمد بن محمدؒ واقع ہے لکھتے ہیں کہ سند باطل ہے اور اس سند کے راوی ضعیف ہیں دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ مجہول ہیں (لسان المیزان جلد ۶ ص ۳۱۴) وثانیاً اس کی سند میں ابو شیبہ مہریؒ ہے علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ بلج مہریؒ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں لا بدی من ذاولا من شیخہ بلج مہریؒ اور اس کا استاد ابو شیبہ مہریؒ پتہ نہیں یہ دونوں کون تھے؟ امام بخاریؒ فرماتے ہیں اس کی سند مجہول ہے (میزان جلد ۶ ص ۳۱۴ و لسان جلد ۶ ص ۳۱۴) وثالثاً اس سند میں علی بن یونسؒ واقع ہے اگر یہ علی بن یونس بلخیؒ ہے تب بھی کمزور ہے (میزان جلد ۶ ص ۳۱۴ و لسان ص ۳۱۴) اور اگر علی بن یونس مدینیؒ ہے تب بھی ضعیف ہے (الایضہ ص ۲۶۹) اگر کوئی اور ہے تو اس کی توثیق درکار ہے ورنہ اس اثر سے نظر بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاذؒ نے صرف سری نمازوں میں اجازت دی ہے و خامساً اس میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ قل هو اللہ احد کی قرأت کا بھی ذکر ہے اور فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا اثر: حضرت سالمؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں ان ابن عمرؓ کان ینصت للامام فیما ھو فیہ ولا یقلد معہ (کتاب القراءة ص ۱) و تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۱) کہ حضرت ابن عمرؓ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے خاموش رہا کرتے تھے اور قرأت نہیں کرتے تھے، فریق ثانی کا کہنا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سری نمازوں میں وہ امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے۔

جواب ۱۔ یہ اثر بھی فریق ثانی کو مفید نہیں اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں ابن جریجؒ ہیں، امام دارقطنیؒ علامہ ذہبیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ وہ مدلس تھے (تہذیب جلد ۶ ص ۴۰۵، میزان جلد ۱۵، ابکار ص ۲۳) اور یہاں وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں اور عنعنہ مدلس کا مقبول نہیں وثانیاً اس میں ذہبیؒ ہیں اور مبارکپوری صاحبؒ ان کی مدلس روایت کو بھی صحیح تسلیم نہیں کرتے اور یہاں بھی وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں وثالثاً یہ اثر عبارتہ النص کے طور پر ہماری دلیل ہے کہ حضرت ابن عمرؓ جہری نمازوں میں قرأت کے قائل نہ تھے رہا سری نمازوں میں اس سے قرأت کا اثبات کہنا تو مفہوم مخالف پیمانی ہے اور ہمارے نزدیک مفہوم مخالفت محبت نہیں ہے (تعلیق المجد ص ۹۳ و اعلام السنن جلد ۴ ص ۱) و رابعاً اگر مفہوم مخالف کو بعض فقہاء



کے قول کے مطابق صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی اس سے اتنا ہی ثابت ہوگا کہ حضرت ابن عمرؓ  
 سہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے اور فریق ثانی کا دعویٰ اس سے خاص ہے کیونکہ  
 ان کا دعویٰ صرف سورۃ فاتحہ پڑھنے کا ہے و خاشا موطا امام مالکؒ وغیرہ کے حوالہ سے بسند صحیح ان  
 کا یہ اثر نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ امام کے پیچھے کسی نماز میں کسی قسم کی قرأت کے قائل نہ تھے اور ان کا یہ  
 مسلک ایک مسلم حقیقت ہے اور ان سے ایک روایت یوں ہے انہ کان ینہی عن القراءة  
 خلف الامام (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۳۳) کہ حضرت ابن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع  
 کیا کرتے تھے۔ مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلویؒ (المتوفی ۱۳۲۰ھ) جو فریق ثانی کے مقتدر اور  
 پیشوا ہیں تحریر فرماتے ہیں کہ مقتدی کو سورۃ فاتحہ پڑھنے کی علماء احناف کے نزدیک اجازت نہیں ہے  
 اور ان کا استدلال ان صحابہ کرامؓ کی روایات سے ہے اور یہ قرأت خلف الامام کے قائل نہ تھے۔  
 حضرت جابر بن عبد اللہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت  
 ابو سعید بن الحدادیؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عمر بن الخطابؓ، حضرت زید بن ثابتؓ،  
 حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ وغیرہم (منع قرائت خلف الامام۔ بحوالہ  
 ایضاح الادلة ص ۸) اور صحیح اسانید کے ساتھ جلد اول میں ان اکابر کے آثار نقل کئے جا چکے ہیں کہ یہ  
 جملہ حضرات امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور یہی بات مولانا نذیر حسین صاحبؒ فرماتے ہیں  
 حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا ایک اثر کتاب القراءة ص ۱۲۹ و ص ۱۳۰ میں ہے لیکن اس میں محول مدرسین  
 اور محققین سے روایت کرتے ہیں علاوہ انہیں امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ عبد اللہ بن عمرؓ نہیں بلکہ  
 عبد اللہ بن عمرؓ بن العاص ہیں (ص ۱۲۹) اور مستزاد برآں اس میں خلف الامام کا جملہ بھی مذکور نہیں ہے  
 لہذا یہ روایت منفرد کے حق میں ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے ابو العالیہؒ نے مکہ مکرمہ میں  
 دریافت کیا کہ کیا میں نماز میں قرأت کیا کروں؟ فرمایا میں بیت اللہ کے ربے حیا کرتا ہوں کہ نماز  
 میں قرأت نہ کروں و لولم یم الکتاب اگرچہ ام القرآن ہی ہو (جزء القراءة ص ۱۲) لیکن اس میں  
 بھی خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ علاوہ بریں کتاب القراءة ص ۱۲ میں اسی اثر کے آخر میں  
 فاتحہ الکتاب کے بعد ہاتھ کی زیادت بھی موجود ہے اور یہ زیادت اس بات کو متعین کر  
 کر دیتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کا یہ اثر مقتدی کے حق میں نہیں ہے کیونکہ فریق ثانی کے نزدیک



بھی اس کو مازاد علی الفاتحہ پڑھنے کی گنجائش نہیں ہے اور کتاب القراءۃ ص ۶۴ میں ان کی اسی روایت میں بام الکتاب کے بعد فزائدًا بافصاعاً کی زیادت بھی مروی ہے حضرت ابن عمرؓ سے ایک اثر ان الفاظ سے مروی ہے۔

مسئل ابن عمرؓ عن القراءۃ خلف الامام ان سے سوال کیا گیا کہ کیا اہم کے پیچھے قرآن کی جاسکتی فقال ما کانوا یرون بأساً ان یقرأ بقلعۃ ہے؟ فرمایا لوگ اس میں کوئی عرج نہیں سمجھتے تھے الکتاب فی نفسہ (جزء القراءۃ ص ۱۲) کہ اپنے دل میں سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔

لیکن اس کی سند میں ایک تو ابو جعفر رازیؒ ہے جس کا نام عیسیٰ بن ماہان ہے جس کا ترجمہ نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ ضعیف ہے اور دوسرا راوی اس سند کا یحییٰ البکاء ہے اہم احمد، ابو داؤد، البوزاری اور ابن عدیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں، دارقطنیؒ اس کو ضعیف اور علی بن الجعدؒ اس کو مختلط کہتے ہیں، ازہریؒ کہتے ہیں کہ یہ متروک ہے ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے (تذیب التذیب جلد ۱ ص ۲۴۹) اہم نسائیؒ اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں (ضعفاً صغیراً ص ۵۵) حافظ ابن حجرؒ اس کو ضعیف الحدیث لکھتے ہیں (تقریب ص ۲۹۵) مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ عیسیٰ بن ماہان متکلم فیہ ہے مگر حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ صدوق ہے اس کا حافظ اچھا نہیں (تقریب ص ۳۲۴) اور یحییٰ البکاء کو ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ ہے الشارح اللہ جب راوی مختلف فیہ ہو تو اس کی حدیث حسن ہوتی ہے (محصلاً ص ۳۲۴) الجواب ہاں بس ایسے ہی راویوں کی ایسی ہی جن قسم کی حدیثوں پر آپ کے مذہب کی بنیاد ہے اور مسلمانوں کی کثرت کی نمازوں کو باطل اور کالعدم ٹھہرانے والوں کی وکالت فرما رہے ہیں۔ سبحان اللہ تعالیٰ اور آگے لکھتے ہیں کہ تطبیق کی یہی صورت ہے کہ نفی سے مراد جہری نماز میں فاتحہ سے مازاد کی نفی مراد لی جائے اور فاتحہ کو اس نفی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے انتہا ص ۳۲۵ الجواب نہ معلوم یہ حضرت کس روایت کی کس تطبیق سے ہے؟ صحیح اور ضعیف کی تطبیق کا کیا معنی؟ الحاصل حضرت ابن عمرؓ ہوں یا کوئی اور صحابی ہو ان میں کسی سے بسند صحیح یہ ثابت نہیں کہ اہم کے پیچھے مقتدیوں کو سورۃ فاتحہ پڑھنی ضروری اور واجب ہے۔

حضرت عبادة بن الصامت کا اثر۔

حضرت محمود بن ربیع فرماتے ہیں کہ:-



سمعت عبادۃ بن الصامت یقرأ خلف  
 الامام فقلت له تقرأ خلف الامام فقال عبا  
 لا صلوة الا بقراءة رسن الکبوی جلد ۱۶۸  
 امام بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ ان کی ایک اور روایت بھی نقل کی ہے جس میں امام کے پیچھے آہستہ  
 قرأت کرنے کی اجازت ہے اور پھر لکھا ہے۔

ومذهب عبادۃ فی ذلک مشہور (ص ۱۶۸)  
 حضرت عبادۃ کا مذہب اس میں مشہور و معروف ہے۔

جواب :- سند کے لحاظ سے گو کلام کرنے کی کافی گنجائش ہے مگر ہم سند کے لحاظ سے اس  
 پر کوئی کلام نہیں کرتے حضرت عبادۃ بن الصامت نے صحیح سمجھایا غلط بہر حال یہ بالکل صحیح بات  
 ہے کہ حضرت عبادۃ ام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے اور ان کی یہی تحقیق اور یہی مسلک و  
 مذہب تھا مگر فہم صحابی اور موقوف صحابی حجت نہیں ہے خصوصاً قرآن کریم، صحیح احادیث اور جمہور  
 حضرات صحابہ کرامؓ کے آثار کے مقابلہ میں لیکن یہ روایت خود اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ حضرات  
 صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ میں امام کے پیچھے قرأت کرنے کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور یہ  
 مسلک ان میں رائج بھی نہ تھا ورنہ محمود بن ریح جو خود صغار صحابہؓ میں تھے حضرت عبادۃ بن الصامت  
 کی امام کے پیچھے قرأت سے کبھی تعجب نہ کرتے اور نہ یہ پوچھنے کی نوبت ہی آتی کہ حضرت آپ امام  
 کے پیچھے کیوں قرأت کرتے ہیں؟ یقینی امر ہے کہ حضرت عبادۃ بن الصامت نے نماز میں تکبیر،  
 قیام، رکوع، سجود، تشهد، اور سلام وغیرہ جملہ امور ادا کئے ہوں گے مگر ان میں سے کسی چیز کے بائے  
 میں پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی کہ حضرت آپ نے رکوع کیوں کیا ہے؟ سجود کیوں کیا ہے؟  
 وغیرہ وغیرہ اگر سوال کیا ہے تو اس چیز کے بائے میں کہ آپ کے امام کے پیچھے قرأت کیوں کرتے  
 ہیں؟ یہ بھی مت بھولیے کہ حضرت عبادۃ بن الصامت نے محمود بن ریح کو یہ نہیں فرمایا کہ پروردگار  
 تمہاری تمام سابق نمازیں بے کار کا لعدم اور باطل ہیں کیونکہ تم نے قرأت انہیں کی اور تمام نمازیں واجب  
 الاعادہ ہیں اور نہ سہی تو یہی نماز جو تم نے ابھی ابھی میرے ساتھ بغیر قرأت کے ادا کی ہے وہی دوبارہ  
 پڑھ لو اور لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت محمود بن ریح حضرت عبادۃ کے داماد تھے رہنمائی  
 التذیب جلد ۱ ص ۱۶۸، انہوں نے ان کو یہ بھی نہ فرمایا کہ تم امام کے پیچھے ترک قرأت کے مرتکب



ہوتے ہو اور تارکِ قرأت کی نماز باطل اور کالعدم ہے اور من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر  
لنذا میری نحت جگر کو میرے گھر پہنچا دو اور خود منے اڑاتے پھرو۔ حضرت عبادۃ وہی جلیل القدر صحابی  
ہیں جو فرماتے ہیں کہ ہم نے جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک پر اس شرط سے  
بیعت کی ہے کہ ان لا تخاف فی اللہ لومة لائمہ (مستدرک وقال صحیح جلد ۳ ص ۳۵۶) اللہ  
تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ہرگز نہ گھبرائیں گے اور ایک معمولی قسم  
کے مسئلہ میں حضرت امیر معاویہؓ سے اُلجھ کر ملک شام ترک کر دیا تھا اور یہ فرمایا کہ ہمارا اجتماع ناممکن ہے  
لیکن حضرت عمرؓ کی زبردست مداخلت سے اپنے ارادہ سے باز آئے (دیکھئے مستدرک جلد ۳ ص ۳۵۵،  
مسند دارمی ص ۱۳ اور ابن ماجہ ص ۷ وغیرہ) مگر جب قرأت خلف الامام کے مسئلہ کی باری آتی ہے تو اپنے  
پڑھنے کی وجہ تو بتلاتے ہیں لیکن اس اہم مسئلہ کے اظہار پر کما حقہ وہ جوش و خروش ظاہر نہیں کرتے جو  
اس کے رکن اور ضروری ہونے پر کرنا چاہیے تھا۔ اگر حضرت عبادۃؓ کے نزدیک قرأت خلف الامام جب  
فرض اور رکن ہوتی تو اس کے اظہار میں پوری قوت اور طاقت صرف کرتے اور اس میں کسی قسم کی کوئی  
کوٹاہی نہ کرتے۔ اس بحث کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات بخوبی سمجھ آ سکتی ہے کہ حضرت محمود بن ربیع  
مطلقاً اہم کے پیچھے قرأت فاتحہ کے قائل نہ تھے اور حضرت عبادۃؓ کو قائل تو تھے لیکن محض استحباب  
طور پر اور اگر کسی کو حکم بھی کیا ہے تو صرف استحبابی امر سمجھ کر۔ اگر اس کو رکن اور فرض سمجھتے تو کہتان حق سے  
بچتے ہوئے حضرت ابن مسعودؓ کی طرح (جنہوں نے قرآن کریم کی دو سورتوں کے تقدم و تاخر فی النزول  
کے بارے میں اعلان کیا تھا) یہ اعلان فرماتے من شاء باہلتہ جس کا جی چاہے میں اس کے ساتھ  
مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہوں جب حضرت عبادۃؓ نے ایسا نہیں کیا تو قطعی بات ہے کہ وہ اہم کے پیچھے  
بلاشک سورۃ فاتحہ پڑھتے تو تھے (اور جہری نمازوں میں پڑھتے بھی صرف تنہا اور اکیلے تھے دوسرے  
حضرات صحابہؓ کا ان سے اتفاق نہ تھا) مگر صرف مستحب سمجھ کر ہم نے جو یہ کہا ہے کہ دوسرے صحابہؓ حرام  
حضرت عبادۃؓ بن الصامت سے جہری نمازوں میں قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں اتفاق رائے  
نہیں رکھتے تھے، سینہ زوری نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ چنانچہ اہم یہی کہتے ہیں کہ۔

وانما تعجب من تعجب من قرأت عبادۃ بن الصامت      جو لوگ اہم کے پیچھے جہری نمازوں میں قرأت کے قائل  
خلف الامام فیما یجہر فیہ بالقرآن لذلک      نہ تھے انہوں نے حضرت عبادۃؓ کی جہری نمازوں میں قرأت



من ذهب الى ترك القراءة خلف الامام فيما  
يجهر الامام فيه بالقراءة حين قال النبي  
صلى الله عليه وسلم مالي انازع القرآن  
ولم يسمع استثناء النبي صلى الله عليه  
وسلم قراءة فاتحة الكتاب سرًا وقوله  
صلى الله عليه وسلم فانه لا صلوة لمن  
لم يقرأ بها وسمعه عبادة بن الصامت  
والقنه واداه واظهره فوجب الرجوع  
اليه في ذلك (انتفى بلفظ كتاب القراءة ص ۴)

پر تعجب کا اظہار کیا اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آنحضرت  
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا کہ میرے ساتھ قرآن  
میں منازعت کیوں کی جا رہی ہے؟ اور اس کے بعد آپ نے  
آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا اور اسی طرح آپ نے یہ  
فرمایا کہ جس آدمی نے نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز  
نہ ہوگی تو یہ استثناء صرف حضرت عبادہ بن الصامت نے  
سُنی اور دیگر حضرات صحابہؓ نہ سُن سکے اور اس کو حضرت  
عبادہؓ نے خوب محفوظ رکھا اس کو ادا کیا اور ظاہر کیا سوانحی  
بات کی طرف رجوع کرنا ضروری تھا۔

صحابی اور تارک نماز؟ یہ دو متضاد باتیں ہیں اور واقعہ صبح کی نماز کا ہے جس میں سینکڑوں حضرات  
صحابہؓ شریک ہوں گے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مالی انازع الخس سے تنبیہ فرما کر سب  
حضرات صحابہ کرامؓ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی اور یہ حکم بھی پیش نظر تھا۔ يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ  
بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ اور فَاصْلَحْ بِمَا تَوَكَّلْ (یعنی اے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم  
اللہ تعالیٰ کے حکموں کو کھول کر بیان کریں جن میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے) مگر بایں ہمہ جناب رسول  
خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ حکم آہستہ (سرا) بیان کرتے ہیں اور حضرت عبادہؓ کے بغیر اس حکم کو کوئی  
دوسرا سنتا ہی نہیں؟ پھر حضرت عبادہؓ پر لوگ متعجب کیوں نہ ہوں کہ حضرات صحابہ کرامؓ جو آنحضرت صلی  
اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک ایک حکم اور ارشاد کو عزیز از جان سمجھتے تھے اور ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے  
کوئی بات نہیں سمجھ آتی تو پھر استدعا کرتے تھے اور کوئی ضروری امر ہوتا تو آپ تین تین مرتبہ ایک ایک  
جملہ کو دہراتے تھے لیکن جب امام کے پیچھے قرأت سورۃ فاتحہ کے حکم کے بیان کرنے کا نمبر آتا ہے تو  
آپ آہستہ بیان کرتے ہیں؟ تین مرتبہ بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے؟ اور یہ حکم صرف  
حضرت عبادہؓ سنتے ہیں کسی دوسرے کے پلے کچھ نہیں پڑتا؟ اور دیگر حضرات صحابہ کرامؓ آپ سے  
دریافت کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے کہ حضرت آپ نے کیا ارشاد فرمایا ہے؟ اگر امام کے پیچھے  
سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کا مسئلہ ضروری فرض، واجب اور رکن ہوتا تو یقیناً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم



سلم ایک بار نہ فرماتے بلکہ کئی بار فرماتے ستر اند فرماتے بلکہ جہر فرماتے صرف حضرت عبادہؓ کو نہ سنتے بلکہ تمام حضرات صحابہؓ کو سنتے اور اگر حضرت عبادہؓ بھی اس حکم کو ضروری سمجھتے تو یقیناً بغیر خوفِ ہمدردی کے اس کی خوب نشر و اشاعت کرتے اور حضرات صحابہ کرامؓ کو اس بات کا قائل کر لیتے کہ وہ بھی جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتے۔ یہ حکم تو ضروری نہ تھا اس لیے اس کی پُر زور اشاعت کی ضرورت ہی انہوں نے نہ سمجھی، بخلاف اس کے ترک قرأت کا حکم ضروری تھا اس لیے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے صرف ایک شخص نے قرأت کی تو آپ نے فرمایا میرے پیچھے کس نے قرأت کی ہے؟ کیوں میرے ساتھ نماز عت اور مخالفت ہوتی رہی ہے؟ حتیٰ کہ آپ نے بیابانِ دہل یہ ارشاد فرمایا مالی انا نزع القرآن نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ارشاد سب نے سنا اور یہ ارشاد سن کر تمام حضرات صحابہ کرامؓ نے جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت ترک کر دی۔ جیسا کہ مفصل پہلے گزر چکا ہے۔ باقی اگر حضرت عبادہؓ سے پسندِ صحیح یا کسی اور صحابی سے بلا قیل و قال خلف الامم کی قید سے کوئی روایت صحیح ہو تو یقیناً اس کی طرف رجوع کیا جاتا مگر روایات کا حال آپ ملاحظہ کر ہی چکے ہیں اور بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ حضرت عبادہؓ کے موقوف قول سے ہی غلطی در غلطی پیدا ہوئی ہے الغرض حضرت صحابہ کرامؓ کے یہ آثار پہلے تو سند ہی صحیح نہیں ہیں اور اگر کچھ صحیح بھی ہیں تو ان میں صرف ستر نمازوں کا ذکر ہے کسی میں مطلق قرأت کا ذکر ہے اور اکثر میں ما زاد، ماتید اور فضا عدا وغیرہ کی زیاد بھی موجود ہے لہذا یہ آثار فریقِ ثانی کو ہرگز مفید نہیں ہو سکتے۔

## آثار حضرات تابعینؒ وغیرہم

فریقِ ثانی نے اپنے اس دعویٰ پر کہ امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے ورنہ نماز ناقص، بیکار، کالعدم اور باطل ہوگی، حضرات تابعینؒ و اتباع تابعینؒ وغیرہم کے آثار اور اقوال بھی استدلال کیا ہے حالانکہ ان کے نزدیک درموقوفات صحابہؓ حجت نیست اگرچہ بصحت رسد پھر آثار حضرات تابعینؒ وغیرہم سے استدلال کیونکر صحیح ہو سکتا ہے جب کہ وہ سنداً اور روایتاً بھی صحت کے معیار پر پورے نہیں اترتے اور معنوی اور درایتی پہلو کے پیش نظر بھی وہ ان کو چنداں مفید نہیں ہو سکتے مگر مشہور ہے ڈوبتے کو تینکے کا سہارا، حضرات تابعینؒ وغیرہم کے وہ آثار جو بحثِ سکتا



وغیرہ اور دیگر مواقع پر نقل کئے جا چکے ہیں اور جن پر کلام بھی کیا جا چکا ہے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے اس موقع پر صرف وہ آثار پیش ہوں گے جو پہلے نقل نہیں ہوئے۔  
 حضرت محول کا اثر :- ان سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ مغرب عشاء اور صبح کی نمازیں ہر رکعت میں آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھی جائے اور جہری نمازوں میں جب اہم سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد سکوت اختیار کرے تو اس وقت آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھی جائے اور اگر اہم خاموش نہ ہو تو اس کے ساتھ یا اس کے بعد یا اس سے پہلے ہر حالت میں سورۃ فاتحہ پڑھو اور کسی حالت میں نہ چھوڑو (بیہقی جلد ۲ ص ۱۷۱)

جواب :- یہ اثر بھی قابل التفات نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اگر بالفرض یہ اثر صحیح بھی ہو تب بھی نص قرآنی، صحیح احادیث اور مجہور حضرات صحابہ کرام کے صحیح آثار کے مقابلہ میں اس کو سننا کون ہے؟ وثانیاً قرأت سورۃ فاتحہ کے لیے سکتے کی کوئی گنجائش نہیں ہے جیسا کہ بحث سکنت اہم میں اس کی سیر حاصل تحقیق پیش ہو چکی ہے اور جہر اہم کے ساتھ ساتھ پڑھتے جانا منازعت اور مخالفت کا موجب ہے جو کتاب و سنت اور اجماع امت سے مردود ہے۔

حضرت عروۃ بن زبیر کا اثر :- ان سے مروی ہے انہوں نے ارشاد فرمایا کہ لا تتم صلوۃ لأحد من الناس لا یقرأ فیہا کسی شخص کی کوئی نماز خواہ وہ فرضی ہو یا نقلی اس وقت بفتح الکتاب فصاعداً مکتوبۃ ولا سبحة تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس میں سورۃ فاتحہ اور اس سے کچھ زیادہ کی قرأت نہ کی جائے۔ (کتاب القراءۃ ص ۷)

جواب :- یہ اثر بھی قابل استدلال نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں محمد بن العباس ہے کتب اسماء الرجال سے اس کی تعیین نہیں ہو سکی کہ یہ کون اور کیسا ہے؟ وثانیاً اس میں احمد بن حنبل ہے جس کا کتب رجال میں کوئی نام و نشان ہی نہیں ملتا، مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ مگر عدم علم سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مجہول ہوا ۳۳۹ جواب :- یہ ٹھیک ہے مگر مؤلف مذکور کا یہ علمی اور اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ اس راوی کی نشاندہی کرتے اور کتب رجال سے اس کی توثیق نقل کرتے وثالثاً اس کی سند میں حماد بن سلمہ ہے ان کے اس اثر کا مقابلہ اہل اثر سے نہیں ہو سکتا جو جلد اول میں ابتداً صحیح نقل کیا جا چکا ہے مباد کہ پوری صاحب لکھتے ہیں۔ سو یہ معارضہ بھی صحیح نہیں



علی وجوب الاستماع والانصات لقراءة الامام۔۔۔ الخ (احکام القرآن ج ۳ ص ۲۹)

استماع وانصات کے وجوب پر واضح دلیل ہوتی۔

علامہ سید محمود آلوسی (مفتی بغداد المتوفی ۱۲۷۰ھ)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

لانہا تقتضی وجوب الاستماع عند قراءة القرآن في الصلاة وغيرها و قد قام الدلیل فی غیرها علی اجواز الاستماع وتركه فبقی فیها علی حاله فی الانصات للجمہر وكذا فی الانخفاء لعلنا بانه یضراً ویؤید ذلك اخبار رجعة (روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۳)

آیت کا مقتضی یہ ہے کہ نماز میں یا خارج از نماز جب بھی قرآن کریم کی قرأت ہوتی ہو تو خاموش رہنا چاہیے۔ لیکن خارج از نماز سماع وعدم سماع دونوں کے جواز پر دلیل قائم ہو چکی ہے۔ لہذا جہر نمازوں میں انصات بہر حال ضروری ہے اور لاسی طرح ستری نمازوں میں بھی کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ امام قرأت کرتا ہے اور متعدد حدیثیں بھی اس کی

تائید کرتی ہیں۔

اس کے بعد علامہ موصوف نے متعدد صحیح حدیثیں، عقلی و ترجیحی دلائل پیش کر کے بڑے دینی دلائل سے اپنا دعویٰ ثابت کیا ہے۔

قارئین کرام! آپ حقیقت کی تہ کو پہنچ چکے ہوں گے۔ ابھی بہت سے مفسرین کرام مثلاً علامہ خازن (المتوفی ۷۴۱ھ) اور شیخ اشعر جونیوری (المتوفی ۱۱۳۰ھ) وغیرہ وغیرہ کی عبارتیں باقی ہیں، مگر ہمارا مقصد صرف منصف مزاج لوگوں کے لیے معتبر مفسرین کے

۱۔ مولانا میر صاحب لکھتے ہیں کہ متاخرین حنفیہ میں بڑے پائے کے مفسرین (تفسیر واضح البیان ص ۴۴)

۲۔ مشہور تفسیر ہے اور ۷۲۵ھ میں مصنف اس کی تالیف سے فارغ ہوئے تھے۔ (اکسیر فن)

آیت مذکورہ کی تفسیر انھوں نے جلد ۲ ص ۲۷۲ میں کیا ہے۔

۳۔ یہ اورنگ زیب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ فی ۱۱۱۸ھ کے استاد تھے۔

(اکسیر ص ۳۴)

اور تفسیر احمدی ص ۲۸۰ میں انھوں نے آیت مذکورہ کی سیر حاصل تفسیر کی ہے۔

چند اقوال بطور نمونہ عرض کرنے تھے اگر استقصا کیا جائے تو تقریباً محال ہے اور ہمارا موضوع بھی یہ نہیں۔ اس لیے اب ہم بعض ضروری عبارتیں نقل کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

امام بیہقی رحم جن کی کتاب القراءہ پر مسئلہ زیر بحث میں فریق ثانی کا مدار ہے۔ رقم طراز ہیں کہ  
ان لا تنکرون ذول هذه الآية في

الصلوة او في الصلوة والخطبة كما

ذهب اليه من ذكرنا قوله من سلف

هذه الامة غير انهم اوبعض من

روى عنهم اختصروا الحديث فقالوا

في الصلوة مطلقاً۔

(کتاب القراءۃ ص ۱۱)

(اور خطبہ وغیرہ کا ذکر تک نہیں کرتے۔)

امام بیہقیؒ کو اس کا اقرار ہے کہ آیت مذکورہ کا شان نزول صرف نماز یا نماز اور خطبہ دونوں

ہیں اور جمہور امت کا بھی یہی قول ہے مگر ان کا اعتراض یہ ہے کہ آیت کو فقط نماز پر کیوں قصر کر دیا

ہے؟ اس میں خطبہ وغیرہ کا ذکر بھی آنا چاہیے جیسا کہ احادیث میں آتا ہے لیکن امام موصوفؒ کا یہ اعتراض

محض دفع الوقتی اور تسکین قلب کا سامان ہے۔

اولاً: اس لیے کہ جمعہ اور عید کی فرضیت مدینہ طیبہ میں ہوتی ہے اور آیت مذکورہ مکی ہے جیسا

کہ علامہ نقویؒ کے حوالہ سے عرض کیا جا چکا ہے۔ پھر اس کا شان نزول خطبہ کیسے ہوا؟

وثانیاً: جس حدیث (بلکہ احادیث) کے اختصار کا الزام امام موصوفؒ نے عائد کیا ہے۔ ان میں

ایک بھی صحیح نہیں ہے جیسا کہ اپنے مقام پر عرض ہو گا۔ پھر ان سے استدلال و احتجاج کیسا؟

وثالثاً: آیت کا حکم خطبہ کو عموم الفاظ کے لحاظ سے شامل ہے نہ کہ شان نزول کے لحاظ سے۔

جیسا کہ آپ پوری وضاحت سے یہ پڑھ چکے ہیں۔ مگر یہ کس قدر حقیقت فراموشی ہے کہ جس نماز

کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اس میں استماع و انصات تو ضروری نہ ہوا اور خطبہ

(وغیرہ بالتبع امور) کو اگر بنا کر اصل حقیقت سے گریزاور پہلو تہی کی جائے؟



## قاضی شوکانیؒ (محمد بن علی المتوفی ۱۲۵۵ھ)

اس مسئلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

لان عمومات القرآن والسنة قد

(امام جب قرأت قرآن کر رہا ہو تو مقتدی کو اس

دلت علی وجوب الانصات والاستماع

وقت اِنِّی وَجَّهْتُ وَجْهَی لِلَّذِی ... آیۃ کی دعاء

والمتوجه حال قرأة الامام للقرآن غیر

استفتاح نہیں پڑھنی چاہئے، کیونکہ قرآن کریم اور سنت

منصت ولا مستمع .... الخ

کے عمومات اور اکثر دلیلیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔ کہ

رنیل الادوار جلد ۲ ص ۲۲۶ ونقلہ النواب

امام جب قرأت کر رہا ہو تو اس وقت مقتدی پر

فی ہدایۃ السائل ص ۱۹۱

انصات اور استماع واجب ہے۔ حالانکہ اس حالت

میں امام کے ساتھ پڑھنے والا استماع اور انصات پر

عامل نہیں ہے۔

قاضی صاحبؒ بھی جہر امام کی طرح جہر امام کے وقت مقتدی کی قرأت کو قرآن کریم کی سیطرہ میں

قرآن سنت عمومی دلائل کے خلاف سمجھتے ہیں اور تصریح کرتے ہیں کہ اس کے خلاف کرنے والا عمومات قرآن اور

اور سنت کا مخالف ہے۔ قاضی صاحبؒ نے سکنت امام میں مقتدی کے لیے قرأت فاتحہ کو احوط

کہا ہے، لیکن قرأت مقتدی کے لیے سکنت کا شریعت میں کوئی وجود ہی نہیں ہے جس کی پوری تشریح

اپنے مقام پر عرض ہوگی۔ انشاء اللہ العزیز۔

مؤلف خیر الکلام کا مناقشہ نمبر ۳ میں یہ کہنا کہ اس میں فاتحہ کا ذکر نہیں اور قاضی شوکانیؒ ہر حالت

میں فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں اور استماع وانصات آہستہ پڑھنے کے منافی نہیں (مصلح خیر الکلام

ص ۵۴۷ و ۵۴۸) تو یہ محض لفاظی ہے۔ ہم نے کب فاتحہ کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے تو یہ حوالہ صرف اس لیے

پیش کیا ہے کہ جہر امام کے وقت مقتدی کا پڑھنا استماع وانصات کے بالکل منافی ہے اور یہی کچھ

قاضی صاحبؒ فرماتے ہیں حتیٰ کہ باقرار مؤلف خیر الکلام قاضی صاحبؒ مقتدی کے لیے فاتحہ کی

قرأت کو سکنت میں احوط کہتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو خیر الکلام ص ۵۴۸) کہ قاضی صاحبؒ فرمایا کہ

لہ قاضی صاحبؒ موصوف اپنے وقت کے متبحر اور وسیع المطالعہ محقق عالم تھے۔ نواب صدیق صاحبؒ

لکھتے ہیں کہ وہ القاضی، العلانہ، الابراء، الانور، الزکی، المنور اور عرۃ الاسلام تھے اور لکھتے ہیں کہ وہ کمال

عالم انسانی پر حاوی تھے۔ (اکبر ص ۹)

اگر ممکن ہو تو فاتحہ کو امام کے سکنت میں پڑھنے میں زیادہ احتیاط ہے۔ (نیل جلد ۲ صفحہ ۲۳) اور فرماتے ہیں کہ قرآن و سنت کے عمومی دلائل مقتدی پر استماع و انصات کو واجب قرار دیتے ہیں۔

حافظ ابو عمر بن عبد البر (یوسف بن عبد اللہ المتوفی ۳۶۳ھ) :

لکھتے ہیں کہ حضرت امام مالکؒ (وغیرہ) جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے امام کے پیچھے قرأت کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

و حجتہ قولہ تعالیٰ و اذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون لا خلاف انہ نزل فی ہذا المعنی دون غیرہ و معلوم انہ فی صلاۃ الجہر لان السراہ یسمع فدل علی انہ اراد الجہر خاصۃ۔ (بخاریۃ او جز المسائل جلد ۱ ص ۲۴۸)

اور ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ جب قرآن کریم کی قرأت ہو رہی ہو تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم ہو اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ اس آیت کا شان نزول صرف یہی ہے۔ نہ کہ کوئی اور۔ اور یہ ظاہر ہے کہ استماع تو صرف جہری نمازوں میں ہو سکتا ہے۔ لہذا اس آیت سے

فقط جہری نمازیں مراد ہوں گی نہ کہ سری۔

انشاء اللہ العزیز یہ بات تو اپنے مقام پر آئے گی کہ آیت میں صرف استماع کا لفظ ہی نہیں جو بقول ان کے محض جہری نمازوں کو شامل ہے (اور نیز استماع اور سماع میں بھی فرق ہے)۔ بلکہ اس میں انصات کا لفظ بھی ہے جو سری نمازوں کو بھی شامل ہے لیکن حافظ المغرب قرآن کریم کی مذکورہ آیت کا شان نزول نماز اور خلف الامام کا مسئلہ بتلاتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ پوری ذمہ داری اور وضاحت سے تحریر فرماتے ہیں کہ آیت مذکورہ کا شان نزول صرف نماز اور خلف الامام کا مسئلہ ہے اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف

نہ علامہ فہرستیؒ ان کو الامام، شیخ الاسلام اور حافظ المغرب لکھتے ہیں۔ (مذکرہ جلد ۳ صفحہ ۳۰۷) علامہ ابوالولید باجیؒ ان کو حافظ بل المغرب لکھتے ہیں (ایضاً صفحہ ۳۰۷) امام حمیدیؒ لکھتے ہیں کہ وہ فقیہ، حافظ کثیر التصنیف قرأت اور علم خلاف کے عالم اور علوم حدیث اور اسامہ الرجال کے مسلم امام تھے (ایضاً صفحہ ۳۰۷) غرضیکہ وہ حفظ اتقان میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ علامہ ابن حزمؒ لکھتے تھے کہ میں نے فقہ احمدؒ

پر ابن عبد البرؒ کی کتاب التہذیب کی مانند کوئی کتاب نہیں دیکھی چہ جائیکہ اس سے بہتر اور اعلیٰ اور کتاب الاستذکار اسی کا مختص ہے (مذکرہ جلد ۳ صفحہ ۳۰۷) حافظ ابن القیمؒ ان کو الامام الحافظ اور اپنے زمانہ میں امام اہل السنۃ لکھتے ہیں۔ (اجتماع المیموش الاسلامیہ صفحہ ۴۷)



نہیں ہے۔ انصاف شرط ہے کہ اس اجماع و اتفاق کے بعد اور کون سی تفسیر معتبر اور قابل اعتماد ہو سکتی ہے؟ جو حضرات صحابہ کرامؓ سے لے کر قاضی شوکانی صاحبؒ تک ہر دور، ہر طبقہ اور ہر مسلک کے فقہاء و محدثین، مؤرخین اور مفسرین کے ہاں طے شدہ حقیقت ہے۔

**شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ** (جن کے نام اور محاسن سے مقدمہ میں آپ اچھی طرح متعارف ہو چکے ہیں) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فالنزاع من الطرفين لكن الذين يبنون  
عن القراءة خلف الامام جمهور السلف  
والخلف ومعهم الكتاب والسنة الصحيحة  
والذين اوجبوها على المأمور فعد بشلهم  
ضعف الاثمة -

مسئلہ زیر بحث میں نزاع تو طرفین سے ہے لیکن جو لوگ امام کے پیچھے قرأت سے منع کرتے ہیں۔ وہ جمہور سلف و خلف ہیں اور ان کے ہاتھ میں کتاب اللہ اور سنت صحیحہ ہے اور جو لوگ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرآن کو واجب قرار دیتے ہیں۔ ان کی حدیث کو ائمہ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے۔

(تنوع العبادات ص ۸)

مطلب ظاہر ہے کہ منکرین قرأت خلف الامام صرف چند نفوس نہیں، بلکہ جمہور سلف و خلف ہیں اور یہ نظریہ جمہور نے اجتہاد اور قیاس ہی سے قائم نہیں کر لیا۔ بلکہ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے لیا ہے اور جو لوگ امام کے پیچھے قرأت تجویز کرتے ہیں۔ ان کا ہاتھ کتاب اللہ سے یکسر خالی ہے اور محض حدیث پر ان کے استدلال کی بنیاد قائم ہے اور حدیث بھی وہ ہے جس کی تضعیف ائمہ حدیث سے منقول ہے۔ (پوری تفصیل اپنے مقام پر آئے گی انشاء اللہ العزیز۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ

وقول الجمهور هو الصحيح فان  
سبحانه وتعالى قال واذا قرئ القرآن  
فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون  
قال احمد اجمع الناس على انها نزلت  
في الصلوة -

جمہور کا مسلک اور قول ہی صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب قرآن کریم پڑھا جائے تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ سب لوگوں کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ اس آیت کا شان نزول نماز ہے۔

شیخ الاسلام کی اس عبارت نے اس امر کی مزید تشریح کر دی ہے کہ آیت مذکورہ کا شان نزول ہی نماز ہے اور اس پر تمام اہل اسلام اور ائمہ دین کا یعنی حضرات صحابہ کرام و تابعین و اتباع تابعین اور جمہور سلف و خلف کا اجماع و اتفاق ہے۔ یہی شیخ الاسلام ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ

وذكر احمد بن حنبل الاجماع على  
انها نزلت في الصلوة وذكر الاجماع على  
انها لا تجب القراءة على المأموم حال الجهر  
امام احمد بن حنبل نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ یہ  
آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ نیز اس پر  
بھی اتفاق نقل کیا ہے کہ جب امام جہر سے قرآن کرتا ہو تو  
(فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۳۳) مقتدی پر قرأت واجب نہیں ہے۔

اور نواب صاحب اس آیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ  
واین آیت دلالت نمی کند مگر بر منع قرأت در حال جہر امام بقرات لقولہ فاستمعوا  
واستماع نمی باشد مگر از برائے قرأت مجبور بہانہ برائے قرأت مخافتت ... اھ  
(دلیل الطالب صفحہ ۲)

قارئین کرام! آپ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود سے لے کر قاضی شوکانیؒ اور نواب صاحب تک کی عبارات ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ اس مذکورہ آیت کا شان نزول صرف نماز ہے خطبہ (وغیرہ) عموم الفاظ کے لحاظ سے بالتبع اور ضمنی طور پر اس حکم میں شامل ہے۔ اور حافظ ابن عبدالبرؒ اور شیخ الاسلام سے یہ بھی سُن چکے ہیں کہ اس بات پر تمام اہل اسلام کا اجماع اور اتفاق ہے کہ اس کا شان نزول فقط نماز ہے۔ اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور اجماع کے نقل کرنے والے بھی امام اہل السنۃ اور مقتدائے ملت حضرت امام احمد بن حنبلؒ ہیں اور آپ یہ بھی سُن چکے ہیں کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرآن کرنا اجماع اور اتفاق کے سراسر خلاف ہے۔ اس تمام بحث کو پیش نظر رکھتے ہوئے فیرق شانی بے بنیاد دعاوی کو (جن کا ذکر سخن ہائے گفتنی میں ہو چکا ہے) دیکھیے کہ حق کس کے ساتھ ہے؟ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ کس کے ہاتھ میں ہے اور جمہور سلف و خلف کی معیت کس کو نصیب ہے؟



نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ

کوئی دعویٰ اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا۔ جب تک کتاب اللہ و سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور بتینہ عادلہ سے اس پر ثبوت نہ پیش کیا جائے۔ دلیل الطالب<sup>۳۹</sup> محمد اللہ تعالیٰ کہ قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد جمہور سلف و خلفؓ کی معیت بھی ہمیں حاصل ہے جو بھواتے حدیث کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی اور نہ ہوگی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس آیت کے سلسلہ میں فریق ثانی کی طرف سے قیداً و حدیثاً جو جو اعتراضات اور معارضات وارد کیے گئے ہیں ان پر بھی طائرانہ نگاہ ڈال لیں کہ ان کی حقیقت کیا ہے ان کو ایک خاص ترتیب سے ہم نقل کرتے ہیں اور ہر ایک کا جواب ساتھ ساتھ عرض کرتے جائیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

### پہلا اعتراض:

مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ علامہ زلیغیؒ نے ”فصل الرأیہ ص ۱۲۷“ میں امام بیہقیؒ کے حوالہ سے امام احمد بن حنبلؒ کا جو یہ قول نقل کیا ہے کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شان نزول جماع اور اتفاق سے نماز ہے تو مجھے اس اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے امام بیہقیؒ کی معرفت السنن و الآثار اور کتاب القراءة کا مطالعہ کیا ہے لیکن ان میں مجھے یہ قول نہیں مل سکا۔

(تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۶۵، تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۹ و ابکار المنن ص ۱)

### جواب:

مبارک پوری صاحبؒ کا یہ اعتراض چند وجوہ سے باطل ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ علامہ جمال الدین زلیغیؒ (المتوفی ۸۶۷ھ) نقل میں بڑے محتاط اور قصہ ہیں اور پھر انھوں نے امام بیہقیؒ کی کسی خاص کتاب کا نام بھی نہیں لیا۔ اور امام بیہقیؒ کثیر التصانیف تھے۔ لہذا مبارک پوری صاحبؒ کا ان کی صرف دو یا تین کتابیں دیکھ کر یہ نظریہ قائم کرنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے؟  
 ثانیاً۔ علامہ امام، الحافظ اور المجتہد تھے۔ مولانا عبدالحی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ من اعلام العلماء اور فقہ حدیث اور اسما الرجال کے مسلم امام تھے۔ قواعد البیہ ص ۲۲

وثانیاً۔ نواب صاحب نے تو جہو کیساتھ اس امر پر اتفاق کیا ہی تھا کہ عدم علم اؤ علم بعدم نیست۔ (بدورالابلہ ص ۳۷۹) مگر مبارک پوری صاحب کو بھی اس کا اقرار ہے کہ عدم نقل عدم وقوع کو مستلزم نہیں (تحقیق الکلام ص ۱۳) اگر مبارک پوری صاحب کو اس کا علم نہیں ہو سکا تو اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ یہ جملہ اور قول ہی کتابوں سے نکل کر بھاگ گیا ہے؟

وثالثاً۔ تنہا علامہ زبلیؒ ہی اس قول کے ناقل نہیں بلکہ علامہ موفق الدین ابن قدامہ (معنی جلد ۶ ص ۶۰۵) اور علامہ شمس الدین بن قدامہ (شرح مقنع للکبیر جلد ۲ ص ۱۱۵) اور حافظ ابن ہمام (فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۲۱) اور ملا علی القاری (شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۳) اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ (اپنے فتاویٰ میں جیسا کہ گزر چکا ہے) وغیرہ سب اس کو نقل کرتے ہیں۔ مبارک پوری صاحب کو ان کتابوں کی طرف مراجعت کرنی چاہیے تھی تاکہ علامہ زبلیؒ کے قول کی صداقت معلوم ہو جاتی۔  
ورابعاً۔ لیجیے ہم مبارک پوری صاحب کے ہم مسلک اور ہم مشرب عالم سے یہ منوا دیتے ہیں مولانا عبد الصمد صاحب پشاورؒ کی غیر مقلد نقل کرتے ہیں کہ

والاصح كونها في الصلوة لما روى  
البیهقی عن الامام احمد قال اجمعوا  
على انها في الصلوة۔  
صحيح ترین بات یہ ہے کہ آیت واذا قرع القرآن  
کاشان نزول ہی نماز ہے جیسا کہ امام بیہقیؒ نے امام احمد  
سے نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نماز کے بارے میں نازل  
(اعلام الاعلام في قراءة خلف الامام من) ہونے پر اجماع و اتفاق ہے۔

لہ بعض ائمہ نے حدیث قلین کی تصحیح کی نسبت امام طحاویؒ کی طرف کی تھی۔ مولانا شوق نیوی نے لکھا کہ مجھے شرح معانی الآثار میں تصحیح نہیں مل سکی۔ اس پر مبارک پوری صاحب یوں گرفت کرتے ہیں کہ تصحیح کی نسبت کرنے والوں نے امام طحاویؒ کی کسی خاص کتاب کا نام نہیں لیا۔ لہذا نیوی صاحب کو ان کی دوسری کتابیں دیکھنی چاہیے تھیں۔ (نہ معلوم یہ مفید مشورہ یہاں کیوں بھول گئے ہیں۔) مگر کیا جانے: حج تمہیں عادت ہے بھول جانے کی۔

۱۔ المتوفی ۷۸۲ھ جو الامام الفقیہ الزہد الخطیب اور قاضی القضاة تھے۔ (مقدمہ معنی ص ۱۲)

۲۔ المتوفی ۸۶۱ھ اپنے وقت کے امام محدث اور فقیہ تھے اور ان کا شمار اہل ترجیح میں ہے۔ (فتاویٰ البیہقی ص ۱۸۰)

۳۔ المتوفی ۱۲۱ھ علم و تحقیق کے یگانہ اور محدث و فقیہ تھے۔ (تعلیقات ص ۸)



نوٹ: یہ کتاب نواب صاحب کی مشہور کتاب "لقطۃ العجلون" کے ساتھ منضم ہے۔  
اور دونوں کچا طبع ہوئی ہیں۔ اس سے بڑھ کر ہم مبارک پوری صاحب کو اور کیا ثبوت دے سکتے

ہیں؟

## دوسرا اعتراض

مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ اس آیت کا خطاب مومنوں کو نہیں بلکہ کافروں کو ہے۔ جو تبلیغ کے وقت شور و غل مچایا کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ قرآن نہ سنو جیسا کہ امام رازمی نے اپنی تفسیر (الکبیر جلد ۴ ص ۵۰۲) میں لکھا ہے اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ اگر واقعی خطاب مومنوں کو ہوتا تو لَعَلَّکُمْ کے لفظ کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ یہ لفظ ترجمی کے لیے آتا ہے اور مومن بہر حال رحمت خداوندی کا مورد اور مستحق ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۷ و تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۹) اور مولانا امیر صاحب لکھتے ہیں اور نہ اس کا خطاب مومنوں سے ہے جس نے اس کا خطاب مومنوں سے سمجھا اس نے سلسلۂ عبارت اور سیاق مضمون پر غور نہیں کیا۔ (تفسیر واضح البیان ص ۵۰۲) اور یہی مضمون کم و بیش مولانا عبد الصمد صاحب پشاور می لکھتے ہیں۔ (اعلام الاعلام ص ۱۹۰) اور یہی عذر رنگ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۳۳۳)

## جواب

یہ اعتراض بھی بالکل بے جان اور بے بنیاد ہے۔ اس لیے کہ آپ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت ابن مسعودؓ سے لے کر قاضی شوکانیؒ تک اکثر حضرات مفسرین کا بلکہ تمام امت کا اجماع و اتفاق سن چکے ہیں کہ اس آیت کا خطاب نہ صرف مومنوں سے ہے بلکہ اس کا شان نزول ہی نماز ہے۔ اس اجماع کے مقابلہ میں ایسے لغو اور پادرہوا نظریہ اور رائے کو کون سنتا ہے؟ ہم سہولت کے لیے اس اعتراض کا یوں تجزیہ کر سکتے ہیں یہ تجزیہ اس لیے ضروری ہے کہ بات سمجھ آ سکے، کہ ان حضرات کے اعتراض کے یا بزعم خود استدلال کے تین مرکزی نقطے ہیں۔ ہم ان کو الگ الگ بیان کر کے ان کا جائزہ لیتے ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ یہ آیت کافروں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ مومن اس کے مخاطب

نہیں ہیں۔ دلائل یہ ہیں :

۱۔ امام رازیؒ نے یوں کہا ہے۔

۲۔ لَعَلَّکُمْ کا لفظ اس کی تائید کرتا ہے۔

۳۔ سیاق و سباق کا تقاضا یہی ہے۔

### پہلی جزو کا جواب

یہ ٹھیک ہے کہ حضرت امام رازیؒ (المتوفی ۴۱۰ھ) منطق و فلسفہ اور عقلیات وغیرہ کے مسلم امام تھے۔ لیکن قرین روایت اور نقلیات میں ان کا پایہ نہایت کمزور تھا۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں امام رازیؒ عقلیات کے مسلم امام ہیں، لیکن احادیث و آثار میں ان کا پایہ کمزور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیر میں رطب و یابس سبھی کچھ موجود ہے۔ (لسان المیزان جلد ۴ ص ۲۶۶) امام سیوطیؒ نقل کرتے ہیں کہ تفسیر کبیر میں سبھی کچھ ہے مگر اس میں تفسیر نہیں۔ (در منثور جلد ۳ ص ۱۵۵) اتقان جلد ۲ ص ۱۸۹۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ مؤلف نے از علم حدیث بے خبر است و در علوم کلام و فنون رسمیه امام اہل زمان بعضی از اہل معرفت بعلم کتاب و سنت گفتہ اند۔ فیہ کل شیء الا التفسیر۔ (اکسیر ص ۱۲۱)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ رازیؒ از علم حدیث خبر ندارد (اکسیر ص ۱۲۱) فریق ثانی ہی از راہ انصاف فرماتے کہ قرآن کریم کی مذکورہ آیت کی تفسیر جو حضرات صحابہ کرام رض و تابعینؒ اور جمہور سلف و خلفؒ سے صحیح اسانید سے نقل کی جا چکی ہے (بلکہ اسی پر امت کا اجماع ہے اور کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے) وہ قابلِ محبت ہے یا امام رازیؒ کی تفسیر :۔

من نہ گویم کہ ایں مکن آں کن !

مصلحت بہین و کار آساں کن !

### دوسری جزو کا جواب

امام رازیؒ کا لفظ لَعَلَّ سے یہ استدلال کرنا کتنی وجہ سے غلط ہے :  
اولاً، لفظ لَعَلَّ اگرچہ ترجمی کے معنی میں ہے۔ لیکن حضرات مفسرین کرامؒ اور ائمہ نحاس



امر کی تصریح کرتے ہیں کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وجوہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے، علامہ خازنؒ لکھتے ہیں: لَعَلَّ وَعَسَىٰ مِنْ اِلٰهٍ وَاٰجِب (جلد ۲ ص ۲۲۳) اور صاحب مدارک علامہ عبد اللہ بن احمد النسفیؒ (المتوفی ۳۸۵ھ) لکھتے ہیں کہ

ولعل للترجي والاحتماع ولكن من  
كثير فيجري مجري وعده المحتوم  
وفائه وبه قال سيويہ -  
آتا ہے۔ لیکن ذات باری سے یحتمی اور ضروری وعدہ  
کے طور پر آتا ہے اور سیویہؒ اسی کا قائل ہے۔

(مدارك جلد ۱ ص ۸۷)

علامہ جارا اللہؒ لکھتے ہیں کہ بادشاہوں کی عادت ہے کہ جب کسی چیز کا وعدہ کرتے ہیں تو اپنی شان استغنا کو ملحوظ رکھ کر لَعَلَّ وَعَسَىٰ استعمال کرتے ہیں۔ (کشاف جلد ۱ ص ۹۲)  
اور مولانا تھانویؒ (المتوفی ۱۳۴۳ھ) لکھتے ہیں: شاہی محاورہ میں لَعَلَّ کے معنی عجب نہیں کے آتے ہیں۔ (بیان القرآن جلد ۱ ص ۱۸۱) لہذا اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی شان بے نیازی کے مطابق لَعَلَّ کے لفظ کے ساتھ مومنوں سے خطاب کیا ہے تو اس میں خرابی کیا ہے؟  
ثانیاً۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مومنوں کے لیے لَعَلَّ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ نہ معلوم وہاں یہ منطق کیسے چلے گی؟ ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے لَعَلَّ تَتَّقُونَ۔ (پ۔ بقرة) تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

اور ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ رجوع کرو اللہ تعالیٰ کی طرف اے مومنو سب کے سب لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ۔ (پ۔ فود ۴) تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اور اس آیت میں خطاب بھی تمام مومنوں کو ہے جب مومن ہیں تو ان کی کامیابی یقینی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ۔ (پ۔ المؤمنون رکوع ۱) تحقیق مومن فلاح پا چکے ہیں۔ اگر لَعَلَّکم کے خطاب سے مومن مراد نہیں ہو سکتے تو قرآن کریم کی ان آیات کا کیا مطلب ہوگا؟

اور ایک مقام پر یہ فرمایا ہے کہ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان کہی جائے تو تم جلدی پہنچو۔ آگے ارشاد ہوتا ہے لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ۔ (پ جمعہ) تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

وَقَالَتْ: اگریہ تسلیم کر بھی لیا جائے تو کیا قرآن کریم اور صحیح احادیث میں اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ بعض مومن اپنی ناشائستہ حرکات کی بنا پر خدا تعالیٰ کی رحمت کے مستحق نہیں رہتے؟ کیا قاتل، چور، شرابی، زانی، راشی اور سود خور وغیرہ کے لیے لعنت اور غضب و عجزہ کے الفاظ قرآن کریم اور حدیث میں وارد نہیں ہوئے؟ اور کیا وہ خدا تعالیٰ کی رحمت کے حق دار اور محتاج نہیں؟ یا ان کے لیے یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی رحمت کے دروازے کھلے اور رحمت واجب ہے؟ اور کیا رحمت کا مستحق صرف کافر ہی ہو سکتا ہے؟

دیکھا۔ تمام علمائے اسلام کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ قرآن کریم تمام اقوام عالم کے لیے ایک ستارہ العمل اور ضابطہ حیات ہے اور قرآن کے کسی حکم اور آیت کو اس کے شان نزول اور خاص سبب پر منحصر کر دینا بالکل بے کار اور بے حقیقت ہے۔ اگرچہ اکثر احکام کے نزول کا کوئی نہ کوئی سبب اپنی جگہ ضرور ہوگا۔ حضرت امام شافعیؒ لکھتے ہیں کہ آیات کے اسباب و شان نزول کچھ ہی ہوں۔ مگر احکام کی دار و مدار الفاظ پر ہے۔ (کتاب الاثم جلد ۵ ص ۲۴۱)

حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ قرآن کریم کے عمومی احکام کو اسباب نزول پر مقید کر دینا باطل ہے۔ (الصارم المسلول ص ۵۰) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ جہور علماء اصول و فروع کے نزدیک اعتبار عموم لفظ کا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۹) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ جن اسباب کی وجہ سے عبادات کی مشروعیت ہوتی ہے۔ ان کا دوام شرط نہیں ہے، جیسا کہ طواف میں رمل اور صفا و مروہ پر سعی کا سبب مشرکین کا اعتراض تھا، لیکن باوجود ان مشرکوں کے ختم ہونے کے اس کا حکم قیامت تک باقی رہے گا۔ (بدائع الفوائد جلد ۳ ص ۱۹) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص مورد کا (فتح الباری جلد ۸ ص ۱۲۱) امام سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ اعتبار تعمیم الفاظ کا ہوگا نہ کہ خصوص سبب کا (التقان جلد ۱ ص ۷۴) قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ عام کو سبب پر بند کر دینا مرجوح اور کمزور مذہب ہے۔ (نیل الاوطار جلد ۲ ص ۱۲۹)

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ خصوص سبب کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا بلکہ اعتبار عموم لفظ کا ہوگا۔ (دلیل الطالب ص ۴۱۳) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: و عبرت



بعموم لفظ است نہ بخصوص سبب، چنانکہ در اصول متقرر است (بدور الاولہ ص ۲۰۹)  
مولانا عبدالصمد پشاوری لکھتے ہیں کہ والحق ان المقدور اعتبار عموم المبنی و

لوخص سببہ (۱ علوم الاعلام ص ۱۹۰) اور اس قاعدہ کو مبارک پوری صاحب بھی  
صاف لفظوں میں تسلیم کرتے ہیں (دیکھئے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۳) مؤلف خیر الکلام  
نے پہلے تو لا جواب ہو کر ادھر ادھر کی بے کار باتیں کی ہیں پھر اقرار پر بھی مجبور ہو گئے ہیں۔  
چنانچہ لکھتے ہیں کہ یہ آیت نماز کو بھی شامل ہے خواہ اس طرح شامل ہو کہ اس آیت میں  
مقتدیوں کو خطاب ہو یا سب مسلمانوں کو جس میں مقتدی بھی داخل ہیں یا اس طرح شامل ہو کہ  
خطاب تو کفار کو ہو مگر نمازی اور سب مسلمان عموم علت کی بنا پر داخل ہوں۔ (۱۱ ص ۳۲۸)  
اگر بالفرض آیت مذکورہ کا شان نزول صحیح روایات اور آثار سے نماز نہ بھی ثابت ہوتا۔ بلکہ  
یہ آیت کافروں کے حق میں ہی نازل ہوتی۔ تب بھی اس کو کافروں پر منحصر سمجھنا اور مسلمانوں  
اور مومنوں کو اس سے خارج کر دینا باطل ہے۔ حالانکہ اس کا شان نزول ہی (مومن اور)  
نماز ہے۔ مگر افسوس ہے کہ فریق ثانی یہ کہتا ہے کہ اس آیت کا جو اولین سبب اور  
مصدق تھا۔ اس کو یہ آیت شامل نہیں ہے۔ یہ تو صرف کافروں کو شامل ہے۔ حیرت  
اور تعجب ہے اس غلط نظریہ پر۔

وخاصاً۔ اگر فریق ثانی کی یہی منطق صحیح تسلیم کر لی جائے تو نہ معلوم ان کا قرآن کریم  
کے ان عمومی احکام کے بارے میں کیا ارشاد ہو گا جو بظاہر ایک کافر اور مشرک قوم کے  
بارے میں نازل ہوئے تھے۔ مثلاً ایک مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے نبی آپ  
ان کافروں سے کہہ دیجیے کہ آؤ میں تمہیں وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں، جو تمہارے رب نے تم  
پر حرام کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ قتل اولاد کا ارتکاب نہ کرو۔  
فواحشات کے قریب نہ جاؤ۔ خون ناحق نہ کرو۔ یتیم کا مال نہ کھاؤ وغیرہ وغیرہ۔ (پارہ ۸،  
سورۃ انعام) کیا یہ کہنا سجا اور صحیح ہو گا کہ یہ احکام تو کافروں اور مشرکوں کے حق میں نازل  
ہوئے ہیں۔ لہذا مومن کے لیے شرک کرنا، قتل کرنا اور یتیم کا مال ہرپ کر لینا بالکل جائز  
ہے؟ فریق ثانی نے یہ عجیب قاعدہ نکالا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ فرما دیں کہ ہم تو گروہ بندی کا

شکار ہو کر قاعدہ سے بے نیاز نہیں ہے

کس طرح فریاد کرتے ہیں تباہ و قاعدہ اے اسیرانِ قفس میں تو گرفتار نہیں ہیں

### تیسری جزو کا جواب

ہو سکتا ہے کہ تیسرے صاحب کا سیاق و سباق کے بارے میں قاعدہ ہی کو قی نرالا اور ماوراء الادراک ہو اور ہم اس کو نہ سمجھ سکیں۔ لیکن بھلا اللہ تعالیٰ اس آیت کا سیاق اور سباق ہم بیان کر سکتے ہیں اور تیسرے صاحب کو فکر و غور کی دعوت دیتے ہیں اور مخلصانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ ارشاد فرمائیں کہ غور کس نے نہیں کیا؟

اہل ایمان کے تین درجے ہو سکتے ہیں۔ اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ۔ جو لوگ توحید و معرفت کے تمام زینوں کو طے کر کے اس مقام پر فائز ہو جاتے ہیں کہ کارخانہ زمین و آسمان کی علوی اور سفلی چیزیں مشاہدہ کے طور پر ان کے سامنے آجاتی ہیں اور وہ عین الیقین تک پہنچ جاتے ہیں تو ایسے لوگ اصحاب بصیرت کہلاتے ہیں اور جو لوگ نظر و استدلال سے کسی حقیقت تک پہنچنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور وہ علم الیقین کے درجہ تک پہنچ کر خود ان کا قدم ہدایت سے ایک انچ نہیں ہٹتا اور لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنتے ہیں تو وہ ہادی اور ہدی کہلاتے ہیں اور جن کو نہ پہلا درجہ حاصل ہوتا ہے اور نہ دوسرا، صرف یہی جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے وہ گروہ عامۃ المؤمنین کا ہے، جن کو حق الیقین کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق رحمت کے امیدوار ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ

هٰذَا ابْصَارُ مَنْ رَّبِّكُمْ وَهٰذِي وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ وَلَمَّا أَقْرَأُوا الْقُرْآنَ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصَتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔  
یہ سمجھ کی باتیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو مومن ہیں اور جس وقت قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگا رہو اور چپ رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔ (پ ۹، اعراف ۲۳)

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے تین طبقوں کی خوبیوں کو علی الترتیب ہذا ابصار من ربکم و ہذی ورحمۃ کے ارشاد سے بیان فرما کر لقوم یؤمنون کہہ کر سب کو مومن کا خطاب



اور لقب عطا فرمایا ہے اور آگے قرآن کریم کی طرف توجہ کرنے اور خاموش رہنے کا حکم دیا ہے۔  
 اس سے زیادہ صحیح اور مضبوط ربط اور کیا ہو سکتا ہے کہ پہلی آیت لقوم یؤمنون  
 پر ختم ہوتی ہے اور دوسری واذا قرئ القرآن الایۃ سے شروع ہوتی ہے۔ پہلی آیت میں  
 مومنوں کے تین طبقوں کی خوبیوں کا ذکر ہوتا ہے اور دوسری آیت میں بصیرت، ہدایت اور  
 رحمت کے سرچشمے قرآن کریم کا ذکر ہوتا ہے۔ پہلی آیت میں اللہ کی رحمت کا ذکر ہے اور دوسری  
 میں لعلمکم ترجموں سے مستحقین رحمت کا تذکرہ ہے۔ اس سے بڑھ کر اس مضمون کا اپنے سیاق  
 سابق سے اور کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اور تمام اہل اسلام اور جملہ معتبر مفسرین کرام اس کا یہی ربط  
 اور تعلق سمجھے ہیں۔ خوف طوالت سے صرف دو شہادتیں ہی نقل کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

علامہ خازنؒ لکھتے ہیں کہ

واذا قرئ علیکم ایہا المؤمنون القرآن  
 فاستمعوا لہ یعنی اصغوا لہ باسما عکم  
 لتفہموا معانیہ وتتدبروا مواظلوہ وانصتوا  
 یعنی عند قراءتہ۔  
 اے مومنو! جب تم پر قرآن کریم پڑھا جائے تو  
 تم اس کی طرف توجہ کرو یعنی بگوش ہوو اس کی  
 طرف مائل ہو جاؤ تاکہ تم اس کے معانی سمجھو اور اس کی  
 نصائح سے تدبر اور غور کر کے فائدہ حاصل کرو اور

(تفسیر خازن جلد ۲ ص ۲۸۷)

اور حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ کافر لوگ قرأت قرآن کے وقت شور و غل مچا کر تے تھے۔  
 وقد امر اللہ عبادہ المؤمنون  
 بخلاف ذلك فقال واذا قرئ القرآن فاستمعوا  
 لہ وانصتوا لعلمکم ترجموں (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۸۹)  
 لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو اس کے  
 خلاف حکم دیا ہے کہ جب قرآن کریم پڑھا جاتا ہو تو تم  
 اس کو سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔

اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام مومنوں کے سردار سید الانبیاء و امام المرسلین و خاتم  
 النبیین حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خطاب کیا ہے کہ آپ اپنے رب کو دل میں عاجزی  
 اور زاری کرتے ہوئے صبح و شام یاد کرتے رہیں گو خطاب آپ کو ہے لیکن گفتہ آید در حدیث  
 دیگران کے قاعدہ کے مطابق حکم سب کو دیا گیا ہے۔

بہر حال اس آیت سے قبل بھی مومنوں کا ذکر ہے اور بعد بھی اکمل ترین مومن سے خطاب

ہے۔ میر صاحب کو اس سے بہتر سیاق و سباق کہاں سے ملیگا مگر ہاں یہ بات الگ ہے کہ  
لاہسلم کا کوئی جواب نہیں ہے۔ بفضلہ تعالیٰ ہم نے توحق و فاداکر دیا ہے شاید آپ  
فرماویں۔

پلک کر کہہ رہا ہے جانے کیا کیا تیرے گوشے میں  
عجب انداز ہے اس کا یہ کوئی دل جلا ہوگا۔

تیسرا اعتراض؛

مبارک پوری صاحب (وغیرہ) لکھتے ہیں کہ اس آیت کا شان نزول خطبہ ہے جیسا کہ امام  
بیہقی نے (کتاب القراءۃ ص ۷۵ میں) لکھا ہے۔ لہذا اس آیت سے قرأت خلف الامام کے  
عدم جو اثر پر استدلال صحیح نہیں ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۲۵)

جواب

یہ اعتراض بھی بے حقیقت اور بے کار ہے؛ اولاً: اس لیے کہ دلائل اور براہین سے  
یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس آیت کا شان نزول ہی نماز ہے خطبہ وغیرہ اس کے عمومی اور  
ضمنی حکم میں شامل ہے۔

وثانیاً۔ خطبہ سے اگر جمعہ کا خطبہ مراد ہو تو امام بغوی کے حوالہ سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ  
جمعہ کی فرضیت مدینہ میں ہوتی ہے اور آیت مکی ہے۔ اور امام ابن جریر لکھتے ہیں کہ جمعہ کی فرضیت  
ساحلہ میں ہوتی ہے حالانکہ آیت مذکورہ بالاتفاق مکی ہے اور مولانا عبدالصمد لکھتے ہیں کہ جو لوگ  
اس آیت کا شان نزول خطبہ بتلاتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور خطبہ کا  
حکم مدینہ میں ہوا ہے۔ (اعلام الاعلام ص ۱۸۹) اور اگر خطبہ سے مراد عید کا خطبہ ہے تو وہ بھی صحیح  
نہیں کیونکہ عید کی نماز کا حکم بھی مدینہ طیبہ میں ہوا تھا۔ (طبری ص ۱۲۸۱)

وثالثاً۔ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس آیت کا شان نزول جمعہ یا عید کا خطبہ ہے  
تو اس سے نماز کو بالیقین خارج کرنا کیونکہ صحیح ہو سکتا ہے؛ جب کہ امت کا ایک معتد بہ طبقہ  
اس کا قائل ہے کہ اسباب نزول میں تعدد بھی جائز ہے جیسا کہ شیخ عبدالرحمن بن حسن نے اس  
کی تصریح کی ہے۔ (فتح المجید شرح کتاب التوحید ص ۱۵)



اور صحیح احادیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ لہذا اگر اس کا شان نزول خطبہ بھی ہو اور نماز بھی ہو تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اور یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہو گا نہ کہ خصوص سبب کا۔ الحاصل یہ اعتراض نقلاً و عقلاً ہر لحاظ سے مردود ہے اور ایک بھی صحیح روایت اس کی تائید نہیں کرتی کہ آیت مذکورہ کا شان نزول خطبہ ہے۔ روایات پر بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ رہی یہ بات کہ یہ نظریہ امام بیہقیؒ ایسے مشہور امام کا ہے تو یہ کوئی وزنی دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ مبارکپوری صاحبؒ ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں کہ امام بیہقیؒ اگرچہ ایک مشہور محدث ہیں۔ مگر ان کا کوئی قول بلا دلیل معتبر نہیں ہو سکتا۔ (بلفظہ تحقیق الکلام جلد ۲، ص ۳۲)

مثلاً بخاری جلد ۲ ص ۶۸۶ و مسلم جلد ۱ ص ۱۸۳ و ابوعوانہ جلد ۲ ص ۱۶۳ و نسائی جلد ۱ ص ۱۱۴ اور مسند احمد جلد ۱ ص ۲۱۵ وغیرہ میں آیت لا تجهر بصلواتك ولا تخافت بها... الایۃ کا شان نزول نمازیان کیا گیا ہے۔ اور بخاری جلد ۲ ص ۶۸۶ و مسلم جلد ۱ ص ۱۸۳ و ابوعوانہ جلد ۲ ص ۱۶۳ میں اسی آیت کا شان نزول دعا بتلائی گئی ہے اور محققین کی تصریح ہے کہ یہ تعدد اسباب نزول کا واضح ثبوت ہے۔

**فائدہ:** یہ تو آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ آیت مذکورہ کا صحیح اور حقیقی شان نزول نماز اور صرف نماز ہے۔ اور جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس آیت کا شان نزول خطبہ ہے تو وہ صرف اس مفہوم کے اعتبار سے کہ اس آیت کا مضمون عموم الفاظ کے لحاظ سے خطبہ کو بھی شامل ہے۔ گویا یہ بھی اس کا شان نزول ہے۔ چنانچہ امام سیوطیؒ (تفسیر اتقان جلد ۱ ص ۳۱) اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ (الفوز الکبیر ص ۲۲ میں) اور نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: ”وَقَسَمْتُ أَنْتَ كَمَا مَعْنَى آيَتِ خُودَ قَامَ اسْتِ بَغِيرِ احْتِیَاجِ دَلَسْتَنَ حَادِثَہُ كَمَا سَبَبِ نَزُولِ شَدَہُ اسْتِ وَ حَكَمِ عُمُومِ لَفْظِ رَاسْتِ نہ خصوص سبب را قدامتے مفسرین بقصد احاطہ ثانیاً مناسبہاں آیت یا بقصد بیان ماصدق آن عموم آن قصہ را ذکر کردہ اند این قسم را ذکر کردن ضروریست۔ و صحابہ و تابعین بسیار بود کہ نزالت فی کذا و کذا می گفتند و غرض ایشان تصویر یا مصادق آن آیت بود و ذکر بعض حوادث کہ آیت آن را بعموم خود شامل شدہ است خواہ این قصہ متقدم باشد یا متاخر و خواہ اسرا باشد..... یا جاہلی یا اسلامی تمام قیود آیت را در گرفتہ باشد یا بعض آن را و این جادانستہ شد کہ اجتہاد را درین قسم دخلیست و قصص متعدده را آن جا گنجایش پس ہر کہ این بحث مستحضر دار دخل مختلفات سبب نزول با دنی عنایت میتوان نمود۔ (اکسیر ص ۱۹) بہر حال شان نزول اس واقعہ میں گونا گونا ہے لیکن خطبہ بھی ماصدق آن آیت کا مصادیق ہے۔

## چوتھا اعتراض

مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ آیت واذقہ القرآن... الاذیۃ قرآن کریم کی دوسری آیت فاقروا ماتیسر من القرآن... الاذیۃ سے منسوخ ہے۔ لہذا اس سے مسئلہ خلف الامام کیسے ثابت ہوگا اور اس دعویٰ کے دلائل یہ ہیں:

- ۱۔ امام ابو نصر مروریؒ (المتوفی ۲۹۳ھ) لکھتے ہیں کہ آیت فاقروا... الاذیۃ مدینہ میں نازل ہوئی ہے کیونکہ اس آیت میں جہاد اور قتال کا حکم ہے اور جہاد کی فرضیت مدینہ میں ہوئی ہے۔ (قیام القیل)
- ۲۔ امام سیوطیؒ نقل کرتے ہیں کہ باقی تمام سورۃ منزل مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے۔ مگر فاقروا اما تیسر... الاذیۃ (تفسیر اتقان جلد ۱ ص ۱۳)

- ۳۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ مدینہ طیبہ میں فرض ہوئی ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ روزے بالاتفاق مدینہ فرض ہوئے ہیں اور حضرت قیسؒ رضی اللہ عنہ سعد فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی فرضیت سے قبل ہمیں صدقہ فطر ادا کرنے کا حکم تھا۔ جب زکوٰۃ فرض ہوئی تو نہ ہمیں فطرانہ ادا کرنے کا تاکید دی گئی اور اور نہ اس سے منع کیا گیا۔ (فتح الباری جلد ۴ ص ۱۱) اور اس آیت فاقروا ماتیسر... الاذیۃ میں زکوٰۃ کا حکم بھی ہے۔ اور زکوٰۃ صدقہ فطر کے بعد فرض ہوئی اور صدقہ فطر صوم رمضان کا تہہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت فاقروا ماتیسر... الاذیۃ مدنی ہے۔ لہذا یہ ناسخ اور آیت واذقہ قرہ القرآن... الاذیۃ منسوخ ٹھہری اور منسوخ آیت سے استدلال اور احتجاج باطل ہے۔ (اوکما قال تحقیق الکلام ۲ ص ۳۶)

جواب: یہ دعویٰ بھی قطعاً باطل اور بے بنیاد ہے۔ ترتیب وار ہر ایک شق کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی شق کا جواب: حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ امام ابو نصرؒ کا یہ دعویٰ غلط ہے۔ اس لیے کہ تمام اہل اسلام اس پر متفق ہیں کہ سورۃ منزل کی آخری آیت بھی مکہ ہے۔ امام ابو نصرؒ کو قتال اور جہاد کے حکم سے جو شبہ ہوا ہے۔ وہ مردود ہے۔ کیونکہ اس میں ارشاد یوں ہوتا ہے۔

۱۔ ان کی یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۲۶۹، ابن ماجہ ص ۱۳۲، طحاوی ص ۱۶۸ اور مستدرک جلد ۱ ص ۱۷۸ وغیرہ میں مروی ہے۔



عَلِمَ أَنَّ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَرْضَىٰ وَآخَرُونَ  
يَضُرُّونَ فِي الْأَرْضِ ... الآية  
اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ عنقریب تم میں بعض آدمی  
بیمار ہوں گے اور بعض دیگر اللہ تعالیٰ کے راستہ میں  
نکلیں گے۔

اور بیماری و سفر میں پابندی کے ساتھ تہجد کی نماز ادا نہیں ہو سکے گی۔ اس کی تاکید اللہ تعالیٰ  
نے ساقط کر دی ہے اور اس آیت میں سَيَكُونُ (حرف سین جو استقبال کے لیے آتا ہے) سے  
خوشخبری سن کر وجود مشقت سے پہلے ہی تہجد کی نماز کی فرضیت ساقط کر دی گئی ہے۔ اس سے  
یہ کیونکر ثابت ہوا کہ جہاد اور قتال کا حکم اس وقت نازل ہو چکا تھا کہ بہر حال آیت مکہ مکرمہ میں  
نازل ہوتی ہے اور اس میں زمانہ مستقبل میں جہاد اور قتال کے حکم کی خوشخبری سنائی گئی ہے اگر  
امام ابو نصر سیکون میں حرف سین پر ہی نگاہ ڈال لیتے جو استقبال کے لیے آتا ہے تو ایسی فاش غلطی  
کا ارتکاب نہ کرتے اور نہ اس آیت کو مدنی کہنے پر مجبور ہوتے۔ (فتح الباری جلد ۱ ص ۳۹۳)

دوسری شق کا جواب: امام سیوطی نے یہ قول نقل کیا ہے لیکن پورے زور کے ساتھ اس کی تردید  
بھی کی ہے اور لکھتے ہیں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سورہ منزل کی آخری آیت مدینہ میں نازل ہوئی  
ہے تو وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سورہ منزل  
کا آخری حصہ پہلے حصہ کے نزول کے پورے ایک سال بعد نازل ہوا ہے۔ (تفسیر اتقان جلد ۸ ص ۳۸)  
اور سورہ منزل قرآن کریم کی ابتدائی سورتوں میں سے ایک ہے۔ چنانچہ مبارک پوری صاحب لکھتے  
سب سے پہلے سورہ قلم نازل ہوئی اور اس کے بعد سورہ منزل۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۸)

۱۷ اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ وجود مشقت سے قبل تنسیخ صحیح نہیں یا اس میں تردد ہو تو اس کو معراج کی وہ  
طویل حدیث پڑھنی چاہیے جس میں پچاس نمازوں کی فرضیت کے بعد وجود مشقت سے قبل ہی باقی سب  
نمازیں معاف کر کے صرف پانچ ہی باقی رکھی گئیں ہیں۔

۱۸ ان کی یہ روایت مسلم جلد ۱ ص ۲۵۶، نسائی جلد ۱ ص ۱۸۲، ابوعوانہ جلد ۲ ص ۳۲۲ اور مستدرک  
جلد ۵ ص ۵۵ وغیرہ میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے اور اسی مضمون کی روایت حضرت ابن عباس سے  
بھی مروی ہے۔ مستدرک جلد ۲ ص ۵۰۵ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۵۰۵۔ الغرض یہ صحیح روایتیں ابن عمر سے  
کی اس روایت سے جس میں یونس بن حبیب وغیرہ راوی موجود ہیں جن کا اتنا پتہ کتبہ حال سے نہیں ملتا۔ بدرجاء  
زیادہ قابل اعتماد ہیں۔

جب صحیح روایت سے یہ ثابت ہو گیا کہ سورۃ منزل من وعن سب مکی ہے تو اس کو مدنی کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے ؟

تیسری شق کا جواب : یہ دعویٰ کہ ناکہ زکوٰۃ کی فرضیت مدینہ میں ہوئی صحیح نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ نفس زکوٰۃ کا حکم مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکا تھا۔ کیونکہ سورۃ مومن، سورۃ جم سجدہ اور سورۃ لقمان وغیرہ تمام مکی سورتوں میں زکوٰۃ کا حکم موجود ہے پھر یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ زکوٰۃ مکہ میں نہیں ہوئی تھی۔ باقی یٰؤقون الزکوٰۃ کو تزکیۃ نفس پر حمل کرنا ویل بعید اور توجیہ رکیک کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور حضرت جعفر طیارؓ نے دربار نجاشی میں جو تقریر کی تھی اس میں زکوٰۃ کا ذکر موجود ہے حالانکہ مہاجرین حبشہ شہ نبوت میں ہجرت کر گئے تھے۔ (طبری ص ۱۱۱۸، زاد المعاد جلد ۲ ص ۶۱)

امام الانعم ابن خزیمہ المتوفی ۳۱۱ھ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ مکہ مکرمہ میں فرض ہو چکی تھی۔ (فتح الباری ۳/۳۱۱) امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ مکہ میں فرض ہو چکی تھی۔ (تفسیر کبیر جلد ۴ ص ۲۳۵) سید آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ اکثر علما کی تحقیق یہ ہے کہ زکوٰۃ مکہ میں فرض ہو چکی تھی۔ (روح المعانی جلد ۱۹ ص ۱۸۱) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ سورۃ منزل کی آخری آیت ان لوگوں کی تائید کرتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نفس زکوٰۃ تو مکہ میں فرض ہو چکی تھی لیکن اس کے نصاب اور مقدار کی تعیین مدینہ طیبہ میں ہوئی ہے۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۲۳۹)

حضرت ابن عمرؓ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار اور تعیین نصاب سے پہلے اپنی ضرورت سے زائد سب مال صرف کر دینے کا حکم تھا۔ (فتح الباری جلد ۳ ص ۲۱۶) اس تحقیق کو پیش نظر رکھنے کے بعد حضرت قیس بن سعد کی روایت کا مطلب یہ ہو گا کہ زکوٰۃ کے نصاب اور مقدار کی تعیین سے قبل صدقہ فطر کی اس لیے تاکید کی جاتی تھی تاکہ فقراء اور مساکین کی امداد اور اعانت لے یہ روایت ابوداؤد جلد ۱ میں مختصراً اور مسند احمد جلد ۵ ص ۲۹۱ اور مستدرک جلد ۲ ص ۳۱۰ وغیرہ میں مفصلاً موجود ہے۔ قال الحاكم والذہبی علی شرطہما۔

لے یہ بات بھی نہ بھولیے کہ صحابہ کرامؓ کی مکی زندگی اور مدینہ طیبہ کا ابتدائی دور غربت اور افلاس کا دور تھا اس میں زکوٰۃ کے نصاب اور مقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا صدقہ فطر کے تاکید کا حکم سے اس کی تلافی کر دی گئی تھی۔



بخوبی ہو سکے اور جب شمع کے لگ بھگ زکوٰۃ کا نصاب اور مقدار مقرر ہوئی تو صدقہ فطر کا وہ تاکید اور فرضی حکم باقی نہ رہا۔ گو روزہ و صدقہ فطر کا حکم اور زکوٰۃ کا نصاب اور مقدار کی تعیین مدینہ طیبہ میں ہوئی اور صدقہ فطر بعض ائمہ کی تحقیق میں اب بھی واجب ہے مگر فرض نہیں۔ اس بحث کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے مبارک پوری صاحب کی ستم ظرفی دیکھیے کہ وہ کس بے باکی سے یہ لکھتے ہیں کہ اندرونی اور بیرونی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فاقرو امانیتس۔۔۔ الایۃ مدنی ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۳۶) فوا اسفا آپ دلائل واضحہ کے ساتھ یہ معلوم کر چکے ہیں کہ اندرونی اور بیرونی عقلی اور نقلی شہادتوں سے فاقرو امانیتس۔۔۔ الایۃ کا ملکی ہونا ثابت ہو چکا۔

### پانچواں اعتراض

مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ فاقرو امانیتس۔۔۔ الایۃ سے واذا قرئ القرآن۔۔۔ الایۃ منسوخ نہیں۔ لیکن اس میں نسخ کا احتمال تو موجود ہے۔ جب اس میں یہ احتمال موجود ہے تو اس سے استدلال کیسے؟ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۳۶)

جواب: یہ اعتراض بھی مردود ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ نسخ کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ وہ محض بے بنیاد احتمالات سے ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے اثبات کے لیے قطعی، حکم اور اٹل دلائل کی ضرورت ہے اور صرف ظن اور تخمین سے قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی۔

وثانیاً۔ یہ احتمال صرف مبارک پوری صاحب کے خیال مبارک میں ہی آیا ہے یا امام احمد بن حنبلؒ، حافظ ابن عبد البرؒ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وغیرہ بلکہ جہور سلف و خلفؒ کو بھی یہ نکتہ ہاتھ آیا ہے؟

اگر یہ احتمال کسی دلیل و برہان پر مبنی ہوتا تو جہور اہل اسلام کا اس آیت سے استدلال کیسے صحیح ہوتا؟ اور باوجود ان حضرات کے علم کی گہرائی کے اس احتمال کی طرف ان کا ذہن کیوں نہ گیا؟ وثالثاً۔ خود مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ آیت فاقرو امانیتس سے قرأت کی فرضیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۴) تو اس آیت سے ہر ہر مقتدی کی قرأت کے

وجوب پر استدلال کیونکر درست ہوا؟ اور آیت واذا قرئ القرآن۔۔۔ الایۃ اس سے منسوخ کیسے ٹھہری؟ کیونکہ اس میں استماع اور انصات کا حکم سب مقتدیوں پر بہر حال واجب اور

لازم ہے اور فاقرؤا سے فرضیت ہی ثابت نہیں ہے۔

ورابعا۔ مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ سورۃ منزل پہلے نازل ہوئی ہے۔ (جس میں فاقرؤا مائیس کی آیت ہے) اور سورۃ اعراف بعد کو نازل ہوئی ہے (جس میں واذا قرئ القرآن ... الآية ہے۔) (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۹) اور پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ منزل کا آخری حصہ بھی مکی ہے اور اقل و آخر میں صرف ایک سال کا وقفہ ہے۔ پھر محض خیال سے متاخر سورۃ کو مقدم سے منسوخ کرنے کا کیا مطلب ؟

و خامسا۔ نواب صاحب سورۃ اعراف کے متعلق لکھتے ہیں کہ دروے یک آیت یادو آیت منسوخ است باقی ہمہ محکم۔ اقل۔ خذ العفو و امر بالعرف۔ دوم۔ و اعرض عن الجہلین (افادۃ الشیوخ ص ۶۵) تو محکم آیات کے منسوخ ہونے کا کیا معنی ؟

چھٹا اعتراض : مولانا امیر صاحب سیالکوٹی رح لکھتے ہیں کہ ان دونوں آیتوں میں اخاف کے نزدیک تعارض ہے۔ جیسا کہ ملا جیون اور صاحب تلویح نے لکھا ہے۔ لہذا اس تعارض کے ہوتے ہوئے استدلال صحیح نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر واضح البیان ص ۴۳۸) مبارک پوری صاحب نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۳۸، ابکار المنن ص ۱۴۸ و تحفۃ الاحوذی

جلد ۱ ص ۲۵۸)

جواب :

بلاشبک ملا جیون خفی تھے لیکن مدار صرف دلائل پر ہے۔ شخصیتوں پر نہیں ہے اور تلویح کے مصنف علامہ سعد الدین قسازانی (المتوفی ۴۹۱ھ) حسب تصریح علامہ حسن چلیپی (المتوفی ۴۹۴ھ) و علامہ سیوطی رح (المتوفی ۹۱۱ھ) و علامہ محمود الکفوی رح (المتوفی ۴۹۰ھ) و علامہ کاتب چلیپی رح (المتوفی ۱۰۶۷ھ صاحب کشف الظنون) شافعی المسلک تھے۔ احناف میں ان کا شمار غلط ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تعارض کے لیے شرائط کیا ہیں ؟ حافظ ابن حجر رح (شرح منجۃ الفکر ص ۴۷ میں) بیان کرتے ہیں کہ تعارض کی شرطیں یہ ہیں :

۱۔ دونوں حکموں کا محل ایک ہو۔

۲۔ تقدم اور تاخر معلوم نہ ہو سکے۔



۳- ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی جاسکے۔

۴- دونوں میں تطبیق نہ ہو سکے۔ مگر ان دونوں آیتوں میں تعارض کی ایک شرط بھی موجود نہیں ہے۔

دونوں کا محل جُدا جُدا ہے: ہم عرض کر چکے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تصریح کرتے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شان نزول فرضی نماز ہے اور آیت فاقرؤا ماتیسر کا محل نماز تہجد ہے جیسا کہ ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۹۲ اور عون المعبود جلد ۱ ص ۵۰۳ وغیرہ میں اس کی تصریح ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وهذا معروف مشہور فیما بین اهل العلم۔ (کتاب الفرائض ص ۱۵۳) اور یہ امر اہل علم میں مشہور و معروف ہے اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ آیت صلاة تہجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (اعلام الموقعین جلد ۲ ص ۳۷۸) خطیب شربینی رحمہ اللہ جو بڑے پایہ کے مفسر تھے لکھتے ہیں کہ اس آیت کا شان نزول تہجد کی نماز ہے۔ (السراج المنیر جلد ۴ ص ۲۳۸) علامہ ابن السعدی لکھتے ہیں کہ یہ صلاة تہجد کے بارے میں ہے۔ (تفسیر ابوالسعود بکبیر جلد ۸ ص ۴۸) مبارک پوری صاحب بھی صاحب روح المعانی سے یہ مضمون نقل کرتے ہیں (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۷)۔ قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ نزلت فی قیام اللیل فلیست مما نحن فیہ (نیل جلد ۲ ص ۲۱۸) یعنی یہ آیت نماز تہجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور ہمارے اس مسئلہ سے (کہ سورۃ فاتحہ رکن ہے یا جہاں سے بھی پڑھ لیا جائے صحیح ہے) اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود مولانا امیر صاحب لکھتے ہیں کہ سورہ مزمل کا یہ رکوع نماز تہجد میں تحفیف کے لیے اترتا ہے۔ (تفسیر واضح البیان ص ۴۴۳) جب ایک آیت کا محل فرضی نماز ہے اور دوسری کا تہجد کی نماز ہے تو پھر تعارض کیسے؟ کیونکہ تعارض کے لیے وحدت محل شرط ہے جو یہاں مفقود ہے۔

دونوں کا تقدّم اور تاخّر: پہلے پوری تحقیق گذر چکی ہے کہ ان کے تقدّم اور تاخّر کا علم اور تو اور خود مبارک پوری صاحب کو بھی اقرار ہے کہ سورۃ مزمل پہلے اور سورۃ اعراف بعد کو نازل ہوئی ہے۔ سو تعارض کی یہ شرط بھی نہ پائی گئی۔

## وجہ ترجیح :

اگر بالفرض دونوں کا محل بھی ایک ہوتا اور تقدم و تاخر بھی معلوم نہ ہوتا تب بھی واذا قرئ القرآن... الآية کے حکم کو ترجیح ہوتی۔ کیونکہ صحیح روایات اور آثار اور جہور سلف خلف کی اکثریت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں مقتدی کو قرأت خلف الامام سے منع کیا گیا ہے ترجیح کے لیے یہ دلیل کیا کم وزنی ہے ؟

جمع و تطبیق : علاوہ بریں ان دونوں آیتوں میں جمع و تطبیق بھی چنداں دشوار اور مشکل نہیں ہے کیونکہ واذا قرئ... الآية مقتدی کے حق میں ہے جو باجماعت فرض نماز پڑھتا ہو اور فاقروا ماتیسر تہجد کی نماز کے بارے میں ہے جو انفرادی طور پر پڑھی جاتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی آیت صرف سورۃ فاتحہ کو شامل ہو کیونکہ قرآن العظیم کا اطلاق اسی پر ہوا ہے اور فاقروا ماتیسر سے مازاد علی الفاتحہ مراد ہو۔ چنانچہ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں : کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بسند صحیح یہ روایت مروی ہے کہ فاقروا ماتیسر سے مازاد علی الفاتحہ مراد ہے۔ (کتاب القراءة ص ۶، ص ۱۵۳، ۱۵۴) اور امام دارقطنیؒ حضرت ابن عباسؓ سے باسناد حسن اسی مضمون کی روایت نقل کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ اس میں ان لوگوں کے لیے حجت ہے جو یہ کہتے ہیں کہ فاقروا ماتیسر مازاد علی الفاتحہ پر مجمول ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۹) اور میر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ الغرض آیت فاقروا ماتیسر میں اگر قرأت سے مراد قرأت القرآن فی الصلوٰۃ مراد لی جائے تو اس سے مراد فاتحہ کے بعد کی قرأت ہے۔ (واضح البیان ص ۴۴۵)

اور چونکہ فریق ثانی کے نزدیک بھی مازاد علی الفاتحہ کی قرأت مقتدی کے لیے ممنوع ہے۔ لہذا اس سے مراد صرف منفرد ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ فاقروا ماتیسر کا حکم امام کے لیے ہو۔ اور واذا قرئ القرآن صرف مقتدی کے لیے۔ اندرین حالات جب جمع و تطبیق کی صحیح صورتیں بھی سامنے موجود ہیں تو تعارض کا دعویٰ بالکل باطل ہو گیا۔

## ساتواں اعتراض :

مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن... الآية پہلا



جواب خود حنفی دیوبندی کے قلم سے کہ جو شخص اس آیت سے خلف الامام کے منسوخ ہونے پر استدلال کرتا ہے اسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ یہ آیت افتراض صلوٰۃ خمسہ کے بعد نازل ہوتی ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۵)

جواب

کیا قرأت خلف الامام کی ممانعت اور افتراض صلوٰۃ خمسہ میں کوئی علت اور معلول کا تلامذہ یا عرفی اور عادی تعلق ہے؟ کیا قرآن کریم کی تعظیم کے پیش نظر قرأت خلف الامام کی ممانعت صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ پانچ نمازیں ہی فرض ہوں۔ پانچ سے کم نمازوں میں یہ ممکن نہیں ہے؟ پہلے عرض ہو چکا ہے کہ دار و مدار دلائل پر ہوتا ہے نہ کہ شخصیتوں پر۔ شخصیتیں قابل صدا احترام ہیں مگر صحت و سقم کا مبنی دلائل ہیں۔

آٹھواں اعتراض

مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ آیت و اذا قرأ القرآن کئی ہے اور امام کے پیچھے قرأت کرنے کا حکم مدینہ طیبہ میں ہوا ہے۔ لہذا متقدم حکم سے متاخر حکم کے خلاف استدلال درست نہیں ہو سکتا۔ اور مدینہ میں قرأت خلف الامام کے جواز پر یہ دلیل موجود ہیں:

۱۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز نہیں ہوتی (موطا امام مالک ص ۲۹)

۲۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز پڑھائی اور جب فارغ ہوئے تو فرمایا۔ میرے پیچھے کس نے قرأت کی ہے؟ اس حدیث کے آخر میں فرمایا: امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے بغیر اور کچھ بھی نہ پڑھا کرو۔ (کتاب القراءت ص ۵۱)

اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اس پر اتفاق اجماع ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں مسلمان ہوئے تھے۔ (تلخیص الجبر ص ۱۱۴)

لے یہ مضمون انھوں نے اپنی مشہور کتاب الفرقان ص ۸۹ میں لکھا ہے اور اس کے مولف مولانا ناظر حسن صاحب دیوبندی تلمیذ مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

۳۔ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ مدنی ہیں اور انھوں نے قرأت خلف الامام کا ذکر کیا ہے۔

(تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۸)

میر صاحب سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ احادیث مثبتہ قرآنہ خلف الامام آیت واذا قرئ القرآن کے بعد فرمائی گئی تھیں۔ کیونکہ عبادہ رضی اللہ عنہ مدنی ہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں مسلمان ہوئے تھے۔ (تفسیر واضح البیان ص ۲۵)

جواب۔ یہ اعتراض بھی محض بے کار ہے: **اولاً**۔ اس لیے کہ قرآن کریم کی کسی آیت اور حکم منسوخ ٹھہرانے کے لیے کسی محکم قطعی اور اٹل حکم کی ضرورت ہے۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ اور لہ مبارک پوری صاحب نے بزعم خود بڑی دوراندیشی کا ثبوت دیا ہے اور لکھتے ہیں: **اولاً**۔ کہ اگرچہ حضرت عبادہ بن الصامت بیعت عقبہ اولی (جو ۲ نبوت میں ہوئی تھی) اور بیعت عقبہ ثانیہ میں (جو ۳ نبوت میں ہوئی تھی) حاضر ہوئے تھے۔ لیکن ان کی حاضری سے (یعنی آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام لانے کیلئے حاضری سورۃ اعراف پہلے نازل ہو چکی تھی کیونکہ مجمع البحار جلد ۲ ص ۵۳۰ میں لکھا ہے کہ ۳ نبوت میں پہلے سورۃ جن نازل ہوئی اور پھر سورۃ اعراف۔

**وثانیاً**۔ یہ کہ عقبہ اولیٰ سے قبل نماز باجماعت مشروع ہی نہ تھی۔ اس لیے بہر حال حضرت عبادہ کی حدیث کا یہ حکم آیت کے بعد ہی ہوگا۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۸ مصلحہ) مگر یہ تمام مقدمات مخدوش ہیں۔ **اولاً**۔ اس لیے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی خلف الامام کی قید کے ساتھ کوئی مرفوع روایت صحیح نہیں ہے۔ لہذا وہ مکی ہوں یا مدنی فرق کیا ہوگا؟

**وثانیاً**۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ بیعت عقبہ اولیٰ رجب ۳ نبوت میں اور بیعت عقبہ ثانیہ ۳ نبوت میں ہوئی تھی۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۳۵۹)

**وثالثاً**۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جماعت کے ساتھ نماز ابتدائے نبوت سے مشروع تھی۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۸۲) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نماز باجماعت ابتدائے اسلام سے مشروع تھا۔ (فتح الباری جلد ۳ ص ۴۰) مسلم جلد ۲ ص ۶۶۶ اور مستدرک جلد ۳ ص ۵۹۲ میں روایت ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ مسلمان ہو کر جب اپنی قوم کے پاس گئے تو حضرت ایما رضی اللہ عنہ بن حصہ ان کو جماعت سے نماز پڑھایا کرتے تھے۔ حالانکہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے قبل مردوں میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ (باقی اگلے صفحہ پر)



حضرت ابوہریرہ رضی کی اخبار احاد سے قرآن کریم کی آیت کیسے منسوخ ہو سکتی ہے۔  
 وثالثاً۔ حضرت عبادہ رضی کی خلف الامام کی قید کے ساتھ کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ  
 اپنے مقام پر بیان ہو گا۔ پھر ایسی بے حقیقت، ضعیف کمزور اور معلول روایتوں نص قطعی  
 کیونکر منسوخ ہو گئی؟ اور حضرت ابوہریرہ رضی سے موطا امام مالک ص ۲۹ میں کوئی روایت  
 ایسی نہیں جس کا مفہوم یہ ہو کہ اگر مقتدی فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز باطل ہے یہی اُن کی مرفوع  
 روایت خراج والی تو وہ موجود ہے اور ان کا قول اقراً بھا فی نفسک یا فارسی بھی موجود ہے  
 مگر اس کا مطلب بطلان صلوٰۃ نہیں ہے جس کی بحث جلد ثانی میں آ رہی ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔  
 وثالثاً۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ کسی متاخر الاسلام صحابی کی روایت سے متقدم الاسلام  
 صحابی کی روایت کو بلا دلیل محض تقدم و تأخر کی وجہ سے منسوخ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ (شرح  
 بختہ الفکر ص ۴۷) نہ معلوم متاخر الاسلام صحابی کی روایت سے نص قرآنی کیسے منسوخ ٹھہرائی  
 جاسکتی ہے؟

ورابعا۔ کیا صرف حضرت عبادہ رضی اور حضرت ابوہریرہ رضی ہی مدنی تھے یا حضرت ابوہریرہ  
 الاشعری رضی، حضرت جابر بن عبد اللہ رضی، حضرت ابوالدرداء رضی، حضرت انس بن مالک، حضرت  
 زید بن ثابت، حضرت عبد اللہ بن جحینہ رضی اور حضرت ابوبکرہ رضی وغیرہ بلکہ خود حضرت ابوہریرہ رضی  
 بھی جن سے قرأت خلف الامام کی ممانعت کی روایتیں مروی ہیں مدنی تھے؟

(بقیہ پچھلا صفحہ) اور بیسیوں میں صرف حضرت خدیجہ رضی مسلمان ہوئی تھیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۷۲ و کمال نقل ص ۵۹۳)  
 مگر اس ابتدائی دور میں بھی جماعت ہوتی تھی۔

لہٰذا صاحب لکھتے ہیں کہ ناسخ مثل منسوخ باشد در قوت بلکہ اقویٰ ازاں چہ در صورت ضعف  
 منزل قوی نہ تواند شد و این حکم عقل است و اجماع بر آن دلالت کردہ چہ صحابہ رضی نص قرآن را بدخیر  
 واحد منسوخ نہ کردہ اند۔ (افادۃ الشیوخ بمقدار النسخ و المنسوخ ص ۵)

حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ علماء حنفیہ کا ضابطہ یہ بیان کرتے  
 ہیں۔ ان تخصیص العام القطعی بنحو الاحاد خیر جائز..... الخ (غیث الغمام ص ۲۵)  
 کہ عام قطعی کی تخصیص خبر واحد سے جائز نہیں ہے۔

و خامساً۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے موقوف اور غیر صریح قول سے نص قرآنی کس طرح منسوخ ہو سکتی ہے۔ جبکہ قاعدہ یہ ہے کہ مرفوع حدیث کے مقابلے میں امت میں سے کسی کا قول قابل قبول نہیں ہو سکتا چنانچہ امام شافعی رحمہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقابلے میں ماوشما کے قول کی کیا وقعت ہے؟ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۲۵۳)

امام ابن خزمیہ کا بیان ہے کہ حدیث کے مقابلہ میں کسی کی بات حجت نہیں ہو سکتی۔ یحییٰ بن آدمؒ فرماتے تھے کہ مرفوع حدیث صحیح کے مقابلہ میں کسی کا قول معتبر نہیں ہے۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۸۲) امام بخاری رحمہ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جب حدیث ثابت ہو جائے تو پھر کسی امتی کا قول قابل اعتما و نہیں ہے (جزء القراءة ص ۱۱) امام بیہقی رحمہ لکھتے ہیں کہ حضورؐ کی حدیث کے مقابلہ میں کسی امتی کا قول قابل اعتبار نہیں ہے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۴۳) محدث ابن حزمؒ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کی موجودگی میں کسی کی بات قابل قبول نہیں ہے (محل جلد ۱۰ ص ۱۷۰) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کوئی بات ثابت ہو جائے تو پھر کسی کی بات حجت نہیں ہے۔ (رفع الملام عن ائمة الاعلام ص ۶۴) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں: زیرا کہ حجت در روایت صحابی است نہ در رائے و فعل وے (بدور الایہ ص ۵۷) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ علامہ شوکانی رحمہ در موقوفات خود ہزار بار می نویسند کہ در موقوفات صحابہ حجت نیست (دلیل الطالب ص ۶۱) عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو فریق ثانی کے نزدیک موقوفات صحابہ حجت نہیں ہیں اور دوسری طرف ان سے واذا قرئ القرآن کی آیت قرآنی منسوخ قرار دی جاتی ہے۔ فاسفاح: میں وہ جوانوں میں شیعہ سے پتھر کو توڑ دوں۔

و سادساً۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو روایت امام بیہقیؒ کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے وہ کمزور اور ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی داہر بن نوحؒ ہے۔ امام دارقطنیؒ لکھتے ہیں وہ قوی نہیں۔ ابن حبان رحمہ کہتے ہیں۔ اس کی روایتوں میں خطا ہوتی ہے۔ ابن قسطلانؒ کہتے ہیں کہ وہ مجہول ہے۔ (لسان المیزان جلد ۲ ص ۴۱۳)

دوسرا راوی اس سند میں ربیع بن بدرؒ ہے۔ امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن قتیبہؒ اسکو ضعیف



کہتے تھے (ضعفاء صغیر ص ۱۲) امام نسائی رحمہ اللہ اس کو متروک کہتے ہیں۔ (ضعفاء صغیر نسائی ص ۲۲) حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ وہ متروک تھا۔ (تقریب ص ۱۲۱) امام ابن معین رحمہ اللہ ابو داؤد رحمہ اللہ اور ابن عدی وغیرہ اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۳۳۳) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ (کتاب القراءة ص ۱۳۸) یعقوب بن سفیانؒ اور ابن خراشؒ اسے متروک کہتے ہیں۔ جوزقانی رحمہ اللہ اس کو واہی الحدیث اور ابو حاتمؒ اس کو ذاہب الحدیث اور ضعیف الحدیث کہتے ہیں۔ عجلؒ محمد بن عثمانؒ اور عثمان بن ابی شیبہ رحمہ اللہ سب اس کی تضعیف کرتے ہیں۔ امام حاکم رحمہ اللہ بیان ہے کہ ضعیف اور کمزور لوگوں سے موضوع اور جعلی روایتیں بیان کرتا تھا۔ ابن جبانؒ، دارقطنی رحمہ اللہ اور ازہریؒ سب اسے متروک کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۳۹)

حضرات! آپ مبارک پوری صاحبؒ کی کرامت ملاحظہ کیجئے کہ اس روایت سے وہ واذا قرأ القرآن.... الآية کو منسوخ قرار دینے پر اُدھار کھاتے بیٹھے ہیں۔ تعجب اور حیرت ہے ایسے علم پر۔ وُسَّابَعًا۔ کیا جہور کی طرف سے یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ وغیرہ بیعت عقبہ اولیٰ یا ثانیہ کے موقع پر قرأت خلف الامام کا حکم سنا ہو اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ صحیح اور مرفوع حدیث واذا قرأ فانصتوا اور مالی انا نوح القرآن الحدیث سے وہ حکم منسوخ ہو گیا ہو۔ کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ متاخر الاسلام ہیں اور سنیہ کو مسلمان ہوتے تھے۔ حدیث، حدیث کے مقابل میں آگئی اور نص قرآنی محفوظ رہ گئی۔

وَتَأْمَنَّا۔ اگر محض احتمال کا نام ہی استدلال ہے تو کیوں نہیں ہو سکتا کہ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے بیعت عقبہ اولیٰ یا ثانیہ میں یہ حکم سنا ہو اور آیت واذا قرأ القرآن مدینہ میں نازل ہوئی ہو۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تفسیر جلد ۲ ص ۲۵۲ میں اور نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ اپنی تفسیر فتح البیان جلد ۳ ص ۳۹۳ میں لکھتے ہیں کہ سورہ اعراف مدنی ہے۔ کیونکہ اس سُورۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی اُمت یہود کا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ یہود کا مرکز مدینہ طیبہ تھا نہ کہ مکہ مکرمہ، لہذا ثابت ہوا کہ یہ ساری سُورۃ ہی مدنی ہے۔ ع

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہو ویسی سنو

## نواں اعتراض

امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شان نزول یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت میں بلند آواز سے نماز میں تکلم کیا کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوتی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے:

۱۔ محمد بن دینار کہتے ہیں ہم سے ابراہیم ہجری نے بیان کیا۔ وہ ابو عیاض سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز میں تکلم کیا کرتے تھے حتیٰ کہ واذا قرئ القرآن .... الآية نازل ہوتی۔

۲۔ مؤمل بن اسمعیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہی مضمون نقل کرتے ہیں۔

۳۔ عبد اللہ بن عامر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ صحابہ بلند آواز سے نماز میں گفتگو اور تکلم کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوتی۔

۴۔ عاصم بن عمر حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز میں تکلم کیا کرتے تھے جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے ممانعت قرأت سے نہیں بلکہ تکلم اور رفع اصوات سے ہے اور تکلم فی الصلوٰۃ و رفع اصوات اور چیز ہے اور قرأت فی الصلوٰۃ الگ امر ہے۔ (کتاب القراءة ص ۷)

جواب۔ امام موصوفؒ کا یہ بیان باطل ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ صحیح اسانید سے پہلے یہ امر ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس آیت کا شان نزول قرأت خلف الامام کا منفی پہلو ہے۔ عام تکلم اور رفع اصوات اس کا شان نزول نہیں ہے۔

وثانیاً۔ امام موصوفؒ نے جتنی روایتوں سے احتجاج کیا ہے۔ وہ سب ضعیف کمزور اور معول ہیں۔ پہلی روایت میں ایک راوی محمد بن دینار ہے۔ امام ابن معینؒ، دارقطنیؒ اور نسائیؒ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ عقیلیؒ کا بیان ہے کہ اس کی حدیث میں وہم ہوتا ہے۔

ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ ان کا حافظہ آخر میں متغیر ہو چکا تھا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۱۵۵)

دوسرا راوی اس کڑی کا ابراہیم ہجری ہے۔ امام ابن معینؒ، نسائیؒ، ابو زرؒ، ترمذیؒ، احمدؒ، سعدیؒ، حربیؒ اور ابو حاتمؒ سب اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ اور ابو حاتمؒ اس کو منکر



الحديث كتمتہ ہیں۔ ابن عدی کا بیان ہے کہ وہ قابل احتجاج نہیں۔ علی بن الحسین بن ابی حمزہ  
 كتمتہ ہیں کہ وہ متروک ہے۔ (میزان جلد ۳۱، تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۶۵)

دوسری روایت میں مولیٰ بن اسماعیل ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ وہ منکر الحديث ہے۔  
 ابو حاتمؒ اس کو کثیر الخطا کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ کا بیان ہے کہ ان کی روایات میں کثرت سے خطا ہوتی  
 ہے۔ یعقوب بن سفیانؒ فرماتے ہیں کہ اہل علم کو ان کی روایات سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ وہ  
 منکر روایتیں بیان کرتے ہیں۔ ساجیؒ اس کو کثیر الخطا کہتے ہیں۔ دارقطنیؒ اور ابن سعدؒ اس کو کثیر الخطا  
 اور کثیر الغلط کہتے ہیں۔ ابن قانعؒ اس کو بخیطی سے تعبیر کرتے ہیں۔ محمد بن نصرؒ مزیؒ اس کو سنی الغلط  
 اور کثیر الخطا کہتے ہیں۔ امام ابو زرؒ کہتے ہیں کہ وہ کثیر الخطا ہے۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۲۱،  
 تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۳۸۰)

تیسری سند میں عبد اللہ بن عامر ہے۔ امام احمدؒ، ابو زرؒ، ابو عاصمؒ، نسائیؒ، ابو داؤدؒ، دارقطنیؒ  
 محدث سعدی سب اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ امام ابن معینؒ ان کو لیس بشیؒ اور ابو احمد الحاکمؒ  
 لیس بالقوی کہتے ہیں۔ ابن ماریہؒ اس کی ذیل تضعیف کرتے ہیں (ضعیف ضعیف) ابو حاتمؒ اس  
 کو متروک کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ محدثین ان کے حافظہ کی شکایت کرتے ہیں۔ (میزان  
 جلد ۲ ص ۵۱ و لسان جلد ۳ ص ۳۰۳، تہذیب جلد ۵ ص ۲۷۵)

چوتھی روایت میں عاصم بن عمر ہے۔ امام احمدؒ، ابن معینؒ اور جوزقانیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں۔  
 علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جس راوی سے متعلق امام بخاریؒ منکر الحديث کہتے ہیں۔ اس  
 حدیث روایت کرنا جائز نہیں۔ (میزان جلد ۵ ص ۵) اور اسی طرح طبقات سبکیؒ جلد ۲ ص ۹ اور  
 تدریب الراوی ص ۲۳۵ میں ہے کہ امام بخاریؒ جس کو منکر الحديث فرماتے ہیں، لا تحل الروایۃ عنہ۔  
 ایسے راوی سے روایت بیان کرنا جائز اور حلال نہیں ہے۔

لطیفہ: فریق ثانی صحیح ابن خزیمہؒ کے حوالہ سے فوق الصدق کی جو روایت پیش کیا کرتا ہے اس کی سند  
 میں بھی یہی مولیٰ بن اسماعیل واقع ہے (دیکھئے اعلام الموقعین جلد ۳ ص ۹ اور بدائع الفوائد جلد ۳ ص ۹) کیا  
 بعید ہے کہ اصل روایت تحت السره ہو اور مولیٰ بن اسماعیل کی کثرت خطا کا نشانہ بن کر روایت فوق الصدق  
 ہو گئی ہو۔  
 نہ تم صدے ہمیں دیتے نہ ہم فریادیوں کرتے،  
 نہ کھلتے راز سر بستہ نہ یہ رسوائیاں ہوتیں

امام بخاریؒ اس کو منکر الحدیث اور ترمذیؒ متروک کہتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۴، تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۵۱) یہ ہیں وہ روایات اور آثار جن پر امام بیہقیؒ نے اپنے استدلال کی بنیاد رکھتے ہیں۔  
 قال اللہ المشتکی۔

و ثالثاً۔ امام بیہقیؒ کی یہ غلطی ہے کہ وہ تکلم فی الصلوٰۃ سے صرف عام انسانی تکلم اور گفتگو مراد لیتے ہیں۔ حالانکہ تکلم کا مفہوم عام ہے جس میں قرأت قرآن، تسبیح، تہلیل، تہمید، تکبیر، نماز، خطبہ اور جملہ ادعیہ آجاتی ہیں۔ لہذا نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ میں سورہ فاتحہ کی نہی بھی آجائے گی۔ کیونکہ عام کی نفی سے خاص کی نفی عین عقلی اور منطقی قاعدہ ہے۔ تکلم کا مادہ کلام اور کلمہ ہے۔ اور قرآن کریم میں متعدد مقامات اور مختلف مواضع میں کلام اللہ، کلمات ربیٰ اور کلمات ربک وغیرہ کا قرآن کریم اور اس کی آیتوں پر اطلاق ہوا ہے۔ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جمعہ کے وقت امام کے منبر پر تشریف لانے سے قبل جتنی نماز کوئی پڑھنا چاہے پڑھ لے۔ ثم ینصت اذا تکلم الامام (بخاری جلد ۱ ص ۱۷۱) پھر جب امام آجائے اور تکلم کرے تو اس وقت وہ نمازی خاموش ہو جائے۔ اس حدیث میں جمعہ کے خطبہ پر تکلم الامام کا اطلاق ہوا ہے خطبہ کیا ہے؟ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وانما الخطبة هي قراءة القرآن (الحديث مستطاب ص ۵۵) خطبہ تو قرآن کریم کی تلاوت اور اس کی قرأت ہے۔ حضرت ام ہشام رضی فرماتی ہیں کہ میں نے سورۃ ق والقرآن المجید جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سُن کر یاد کی ہے۔ آپ اسے ہر جمعہ کے خطبہ میں پڑھا کرتے تھے۔ (مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۱۲۳ و مسلم جلد ۱ ص ۲۸۸) آخری تشہد میں درود شریف کے بعد کوئی متعین دعا شریعت نے نہیں بتائی۔ لیکن ادعیہ ماثورہ میں رَبَّنَا اِنَّا... الْاٰیۃ رَبِّاجعلنی مقیم الصلوٰۃ... الْاٰیۃ رَبَّنَا لَا تَزِغْ قُلُوْبَنَا... الْاٰیۃ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا... الْاٰیۃ وغیرہ وغیرہ بھی ادعیہ ثابت ہیں اور آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ آخری تشہد سے فارغ ہونے کے بعد تحریر لیت خیر بعد من الکلام ما شاء (بخاری ۲ ص ۹۲) جو کلام بھی دل چاہے نمازی انتخاب کر لے۔ ایک شخص نے رکوع کی حالت میں الحمد للہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ پڑھا تھا اور آپ نے فرمایا: من المتکلم (بخاری جلد ۱ ص ۱۰۳) وسند احمد جلد ۳ ص ۱۰۳ متکلم کون تھا؟ ایک شخص نے یہ دعا کی تھی: اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ وَحَمَّهٗ اَوْ لَا تَرْحَمْ



مَعَنَا أَحَدًا - ۱۔ امام نسائیؒ اس پر ایک باب قائم کرتے ہیں۔ باب الکلام فی الصلوٰۃ (جلد ۱ ص ۱۱۰) امام بخاریؒ ایک باب باین عنوان قائم کرتے ہیں:

اِذَا قَالَ وَاللّٰهُ لَا اَتَكَلَّمُ الْیَوْمَ فَصَلِّ اگر کسی شخص نے قسم اٹھائی کہ میں کلام نہیں اوقراُ اوسبِّح اوکبرا وحمد او کروں گا تو اگر اس نے نماز پڑھی یا قرآن کی تلاوت ہلل فھو علی نیتہ۔ (بخاری ۲ ص ۹۸)

اللہ پڑھا تو یہ اس کی نیت پر موقوف ہے۔ یعنی اگر وہ تکلم سے قرأت قرآن وغیرہ مراد لے اور اس کی نیت کرے تو تکلم کا اطلاق اس پر صحیح ہے اور وہ حائث ہو جائے گا۔ قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں:

فلا یجوز من الکلام الا ما خضعت جب امام خطبہ پڑھ رہا ہو تو اس وقت کلام دلیل کصلوٰۃ التحیۃ۔ صحیح نہیں ہے۔ مگر جس کو شرعی دلیل نے خاص کر دیا نبیل (طاریحہ جلد ۳ ص ۱۵۲) ہو جیسے صلوٰۃ تحیہ۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قاضی صاحب موصوف صلوٰۃ تحیہ پر کلام کا اطلاق صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ جب یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ نہی عن التکلم قرأت قرآن وغیرہ پر مشتمل ہے تو امام بیہقیؒ کا یہ استدلال کہ نہی تو تکلم سے ہے۔ تلاوت اور قرأت قرآن سے نہیں بالکل بے بنیاد ہے اور جیسے ہر کے ساتھ پڑھنے سے منازعت اور مخالفت ہوتی ہے۔ اسی طرح آہستہ پڑھنے سے بھی ہوتی ہے۔ جس کی تحقیق آگے آگے کی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

ورابعا۔ امام بیہقیؒ نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ ان ضعیف اور کمزور روایتوں سے ثابت کرتے ہیں۔ حالانکہ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ عام تکلم فی الصلوٰۃ کی نعت لہ محدثین و مؤرخین کا اس بات میں شدید اختلاف ہے کہ نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی یا مدینہ طیبہ میں؟ حافظ ابن قیمؒ (زاد المعاد جلد ۲ ص ۶۱ میں) حافظ ابن کثیرؒ

(البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۹۷ میں) اور قاضی ابوالطیب الطبرانیؒ (المستوفی ص ۱۵۸) دیکھیں بذل المجہد جلد ۲ ص ۹۵) اس کے مدعی ہیں کہ یہ نمانعت مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکی تھی۔ اور ذیل باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے۔

آیت قوموا لله قانتین سے ہوئی ہے جیسا کہ بخاری جلد ۱ ص ۱۶۷ و مسلم جلد ۱ ص ۲۰۴ میں حضرت زید بن ارقم سے مروی ہے اور اس کی پوری تحقیق پہلے گزر چکی ہے کہ آیت واذا قرأ القرآن کا شان نزول ہی خاص قرأت خلف الامام کا مسئلہ ہے۔

### دسواں اعتراض

حضرت امام بخاری رحمہ فرماتے ہیں کہ آیت واذا قرأ القرآن ... الا یہ میں استماع اور انصات کا حکم ہے اور استماع کا تحقق صرف ان نمازوں میں ہو سکتا ہے جن میں قرأت سنی جاسکتی ہو اور ستر میں نمازوں میں چونکہ قرأت سنی نہیں جاسکتی۔ اس لیے ان میں مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنی جائز ہوگی۔ لہذا آیت اپنے عموم پر باقی نہ رہی اور منکرین قرأت خلف الامام کا علی الاطلاق استدلال اس آیت سے صحیح نہ ہوا (اوکما قال جزء القراءة ص ۱۹ اور یہی سوال امام بیہقی رحمہ نے کتاب القراءة ص ۷۶ میں اور نواب صاحب نے دلیل الطالب ص ۲۸۰ میں اور مبارک پوری صاحب نے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵۱، اور ابکار المنن ص ۱۳۸ میں کیا ہے)۔

جواب۔ ان اکابر کے سوال یا استدلال کے مرکزی نقطے اصولی طور پر صرف دو ہیں۔ ان کا تجزیہ یوں کیا جاسکتا ہے:

۱۔ استماع کا معنی سنتا ہے۔

۲۔ ستر میں نمازوں میں آہستہ آہستہ امام کے پیچھے قرأت کرنا استماع اور انصات کے منافی نہیں ہے علی الترتیب دونوں شقوں کا جواب ملاحظہ کریں:

استماع کا معنی۔ استماع کا معنی سننا نہیں بلکہ کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے، قرآن سنی جاسکتی ہو یا نہ۔

(بقیہ کچھ صفحہ) میں حضرت ابن مسعود رضی کی وہ صحیح روایت پیش کرتے ہیں جو صحاح ستہ میں موجود ہے کہ حبشہ سے لوٹنے کے بعد انھوں نے بحالت نماز آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سلام کہا۔ مگر جواب نہ ملا۔ کیونکہ نہی عن المتکلم فی الصلوٰۃ نازل ہو چکی تھی۔ مگر حافظ ابن حجر رحمہ لکھتے ہیں کہ یہ آیت چونکہ بالاتفاق مدنی ہے اس سے معلوم ہوا کہ عام تکلم فی الصلوٰۃ کی نہی مدینہ ہی میں نازل ہوئی (فتح الباری جلد ۱۲ صفحہ ۵۵) اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ بعض مہاجرین حبشہ مکہ مکرمہ بھی آپس آئے اور بعض مدینہ منورہ میں اور حضرت ابن مسعود رضی کا یہ رجوع مدینہ طیبہ میں ہوا تھا۔



۱۔ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جب بسلسلہ جہاد کسی قصبہ یا شہر پر حملہ کرنا چاہتے تھے تو

وكان يستمع الاذان فان سمع ..... پہلے توجہ کرتے۔ اگر اذان کی آواز سن لیتے تو حملہ سے باز رہتے۔ ورنہ ہلہ بول دیتے تھے۔

مسلم ص ۱۶، ابو عوانہ جلد ۵ ص ۳۳۵، دارمی ص ۳۲۳، طبرانی ص ۲۴۱

قطبی پڑھنے والا طالب علم بھی بخوبی اس امر سے واقف ہو گا کہ تقسیم الشئ الى نفسه والى غيره محال ہے۔ اگر استماع اور سماع کا ایک ہی معنی ہو تو اس حدیث کا مطلب یہ ہو گا کہ آپ اذان سنتے تھے۔ سو اگر آپ سن لیتے تو حملہ نہ کرتے والا حملہ کر دیتے تھے جب پہلے اذان سن لی ہوتی تھی تو پھر اگر اذان سن لیتے گا کیا مطلب؟ استماع کا معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ آپ پہلے کان دھرتے اور توجہ کرتے۔ توجہ کے بعد اگر اذان سن لیتے تو فیما والا حملہ کر دیتے تھے۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ استماع سے مراد ارادۃ استماع ہے۔۔۔۔۔ ص ۳۸۱۔ ایک بے کار بہانہ ہے۔ اس لیے کہ مجازی معنی کے لیے قرینہ درکار ہے اور اس جگہ قرینہ مفقود ہے۔ فان سمع... الخ کے واضح الفاظ اس کا ابطال کرتے ہیں کیونکہ حرف فا سے سماع کا ترتیب امر باطنی یعنی ارادہ پر چسپاں نہیں ہوتا بخلاف کان دھرنے کے جو ظاہری امر ہے۔

۲۔ صراح ص ۳۱۳ میں لکھا ہے۔ استماع گوش داشتن۔ کان دھرنا اور توجہ کرنا۔

۳۔ لغت کے امام ثعلب سے روایت ہے واذ قرئ القرآن... الآية کا یہ مطلب نقل کیا گیا ہے کہ قال ثعلب معناه اذ قرء الامام فاستمعوا الى قرآنہ ولا تشكلموا (تاج العروس ج ۱ ص ۵۹۱) ثعلب کہتے ہیں کہ استماع کا معنی یہ ہے کہ جب امام قرآن کرے تو اس کی قرأت کی طرف توجہ کر دو اور بولو مست۔ ۴۔ اور امام راغب فرماتے ہیں کہ والاستماع الاصغاء۔ استماع کا مطلب کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ (مفردات ص ۲۳۲)

۵۔ اور مختار الصحاح میں ہے: واستمع له ای اصغى۔ کہ استمع لہ کا یہ معنی ہے کہ اس نے توجہ کی اور کان دھرے۔

۶۔ منجد اور قاموس میں ہے: استمع له واليه اصغى۔ استمع لہ اور الیہ کا ایک ہی مطلب

ہے کہ اس نے توجہ کی اور کان دھرے۔ (منجد صفحہ ۳۶، قاموس جلد ۳ ص ۳۷)

۷۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں:

الاستماع الاستماع۔ (شرح مسلم کہ استماع کا معنی توجہ کرنا اور کان دھرنا ہے۔

جلد ۱ ص ۱۸۴)

۸۔ امام رازمیؒ لکھتے ہیں:

لأن السماع غير والاستماع غير۔ سماع اور چیز ہے اور استماع اور ہے۔

(تفسیر کبیر جلد ۲ ص ۵۰۴)

۹۔ قاضی شوکانی صاحب قرأت خلف الامام کی حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

يدل على النهي عن القراءة عند مجرد الجهر من الامام وليس في رواية غيره ما يشعر باعتبار السماع۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جب امام جہر سے قرأت کر رہا ہو تو مقتدی کو اس حالت میں قرأت کرنا منع ہے۔ یہ حدیث اور کوئی دیگر حدیث

اس پر دلالت نہیں کرتی کہ مقتدی کو قرأت سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ وہ قرأت سن رہا ہے۔ (نبیل الاوطار جلد ۲ ص ۱۱۴)

اس عبارت میں قاضی صاحب واشگاف الفاظ میں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ترک قرأت خلف الامام کی علت سماع نہیں ہے۔ موصوف جہر امام کو اس کی علت ٹھہراتے ہیں اور جہور اہل اسلام بڑے وسیع النظر ہیں۔ وہ صرف قرأت امام کو ترک القرأت خلف الامام کی علت سمجھتے ہیں۔

۱۰۔ نواب صاحب لکھتے ہیں:

ومعتبر استماع است نہ سماع پس ہر کہ بانتہار ووقوف واقف شد و نمی شنود یا اصم است یا صوت خطیب خفی است وے ہچو سماع است۔ (بدور الابلہ ص ۷۳)

ان تمام پیش کردہ اقتباسات سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ استماع اور سماع دو الگ الگ چیزیں ہیں اور استماع کا معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ اس میں سننے کا معنی ملحوظ نہیں ہے۔ لہذا اس آیت کو صرف جہری نمازوں کے ساتھ مخصوص کر دینا



باطل ہے بلکہ یہ آیت ستری اور جہری ہر قسم کی نمازوں کو شامل ہے اور سماع قرأت، ترک قرأت کی علت نہیں۔ جیسا کہ قاضی شوکانی صاحب کو بھی مسلم ہے۔

### انصات کا معنی

انصات کا معنی ہے خاموشی بدون (صراح ص ۶۹) قاموس جلد ۱ ص ۹۲ میں ہے۔

انصت، سکوت یعنی انصات کا معنی خاموشی ہونا ہے اور یہی معنی مغرب ۲ ص ۲۱۲ اور منجد ص ۸۸۳ وغیرہ کتب لغت میں آئے ہیں۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں: الانصات السکوت کہ انصات کا معنی سکوت کرنا اور خاموش رہنا ہے۔ (شرح مسلم جلد ۲ ص ۲۸۳) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں: اذ لا فرق بین السکوت والوانصات عند العرب (کتاب القراءات ص ۸) اہل عرب کے نزدیک سکوت اور انصات میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اور مختار الصحاح میں ہے کہ الانصات السکوت والواستماع انصتہ وانصت لہ (ص ۵۸)۔ انصات کا معنی خاموش رہنا اور کان دھرنا ہے لام کے ساتھ ہو یا بدون لام دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔

اور منجد میں ہے کہ انصت وانتصت لہ سکت مستمعاً لحدیثہ (ص ۸۸۳) انصت اور انتصت لہ کا معنی ایسا ہے کہ اس کی بات کے لیے توجہ کرتے ہوئے خاموش ہو گیا۔ اور تاج العروس میں ہے کہ

انصتہ وانصت لہ اذا سکت	انصتہ اور انصت لہ کا معنی ایک ہی ہے
لہ مثل نصحه ونصح لہ وانصتہ و	کہ اس کے لیے خاموش ہو گیا جیسے نصحہ اور
انصت لہ مثل نصحتہ ونصحت	نصح لہ کا ایک ہی مطلب ہے اور انصات کا
لہ والوانصات هو السکوت والاستماع	معنی سکوت اور بات کی طرف توجہ کرنا ہے۔ کہا
للحدیث یقال انصتہ وانصت لہ۔	جاتا ہے انصتہ وانصت لہ۔

(جلد ۱ ص ۵۹۱)

امام ابوبکر الرازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ

قد بینا دلالة الآية علی وجوب الانصات ہم نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت وجوب انصات

عند قراءة الامام في حال جهل الامام  
والاخفاء وقال اهل اللغة الانصات  
الامساك عن الكلام والسكوت (استماع  
القراءة ولا يكون القاري منصتاً ولو ساكتاً  
بجاء وذلك لان السكوت ضد الكلام وهو  
تسكين الالة عن التحريك بالكلام -  
- اهـ (احكام القرآن جلد ۳ ص ۳۹)

پر دلالت کرتی ہے جب کہ امام قرأت کر رہا  
ہو جو ہر سے قرأت کرے یا آہستہ اور اہل لغت  
کہتے ہیں کہ انصات کا معنی کلام سے مرک  
جانا اور قرأت کی توجہ کے لیے خاموش رہنا  
ہے اور پڑھنے والا کسی صورت میں مُنصت  
اور ساکت نہیں ہو سکتا کیونکہ سکوت کلام کی  
ضد ہے اور سکوت کا یہ معنی ہے کہ زبان کو  
کلام کے لیے حرکت نہ دی جائے۔

### سکوت کا معنی

امام اللغت والادب ابو عبد اللہ الحسین بن احمد المعروف بابن خالونہ (المتوفی ۳۸۵ھ)  
لکھتے ہیں: نزل الرجل اذا انقطعت حجته عند المناظرة وسكت وامسكت مثله -  
(اعراب ثلاثين سورة من القرآن ۳)  
یعنی مناظرہ کرتے وقت جب کوئی آدمی بالکل لاجواب ہو کر خاموشی اختیار کر لیتا ہے تو اس پر  
نزل کا لفظ اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی اپنے کلام کو منقطع کر دیتا ہے۔ اسی طرح  
جب کوئی اپنے کلام کو منقطع کر دیتا ہے تو اس پر سکت اور اسکت بولا جاتا ہے۔  
منجد ص ۳۵۲ اور قاموس جلد ۱ ص ۹۲ میں لکھا ہے: اسکت انقطع کلامہ فلم یتکلم کہ  
سکوت کا معنی یہ ہے کلام بالکل ترک کر دیا اور کوئی بات نہ کی۔ مجمع البحار جلد ۲ ص ۲۵ میں  
اس کی تصریح یوں کی ہے۔ جرى الوادي ثلاثاً ثم سكت اي انقطع يعني تين دن تک  
سیلاب چلتا رہا پھر بالکل ٹوک گیا۔

امام راغب اصفہانی (المتوفی ۵۰۳ھ) لکھتے ہیں: السكوت منقطع بترك  
الكلام - (مفردات ص ۲۲) سکوت ترک کلام کے ساتھ مختص ہے۔

امام لازمی تحریر فرماتے ہیں:

لان السكوت عدمی معناه انه

سکوت عدمی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اس



لم یقل شیئاً ولم یقل امداً ولم یصرف فی قول ولا فعل ولا شک ان هذا المعنی عدمی محض۔  
 نے کچھ بھی نہیں کہا نہ کوئی بات نقل کی ہے اور نہ کسی قول اور فعل میں تصرف کیا ہے اور اس کے عدمی محض ہونے میں کیا شک اور شبہ

(مناظرات امام رازی ص ۳۵) ہو سکتا ہے؟

ان منقولہ جواہروں سے یہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت ہو جاتی ہے کہ بغیر مکمل خاموشی کے انصات اور سکوت اور اسکات کا مفہوم کسی طرح بھی محقق نہیں ہو سکتا اور جو لوگ جہری یا ستری نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأت تجویز کرتے ہیں۔ وہ کسی طرح انصات پر عامل نہیں تصور کیے جا سکتے اور یہ بھی وضاحت کے ساتھ عرض کیا جا چکا ہے کہ استماع کا معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے، سننا اس کے مفہوم میں شامل نہیں ہے۔ اس لیے ستری اور جہری کا سوال اٹھانا محض بے جا اور دور از کار بحث ہے۔

آہستہ پڑھنا بھی انصات اور استماع کے سراسر منافی ہے:

جو حضرات بحالت اقتدار امام کے پیچھے آہستہ قرأت تجویز کرتے ہیں اور اس کو انصات اور استماع کے منافی نہیں سمجھتے وہ غلطی پر ہیں۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آتے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو قرآن کہہ کر پڑھاتے تو آپ بھی آہستہ آہستہ ساتھ پڑھتے جاتے کہ مبادا حضرت جبرائیل علیہ السلام کے تشریف لے جانے کے بعد میں مجھول نہ جاؤں اور کان یحرن شفتیہ آپ آہستہ آہستہ ہونٹ مبارک ہلاتے جاتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو یہ بھی پسند نہ آیا کہ آپ قرأت قرآن کے وقت اپنے ہونٹوں کو حرکت دیں اور یہ حکم نازل ہوا۔ لا تحریک لہ لسانک کہ آپ اپنی زبان تک کو حرکت نہ دیں۔ فاستمع لہ وانصت۔ (بخاری جلد ۱) سو آپ کان دھریں اور پوری طرح توجہ کریں ص ۳، مسلم جلد ۱ ص ۱۸۳، طہا لسی ۳۳۱ اور مکمل خاموشی اختیار کریں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آہستہ پڑھنا، زبان کو حرکت دینا اور ہونٹ ہلانا استماع اور انصات کے بالکل منافی ہے۔ اسی لیے تو آپ کو تحریک لسان اور تحریک شفتین سے بھی منع کیا گیا۔

حالانکہ آپ آہستہ ہی پڑھتے تھے۔ بعض علمائے وا ذکر بک فی نفسک ..... الا یہ سے آہستہ قرأت کرنے کے جو ان پر استدلال کیا ہے۔ حاکم ابن کثیر علیہ الرحمہ ان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ  
 وهذا بعيد مناف لانصات المأمور، یہ معنی حق اور انصاف سے بعید اور انصات  
 بہ۔ (تفسیر ابن کثیر مع المعالم ج ۳ ص ۲۸۱ وغیرہ) مامور بہ کے قطعاً اور سراسر منافی اور مخالف ہے۔

(جلد ۲ ص ۲۸۱)

حضرات! آفتابِ نیم روز کی طرح یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مقتدی کے لیے سہمی اور جہری کسی بھی نماز میں قرأت کرنا استماع، انصات اور سکوت کے منافی ہے۔

گیارہواں اعتراض: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان جو اسکات اور خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ اس وقت آپ کیا پڑھا کرتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں یہ دُعا پڑھا کرتا ہوں۔ اللھم باعد بینی وبين خطایا می۔ (الحديث - بخاری جلد ۱ ص ۱۸۱)  
 امام بیہقیؒ اس روایت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ پڑھنے پر اسکات کا اطلاق صحیح ہے، لہذا جو شخص امام کے پیچھے آہستہ قرأت کرتا ہے تو وہ آیت استماع و انصات کی مخالفت نہیں کر رہا۔ (کتاب القرات ص ۷۵) یہی بات مبارک پوری صاحب وغیرہ نے بھی نقل کی ہے۔ (دیکھیے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵۱)

جواب۔ یہ اعتراض یا استدلال بھی غلط ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ ہمارا استدلال نص قرآنی سے ہے جس میں لفظ استماع اور انصات آیا ہے۔ اسکات اور سکوت کا لفظ صراحت کے ساتھ اس آیت میں مذکور نہیں ہے۔ استماع اور اسکات و سکوت کے درمیان فرق نمایاں ہے۔ امام بیہقیؒ نے جو یہ فرمایا ہے کہ ان میں فرق نہیں ہے صحیح نہیں ہے اور اسی سے قاضی مقبول احمد صاحب کو مغالطہ ہوا ہے۔ (دیکھیے الاعتصام) اس میں اہل علم کے لیے اشکال کی کوئی وجہ نہیں اور انصات اور سکوت میں جو فرق ہے وہ مبارک پوری صاحبؒ کو بھی مسلم ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ انصات اور سکوت کا معنی ایک نہیں ہیں بلکہ انصات کا معنی سکوت مع الاستماع ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵۱ و



تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۳۵۸) لہذا حدیث اسکا تہ سے استماع اور انصاف کی تفسیر کرنا اور اس پر استدلال کی بنیاد رکھنا باطل ہے۔

دثانیاً۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ حضرت زبید بن ارقم کی امدنا بالسکوت کی روایت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں نماز میں مطلقاً سکوت کا حکم دیا گیا کہ نہ تو تم شہادہ آمین پڑھو اور نہ تسبیح، تہمید، تشہد اور درود وغیرہ پڑھو۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ حکم سابق سے سکوت کا حکم دیا گیا کہ سلام و کلام وغیرہ سے سکوت اختیار کرو تو اس وقت میں سکوت عن الکلام المتقدم مراد ہے۔ (فتح الباری جلد ۲ ص ۶۰ محصلہ) گویا جن چیز سے سکوت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے حقیقتاً سکوت ہی مراد ہے۔ اس بیان کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب (المتوفی ۱۳۵۲ھ) حدیث اسکا تہ کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں اسکات عن التکبیر مراد ہے یعنی تکبیر تحریمہ سے اسکات اور سکوت کرنا (فصل الخطاب) خلاصہ یہ ہوا کہ اسکات کا معنی آہستہ پڑھنا نہیں جیسا کہ امام بیہقی رحمہ اللہ کو دھوکا ہوا ہے بلکہ اسکا حقیقی معنی ہی مراد ہے۔ وہ یہ کہ جس چیز سے خاموش رہنے کا حکم تھا اس کو حقیقتاً ترک کر دینا اور اس سے خاموش ہونا ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تو یہ ایک مجازی معنی ہے اور آیت زیر بحث میں جمہور سلف و خلف نص صحیح احادیث اور لغت کی روشنی میں حقیقی معنی مراد لیتے ہیں۔ لہذا مجازی معنی کو حقیقی معنی کے ترک کی دلیل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ چنانچہ امام ابو بکر الرازیؒ اسی حدیث کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: انما سَتْنَاهُ سَاكَا حِجَازِ اَوْ مَن لَّوِيْمَعِه يَظْنُه سَاكَا ۱ھ (احکام القرآن جلد ۳ ص ۴۹) یعنی اس کو ہم نے مجازی طور پر ساکت کہا ہے کیونکہ جو شخص اس کی قرأت کو نہیں سُن رہا وہ اس کو ساکت ہی خیال کرتا ہے۔ مجازی معنی خود قرینہ کا محتاج ہوتا ہے اور فریق ثانی اس سے حقیقت کو ترک کرنے پر تلا ہوا ہے۔

بارہواں اعتراض۔ مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ صاحب مجمع البحار نے (جلد ۱ میں) حدیث قرأ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیما امد وسکت فیما امد کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ قرآن کے معنی جہر کے ہیں اور سکت کے معنی اُسْر کے ہیں یعنی آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہر سے بھی قرأت کی اور آہستہ بھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے معنی جہر بھی آتے ہیں۔ اس

معنی کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیت واذا قرئ القرآن کا مطلب یہ ہوگا کہ جب قرآن جہر سے پڑھا جائے تو تم خاموش رہو۔ لہذا یہ آیت صرف جہری نمازوں کو شامل ہوگی۔ نہ کہ سہری نمازوں کو۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵۷۰ محصلہ)

**جواب۔** مبارک پوری صاحب کا یہ بیان بھی قابل التفات نہیں ہے۔  
 اولاً۔ اس لیے کہ آیت کا شان نزول صحیح روایات سے ترک قرأت ثابت ہو چکا ہے۔ اس میں قیاس کی ضرورت ہی نہیں ہے  
 وثانیاً۔ اہل عرب کے نزدیک قرآن اور جہل میں نمایاں فرق ہے اور حقیقت کو بلا کسی قوی اور صارف قرینہ کے ترک کرنا کئی وجہ سے باطل ہے۔

ثالثاً۔ اگر اس حدیث کا معنی ہی بیان کرنا مقصود ہے تو اس کی صحیح صورتیں بھی عرض کی جاسکتی ہیں۔ کیوں نہیں ہو سکتا کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم امامت کی حالت میں قرأت کرتے تھے۔ (قرأ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیما أمر) اور اقتدار کی حالت میں آپ نے سکوت اور خاموشی اختیار کی (وسکت فیما أمر) اور یہ بھی ممکن ہے کہ مطلب یہ لیا جائے کہ آپ نے پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد قرأت کی اور کوئی نہ کوئی سورت یا قرآن کا کچھ حصہ پڑھا (قرأ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیما أمر) اور پچھلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد اور کوئی سورت نہ پڑھی۔ اور حقیقتاً سکوت اختیار کیا (وسکت فیما أمر) اور صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۰۷ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے کہ پچھلی دو رکعتوں میں

لے بیت اللہ کے پاس دومرتبہ آپ نے حضرت جبرائیلؑ کی اقتدار میں نماز پڑھی ہے۔ (ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۵۵ ترمذی جلد ۱ ص ۲) سفر تبرک سے واپسی پر آپ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف کی اقتدار میں ہے۔ (مسلم جلد ۱ ص ۱۳۴) ابوداؤد جلد ۱ ص ۲) اہل قبا کے درمیان مصالحت کرنے کے بعد واپسی پر آپ نے عصر کی نماز میں حضرت ابوبکرؓ کی اقتدار میں ہے۔ (بخاری جلد ۲ ص ۱۰۶) اور نزل جبرائیلؑ فامنی۔ الحدیث بخاری جلد ۱ ص ۱۴۵ و مسلم جلد ۱ ص ۲۲۱ اور مؤطا امام مالک ص ۷ وغیرہ میں موجود ہے۔ جس سے حضرت جبرائیلؑ کی اقتدار میں آپ کا نماز پڑھنا ثابت ہے اور آخری نماز میں آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدار میں جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ آپ کی نفس اقتدار کے ثبوت کے لیے یہ دلائل کافی ہیں۔



آپ صرف سورۃ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔ جب سکت کے اور قرآن کے معنی کے لیے صحیح احادیث سے اور احتمالات کا بھی ثبوت مل سکتا ہے جن سے حقیقی معنی درست ہو سکتے ہیں تو پھر مجاز مراد لینے کی کون سی مجبوری ہے، جس کے لیے ایسی رنگیک اور بار و تاویل اختیار کی جائے؟ اور ہمارے بیان کردہ مطلب ہی سابق اور آئندہ دلائل کا ساتھ دیتا ہے، جس کو صحیح ہونے کے ساتھ جہود کی تائید کا شرف بھی حاصل ہے۔

ورابعداً۔ کیا مبارک پوری صاحبؒ فَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُوسَى الْغَضَبِ اور اِمْرًا بِالسُّكُوتِ اور سکت النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الروح فسکت (بخاری جلد ۱ ص ۲۴) وغیرہ کا یہ معنی کریں گے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کا غصہ آہستہ آہستہ بولنا رہا۔ ہمیں نماز میں آہستہ آہستہ سلام و کلام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ سائلین کے سوال کے بعد آپ آہستہ بولتے رہے؟ اور کیا یہ فَاَصْدَعَ بِمَا تُؤْمَرُ مِنْ خَلْفِ نَهْیْکَ؟ اور دل میں آہستہ آہستہ بولنے سے سائلین کو کیا فائدہ تھا؟ لہذا اس استدلال میں بھی کوئی جان نہیں ہے۔

### تیرھواں اعتراض۔

حافظ ابن ہمامؒ نے آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ فاستمعوا میں اللہ تعالیٰ نے جہری نمازوں میں قرأت سے مقتدیوں کو منع کیا ہے اور انصاف میں ستری نمازوں میں ان کو قرأت سے روکا ہے۔ مبارک پوری صاحب ان پر گرفت کرتے لکھتے ہیں کہ ابن ہمامؒ کے کلام میں تین فساد ہیں:

۱۔ ابن ہمامؒ انصاف کا معنی سکوت سمجھے ہیں۔ حالانکہ انصاف کا معنی مطلق سکوت کے نہیں ہیں بلکہ سکوت مع الاستماع کے ہیں۔

۲۔ ابن ہمامؒ کی تفسیر بالرائے ہے۔ (جس کا حرام ہونا مبرہن ہے)

۳۔ ستری نمازوں میں سماع قرأت کے بغیر تدبیر کیسے متصور ہو سکتا ہے؟ (تحقیق الکلام ص ۴۶)

جواب۔ مبارک پوری صاحبؒ کی تینوں شقیں مردود ہیں:

پہلی اس لیے کہ مبارک پوری صاحبؒ خود غلطی کا شکار ہیں۔ وہ سماع اور استماع کو ایک سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سماع اور استماع میں زمین آسمان کا فرق ہے اور متعدد دعوائل سچے یہ امر ثابت

کیا جا چکا ہے۔ اگر واقعی استماع کا معنی سننا ہوتا تو حافظ ابن ہمام پر اعتراض کی گنجائش تھی۔ اور دوسری شق اس لیے مخدوش ہے کہ حافظ ابن ہمام کی تفسیر بعینہ قرآن کریم، صحیح احادیث لغت اور جمہور مفسرین کی تفسیر ہے۔ لہذا اس کو تفسیر بالرائے سے تعبیر کرنا ان دلائل سے غفلت اور بے خبری پر مبنی ہے۔ اور بلا تحقیق یہ الزام لگانا کھلی جسارت ہے۔ اور

تیسری شق اس لیے باطل ہے کہ اگر مبارکپوری صاحبؒ اس دعوے میں مبتلا ہیں کہ استماع کا مطلب سماع ہے (اور جبھی تو وہ سماع قرأت کی آڑ لیتے ہیں) تو اس کی پوری تفصیل پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ سماع اور استماع میں فرق ہے۔ اور اگر وہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ انصات کا سماع کے بغیر تحقق نہیں ہو سکتا تو یہ بھی باطل ہے۔ کیونکہ انصات کے مفہوم میں من وجہ استماع اور توجہ تو شامل ہے لیکن اس میں سماع پر گز شامل نہیں ہے۔ ایک حدیث بایں الفاظ آتی ہے۔

وان تأی وجلس حیث لا یسمع فانصت  
اگر کوئی شخص جمعہ کے خطبہ کے وقت امام سے  
ولعل ینلج کان لہ کفل من الاجر (الحديث)  
دور بیٹھ گیا جہاں سے امام کی آواز وہ نہیں سن سکتا اور  
(ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۵۱)  
خاموش رہا تو اس کو ایک درجہ ثواب حاصل ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انصات کے لیے سماع شرط نہیں ہے۔ انصات وہاں بھی ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے جہاں خطبہ وغیرہ کچھ بھی نہ سنا جاسکتا ہو۔ اگر انصات کے تحقق کے لیے سماع شرط ہوتا تو بغیر سماع کے انصات نہ پایا جاسکتا۔ اور یہ بھی مت بھولے کہ انصات میں گو فی الجملہ استماع ملحوظ ہے لیکن من کل الوجوہ استماع بھی اس میں ضروری نہیں ہے۔ انصات کا معنی خاموش ہونا ہے اور یہ معنی بغیر استماع اور توجہ کے بھی متحقق ہو سکتا ہے اور استماع کے ساتھ بھی متحقق ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

فلا انصات ہوا لسكرت وهو یحصل  
انصات کا معنی سکوت کرنا اور خاموش رہنا  
من یتعم وممن لا یتستمع کان  
ہے اور انصات ایسے شخص سے بھی ہو سکتا ہے جو  
یکون مفکراً فی امر آخر۔  
استماع اور توجہ کرے اور انصات اس شخص سے بھی  
ہو سکتا ہے جو استماع اور توجہ نہیں کرتا، بلکہ کسی اور  
(فتح الباری جلد ۱ ص ۲۵۰ بحوالہ فتح الملہم ۲)  
امر کی فکر میں ڈوب کر خاموش ہے۔



بہر حال مبارکپوری صاحب کی پیش کردہ تینوں شقیں باطل ہیں اور اس کے مصداق ہیں کہ .... ع: میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکال یا مؤلف خیر الکلام نے (اور انھیں کی پیروی میں قاضی مقبول احمد صاحب نے ملاحظہ ہو الاعتصام ۵ اکتوبر ۱۹۹۲ء) اس سلسلہ میں جو مخلص تلاش کیا ہے وہ بھی بڑا ہی عجیب ہے۔ انھوں نے ص ۳۷۰ سے ص ۳۹۴ تک کئی صفحات اس پر سیاہ کر ڈالے ہیں مگر بعض باتوں کو شہید وہ خود بھی نہ سمجھے ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں صرف کچھ کہنے اور لکھنے کا نام جواب نہیں ہوتا۔ ذیل کے امور کو ملحوظ رکھیں۔

۱۔ ہم نے کتب لغت سے باحوالہ یہ ثابت کیا ہے کہ انصاف کے معنی بالکل خاموشی اور استماع کے معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے، مؤلف مذکور کا یہ فریضہ تھا کہ وہ باحوالہ کتب لغت یہ ثابت کرتے کہ انصاف مطلق خاموشی نہیں بلکہ اس میں کلام کرنا درست ہے اور استماع کا معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا نہیں بلکہ اس کا معنی سننا اور آہستہ آہستہ بولنا ہے لیکن جب وہ اس سے بالکل لاجواب رہے تو یہ کہہ کر جان چھڑا لی ہے کہ پھر ہم کو اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ سکوت اور انصاف لغت کے لحاظ سے آہستہ پڑھنے کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ بلکہ ہمارے لیے اس قدر کافی ہے کہ ہم ثابت کر دیں کہ قرآن مجید کی آیت زیر بحث میں جو استماع اور انصاف آیا اس سے بالکل خاموشی مراد نہیں۔ (ص ۱۷۱) مگر یقین جانیے کہ اس سے بالکل خاموشی مراد ہے۔ حضرات ائمہ لغت اور جہور مفسرین کی روشن عبارتیں اس کا بین ثبوت ہے۔ جن کے حوالے گذر چکے ہیں چونکہ لغت سے ایسی ایک ایسا فن ہے جو بلا کسی فریق کے لحاظ کے صحیح بات بتاتا ہے۔ اس لیے مؤلف خیر الکلام لغت سے اپنی تائید پیش کرنے سے بالکل قاصر رہے ہیں۔

۲۔ جن روایات سے انھوں نے استدلال کیا ہے کہ سکوت قرآن کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے ان میں ایک روایت بخاری کی اور ایک مستدرک وغیرہ کی ہے کہ اسکا تک ما بین التکبیر والقرآن ما تقول... الخ ویسکت بعد القراءة ہنیۃ یسأل اللہ من فضله۔ تو ہم نے احسن الکلام میں اس کی تصریح کر دی ہے کہ نص قرآنی میں انصاف و استماع

کالفاظ ہے اور باقر مبارکپوری صاحب انصاف اور سکوت میں فرق ہے اس لیے یہ جملہ حوالے ہمارے خلاف نہیں ہیں کیونکہ ہمارا استدلال تو انصاف و استماع کے لفظ سے ہے اور اور انصاف و سکوت میں فرق ہے۔

۳۔ فتح الباری جلد ۱ ص ۳۴۰ کے حوالہ سے ابن جریرؒ سے جو روایت نقل کی گئی ہے کہ لوگ مؤذن کی اذان کے لیے خاموش رہتے تھے بایں ہمہ وہ اذان کے کلمات دہراتے تھے جس سے مؤلف خیر الکلام نے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ انصاف میں کلمہ درست ہے۔ (مختلہ خیر الکلام ص ۳۷۲) تو یہ اثر بالکل ضعیف ہے کیونکہ اس میں حدیث ہے اور یہ معلوم نہیں کہ بیان کرنے والا کون ہے؟ اور ہے بھی موقوف اس میں مرفوع روایات کے مقابلہ میں کیا حجت ہے؟ علاوہ ازیں اذان پر قیاس باطل ہے کیونکہ اذان میں ہر کلمہ کے بعد وقفہ ہوتا ہے جس میں اجابت مؤذن ہو سکتی ہے۔ بخلاف امام کے پیچھے قرأت کے کہ سکوت کا صحیح احادیث سے ثبوت نہیں اور مقدمہ ہی کو بڑھانا منع ہے۔

۴۔ مجمع الزوائد جلد ۳ ص ۱۲۳ سے جو روایت نقل کی ہے کہ من صام رمضان فی انصاف و سکون.... الخ اس کی سند و کار ہے کہ آیا صحیح بھی ہے یا نہیں؟ ضعیف قسم کی روایتوں قرآن و احادیث صحاح اور اجماع امت اور لغت کو کس طرح رو کیا جاسکتا ہے؟ علامہ دمشقیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں الولید بن الولید ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ اس کی توثیق کرتے ہیں۔ وضعفہ جماعة اور دیگر حضرات محدثین کرامؒ اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ (مجمع الزوائد، جلد ۳ ص ۱۲۳) علاوہ ازیں اس سے جھوٹ، گالی گلوچ اور غیبت وغیرہ سے صحیح معنی میں انصاف مراد ہے جیسا کہ مقتدی کے لیے انصاف عن القراءة مراد ہے۔ کیونکہ باقی باتوں کا تو نماز میں احتمال ہے ہی نہیں اور جن حضرات سے اس کے علاوہ کچھ اور منقول ہے تو وہ لاعلمی پر مبنی ہے۔

۵۔ جو آیات مؤلف خیر الکلام ص ۳۶۶ پر پیش کی ہیں کہ قرآن کریم کی تلاوت کے وقت کچھ کلمات کہہ سکتے ہیں تو انھوں نے یقولون اور قالوا کے الفاظ پر غور نہیں کیا کیونکہ یہ زبان کے ساتھ پڑھنے پر نص نہیں ہیں دل میں کہنے پر بھی قال اور یقول کا اطلاق صحیح ہے۔



حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک خاص موقع پر اپنے بھائیوں سے کہا: قَالَ اَنْتُمْ شَرُّ مَكَانًا.....  
 الآیہ۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ قال هذا في نفسه (ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۴۸۶) یہ  
 قول انھوں نے دل میں کہا تھا، مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہیے کہ نزاع قرآن اور یقراء کے الفاظ  
 میں ہے قال اور یقول میں نہیں ہے اور نہ ان کی پیش کردہ آیات سے انصاف اور استماع  
 کے وقت قرأت ثابت ہوتی ہے۔

۶۔ مؤلف خیر الکلام نے جو قرأتیں پیش کیے ہیں کہ انصاف و سکوت وغیرہ کے ساتھ قرأت ہو  
 سکتی ہے تو اگر ان کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی مجاز ہے اور انصاف و استماع کا جو معنی ہم نے کیا  
 ہے وہ حقیقت ہے جو صحیح احادیث کے علاوہ اجماع اُمت اور لغت سے قوی طور پر مؤید ہے  
 اس لیے اس کو ترک کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے اور نہ اس کو کوئی سننے کے لیے تیار ہے چنانچہ  
 خود مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ کیونکہ ہم کو اس امر کی ضرورت ہے کہ معلوم کریں کہ آیت میں  
 استماع اور انصاف کا کیا درجہ ہے خواہ وہ اطلاق حقیقی ہو یا مجازی۔ جب یہ ثابت ہو جائے تو  
 مدعی حاصل ہو جاتا ہے باقی بحث زائد ہے (ص ۳۷۱) آپ پر کیا مصیبت وارد ہوئی ہے کہ آپ  
 اطلاق مجازی کے پیچھے کمر بستہ ہو کر نصوص صحیحہ کی خلاف ورزی کر رہے ہیں جو کچھ ائمہ لغت اور  
 جہور اُمت نے کہا ہے اسے تسلیم کر لیں۔ اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جن حضرات سے انصاف و  
 استماع اور سکوت وغیرہ کے حوالے مؤلف خیر الکلام نے نقل کیے ہیں چونکہ وہ اس مسئلہ میں فریق کی  
 حیثیت رکھتے ہیں جن کی تفسیر میں ان کا اپنا ذہن بھی کار فرما ہے اور ان کی تفسیر خود محل نزاع ہے  
 اس لیے صحیح احادیث اور کتب لغت ہی سے ان کے معانی حل ہو سکتے ہیں۔ مؤلف خیر الکلام ص  
 ۳۸۶ میں لکھتے ہیں کہ پس ضروری ہے کہ جو آیت میں بالکل خاموشی کا معنی لیتا ہے وہ دو باتیں  
 ثابت کرے۔ ایک یہ کہ انصاف لغت میں بالکل خاموشی کے معنی میں آتا ہے۔ دوم یہ کہ  
 اس کے خلاف جو قرأتیں پیش کیے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں..... ۱۷

بجاء اللہ تعالیٰ ہم کتب لغت سے ثابت کر چکے ہیں کہ انصاف کے معنی لغت میں بالکل خاموشی  
 کے آتے ہیں اور جو قرأتیں اس کے خلاف پیش کیے گئے ہیں وہ سب مجازی ہیں۔ اس لیے حقیقت  
 کو ترک کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے اور نہ شاذ اور خلاف اجماع قول کو لے کر جہور کا مسلک رد

کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ مؤلف خیر الکلام نے ص ۳۷۰ میں جو یہ لکھا ہے کہ اگر انصت بدون لام کے ذکر ہو تو سکوت کے معنی میں ہے اور جب اس کے ساتھ لام ہو تو اس میں استماع بھی ہے۔ اور قاموس جلد ۱ ص ۵۹ کا حوالہ انصتۃ ولہ سکت لہ واستمع لحديث نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ اس کا عطف فاسمۃ حوالہ پر ہے لہذا یہاں بھی لام ہے یا مقدر مافی جاتیگی۔ (مُحَصَّل) تو یہ محض لفظوں کا کرب ہے محض لفظوں کی شعبہ بازی سے کیا بنتا ہے۔ قاموس میں انصتۃ ولہ لام کے ساتھ ساتھ ہو یا بدون لام کے دونوں کے معنی سکت کیا ہے اور قرآن کریم میں انصات اور استماع دو الگ الگ حکم ہیں۔ ایک کی لام دوسرے کو دے کر کام نکالنا اور اس طرح کی خانہ پری سے کچھ نہیں بنتا۔

۸۔ ہم نے قاموس کا حوالہ دیا ہے۔ اس پر مؤلف خیر الکلام ص ۳۹۳ میں لکھتے ہیں کہ قاموس میں اس سے آگے لکھا ہے کہ وَجَلَّ سَكْتُ قَلِيلُ اَكْلًا مَ فَاذَا تَكَلَّمَ احسن (قاموس جلد ۱ ص ۹۳) یہ آدمی سکت ہے یعنی کم باتیں کرتا ہے جب کلام کرتا ہے تو اچھا کلام کرتا ہے .... ۱۷ مگر اس حوالہ سے مؤلف کو کیا فائدہ ؟ وجَلَّ سَكْتُ کا معنی تو یہ ہے کہ خاموشی طبع کم گو ہے مگر جب کلام کرتا ہے تو اچھا کلام کرتا ہے۔ اس میں یہ کہاں ہے کہ وہ خاموشی اور انصات کے وقت کلام کرتا ہے جو مؤلف مذکور کا مدعی ہے۔ انصات اور خاموشی اپنے وقت پر ہے اور کلام اپنے وقت پر ہے۔ دونوں کا وقت ایک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف مذکور کو سمجھ عطا فرمائے ان کو ثابت تو یہ کرنا ہے کہ انصات کے وقت کلام ہو رہا ہے۔ اور اس حوالہ میں اس کا ذکر کوئی نہیں۔ خاموشی اپنے وقت پر ہے اور کلام اپنے وقت پر ہے۔ اور اس بات کو ایک عام آدمی بھی بخوبی سمجھتا اور سمجھ سکتا ہے۔ مگر عجب ! اک دل ہے جو ہر خطہ الجھتا ہے خرد سے

چودھواں اعتراض

حضرت امام بخاری رحمہ، امام ترمذی رحمہ، امام بیہقی رحمہ، مولانا شمس الحق رحمہ، مولانا ابو عبد الرحمن رحمہ

۱۔ کتاب القراءۃ ص ۲۹ و ۱۷

۲۔ جزء القراءۃ ص ۵۸ و ۹

۳۔ التعلیق المعنی جلد ۱ ص ۱۳۵

۴۔ ترمذی جلد ۱ ص ۳۲



محمد عبد اللہ، مولانا عبد الصمد اور مبارک پوری صاحب وغیرہ فرماتے ہیں کہ ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ آیت استماع اور انصات کا مطلب یہی ہے کہ مقتدی کو بجالتِ قرأتِ امام توجہ کرے ہوئے خاموشی اختیار کرنی چاہیے اور جب امام قرأت کر رہا ہو تو اس وقت مقتدی کو کچھ بھی نہیں پڑھنا چاہیے اور مکمل خاموشی اختیار کرنی چاہیے لیکن مقتدی کو سکنااتِ امام میں قرأت کرنی چاہیے اور سکناات میں قرأت کرنا آیت مذکورہ کے منافی نہیں ہے اور سکناات کا ثبوت یہ ہے۔

۱۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ امام جس وقت سکتہ کرے تو اس وقت مقتدی کو قرأت کرنی چاہیے کیونکہ جس شخص نے قرأت نہ کی۔ اس کی نماز میں خلل اور نقصان واقع ہوگا۔ (کنز العمال جلد ۴ ص ۹۶)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص امام کے ساتھ فرض نماز میں شریک ہو۔ اس کو امام کے سکناات میں سورۃ فاتحہ پڑھنی چاہیے۔ (کتاب القراءۃ ص ۵۴، مستدرک جلد ۱ ص ۲۳۸)

۳۔ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جده سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انصات اور سکتہ کرتے تھے تو اس وقت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپ کے پیچھے قرأت کر لیا کرتے تھے۔ (کتاب القراءۃ ص ۶۹، ۸۶)

۴۔ ہشام بن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ اے فرزند جب امام سکتہ کرے تو تم اس وقت قرأت کر لیا کرو۔ اور جب امام قرأت کرے تو اس وقت تم خاموش ہو جاؤ۔ کیونکہ فرض نماز ہو یا نفل۔ اگر اس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو نماز ادا نہیں ہوتی۔ (جزء القراءۃ ص ۵۸، کتاب القراءۃ ص ۸۷)

۵۔ حضرت ابوسلمہؒ یا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ امام کے لیے دو سکتے ہوتے ہیں۔ ان کو سورۃ فاتحہ کی قرأت کے لیے غنیمت سمجھو۔ (جزء القراءۃ ص ۵۸، کتاب القراءۃ ص ۸۷)

۴۔ حضرت سعید بن جبیر کا بیان ہے کہ سلف کا طریقہ یہ تھا کہ جب ان کو کوئی نماز پڑھاتا اور امامت کا فریضہ بجالاتا تو نماز میں ضرور سکتہ کیا کرتا تھا تاکہ مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔  
(جزء القراءة ص ۵۷)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ سکنات امام کا وجود اور ثبوت بھی ہے۔ لہذا اس صورت میں قرآن کریم اور حدیث دونوں پر عمل ہو جائے گا۔

جواب۔ ان حضرات کا یہ استدلال نہایت ضعیف اور کمزور ہے۔ کیونکہ یہ اکثر و بیشتر روایات حضرات صحابہ و تابعین پر موقوف ہیں اور پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ فریق ثانی کے نزدیک درموقوفات صحابہ حجت نیست۔ جب حضرات صحابہ کرام کا یہ حال رہا تو تابعین اور اتباع تابعین وغیرہم کی کیا پوزیشن باقی رہ جاتی ہے۔ اور یہ جتنے آثار و روایات نقل کی گئی ہیں۔ ان میں ایک بھی صحیح نہیں ہے۔ ترتیب وار جوابات ملاحظہ کریں:

اثر ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ اولاً۔ یہ اثر موقوف ہونے کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نہیں۔ بلکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا نام لینا راویوں میں سے کسی کی غفلت اور غلطی کا نتیجہ ہے۔ (دیکھیے کتاب القراءة ص ۲۵)

وثانیاً۔ اس میں سورۃ فاتحہ کی تصریح موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ اثر مجمل ہے۔

وثالثاً۔ اس کی سند میں شعی بن صباح راوی کمزور ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس کے

دماغ میں فتور آ گیا تھا۔ (ضعفاء ص ۳۰) امام نسائی رحمہ اللہ اس کو متروک کہتے ہیں۔ (ضعفاء صغیر

نسائی ص ۵۳) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے (تقریب ص ۳۲۶) امام بخاری القطن

اور ابن حمدی رحمہ اللہ اس کی روایت کو قبول نہیں کرتے تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ محض

ہیچ ہے۔ ابن معینؒ اس کو لیس بذالک اور ابن عدیؒ ضعیف کہتے ہیں (میزان الاعتدال جلد ۱

ص ۷)۔ امام ترمذی رحمہ اللہ، ابن سعد رحمہ اللہ، علی بن الجندی رحمہ اللہ، دارقطنی رحمہ اللہ، ابن حبان، ساجی رحمہ

ابو احمد الحاکم رحمہ اللہ، سحنون رحمہ اللہ اور امام عقیلی رحمہ اللہ وغیرہ سب اس کی تضعیف کرتے ہیں۔

(تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۶)

حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ اس روایت کی سند میں محمد بن عبداللہ بن



غیر موجود ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف تھا (ضعفاء ص ۲۸) امام مسلم کہتے ہیں کہ امام یحییٰ القطان اس کی تضعیف کرتے تھے۔ (مسلم جلد ۱ ص ۲۰) امام نسائی اس کو متروک کہتے ہیں۔ (ضعفاء ص ۲۵) امام بیہقی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ قابل احتجاج نہیں۔ (کتاب القراءة ص ۵۴) امام دارقطنی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۱) امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ قوی نہیں (ترمذی جلد ۲ ص ۱) امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۷۷ و لسان المیزان جلد ۵ ص ۲۱۶) علاوہ انہیں اس روایت میں صلوٰۃ مکتوبہ کی قید ہے۔ حالانکہ فریق ثانی کے نزدیک صلوٰۃ تراویح..... صلوٰۃ عید اور صلوٰۃ وتر وغیرہ میں بھی امام کے پیچھے قرأت فاتحہ ضروری ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک موقوف اثر بھی مروی ہے۔ کہ سکتہ امام میں قرأت فاتحہ کے بغیر نماز مکمل نہیں ہو سکتی (کتاب القراءة ص ۶۶) لیکن اس کی سند میں اسحاق بن عبد اللہ بن ابی فروہ نہایت ضعیف اور کمزور راوی موجود ہے۔ جس کی پوری بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز

روایت عمرو بن شعیب عن ابیہ..... الخ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے روایتی سلسلہ میں محدثین کا کلام معروف و مشہور ہے۔ امام یحییٰ القطان فرماتے ہیں کہ اس کی سند ہمارے نزدیک ضعیف اور کمزور ہے۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۴۳، ۱ ص ۸۲) امام ابو داؤد رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ وہ آدمی حجت بھی نہیں۔ امام ابو زرہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ محدثین اس لیے ان پر کڑی جرح کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے باپ سے چند روایتیں سنیں ہیں اور وہ باپ دادا کی تمام غیر مسموع روایات کو بلا تشاہید بیان کرتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۲ صفحہ ۲۸۹) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ انھوں نے عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے کچھ بھی نہیں سنا۔ وہ کتاب سے نقل کر کے محض تدلیس سے کام لیتے ہیں۔ (طبقات المدلسین ص ۱۱) امام طحاوی رحمہ اللہ بھی ان کی سند کو منقطع سمجھتے ہوئے اس کو ضعیف کہتے ہیں (طحاوی جلد ۱ ص ۴۵)

لہٰذا حضرات محدثین کرام کا یہ ضابطہ ہے۔ اگر اسناد اپنی کتاب اور بیاض سے روایت کرنے کی شگرد کو اجازت نہ دے۔ تو وہ اس کتاب اور بیاض سے روایات بیان کرنے کا مجاز نہیں اور اس کی ایسی روایتیں قابل حجت نہیں ہو سکتیں۔ (شرح نکتہ الفکر ص ۱۰۰)

امام حاکم کہتے ہیں کہ ان کی روایت مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف سمجھی جاتی ہے۔  
 (مسند رک جلد ۱ ص ۱۹۷) محدث ابن حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عمرو بن شعیب کتاب سے روایت  
 نقل کرتے ہیں جو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے اما حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ  
 فصحیفۃ لا تصح۔ (محلی ابن حزم جلد ۱ ص ۲۲۲)

امام علی بن المذینی فرماتے ہیں کہ عمرو بن شعیب جب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت  
 نقل کرے تو وہ کتاب سے (جو انھوں نے پائی تھی) نقل کرتا ہے فہو ضعیف المذاوہ ضعیف  
 ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں کہ وہ فی نفسہ ثقہ ہے مگر عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے مرسل ہے  
 ابن جبان فرماتے ہیں کہ جب وہ طاؤس اور سعید بن المسیب وغیرہ ثقات سے روایت  
 نقل کرے تو حجت ہے۔ اور جب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت کرے تو اگر  
 جدہ سے عبد اللہ مراد ہیں تو حدیث منقطع ہوگی اور اگر محمد مراد ہوں تو مرسل ہوگی (تہذیب  
 التہذیب جلد ۸ ص ۵۳) اور محدث ساجی فرماتے ہیں کہ

قال ابن معین ہو ثقہ فی نفسہ و  
 ماروی عن ابیہ عن جدہ لا حجة  
 فیہ ولیس بہ متصل و هو ضعیف... الخ  
 امام ابن معین نے فرمایا کہ وہ فی نفسہ ثقہ ہے  
 لیکن جب عن ابیہ عن جدہ سے روایت کرے تو  
 حجت نہیں اور اس کی سند متصل نہیں بلکہ ضعیف ہے۔  
 (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۸)

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے سنا:

يقول له اشياء منا كيدوا انما يكتب  
 حدیثہ یعتبر بہ فاما ان یکون حجة فلا  
 انھوں نے فرمایا کہ اس سے بہت سی منکر اشیا  
 بھی ہیں اس کی حدیث اعتبار کے لیے تو لکھی  
 جاسکتی ہے لیکن حجت کسی صورت میں نہیں سکتی۔  
 (ایضاً ص ۴۹)

اور امام ائرم فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ میں اس کی حدیثیں لکھ لیتا ہوں کبھی  
 تو اس سے احتجاج کر لیتا ہوں۔

وربما وجس فی القلب منہ شیء (ایضاً ص ۴۹)  
 اور کبھی اس سے دل میں کھٹکا گذرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مولف تحفہ الکلام نے (۱۹۳ و ۱۹۴) میں بحوالہ تحفۃ الاحوذی جلد ۱  
 ۲۶۷



امام احمد اور امام علی بن المذنبی کے بارے میں جو یہ لکھا ہے کہ وہ عمرو بن شعیب کی روایت کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں صحیح نہیں ہے اور علامہ ذہبی نے عمرو بن شعیب کی روایت کو جو حسن کہا ہے تو اس سے اس کی دوسرے طرق سے روایت مراد ہے نہ کہ عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے کیونکہ اس پر امام الجرح والتعديل امام یحییٰ بن سعید القطان اور یحییٰ بن معین وغیرہ کی مفصل جرح موجود ہے۔

امام ابن حبان اپنا فیصلہ یہ بیان کرتے ہیں کہ فی روایت عن ابیہ عن جدہ مناکیر كثيرة لا يجوز عندی الاحتجاج بشیء منها۔ (اسعاف المبطأ بجال المؤطأ ص ۲) عمرو بن شعیب کی عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے میرے نزدیک کوئی روایت قابل احتجاج نہیں ہے کیونکہ ان میں کثرت سے نکارت ہوتی ہے۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: بعض محدثین ان کی مطلقاً تضعیف کرتے ہیں اور جہور ان کی توثیق کرتے ہیں اور بعض دیگر ان کی بعض روایتوں کو ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں اور اپنا فیصلہ یوں ارقام فرماتے ہیں:

ومن ضعفه مطلقاً فمحمول علی ردائیه  
عن ابیہ عن جدہ (تهذيب التهذيب ص ۸)  
جو حضرات ان کی مطلقاً تضعیف کرتے ہیں۔  
سوان کی یہ تضعیف صرف عن ابیہ عن جدہ  
کے طریق پر محمول ہوگی۔

علامہ سید سلیمان ندوی (المتوفی ۱۳۷۷ھ) لکھتے ہیں کہ اور یہ بیچارے اس لیے ضعیف سمجھے جاتے تھے کہ ان کو کتاب مل گئی تھی جس سے حدیثیں نقل کرتے وقت وہ تالیس سے کام لیتے تھے۔ (خطبات مدراس ص ۵۳) عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے ایک اور روایت بھی مروی ہے کہ جس نے سکناات امام میں سورۃ فاتحہ کی قرأت نہ کی تو اس کی نماز کا مل ادا نہ ہوگی۔ (کتاب القراءة ص ۵۵-۵۴)

لیکن اس کی سند میں علاوہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے محمد بن عبد اللہ بن عبید بن عمیر واقع ہے جس کا حال ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں۔

ہشام بن عروہ رحمہ کی روایت: ان کی روایت موقوف ہونے کے علاوہ ضعیف بھی

ہے اس کی سند میں موسیٰ بن مسعود ایک راوی ہے۔ امام احمد اس میں کلام کرتے ہیں۔ ترمذی ان کی تضعیف کرتے ہیں۔ امام ابن خزیمہ کا بیان ہے کہ اس سے احتجاج درست نہیں۔ بغداد اس کو ضعیف الحدیث کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۸۱) ابو حاتم رحمتے ہیں کہ مؤمل بن اسماعیل اور ابو حذیفہ (موسیٰ) دونوں کی کتابوں میں بہت غلطیاں ہیں۔ عمرو بن علی الفلاس کہتے ہیں کہ کوئی صاحب بصیرت محدث اس سے احتجاج نہیں کر سکتا۔ ابو احمد حاکم کا بیان ہے کہ وہ قوی نہ تھا۔ ابن قانع کہتے ہیں کہ اس میں ضعف ہے۔ امام حاکم کہتے ہیں کہ وہ کثیر الوہم اور سعی المحفظ تھا۔ ساجی اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ دارقطنی اس کو کثیر الوہم بتاتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۷۱)

علاوہ ازیں اس روایت میں فصاعداً کی زیادت بھی موجود ہے۔ کیا فریق ثانی سورۃ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا مقتدی کے لیے جواز سمجھتا ہے؟

اثر ابو سلمہ یا ابو ہریرہؓ۔ یہ اثر بھی موقوف ہونے کے علاوہ ضعیف ہے۔ اس کی سند میں موسیٰ بن مسعود واقع ہے جس کی حقیقت آپ کو معلوم ہو چکی ہے۔ مزید برآں روایت کو اس کا پورا یقین بھی نہیں کہ یہ روایت حضرت ابو سلمہ (تابعی) سے ہے یا حضرت ابو ہریرہؓ سے مؤلف خیر الکلام کا اس کو مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے حدیث حسن کہنا (ملاحظہ ہو خیر الکلام ص ۳۳۷) غلط ہے۔ کیونکہ یہ راوی نہ مختلف فیہ ہی نہیں بلکہ جمہور محدثین کرام کی اس پر کڑی جرح منقول ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

اثر سعید بن حمیرہؓ۔ یہ اثر بھی موقوف ہونے کے علاوہ ضعیف اور کمزور ہے۔ اس کی سند کا ایک راوی عبداللہ بن رجاہؓ کی ہے۔ امام احمد اور ازہری رحمتے ہیں کہ اس کی روایت میں نکارت ہوتی ہے۔ (میزان جلد ۳ ص ۳۷۷) ساجی کا بیان ہے عندہ مناکیر (تہذیب التہذیب جلد ۵) کہ وہ صاحب مناکیر ہے۔ اس سند کی کڑی کا دوسرا ضعیف راوی عبداللہ بن عثمان بن غنیم ہے اسکے بارے میں محدثین کرام کے متضاد اقوال منقول ہیں امام ابن عیینہؓ کو ثقہ جتھ کہتے ہوئے بھی یہ فرماتے ہیں احادیثہ لیست بالقویۃ۔ امام ابو حاتمؓ ماہم بأسی صالح الحدیث کہنے کے باوجود فرماتے ہیں وکان یخطئ (اور نیز فرمایا لا یحتج بہ میزان الاعتدال ص ۳۷۷) امام نسائیؓ نے ایک مرتبہ ثقہ اور ایک مرتبہ لیس بالقوی کہا اور امام علی بن المدینیؓ کو منکر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ص ۳۱۵)



امام دارقطنی رحمہ اللہ کا بیان ہے۔ ضعیف لیسوہ وہ ضعیف ہے اور محدثین اس کو ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں۔ (نصب الرأی جلد ۱ ص ۳۵۳) مبارکپوری صاحب کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ مولانا عبدالحی کے رسالہ امام الکلام ص ۷۳ کی آٹھ لکھتے ہوئے اس ضعیف اور کمزور اور راہی اثر کو صحیح کہتے ہیں۔ (دیکھیے ابکار المنن ص ۱۶۷) فوا اسفا۔

سعید بن جبیر کا بعینہ اس مضمون کا اثر کتاب القراءة ص ۸۷، ۶۹ میں بھی مذکور ہے، لیکن سند میں وہی عبد اللہ بن عثمان بن خثیم ہے۔

یہ ہیں وہ روایات و آثار جن سے یہ حضرات سکات امام میں مقتدی کے لیے قرأت سورۃ فاتحہ تجویز کرتے ہیں۔ ابھی تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ سکات امام کا روایتی پہلو تھا۔ اب آپ درایتی پہلو بھی سن لیجئے۔ جہاں تک سکات امام کا ثبوت مل سکتا ہے وہ صرف دو سکتے ہیں، پہلا سکتہ تجزیر تحریمہ کے بعد کا سکتہ ہے اور فریق ثانی کو اس امر میں اتفاق ہو گا کہ نہ تو اس میں قرأت سورۃ فاتحہ کا ثبوت ہے اور نہ گنجائش اور دوسرا سکتہ سورۃ فاتحہ کی قرأت سے فارغ ہونے کے بعد امام اس لیے کرتا ہے تاکہ امام

حتی یتراء الیہ نفسہ۔ (نسائی جلد ۱ ص ۱۱۱) قرأت سے فارغ ہونے کے صرف سانس لے سکے۔

ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۱، ترمذی جلد ۱ ص ۳۴، داعمی ص ۱۲۶

اور صرف اس سکتہ میں سورۃ فاتحہ کی قرأت کیسے ممکن ہے؟ اور پھر ایک سکتہ کے سکات کیسے بن گئے؟ خود مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں:

بل السکتہ الثانیۃ کا نزلون یتراء الیہ نفسہ بلکہ دوسرا سکتہ تو صرف اس لیے ہوتا تھا کہ امام قرأت سے فراغت کے بعد سانس لے سکے۔ جیسا کہ فقرہ

کما صرح بمقتادۃ۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۹) قنادۃ نے اس کی تصریح کی ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ امام احمد، امام مالک، امام ابو حنیفہ اور جہور اہل اسلام اس کے ہرگز قائل نہ تھے کہ سورۃ فاتحہ کے بعد امام اس لیے سکتہ کرے تاکہ مقتدی اس میں سورۃ فاتحہ پڑھ لیں اور نہ یہ حضرات سکتہ کے وجوب کے قائل تھے اور نہ استحباب کے۔

(تنوع العبادات ص ۸۵)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ولم نعلم نزا عابین العلماء انه  
لا یجب علی الامام ان یقرأ  
المأموم بالفاتحة ولا غیرها الی ان  
قال - ولا یتحب للامام السکوت  
لیقرأ المأموم عند جماہیر العلماء  
وهذا مذهب مالک والبی حنیفۃ و

یعنی جہاں تک ہمیں معلوم ہے علماء کا اس بات  
پر اتفاق ہے کہ امام پر سکتہ واجب نہیں ہے تاکہ مقتدی  
سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔ امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ اور  
امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ جو راہل اسلام اس پر بھی متفق  
ہیں۔ کہ امام کے لیے یہ بات مستحب بھی نہیں ہے کہ وہ  
سکتہ کرے تاکہ مقتدی قرأت کر سکیں۔

احمد بن حنبلؒ وغیرہ۔ (فتاویٰ جلد ۲ ص ۲۲۶)

قاضی محمد بن عبداللہ ابوبکر ابن العربی المالکی الاندلسی (المتوفی ۵۴۳ھ) مجز سکتات سے  
یوں خطاب کرتے ہیں کہ

عجباً لك كيف يقدر المأموم في المحبة  
على القراءة ايتازع القرآن الامام امر  
يعرض عن استماعه امر یقرأ اذا  
سکت قيل له فان لم یسکت وقد  
اجمعت الامة علی ان سکوت الامام  
غیر واجب فمتی یقرأ ؟

عجب ہے تم پر مقتدی کو جہری نمازوں میں قرأت  
پر کیسے قادر تصور کیا جائے؟ کیا وہ قرأت قرآن پر امام  
سے منازعت کرتا رہے؟ یا استماع سے اعراض کرے؟  
یا جب امام سکتہ اختیار کرے تو اس وقت وہ قرأت کرے؟  
اگر امام سکتہ نہ کرے تو مقتدی کب پڑھے؟ کیونکہ تمام  
امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امام پر سکتہ واجب نہیں ہے۔

(عارضۃ الاحوذی جلد ۱ بحوالہ اوجز المسالك جلد ۱ ص ۲۲۸)

حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کسی صحیح حدیث سے  
یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ آپ نے محض اس لیے سکتہ اختیار کیا ہو تاکہ مقتدی سورۃ  
فاتحہ پڑھ لیں۔  
(بحوالہ غیث النعمان ص ۱۶۵)

لے موصوف بہت بڑی قدر و منزلت کے مالک تھے۔ متبحر علمی ذہانت اور خصائل و عادات میں بے نظیر  
تھے۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، العلامة اور القاضی لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۸۶)



محمد بن اسماعیل بن الصلاح امیر بیانی (المتوفی ۷۴۱ھ) لکھتے ہیں کہ

ثم اختلف القائلون بوجوب القراءة  
فقل في محل سككات الامام وقيل  
في سكوتہ بعد تمام القراءة ولا دليل  
لهذين القولين في الحديث -  
(سبل السلام شرح بلوغ المرام جلد ۱  
ص ۱۰۶)

ان اقتباسات یہ بات آفتاب نیروز کی طرح ثابت ہو گئی ہے کہ سکنات امام کا کسی حدیث سے ثبوت نہیں ملتا۔ اور امت کا اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ نہ تو امام پر سکنہ واجب ہے اور نہ مستحب اور یہ بات بعید از قیاس اور انصاف ہے کہ شریعت حقہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت سورۃ فاتحہ کا مکلف تو بنائے لیکن اس کو قرأت کا موقع اور محل نہ بتلائے، یہ تو ایسا ہی ہوا جیسا کسی نے کہا ہے۔

در میان قعد دریا تختہ بن دم کردہ

باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

یہ ایسی خرافات ہے، جس سے شریعت حقہ کا دامن انصاف بالکل مبرا اور پاک ہے امام ابو بکر الجصاص رحمہ فرماتے ہیں کہ مقتدی کا کام تو یہ ہے کہ وہ امام کی پیروی کرے اور جانتے نہیں کہ امام مقتدی کا تابع ہو۔ تو اس قائل کا قول کہ امام سکنہ کرے تاکہ مقتدی قرأت کرے۔ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول کے خلاف ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتداء کی جائے اور پھر باوجود اس کے یہ معاملہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کے مخالف ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ اور جب امام قرأت کرتے لے نواب صاحب لکھتے ہیں کہ امام صنعاء و علامہ بنین و شاعر مجید و مجتہد مفید و محدث کامل و عارف و اصل است، حامل بود کتاب و سنت بحسب اجتہاد نفس خود تقیید بہ تقلید احد سے از اہل علم نہ داشت۔

(تقصا جہود الاحرار من تذکار خرد والا برادر ص ۸۰)

تو تم خاموش رہو اس حدیث میں آپ نے مقتدی کو امام کی قرأت کے لیے خاموشی کا حکم دیا ہے اور سکنات کا قائل امام کو مقتدی کے لیے انصات کا حکم دے رہا ہے۔ اور امام کو مقتدی کا تابع بنا رہا ہے اور یہ قول بالکل اگٹ ہے۔

اور اس پر بحث کرتے ہوئے مزید ارقام فرماتے ہیں:

وقوله انما جعل الامام ليقرأ فذاقوا  
فانصتوا اخباره من ان من الائمة بالامام  
ان ينصت الامام لقراءة المأموم لانه لو كان  
مأموراً بالانصات له كان مأموراً بالائمة  
بفصير الامام مأموماً والمأموم اماماً في  
حالة واحدة وهذا فاسد... الخ  
(احكام القرآن جلد ۳ ص ۵۱)

آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ  
امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے پس  
جب وہ پڑھے تو تم خاموش رہو اس میں آپ نے خبر دی ہے  
کہ امام کی اقتدائیں یہ امر شامل ہے کہ اس کی قرأت کے  
لیے خاموشی اختیار کی جائے اور یہ ارشاد صاف بتاتا ہے کہ  
جائز نہیں کہ امام مقتدی کی قرأت کے لیے انصات کرے کیونکہ  
اگر وہ اس کا مأمور ہوتا تو وہ اقتدا کا مأمور ہوتا تو ایک ہی  
حالت میں امام مقتدی ہو جاتا اور مقتدی امام اور یہ بالکل

فاسد ہے۔

پندرھواں اعتراض۔ حضرت امام بخاریؒ، امام بیہقیؒ اور مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ  
فرماتے ہیں کہ خطبہ جمعہ کے وقت اتنی توجہ اور خاموشی کا حکم اور تاکید آتی ہے کہ اگر کوئی شخص  
شورو غل مچاتا ہو تو اس کو یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ خاموش ہو جاؤ جیسا کہ صحیح حدیث میں آتا ہے۔  
اذقلت لصاحبك يوم الجمعة انصت  
فقد لغوت۔ (بخاری جلد ۱ ص ۱۲۸)  
یعنی جب تم کسی کو جمعہ کے خطبہ کے وقت یہ کہو کہ  
خاموش ہو جاؤ تو تم نے ایک بیجا اور بے ہودہ حرکت کی۔  
(مسلم ص ۲۸۱)

اس سے معلوم ہوا کہ خطبہ جمعہ کے وقت ایسی توجہ اور خاموشی مطلوب ہے کہ امر بالمعروف اور

۵۷ کتاب القراءة ص ۸۳

۳۵ جزیع القراءة ص

۵۷ یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۲۰۶، ابوداؤد جلد

۵۷ تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۶۷ وغیرہ

ص ۱۵۸، ترمذی جلد ۱ ص ۶۷، ابن ماجہ ص ۷۹ اور طحاوی جلد ۱ ص ۲۱۵ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔



نہی عن المنکر بھی اس وقت ساقط ہے لیکن مع بذآں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اذا جاء احدکم يوم الجمعة فليدع رکتین وليتجوز فیہما (مسلم جلد ۱ ص ۲۸۷) — جب تم میں سے کوئی شخص اس حالت میں آئے کہ امام جمعہ کا خطبہ پڑھ رہا ہو تو اس آنے والے کو مختصر طریق سے دو رکعت نماز پڑھ لینی چاہیے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جائز ہے، جس میں بہر حال تلاوت قرآن کریم کی جاتی ہے اور یہ انصات کے منافی نہیں۔ لہذا اگر کوئی شخص امام کے پیچھے بجاقت اقتدار قرأت کرتا ہے تو وہ بھی آیت استماع اور انصات کی مخالفت نہیں کر رہا۔

جواب۔ جہور اہل اسلام خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ، امام لیثؒ بن سعدؒ، امام ابو حنیفہؒ اور جہور حضرات صحابہؓ و تابعینؓ اور سلفؓ کا مسلک یہ ہے کہ خطبہ کے وقت نماز صحیح نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا یہی مسلک ہے۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۸۷)

علامہ عراقیؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، عروہ بن زبیرؓ، عطاء بن ابی رباحؓ، سعید بن المسیبؓ، محمد بن سیرینؓ، امام زہریؒ، قتادہؒ، ابراہیم نخعیؒ اور قاضی شریحؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ (فتح الملام جلد ۲ ص ۴۱۵)

امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ کوفے کے فقہاء اور محدثین کا یہی مسلک تھا۔ (جلد ۱ ص ۶۷) جب جہور اہل اسلام کے نزدیک خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جائز نہیں۔ تو اس پر مقتدی کی قرأت خلف الامام کو قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا اور جس طرح خطبہ کے وقت نماز استماع اور انصات کے منافی ہے اسی طرح قرأت خلف الامام بھی منافی ہے، جہور کا کہنا ہے کہ گو آیت واذا قرئ القرآن..... الاۃ کا شان نزول صرف نماز ہے لیکن یہ آیت اپنے عموم الفاظ کے اعتبار سے خطبہ کو بھی شامل ہے۔ اس لیے خطبہ کی حالت میں بھی ہر ایسے قول و فعل سے اجتناب ضروری ہے جو استماع و انصات کے منافی ہو اور ظاہر ہے کہ نماز قولاً وفعلاً استماع و انصات کے منافی ہے۔ لہذا نماز بھی صحیح

لے یہ روایت ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۵۹، نسائی جلد ۱ ص ۱۵۷، ترمذی جلد ۱ ص ۶۷، ابن ماجہ ص ۷۹ اور طحاوی

جلد ۱ ص ۱۷۹ وغیرہ میں بھی موجود ہے بعض میں مختصر اور بعض میں قدرے تفصیل سے۔

نہ ہوگی اور آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ  
یصلی ما کتب لہ، ثم یصمت اذا تکلم الامام امام کے آنے سے پہلے جتنی نماز کوئی پڑھنا چاہے پڑھ لے  
(بخاری جلد ۱ ص ۱۲۱، مسلم جلد ۱ ص ۲۸۳) اور پھر جب امام خطبہ شروع کرے تو اس وقت نماز  
طیالسی ص ۶۵) ترک کر کے خاموش ہو جائے۔

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ امام کے خطبہ پڑھنے سے قبل نماز پڑھنا جائز ہے لیکن خطبہ شروع  
ہونے کے بعد گنجائش نہیں نکلتی اور بغیر خاموشی اور انصاف کے کوئی چارہ نہیں اور طیالسی کے یہ  
الفاظ بھی مد نظر رکھیے فاذا تکلم الامام استمع وانصت۔ جب امام خطبہ پڑھے تو مقتدی اس  
وقت توجہ کرے اور خاموش رہے اور حضرت نبیشتہ الہندیؒ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم  
سے روایت کرتے ہیں کہ

فان لم یجد الامام خرج صلی ما بدالہ اگر امام ابھی خطبہ کے لیے نہ آیا ہو تو جتنی نماز پڑھی  
وان وجد الامام قد خرج مجلس فاستمع جاسکتی ہے پڑھنی چاہیے اور جب امام خطبہ کے لیے  
وانصت الحدیث (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۷۱) آچکا ہو تو اس وقت ہر شخص کو بیٹھ کر توجہ اور خاموشی  
وقال رواہ احمد ورجالہ رجال الصحیح خلا اختیار کرنی چاہیے۔ علامہ ہیشمیؒ کہتے ہیں کہ اس روایت  
شیخ احمد وهو ثقہ... (انتہی) کے سب راوی بخاری کے راوی ہیں۔ ہاں مگر امام احمد کے  
اشاد لیکن ہیں وہ بھی ثقہ۔

۱۔ ان کا نام علی بن اسحاق ہے۔ (فتح الملکم جلد ۲ ص ۴۱۵) ابن معینؒ ان کو ثقہ اور صدوق کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ نے ان  
اور محدث محمد بن حمدویہ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقافت میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۸۲)  
حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۲۹۹) حافظ ابن حجرؒ مقدمہ فتح الباری ص ۴۲ میں لکھتے  
ہیں کہ ہم فتح الباری میں جو حدیث بغیر گرفت کے نقل کریں گے۔ وہ صحیح یا حسن ہوگی۔ اور یہ روایت حافظ موقوف  
نے فتح الباری جلد ۲ ص ۲۹۷ میں نقل کی ہے اور اس پر کوئی گرفت نہیں کی۔ مؤلف خیر الکلام نے (ص ۵۶۳)  
۵۶۴ میں) یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کی سند میں عطار خراسانی ہے اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ارسال  
تدلیس اور کثرت وہم کا شکار تھے۔ اور بخاری نے ان کی کوئی حدیث نہیں لی۔ (تقریب ۱۷۹) اور مقدمہ فتح الباری  
ص ۴۳۶ میں لکھتے ہیں کہ وہ بخاری کی شرط پر نہیں ہے۔ یہ علامہ ہیشمیؒ کا وہم ہے۔ (باقی صفحہ آئندہ پر)



اس صحیح روایت سے بھی معلوم ہوا کہ نماز کی گنجائش صرف اس وقت ہے۔ جب امام خطبہ کے لیے ابھی نہ آیا ہو۔ لیکن جب امام خطبہ کے لیے آچکا ہو تو پھر نماز کی گنجائش ہے اور نہ سلام و کلام کی اور خطبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی حدیث کا جواب جہور نے یہ دیا ہے کہ یہ ایک مخصوص واقعہ ہے۔ بعض روایات نے نقل بالمعنی کے پیش نظر اس کو تعمیم کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت سلیم غطفانی رضی اللہ عنہ فاقہ کا شکار تھے۔ ان کی خستہ حالی اور پریشانی کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے لیے چندہ کرنے کا قصد فرمایا اور اس کا حکم دیا کہ کھڑے ہو کر دو رکعتیں پڑھ لیں تاکہ لوگ ان کی پرگندہ صورت اور بے بسی کو دیکھ لیں اور دل کھول کر اس کی اعانت اور امداد کریں۔ چنانچہ روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں:

جاء رجل يوم الجمعة والنبي صلى الله عليه وسلم يخطب بليثاء بذرة فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم اصليت قال لا قال حمل ركعتين وحث الناس على الصدقة الحديث۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک شخص نہایت خستہ حالی میں آیا۔ آپ نے فرمایا: تم نے نماز پڑھی ہے؟ کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کھڑے ہو کر دو رکعتیں پڑھو۔ اور لوگوں کو اپنے صدقہ اور خیرات کی تلقین فرمائی تاکہ اس کی امداد و اعانت ہو سکے۔

(نسائی جلد ۱ ص ۱۵۸)

(بقیہ پچھلا صفحہ) کہ اس کو صحیح کی شرط پر مانتے ہیں۔ (محصلہ) مگر یہ حافظ ابن حجر کا وہم ہے کیونکہ صحیح بخاری جلد ۲ ص ۳۲۲ اور ص ۴۹۶ میں عطاء کی روایت موجود ہے۔ محدث ابو سعید الدمشقی اور ان کے پیروکار اور علامہ قسطلانی وغیرہ تصریح کرتے ہیں کہ یہ عطاء خراسانی ہے۔ لہذا یہ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ کا وہم نہیں بلکہ حافظ ابن حجر کا وہم ہے اور جس بنا پر مؤلف مذکور انکار کرتے ہیں کہ چونکہ یہ کمزور ہے لہذا بخاری کی شرط پر نہیں اُتر سکتا۔ نہایت کمزور ہے۔ کیونکہ اس سے ضعیف تر راوی صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ ہم انشاء اللہ تعالیٰ عرض کر سکتے ہیں۔ اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۱۲ میں نشان دہی کی ہے کہ یہ مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کا راوی ہے۔ اس لحاظ سے بھی وہ صحیح مسلم کا راوی ہے اور یہ روایت بالکل صحیح ہے۔ اور اصول حدیث کی رو سے اس کے حسن ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ البتہ نہ ماننے کا کوئی علاج نہیں۔

اور مسند احمد کی روایت کے الفاظ یوں ہیں۔ اے حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

ان هذا الرجل دخل المسجد في هيئة  
بذرة فامرته ان يصلي ركعتين وانا  
ارجوان يفطن له رجل فيتصدق  
عليه۔ (فتح الباری ۲ ص ۳۶۶)

یہ شخص مسجد میں داخل ہوا اور یہ بہت شکستہ  
حال تھا۔ میں نے اس کو اس امید سے دو رکعتیں  
نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے تاکہ کوئی صاحب دل اس  
کو دیکھ لے اور اس پر صدقہ کرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک مخصوص واقعہ تھا۔ اور روایت میں سے بعض نے اس کو عمومی  
رنگ میں پیش کر دیا ہے اور ایک روایت میں یہ بھی مروی ہے جو محض بطور تائید پیش کی جاتی  
ہے، جس کی مزید تائید معتمر کامرسل کرتا ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۶۹)

وامسك عن الخطبة حتى فرغ من  
صلاته۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۶۹ وزیلی جلد ۲ ص ۲۰۳)

کہ جب تک وہ شخص نماز سے فارغ نہ ہو  
گیا۔ آپ نے خطبہ بند کر دیا تھا۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں جو محض تائید پیش کی جا رہی ہے نہ کہ استدلال  
ارکع رکعتین ولا تعد لمثل هذا۔

(دارقطنی جلد ۱ ص ۱۶۹ وزیلی جلد ۱ ص ۱۶۹)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

واما قصة سليك رضي الله تعالى عنه  
فقد ذكر الترمذي انها اصح شئ  
روى في هذا الباب واقوى۔

امام ترمذی رحمہ اللہ کا ارشاد ہے کہ اس باب  
میں سلیک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ سب سے زیادہ  
صحیح اور قوی تر ہے۔

(فتح الباری جلد ۲ ص ۲۲۵)

چونکہ یہ شخص نہایت ہی غریب تھا اس لیے اے حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس  
کے لیے دس سوزی سے چندہ کیا اور جب دوسرے اور تیسرے جمعہ چھپا دیا تو پھر بیٹھ گیا  
آپ نے فرمایا اٹھ اور نماز پڑھ۔ (فتح الباری جلد ۱ ص ۳۹۹) اور ہمارے خیال میں یہ  
بھی اس کی طرف لوگوں کو توجہ دلانے کے لیے تھا تاکہ لوگ اس مفلوک الحال کو دل کھول کر



چندہ دیں بلکہ امام بخاریؒ روایت نقل کرتے ہیں کہ جب وہ دوسرے جمعہ پر آیا تو اس وقت  
 آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: ان یصدقوا  
 علیہ وان یصلی رکعتین۔ (جزء القراءة ص ۳۷) کہ اس پر صدقہ کریں۔ اور اس کو دو رکعتیں  
 پڑھنے کا حکم دیا اور بقول مؤلف خیر الکلام حافظ ابن حجرؒ نے اس کے لیے چندہ مانگنے کو  
 جزو علت کہا ہے۔ (خیر الکلام ص ۵۶۵) مگر یہ جزو علت نہیں پوری علت ہے کیونکہ آپؐ  
 دو تین جمعے متواتر صرف اسی خستہ حال شخص کو نماز کا حکم دیا ہے رہا امام نوویؒ اور حافظ  
 ابن حجرؒ کا مسلم کی روایت کے پیش نظر یہ کہنا کہ یہ نص ہے اس میں تاویل کی گنجائش نہیں۔  
 (محصلاً خیر الکلام ص ۵۶۵ والا عتصام ص ۱۲۷، اکتوبر ۱۹۶۲ء) درست نہیں۔

اولاً۔ اس لیے کہ روایت بالمعنی کا یہ جواب نہیں ہے۔

ثانیاً۔ اگر الفاظ یہی ہوتے تو کم از کم حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم اس کے خلاف نہ کرتے  
 ان کا عمل ہی اس کے غیر نص ہونے کی دلیل ہے اور جہور اہل اسلام کی تائید اس پر مستزاد ہے  
 امام نسائی سنن الکبریٰ میں اس حدیث کا یہ باب قائم کرتے ہیں: باب الصلوة قبل الخطبة  
 زیلعی جلد ۲ ص ۲۰۳) گویا امام نسائیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ واقعہ (نماز پڑھنے کا) خطبہ شروع ہونے  
 سے پہلے پیش آیا تھا اور امام نسائیؒ کا ایسا سمجھنا محض بے وجہ نہیں ہے کیونکہ میخطب مضارع کا  
 صیغہ ہے اور زمانہ حال مستقبل دونوں کا اس میں احتمال موجود ہے۔ اور زمانہ استقبال مراد

لہ اسی مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض محققین نے میخطب کا معنی یرید الخطبة کیا ہے۔ دیکھئے  
 فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۱۷، فیض الباری جلد ۲ ص ۳۳۳۔ امام نوویؒ اذامن الامام فامتنوا کی شرح  
 میں لکھے ہیں۔ قالوا معناه اذا اراد التامین۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۷۳) علماء کا بیان ہے کہ  
 جب امام آمین کہنے کا ارادہ کرے تو تم بھی آمین کہو۔ جب اتمن ماضی میں اراد التامین کی گنجائش نکل  
 سکتی ہے تو میخطب میں یرید الخطبة کا احتمال کیوں بعید ہے؟ علاوہ بریں بخاری جلد ۱ ص ۱۵۶

میں (وقال الحافظ فی الفتح جلد ۲ ص ۳۲۸ متفق علیہ) اصل الفاظ میں تروو ہے۔ والامام میخطب  
 او قد خرج کہ امام خطبہ پڑھ رہا ہو یا خطبہ کے لیے آرہا ہو او قد خرج جملہ ہوتے ہوئے فرق ثانی کا دعویٰ  
 اور کزور ہو جاتا ہے۔ دیکھئے مزید تحقیق کے لیے عارضہ الاحوذی جلد ۲ ص ۳۰۲۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

لینے کی صورت میں حدیث کے معنی یہ ہوں گے۔ جب تم میں کوئی شخص آئے۔ درآں حالیکہ امام خطبہ پڑھنا چاہتا ہو اور اس کا ارادہ کرتا ہو (جو قرآن سے معلوم ہو سکتا ہے) تو خطبہ سے قبل ہی تم نماز پڑھ لیا کرو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں صرف دو رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ امام کے خطبہ شروع کرنے سے پہلے ہی فارغ ہو کر استماع اور انصات پر صحیح طور پر عامل ہو سکے۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) مؤلف خیر الکلام نے دو باتیں ایسی کہی ہیں جن پر بے ساختہ ہنسی آتی ہے پہلی بات یہ کہ والواما یخطب او قد خرج میں تردّد صرف سعید کے بعض شاگردوں کو ہے۔ روح بن قاسم اور سفیان بن عیینہ کی روایت میں تردّد نہیں اس طرح شعبہ کے بعض شاگرد و تفریق شملیل ابو زید ہروی و ہبب بن جریر بغیر تردّد کے بیان کرتے ہیں۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۶۸) اور انہیں تنویع کے لیے ہے (محصلہ ص ۵۶۷)۔ مگر ہم نے بخاری شریف جلد ۱ ص ۱۵۶ کا حوالہ دیا ہے جس کی سند یوں ہے: حدثنا آدم و ابن نا شعبه قال حدثنا عمر بن دینار قال سمعت جابر بن عبد اللہ .... الخ نہ تو اس سند میں سعید ہے اور نہ اس کے وہ مذکور شاگرد ہیں جن کا ذکر مؤلف مذکور نے کیا ہے۔ اس لیے حرف او کے ساتھ ہی اصل روایت ہے جو برائے شک ہے اور اگر حرف او تنویع کے لیے ہوتا اور خطبہ اور غیر خطبہ کی حالت اجانت نماز کے لیے برابر ہوتی تو جہور اور خصوصاً حضرات خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے خلاف نہ کرتے بلکہ وہ دونوں حالتوں کو برابر سمجھتے رہا مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ جہوریت حدیث کے معاملہ میں کوئی حجت نہیں (۵۶۳) تو یہ شکست فاش کی واضح علامت ہے۔ حق جامعیت کے ساتھ ہوتا ہے اور امت کی اکثریت کبھی غلط بات پر مجتمع نہیں ہو سکتی اور یہاں جہور کے پاس صحیح روایات ہیں محض جہوریت ہی نہیں ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام اپنے ناخواندہ حواریوں کو سمجھا رہے ہیں۔ دوسری بات مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ یہ کہنا کہ خطب مضارع کا صیغہ ہے اور زمانہ حال مستقبل دونوں کا اس میں احتمال ہے۔ قواعد نحو سے بے خبری پر مبنی ہے کیونکہ عامل حال اور حال کا زمانہ ایک ہونا چاہیے / پس خطبہ کا زمانہ وہی ہونا چاہیے جو آنے کا ہے ... (ص ۵۶۶) بے شک یہ قواعد نحو سے بے خبری پر مبنی ہے اور ساری عمر پڑھا پڑھا کر بھی مؤلف خیر الکلام کو نحو کے بالکل ابتدائی گراں تر بھی معلوم نہیں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ جن حال اور عامل حال کا زمانہ ایک ہوتا ہے وہ ایسا حال ہے جو ترکیب میں حال واقع ہو اور یہاں خطب مضارع کا صیغہ ہے جو خود عامل ہے اور اس میں حال و استقبال کا معنی پایا جاتا ہے یہ راکباً کی طرح حال نہیں ہے جب کہ عامل اور ہوتا ہے۔ اور اس میں عامل حال اور حال کا زمانہ ایک ہوتا ہے۔ بات اور حال کی ہے اور وہ بے خبری میں چسپاں دوسرے حال پر کر رہے ہیں۔



الحاصل خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جہور کے نزدیک صحیح حدیث کی روشنی میں ممنوع ہے۔ اور جس حدیث سے اجازت ثابت ہوتی ہے اس کا صحیح محل بھی آپ جہور کی طرف سے سن چکے ہیں۔ دریں حالات خطبہ کی حالت میں نماز کو جائز تصور کرتے ہوئے اس پر قرأت خلف الامام کے جواز کو قیاس کرنا ایک بے حقیقت اور بے اصل بات ہے، خصوصاً جب کہ مسئلہ مذکورہ منصوص ہے۔

سولھواں اعتراض۔ امام بخاری رحمہ، مبارک پوری رحمہ اور مفتی کلا نوری صاحب وغیرہ لکھتے ہیں کہ جب امام قرأت کر رہا ہو اور کوئی شخص آکر اس کی اقتدا کرنا چاہتا ہے۔ تو لامحالہ اس کو تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد ہی اقتدا نصیب ہو سکتی ہے اور اس کا تکبیر تحریمہ کہنا آیت استماع وانصات کے منافی ہے۔ لہذا مانعین قرأت خلف الامام کا عمل بھی آیت مذکورہ پر نہ ہوا۔ (جزء القراءة ص ۳۵ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۰۰ وغیرہ)

جواب۔ پہلے پوری تفصیل کے ساتھ یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ آیت کا مخاطب ہر ایسا شخص ہے جو امام کی اقتدا کر چکا ہو اور امام ابن جریر وغیرہ کے حوالے سے نقل کیا جا چکا ہے کہ

فان نصات خلفه لقرآته واجب علی  
جو آدمی امام کی اقتدا کر چکا ہو۔ امام کی قرأت کے  
من کاف مؤتایہ۔ لیے خاموش ہونا اس پر واجب ہے۔

رہا وہ شخص جس نے مطلقاً امام کی اقتدا نہ کی ہو یا ابھی اقتدا کرنے کا ارادہ ہی کر رہا ہو تو وہ شخص اس آیت کا مخاطب نہیں ہے اور تکبیر تحریمہ علمائے اخاف کی تحقیق میں شرط ہے۔ (دیکھیے خانیہ جلد ۱ ص ۴۰ و سر اجیہ ص ۱۰ و ہدایہ جلد ۱ ص ۸۲ اور شرح وقایہ جلد ۱ ص ۱۰ وغیرہ) اور شرط خارج ہوتی ہے۔ (و شرط الشئ خارج عنه ہامش کنز ص ۳۰) لہذا قرأت امام کے وقت مقتدی کا تکبیر تحریمہ کہنا آیت استماع وانصات کے کسی طرح مخالف اور منافی نہیں ہے۔ ہاں اس کا قرأت کرنا یقیناً منافی ہے۔ قاضی مقبول احمد صاحب یہ کہتے ہیں کہ یہاں آیت کو اپنے عموم پر کیوں نہیں رکھا گیا؟ اور جو شخص نماز میں شریک نہ ہو اور وہ شور و غل مچاتا ہے (مصلح الاعتصام ص ۱۰، ۵، اکتوبر ۱۹۲۲ء) لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس شخص نے اقتداء

نہ کی ہو اس کے لیے انصاف و استماع مستحب ہے، اس کو شور و غل کا حق کس نے دیا ہے؟  
اور آیت استجاب کے حکم میں اپنے عموم پر ہے ہاں وجوب صرف مقتدی کے لیے ہے۔  
کیونکہ شان نزول ہی خلف الامام کا مسئلہ ہے۔ کما مٹ۔

سترھواں اعتراض۔ حضرت امام بخاریؒ، امام بیہقی رحمہ اور مبارکپوری صاحبؒ  
وغیرہ کہتے ہیں کہ جو لوگ امام کے پیچھے قرأت کرنے کے منکر ہیں۔ ان کا بھی آیت استماع و انصاف  
پر عمل نہیں ہے کیونکہ وہ بھی امام کے پیچھے ثناء و غیرہ پڑھنے کے قائل ہیں۔ اگر امام کے پیچھے قرأت  
کرنے صحیح نہیں تو ثناء و غیرہ کی قرأت کیسے صحیح ہوتی؟ لہذا ثناء و غیرہ کی قرأت کر نیوالے  
بھی آیت استماع و انصاف پر عامل نہ ہوتے۔

(جزء القراءة ص ۷، ص ۱۰، کتاب القراءة ص ۱۵، تحقیق الکلام ج ۲ ص ۴)

جواب۔ ان اکابر کا یہ اعتراض بھی سطحی قسم کا ہے اور قابل التفات نہیں ہے۔  
اولاً۔ اس لیے کہ اگر صورت مذکورہ میں مقتدی سے مدرک مراد ہے تو ظاہر ہے کہ اس  
کے لیے صرف ثناء کی قرأت کرنا ہے۔ اور امام کو ثناء، تقویٰ اور تسمیہ بھی پڑھنا ہے۔ اگر  
مدرک امام سے پہلے قرأت ثناء سے فارغ نہ ہوا۔ تو امام کے ساتھ تو بہر حال فارغ ہو ہی  
جائے گا۔ اور جب امام قرأت قرآن (سورۃ فاتحہ) شروع کرے گا تو مدرک ثناء کے پڑھنے  
سے فارغ ہو چکا ہوگا۔ لہذا مدرک باوجود ثناء پڑھنے کے آیت مذکورہ کا مخالف ہوا۔

ثانیاً۔ اگر صورت مذکورہ میں مقتدی سے ملبسوق مراد ہے تو محققین فقہائے  
احناف کی تصریح سے یہ بات ثابت ہے کہ جب امام جہر سے قرأت کر رہا ہو تو مقتدی  
کو اس وقت ثناء پڑھنا جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ قاضی خاں جلد ۱ ص ۴۲، فتاویٰ سر اجیہ ص  
اور فتح القدیر جلد ۱ ص ۳۴۵ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے، بلکہ علامہ حلبی الحنفی رحمۃ اللہ  
علیہ (المتوفی ۱۰۵۹ھ) نے اس کی تصریح کی ہے کہ ولایا فی الثناء مطلقاً۔ (کبیری ص ۳۴)  
کہ جب امام قرأت شروع کر چکا ہو تو مقتدی کو کسی بھی نماز میں ثناء نہیں پڑھنی چاہیے۔ جہری  
نمازوں میں قرأت امام کا علم مقتدی کو آسانی سے ہو سکتا ہے اور سرسری نمازوں میں قرائن  
اور شواہد سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔



مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۶۹ میں امام ابو جعفر رحمہ اللہ کے حوالہ سے جو یہ نقل کیا ہے کہ مقتدی جب امام کو سورۃ فاتحہ میں پائے تو بالاتفاق شمار پڑھے۔ (مینیۃ المصلی ص ۶۵ مصلہ)  
اس میں بالاتفاق سے تمام فقہاء احناف کا اتفاق مراد نہیں ہے بلکہ صرف امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد کا اتفاق مراد ہے۔ (صغیری ص ۱۲۸ اور کبیری ص ۳۲۹)  
و ثانیاً۔ قاضی شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ

وظاهر التقیید بقولہ من القرآن یدل  
علیٰ انہ لو باس بالو ستفتاح حال قرأۃ  
الامام بمعالیس بقرآن والتعود والدعاء (۱) اور دعاء وغیرہ جو قرآن نہیں، پڑھنے میں کوئی  
(نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۲۴) ہرج نہیں ہے۔

اور نواب صاحب لکھتے ہیں:

و این روایات (یعنی فلا تقرأوا بشی من القرآن وغیرہ) و نحو آن دلالت وارندہ  
بر آنکہ منہی عنہ نزد قرأت امام ہماں قرآن کریم ست فقط و اما قرأۃ توجہ واستعاذہ و نحو آن  
(یعنی شمار وغیرہ) پس لا باس بہ است۔ و نہی تناول آن نیست و نہ بوجہ از وجہ بر آن  
دلالت وارد۔ (دلیل الطالب ص ۲۹۴) مگر سورۃ فاتحہ کو نواب صاحب نے متشی قرار  
دیا ہے اور یہی مضمون مولانا عبد الصمد صاحب نے بیان کیا ہے۔ (اعلام الاعلام ص ۱۹۲)  
اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی کو صرف قرأت قرآن سے منع کیا گیا ہے۔ شمار تہجد،  
تسبیح اور تشہد وغیرہ سے اس کو منع نہیں کیا گیا۔ اور آیت و اذا قرئ القرآن... الایۃ  
اور حدیث فلا تقرأوا بشی من القرآن اس کی تائید کرتی ہے۔ اس بحث کو پیش نظر  
رکھنے سے حضرت امام بخاری رحمہ اللہ، امام بیہقی رحمہ اللہ اور مبارکپوری صاحب وغیرہ کا یہ مغالطہ بھی دور  
ہو جاتا ہے کہ تمھارے نزدیک فرض (یعنی قرأت) سے غیر فرض (یعنی شمار وغیرہ) کی اہمیت  
زیادہ ہے کہ ان دیگر امور میں امام کفایت نہیں کر سکتا۔ مگر قرأت میں کفایت کر سکتا ہے۔  
(جزیر القرأۃ ص ۷، کتاب القرأۃ ص ۱۵۷، تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۴۲)  
یہ بات توجہ لانے دیجئے کہ ان اکابر کے نزدیک صرف سورۃ فاتحہ کی قرأت کی اہمیت کیوں

ہے اور قرآن کریم کی باقی ایک تہ سورتوں کی اہمیت کیوں نہیں ہے آخر وہ سورتیں بھی تو قرآن کریم کی ہیں؟۔ صحیح: ہے یہ گنت بد کی صد اجلیسی کہو ویسی سنو۔

مگر قرآن وحدیث کی فہمائش کے علاوہ قاضی شوکانی رحمہ اور نواب صاحب بھی صحیح بات کہنے اور لکھنے پر مجبور ہیں کہ منہی عنہ نزد قرأت امام ہماں قرآن کریم است، فقط۔ اس لیے جب مقتدی کو قرأت امام کے وقت صرف قرآن کریم کی قرأت سے منع کیا گیا ہے۔ تو شمار وغیرہ کا سوال اٹھانا دور از کار بات ہے۔

اٹھارواں اعتراض۔ حضرت امام بخاری وغیرہ لکھتے ہیں کہ جب صبح کی نماز کی جماعت کھڑی ہو تو تمہارے نزدیک صبح کی سنتیں قریب ہی پڑھنی جائز نہیں۔ کیا تمہارا یہ فعل آیت استماع وانصات کے منافی نہیں ہے؟ لہذا تمہارا عمل بھی تو اس آیت پر نہ ہوا۔ (جزء القراءة ص ۸) جواب۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس آیت کا وجوبی طور پر مخاطب صرف وہ شخص ہے جو امام کی اقتدا اختیار کر چکا ہو۔ جس نے ابھی تک امام کی اقتدار نہیں کی وہ اس کا وجوبی طور پر مخاطب نہیں ہے۔ لہذا جماعت کے پاس سنتیں پڑھنے والا کسی طرح بھی آیت کا مخالف نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں محققین علماء اخاف نے اس کی تصریح کی ہے کہ اس کو سنتیں ترک کر کے عجات میں شریک ہونا چاہیے۔ چنانچہ حافظ ابن ہمام رحمہ لکھتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ مسجد کے علاوہ اگر اور کوئی جگہ نہ ہو تو نمازی کو صبح کی سنتیں پڑھنا جائز نہیں ہیں کیونکہ ترک مکروہ فعل سنت پر مقدم ہے۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ

واشد ما یكون كراهية ان یصلیہما  
منا بطا للصف كما یفعلہ كثیر من  
الجهلة۔ (فتح القدیر جلد ۱ ص ۳۴ طبع مصر)

اور سب سے زیادہ کراہت اس بات میں ہے کہ صف کے پاس ہی صبح کی سنتیں پڑھی جائیں جیسا کہ بہت سے جاہل پڑھ لیا کرتے ہیں۔

غرضیکہ امام بخاری رحمہ کا یہ اعتراض بھی کسی طرح ان کے لیے مفید نہیں ہے اور نہ اس طرح ان کا مطلب پورا ہو سکتا ہے۔

انیسواں اعتراض۔ مبارکپوری صاحب وغیرہ لکھتے ہیں کہ آیت مذکورہ خطبہ کو بھی شامل ہے۔ لے جب صبح کی جماعت ہو رہی ہو تو اس وقت صبح کی سنتوں سے متعلق حضرات فقہاء اور محدثین کا اختلاف ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)



حالانکہ تمہارے نزدیک جب خطیب یا ایتھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ پڑھتا ہو تو سامعین کو آہستہ آہستہ درود شریف پڑھنا جائز ہے۔ (کفایہ جلد ۱ ص ۶۸ اور شرح وقایہ جلد ۱ ص ۱۷۵) لہذا آیت استماع وانصات پر تمہارا عمل بھی نہ ہوا۔

(تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۴۳۳)

جواب — یہ تحقیق نقل کی جا چکی ہے کہ آیت کا شان نزول صرف نماز ہے۔ نزول آیت کے وقت خطبہ کا وجود بھی نہ تھا۔ ہاں عموم الفاظ میں خطبہ بھی شامل ہے۔ اس لیے بالطبع اور ثانوی حکم کی ظاہری مخالفت سے مقصود اولین اور بالذات حکم کی مخالفت کرنی کیسے جائز اور صحیح ہو سکتی ہے؟ علاوہ ازیں اگرچہ بعض علمائے احناف نے خطبہ کے وقت دل میں درود شریف پڑھنے کی اجازت دی ہے بلکہ اس کو صواب اور صحیح کہا ہے۔ لیکن محققین آہستہ پڑھنے سے بھی منع کرتے ہیں۔ چنانچہ امام قاضی خان رحمہ (المتوفی ۵۹۲ھ) لکھتے ہیں کہ

(بچھے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) ایک گروہ کہتا ہے کہ پاس ہی پڑھ لی جائیں۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے موقوفاً درود آتی ہیں۔ علامہ بیہقیؒ ایک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ روایت، ثقات اور دوسری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ رجالہ موثقون (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۷۵) دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جماعت کے بعد پڑھ لی جائیں جیسا کہ بعض احادیث میں آتا ہے لیکن اس مضمون کی بیشتر حدیثیں ضعیف ہیں۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اگر صبح کی ستیر رہ جائیں تو ان کی قضا نہیں ہے۔ لیکن یہ قول غلط ہے۔ چوتھا گروہ کہتا ہے کہ سورج نکلنے کے بعد پڑھی جائیں (یہ ضروری نہیں کہ وہی جگہ اور وہی وضو ہو) جیسا کہ صحیح اور مرفوع حدیث میں آتا ہے۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۵۷، مستدرک جلد ۱ ص ۲۷۷، سنن الکبیر جلد ۲ ص ۴۸۴) چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیماری اور تندرستی، اقامت اور کسی حالت میں صبح کی سنتیں ترک نہیں کیں۔ (طیالسی ص ۲۲۰، زاد المعاد جلد ۱ ص ۱۸۵) لہذا یہی آخری مسلک قوی تر ہے۔

۱۔ حسن بن منصور، امام کبیر اور بحر عمیق تھے، بڑے زیرک اور نکتہ رس تھے، بڑے عابد اور فقیہ النفس تھے۔ ان کا شمار مجتہدین فی المسائل میں ہوتا ہے۔ (فوائد بیہقیہ ص ۶۴، ۶۵) صاحب جواہر المصنئہ (علامہ ابو محمد عبدالقادر ۷۵۷ھ) ان کو امام الکبیر سے یاد کرتے ہیں۔

(جواہر المصنئہ جلد ۱ ص ۲۰۵)

وہ مشائخنا قالوا یا نہ لاہ یصلی علی النبی  
صلی اللہ علیہ وسلم بل یستمع وینصت  
لہ ان الاستماع فرض والصلوة علی  
النبی صلی اللہ علیہ وسلم یمکن  
بعد هذه الحالة۔ (خانیہ جلد احث)  
ہمارے مشائخ کا بیان ہے کہ خطبہ کی حالت  
میں درود شریف پڑھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ  
استماع اور انصات ضروری اور فرض ہے اور  
سامع کو خطبہ کے لیے نہایت خاموشی سے توجہ  
کرنی چاہیے اور درود شریف کا پڑھنا اس کے  
بعد بھی ممکن ہے۔

فتاویٰ سر اجیہ ص ۱۷ میں لکھا ہے کہ فقیہ حام الدین نے آہستہ پڑھنے کی اجازت دی  
ہے لیکن شمس الانامہ سرخسی (المتوفی ۷۲۳ھ) آہستہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔  
اور مسبوط سرخسی جلد ۲ ص ۲۹ میں آہستہ پڑھنے کی بھی صراحت کے ساتھ ممانعت بیان کی گئی  
ہے، حافظ ابن ہمام رحم لکھتے ہیں کہ محققین کا بیان ہے کہ چونکہ استماع اور انصات فرض اور  
ضروری ہے۔ اس لیے حضرت امام ابو حنیفہ رحم کے نزدیک خطبہ کے وقت آہستہ درود شریف  
پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ (فتح القدیر جلد ۲ ص ۴۲۱، طبع مصر) اور یہی مسلک علامہ  
ابن عابدین شامی رحم (المتوفی ۱۲۵۲ھ) کا ہے۔ (بحوالہ فتح الملہو جلد ۲ ص ۴۲) لہذا مبارک  
پوری صاحب کا یہ اعتراض بھی بے بنیاد ہے۔

بیسواں اعتراض۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ستری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ  
فاتحہ پڑھنے کے استحباب پر استدلال کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ذکر قرأت اور  
دعا کے بغیر سکوت اختیار کرنا نہ مامور بہ ہے اور نہ عبادت ہے بلکہ وسوس کا دروازہ  
کھولنے کا ایک سبب ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہونا سکوت سے افضل  
ہوگا۔ اور قرأت قرآن سے بہتر ذکر اور کیا ہو سکتا ہے۔ لہذا ستری نمازوں میں امام کے پیچھے  
لے علامہ سراج الدین اودمی رحم المتوفی فی حدود ۸۰۰ھ۔

لے امام، علامہ، حجت، تکلم، مناظر، اصولی اور مجتہد تھے، مبسوط کی پندرہ جلدیں (باب الشرط تک)  
بغیر مراجعہ کتب کے زبانی انھوں نے اطلاق کرتی تھیں۔ جب کہ حق گوئی کی پاداش میں حکومت وقت نے پرا  
دستور کے مطابق ایک تاریک کنوئیں میں ان کو مجسوس کر رکھا تھا۔ (فوائد بہیہ ص ۱۸۸)



سورۃ فاتحہ کا پڑھنا مستحب ہوگا۔ (محصلاً فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۵۰)

جواب۔ شیخ الاسلام علیہ الرحمۃ کا یہ استدلال بھی درست نہیں ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ مقتدی کا فریضہ اجتماع و انصات ہے نہ کہ قرآن اور استماع و سماع کا فرق پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔

ثانیاً۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ظہر اور عصر کی نماز میں سورۃ فاتحہ کے بعد کم و بیش پچیس تیس آیتیں پڑھنی مسنون ہیں اور مقتدی کے لیے دیگر حضرات سلفہ خلف کی طرح شیخ الاسلام رحمہ کے نزدیک بھی مازاد علی الفاتحہ پڑھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر کم و بیش تیس آیتوں کے طویل وقفہ میں مقتدی پر وسوسہ کا دروازہ نہیں کھلتا تو امید واثق ہے کہ سورۃ فاتحہ کے مختصر سی سات آیتوں کے وقفہ میں بھی باب و سوسہ مسدود ہی رہے گا۔

ثالثاً۔ خود شیخ الاسلام رحمہ اس کے قائل ہیں کہ مقتدی کے لیے مازاد علی الفاتحہ میں قرأت کی بجائے استماع افضل ہے۔ نہ معلوم یہاں ذکر قرأت اور دعا کے بغیر سکوت کیوں اعلیٰ اور افضل ہو گیا ہے؟ اس لیے سورۃ فاتحہ کی قرأت کے وقفہ میں بھی استماع افضل رہے گا کیونکہ بقول شیخ الاسلام رحمہ آیت و اذا قرأت القرآن کا اولین مصداق صرف سورۃ فاتحہ ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اور سب سے زیادہ میں بھی قرآن یقیناً ہوتی ہے۔ ہاں اگر واذ اجهر بالقرآن کا ارشاد ہوتا۔ تو بات الگ تھی۔ ہم نے شیخ الاسلام رحمہ کے جواب میں جو باتیں عرض کی ہیں وہ ہماری اپنی اختراع نہیں بلکہ خود موصوف نے بیان کی ہیں۔

وايضاً ففي اجتماع المسلمين على انه فيما يزاد على الفاتحة يؤمر بالاستماع دون القراءة دليل على ان استماع لقراءة الامام خير له من قرأته معه بل على انه مأموماً بالاجتماع دون القراءة مع الامام۔

نیز مسلمانوں کے اس اجماع میں کہ مازاد علی الفاتحہ میں مقتدی کو قرآن کے بجائے استماع کا حکم ہے اس امر پر دلیل ہے کہ مقتدی کو استماع کا حکم ہے اس امر پر دلیل ہے کہ مقتدی کا استماع اس کے پڑھنے سے بہتر اور افضل ہے بلکہ اس کو صرف حکم ہی یہ ہے کہ وہ قرأت نہ کرے

اور لکھتے ہیں کہ

فان الكتاب والسنة امرت المومنین بالاستماع  
دون القراءة والامعة متفقون علی ان  
استماعه لما زاد علی الفاتحة افضل  
من قراءة ما زاد علیها۔ (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۳۳)  
کتاب اور سنت نے مقتدی کو یہ حکم دیا ہے  
کہ وہ قرأت نہ کرے بلکہ سنے اور امت اس پر  
متفق ہے کہ "ما زاد علی الفاتحة" میں استماع  
قرأت سے بہتر اور افضل ہے۔

موصوف کی ان عبارتوں کو پیش نظر رکھ کر بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے نقل  
کردہ جملہ جوابات خود شیخ الاسلام کی عبارات سے ماخوذ ہیں۔ باقی استماع کا معنی اور مطلب  
پوری تشریح کے ساتھ پہلے نقل کیا چکا ہے۔ اس میں الجھ کر جادۂ مستقیم سے پہلو تہی کرنا  
ارباب تحقیق کو زیب نہیں دیتا۔

قارئین کرام! ہم نے آیت کے سلسلے میں کافی وقت لیا ہے۔ اگرچہ فریق ثانی کی جانب  
سے اس سلسلے میں بعض لچر لپوچ اور لایعنی اعتراضات یا استدلالات اور بھی کیے گئے ہیں  
لیکن ہمیں ابھی آپ سے بہت کچھ عرض کرنا ہے اس لیے ہم ان کو نقل کرنے اور جواب عرض  
کرنے میں مزید آپ کے دماغ کو پریشان نہیں کرتے اور باب اول کو یہیں ختم کرتے ہیں۔



# باب دوم

پہلے باب میں قرآن کریم کی آیت اور حضرات صحابہ کرام و تابعین اور دیگر جمہور سلف و خلف سے اس کی تفسیر نقل کی گئی ہے کہ واذا قرئ القرآن... الاٰیۃ کا شان نزول صرف نماز ہے۔ اور مقتدی کو امام کے پیچھے کسی نماز میں قرآن کرنا جائز نہیں ہے اور یہ کہ آیت کی یہ تفسیر مؤید بالا جماع ہے۔ اور آیت کی تفسیر پر جتنے اہم سوالات کیے گئے تھے ان کے تفصیلی جوابات بھی عرض کیے جا چکے ہیں۔ اب باب دوم میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح صریح اور مرفوع قوی اور فعلی حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔ جن سے بخوبی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام کا وظیفہ پڑھنا اور مقتدی کا خاموش رہنا ہے۔ فریق ثانی کی طرف سے ان پر جو سوالات کیے گئے ہیں ان کو نقل کر کے ان کے مسکت جوابات بھی عرض کر دے گئے ہیں:۔

باقول نبی چون و چہ را نہ شناسیم

داریم یہ اخلاص سرے بر خط تسلیم

قانون اشارات و شفا را نہ شناسیم

قرآن و حدیث است شفائے دل رنجور

پہلی حدیث:

امام مسلم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے الشَّحَاقُ بْنُ اِبْرَاهِیْمَ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے

امام مسلم رحمہ (المتوفی ۲۶۱ھ) صحیح مسلم شریف کے مؤلف ہیں جو بخاری شریف کے بعد تمام حدیث کی کتابوں میں پہلے درجہ پر (حاشیہ نہ کادر حاشیہ ۱۷ صفحہ پر دیکھئے)

جبریلؑ نے بیان کیا۔ وہ سلیمانؑ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ قتادہؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ یونسؑ بن جبریلؑ سے اور وہ حطانؑ بن عبد اللہ الرقاشیؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے (المتمنیٰ ص ۵۲) روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک طویل حدیث میں فرمایا:

(تقریباً نوٹ نمبر ۱۲) صحیح تسلیم کی جاتی ہے اور امت کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے۔ کہ بخاری و مسلم دونوں کی تمام روایتیں صحیح ہیں۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ اور حجت الاسلام کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۰) علامہ بیہقیؒ مشہور امام ہیں جو ابن راہویہؒ سے مشہور ہیں۔ مقدمہ میں ان کا ترجمہ نقل کیا جا چکا ہے۔

علامہ ابوالقاسم لاکانیؒ کا بیان ہے کہ جریر بن عبد الحمیدؒ کی ثقاہت پر سب کا اتفاق ہے اور ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ تدلیس نہیں کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۶۹) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الحجت کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۵۰)

علامہ مسلمؒ نے ایک سائل کے جواب میں فرمایا کہ کیا تم سلیمانؑ سے بڑا حافظ حدیث چاہتے ہو؟ (مسلم جلد ۱ ص ۴۴) وریہ ص ۹۳) علامہ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں (طبقات جلد ۱ قسم دوم ص ۱۸) ابن حبانؒ ان کو امام اور شیخ الاسلام کہتے ہیں۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۲۱۲) امام ابن معینؒ، امام احمدؒ، نسائیؒ اور عیسیٰؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام ثوریؒ کا بیان ہے کہ وہ حافظ بصرہ میں تھے۔ امام شعبہؒ فرماتے تھے کہ سلیمانؒ خالص اور عجم یقین تھے۔ امام یحییٰؒ کا بیان ہے کہ مجھے کسی ایسے شخص کی صحبت کبھی نصیب نہیں ہوئی جس کے دل میں سلیمانؒ یمی سے زیادہ خوف خدا موجود ہو۔ ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ، متقن، حافظ، صاحب سنت اور بصرہ کے عبادت گزاروں میں تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۲۰۲) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الامام اور شیخ الاسلام کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۳۲)

علامہ محدث ابن ناصر الدینؒ کا بیان ہے کہ وہ مفسر قرآن آیتہ فی الحفظ اور نسبی انی کے امام تھے۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۱۵۳) ابن سعدؒ ان کو ثقہ، مامون اور حجت کہتے ہیں۔ (طبقات جلد ۱ قسم دوم ص ۱) عبد الرحمن بن ہدیہؒ کا بیان ہے کہ قتادہؒ حمید کے جیسے پچاس آدمیوں سے زیادہ بڑے حافظ تھے۔ (تہذیب الاسما جلد ۱ قسم اول ص ۵) حافظ ابن القیمؒ کہتے ہیں کہ وہ بصرہ کی جامعہ افتار کے ایک معزز رکن تھے۔ (اعلام الموقعین جلد ۱ ص ۲) ابن سیرینؒ کا بیان ہے کہ قتادہؒ سب لوگوں سے زیادہ بڑے حافظ تھے (کتاب الحلال ترمذی ص ۲۳۸) اور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)



ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبنا  
فیہین لنا سنتنا وعلما صلوٰتنا فقال  
اذا صلیتم فاقیموا صفوفکم ثم لیؤمکم  
احدکم فاذا کبر فکبروا واذ اقرأ فانصتوا  
واذا قال غیر المغضوب علیہم ولا الضالین  
فقلوا آمین۔ الحدیث

(مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴)

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہاں خطاب  
فرمایا اور سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین  
فرمائی اور نماز کا طریقہ بتلایا اور یہ فرمایا کہ نماز پڑھنے  
سے قبل اپنی صفوں کو درست کر لو۔ پھر تم میں سے  
ایک تمھارا امام بنے۔ جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر  
کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور  
جب وہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے  
تو تم آمین کہو۔

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ قرأت کرنا امام کا فریضہ اور ڈیوٹی ہے۔ مقتدیوں کا وظیفہ  
صرف خاموش رہنا اور انصات کرنا ہے اور ان کے لیے بغیر انصات کے اور کوئی گنجائش  
نہیں ہے اور چونکہ یہ روایت مطلق ہے۔ لہذا ستری اور بہری تمام نمازوں کو شامل ہے۔  
اور مقتدیوں کو کسی نماز میں امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت اور گنجائش نہیں ہے۔  
یہ روایت صحیح مسلم کے علاوہ حدیث وغیرہ کی دیگر معتبر اور مستند کتابوں میں بھی موجود ہے۔  
(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۳۵۱۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور العلماء  
لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۱۵) حافظ ابن کثیرؒ ان کو احد العلماء تابعین والائمة العالمین لکھتے ہیں  
(البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۹ ص ۳۳۳) امام بیہقیؒ ان کو حافظ حدیث لکھتے ہیں (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۰۶)  
علامہ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔

لکھ یونس بن جبیرؒ امام مسلم کا بیان ہے کہ وہ حدیث کے بیان کرنے میں بچہ کا رُحمت تھے۔ (مسلم جلد ۱ ص ۴۴)  
امام ابن معینؒ علیؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ نسائیؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو  
ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۴۳۶)

۵۵ حطان بن عبد اللہ الرقاشیؒ، امام علیؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ محدث ابن ماجہؒ ان کو ثبت  
کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۳۹۲) حضرت ابو موسیٰ  
الاشعریؒ جلیل القدر اور صاحب مناقب صحابی ہیں۔

جن طرح کہ حاشیہ سے بخوبی اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حافظ ابو عوانہ رحمہ کی بعض سندیں ملاحظہ فرمائیں:

امام ابو عوانہ رحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے الصائغ رحمہ نے مکہ مکرمہ میں بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے علی بن عبد اللہ رحمہ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے جبر بن جبر نے بیان کیا۔ وہ سلیمان بن تیمی سے اور وہ قتادہ سے اور وہ ابو غلاب یونس بن جبر سے اور وہ حطان بن عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

۱۔ یہ روایت ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۲۰، مسند احمد جلد ۲ ص ۴۱۵، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵، بیہقی جلد ۲ ص ۱۵۵  
ابن ماجہ ص ۶۱، محلی ابن حزم جلد ۳ ص ۲۲۰۔ مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۸۱۔ جامع صغیر سیوطی ص ۳۰۔ مغنی ابن قدام جلد ۱ ص ۶۰۲۔ فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۲ ص ۱۲۲، نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۴۹۔ نصب الرایہ جلد ۲ ص ۱۲۴۔  
توجیہ النظر ص ۲۲۰۔ شرح بلوغ المرام جلد ۱ ص ۲۲۵۔ فتح الباری جلد ۲ ص ۲۰۱۔ زہر البی جلد ۱ ص ۱۲۶۔  
درایہ ص ۹۹۔ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۸۰۔ اعلار السنن جلد ۲ ص ۲۲۶۔ کتاب القراءة ص ۸۴۔ امام الکلام  
ص ۱۱۱۔ کنز العمال جلد ۲ ص ۱۸۶، ۶۹۔ فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۴۱۔ شرح نقایہ ص ۸۳۔ محن الباری  
جلد ۲ ص ۳۶۲۔ محن المعبود جلد ۱ ص ۳۲۵۔ تنقیح الرواة جلد ۱ ص ۱۵۲۔ عمدة القاری جلد ۳ ص ۲۵۹۔  
فصل الخطاب ص ۲۴۔ آثار السنن جلد ۱ ص ۸۵۔ جوہر النقی جلد ۱ ص ۱۵۳۔ تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۹۔  
کتاب العلل جلد ۱ ص ۱۶۲۔ شرح المغنی للکبیر جلد ۱ ص ۱۳۲۔ منتقی الاخبار جلد ۲ ص ۱۳۲۔ تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۲۔  
فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲۔ جزر القراءة ص ۵۶۔ تنوع العبادات ص ۸۶۔ ازالة الستر ص ۵۱۔ خاتمة الخطاب  
ص ۱۶۔ بدل المجود جلد ۲ ص ۵۵۔ برہان العجائب ص ۱۰۲۔ اور عقیدۃ الحمدیہ جلد ۲ ص ۱۹۳ وغیرہ  
حدیث، تفسیر، شرح حدیث اور کتب فقہ میں نقل کی گئی ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اس طرح لکھتے ہیں:  
كما رواه مسلم في صحيحه من حديث ابي موسى الاشعري رضي الله تعالى عنه قال قال  
رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم انما جعل الزمان ليؤتم به فاذا اكبر فكبروا  
واذا قرأ فانصتوا۔ ۱۔ (تفسير جلد ۲ ص ۲۸۰) اور قاضی شوکانی رحمہ نے روایت اسی طرح  
نقل کی ہے۔ اور فرماتے ہیں رواه احمد ومسلم... الخ (نیل الاوطار ج ۲ ص ۲۵۰) اور امام احمد نے  
کتاب الصلوٰۃ ص ۵۲ میں اسی طرح نقل کی ہے۔  
(باقی نوٹ نمبر ۲۳۷ و ۲۳۸ کے صفحہ پر دیکھئے)



خطبتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہم سے  
 فعلمنا سنتنا و بین لناصلو تنافقال خطاب کیا اور سنت کی تعلیم دی اور نماز کا طریقہ  
 اذا کبر الامام فکبروا و اذا قرأ فانصتوا بتلایا اور فرمایا کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کرو  
 (صحیح ابوعوانہ جلد ۲ ص ۱۳۳) اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

امام ابوعوانہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سلیمان بن اشعث سجستانی نے بیان کیا۔ وہ فرماتے  
 ہیں کہ ہم سے عاصم بن نصر بن نصر نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے معتمر بن عبد اللہ نے بیان کیا۔ وہ  
 فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سلیمان بن یحییٰ سے سنا۔ وہ فرماتے ہیں (حدثنا قتادة) ہم سے  
 قتادہ نے بیان کیا۔ وہ ابو غلاب یونس بن جبیر سے اور وہ حطان بن عبد اللہ الرقاشی سے  
 روایت کرتے ہیں۔ وہ حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔  
 انھوں نے فرمایا:

(بضم نوٹ پچھلا صفحہ) ۱۔ امام ابوعوانہ کا نام یعقوب بن اسحاق ہے (المتوفی ۳۱۶ھ) علامہ ذہبیؒ ان کو  
 الحافظ اور الثقة الکبیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۲)

۲۔ الصائغ کا نام محمد بن یحییٰ بن سالم تھا۔ (المتوفی ۲۷۶ھ) محدث ابو حاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔  
 ابن خراشؒ ان کو اہل فہم و اہل امانت کہتے ہیں۔ ابن جبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۲ ص ۳۹)  
 تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۵۸

۳۔ علی بن عبد اللہ بن مہینیؒ۔ (المتوفی ۲۳۲ھ) علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ العصر قد وہ اور من اباب هذا  
 الشان لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵) امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ مامون اور احد الائمہ فی  
 الحديث تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۳۵۶)

۴۔ صالح ستمہ میں مشہور کتاب سنن ابو داؤد کے مصنف ہیں۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام الثبت اور سید  
 الحفاظ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۲) ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبنا فکان ما بیننا من صلواتنا وعلما سننتنا قال اقیمو الصلوف ثم لیومکوا احدکم فاذا کبر الہام فکبروا واذ اقرأ فانصتوا (صحیح ابوعوانہ ج ۱ ص ۱۲۱، ابوداؤد ج ۱ ص ۱۲۱)

کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پھر خطب فرمایا اور نماز کا طریقہ سکھایا اور سنت کی تعلیم دی اور فرمایا کہ صلیف درست کیا کرو۔ تم میں ایک امامت کا فریضہ انجام دے جب امام نکلیں گے تو تم بھی تکبیر کرو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

امام ابوعوانہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سہل بن بجر چند سب ابوری نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہ بن رشید نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو عبیدہ رحمہ نے بیان کیا۔ وہ قنادہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قرأ الہام فانصتوا واذ اقال غیر المغضوب علیہم ولا الضالین فقولوا آمین۔ (ابوعوانہ ج ۲ ص ۱۳۶)

آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پڑھے تو تم آمین کہو۔

ابو عبیدہ بن رشید اور ابو عبیدہ کو علامہ سمعانی مستقیم الحدیث لکھتے ہیں۔ (کتاب الانساب ص ۱۳۶)۔ مولانا ظفر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ سہل بن بجر کا ترجمہ مجھے نہیں مل سکا۔ لیکن کنز العمال جلد ۱ ص ۱۳۶ میں لکھا ہے کہ صحیح ابوعوانہ کی تمام حدیثیں صحیح ہیں۔ (اعلام السنن جلد ۲ ص ۴۹) اور تدریب الراوی ص ۵۵ میں ابوعوانہ کو صحیح کہا گیا ہے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۳۶) راقم الحروف کہتا ہے کہ مبارک پوری صاحب کو بھی اس کا اقرار ہے۔ چنانچہ وہ ایک سند کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ اور حافظ ابو عوانہ کی سند کا بھی صحیح ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے صحیح میں صحت کا التزام کیا ہے۔ (بلفظ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۸) محقق نیموی نے اس کو متابعت میں پیش کیا تھا (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۸۵) اور مبارک پوری صاحب نے تصحیح طلب کی تھی۔ (ابکار المنن ص ۱۵۲) مگر یہ عبارت خود ہی ان کا جواب ہے۔ خود اپنی پسند کے جواب سے بہتر جواب اور کیا ہو سکتا ہے؟ وکفی بنفسک الیوم علیک حسیا۔ مولانا عبد اللہ صاحب دوپٹری مرحوم نے الکتاب المستطاب ص ۸۶ میں اور مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۱۶ اور ص ۴۱۷ میں ابو عبیدہ اور سہل بن بجر کے بارے میں ادھر ادھر کے راویوں کا نام لسان المیزان اور کتاب الکنی واولائی سے نقل کر کے ان کی جو تضعیف (بقیہ صفحہ پر دیکھئے)



ان تمام صحیح روایات سے معلوم ہوا کہ قرأت کرنا امام کا کام ہے اور مقتدیوں کا کام صرف خاموش رہنا اور انصاف کرنا ہے اور آپ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ جب امام ہر کرے تو تم خاموش رہو بلکہ یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور یہ مفہوم عبارتہ النص کے طور پر ہم چری اور ستری سب نمازوں کو شامل ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث پر فریق ثانی کی طرف سے جو اعتراضات وارد کیے گئے ہیں۔ ان کو نقل کر کے ان کے جوابات بھی ہدیہ ناظرین کر دیے جائیں۔ تاکہ فن روایت اور درایت کے لحاظ سے اس حدیث کی حقیقت بھی آشکارا ہو جائے اور اعتراضات کی پوزیشن بھی واضح ہو جائے۔

### پہلا اعتراض

حضرت امام بخاریؒ اور مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سندیں سلیمان تیمیؒ مدلس ہیں اور وہ غصہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس لیے حسب قاعدہ محدثین یہ روایت قابل استدلال نہیں ہو سکتی۔ (جزء القراءة ص ۵۶، تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۸۴ وغیرہ) جواب۔ یہ سوال بالکل سطحی قسم کا ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ تمام محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مدلس راوی جب حدثنا وغیرہ الفاظ سے تحدیث کرے تو تدریس کا الزام اس پر سے رفع ہو جاتا ہے اور ہم پہلے ابو حوانہ اور ابو داؤد کی صحیح سند کے ساتھ ان کی تحدیث (سلیمان تیمیؒ قال حدثنا قتادة) نقل کر چکے ہیں اور معتز بن سلیمانؒ پر بھی مدلس ہونے کا الزام ہے۔ مگر ابو حوانہ اور ابو داؤد کی سند روایت میں وہ بھی سمحت فرماتے ہوئے تحدیث کرتے ہیں۔

(پچھلا صفحہ۔ حاشیہ) کی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ بھلا صحیح ابو حوانہ کے یہ ضعیف راوی کیسے ہو سکتے ہیں جو تبصریح محدثین صحیح ہے۔ ابو حوانہ کی سند میں جو راوی ہیں وہ بالکل ثقہ ہیں اور جن راویوں کی انھوں نے نشانہ ہی کی ہے وہ راوی ابو حوانہ کے ہرگز نہیں ہیں۔

۱۔ شرح نجمۃ الفکر ص ۵۳، تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۷۰ اور تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۶۲ وغیرہ میں محدثین کا یہ قاعدہ نقل کیا گیا ہے۔

وثائقیاً۔ جملہ محدثین کا یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ اگر مدلس راوی کا کوئی متابع موجود ہو تو تالیس کا عیب اور طعن اس سے اٹھ جاتا ہے۔ چنانچہ مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ تالیس کا طعن متابعت سے اٹھ جاتا ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۶۲) اور صحیح ابو عوانہ کی روایت میں ابو علیہ سلیمان تیمی کے متابع ہیں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ مولانا محمد حسن صاحب محدث فیض پور می فرماتے ہیں کہ صحیح ابو عوانہ کی مستقل سند میں ابو عبیدہ الحداد سلیمان تیمی کے متابع ہیں اور اس کی سند اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔ (فی غایتہ الصحتہ) (الدلیل المبین) علاوہ انہیں دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۶ میں ان کے دو اور متابع موجود ہیں۔ عمر بن عامر اور سعید بن ابی عروبہ جب سلیمان تیمی خود تحدیث کرتے ہیں اور ان کے تین ثقہ راوی متابع موجود ہیں تو پھر اعتراض کی کیا وقعت رہ جاتی ہے؟

دوسرا اعتراض:

حضرت امام بخاری، امام دارقطنی اور امام ابوداؤد وغیرہ فرماتے ہیں کہ واذا قلنا فانصتوا کی زیادت محفوظ نہیں ہے۔

لرحیث بہ الاسلام التیمی فی  
ہذا الحدیث۔ (جزء القراءة ص ۵۶)

کیونکہ سلیمان تیمی کے بغیر اس حدیث میں  
یہ زیادت اور کسی سے مروی نہیں ہے۔

و کتاب الکئی ح ۳، دارقطنی جلد ۱

ص ۱۲۵ و ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۴۰

۱۔ عمر بن عامر۔ یہ مسلم کے روایات اور رجال میں تھے۔ امام ابن معین اور محدث عجل ان کو ثقہ کہتے ہیں

اور امام احمد ان کو ثقہ اور ثبت فی الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۴۶)

۲۔ علامہ ذہبی ان کو الامام، الحافظ اور احدا اعلام لکھتے ہیں۔ امام ابن معین اور نسائی ان کو ثقہ

کہتے ہیں۔ (مذکرہ جلد ۱ ص ۱۶) امام دارقطنی (المتوفی ۳۸۵ھ) اور امام بیہقی نے اس پر یہ اعتراض

کیا ہے کہ عمر بن عامر اور سعید بن ابی عروبہ کی سند میں سالم بن نوح واقع ہے۔ جو قوی نہیں ہے

اس لیے یہ روایت متابعت کے قابل نہیں ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۶)

لیکن یہ اعتراض چنداں وزنی نہیں ہے۔ کیونکہ سالم بن نوح سے امام مسلم (مثلاً جلد ۱ ص ۲۳۶،



جواب۔ ان اکابر کا یہ عذر قابل سماعت نہیں ہے :

اولاً : اس لیے کہ سلیمان تیمیؒ بلا اختلاف ثقہ اور ثبت، متقن اور حافظ تھے۔ (جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں) اور تمام محدثین کا اس امر میں اتفاق ہے کہ ثقہ کی زیادت قابل قبول ہے۔ چند نقول ملاحظہ فرمائیں :

علامہ قسطلانی (المتوفی ۹۲۳ھ) لکھتے ہیں کہ صحیح مسک یہ ہے کہ ثقات کی زیادت مطلقاً قابل قبول ہے۔ (قسطلانی جلد ۱ ص ۱۷) علامہ حازمی (الشافعی المتوفی ۵۸۴ھ) لکھتے ہیں کہ ثقہ راوی کی زیادت مقبول ہے۔ (کتاب الاعتبار ص ۲) امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ اور حافظ راوی کی زیادت قابل قبول ہوتی ہے۔ (کتاب العلل ۲ ص ۲۲) امام حاکم کا بیان ہے کہ فقہائے اسلام کا اس بات پر کلی اتفاق ہے کہ متون اور اسانید میں ثقات کی زیادت مقبول ہوگی۔ (مستدرک جلد ۱ ص ۳) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ محدث ابن خزیمہ کا بیان ہے کہ حافظ متقن اور مشہور راوی کی زیادت کا انکار ہرگز نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کی زیادت بہر حال قابل قبول ہوگی۔ لیکن اگر کوئی ایسا راوی جو اس کے ہم پایہ نہ ہو اور متواتر حدیث میں ایک جملہ زائد کرے تو وہ زیادت قابل قبول نہیں ہے۔ (محصلہ کتاب القراءۃ ص ۹۵) لیکن سلیمان تیمیؒ تو دوسرے راویوں سے بڑے حافظ ہیں۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ۲۹۹ ص ۳۵، ۳۵۶ ص ۱۸۶، ۲۲۳ ص ۲۹۵، ۳۳۳ ص ۳۹۶، ۳۹۸ ص ۳۹۸

وغیرہ میں) اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اپنے اپنے صحیح میں احتجاج کیا ہے۔ (جوہر النقی جلد ۱ ص ۱۵۲) امام احمد فرماتے ہیں کہ ما بعدیثہ بائس ان کی حدیث میں کوئی خرابی نہیں۔ ابو زرؒ ان کو لو بائس بہ اور صدوق لکھتے ہیں۔ امام یحییٰؒ لکھتے ہیں ما بائس بذلك ان میں کوئی خرابی نہیں۔ ابن عدیؒ ان کی حدیثوں کو اقرب الی الصواب لکھتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ساجیؒ ان کو صدوق اور ثقہ لکھتے ہیں۔ ابن شاپرؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن قانعؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۴۳۳) فریق ثانی ان کا موازنہ فرما محمد بن اسحاقؒ سے کر دیکھے جن کی روایت سے ان کا احتجاج

ہے۔ ع : وبضدھا تتباین الاشیاء

لہ امام دارقطنیؒ نے تشہد کے باب میں وحدۃ التشریک لہ کی زیادت کو جس میں سلیمان تیمیؒ متغیر ہیں صحیح تسلیم

کیا ہے۔ دیکھو دارقطنی جلد ۱ ص ۱۳۴

اہم نووی لکھتے ہیں کہ جہور محدثین اور علماء فقہ و اصول اس بات پر متفق

ہیں کہ ثقہ راوی کی زیادت اور فقر و مقبول ہے۔ (تلخیص المستدرک جلد ۱ ص ۳۱) علامہ ماروینیؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت مقبول ہے۔ (الجزء ہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۵) علامہ زلیعیؒ کا بیان ہے کہ ثقہ متقن اور حافظ راوی کی زیادت قابل قبول ہوتی ہے۔ (زلیعی جلد ۱ ص ۳۳۴) حافظ ابن حجرؒ بھی اس کی تصریح کرتے ہیں۔ (شرح منہج المفکر ص ۳) علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت مقبول ہے۔ (توجیہ النظر ص ۲۶۳) مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ راوی جب تنہا کوئی زیادت نقل کرے تو وہ صحیح ہے اور اگر کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ اس زیادت کو بیان کرتا ہو تو اس کے صحیح ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں۔ (تعلیق المغنی جلد ۲ ص ۳۸۵) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ شک نیست کہ زیادت ثقہ مقبول است۔ (بدور الابلہ ص ۵۶) مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت مقبول ہے (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۵) مولانا گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اور زیادت ثقہ کی باتفاق جملہ محدثین قدیم و جدیدہ کہ جن میں خود بخاری علیہ الرحمۃ بھی ہیں صحیح و معتبر ہے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ (ہدایۃ المقتدی ص ۵) ان تمام اقتباسات سے یہ بات یقیناً اور حتماً ثابت ہو جاتی ہے کہ سلیمان تیمیؒ (جو لایخیر الامام، الحافظ ثقہ، ثبت اور شیخ الاسلام تھے) کی واذا قرأ فانصتوا کی زیادت بالکل صحیح اور معتبر ہے۔ اس کا انکار کرنا فن حدیث کے طے شدہ اصول سے انحراف کرنا ہے جو یقیناً مردود ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ

لہ یہ سب بحث روایتی حیثیت سے تھی اور روایتی لحاظ سے بھی یہ زیادت بالکل صحیح ہے مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت اس وقت شاذ اور ناقابل قبول ہوتی ہے جب اصل روایت کے منافی ہو اگر اصل اور ماقبل کے منافی نہ ہو تو جہور محققین کے نزدیک وہ زیادت قابل قبول ہوتی ہے۔ (ابکار المنقذ ص ۴۱) اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت ماقبل (واما جعل الامام لیؤتم بد) کے ہرگز منافی نہیں ہے بلکہ اس کے عین مطابق ہے کیونکہ انصات کرنا اور خاموش رہنا تمام اور اقتدار کے ہرگز منافی نہیں ہے بلکہ جو لوگ امام کے پیچھے قرأت کے وقت خاموشی اختیار نہیں کرتے وہ درحقیقت مؤتم اور مقتدی کہلانے کے مستحق نہیں ہیں اس لیے کہ ان کی امام کے پیچھے قرأت کرنا سراسر



والزيادة مقبولة والمفسر يقضى على المذهب  
اذا رواه اهل الثبوت... اه (بخاری ج ۲)

امام خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ

قال الجمهور من الفقهاء واصحاب  
الحديث زيادة الثقة مقبولة اذا انفرد  
بها..... اه (کفایۃ ص ۲۲۳)

زیادت مقبول ہے اور مفسر روایت مبہم پر  
حاکم ہے جب کہ اہل ثبوت اس کو روایت کریں۔

جمهور فقہاء اور محدثین یہ فرماتے ہیں کہ ثقہ  
راوی جب منفرد ہو تو اس کی زیادت قابل قبول ہے

اور مختلف اقوال و آراء نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

والذي مختاره من هذه الاقوال ان  
الزيادة الواردة مقبولة على كل الوجه  
ومعمول بها اذا كان راويها عدلاً  
حافظاً ومتقناً ضابطاً..... اه (کفایۃ ص ۳۲۵)

ان اقوال میں سے جو قول ہم اختیار کرتے ہیں  
وہ یہ ہے کہ زیادت جہاں بھی وارد ہو وہ بہر صورت  
مقبول اور قابل عمل ہے جب کہ اس کا راوی عدل  
حافظ اور متقن ضابطہ ہو۔

اور نواب صاحب فرماتے ہیں کہ ونیز زیادت ثقہ مقبول است مطلقاً نزد جماہیر از

اہل حدیث وفقہ واصول قالہ النووی..... اه (ہدایۃ السائل ص ۱۹۱) اور علامہ محدث حسین  
بن محسن انصاری نے شاذ اور معطل پر بڑی نفیس بحث کی ہے اور لکھتے ہیں کہ جب ثقہ راوی  
زیادت نقل کرے تو وہ مستقل حدیث کے حکم میں ہے اس کو رد کرنے کا کیا معنی؟ (البيان المکمل  
ص ۶، المنضم مع الدارقطنی) اور امام نووی لکھتے ہیں کہ

ومذهب الجمهور من الفقهاء والمحدثين  
قبولها مطلقاً (تقریب النواوی مع تدبیر  
الراوی ص ۱۵۶)

اور علامہ سیوطی لکھتے ہیں کہ

وقد ادعى ابن الطاهر الاتفاق على  
هذا القول..... اه (تدريبات الراوی ص ۱۵۶)

اور ابن طاہر نے دعویٰ کیا ہے کہ اس قول پر  
سب کا اتفاق ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) اقتدار کے خلاف ہے۔ (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۲۳)

مؤلف خیر الکلام ص ۲۸۸ میں ایک راوی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب ان کا ثقہ ہونا ثابت ہوا تو اس صورت میں ان کا تفرد کوئی مضر نہیں ہوگا۔۔۔ اھ

حافظ ابن حجر ایک مقام پر لکھتے ہیں :

وعلى تقدير تفرد الراوى عنى بذكرها

لا يستلزم ذلك تخطئته (انہا نکون

زیادة من ثقة حافظ غير منافية

لرواية رفيقته فتقبل ولا تكون شاذة

وله معنى لرد الروایات الصحيحة بهذه

التعليات الواهية (فتح الباری جلد ۱،

ص ۲۴۷ طبع مصر۔)

اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس زیادت کے ذکر

کرنے میں اور اعلیٰ متفرد ہے تب بھی اس سے یہ

ثابت نہیں ہوتا کہ یہ ان کی خطا ہے کیونکہ یہ ثقہ اور

حافظ کی زیادت ہے اور یہ اس کے باقی رفیق کی روا

کے متنافی نہیں ہے سو یہ قابل قبول ہے اور شاذ نہیں

اور صحیح روایات کو ان کی ایک بہانوں سے (کہ یہ شافعی

ٹھکرانے کا کوئی معنی نہیں ہے۔

اور قاضی شوکانی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ (نیل الاوطار جلد ۱ ص ۱۶۱) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :

اور شاذ کہہ کر روایت کو مطول قرار دینے کی طرف

وله يلتفت الى تعليل الحديث به اذا كانت

الرافع ثقة۔ (نیل جلد ۱ ص ۲۰۲)

کوئی توجہ نہیں کی جاسکتی جب کہ رافع ثقہ ہے۔

حضرات محدثین کرام، فقہار عظام اور ارباب اصول کا یہ اتفاقی اجماعی اور طے شدہ قاعدہ

ہے کہ جب راوی ثقہ اور حافظ ہو اور وہ زیادت نقل کرے تو مطلقاً اس کی روایت مقبول ہے

اور بحمد اللہ تعالیٰ سلیمان تیمی ثقہ اور حافظ ہیں لہذا ان کی زیادت واذا قرأ فانصتوا بہر حال مقبول

ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا (ص ۳۱۵، ص ۳۱۶ میں) اوداسی طرح قاضی

قاضی مقبول احمد صاحب کا (ملاحظہ ہوا الاعتصام ص ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۲ء)

امام بیہقی کی تقلید میں اس کو شاذ کہنا بالکل غلط اور قطعاً باطل ہے اور تمام اصول کے خلاف ہے۔

جس کی حیثیت ایک پرکاش کی بھی نہیں ہے اور اصول حدیث کے پیش نظر اس کو کوئی سننے کے لیے

تیار نہیں ہے۔ اپنے جی کو خوش کرنے یا اپنے حواریوں کا غم ہلکا کرنے کے لیے وہ بڑے شوق سے

اس کو شاذ کہتے پھریں۔

وثانیاً۔ اس زیادت کے نقل کرنے میں سلیمان تیمی متفرد نہیں، بلکہ صحیح ابو عوانہ کی روایت



میں ابو عبیدہ بھی اس زیادت کو نقل میں سلیمان تیمی کے ساتھ ہیں اور ابو عوانہ کی سند کا صحیح ہونا خود مبارک پوری صاحب کو بھی مسلم ہے۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ نیز عمر بن عامر اور سعید بن ابی عروہ بھی اس زیادت کو بیان کرتے ہیں اور دونوں ثقہ ہیں اور ان کی سند علی شرط مسلم صحیح ہے کما مژ۔ الغرض فریق ثانی کا یہ اعتراض سراسر باطل ہے اور یہ اس حدیث کی صحت پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ

وما اعله البخاری فلیس بقادح فی صحۃ  
 (تتبع العبادات) کی جو کوشش کی ہے تو اس سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

الحاصل سلیمان تیمی کی یہ روایت بلا شک و شبہ بالکل صحیح ہے اور اس میں ان کی غلطی بتلانامان پر بہتان باندھنا ہے۔ امام احمد سے کسی نے سوال کیا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ سلیمان تیمی نے خطا کی ہے تو امام احمد نے جواب دیا: جس شخص نے سلیمان تیمی کی طرف خطا کی نسبت کی ہے وہ ان پر بہتان باندھتا ہے (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۵۵) اس روایت میں اصل قصور اور خطا ان روایت کی ہے جنہوں نے یہ صحیح زیادت تک کر دی ہے۔ فساھلہم اللہ تعالیٰ بعموم فضلہ۔ مؤلف خیر الکلام نے اپنے پیشرو حضرات کے نقش قدم پر چل کر واذ اقرا فانصتوا کی زیادت کو ایڑی چوٹی کا زور لگا کر دھینگا دھینگا غیر مقبول اور شاذ بنانے کی کوشش ناکام کی ہے۔ اور شاذ کی تعریف پر مطلقاً غور نہیں کیا اور غور کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ پھر تو قلعی کھل جاتی تھی اگرچہ انہوں نے ص ۴۱۸ میں شرح شعبہ اور مقتضب ابن الصلاح وغیرہ سے شاذ کی تعریف نقل کی ہے لیکن لفظ مخالف فیہ النامس پر غور نہیں کیا شاذ کی تعریف نیچے حضرت امام شافعی فرماتے ہیں کہ

قال الشافعی لیس الشاذ من

الحديث ان يروى الثقة ماله يرويه

غيره هذا ليس بشاذ وانما الشاذ

ان يروى الفتح حدیثا مخالف فیہ الناس

شاذ وہ حدیث نہیں ہے جس کو ثقہ روايت کرے اور دوسرے روایت نہ کرتے ہوں بلکہ شاذ وہ روایت ہے جس کو ثقہ روایت کرتا ہو مگر اس میں دوسرے لوگوں کی مخالفت کرے

یہ ہے شاذ۔

هذا الشاذ من الحديث

(معرفة علوم الحديث ص ۱۱۹)

امام مسلم فرماتے ہیں کہ

وعلمنا من المنكر في حديث المحدث

اذا ما عرضت رواية للحديث على رواية

غيره من اهل الحفظ والرضى خالفوا

روايتهم ولم تكن توافقها فاذا كانت

ازد غلب من حديثه كذا كان مهجور

الحديث غير مقبول ولا مستعمل۔

... ۱ھ (مسلم جلد ۱ ص ۵)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ

لان الزيادة امان تكون لا تنافي

بينها وبين رواية من لم يذكرها

فهذه تقبل مطلقاً لانها في حكم التحدث

المستقل الذي يتفرد به الثقة ولا يرويه

عن شيخه غيره واما ان تكون منافية

بحديث يلزم من قبولها رد الرواية

الآخرى فهذه هي التي يقع الترجيح

بينها وبين معارضتها فيقبل الراجح

ويرد المرجوح ... ۱ھ

(شرح نخبه الفكر ص ۳۷)

اور تدریب الراوی میں ہے۔

اور محدث کی قابل انکار حدیث کی علامت

یہ ہے کہ جب اس کی روایت دوسرے اہل حفظ

اور پسندیدہ راویوں کی روایت پر پیش کی جائے تو

اس کی روایت ان کی روایت کے مخالف ہو یا ممکن

ہی نہیں کہ اس کے موافق ہو پس جب اس کی حدیث

پر غلبہ یہ ہو تو اس کی حدیث متروک اور غیر مقبول

ہوگی اور قابل عمل نہ ہوگی۔

کیونکہ زیادت یا تو ایسی ہوگی کہ اس میں اور

دوسرے راویوں کی روایت میں جھوٹ اس کو

ذکر نہیں کیا منافاة نہ ہوگی تو ایسی زیادت مطلقاً

مقبول ہے کیونکہ یہ مستقل حدیث کے حکم میں ہے

جس کے بیان میں ثقہ راوی متفرد ہو اور اس کے

شیخ سے اور کوئی روایت نہ کرتا ہو اور یا وہ زیاد

ایسی ہوگی کہ وہ دوسرے راویوں کی روایت

کے منافی ہوگی اس حیثیت سے کہ اس کے قبول

کر لینے سے دوسری روایت کا رد لازم آتا ہو تو

اس میں اور اس کی معارض میں ترجیح کا سوال ہوگا

راجح کو قبول کیا جائے گا اور مرجوح کو رد کیا جائے گا۔



ثم يفسرون الشذوذ بـمخالفة  
الثقة من هو وثق منه والمنقول عن  
ائمة الحديث المتقدمين كابن  
مهدى ومحيي القطان واحمد وابن  
معين وابن المديني والبخاري وابي  
زرعة وابي حاتم والنسائي والدارقطني  
وغيرهم اعتبارا لترجيح فيما يتعلق  
بالزيادة المنافية بحيث يلزم من  
قبولها رد الرواية الاخرى ..... اه  
(تدريب الراوي ص ۱۵۷)

اور ترجیح النظر میں ہے۔

وزيادة راوی الصحيح والحسن  
تقبل مطلقاً ان لم تكن منافية لرواية  
من لم يذكرها وانها حينئذ كالحدیث  
المستقل الذي ينفرد به الثقة ولو  
يرويه عن شيخهم غيره فان  
كانت منافية لها بحيث يلزم من  
قبولها رد الرواية الاخرى بحيث  
عن الراجح منها فان كان الراجح  
منها رواية من لم يذكر تلك الزيادة  
لمزيد ضبطه او كثرة عدله او  
غير ذلك من موجبات الترجيح ان  
ردت تلك الزيادة وان كان الراجح

پھر حضرات محدثین شذوذ کی تعریف یہ  
کرتے ہیں کہ ثقہ راوی ثقہ تر راوی کی مخالفت  
کرے اور متقدمین ائمہ حدیث مثلاً ابن مہدی  
یحیی القطان، احمد، ابن معین، ابن المہدی  
بخاری، ابو زرعة، ابو حاتم، نسائی اور دارقطنی  
وغیرہ یہ فرماتے ہیں کہ اعتبار ترجیح کا اس منافی  
زیادت سے متعلق ہے جس کا قبول کر لینا  
دوسری روایت کے رد کو مستلزم ہو۔

صحیح اور حسن کے راوی کی زیادت مطلقاً  
مقبول ہے اگر وہ ان راویوں کی روایت کے  
مخالف نہ ہو جنہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا کیونکہ  
وہ اس وقت مستقل حدیث کے حکم میں ہے  
جس کو ثقہ راوی انفرادی طور پر بیان کرتا ہے  
اور اس کے شیخ سے کوئی اور اس کا راوی  
نہیں ہے۔ پس اگر وہ زیادت دوسری روایت  
کے جس میں زیادت نہیں ہے بایں طور منافی  
ہو کہ اس زیادت کے قبول کر لینے سے اس  
روایت کا رد لازم آتا ہو تو یہاں راجح و مرجوح  
کی بحث چلے گی۔ اگر راجح ان راویوں کی تھا  
ہے جنہوں نے اس کو ذکر نہیں کیا۔ مزید ضبط

منہارواۃ من ذکر تلك الزیادة  
قبلت ..... اھ

(توجیہ النظر ص ۲۱۹ و ۲۲۰)  
اور اگر راجح اس کی روایت ہے جس نے اس  
کو ذکر کیا ہے تو زیادت قبول کر لی جائے گی۔

ان تمام اقتباسات سے روز روشن کی طرح یہ بات ثابت ہو گئی کہ شاذ اور غیر  
مقبول روایت میں حضرات محدثین کرام کے نزدیک ایک بنیادی شرط ہے وہ یہ کہ  
اس کی روایت باقی ثقات کی روایت کے مخالف اور منافی ہو اور مخالفت اور منافات  
بھی بایں طور کہ اس کے تسلیم کر لینے سے ان باقی ثقات کی روایت (جس کو وہ اپنے شیخ  
سے صحیح اور متصل سند کیساتھ روایت کرتے ہیں اور ان میں وجوہ ترجیح بھی موجود ہیں جن کو نظر انداز نہیں  
کیا جاسکتا۔) کا رد لازم آتا ہو اور اس زیادت کی اصل حدیث کے ساتھ موافقت  
کی مطلقاً کوئی راہ نہ پیدا ہوتی ہو (اولہو تکد توافقہا) لیکن یہاں واذ اقرأ فانصتوا کی  
زیادت کا معاملہ ہرگز ایسا نہیں ہے کیونکہ اس کی اصل روایت سے قطعاً کوئی مخالفت  
اور منافات نہیں ہے بلکہ یہ تو حدیث کے اول حصہ کی مؤید ہے جیسا کہ ہم نے شیخ الاسلام  
ابن تیمیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے جس کا کوئی جواب مؤلف خیر الکلام نے نہیں دیا بلکہ حواریوں  
کو مغالطہ دینے کے لیے یہ لکھ مارا ہے کہ قبول کرنے والوں نے شذوذ کا کوئی جواب نہیں دیا  
(ص ۴۲۲) ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ واذ اقرأ فانصتوا کی زیادت انما جعل الزاماً  
لیؤتوبہ کی عین مؤید ہے۔ اس کے منافی اور مخالف ہرگز نہیں اس لیے یہ کسی صورت  
میں شاذ اور غیر مقبول نہیں ہے۔ رہا مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ جو لوگ اس زیادت کو بقیہ  
حدیث کے منافی قرار دیتے ہیں۔ ان کی تقریر یہ ہے کہ شروع حدیث میں یہ جملہ ہے انما  
جعل الزاماً لیؤتوبہ کہ امام کی پیروی کرو اور حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں یہ لفظ بھی  
ہے فلا تختلفوا علیہ سنن کبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۴ اس کے ساتھ مخالفت نہ کر و یعنی جس طرح  
امام کرے اسی طرح کرو اس جملہ کا تقاضا یہ ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے پڑھے (محصلہ  
ص ۴۳۱) تو یہ سب ان کی غفلت کا نتیجہ ہے :



اولاً۔ اس لیے کہ حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت میں انما جعل الامام لیؤتم بہ کا حصہ عمر بن عامر اور سعید بن ابی عروبہ کے طریق سے آتا ہے اور مؤلف خیر الکلام توصلت میں ان کی حدیث کو شافکتے ہیں۔ پھر بقول ان کے اس شاذ پر بنیاد رکھنا کیونکر صحیح ہے؟ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس روایت کا راوی سالم بن نوح ہے جو مؤلف خیر الکلام کے نزدیک ضعیف ہے۔

وثانیاً۔ فلا تختلفوا علیہ کا جملہ محمد بن حجلان کی روایت میں ہے اور وہ ان کے نزدیک وہی ہیں پھر اس کا کیا اعتبار؟

وثالثاً۔ اگر امام کی مخالفت کا یہی معنی ہے تو مقتدی نہ صرف یہ کہ سورۃ فاتحہ ہی پڑھیں بلکہ مازاد بھی پڑھیں اور جہر کے ساتھ پڑھیں اور ہر ایک امام کی طرح مصلیٰ پر کھڑا ہو۔ کیونکہ جو امام کرتا ہے سو مقتدی بھی کریں فلا تختلفوا علیہ پر پورا عمل ہونا چاہیے۔ الغرض ان رکیکے لیے جہت سے اس صحیح زیادت کا انکار اور اس کو شافکتہ سراسر باطل ہے۔

تیسرا اعتراض۔  
مبارک پوری صاحب (وغیرہ) لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں قنادہ مدلس ہے اور عنعنہ سے روایت کرتا ہے اور مدلس کی معنی روایت قابل التفات نہیں ہوتی۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۸۱ و البکار المنین ص ۵۸ وغیرہ)

جواب: یہ اعتراض بھی باطل ہے:  
اولاً۔ اس لیے کہ یہ روایت مسلم کی ہے اور بخاری و مسلم کی ثقہ ذات سے مروی جملہ روایات کے صحیح ہونے پر اُمت کا اجماع و اتفاق ہے۔ اگر صحیحین کی معنی حدیثیں صحیح نہیں تو اُمت کا اتفاق اور اجماع کس چیز پر واقع ہوا ہے جبکہ راوی بھی سب ثقہ ہیں۔  
وثانیاً۔ یہ روایت ابو عوانہ کی ہے اور باقر مبارکپوری صاحب انھوں نے اپنے صحیح میں صحت کا التزام کیا ہے۔ لہذا قنادہ کی اس سند کا صحیح ہونا ظاہر ہے۔

وثالثاً۔ محدثین کا اتفاق ہے کہ مدلس راوی کی تدلیس صحیحین میں کسی طرح بھی مضر نہیں ہے لہ صحیحین کی تدلیس کے مضر نہ ہونے کا یہ قاعدہ امام نووی و قسطلانی کے علاوہ علامہ بخاری (المتوفی ۴۵۰ھ) صحیحین کی تدلیس کے مضر نہ ہونے کا یہ قاعدہ امام نووی و قسطلانی کے علاوہ علامہ بخاری (المتوفی ۴۵۰ھ) (باقی نوٹ اگلے صفحہ پر ۲)

چنانچہ امام نووی لکھتے ہیں کہ

وما فی الصحیحین من التالیس فمحمول

صحیح بخاری و مسلم میں جو تالیس واقع ہو تو وہ دوسرے

علی السماع من جملۃ آخری۔

دلائل سے سماعت پر محمول ہے۔

(مقدمہ ص ۱۸ و شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۸۱)

یعنی اگر صحیحین میں کوئی مدلس راوی عنعنہ سے روایت کرتا ہے تو حدیث میں کراہم کے نزدیک وہ ایسی ہے جیسے اس راوی نے حدیثنا اور اخبارنا وغیرہ سے تحدیث کی ہو اور علامہ قسطلانیؒ لکھتے ہیں کہ امام ائمہ قنادہؒ اور سفیان ثوریؒ وغیرہ سے بخاری و مسلم میں جو روایتیں عنعنہ سے مروی ہیں وہ سماع پر محمول ہیں۔ اگرچہ ہمیں ان کی تحدیث پر اطلاع نہ ہو سکے۔ کیونکہ امام بخاری و مسلم سے متعلق ہم یہی اچھا اور نیک گمان قائم کر سکتے ہیں۔ (قسطلانی جلد ۱ ص ۹) امام سبکیؒ نے علامہ مزنیؒ سے سوال کیا کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے جو روایتیں عنعنہ کے ساتھ نقل کی ہیں کیا ان میں صراحت کے ساتھ تحدیث بھی ثابت ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ اکثر روایات میں اس کا ثبوت موجود نہیں ہے مگر ہمیں تحسین ظن کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ (تدریب الراوی ص ۵۹) مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۲۰ میں یہ لکھ کر اپنا دل خوش کر لیا ہے کہ مگر یہ قاعدہ ان احادیث میں چلتا ہے جہاں تنقید نہ ہوتی ہو۔ یہ قاعدہ ہر جگہ جاری نہیں ہوتا۔ الخ مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہیے کہ قاعدہ مذکورہ بخاری و مسلم کی تمام مدلس اٹیوں کے متعلق ہے صحیحین کی کوئی مدلس روایت اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں اور ایسی کوئی تنقید ان پر نہیں ہو سکی جس سے انکی مدلس روایت ضعیف ہو سکے لہذا صحیحین کے روایات کی تالیس کی اڑ لے کر صحیح حدیث کا انکار کرنا قانون روایت اور فن حدیث کے بالکل خلاف ہے جو ہر صورت مردود ہے ہاں اگر کوئی راوی ضعیف ہو تا تو معاملہ جدا ہوتا۔

و رابعاً قنادہؒ کا شمار طبقہ اولیٰ کے ان مدلسین میں ہوتا ہے جن کی تالیس کسی کتاب میں مضر

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) نے فتح المغیث ص ۷۷ میں اور امام سیوطیؒ نے تدریب الراوی ص ۱۴۴ میں اور

محدث عبدالقادر القرشیؒ (المتوفی ۷۷۵ھ) نے الجواہر المضمیہ جلد ۲ ص ۴۲۹ میں اور نواب صاحبؒ نے

ہدایت السائل ص ۱۹ میں پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔



نہیں ہے۔ چنانچہ امام حاکمؒ لکھتے ہیں کہ مدلسین کا ایک گروہ وہ ہے جو اپنے جیسے یا اپنے سے بڑھ کر یا اپنے سے کچھ کم ثقہ راویوں سے روایت کرتا ہے، مگر وہ اس زمرہ سے خارج نہیں جس کی روایتیں قابل قبول ہوتی ہیں سو ایسے مدلسین میں ابوسفیانؒ طلحہ بن نافعؒ اور قتادہ بن دعائمہؒ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۱۰۳) علامہ جزائریؒ علامہ ابن حزمؒ سے محدثین کا ضابطہ بیان کرتے ہوئے ان مدلسین کی فہرست بتاتے ہیں جن کی روایتیں باوجود تدلیس کے صحیح ہیں اور ان کی تدلیس سے صحت حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ

منہم کان جلة اصحاب الحديث واثمة  
المسلمین کالحسن البصری وابی اسحاق السبئی  
وقتادہ بن دعامة وعمر بن دینار وسلیمن  
الاعمش وابی الزبیر وسفیان الثوری  
وسفیان بن عیینة۔ (توجیہ النظر ص ۲۵۱)

ان مدلسین میں جلیل القدر محدث اور مسلمانوں کے امام شامل ہیں جیسے حسن بصریؒ، ابواسحاق السبئیؒ قتادہ بن دعائمہؒ، عمرو بن دینارؒ، سلیمان اعمشؒ، ابوالزبیر سفیان ثوریؒ اور سفیان عیینہؒ وغیرہ۔

معلوم ہوا کہ پہلے تو صحیحین میں کسی راوی کی تدلیس مضر نہیں۔ قتادہ کی ہوں یا کسی اور راوی کی اور پھر قتادہ کا شمار محدثین کے نزدیک ان مدلسین میں ہوتا ہے جن کی تدلیس کسی محل اور کسی موقع پر مضر نہیں ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ امام دارقطنیؒ نے جو یہ کہا ہے کہ قتادہ رحمہ اللہ مدلس ہیں۔ لہذا یہ روایت متصل نہیں مردود ہے اس لیے کہ لا یشک عندنا ان مسلماً رحمہ اللہ تعالیٰ یعلم هذه القاعدة و یعلم تدلیس قتادہ فلو لا ثبوت سماعہ عنہ لم یحتج بہ الی ان قال و نسبة الی امثل قتادہ الذی محلہ من العدالة والحفظ والعلم والغایة العالیة (شرح مسلم ج ۱ ص ۲۰۹) — اور ہمارے نزدیک اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ امام مسلم رحمہ اللہ یہ قاعدہ جانتے ہیں کہ مدلس کا عفنہ قبول نہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ قتادہ رحمہ اللہ مدلس ہیں۔ اگر امام مسلمؒ کے نزدیک قتادہ کا سماع ثابت نہ ہو تو وہ اس سے احتجاج نہ کرتے۔ (پھر آگے فرمایا) اور امام دارقطنیؒ نے قتادہ جیسی شخصیت کی طرف ایسی بات منسوب کی ہے جن کا مقام عدالت اور حفظ اور علم اور کمال کے انتہائی درجہ کو پہنچا ہوا ہے۔ — یہ حضرات محدثین کرامؒ کا طے شدہ ضابطہ ہے۔ علامہ ابن حزمؒ کی ظاہریت نہیں جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کہا ہے اور امام حاکمؒ نے بھی





اسلم کی سب باتیں صحیح نہیں کیونکہ انکی بعض روایتوں پر تنقید ہو چکی ہے تو پھر پرز صاحب اور دودی صاحب کا کیا قصور ہے؟ وہ بھی تو یہی کہتے ہیں بخاری مسلم کی سب باتیں صحیح نہیں ہیں اور یہی فریق ثانی کے شیخ الحدیث صاحب کہہ رہے ہیں مگر کسی غیر مقلد کو اس پر ادبلا مچانے کی توفیق نہیں ہوئی؟ آخر کیوں؟ اگر انکی رائے کے مطابق کوئی اور بھی صحیحین کی بعض روایتوں پر تنقید کرے تو انکو چین چین نہیں ہونا چاہیے۔ بلا شک حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے طبقات المدلسین میں قتادہ رحمہ کو تیسرے طبقہ کا مدلس کہا ہے مگر آخر میں اس سے رجوع کر لیا ہے۔

چنانچہ قاضی شوکانی حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

ونقل عنه انه قال لست راضياً عن شيء  
من تصانیفی لانها عملتها في ابتداء الامر  
ثم لم يتبين لي من يحرمها معي سوى شرح  
البخاری ومقدمته والمشتبه والتهديب  
ولسان الميزان ودودي عنه في موضع  
آخر انه اثنى على شرح البخاری والتعليق  
والنخبة... اهـ (البدار الطالع ص ۱۷ طبع اول  
۱۳۸۸ھ)

حافظ ابن حجر رحمہ سے نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں اپنی کسی تصنیف پر راضی نہیں ہوں کیونکہ وہ میں نے ابتدائی دور میں لکھی ہیں اور تحریر کر کے ابوالرفیق بھی مجھے میسر نہ ہو سکا (اس لیے ان تصانیف میں سقم رہ گیا ہے) ہاں فتح الباری اس کا مقدمہ مشتبہ تہذیب اور لسان المیزان پر میں خوش ہوں اور ان سے دوسری جگہ مروی ہے کہ انھوں نے فتح الباری، تعلیق اور نخبة کی بڑی تعریف کی ہے

اس سے معلوم ہوا کہ حافظ موصوف بغیر ان چند کتابوں کے جن میں فتح الباری بھی ہے اپنی اور کسی تصنیف پر نہ راضی ہیں اور نہ اعتماد کرتے ہیں کیونکہ زندگی کے ابتدائی دور میں وہ کتابیں لکھی ہیں جن میں علم و عقل خام ہوتے ہیں اور قابل اعتماد و رفیق بھی ان کو نصیب نہیں ہو سکا۔ تاکہ اس کی اصلاح شامل ہو جاتی اور ان کی ابتدائی کتابوں میں طبقات المدلسین بھی ہے۔ بخلاف اس کے فتح الباری اور دیگر چند کتابوں پر جن کے نام اوپر بیان ہو چکے ہیں وہ بڑے راضی ہیں اور فتح الباری (مثلاً جلد ۲ ص ۲۰۲ وغیرہ) میں قتادہ کی معنعن روایت کو صحیح کہہ رہے ہیں۔ لہذا انھوں نے اپنے سابق نظریہ سے رجوع کر لیا ہے۔ اور مؤلف خیر الکلام ص ۲۰۶ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں قتادہ ہے جو تیسرے طبقہ کے مدلسین سے ہے اور یہاں عن کے ساتھ روا کرتا ہے مگر بعض علماء نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے... الخ مؤلف مذکور نے اس روایت

سے استدلال کیا ہے اور اس کی صحت پر کوئی کلام نہیں کیا کیوں؟ اس لیے کہ ع :  
 احقر کو ہم دونوں دیر جاناں پہ جا ملے

۲  
 وثانیاً۔ حضرات محدثین عظام رحمہ کے ضابطہ پر تو مؤلف خیر الکلام مطمئن نہیں ہیں اور سلیمان  
 شاذ کوئی کی لاتوں کا سہارا تلاش کرتے ہیں اور یہ بتانے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے کہ  
 وہ کون ہے؟ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ فیہ نظر ابن معینؒ نے اس کو حدیث میں جھوٹا  
 کہا۔ ابوحاتم رحمہ اس کو متروک الحدیث اور نسائیؒ لیس بشقہ کہتے ہیں اور صالح جزیرہؒ فرماتے  
 ہیں کان یکذب فی الحدیث کہ حدیث میں جھوٹ کہتا تھا اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ وہ شراب  
 پیتا اور یہودہ حرکتوں میں آلودہ تھا اور نیز فرمایا کہ در بدمیک میں شاذ کوئی سے بڑا جھوٹا اور  
 کوئی داخل نہیں ہوا۔ بغویؒ فرماتے ہیں کہ رماء الاثمۃ بالکذب ائمہ حدیث نے اس کو  
 جھوٹ سے متهم کیا ہے اور امام یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں کہ کان یضغ الحدیث کہ وہ جعلی  
 روایتیں بنایا کرتا تھا۔ امام ابو احمد الحاکمؒ اس کو متروک الحدیث اور امام ابن ہمدانیؒ اس کو ضعیف  
 اور نامراد کہتے تھے۔ امام عبد الرزاقؒ نے اس کو عدو اللہ کذاب اور ضعیف کہا اور صالح جزیرہؒ کہتے ہیں  
 کہ آنا فانا سندیں گھر لیتا تھا تھا اور صالح بن محمدؒ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ کذاب اور لونڈے  
 بازی سے متهم تھا۔ (محصلہ لسان المیزان جلد ۳ ص ۸۴ تا ۸۷) یہ ہے مؤلف خیر الکلام کا  
 وکیل لا حول ولا قوۃ الا باللہ امام بخاریؒ نے شعبہ کے طریق کے علاوہ بھی بغیر تحدیث  
 اور سوائے متابعت کے قنادہ کی بہت سی روایتیں لی ہیں۔ مثلاً جلد ۱ ص ۷۶، ص ۸۱، ص ۸۲،  
 ص ۱۳۸، ص ۱۴۰، ص ۱۵۲، ص ۱۷۶، ص ۱۷۸، ص ۲۵۷، ص ۲۷۸، ص ۳۲۵، ص ۳۳۰، ص ۳۳۱،  
 ص ۳۳۲، ص ۳۳۳، ص ۳۸۳، ص ۳۸۵، ص ۴۰۱، ص ۴۰۴، ص ۴۸۷، وغیرہ وغیرہ۔ کیا ان تمام روایتوں کو  
 ضعیف سمجھا جائے۔ مؤلف خیر الکلام ہوش میں آکر جواب دیں۔ نرمی ٹھانپی بیکار ہے۔  
 وقال الشافعیؒ امام دارقطنیؒ ایک سند اس طرح نقل کرتے ہیں: عن قتادة عن ابی  
 غلاب عن حطان بن عبد اللہ الرقاشی.... ۱۷ اور آخر میں لکھتے ہیں کہ وهذا استنا  
 متصل حسن (جلد ۱ ص ۱۳۴) یہاں قنادہ عن سے روایت کرتے ہیں لیکن امام دارقطنیؒ  
 اس کو متصل اور حسن کہتے ہیں۔



لطیفہ : اس حدیث میں سلیمانؑ کی وحیدہ و شریکہ کی زیادت نقل کرنے میں متفرد ہیں اور امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ خالفہ ہشام و سعید و ابان و ابو عوانہ و غیرہم عن قتادہ... اھ کہ یہ سب راوی سلیمانؑ کی مخالفت ہیں۔ بایں ہمہ یہ روایت نہ معطل ہے اور نہ مثلاً بلکہ متصل اور حسن ہے مگر افسوس کہ یہی سلیمانؑ تیمیؒ جب واذقراً فانصتوا کی زیادت نقل کریں اور ان کے ثقہ متابع بھی موجود ہوں تو روایت فوراً شاذ ہو جائے آخر کیوں؟

وابعاً — متحدہ حدیث کبھی یوں ہوتی ہے کہ خود راوی کہتا ہے حدثنی فلاں یا سمعت فلاں یا اسی قسم کے اور الفاظ استعمال کرتا ہے اور کبھی لفظ عن ہوتا ہے لیکن اوپر کاراوی حدث یا یحدث کہتا ہے یہ بھی تحدیث ہی ہوتی ہے اور واذقراً فانصتوا کی روایت میں قتادہ کی تحدیث موجود ہے لہذا ان کو مدلس کہہ کر ان کی روایت کو رد کرنا قطعاً باطل اور یقیناً مردود ہے۔ چنانچہ ابو داؤد اور ابو عوانہ میں یوں ہے کہ

المعتمر قال سمعت ابا ثناء قتادہ عن ابی غلاب یحدثہ عن حطان بن عبد اللہ الرقاشی... اھ (ابوداؤد جلد ۱۴، ابوعوانہ ج ۲ ص ۱۳۲)

معتمر کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ (سلیمانؑ) سے سنا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے قتادہ نے بیان کیا وہ ابو غلاب سے روایت کرتے ہیں انھوں نے قتادہ سے بطریق حطان بن عبد اللہ الرقاشی تحدیث بیان کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابو غلاب نے قتادہ سے حدیث بیان کی ہے۔ تحدیث اور کیا ہوتی ہے؟ اور مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

یحدثہ امی یحدث ابو غلاب قتادہ یعنی ابو غلاب نے قتادہ سے حطان بن عبد اللہ عن حطان بن عبد اللہ الرقاشی... اھ (بذل المجہود جلد ۲ ص ۱۲)

اس لیے قتادہ کی تدلیس کا بہانہ بھی سراسر باطل ہے کیونکہ اس روایت میں تحدیث موجود ہے صرف غیر بالغ نظر لوگوں نے لفظ عن سے دھوکا کھایا اور دیا ہے۔ امام نوویؒ

لکھتے ہیں کہ

وَكَذَلِكَ قَالَ وَحَدَّثَ وَذَكَرَ وَشَبَّهَ بِمَا فَكَلَنَهُ  
مَحْمُولٌ عَلَى الرَّقِصَالِ وَالسَّمَاعِ -

اور اسی طرح لفظ قال اور حدّث اور ذکر اور  
ان کی مانند اور الفاظ اتصال اور سماع پر محمول

(شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۱) ہیں۔

لہذا اصول حدیث کے رو سے قنادہ کی یہ روایت متصل اور صحیح ہے باقی خواتین بدرا  
بہانہ پاتے بسیار مؤرخ اسلام علامہ عبد الرحمن بن خلدون (المتوفی ۸۰۸ھ) بخاری اور مسلم کی  
صحت اور مزینیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

وَمِنْ أَجْلِ هَذَا قِيلَ فِي الصَّحِيحِينَ  
بِإِجْمَاعٍ عَلَى قَبُولِهَا مِنْ جِهَةِ (الْإِجْمَاعِ)  
عَلَى صِحَّةِ مَا فِيهَا مِنَ الشَّرْطِ الْمَتَّقِ  
عَلَيْهَا فَلَا تَأْخُذُكَ رَيْبَةٌ فِي ذَلِكَ فَالْقَوْمُ  
أَحَقُّ النَّاسِ بِالظَّنِّ الْجَمِيلِ بِهِمْ -

اور اسی واسطے کہا گیا کہ بخاری اور مسلم کی روایات  
کے قبول کرنے پر اجماع ہے اس لیے کہ جو صحت  
کی متفق علیہا شرطیں ان میں موجود ہیں ان پر اجماع ہو  
چکا ہے لہذا اس بارے میں ذرہ بھر شک نہ کریں کہ  
وہ حضرات تمام لوگوں میں ظنِ جمیل کے زیادہ مستحق ہیں

اور صحیح مسلم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ  
ثُمَّ جَاءَ إِمَامُ مُسْلِمَ بْنِ الْحَجَّاجِ الْقَشِيرِيُّ  
رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى فَأَلْفَ مَسْنَدَهُ الصَّحِيحَ  
حَذَافِيَهُ حَذَّوالبخاری في نقل المجمع  
عليه... ۱۱۰ (مقدمة: ۱ ص ۴۴۵)

پھر امام مسلم بن الحجاج القشیریؒ آئے اور انھوں نے  
اپنا مسند صحیح تالیف کیا جس میں وہ امام بخاریؒ کے  
نقش قدم پر چلتے رہے اور مجمع علیہما روایتیں نقل  
کرتے رہے۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ

وَلَكِنَّ الشَّيْخَانَ (وَيَذَكُرَانِ) أَحَدَهُمَا قَدْ تَنَاوَلَا  
فِيهِمَا مَشَافَهُمَا وَاجْتَمَعَا عَلَى الْقَوْلِ بِهِ  
وَالْتَصَحَّحَا لَهُ (رَحْمَةُ اللَّهِ الْبَالِغَةُ) ۱۳

اور لیکن امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ صرف وہی حدیث  
ذکر کرتے ہیں جس میں انھوں نے اپنے اساتذہ سے  
بحث و مناظرہ کیا ہوتا ہے اور جس کے بیان کرنے اور  
تصحیح پر ان سب کا اجماع ہو چکا ہے

اور علامہ حسین بن محسنؒ لکھتے ہیں کہ



وقد حصل الاتفاق على الحكم بصحة ما في الصحيحين غير المستثنى... ۵۱ اور سلم میں تمام روایتیں بغیر استثناء کے صحیح ہیں۔  
(البيان المكمل ص ۲)

حضرات محدثین کرام کا یہ فیصلہ ہے لیکن غیر مقلدین حضرات کے شیخ الحدیث صاحب بخاری اور سلم کی صحیح زیادت کو بھی دودی صاحب اور پرویز صاحب کی طرح تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔  
فوا اسفہ — ترجمان الحدیث ماہ نومبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۳۷ میں جو بات ہمارے حق میں لکھی ہے وہ خود ان حضرات پر سو فیصدیٹ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

”ہم ناظرین کرام سے ایمان اور دیانت داری کا واسطہ دیکر پوچھتے ہیں کہ اگر محدثین اور رواقہ حدیث کے متعلق یہ رائے صحیح ہے جس کا اظہار یہ حضرات کر رہے ہیں تو ازراہ انصاف بتلایا جائے کہ کیا محدثین کی امانت و دیانت محفوظ رہی؟ منکرین حدیث نے آخر کو لسا تیر مارا جس کے زخموں سے ہم پریشان ہیں؟“

چوتھا اعتراض۔ مبارکپوری صاحب (وغیرہ) لکھتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو امام بخاری، ابو داؤد، ابو حاتم، ابن معین، حاکم، دارقطنی، ابن خزیمہ، ذہبی، ابو علی نیشاپوری اور امام بیہقی وغیرہ تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے یہ زیادت صحیح نہیں ہو سکتی۔ (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۸۳)  
جواب۔ ان حضرات کا اس زیادت کو صحیح نہ تسلیم نہ کرنا اس بات پر مبنی تھا کہ اس زیادت کے بیان کرنے میں سلیمان بنی متفرد ہیں، نیز قسارہ کی طرح وہ مدلس بھی ہیں اور ان باتوں کے تسلی بخش اور مسکت جوابات آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ لہذا اس زیادت کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ اور مبارک پوری صاحب اور ان کے اتباع مردم شماری کے لحاظ سے حق و باطل، صحیح و غلط میں تمیز قائم رکھنا ضروری سمجھتے ہیں تو وہ بھی سن لیں:

حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو صحیح سمجھنے والے یہ حضرات ہیں:

- ۱۔ امام احمد بن حنبل (مسند احمد ص ۳۸۶، تعلیق الحسن جلد ۲ ص ۸۶، فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۶)
- ۲۔ امام مسلم (صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۷، درایہ ص ۹)

۳۔ امام نسائی (بحوالہ فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۴۔ امام ابن جریر (تفسیر جلد ۹ ص ۱۱)

۵۔ علامہ ابن حزم (بحوالہ فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۶۔ امام منذری (عون المعبود جلد ۵ ص ۲۳۵)

تعلیق المنقح جلد ۱ ص ۱۲۲ تحقیق الکلام ۲

ص ۸۳، نفحۃ العنبر ۷۹

۷۔ حافظ ابن کثیر (تفسیر جلد ۲ ص ۲۸۰)

۸۔ امام اسحاق بن راہویہ (جوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۶)

تنوع العبادات ص ۸۶

۹۔ امام ابو یوسف (فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۱۰۔ حافظ ابن حجر (فتح الباری جلد ۲ ص ۲۰۱)

۱۱۔ امام ابو زرعہ رازی (مقدمہ فتح الباری ص ۳۳۵)

قسط لانی و تدریب الراوی ص ۳۰ مقدمہ سلم

ص ۱۳ و ازادہ ستر ص ۵۲

۱۲۔ امام موفق الدین ابن قدامہ (معنی جلد ۱ ص ۶)

۱۳۔ امام شمس الدین ابن قدامہ (شرح مقنع للکبیر

جلد ۲ ص ۱۳)

۱۴۔ امام ابن خزیمہ (برهان العجائب ص ۱۰۲)

نفحۃ العنبر ص ۷۹

۱۵۔ امام ابو عمر بن عبد البر (نفحۃ العنبر ص ۷۹)

۱۶۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ (فتاویٰ جلد ۳ ص ۳۱۲)

و تنوع العبادات ص ۸۶

۱۷۔ امام ابو عوانہ (کیونکہ باقر ارمبار کپوری صاحب

انہوں نے اپنے صحیح میں صحت کا التزام کیا

ہے اور حضرت ابو موسیٰ الاشعری کی روایت

متعدد اسانید سے انہوں نے صحیح میں

درج کی ہے۔

۱۸۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب

(عون الباری جلد ۱ ص ۳۲۳)

۱۹۔ علامہ مارونی (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۶)

۲۰۔ علامہ عینی (عمدة القاری جلد ۳

ص ۵۶)

۲۱۔ امام ابن معین (۱۷)

۱۷۔ امام مسلم سے ایک سائل نے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے صحیح میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت کی سند

کیوں بیان نہیں کی جب کہ وہ بھی آپ کے نزدیک صحیح ہے تو امام موصوف نے جواب ارشاد فرمایا کہ

لیس کل شیء عندی صحیح و ضعیفہ میں نے ہر اس حدیث کو جو میرے نزدیک صحیح ہے۔

اپنے صحیح میں درج کرنے کا التزام نہیں کیا بلکہ میں نے

تصرف وہ روایتیں درج کی ہیں جن پر محدثین کا اجماع

واقع ہوا ہے۔

(بقیہ ماثیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

ہا ہنا انما وضعت ہا ہنا ما اجمعوا

علیہ۔ (مسلم جلد ۱ ص ۱۷۲)



۲۲۔ امام عثمانؓ بن ابی شیبہؓ

۲۴۔ امام علیؓ بن المدینیؓ رحمہ

۲۳۔ امام سعید بن منصورؓ خراسانیؓ رحمہ

۲۵۔ امام ابن صلاحؓ وغیرہ وغیرہ محدثینؓ و

فقہاءؓ اس حدیث کی تصحیح کرتے ہیں۔ جب سو فیصدی حنفی و مالکی اور حنبلی اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں اور جب شوافع اور غیر مقلدین حضرات کا ذمہ دار منصف مزاج اور معتد بہ گروہ و اذقان فائستوا کی زیادت کو صحیح سمجھتا ہے تو اس کے صحیح ہونے میں کیا شک ہے؟ اور یہ بھی طے شدہ قاعدہ ہے کہ اثبات نفی پر مقدم ہوتا ہے۔ تو پھر نہ معلوم اس زیادت کی صحت کا انکار کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر محض مردم شماری سے مبارک پوری صاحبؓ میدان جیتنا چاہتے ہیں تو اس میں بھی ان کی شکست یقینی ہے۔ رہا مبارک پوری صاحبؓ کا امام ابن خزیمہؓ کو اس زیادت کی صحت کے منکرین میں شمار کرنا تو یہ باطل ہے۔ کیونکہ بریلان العجائب کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ امام

(بقیہ حاشیہ بچھلا صفحہ) حافظ ابن صلاحؓ نے مقدمہ صفحہ ۸ میں اور امام سیوطیؓ نے تدریب الراوی صفحہ ۴۲ میں اور علامہ جزائریؓ نے توجیہ النظر ص ۲۴۰ میں اس کی تصریح کی ہے کہ امام مسلمؓ کی مراد ما اجمعا علیہ کے جملہ سے یہ محدث ہیں۔ امام احمد بن حنبلؓ، امام یحییٰ بن معینؓ، امام عثمان بن ابی شیبہؓ، امام سعید بن منصورؓ خراسانیؓ اور حافظ ابن حجرؓ ان میں امام علی بن المدینیؓ کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۲۳) اور امام ابن صلاحؓ فرماتے ہیں کہ جس حدیث کو امام مسلمؓ اپنے صحیح میں صحیح سمجھتے ہیں اس کا صحیح ہونا نفس الامر میں یقینی ہے۔ (غایتہ المأمول جلد ۱ ص ۴) اس کا طے سے گویا یہ تمام ائمہ حدیث حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ کی اس زیادت والی روایت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

۱۔ اثبات کا نفی پر مقدم ہونا محدثین کا طے شدہ مسئلہ ہے۔ امام نوویؓ لکھتے ہیں کہ اثبات کو نفی پر ترجیح ہوتی ہے۔ (شرح مسلم جلد ۲ صفحہ ۵۰)

حافظ ابن حجرؓ لکھتے ہیں کہ المثلث اولیٰ من النافی۔ (مشرح غتہ الفکر ص ۹) امام بیہقیؓ لکھتے ہیں کہ المثلث اولیٰ من النافی (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۸) امیر میانیؒ لکھتے ہیں: والاثبات مقدم (سبل السلام جلد ۱ ص ۲۲۲) نواب صاحبؓ لکھتے ہیں کہ اثبات مقدم است بر نفی (بدور الابلہ ص ۳۷۹) مبارک پوری صاحبؓ لکھتے ہیں کہ من اثبت مقدم علی من نفی۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۱۶۱) مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ یہاں جمع ہی اثبات ہے۔ تصحیح اثبات نہیں ہے کیونکہ تصحیح ظاہر سند کے اعتبار سے ہے۔ اور (حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

موصوف اس زیادت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح امام ابن معینؒ کو بھی منکرینِ صحت میں شمار کرنا غلط ہے۔ کیونکہ نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ مسلم کی تمام مسند روایتوں کو صحیح سمجھتے تھے جن میں حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی واذا قرأ فانصتوا کی زیادتی والی روایت بھی شامل ہے۔ علاوہ بریں امام ابن معینؒ اور امام ابو حاتمؒ نے حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادتی پر کلام نہیں کیا بلکہ انھوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں اس زیادتی پر کلام کیا ہے، جس کا ذکر عنقریب ہو گا۔ (دیکھیے کتاب العلل ابن ابی حاتم جلد ۱ ص ۱۶۳ و سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۵۶ و بغیۃ الالمی جلد ۱ ص ۱۶) اس لیے حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں اس زیادتی کے انکار کرنے والوں میں ان کا شمار کرنا جہالت اور غفلت پر مبنی ہے۔

ووثوں کی دنیا میں بھی دیکھ لیجیے کہ اس زیادتی کے صحیح تسلیم کرنے والے زیادہ ہیں یا اس کے غلط قرار دینے والے: ع — چلی بھی برہی کسی پر کسی کے آن لگی

### پانچواں اعتراض

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ امام بیہقیؒ اور حافظ ابو علیؒ کہتے ہیں کہ حضرت قتادہؒ کے جملہ تلامذہ میں سے سلیمان تیمیؒ واذا قرأ فانصتوا کی زیادتی کو نقل کرنے میں متفرد ہیں اور ائمہ حفاظ کی تضعیف (بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) تضعیف شدہ و پر مطلع ہونے کی بنا پر پس جرح ہی اثبات ہے۔ (ص ۳۲۶) محض جی ہلانے کا ایک بہانہ ہے، اس شعبہ بازی سے اثبات کو نفی اور نفی کو اثبات بنا دینا کون تسلیم کرتا ہے؟ تصحیح صرف ظاہر سند کے لحاظ نہیں بلکہ ثبوت اصول کے اعتبار سے ہے اور جرح کا مفہوم یہاں یہ ہے کہ روایت صحیح نہیں اور نفی کیا ہوتی ہے؟

لہ برمان العجائب مولانا محمد بشیر سہسوانیؒ (المتوفی ۱۳۲۶ھ) غیر مقلد کی تالیف ہے۔

لہ امام مسلم کی ایک عبارت ملاحظہ کیجیے جس سے امام بیہقیؒ نے اصل مضمون کا حلیہ بگاڑ دیا ہے:

وفي حديث جرير عن سليمان التيمي عن قتادة من الزيادة واذا قرأ فانصتوا وليس في حديث أحد منهم فان الله عز وجل جرير، سليمان تیمیؒ کے طریق سے قتادہؒ سے روایت کرتے ہیں اور اس میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادتی بھی موجود ہے اور کسی کی روایت میں یہ مضمون نہیں ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)



امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی تصحیح پر مقدم ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) قال علی لسان نبیہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان پر سَمِعَ اللہ لَمَنْ صَلَّی اللہ علیہ وسلم سَمِعَ اللہ لَمَنْ حَدَّثَہُ روایت میں ہے جس کو وہ ابو حواریہ سے روایت کرتے ہیں۔ (مسلم جلد ۱ ص ۱۷۳)

اس عبارت کو آپ اچھی طرح دیکھ لیں اور پھر امام بیہقی رحمہ اللہ کے اس ادعا کی داد دیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا لیس فی حدیث احد منهم (کتاب القراءة ص ۸۷) واذا قرأ فانصتوا کی زیادت ان میں سے کسی کی روایت میں نہیں ہے۔ امام مسلم کے قول و لیس فی حدیث احد منهم کا تعلق قبل واذا قرأ فانصتوا سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ما بعد فان اللہ قال علی لسان نبیہ کے ساتھ ہے۔ اور یہ مضمون صرف ابو کامل کی روایت میں ہے اور کسی نے اس کو نقل نہیں کیا۔ مگر امام بیہقی رحمہ اللہ و لیس فی حدیث احد منهم کا تعلق ما قبل واذا قرأ فانصتوا کے ساتھ جوڑ کر خود غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں اور دوسروں کو مغالطہ دے رہے ہیں فساد فی اللہ تعالیٰ بصوم فضله والعصمة بید اللہ تعالیٰ۔ امام بیہقی رحمہ اللہ ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں کہ بعض علماء نے آیت کی تفسیر میں زید بن اسلم کا قول نقل کیا ہے لیکن اس نے پوری عبارت نقل نہیں کی اور اس کا یہی وتیرہ ہے کہ عبارت میں سے وہ صرف اس حصہ کو نقل کر دیتا ہے جو اس کے مفید مطلب ہو سکتا ہے اور باقی عبارت چھوڑ دیتا ہے تاکہ دیکھنے والا غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ یہ ناقل کی دلیل ہے اور وہ اپنے دل میں یہ نہیں سوچتا کہ علیہم بذات الصدور اس کے اس فعل سے واقف ہے اور کیا اوقات اس کی کتاب کو پڑھنے والا اس کی تلبیس پر مطلع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کے ساتھ ایسی مغالطہ آفرینی سے محفوظ رکھے۔ (کتاب القراءة ص ۹۳) مگر امام بیہقی رحمہ اللہ دوسروں کی شکایت کرتے کرتے خود اس کے مرکب ہو گئے ہیں۔ والعصم من عصمہ اللہ تعالیٰ۔

آپ ہی خود اپنے چور و جفہ کو دیکھیں  
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی۔

مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۲۸ میں غلط فہمی کے عنوان سے یہ بے مغز بات کہی ہے کہ امام بیہقی رحمہ اللہ کی غلطی نہیں معترض کی غلطی ہے اور پھر آگے لکھا ہے کہ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ عبارت امام مسلم کی ہو اور کچھ امام بیہقی نے اپنی طرف سے کہ دی ہو۔ (محصلاً) مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہیے کہ ادھر ادھر کی باتیں حقیقت پر پردہ نہیں ڈال (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ولہم ما ولہم یروہا مسندۃ فی صحیحہ (فوقی شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۰۷) خصوصاً جب کہ اس روایت کو امام مسلمؒ نے اپنے صحیح میں باسند پیش بھی نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ روایت مسلم کی مسند روایتوں میں شامل نہیں ہے۔

جواب۔ یہ بات جانے دیجئے کہ اس زیادت کے نقل کرنے میں سلیمان بنی متفرد ہیں یا کوئی اور بھی اس کو بیان کرتا ہے؟ اور یہ بات بھی جانے دیجئے کہ حفاظ حدیث اس کی تصحیح پر متفق ہیں یا تضعیف پر؟ دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ حدیث جو حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور جس میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت ہے۔ امام مسلم کی مسند روایتوں میں ہے یا غیر مسند میں؟ امام نوویؒ کا یہ خیال کہ یہ مسند نہیں باطل اور مردود ہے۔ حافظ ابن حجرؒ اور قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ وہو حدیث صحیح الخیر مسلم من حدیث ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (فتح الباری جلد ۲ ص ۱۹۲ و نیل الاوطان جلد ۲ ص ۱۰۷) حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت صحیح ہے اور امام مسلمؒ نے اس کی تخریج کی ہے۔ فریق ثانی اصول حدیث کی کتابوں کی طرف مراجعت کر کے دیکھ لے کہ محدثین کی اصطلاح میں تخریج کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اور کوئی محدث جب کسی سند کے ساتھ روایت بیان کرتا ہے اور اسی سند کے روایت میں سے کسی کی زیادت کو بیان کرتا ہے تو اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ مسند ہوتی ہے یا غیر مسند؟

علاوہ بریں اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ روایت امام مسلمؒ نے باسند پیش نہیں کی تو کیا ابو حواریؓ اور ابو داؤد وغیرہ نے بھی اس کو مسند روایت نہیں کیا؟ اور کیا کسی حدیث کی تصحیح اس میں منحصراً ہے کہ امام مسلمؒ اسے باسند نقل کریں تو صحیح ہوگی ورنہ ضعیف ہوگی؟ الغرض حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت امام مسلمؒ کی مسند روایتوں میں شامل ہے۔ اور امام نوویؒ کا یہ کھلا قصور ہے کہ اس کو غیر مسند قرار دیتے ہیں۔ یہی وہ عبارت ہے جس سے مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم (بقیۃ حاشیہ پچھلا صفحہ) سکتیں۔ بفضلہ تعالیٰ عربی دان کثرت سے موجود ہیں کسی ثالث عربیؓ سے دریافت کر لیں کہ غلطی امام بیہقیؒ کی ہے یا بقول مؤلف مذکور معترض کی خواہ مخواہ کا تعصب اور حرات نہ بن سکتی ہو اس کو بھی بنا ڈالنا علماء کی شان کے خلاف ہے۔



امر تسری کو غلط فہمی ہوتی۔ اور علی رؤس الاشہاد ان کو شکست فاش ہوئی تھی۔ اس زیادت کے صحیح ہونے میں ذرا برابر شک و شبہ نہیں۔ البتہ۔ ع

نرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

### چھٹا اعتراض:

حافظ ابن حجر، امیر بیانی رحمہ اور مبارکپوری صاحب وغیرہ لکھتے ہیں۔ کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت صحیح ہے مگر اس سے مراد ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت ہے۔ یعنی جب امام اور تم (مقتدی) سورۃ فاتحہ کی قرأت سے فارغ ہو جاؤ تو امام قرأت کرے اور تم خاموش رہو کیونکہ واذا قرأ فانصتوا عام ہے اور حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سورۃ فاتحہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۶، فتح الباری جلد ۲ ص ۱۹۲، سبل السلام جلد ۱ ص ۲۳۵)

جواب: ان حضرات کی یہ توجیہ اور تاویل قطعاً باطل ہے۔ اس لیے کہ مسلم اور ابو عوانہ وغیرہ کے حوالہ سے صحیح روایت ان الفاظ کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی جا چکی ہے۔

واذا قرأ فانصتوا واذا قال غیبا المغضوب علیہم کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو ولا الضالین۔ فقولوا۔ آمین اور جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔

یہ عقدہ تو فریق ثانی ہی حل کرے گا کہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین سے قبل وہ کون سی قرأت ہے جس میں امام کا فریضہ قرآۃ کرنا اور مقتدیوں کا وظیفہ خاموش رہنا بتلایا گیا ہے؟ شاید ان کے نزدیک اس اثنام میں سورۃ یسین کی قرأت سنت ہو جس کی امام قرأت کرتا رہے اور اس وقت مقتدی خاموش رہیں؟ اس صحیح حدیث کو پیش نظر رکھ کر بخوبی یہ لے مولف خیر الکلام لفظ قرأت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اثر اگرچہ مطلق ہے مگر قرأت بالاجماع چونکہ فاتحہ سے شروع ہوتی ہے اس واسطے اس اثر سے فاتحہ خلف الامام کا پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔ (صفحہ ۵۲۱) اس اعتبار سے مقتدی کو سورۃ فاتحہ کی قرآۃ کے وقت اولاً وبالذات خاموش رہنا ضروری ہے کیونکہ بالاجماع قرأت یہاں ہی سے شروع ہوتی ہے۔

اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ تاویل قطعی طور پر باطل اور مردود ہے کیونکہ واذا قرأ فأنصتوا کے حکم میں مقتدیوں کے لیے سورۃ فاتحہ کی قرأت کی ممانعت <sup>۱</sup> اولاً اور بالذات ہے اور قرآن کریم کی بقیہ سورتوں کی ممانعت <sup>۲</sup> ثانیاً اور بالتبع ہے۔ فریق ثانی کے سطحی قسم کے لوگ عموماً یہ مطالبہ کیا کرتے ہیں کہ ہمیں ایسی صحیح روایت بتلاؤ جس میں سورۃ فاتحہ کی قرأت کی مقتدیوں کے لیے ممانعت آئی ہو۔ سوطیہ کرام کو مسلم اور ابو حوانہ کی یہ صحیح حدیث پیش نظر رکھنی چاہیے اور حدیث نمبر وغیرہ ملاحظہ کریں اور اگر بالفرض اس حدیث میں واذا قرأ فأنصتوا کی زیادت نہ بھی نہ کوہ ہو تب بھی یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ قرأت کرنا امام کا کام ہے نہ کہ مقتدیوں کا اس زیادت کے بغیر روایت کا مضمون یہ ہو گا جب تم نماز پڑھنا چاہو تو اپنی صفیں درست کر لو۔ اور ایک تم میں سے امام بنے جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام غیر الم غضوب علیہم ولا الضالین پڑھے تو تم آمین کہو۔ اگر مقتدیوں پر بھی سورۃ فاتحہ کی قرأت لازم ہوتی تو اذا قال غیر الم غضوب علیہم ولا الضالین کے بجائے اذا قلت غیر الم غضوب ولا الضالین۔ ہوتا جیسا کہ فقہولوا آمین میں قولوا جمع کا صیغہ ہے حالانکہ غیر الم غضوب علیہم ولا الضالین پڑھنے کی نسبت صرف امام کی طرف ہوتی ہے اور یہ اس امر کی بین دلیل ہے کہ سورۃ فاتحہ پڑھنا صرف امام کا کام ہے۔ مقتدیوں کا کام صرف خاموش رہنا اور انصاف کرنا ہے۔ ہاں البتہ آمین کہنے میں مقتدی برابر کے شریک ہیں اور صحیح مسلم جلد ۱ ص ۷۷ کی ایک روایت میں اس طرح آتا ہے کہ اذا قال القاری غیر الم غضوب علیہم ولا الضالین فقال من خلفه آمین الحدیث کہ جب پڑھنے والا غیر الم غضوب علیہم ولا الضالین کہے تو جو اس کے پیچھے ہیں وہ آمین کہیں اس روایت میں شائع نے امام کو قاری اور پڑھنے والا کہا ہے اگر سب کے لیے قرآن لازم ہوتی تو صرف امام ہی قاری نہ ہوتا۔ (الدلیل المبین ص ۲۸۹) رہا حضرت عبادہ کی روایت کا حوالہ دینا تو اپنے مقام پر آئے گا کہ قرأت سورۃ فاتحہ برائے مقتدی کی کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ لہذا اس صحیح روایت سے اس کا تعارض قائم کرنا اور پھر اس کی تاویل اور توجیہ کرنا انصاف سے بعید تر ہے۔



یہ کاوشیں سبب ہیں کیسی، کہ رتوں کی کچھ انتہا بھی  
زبان کہتے ہیں ہم بھی آخر کبھی تو پوچھو، سوال کیا ہے؟

مؤلف خیر الکلام نے (ص ۴۲۲ و ص ۴۲۳ میں) یہ کہ کر جان چھڑانے کی ناکام کوشش  
کی ہے کہ معترض نے یہ سمجھا ہے کہ دونوں جملوں میں ترتیب ہے حالانکہ واو ترتیب کے  
لیے نہیں ہوتی جیسے مرزائی لفظ متوفیک و دافعک میں ترتیب ثابت کرنے میں غلطی کرتے  
ہیں اسی طرح معترض نے بھی غلطی کی ہے اور دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ میں فانصتوا کا جملہ  
ولا الضالکین کے بعد ہے مگر سند میں محمد بن یونس ہے جو ضعیف ہے۔ حدیث اگرچہ  
ضعیف ہے مگر اس سے انصاف کے محل کی تعیین ہوتی ہے (مصلحہ) اور قاضی مقبول احمد  
صاحب نے الاعتصام ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۸ میں بزعم خویش قرآن و حدیث کی چند  
مثالیں دے کر آخر میں یہ کہا ہے کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ واو ہمیشہ ترتیب کے لیے نہیں  
ہوتی اور اس زیر بحث حدیث میں بھی ترتیب نہیں ہے تو مولانا موصوف کا طلبہ کو  
نصیحت کرنا محض طفل تسلی ہے اور اس فقرہ سے ما زاد علی الفاتحہ مراد لینے میں کوئی  
رکاوٹ نہیں۔ اھ

الجواب: یہ جو کچھ کہا گیا ہے بالکل بے جان ہے:

اولاً۔ اس لیے کہ اگرچہ جہود سخا و غیرہ اس کے قائل ہیں کہ حرف واو ترتیب کا فائدہ  
نہیں دیتا لیکن بعض اکابر ائمہ یہ فرماتے ہیں کہ اس میں ترتیب ہوتی ہے چنانچہ علم نحو کی مشہور  
کتاب مغنی اللیب میں ہے کہ

وقول بعضهم ان معانها الجمع المطلق  
غير سديد لتقييد الجمع بقيد الاطلاق  
وانما هي للجمع لا بقيد وقول السيرافي  
ان النحويين واللغويين اجمعوا على انها  
لا تفيد الترتيب مردود بل قال بافادتها  
اياها قطرب والربيعي والفراء وطلب

اور بعض کا یہ کہنا کہ حرف واو کا معنی جمع مطلق ہے  
درست نہیں ہے کیونکہ جمع کے ساتھ اطلاق کی  
قید لگ گئی ہے حالانکہ یہ بغیر قید کے جمع کے لیے  
ہے اور سیرافی کا یہ کہنا کہ جملہ نحوی اور لغوی  
اس امر پر متفق ہیں کہ واو ترتیب کا فائدہ نہیں  
دیتی بالکل مردود ہے کیونکہ قطرب، ربیع، فراء

وابوعمر والزاهد وهشام والشافعي  
ونقل الامام في البرهان عن بعض  
الحنفية انها للمحبة ... اه (جلد ۲ ص ۳۱)  
اور علامہ رضی لکھتے ہیں کہ

ونقل بعضهم عن الفراء والكسائي  
وثعلب والربيعي وابن درستويه وبه  
قال بعض الفقهاء انها للترتيب ... اه  
(رضی جلد ۲ ص ۳۰۹)  
بعض نے فرما، کسائی، ثعلب، ربیع اور درستیہ  
سے نقل کیا ہے اور اسی کے بعض فقہاء قائل ہیں  
کہ حرف واو ترتیب کے لیے ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ بہت سے فقہاء شافعیہ اور بعض نحویوں کا یہی مذہب ہے کہ حرف  
واو ترتیب کو چاہتا ہے (محصلا شرح مسلم جلد ۱ ص ۳۲) اس سے معلوم ہوا کہ حرف واو کو ترتیب  
کے لیے مانتے والے بڑے بڑے ائمہ ہیں جن میں امام شافعی وغیرہ بھی ہیں۔ لہذا معترض کو  
استدلال میں مرزائیوں سے تشبیہ دے کر اپنے دل ماؤف کی بھڑاس نکالنا اور حواریوں کو  
خوش کرنے کی بے جاسعی کرنا علمی دنیا میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔

وثانیاً۔ جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ حرف واو ترتیب کے لیے نہیں اس کا مطلب  
یہ ہے کہ ترتیب ضروری اور واجب نہیں یہ کب کہا ہے کہ ترتیب ناجائز اور حرام ہے؟ کسی  
مسنی عالم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ روایت پیش کی تھی کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ  
وسلم بقیہ حیات تھے اور ہم یوں کہا کرتے تھے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم (ترمذی جلد ۲ ص ۲۱۲ و  
قال حسن صحیح) یعنی اس ترتیب سے ہم ان کا تذکرہ کیا کرتے تھے تو اس پر ایک رافضی  
بدحواس ہو کر بولا کہ حرف واو ترتیب کے لیے نہیں ہوتا۔ مسنی عالم بولا کہ ترتیب ناجائز  
اور حرام بھی تو نہیں ہے۔

وثالثاً۔ حدیث زیر بحث کے تین جملے ہیں: فاذا اكبر فكبيرا واذا قرأ فانصتوا  
واذا قال غير المنضوب عليهم ولا الضالين فقولوا امين تو مولف خیر الکلام وغیرہ  
لے اور ابن رشد نے سخا کو فہ کا یہی مسلک نقل کیا ہے کہ واو میں ترتیب ہوتی ہے۔ (بدایۃ المجتہد  
ج ۱ ص ۱۶)



کے ذہن کے مطابق واذا قرأ فافصتوا اور واذا قال غیر المخصوص علیہم..... الخ جو حرف  
 واو کے ساتھ مذکور ہیں فاذا کبر فکبروا سے پہلے بھی ہو سکتے ہیں تو مطلب یہ ہو گا کہ امام  
 کے تکبیر کرنے سے پہلے ہی تم خاموش رہا کرو اور غیر المخصوص..... الخ پڑھا کرو اس لحاظ سے  
 ماقبل التکبیر میں بھی انصات کی صورت نکل آئی جو فریق ثانی کو بڑی مفید رہے گی اور امام  
 بھی تکبیر سے پہلے ہی غیر المخصوص علیہم..... الخ پڑھ لیا کرے گا اور مقتدی بھی آمین کہ لیا  
 کریں گے کیونکہ حرف واو ترتیب کو نہیں چاہتا اس طرح انشاء اللہ تعالیٰ سب مسئلے حل  
 ہو جاتے ہیں۔

ورابعداً۔ واقطنی کی روایت کے متعلق خود مؤلف غیر الکلام ضعیف ہونے کا اقرار کیا ہے  
 پھر اس سے تعین محل کا سہارا بالکل بیکار ہے انتہائی تعجب ہے کہ صحیح ابو عروانہ اور صحیح مسلم  
 کے ثقہ راویوں کی متابعت تو مؤلف کے نزدیک کالعدم ہے مگر محمد بن یونس (جس کے بارے  
 میں مولانا شمس الرحمن صاحب غیر مقلد لکھتے ہیں کہ ہوضعیف لا یحتج بہ) تعلیق المغنی  
 جلد ۱ ص ۱۲۵ کی روایت سے تعین محل انصات ضرور ہو سکتا ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ!  
 آپ نے ملاحظہ کیا کہ فریق ثانی کس طرح بے جان اور بے وزن دلیلوں کا سہارا لیتا ہے۔  
 دوسری حدیث :

امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے جابر بن عبد اللہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ  
 ہم سے ابو خالدؒ نے بیان کیا۔ وہ محمد بن عجلانؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ زید بن اسلمؒ  
 نے امام نسائیؒ (المتوفی ۳۰۳ھ) جن کی کتاب سنن نسائی صحاح ستہ میں تیسرے درجہ پر مانی جاتی ہے۔

علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ الامام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں (مذکرہ جلد ۲ ص ۲۴۱)  
 علامہ نسائیؒ رح ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقہات میں لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مستقیم الحدیث  
 ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۵۳) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تقریب ص ۶۴)  
 علامہ امام وکیعؒ ابن معینؒ اور ابن مدینیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ لا یاس بہ اور ابو ہشام رفاعیؒ  
 ثقہ اور امین کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں  
 عجلیؒ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے۔ (بغدادی جلد ۹ ص ۲۲ و تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۸) علامہ  
 (باقی اگلے صفحہ پر)

سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابو صالحؓ سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انما جعل  
الامم ليؤتم به فاذا اكبر فكبروا واذا قل  
فانصتوا واذا قال سمع الله لمن حمده  
فقولوا اللهم ربنا ولك الحمد -  
کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد  
فرمایا ہے کہ امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی  
اقتدار کی جائے سو جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور  
جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب وہ  
سمع اللہ لمن حمد کہے تو تم اللہم ربنا لک الحمد کہو۔  
(نسائی ج ۱ ص ۱۰۶)

(باقی پچھلے صفحے کے حاشیے) ذہبیؒ ان کو الحافظ الصدوق اور مشہور محدث لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۵)  
لکہ امام ترمذیؒ ان کو ثقہ اور مامون فی الحدیث کہتے ہیں۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۱ و کتاب العلل جلد ۲ ص ۲۳)  
امام بیہقیؒ ان کو ثقات میں شمار کرتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۴) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ وہ امام فقیہ  
اور عابد تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۸۷) ابن حاد حنبلیؒ کا بیان ہے کہ وہ عابد پابند شریعت  
اور صداقت شعار تھے۔ (شذرات التہذیب جلد ۱ ص ۲۲۲) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور القدوہ لکھتے  
ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۵) امام احمد سفیان بن عیینہ بن معینؒ، بخاریؒ، ابو حاتمؒ، نسائیؒ اور ابو زرؒ عہ ان کو ثقہ  
کہتے ہیں۔ یعقوب بن شیبہؒ ان کو صدوق وسط کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔  
ساجیؒ ان کو اہل صدق میں شمار کرتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو عابد ناسک اور فقیہ بتاتے ہیں۔  
(تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۴) مولانا شمس الحقؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ (تحلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۲)  
عون المعبود جلد ۱ ص ۲۳) اور خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تاریخ جلد ۲ ص ۳)  
یہ زید بن اسلمؒ کو علامہ ذہبیؒ الامام اور الفقیہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۲۲) امام احمد ابو زرؒ عہ، ابو حاتم  
محمد بن سعدؒ، نسائیؒ، ابن خراشؒ اور یعقوب بن شیبہؒ سب ان کو ثقہ لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب  
جلد ۱ ص ۳۹۲)

ابو صالحؒ کا نام ذکون تھا۔ امام احمدؒ ان کو ثقہ اجل الناس اور اوثق الناس کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۸۳)  
امام ابن معینؒ، ابو حاتمؒ، ابو زرؒ عہ، ابن سعدؒ، ساجیؒ اور بخاریؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ محدث حبرئیؒ  
اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۱۹) حضرت ابو ہریرہؓ جلیل القدر  
(باقی اگلے صفحہ پر)



اس صحیح روایت سے بھی معلوم ہوا کہ تمام نمازوں میں امام کا وظیفہ قرآن کرنا اور مقتدیوں کا فریضہ خاموش رہنا ہے۔ اس حدیث پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں وہ ملاحظہ کیجئے اور ساتھ ہی ان کے جوابات بھی دیکھ لیجئے۔

### پہلا اعتراض:

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ امام بیہقی رحمہ اللہ اور مبارکپوری صاحب وغیرہ فرماتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت نقل کرنے میں ابو خالد الاحمر جرح متفر دیں لہذا یہ زیادت قابل قبول نہیں۔ (جزء القراءة ص ۵۹، کتاب القراءة ص ۹، ابکار المنن ص ۱۵۲ اور مؤلف خیر الکلام نے صفحہ ۴۳۲ اور ۴۳۳ میں اس روایت کو شاذ کہہ کر گلو خلاصی چاہی ہے اور قاضی مقبول احمد صاحب نے بھی اس کو شاذ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دی ہے۔ (ملاحظہ ہو الاعتصام ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۱۸۱) جواب۔ اس زیادت کے رد کرنے کا یہ بہانہ محض بے کار ہے۔

(پچھلے صفحے کا باقی) صحابی ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب نے اس سند کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ رجال اسنادہ ثقات۔ (دلیل الطالب ص ۲۹۴)

یہ روایت ابن ماجہ ص ۶۱، ابوداؤد جلد ۱ ص ۸۹، مسند احمد ص ۴۱۵، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۴، سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۶، محلی جلد ۳ ص ۳۴۰، جزء القراءة ص ۵۶، کتاب القراءة ص ۹۱، ابن جریر جلد ۹ ص ۱۱۰، ابن کثیر جلد ۲ ص ۶۲۳، الجوزی التقی جلد ۲ ص ۱۵۶، تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۲، عون المعبود جلد ۵ ص ۲۳۵، درایہ ص ۹۴، زیلعی جلد ۲ ص ۱۶، مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴، آثار السنن جلد ۲ ص ۵۷، ابکار المنن ص ۱۵۳، اعلار السنن جلد ۴ ص ۵۵، دلیل الطالب ص ۲۸۴، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۳، بذل المجہود جلد ۲ ص ۵۵ اور فتح الملہم ص ۲۲ وغیرہ میں مروی ہے۔

۱۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ در حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ واذا قرأ فانصتوا پس خط مؤتم انصات و اشاع قرآن امام است و انصات خاص بچہ یہ نیست بلکہ شامل ساریہ ہم است پس واجب سکوت باشد مطلقاً نہ دقرأت الخ (ہدایۃ السائل ص ۱۹۳)

۲۔ امام بخاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ لہریتا بع علیہ مبارک پوری صاحب ایک سند کی تحقیق میں لکھتے (باقی اگلے صفحہ پر)

اولاً۔ اس لیے کہ جب ابو خالد النخعی اختلاف ثقہ اور ثبت میں تو پھر ان کی زیادتیوں قابل قبول نہ ہوگی؟

ثانیاً۔ اس زیادت کے بلیان کرنے میں ابو خالد النخعی متفق نہیں بلکہ محمد بن سعد انصاری اشہلی بھی اس زیادت کو نقل کرتے ہیں۔ اور اس روایت کے باقی وہی راوی ہیں جن کی توثیق عرض کر دی گئی ہے۔ البتہ محمد بن عبد اللہ بن مبارک کا ذکر نہیں ہوا۔ اور یہیں وہ بھی ثقہ، نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں کہ ابو خالد از ثقات اثبات است، بخاری و مسلم بے احتجاج کردہ اند۔ دریں صورت تفردش مضر نیست، و نیز وہی نہ تھا بایں زیادت متفرد است، بلکہ ابو سعید محمد بن سعد انصاری نیز تابع او بریں زیادت بوده است۔ (دلیل الطالب ص ۲۹۴)

غرضیکہ یہ زیادت بھی سابق کی طرح بالکل صحیح ہے اور اس کے غیر صحیح ہونے کا ادنا احتمال بھی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسرا اعتراض؛

مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ محمد بن عجلان میں کچھ کلام اور مقال ہے۔ نیز وہ مدلسی (پچھلے صفحہ کا بقید) ہیں کہ امام بخاری کا محمد بن عبد اللہ بن الحسن سے متعلق روایت بع علیہ کناہرگز مضر نہیں کیونکہ محمد مذکور ثقہ تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۳۱) کیا ہم بھی مبارک پوری صاحب اس انصاف کی امید رکھ سکتے ہیں۔

یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۱۰۷، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۲، عون المعبود جلد ۱ ص ۲۲۵، نصب الرایہ جلد ۲ ص ۱۴ اور تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۲ وغیرہ میں مذکور ہے۔

امام نسائی ان کو ثقہ کہتے ہیں (جلد ۱ ص ۱۰۷) دارقطنی ان کو ثقہ کہتے ہیں (جلد ۱ ص ۱۲۵) زیلعی کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (جلد ۲ ص ۱۴) ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۸۵) مولانا شمس الحق ان کو ثقہ کہتے ہیں (عون المعبود جلد ۱ ص ۲۳۵ و تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۲)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور حافظ تھے (تقریب ص ۳۲۷) الحاصل اس روایت کے بھی جلد راوی ثقہ ہیں۔ اور اصول حدیث کی رو سے یہ روایت اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔



اس لیے یہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی۔ (ابکار المنص ۱۵۲)

جواب۔ مبارک پوری صاحب ان میں مقال کا شاید مطلب ہی نہیں سمجھے۔ یہی ان کی تدلیس تو وہ بھی مفروغ عنہ ہے۔

اولاً۔ بقول بعض یہ مکحول کے درجہ کے ملس تھے۔ مگر فریق ثانی مکحول کی تدلیس سے صرف نظر کر جاتا ہے۔ ا۔

ثانیاً۔ اگر ان کی تدلیس مضر ہوتی تو امام بخاریؒ اور ابو داؤد وغیرہ ضرور اس کا تذکرہ کرتے مگر وہ صرف ابو خالد الناحر کے تفرد کی شکایت کرتے ہیں۔

ثالثاً۔ دیگر محدثین کو عموماً اور علامہ ذہبیؒ کو خصوصاً یہ قاعدہ معلوم ہے لیکن وہ محمد بن عجلان کی متعدد معنعن حدیثوں اور روایتوں کو صحیح کہتے ہوئے تصحیح کرتے ہیں۔ (مثلاً تلخیص مستدرک جلد ۱ ص ۱۰ وغیرہ)

رابعاً۔ محدثین اور محققین کے صنیع سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن عجلان، قتادہ، سفیان ثوری اور حسن بصری وغیرہ کی طرح ان ملسین میں شامل ہیں جن کی تدلیس کسی صورت میں مضر نہیں۔ خامساً۔ محمد بن عجلان کے دو متابع بھی موجود ہیں۔ خارجہ بن مصعب اور یحییٰ بن عمار (دیکھئے سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۷) اور گویہ کمزور اور ضعیف ہیں لیکن متابعت میں پیش کرنے پر مبارک پوری صاحب کو بھی کوئی اعتراض نہیں بلکہ وہ اس کا اقرار کرتے ہیں۔

لے بعض لوگوں نے ان میں یہ کلام کیا ہے کہ امام بخاریؒ و مسلمؒ نے ان سے احتجاج نہیں کیا۔ لیکن یہ اعتراض باطل ہے۔ اولاً۔ اس لیے کہ ثقہ اور ثبت راوی کے لیے یہ شرط نہیں کہ ان سے امام بخاریؒ و مسلمؒ نے ضرور احتجاج کیا ہو۔ ثانیاً۔ امام مسلمؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے (مستدرک جلد ۱ ص ۱۰، بدل المجہود جلد ۲ ص ۵۵) اور مسلم جلد ۲ ص ۳۱ وغیرہ ملاحظہ کر لیجئے) محمد بن عجلان بطریق سعید مقبریؒ عن ابی ہریرہؓ کی بعض روایتوں پر کچھ کلام کیا گیا ہے (کتاب العلل ترمذی جلد ۲ ص ۲۳ و تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۳۴۱) لیکن وہ بھی صرف چند روایتیں ہیں اور علامہ ذہبیؒ نے ان کا جواب بھی دے دیا ہے (میزان جلد ۲ ص ۱۰۲) مگر ہم نے جو سند پیش کی پیش کی ہے وہ سعید مقبریؒ کے طریق سے نہیں بلکہ زبید بن اسلم کے طریق سے ہے۔

۵ دیکھئے ابکار المنص ص ۱۲۹ اور دیگر محدثین بھی اس قاعدہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

سادہ سا۔ جرح کرنے والے جرح پر بھی متفق نہیں ہیں۔ بعض ابو خالد کا تفریق بتاتے ہیں اور بعض محمد بن عجلان کی تدلیس اس سے بھی جرح کمزور ہو جاتی ہے۔ (اعلام السنن جلد ۴ ص ۵۶) سابعاً۔ اگر محمد بن عجلان میں واقعی کوئی کلام ہوتا۔ یا ان کی تدلیس مضر ہوتی تو حضرات محدثین کرام کی ایک بہت بڑی جماعت اس حدیث کی ہرگز تصحیح نہ کرتی، حالانکہ اس حدیث کی ذیل کے ائمہ حدیث تصحیح کرتے ہیں:

- ۱۔ امام احمد بن حنبل (المجموع النقی جلد ۱ ص ۱۵۸) ۲۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ (جلد ۱ ص ۱۶۴)
- ۳۔ علامہ ابن حزم (محل جلد ۳ ص ۳۲۳) ۴۔ امام نسائی (جلد ۱ ص ۱۰۸)
- ۵۔ دارقطنی (جلد ۱ ص ۱۲۴) ۶۔ ابن جریر (تفسیر جلد ۱ ص ۱۱)
- ۷۔ حافظ ابو عمر بن عبد البر (جوہر النقی جلد ۲ ص ۱۰۸) ۸۔ حافظ ابن کثیر (تفسیر جلد ۳ ص ۶۲۳)
- ۹۔ علامہ مار دینی (جوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۴) ۱۰۔ امام منذری (ذیلی جلد ۲ ص ۱۶۱ و تطبیق المغنی)
- ۱۱۔ علامہ جمال الدین (نصب الراية جلد ۲ ص ۱۶۱) جلد ۱ ص ۱۲۴
- ۱۲۔ مولانا شمس الحق عظیم آبادی (عون المعبود ۱۳۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب جلد ۲ ص ۲۳۵، تطبیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۴) (دلیل الطالب ص ۲۹۴)

بلکہ نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

وهذا الحديث مما ثبت عند اهل السنن وصححه جماعة من الزمّة۔  
یہ حدیث ارباب سنن کے نزدیک ثابت اور محقق ہو چکی ہے اور ائمہ حدیث کی ایک بہت بڑی جماعت نے اس کی تصحیح کی ہے۔ (دلیل الطالب ص ۲۹۴)

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا حوالہ باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ بڑی شد و مد سے واذا قرأ فانصتوا کی روایت اور اس میں زیادت کو صحیح ثابت کرتے ہیں، علامہ ابن حزم رحمہ (بقیہ پچھلا صفحہ) ملاحظہ ہو میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۳ و مقدمہ نووی ص ۱۶ و کتاب القراءة ص ۱۲۹ و تدریب الراوی ص ۲۸، اور اعلام السنن ص ۲۳، اور لکھا ہے و هذا مجمع بین المسحذین مگر یہ یاد رکھیے کہ اصل راوی صرف مدلس ہو ضعیف اور کمزور نہ ہو۔ ورنہ متابعت بے سود ہوگی۔



لکھتے ہیں کہ بعض کا خیال ہے کہ اس زیادت میں محمد بن عجلان نے خطا کی ہے۔ مگر ہم ثقہ راوی کے بارے میں کسی واضح برہان کے بغیر یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ بہر حال سند کے لحاظ سے یہ زیادت بالکل صحیح ہے (محلّی ابن حزم جلد ۳ ص ۲۴۲) انصاف سے فرمائیے کہ کسی حدیث کی تصحیح کے لیے اس سے بڑھ کر حضرات محدثین کرام کے پاس اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ مگر۔

آنکھیں اگر ہیں بند تو پھر دن بھی رات ہے  
اس میں بھلا قصور ہے کیا آفتاب کا۔

الحاصل حضرات ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت بھی اور اس کی پوری سند بالکل صحیح اور بے غبار ہے اور محض تعصب کی وجہ سے اس کو شاذ کہہ کر رد کرنا بے سود ہے۔

تیسری حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے جعفر خلدیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے الحسن بن علی بن شعیب المعمریؒ نے امام بیہقیؒ کا ترجمہ باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے۔

۱۱ حافظ ابو عبد اللہ الحاکم صاحب مستدرک کا ترجمہ بھی باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے۔  
۱۲ جعفر بن محمد بن نصیر الخلدیؒ، علامہ خطیبؒ ان کو ثقہ، صادق، دیندار اور فاضل لکھتے ہیں (تاریخ خطیب جلد ۲ ص ۲۲۷)

۱۳ علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ، العلامة اور البارع لکھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ حفظ اور فہم سے بہرہ ور تھے۔ امام دارقطنیؒ ان کو صدوق اور حافظ کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۱۵) ابن عدیؒ ان کو کثیر الحدیث اور امام ربانی کہتے ہیں۔ (ایضاً) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ تمام محدثین ان کے عادل ضابطہ اور صاحب فضیلت ہونے پر متفق ہو چکے ہیں۔ موسیٰ بن ہارون کا بیان ہے کہ وہ اوثق الناس اور اثبت الناس تھے اور ان کی یہ خوبی تھی کہ تدلیس نہیں کرتے تھے۔ محدث عبدان ابو ہریرہؒ کا بیان ہے کہ میں نے معمریؒ جیسا محدث تمام روئے زمین پر نہیں دیکھا۔ (لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۲۱ تا ۲۲۵) اور علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ علم کا طرف تھے فہم و حفظ سے متصف تھے۔ ان کی احادیث میں کچھ

نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمد بن محمدؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے طفاویؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ایوبؒ نے بیان کیا۔ وہ زہریؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا قرا الامام فانصتوا۔ (کتاب القراءۃ ص ۹۲) کہ جب امام قراءۃ کرے تو تم خاموش رہو۔

اس روایت میں بھی مقتدی کا وظیفہ (تمام نمازوں میں) خاموشی اور امام کا فریضہ قراءۃ بتلائی گئی ہے اور اگر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جاتے تو اس روایت پر بھی کوئی معقول اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ گو امام بیہقی نے یہ فرمایا ہے کہ واذا قرا فانصتوا کی زیادت بیان کرنے میں المعمری متفرد ہیں۔ لیکن جب معمری ثقہ ثبت اور الحافظ اور الامام ہیں تو ان کی یہ صحیح روایت اور زیادت بیان کس طرح رد کی جاسکتی ہے؟ معمری کے طریق سے ایک روایت کی امام حاکمؒ اور علامہ ذہبیؒ دونوں علی شرط الشیخین تصحیح کرتے ہیں (مستدرک جلد ۱ ص ۱۵۸) مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۳۵ اور ۴۳۶ میں یہ لکھا ہے کہ معمری

(بقیہ پچھلا صفحہ) غرائب اور افراد بھی تھے۔ وارقطنی فرماتے ہیں کہ وہ صدوق اور حافظ تھے، ان پر

جرم موسیٰ بن ہارونؒ نے ازروئے عداوت کی ہے۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۳۷۰)

۱۔ امام ابو حاتمؒ ان کو صالح الحدیث اور صداقت شعار کہتے ہیں۔ محدث صالح جزیرہ، مسلم بن قاسم ابن عبد البرؒ اور دیگر محدثین ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن خزمہؒ ان کو دانا محدث کہتے ہیں۔ نسائی لا بأس بہ اور ابن عدی صدوق کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۸۱) علامہ ذہبیؒ ان کو

المسندين کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۴۲)

۲۔ علامہ ذہبیؒ ان کو مشہور محدث اور ثقہ کہتے ہیں۔ (میزان جلد ۳ ص ۸۹) امام ابن معینؒ ان کو لیس بہ بأس اور ابن مدینیؒ ثقہ کہتے ہیں اور ابو داؤدؒ اور ابو حاتمؒ لیس بہ بأس سے ان کی توثیق کرتے ہیں ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں وارقطنیؒ کا بیان ہے کہ بخاریؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ تمام متقدمین ان کی ثقاہت پر متفق ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۳۰۹)

۳۔ امام احمد بن حنبلؒ، ابو زرؒ، نسائیؒ، ابن سعدؒ، وارقطنیؒ اور ابو داؤدؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ (باقی اگلے صفحہ پر)



صاحب غرائب و افراد ہیں اور بعض محدثین نے ان کو کذاب کہا ہے۔ عبدان کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ جسد سے کہا ہے اور بغدادیوں کی طرح یہ بھی موقوف کو مرفوع کر دیا کرتا تھا اور حدیث میں اضافے کرنے کی ان کی عادت تھی۔ (محصلہ خیر الکلام بحوالہ لسان المیزان)

الجواب: بخاری اور مسلم میں ایسے متعدد راوی موجود ہیں۔ مؤلف خیر الکلام کا شوق ہو تو ہم ماشار اللہ تعالیٰ باحوالہ عرض کر سکتے ہیں اس لیے صاحب غرائب و افراد ہونا اصول حدیث کے لحاظ سے کوئی جرح نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض لوگوں نے محض عداوت اور دشمنی کی وجہ سے ان پر جرح کی ہے اور کبھی یہ کہا کہ یہ موقوف کو مرفوع کر دیتے ہیں اور کبھی یہ کہا کہ یہ اضافے کرتے ہیں اور ان کے بڑے دشمن اور معاند موسیٰ بن ہارون نے ان کی واذا قرأ فانصتوا کی زیادت پر بھی انکار کیا تھا (ملاحظہ ہو لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۲۴) اور ان کی تقلید کرتے ہوئے لوگ اس پر جرح کرتے اور اس زیادت کو انکار کرتے ہیں جب محدثین کے سامنے حقیقت حال کھل گئی تو انھوں نے بالآخر یہ فیصلہ کیا چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ پس آخر میں بات ان کی توثیق پر پکی ہوئی ہے زیادہ فاستقر الحال اخرا علی توثیقہ فان غایۃ ما قیل فیہ انہ حدث باحادیث لم یتابع علیہا وقد علمت من کلام الدارقطنی انہ رجع عنہا فان کان قد اخطأ فیہا کما قال خصمہ فقد رجع عنہا وان کان مصیبا بها کما کان یدعی فذاک ارفعہ لہ واللہ اعلم۔

پس آخر میں بات ان کی توثیق پر پکی ہوئی ہے زیادہ فاستقر الحال اخرا علی توثیقہ فان غایۃ ما قیل فیہ انہ حدث باحادیث لم یتابع علیہا وقد علمت من کلام الدارقطنی انہ رجع عنہا فان کان قد اخطأ فیہا کما قال خصمہ فقد رجع عنہا وان کان مصیبا بها کما کان یدعی فذاک ارفعہ لہ واللہ اعلم۔

(لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۲۵)

سبب ہے۔

(بقیہ کچھ صفحہ) ان کو صالح الحدیث اور ابن عبد البر ثقہ اور حافظ کہتے تھے۔ ابن حبّان ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۴۱۲)

۱۔ ان کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشہور صحابی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ معمرؓ ثقہ ہیں اور ثبت بھی۔ اور ان کی یہ زیادت جو واذا قرأ فاستمعوا سے وارد ہوتی ہے بالکل صحیح ہے کیونکہ دوسری اسانید میں ثقہ راویوں سے بھی یہ مروی ہے اور قرأت خلف الامام انصاف کے بالکل خلاف ہے اور حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انسؓ کی روایتیں باب سوم میں آئیں گی کہ وہ بھی امام کے پیچھے سب یا بعض نمازوں میں قرأت کے قائل نہ تھے اور شاذ مقبول کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مستقل حدیث ہو جس کو ثقہ راوی بیان اور روایت کرتا ہو انصاف کی دنیا میں اس کے رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں اور کسی حفظ کی قرآن کریم میں غلطی سے کوئی جملہ بڑھا دینا یہ شاذ مردود کی مثال ہے اس کو مؤلف خیر الکلام اپنے پاس ہی رکھیں۔ بات ثقہ راویوں کی زیادتی کی ہو رہی ہے۔ الغرض واذا قرأ فاستمعوا کی زیادت بالکل صحیح ہے ایک رتی شک اس کی صحت میں نہیں ہے۔ قرآن کریم کی آیت میں فاستمعوا وانصتوا کا حکم تھا اور حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انسؓ بن مالک کی صحیح اور مرفوع روایتوں میں بھی اس کی تصریح ہے کہ واذا قرأ الامام فاستمعوا اور ایک ایک سند کا صحیح ہونا بھی آپ معلوم کراتے ہیں۔ اب ان کے حجت ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وحدیث صحیح حجت است برامت در رنگ حجت کتاب عزیز۔ (دلیل الطالب ص ۸۸) اور لکھتے ہیں کہ اصل در امر وجوب فعل مامور بہ است۔

(بدور الابلہ ص ۲۲)

اور نیز تحریر فرماتے ہیں کہ امر بشیء نہیں است انرا ضداد او۔ (بدور الابلہ ص ۳۲۸) الغرض مقتدی کے لیے استماع اور انصاف کے وجوب کا حکم اور امام کے پیچھے قرأت کرنے کے ممنوع اور منہی عنہ ہونے کا حکم قرآن کریم اور صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ دیکھیے فریق ثانی لہ ارباب اصول کا اس امر پر تقریباً اتفاق ہے کہ امر مطلق کا مفاد وجوب ہے، چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: "وامره المطلق علی الايجاب" (القواعد النورانیۃ الفقہیۃ، طبع مصر ص ۵۲، لشیخ الاسلام) یعنی صاحب شرع کا امر مطلق وجوب پر محمول ہوتا ہے، شیخ الاسلام ابن وقین العیفریؒ فرماتے ہیں: "وظاھرا من الوجوب" (احکام الاحکام جلد ۵ ص ۵) امر ظاہری طوریہ پر وجوب کے لیے ہوتا ہے اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ صیغہ امر بے صارف محمول پر وجوب است۔ (افادۃ الشیوخ ص ۱۰۶)



مانتا ہے یا نہیں۔ کہیں وہ یہ نہ ارشاد فرمادے کہ

یہ سب سُوج کر دل لگایا ہے ناصح !

نئی بات کیا آپ منہ مار رہے ہیں۔

قرآن کریم کی آیت اور حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ و حضرت ابو ہریرہؓ و حضرت انسؓ بن مالک کی پیش کردہ صحیح روایتیں اپنے عموم الفاظ کے اعتبار سے سہری اور جہری سب نمازوں کو شامل ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ امام کے پیچھے اقتدار کر لینے کے بعد مقتدی کو سوائے استماع، انصات اور خاموش رہنے کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اب بعض ایسی روایتیں پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں خاص طور پر جہری نمازوں میں مقتدیوں کو امام کے پیچھے قرأت کرنے کی سخت تنبیہ اور مانعت آتی ہے۔ اور بعض روایتیں وہ بھی ہیں جن میں جہری نمازوں کی کوئی قید مذکور نہیں ہے بلکہ وہ سب نمازوں کو شامل ہیں۔

چوتھی حدیث۔ حضرت امام مالکؒ، امام ابن شہاب زہریؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابن اُکیمہ لیشیؒ سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

لے حضرت امام مالکؒ اور امام ابن شہاب زہریؒ دونوں کا ترجمہ مقدمہ ..... میں نقل کیا جا چکا ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ صحابی ہیں۔ ابن اُکیمہ لیشیؒ کا نام عمارہ تھا۔ امام ابو حاتمؒ اور یحییٰ بن سعیدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام یعقوب بن سفیانؒ ان کا مشہور تابعین میں شمار کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۱۳۱) امام بستیؒ فرماتے ہیں کہ ابن اُکیمہؒ اور ان کے بھائی دونوں ثقہ ہیں۔ (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۵۸ و مرقات جلد ۱ ص ۵۳) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ ابو حاتمؒ راضیؒ ان کو صحیح الحدیث اور حدیثہ مقبول لکھتے ہیں۔ ابو حاتمؒ بستیؒ کا بیان ہے کہ ان سے ان کے پوتے عمر بن مسلمؒ، امام زہریؒ اور سعید بن ابی ہلالؒ نے تواتر کی ہے۔ (فتاویٰ جلد ۱ ص ۱۴۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں۔ (تقریب ۲۷۶) مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور اوساط تابعینؒ تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۲ ص ۲۵۴) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ ثقہ راوی کی یہ شرط نہیں کہ اس سے روایت کرنے والے ایک سے زیادہ ہوں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک جہری نما  
انصرف من صلوة جہر فیہا بالقرآۃ سے فارغ ہوئے اور یہ ارشاد فرمایا کیا تم میں سے  
فقال هل قرأ معی منکم احد انفا فقال کسی نے ابھی میرے ساتھ قرأت کی ہے؟ ایک  
وجہ نعم انا یا رسول اللہ قال فقال شخص بولا۔ جی ہاں یا رسول اللہ! میں نے قرأت  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی کی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا جہی تو میں (اپنے  
اقول مالی انازع القرآن فانتہی الناس دل میں) کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ قرآن کریم کی قرأت  
عن القرآۃ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ میں منازعت اور ہاتھ پائی کیوں ہو رہی ہے؟  
اس ارشاد کے بعد جن نمازوں میں آپ جہر سے

(بقیہ پچھلا صفحہ) جیسے ابن اُکیمہ لیشی رحمۃ اللہ علیہ ثقہ ہیں۔ حالانکہ امام زہریؒ کے علاوہ اور کسی نے ان سے روایت  
نہیں کی۔ (ابکار المنن ص ۶۱) امام ابن معینؒ کا بیان ہے کہ ابن اُکیمہؒ کی توثیق کے لیے یہی ایک دلیل  
کافی ہے کہ امام زہریؒ جیسے جلیل القدر امام ان سے روایت کرتے ہیں۔ (ابو ہریرہ النقی جلد ۲ ص ۱۵۸)  
حافظ ابن کثیرؒ اس حدیث کی امام ترمذیؒ اور ابو حاتمؒ سے تحسین اور تصحیح نقل کرتے ہیں۔  
(تفسیر ابن کثیر ص ۴۲۳) مولانا میر صاحبؒ ایک حدیث کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ یہ  
موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی سند روایت ہے جس کی صحت میں کلام نہیں ہو سکتا۔  
(بلفظہ تفسیر واضح البیان ص ۴۲۰)

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اور مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ نے جو یہ کہا ہے کہ ابن اُکیمہ لیشیؒ  
ثقہ ہیں۔ مگر امام زہریؒ کے علاوہ اور کسی نے ان سے روایت نہیں کی تو یہ ان کا وہم ہے۔ حافظ ابن  
تیمیہؒ کا حوالہ پہلے نقل ہو چکا ہے کہ ان سے ان کے پوتے عمر بن مسلمؒ (ان کی روایت صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۶۰) میں  
ہے ملاحظہ کیجیے) امام زہریؒ اور سعید بن ابی ہلالؒ نے روایت کی ہے۔ علاوہ انہیں ان سے ایک چوتھے راوی  
بھی ہیں۔ چنانچہ مستدرک جلد ۲ ص ۴۸۴ میں ہے عن ابی الحویرث عن عمارۃ بن اُکیمہ اللیشیؒ.....  
..... الخ ابو الحویرث کا نام عبدالرحمن بن معاویہ تھا۔ ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۱۱۸) ابن  
حبابؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۴ صفحہ ۲۷۶) لہذا علامہ ذہبیؒ اور مبارک پوری صاحبؒ  
کی رائے صحیح نہیں ہے۔ ع خذ ما تراه ودع شیئاً سمعت بہ۔



وسلم فیما جہر فیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالقرآن حین سمعوا ذلک  
قرأت کیا کرتے تھے۔ لوگوں نے آپ کے پیچھے قرأت  
ترک کر دی تھی۔

من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (موطأ امام مالک ص ۲۹، ۳۰)

یہ روایت موطأ امام مالک کے علاوہ حدیث کی دیگر معتبر اور مستند کتابوں میں مذکور ہے  
جس کے صحیح ہونے میں قطعاً کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت  
کی ممانعت میں یہ روایت قطعی ہے۔

یہ واقعہ صبح کی نماز کا ہے۔ (دیکھئے سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۷ ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۲۰  
وغیرہ) جس میں تقریباً تمام حضرات صحابہ کرام موجود ہوں گے، مگر ان میں آپ کے پیچھے قرأت  
کرنے والا صرف ایک شخص تھا اور آپ نے ان دیگر حضرات کو کچھ بھی نہیں کہا جنہوں نے قرأت  
نہیں کی تھی بلکہ اسی کو ڈانٹ ڈپٹ کی۔ جس نے قرأت کی تھی اور حضرات صحابہ کرام میں  
سے کسی نے اس کا حوالہ نہیں دیا کہ حضرت آپ نے تو قرأت کرنے کا خود حکم دیا ہے۔ پھر  
کیا ممانعت کا کوئی جدید حکم آیا ہے؟ اور محال ہے کہ آپ نے امام کے پیچھے قرأت کرنے  
کا حکم دیا ہو اور اس پر عمل کرنے والا صرف ایک ہی شخص ہو اور آپ نے قیام رکوع، سجود  
اور قعدہ وغیرہ کو نیز تسبیح، تحمید اور تشہد کو ناگوار نہیں فرمایا۔ اگر ناگوار گزری ہے تو صرف  
مقدم کی قرأت، جہری نمازوں میں اس سے بڑھ کر امام کے پیچھے قرأت کے منع ہونے  
کا اور کیا ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے؟ متواف خیر الکلام کا (ص ۲۳۷) میں یہ کہنا کہ اگرچہ  
حدیث میں لفظ مطلق قرأت ہے کہ جہری نمازوں میں قرأت سے باز آگئے مگر قرأت کی

۱۔ یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۱۰۶، ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۷۰، ترمذی جلد ۱ ص ۴۲، ابن ماجہ  
ص ۶۱، مسند احمد جلد ۲ ص ۳۰۱، علی جلد ۳ ص ۲۴۰، جزر القرآن ص ۵۵، سنن الکبریٰ  
جلد ۲ ص ۱۵۷، کتاب القرآن ص ۹۹، کتاب الاعتبار ص ۱۹۷، البحر المنقہ جلد ۲  
ص ۱۵۸، ابن کثیر جلد ۳ ص ۶۲۳، مرقاۃ جلد ۱ ص ۵۳۳، فتاویٰ ابن تیمیہ ۲ ص ۱۴۹،  
عقیدہ محمدیہ جلد ۲ ص ۱۸۹، فتح الملہم ۲ ص ۲۳، بذل المجہود ۲ ص ۵۷، تحقیق الکلام ۲  
ص ۱۲۵، بکار المنن ص ۱۵۵، فصل الخطاب ص ۳۳، اور اعلام السنن جلد ۲ ص ۸۷ وغیرہ  
کتابوں میں مذکور ہے۔

بننا پر مطلق کی تقدیر ہو سکتی ہے۔ انج بالکل ایک بے وقعت بات اور مطلب پرستی کے لیے صرف ایک بہانہ ہے جس کو ماننے کے لیے کوئی تیار نہیں ہے اور یہی بے سود بہانہ قاضی مقبول احمد صاحب نے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو الاعتصام ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۱) اور انھوں نے اس مطلق قرأت کو مازاد علی الفاتحہ پر محمول کر کے بالکل ایک اور غیر معقول بات کہی ہے جو طفل تسلی سے بڑھ کر نہیں ہے۔ امام ابو بکر الرازیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت جہر اور ستر دونوں پر دلالت کرتی ہے کیونکہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہر اور سر کا کوئی فرق بیان نہیں کیا۔ ہاں البتہ راوی نے اس کی تاویل یہ کی اور وہ یہ سمجھے کہ یہ جہر سے متعلق ہے۔ (محصلہ احکام القرآن جلد ۳ ص ۵۱) فریق ثانی کی طرف سے اس روایت پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کو ان کے جوابات کے ساتھ ملاحظہ کر لیجئے۔

پہلا اعتراض: امام بیہقیؒ، علامہ حانفیؒ، علامہ ابن حزمؒ، امام نوویؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ ابن اکیمہ لکھنویؒ محمول ہے۔ بنا بریں یہ روایت قابل التفات نہیں۔ (سنن الکبریٰ ص ۱۵۹، کتاب القراءۃ ص ۹۹، کتاب الاعتقاد ص ۹۸، محلی جلد ۳ ص ۲۲۰، شرح منہب جلد ۳ ص ۳۶۸ و الباری المنہج ص ۱۵۵ وغیرہ)

جواب: ان اکابر کا یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔ اولاً۔ پوری تشریح کے ساتھ ابن اکیمہؒ کی توثیق نقل کی جا چکی ہے۔ اور باقر امیر صاحبؒ و مبارکپوری صاحبؒ موطا کی مسند روایت پر کلام نہیں کیا جاسکتا۔ اور ابن اکیمہؒ ثقہ تھے۔ پھر بھی اعتراض کیے جانا انصاف کے بالکل منافی ہے۔ ثانیاً حضرات محدثین کرامؒ کا یہ ضابطہ ہے کہ اگر کسی راوی کی دیگر محدثین توثیق کریں (بلکہ اس سے روایت کرنے والا بھی اگر وہ اہل توثیق ہے ہو خود توثیق کر دے) تو اس پر جہالت کا الزام نہیں پڑتا۔ وہ ثقہ اور عادل راویوں کی صف میں آجاتا ہے۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۷۰ وغنیۃ الامنی ص ۳۵۶، مولانا شمس الحق المنعم مع معجم الصغیر للطبرانیؒ) اور ابن اکیمہؒ کو دیگر محدثین بھی ثقہ کہتے ہیں۔ اور امام زہریؒ (جن کا اہل توثیق میں پایہ بہت بلند تھا) بھی توثیق کرتے ہیں۔ اور چار راوی ان سے فن حدیث میں روایت کرتے ہیں۔ اندر میں حالات ان کو محمول کہتے جانا انصاف کا خون کرنا ہے۔

ثالثاً۔ مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اگر کسی راوی پر جہالت کا الزام ہو اور امام ابن



جہاں اس کی توثیق کر دیں۔ تو جہالت کا الزام رفع ہو جاتا ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۳۱) اور ابن اکیمہ کو ابن جہاں ثقات میں لکھتے ہیں۔ غرض کہ کسی راوی سے متعلق ثقہ، ثبت اور عادل ہونے کے جتنے قواعد محدثین کرام کے نزدیک ثابت ہیں۔ وہ تمام ابن اکیمہ میں پائے جاتے ہیں۔ اور جہاں سے نکلنے کا کوئی ضابطہ ایسا نہیں جو ان میں نہ پایا جاتا ہو۔ پھر فریق ثانی ہی انصاف سے فرمادے کہ ابن اکیمہ نے وہ کون سا جرم کیا ہے کہ ان کے لیے جہالت کے چکر سے نکلنے کے لیے کوئی دروازہ نہیں کھلتا۔ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ توثیق کا نام ہی جہالت ہے۔ ع نام ان کا رکھ لیا ہے آسمان تحریر میں

الحاصل فن حدیث کے لحاظ سے اس حدیث کے صحیح اور معتبر ہونے میں مطلقاً کوئی کلام نہیں ہے۔ رہا اس حدیث کا حضرت ابو ہریرہؓ کے موقوف اثر (اقرأ بھا فی نفسک) سے معارضہ کرنا تو اس کی بحث اپنے مقام پر آ جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

دوسرا اعتراض۔ حضرت امام بخاریؒ، امام بیہقیؒ، امام نوویؒ، مولانا ابو عبد الرحمن محمد عبد اللہؒ اور مبارکپوری صاحب وغیرہ لکھتے ہیں کہ فانتہی الناس عن القراءة حین سمعوا ذلک من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ حضرت ابو ہریرہؓ نے بیان نہیں کیا بلکہ یہ حضرت امام زہریؒ کا بیان ہے۔ اور امام زہریؒ کی عادت تھی کہ مرفوع حدیث میں اپنا قول ملا دیا کرتے تھے۔ اور اس دعویٰ کی دو دلیلیں ہیں۔ اول۔ امام لیث بن سعدؒ اور ابن جریرؒ فانتہی الناس الخ کا ٹکڑا اپنی روایت میں بیان نہیں کرتے۔ دوم۔ امام اوزاعیؒ، امام زہریؒ سے روایت کرتے ہیں کہ

قال الزہری فانتہی الناس فلم یکنوا یقرؤن۔ (جز القراءة ص ۲۳، ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۰، سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۱)

اس سے ثابت ہوا کہ یہ جملہ امام زہریؒ کا مدرج ہے اور یہ حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ نے یہ بات تو اچھی طرح محفوظ رکھی ہے (کہ فانتہی الناس الخ امام زہریؒ کا مدرج ہے، مگر شومی قسمت کہ) الا انہ لم یحفظ اسنادہ۔ لیکن وہ اس کی سند محفوظ نہیں.... رکھ سکے۔

(جزء القراءة ص ۲۳، کتاب القراءة ص ۶۹ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۸، شرح مہذب ص ۳۷۰، عقیدہ محمدیہ جلد ۲ ص ۱۹۰ وغیرہ واللفظ للبیہقی)

جواب۔ ان حضرات کا یہ کہنا کہ یہ قول امام زہریؒ کا ہے اور مطلب یہ ہے کہ تابعین نے امام کے پیچھے قرأت ترک کر دی تھی..... محض دفع الوقتی پر مبنی ہے اور اصول کے لحاظ سے یہ غلط ہے۔  
اولاً۔ اس لیے کہ امام بیہقیؒ کا بیان ہے کہ جو جملہ حدیث مرفوع کے ساتھ بیان ہو وہ مرفوع ہی ہوگا۔ الا یہ کہ اس کے مدرج ہونے پر قاطع دلیل قائم ہو۔ (تلخیص الحجیر ص ۱۲۶) اور کمزور سند اور محض احتمال سے اور ارجح ثابت نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ محض احتمال سے ارجح ثابت نہیں ہو سکتا۔ (فتح الباری جلد ۱ ص ۴۲۵) اور اس کے مدرج ہونے کی کوئی عقلی اور نقلی صحیح دلیل موجود نہیں ہے۔

ثانیاً۔ امام بیہقیؒ، علامہ حارمیؒ، حافظ ابن حجرؒ اور امام نوویؒ لکھتے ہیں۔ واللفظ لہ۔

وبینا ان الصحيح بل الصواب الذي عليه الفقهاء والاصوليون ومحققوا المحدثون انه اذا روى الحديث مرفوعاً وموقوفاً او موصولاً ومرسله حكم بالرفع والواصل لانهما زيادة ثقة وسواء كان الرفع والواصل اكثر اواقل في الحفظ والعدد۔ (شرح مسلم جلد ۲ ص ۲۵۶)

ہم بیان کرتے ہیں کہ صحیح بلکہ خالص حق بات یہ ہے جس پر فقہاء، علماء اصول اور محقق محدثین متفق ہیں کہ جب کوئی حدیث مرفوع اور موقوف روایت کی گئی ہو۔ یا موصول اور مرسل بیان ہوئی ہو تو اس صورت میں حدیث مرفوع اور متصل ہی سمجھی جائے گی چاہے رفع اور وصل کرنے والے حفظ اور عدد میں زیادہ ہوں یا کم حدیث بہر حال مرفوع ہوگی۔

علامہ عراقیؒ فرماتے ہیں کہ اگر ایک ہی ثقہ راوی سے معاً دو مسئلوں میں اختلاف پیدا ہو کہ

لے کتاب القراءة ص ۴۶

لے کتاب الاعتبار ص ۱۲

لے تلخیص الحجیر ص ۱۲۶

لے شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۵۶۔ اور امام نوویؒ نے جلد ۱ ص ۲۸۲ و جلد ۲ ص ۴۷۲ و جلد ۳ ص ۴۰ میں بھی اس کا ذکر کیا ہے اور جلد ۲ ص ۲۸۲ میں حضرت امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کا خاص طور پر نام ذکر کیا ہے۔



کسی وقت وہ موصول بیان کرتا ہے اور کسی وقت مرسل یا کسی وقت وہ مرفوع بیان کرتا ہے اور کسی وقت موقوف۔ تو صحیح قول کی بنا پر اس کے موصول اور مرفوع ہونے کا حکم کیا جائے گا نہ کہ مرسل اور موقوف ہونے کا۔ (شرح الفیہ جلد ۱ ص ۸۳)

نواب صاحب لکھتے ہیں کہ اذا کان الواصل ثقة فهو مقبول۔ (دلیل الطالب ص ۲) اور نیز فرماتے ہیں کہ

اختلف فی کہ در رفع ووقف اوست قاذح در حجیت نہ باشد چہ رفع زیادت است  
(ایضاً ص ۱۳۴)

اور نیز لکھتے ہیں کہ قال شیخنا وبرکتنا الشوکافی وهو الحسن اذا جاءت الزیادة من طریق الثقة۔ (ایضاً ص ۴۶۱) امام نہرئی کی ثقاہت اور عدالت بھی بالاتفاق مسلم ہے۔ اس لیے اس طے شدہ قاعدہ کے رو سے یہ جملہ بھی مرفوع ہی ہو گا۔

ثالثاً۔ امام ابو داؤد، ابن ابی السرح سے روایت کرتے ہیں وہ معمر سے اور وہ امام نہرئی سے وہ فرماتے ہیں کہ

قال ابو ہریرۃ فانتمی الناس۔ (ابو داؤد جلد ۱) کہ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا۔ لوگوں نے قرأت ترک کر دی تھی۔

(ص ۱۲۰)

۱۔ ابن ابی السرح کا نام احمد بن عمرو بن عبد اللہ بن عمرو بن السرح تھا۔ محدث علی بن الحسن بن خلف کا بیان ہے کہ وہ ثقہ ثبت اور صالح تھے۔ ابو زرہ اور ابو حاتم نے وہ بائس بہ سے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ ابن یونس ان کو فقیہ اور من الصالحین الا ثبات کہتے ہیں۔ امام نسائی ان کو ثقہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۶۳) جب یہ ثقہ اور ثبت ہیں تو امام ابو داؤد کے باقی چار اساتذہ اگر اس کو نقل نہیں کرتے تو نہ کریں زیادت ثقہ مطلقاً مقبول ہے۔ اس لیے مؤلف خیر الکلام کا یہ عذر رنگ بھی قابل سماعت نہیں ہے اور اسی طرح لیث بن سعد وغیرہ کا اس جملہ کو نکال دینا اور امام نہرئی کا سانس چھوٹنے یا کھانسی وغیرہ کی وجہ سے اس کو آہستہ پڑھنا بھی ہرگز ادراج کی دلیل نہیں ہے۔

۲۔ معمر بن راشد کو علامہ ذہبی الزہامی الحجة احد الاعلام اور عالم یمن لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص ۳۶) امام احمد بن حنبل سے سوال کیا گیا کہ امام (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اس صحیح روایت سے معلوم ہو گیا کہ یہ حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے۔ نہ یہ کہ امام زہریؒ کا مدرج ہے۔ جب معمرؒ کا اثبث الناس فی الزہریؒ ہونا محدثین کا طے شدہ قاعدہ ہے۔ تو امام لیث بن سعدؒ اور ابن جریرؒ کا اس جملہ کو نہ نقل کرنا اس کے مدرج ہونے کی ہرگز دلیل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس میں صحیح اور صواب بات معمرؒ ہی کی ہوگی خصوصاً جبکہ وہ مثبت بھی ہیں۔

رابعاً۔ گو امام اوزاعیؒ بہت بڑے محدث فقیہ اور امام تھے۔ لیکن کتب الرجال میں اس کی تصریح موجود ہے کہ امام زہریؒ سے جو روایت وہ کرتے ہیں وہ حجت نہیں ہو سکتی حافظ ابو عمرؒ بن عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ کی امام زہریؒ اور یحییٰ بن ابی کثیرؒ سے جملہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں۔ (کتاب الانصاف ص ۲۰۱ و کتاب العلم ص ۲۰۱) امام ابن معینؒ کا بیانیہ کہ اوزاعیؒ فی الزہریؒ لیس بذالک (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۲۴۱) کہ امام اوزاعیؒ زہریؒ سے روایت کرنے میں قابل اعتبار نہیں ہیں۔ امام یعقوب بن شیبہؒ کا بیان ہے کہ امام اوزاعیؒ ثقہ اور مثبت تھے۔ لیکن انکی زہریؒ سے جملہ روایتیں کمزور اور ضعیف ہیں۔ (ایضاً) یہ راوی ضعیف نسبتاً نہیں ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۴۰ میں لکھا ہے۔ اور دھوکہ دیا ہے بلکہ یہ محدثین کی تصریح کے مطابق زہریؒ کی روایت میں حقیقتہً ضعیف ہے۔ انصاف شرط ہے کہ امام معمرؒ کی روایت کو (جو اثبث الناس فی الزہریؒ ہیں) چھوڑ کر امام اوزاعیؒ کی روایت کو (جن کی زہریؒ

(بقیہ پچھلا صفحہ) زہریؒ کے تلامذہ میں سے زیادہ ثبت کون ہے؟ فرمایا معمرؒ اثبث الناس فی

الزہریؒ۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۴۵۵) امام ابن معینؒ کا بیان ہے کہ معمرؒ اثبث الناس فی الزہریؒ۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۷۹) لہذا زہریؒ کی سب سے زیادہ معتبر اور مستند روایت صرف معمرؒ راشدؒ کے طریق ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس متصل حدیث کو مرسل کہنا؛ جیسا کہ مؤلف خیر الکلام ص ۴۳۹ میں کہا ہے بالکل باطل اور مردود ہے۔ اور قاضی مقبول احمد صاحب نے اسے معروف صحابی اور فہم صحابی کہہ کر گویا صی چاہی ہے جو انتہائی جہالت ہے۔ یہ فہم صحابی نہیں یہ روایت حدیث ہے کہ جب آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تو اس کے نتیجے میں لوگ ہر قسم کی قرأت سے بالکل باز آ گئے۔ یہ روایت ہے نہ کہ فہم صحابی۔ اس لیے حدیث بالکل صحیح اور قابل قبول ہے۔ البتہ نہ ماننے کا کوئی علاج نہیں۔



کے طریق سے تمام روایتیں کمزور اور ضعیف ہیں۔) کیونکہ ترجیح دی جاسکتی ہے؟ امام بیہقی پر  
امام اوزاعیؒ کی یہ نوازش ہوتی ہے کہ اتنا تو وہ یاد رکھ سکے ہیں کہ یہ جملہ مرفوع حدیث میں نہیں ہے۔  
مگر سند محفوظ نہیں رکھ سکے۔ امام بیہقی علیہ الرحمۃ کو کیا مصیبت درپیش ہے کہ وہ ان لایعنی اور  
بے سند باتوں اور تار عنکبوت سے معجز کی صحیح روایت کو رد کر کے اصول شکنی کرتے ہیں؟  
مگر یہ سچ ہے ایک غلطی کے درست کرنے کے لیے متعدد غلطیوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔

خامساً۔ اگر یہ جملہ بالفرض حضرت ابو ہریرہؓ کا نہ ہو بلکہ امام زہریؒ کا ہو۔ تب بھی کامیابی  
اور فتح جہوری کی ہوگی۔ فریق ثانی کو بغیر صراحت نصیبی کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ شیخ الاسلام ابن  
تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ اگر بالفرض فانتہی الناس الخ کو امام زہریؒ کا مدرج ہی تسلیم کر لیا جائے۔  
تب بھی یہ اس بات کی ایک بہت بڑی وزنی دلیل ہوگی کہ امام کے پیچھے قرأت کو صحیح نہیں  
ہے کیونکہ امام زہریؒ اپنے وقت میں سنت اور حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ اگر امام  
کے پیچھے قرأت کو نا ضروری ہوتا تو یہ مسئلہ امام زہریؒ سے کیسے مخفی رہ سکتا تھا؟ جب امام  
زہریؒ یہ فرماتے ہیں کہ جہری نمازوں میں لوگوں نے قرأت ترک کر دی تھی۔ تو یہ اس بات کی  
کھلی اور معقول دلیل ہے کہ حضرات صحابہ و تابعین امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے اور اسی  
پر امام موصوفؒ نے ان کو عامل پایا (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۳۵)

سادساً۔ راقم الحروف کہتا ہے کہ فریق ثانی اس جملہ کو امام زہریؒ کا مدرج تسلیم کرتا ہے۔

اگر یہ جملہ (فانتہی الناس الخ) سرے سے اس حدیث میں نہ ہو اور روایت حالی (انما انزع  
القلن پر ہی ختم ہو جائے) جیسا کہ امام لیث بن سعد وغیرہ کی روایت یہیں ختم ہوتی ہے) تو بھر بھی  
یہ حدیث جہوری کی دلیل ہے۔ کیونکہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے قرأت کرنا والا  
لہ مثلاً یہ کہ صحیح اور ضعیف حدیث کا تعارض ہو تو صحیح قابل اخذ اور ضعیف متروک ہوگی۔ ثقہ کی زیادت  
مقبول ہوگی۔ واصل اور رافع کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ مثبت کو نافی پر ترجیح ہوگی۔ امام معمرؒ مثبت  
الناس فی الزہدی رح ہیں۔ امام اوزاعیؒ فی الزہدی لیس بذالک وغیرہ تمام  
طے شدہ قواعد کو محض ایک غلط بات کو درست کرنے کے لیے ٹھکرایا جا رہا ہے۔ فوا عجبا و

صرف ایک ہی شخص تھا اور اس کو بھی آپ نے گوارا نہ فرمایا۔ پہلے آپ نے نماز سے فارغ ہو کر فوراً سوال کیا۔ اور پھر اس شخص کے اقرار کرنے کے بعد مالی انازع القدان کے جملہ سے اس کی قرأت کو ناپسند کرتے ہوئے ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ فرمائی اگر فانتھی الناس کا جملہ سرے سے نہ ہو تو کیا اس تنبیہ کے بعد بھی اس کا حضرات صحابہ کرام سے احتمال ہے کہ وہ باقاعدہ امام کے پیچھے قرأت کرتے رہے؟ حاشا وکلاً۔ راقم کہتا ہے کہ اگر اس حدیث میں اور کچھ بھی نہ ہو تا صرف یہی جملہ ہوتا۔ ہل قرأ معی منکم احدٌ تو پھر بھی یہ جہوز کی دلیل کے لیے کافی ہوتا، حالانکہ جملہ فانتھی الناس حضرت ابوہریرہؓ کا ارشاد ہے، جیسا کہ بسند صحیح آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔

اصلی بات یہ ہے کہ امام زہریؒ کے فانتھی الناس الخ کے مضمون کے سمجھنے میں فیر بن ثانی کو غلطی واقع ہے جس کے سبب انھوں نے پیچ در پیچ غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اور ایک بنیاد لے آپ نے ہل قرأ ارشاد فرمایا ہے۔ ہل جہوز نہیں فرمایا جس سے سورۃ فاتحہ کی قرأت ہر طرح سے ممنوع ہوگی۔ اس لیے ہل قرأ کو ہر پر حمل کرنا یا ہل قرأ کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنا جیسا کہ امام بیہقیؒ وغیرہ نے کیا ہے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۹ وغیرہ) یقیناً باطل اور مردود ہے اور محل النصوص علی ظہور اھرها کے خلاف ایسا مطلب مراد لینا ہرگز صحیح نہیں۔ رہا یہ سوال کہ اگر پڑھنے والے نے آہستہ قرأت کی تھی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو کیسے علم ہوا؟ تو یہ بڑی سطحی قسم کی بات ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ آپ کو نماز کی حالت میں ایک مخصوص کیفیت حاصل تھی جس سے آپ مقتدیوں کے رکوع و سجود اور خشوع کو ملاحظہ کر لیتے تھے۔ (مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۱۸۱) ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہے جو اچھی طرح وضو کر کے نہیں آتے جس کی وجہ سے ہم پر قرآن کریم کی قرأت ملتبس ہو جاتی ہے (نسائی جلد ۱ ص ۱۸۱) حافظ ابن کثیرؒ اسی مضمون کی ایک اور روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ اسناد حسن و متن حسن۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ مقتدیوں کے وضو کے نقصان سے متاثر ہوتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقتدی کی نماز امام کی نماز سے (صحۃ و فساداً) وابستہ اور متعلق ہوتی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۴۱) لہذا مقتدی کی آہستہ قرأت سے آپ کا متاثر ہونا بعید نہ تھا۔ اس لیے نماز کی حالت میں آپ کی طبیعت لطیف تر اور شفاف تر ہو جاتی تھی۔

۳ امام زہریؒ مرفوع حدیث بیان کر رہے تھے جس میں فانتھی الناس الخ کا جملہ بھی تھا۔ امام موصوفؒ (باقی اگلے صفحہ پر)



اور پادریوں کی بات کی درستی کے لیے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہیں۔

تیسرا اعتراض: مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے امام کے پیچھے صرف جہری نمازوں میں قرأت کی ممانعت آتی ہے۔ حالانکہ تم سب سب جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے منکر ہو۔ لہذا تمہارا دعویٰ عام اور دلیل خاص ہے۔ (تحقیق الکلام وغیرہ)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) کے شاگرد بکثرت تھے۔ ایک نے یہ جملہ براہ راست امام زہریؒ سے نہ سنا تو رفیق سبق سے پوچھا کہ امام زہریؒ نے کیا فرمایا تھا۔ وہ بولے فانتھی الناس الخ کہنا تھا۔ اس سے بعض کو یہ دھوکہ ہوا کہ شاید یہ جملہ امام زہریؒ کا مدرج ہے۔ حالانکہ یہ جملہ بھی مرفوع حدیث میں موجود تھا۔ (فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۳ و اعلام السنن جلد ۲ ص ۸۸) چنانچہ روایت یوں ہے کہ

وقال عبد الله بن محمد الزهري  
من بينهم قال سفيان وتكلم الزهري  
بكلمة لمواسمها فقال معمر انه  
قال فانتھی الناس الخ  
ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۰، کتاب القراءة ص ۹۹، سنن  
الکبریٰ ۲ ص ۱۵۸

اپنے ساتھیوں میں سے عبد اللہ بن محمد نے  
یہ بیان کیا کہ سفيان نے فرمایا کہ امام زہریؒ نے ایک  
کلمہ بیان کیا لیکن میں خود ان سے نہ سن سکا۔ میں نے  
پوچھا کہ انھوں نے کیا فرمایا ہے؟ امام معمرؒ نے فرمایا کہ زہریؒ  
نے فانتھی الناس الخ کا جملہ بیان کیا ہے۔

اور کتب احادیث میں اس کی متعدد نظیریں موجود ہیں۔ مثلاً زہریؒ کا بیان ہے کہ ابو الزہریؒ حدیث بیان کرتے ہیں  
تھے۔ ایک جملہ میں نہ سن سکا۔ وہ جملہ مجھے میرے رفیق درس یاسین زیدؒ نے بتایا۔ (طیالسی ص ۲۴۰) حضرت جابر بن  
سمرہؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حدیث ارشاد فرما رہے تھے لیکن ایک جملہ میں نہ سن سکا۔ میں نے اپنے  
رفیق سے پوچھا تو اس نے مجھے بتلایا (ترمذی جلد ۲ ص ۴۳، ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۳، طیالسی ص ۲۴۰، بغدادی جلد ۱ ص ۱۹۶) حضرت  
عبد اللہ بن قریظؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حدیث بیان کی مگر ایک خفیف سا کلمہ میں نہ سن  
سکا۔ میں نے پہلو میں اپنے رفیق سے پوچھا تو اس نے مجھے بتلایا (مسند رک جلد ۴ ص ۲۲۱) حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ  
فرماتی ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حدیث بیان کی لیکن ایک جملہ اہل مجلس کے رونے اور  
شور و غل کی وجہ سے میں نہ سن سکی۔ میرے قریب جو صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے دریافت کیا  
تو انھوں نے وہ جملہ مجھے بتلایا۔ (نسائی جلد ۴ ص ۲۲۴ و مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۲۶) اور یہ تمام جملے مرفوع حدیث کے ساتھ تھے۔  
یہی حال فانتھی الناس الخ کے جملہ کا ہوا ہے۔

جواب: یہ ٹھیک ہے کہ جہور اہل اسلام تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرآن کے عدم جواز کے قائل ہیں لیکن یہ دعویٰ کس نے کیا ہے کہ تمام نمازوں میں مقتدی کے لیے عدم جواز قرآن کی دلیل صرف یہی ایک حدیث ہے۔ ہاں جہری نمازوں میں عدم جواز قرآن خلف الامام کی ایک دلیل یہ روایت بھی ہے باقی سری نمازوں کے لیے قرآن کریم کی آیت۔ حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انسؓ بن مالک کی حدیث واذ اقرء فانصتوا پہلے بیان ہو چکی ہے۔ بقید دلائل اپنے مقام پر بیان ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ نقد تو وصول کر لیجئے۔ اور ادھار کے منتظر رہیے۔ دنیا بامید قائم است۔

باقی امام بیہقی وغیرہ کا ابن اکثمؒ کی روایت کا علاء بن عبد الرحمنؒ کی روایت سے معارضہ کر کے علاء بن عبد الرحمنؒ کی روایت کو ترجیح دینا سو یقیناً مردود ہے، جس کی پوری تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز اور یہ بات بھی اپنے مقام پر انشاء اللہ تعالیٰ باحوالہ آئے گی کہ حضرت ابو ہریرہؓ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآن نہیں کرتے تھے۔ لہذا مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کا فتویٰ جہری نمازوں کو بھی شامل ہے بالکل بے کار ہے۔

پانچویں حدیث۔ امام عبد اللہؒ فرماتے ہیں کہ مجھ سے والد ماجد امام احمد بن حنبلؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یعقوب بن ابراہیمؒ نے بیان کیا۔ وہ محمد بن عبد اللہ بن مسلمؒ سے روایت کرتے ہیں۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام الحافظ اور الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۶۱۳) امام احمد کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

علامہ ابن معینؒ اور علیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۱۳۸) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور الحافظ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۶۱۳) امام احمدؒ ان کو صالح الحدیث اور راہس بہ کہتے ہیں۔ ابن معینؒ ایک روایت میں ان کو صالح کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ ان کی روایتیں لکھی جاسکتی ہیں۔ امام ابو داؤدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ مجھے ان کی کسی حدیث میں خرابی معلوم نہیں اور میں نے ان کی کوئی حدیث منکر نہیں دیکھی۔ واقفیؒ ان کو کثیر الحدیث اور صالح کہتے ہیں۔ یہ صحاح ستہ کے راوی ہیں (اور یہ بالکل ایک ظاہر ہے کہ صحاح ستہ کے راوی میں اگر کوئی کمزوری ہو تو قابل برداشت ہوتی ہے جبکہ مقابلہ میں فی ثقہ تروا ہو) صحیح بخاری میں ان کی دو حدیثیں ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۳۸) امام زہریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے۔



وہ امام زہری سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے عبدالرحمن بن ہریر نے بیان کیا۔  
وہ عبداللہ بن بکینہ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم  
نے ارشاد فرمایا کہ

ہل قرأ احد منکم معی انفا قالوا نعم  
قال انی اقول مالی انا زع القرآن فانتہی  
الناس عن القراءة معہ حیث قال ذلک۔  
(مسند احمد جلد ۵ ص ۳۲۵)

کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرأت کی  
ہے؟ حضرات صحابہ کرام نے عرض کیا جی حضرت قرأت  
کی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا تب ہی تو میں (دل  
میں) کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ قرآن کریم قرأت میں  
منازعت اور کشمکش کیوں کی جا رہی ہے؟ آپ کا  
یہ ارشاد جب سنا تو لوگوں نے آپ کے پیچھے قرأت  
ترک کر دی۔

امام ابوبکر بنہمی (المتوفی ۶۸ھ) اس حدیث کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ رواہ احمد  
ورجال احمد رجال الصحيح۔ (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۰۹) یہ روایت امام احمد نے بیان کی  
ہے اور امام احمد کی سند کے تمام راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ اس کے آگے علامہ بنہمی نے  
امام بزار کا وہ اعتراض نقل کیا ہے جو عنقریب آ رہا ہے۔ الغرض سند کے لحاظ سے یہ روایت  
بھی صحیح ہے۔ اور اس میں جہری نماز کی کوئی قید بھی مذکور نہیں ہے۔ لہذا یہ روایت جہری اور  
سری تمام نمازوں کو شامل ہے۔ گویا اس روایت کے پیش نظر حضرات صحابہ کرام نے آنحضرت  
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے تمام نمازوں میں قرأت ترک کر دی تھی۔ (ملاحظہ ہو احکام القرآن  
جلد ۳ ص ۵۲ ملخصا من الرانمی) اور اگر اس روایت میں جہری قید بھی ہو جیسا کہ مجمع الزوائد جلد ۲  
ص ۱۱۱ امام ذہبی ان کو الحافظ اور ثبت لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ص ۹۱)

علامہ بکینہ ان کی والدہ کا نام تھا (نومی ص ۲۱۱، طبقات ابن سعد جلد ۴ قسم دوم صفحہ ۳) والد کا نام  
مالک تھا۔ (صحیح مسلم ص ۲۱۱) مدینہ سے تیس میل دور مقام ریم میں متوطن ہو گئے تھے (استیعاب  
جلد ۱ ص ۳۵۱) اور جلیل القدر و فضلاء صحابہ میں ان کا شمار تھا۔ (اصابہ جلد ۲ ص ۱۳۱) المتوفی ۵۵ھ  
یہ روایت سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۸ اور کتاب القراءة ص ۹۸ وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔

کی ایک روایت میں ہے صلیٰ صلوة یجہر فیہا الخ تب بھی جہری نمازوں میں ترک قرآن خلف الامام پر سابق روایت کی طرح یہ صریح دلیل ہے۔ اس روایت پر امام بزرگ اور امام بیہقی وغیرہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں محمد بن عبد اللہ بن مسلم نے خطا کی ہے۔ اصل روایت عن ابن اکیمہ عن ابی ہریرۃ الخ تھی۔ لیکن انھوں نے عن ابن جحینہ کر دی ہے۔ اور پھر محض لفظوں کے ذریعہ لوں رعب جمانے کی سعی کی ہے کہ ہذا اخطا لا شک فیہ ولا ارتیاب۔ (سنن الکبریٰ ۲ ص ۱۵۹ وغیرہ) لیکن محض ظن اور اٹکل سے ایسے زویعی اور بیکار اعتراض کون سنتا ہے؟ کیا ابن اکیمہ اور حضرت ابو ہریرہؓ کے علاوہ عبد اللہ بن جحینہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے ترک قرأت خلف الامام کی روایت نقل کرنے کے مجاز نہیں تھے؟ اور کیا امام احمد بن حنبلؒ اور علامہ بیہقیؒ وغیرہ کو یہ غلطی اور خطا معلوم نہ ہو سکی؟ نہ تو اس میں اندراج کی غلطی سے انتقال سند ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۱۴۴ میں کہا ہے اور نہ یہ روایت ضعیف ہے۔ وعلیٰ سبیل التذلل اگر یہ روایت عن ابن اکیمہ عن ابی ہریرہؓ ہی ہو۔ تب بھی یہ صحیح روایت پہلی روایت کی مؤید ہوگی اور اس کا صحیح ہونا آپ معلوم ہی کر چکے ہیں۔ حالانکہ یہ روایت عبد اللہ بن جحینہؒ ہی سے مروی ہے۔ امام مہرؒ اور سفیان بن عیینہؒ کی زہری عن ابن اکیمہ الخ کی روایت اپنے مقام پر صحیح ہے۔ نہ تو دونوں میں تعارض ہے اور نہ اختلاف۔ رہا اس روایت میں قرآن کو جہر پر حمل کرنا یا اس میں قرأت کو ما زاد علی الفاتحۃ پر محمول کرنا جیسا کہ امام بیہقیؒ نے کیا ہے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۹) تو محض فرسودہ اور بے حقیقت تاویل ہے۔ اور خالص سینہ زوری پر محمول ہے۔

فسامحہ اللہ تعالیٰ بعموم فضلہ۔

علامہ بیہقیؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ اس روایت کے جملہ راوی بخاری کے راوی ہیں۔ اگر اس روایت کو ابن اکیمہ سے تسلیم کیا جائے تو ابن اکیمہ بخاری کے راوی نہیں ہیں۔ لہذا ان کا رجال رجال الصحیح کہنا ہی امام بزرگ کی تردید کے لیے کافی ہے اور اپنے وقت میں اگر علامہ بیہقیؒ کو صحت اور سقم کی پرکھ نہیں تو اور کس کو تھی؟ مؤلف خیر الکلام کا بیہقیؒ پر اعتراض بے سود ہے اگرچہ سند احمدی بعض روایتیں ضعیف و کمزور ہیں

مگر یہ سند بالکل صحیح ہے کیونکہ اس کے جملہ راوی بخاری کے راوی ہیں۔



چھٹی حدیث : امام بزارؒ فرماتے کہ ہم سے محمد بن بشرؒ اور عمر بن علیؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو احمدؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یونس بن ابی اسحاقؒ نے اپنے باپ سے بیان کیا۔ وہ ابو الاحوصؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا :

۱۔ صاحب منہاج بن عمرو بن عبدالحق (المتوفی ۲۹۲ھ) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور العلماہ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۰۴)

۲۔ حافظ ابن حجرؒ ان کو الحافظ اور عجلؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابو حاتم صدوق اور نسائی لو باسنہ کہتے ہیں۔ مسلم بن قاسمؒ ان کو ثقہ اور مشہور کہتے ہیں۔ دارقطنیؒ ان کو من الحفاظ والاشبات کہتے ہیں ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۷۷) عمرو بن علیؒ کو امام ابو زرؒ من فہسان الحدیث اور دارقطنیؒ من الحفاظ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ مسلم بن قاسمؒ ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۸۷)

۳۔ ان کا نام محمد بن عبد اللہ بن الزبیر تھا۔ امام ابن زبیرؒ ابن معینؒ اور عجلؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ بزارؒ کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بڑا حافظ نہیں دیکھا۔ محدث ابو زرؒ اور ابن خراشؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں امام ابو حاتمؒ ان کو حافظ الحدیث کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ لیس بہ باس ابن قانعؒ ثقہ اور ابن سعدؒ ان کو صدوق اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۹ ص ۲۵۵)

۴۔ امام ابن معینؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ حسن الحدیث اور نسائیؒ لو باسنہ کہتے ہیں۔ عجلؒ ان کو جائز الحدیث کہتے ہیں اور ابن شہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۳ ص ۱۳۳) ۵۔ ابو اسحاق السبئیؒ علامہ ابن ناصر الدینؒ ان کو بڑے حفاظ اور ائمہ دین میں شمار کرتے ہیں (شذراذہ جلد ۱ ص ۱۴۵) امام نوویؒ لکھتے ہیں ان کی توثیق جلالت اور شمار پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسماء جلد ۲ ص ۱۷۷) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور احد الاعلام کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۷۷) امام احمد بن معینؒ، نسائیؒ، عجلؒ اور ابو حاتمؒ وغیرہ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۶۵)

۶۔ ان کا نام عوف بن مالک بن فضلہ تھا۔ امام ابن معینؒ، ابن سعدؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۹ ص ۱۶۹) حضرت ابن مسعودؓ جلیل القدر صحابی تھے جن کے کچھ مناقب بائبل میں بیان ہو چکے ہیں۔

کانوا یقرآن خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال خلطتم علی القرآن - کہ لوگ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے قرأت کرتے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا (احکام القرآن جلد ۳ ص ۵۵ وطحاوی جلد ۱ ص ۱۶۲) الجہر النقی جلد ۲ ص ۱۶۲

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ نے اپنے پیچھے قرأت کرنے والوں کی قرأت کو گوارا نہ فرمایا اور مخصوص الجہر میں ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے تنبیہ فرمائی اور اس میں چونکہ جہری نماز کی قید نہیں۔ اس لیے سب نمازوں کو یہ روایت شامل ہوگی۔ اور آہستہ قرأت کرنے بلکہ مقتدیوں کے عدم تکمیل وضو سے آپ کا متاثر ہونا پہلے نقل ہو چکا ہے۔ علامہ ہاشمیؒ لکھتے ہیں کہ یہ روایت مسند احمد، مسند ابویعلیٰ اور مسند بن زرارہ میں مروی ہے۔ اور مسند احمد کی روایت کے جملہ راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱) علامہ ماری دینیؒ لکھتے ہیں کہ وہذا سند جید کہ یہ عمدہ اور کھری سند ہے۔ (الجہر النقی جلد ۲ ص ۱۶۲) اور قرأت چونکہ مطلق ہے اس لیے سورہ فاتحہ اور قرآن کریم کی جملہ سورتوں کی قرأت کو شامل ہے کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے جہر اور سر کا کوئی فرق بیان نہیں فرمایا۔ (احکام القرآن جلد ۳ ص ۵۱)

اس روایت میں قرآن کو جہر پر یا قرأت کو مازاد علی الفاظہ پر بجز مجرول کرنا جیسا کہ امام بیہقیؒ کی تقلید میں کرنے والوں نے (جن میں قاضی مقبول احمد صاحب بھی ہیں) کیا ہے بالکل غلط ہے ایسی لایعنی تاویلات کو کون مانتا ہے؟

بعض طرق میں اس کا ذکر آتا ہے کہ حضرات صحابہؓ آپ کے پیچھے جہر سے قرأت کرتے تھے مگر فی جہرون کے الفاظ سندا و معناً محل نظر ہیں۔ یہ روایت دارقطنی جلد ۱ ص ۳۰ میں ہے، لیکن پوری سند یوں ہے: عن یونس بن ابی اسحق عن (الحوصص) الخ اور گو تعلیق المغنی میں کہا ہے: اسنادہ حسن مگر مؤلف خیر الکلام کے اصول سے یہ صحیح نہیں ہے وہ لکھتے ہیں کہ

اس کی سند میں ابواسحاق سبیعیؒ ہیں حافظ ابن حجرؒ نے ان کو تیسرے طبقہ کے مدلسین



میں شمار کیا ہے۔ طبقات المدلسین ص ۱۲۳ اور اس طبقہ کی روایات بدون تصریح سماع مقبول نہیں ہوتیں۔۔۔۔ الخ (خیر الکلام ص ۲۶۸) بقول ان کے یہ نہ تو صحیح ہے اور نہ مقبول علاوہ انہیں امام احمد فرماتے ہیں کہ یونس کی اپنے والد سے روایت ضعیف ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۳۳) اور مؤلف خیر الکلام نے ص ۱۹۰ میں لکھا کہ بعض اہل علم ابواسحاق کو ان کے اختلاط کی وجہ سے چھوڑ چکے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۲۹۲) لہذا متروک کی روایت کا کیا اعتبار۔ کم از کم ان کو اپنے پیش کردہ اصول کا خیال تو ملحوظ رکھنا چاہئے۔

ساتویں حدیث: امام بیہقی فرماتے ہیں کہ ہم سے ابوالحسن علی بن احمد حامی مقرئ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمد بن سلیمان فقیہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابراہیم بن ہشیم نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے آدم بن محمد نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ

۳۲۹  
۱ علامہ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ صادق دیندار، فاضل اور حسن الاعتقاد تھے۔ (بغدادی جلد ۱) مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۲ میں یہ کہا ہے کہ ابن ابی الفوارس کہتے ہیں ضعیف جداً سخت ضعیف ہے۔ میزان جلد ۲ ص ۲۱۷ اور لسان المیزان جلد ۲ ص ۱۹۲، مگر یہ ان کی جمالت ہے کیونکہ جن کی تضعیف ابن ابی الفوارس نے کی ہے وہ علی بن احمد بن ابی قیس المقرئ الرفاعی۔۔۔۔ الخ ہیں جن کی وفات ۳۵۲ھ میں ہوئی ہے۔ دیکھئے لسان جلد ۲ ص ۱۹۲ وغیرہ اور زبیر بن سند میں علی بن احمد بن عمر بن حفص ابوالحسن المقرئ المعروف بابن الحامی ہیں جن کی وفات ۴۱۷ھ میں ہوئی (دیکھئے بغدادی جلد ۱ ص ۳۳) اس لیے مؤلف خیر الکلام کا ص ۲۲ میں یہ کہنا کہ پھر یہ حدیث بالکل منکر شاذا اور ضعیف ہے۔ انتہی بلفظ قطعاً باطل اور مردود ہے۔

۲ علامہ ذہبی ان کو الامام، الحافظ، الفقیہ اور شیخ العلماء لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۹) ۳ امام بیہقی لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (بحار الجہر النقی جلد ۱ ص ۱) دارقطنی ان کو ثقہ لکھتے ہیں (جلد ۱ ص ۱) ابن عدی ان کو مستقیم الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (لسان المیزان جلد ۱ ص ۱۲۳) خطیب ان کو ثقہ اور ثبت لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۲) ۴ آدم بن ابی ایاس، امام ابو داؤد، ابن معین اور حلی ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتم ان کو ثقہ اور (باقی اگلے صفحہ پر)

ہم سے ابن ابی ذئبؒ نے بیان کیا۔ وہ محمد بن عمروؒ سے اور وہ محمد بن عبدالرحمن بن ثوبانؒ سے اور وہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

ما كان من صلوة يبهر فيها الامام جس نماز میں امام جہر سے قرأت کرتا ہو۔  
بالقرأة فليس لاحد ان يقرأ معه۔ اس نماز میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ امام کے  
(کتاب القرآءة ص ۹۹، ص ۱۲۷ طبع اشرف پریس) ساتھ قرأت کرے۔

یہ روایت بھی اس بات کو واشگاف کرتی ہے کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے کسی مقتدی کو اس کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ امام کے پیچھے کسی قسم کی قرأت کرے۔ امام بیہقیؒ نے قرأت سے جہر اور ما زاد علی الفاتحة کی قرأت مراد لی ہے۔ لیکن یہ قطعاً غلط ہے۔ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مامور من اللہ تھے۔ اور آپ کو فاصدع بہاتوءہم کا حکم تھا۔ مطلق قرأت اور سورۃ فاتحہ کی مقید قرأت میں نیز نفس قرأت اور جہر بالقرآۃ میں آپ اچھی طرح فرق جانتے تھے۔ پھر نہ معلوم آپ نے اتنی رازداری اور کنایہ سے کام کیوں لیا؟ آپ نے یہ کیوں نہ فرمادیا کہ فلیس لاحد ان یبهر معہ اور یہ کیوں نہ فرمادیا: فلیس لاحد ان یقرأ معہ غیر سورۃ الفاتحہ آپ کے الفاظ تو یہ ہیں فلیس لاحد ان یقرأ معہ کسی کو یہ حق نہیں کہ امام کے ساتھ کسی قسم کی قرأت کرے۔ آپ کے مطلق حکم کو بلا دلیل مقید کر دینا (بقیہ گذشتہ صفحہ) مامون کہتے ہیں۔ نسائی لا بائس بہ کہتے ہیں۔ ابن حبان ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۹۲)

لہ ثقہ، فقیہ اور فاضل تھے۔ (تقریب ص ۳۲۹)

لہ امام ابو زرؒ، نسائی اور ابن سعد ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو ثقہ اور صالح الحدیث کہتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۹ ص ۳۷۴)

لہ ابن سعد، ابو زرؒ، نسائی ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ کا بیان ہے کہ وہ تابعین میں تھے اور ایسے ثقہ تھے کہ ان کے مثل سے سوال نہیں ہو سکتا۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۹ ص ۲۹۴) حضرت ابوہریرہؓ مشہور صحابی تھے۔ غرضیکہ اس روایت کا ایک ایک راوی ثقہ اور ثبت ہے۔



اور مطلق قرأت کو مقید قرأت پر بغیر کسی حجت کے حمل کرنا سینہ زوری نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک اور بات اس روایت کے بارے میں امام بیہقیؒ سے نکلی ہے، وہ بھی بہت ہی عجیب ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ روایت منکر ہے۔ اگر کوئی روایت صرف امام بیہقیؒ کے منکر کہنے سے منکر ہو جایا کرتی ہے تو پھر ان سے کوئی جھگڑا نہیں۔ لیکن اصول حدیث کے لحاظ سے یہ روایت کسی طرح منکر نہیں ہے۔ حضرات محدثین کرامؒ کی اصطلاح میں منکر وہ روایت ہوتی ہے جس کی سند میں کوئی ایسا راوی موجود ہو جو فاحش غلطی اور کثرتِ خطا کا مرتکب ہوا ہو۔ یا اپنے زیادہ کسی ثقہ راوی کی مخالفت کرتا ہو۔ (دیکھیے شرح بختہ الفکر ص ۵۵ و ۵۹ وغیرہ) لیکن اس روایت کے تمام راوی ثقہ اور ثبت ہیں۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں اور اس روایت میں کوئی ایسا راوی موجود نہیں جو کسی ثقہ راوی کی مخالفت کر رہا ہو۔ اگر امام بیہقیؒ کی مراد اس روایت کو علامہ ابن عبد الرحمنؒ کی روایت کے خلاف بتانا ہے۔ تو اس کی حقیقت بھی عنقریب آشکارا ہو جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز! اندریں حالات اس کو منکر کہنا اصول کے خلاف ہے جو کسی طرح مسموع نہیں ہو سکتا۔ اور باقرار مبارک پوری صاحبؒ یہ نقل ہو چکا ہے کہ امام بیہقیؒ کا کوئی قول بلا دلیل حجت نہیں ہو سکتا۔ مؤلف خیر الکلام (ص ۳۳۶ میں) لکھتے ہیں کہ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے طبیعت نفرت کرتی ہے۔ کیونکہ جو صحیح روایات حضرت ابو ہریرہؓ سے وارد ہیں یہ بوجہ ان کے خلاف ہونے کے شاذ ہے۔۔۔ الخ اگر امام بیہقیؒ کی طبیعت صحیح حدیث کو نہیں مانتی تو نہ مانے۔ صحیح حدیث کو ماننے والے بھی دنیا میں بفضلہ تعالیٰ موجود ہیں اور حضرت ابو ہریرہؓ سے جہری منافقوں میں کوئی روایت خلف الامام قرأت کی ثابت نہیں ہے۔ جیسا کہ بیان ہو گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) لہذا خلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اٹھویں روایت: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابوبکر بن اسحاق الفقیہ اور ابوبکر بن عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں فرماتے ہیں کہ امام ابو عبد اللہؒ کا ترجمہ باب اول میں گزر چکا ہے۔ ابوبکر بن اسحاق الفقیہ اور ابوبکر بن عبد اللہؒ کی سند ڈبل ہے مگر مزید تسلی اور تسکین کے لیے (کیونکہ ابوبکر الفقیہ تو مشہور امام ہیں) ابوبکر بن عبد اللہؒ کا ترجمہ سن لیں۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الامام، الاوحد، المصل اور محدث نیشاپور لکھتے ہیں۔ (المتوفی ۷۸۸ھ) (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۲)



ہیں کہ ہم سے احمد بن شبر بن سعد المرندیؒ اور حسن بن سفیانؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم سے فضیل بن عبد الوہابؒ اور محمد بن خالد بن عبد اللہ الواسطیؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم سے خالد بن عبد اللہ الطحانؒ نے بیان کیا۔ وہ عبد الرحمن بن اسحاقؒ سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ سعید مقبریؒ سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے وہ فرماتے ہیں کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لے سنو کی یہ کڑی بھی ڈبل ہے۔ اور حسن بن سفیانؒ کا ترجمہ باب اول میں امام زہریؒ کے اثر میں نقل ہو چکا ہے کہ وہ جلیل القدر امام تھے۔

یہ کڑی بھی ڈبل ہے۔ امام ابن معینؒ کہتے ہیں کہ فضیل ثقہ اور لا بأس بہ تھے۔ محدث عبد الرحمنؒ اپنے والد سے ان کی توثیق نقل کرتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۱۲ ص ۳۹۳) ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور ابو بکر بن رلیس بہ لا بأس کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۲۹۳)

امام احمد بن محمدؒ ابو زرہؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو ثقہ اور صحیح الحدیث کہتے ہیں۔ امام ترمذیؒ ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں۔ محمد بن عمارؒ ان کو اثبت کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً ص ۳۰۱) امام احمد ان کو من افاضل المسلمین کہتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۸ ص ۲۹۴) علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ اور الامام لکھتے ہیں۔ (مذکرہ جلد ۱ ص ۲۳۹)

امام احمد ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں۔ ابن معینؒ ثقہ کہتے ہیں۔ یعقوب بن شیبہ صالح اور یعقوب بن سفیان لا بأس بہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ حسن الحدیث کہتے ہیں۔ ابو داؤد ثقہ کہتے ہیں۔ نسائی (جلد ۴ ص ۱۱۱) لیس بہ لا بأس کہتے ہیں۔ ابن خزمہؒ بھی لیس بہ لا بأس کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ صالح الحدیث اور ساجی صدوق کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کی توثیق کرتے ہیں اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ ترمذیؒ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ان کی توثیق کی ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۱۱۸) مؤلف خیر الکلام ص ۱۱۸ میں لکھتے ہیں کہ ابن معینؒ نے ان کو ضعیف کہا اور امام احمدؒ نے منکر الحدیث کہا یہ جوہر ہیں اگرچہ مبہم ہیں مگر ان سے راوی مرتبہ سے گریز کرنا چاہیے (محصلہ) الجواب: امام ابن معینؒ نے ان کو ثقہ کہا ہے اور امام احمدؒ نے ان کو صرف ابو الزنادؒ کی روایت میں منکر کہا ہے اور یہ روایت سعید مقبریؒ سے ہے اور لطف یہ ہے کہ خود مؤلف مذکور جوہر کو مبہم کہتے ہیں اور خیر الکلام ص ۱۱۸ میں لکھا ہے کہ پھر اس پر جوہر ہیں کی گئی ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)



کل صلوة لا یقرأ فیہا بام الکتاب فی

کہ ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو وہ نماز ناقص ہوتی ہے، مگر ماں وہ نماز اس سے مستثنیٰ

خدا ج (۱) صلوة خلف امامہ۔

(کتاب القراءة ص ۱۳۵، طبع دہلی دص ۱۴۱۱، ہے جو امام کے پیچھے پڑھی جائے۔

طبع اشرف پور میں)

اس روایت میں خلف امام اور امام الکتاب کی قید خاص طور پر ملحوظ رکھنی چاہئے۔ اور یہ بھی کہ آپ نے تمام نمازوں میں سورۃ فاتحہ کی قرأت کو ضروری اور لازم ٹھہرایا ہے۔ مگر مقتدی کے لئے اس کی قرأت کی مطلقاً گنجائش نہیں چھوڑی اور امام بیہقیؒ وغیرہ جہاں قرأت سے مانا دعویٰ الفاتحہ مراد لے کر غلو خلاصی کیا کرتے ہیں۔ یہ روایت ان کی اس تاویل کو بھی باطل ٹھہراتی ہے۔ کیونکہ اس میں خاص طور پر امام الکتاب کی قید موجود ہے جو نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ اور اس صحیح روایت سے بھی فریق ثانی کا یہ مطالبہ آسانی سے پورا ہو جاتا ہے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے کی ایک ہی صحیح صریح مرفوع حدیث پیش کرو۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) مفسر نہیں محدثین اور اصول فقہ والوں کے ہاں اس قسم کی جمع مقبول نہیں ہوتی اھ امام احمد کی اصطلاح منکر الحدیث کے بارے میں بالکل جدا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ان ابن حنبلؒ یطلق علی من یغرب علی اقراءہ فی الحدیث ای یأتی بالخرائب انہ منکر الحدیث... انتہی (ہامش تدریب الراوی ص ۲۳۴) امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جو راوی اپنے باقی ساتھیوں سے متفرد ہو کر کوئی غریب حدیث بیان کرے تو وہ منکر الحدیث ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ غریب حدیث صحیح بھی ہو سکتی ہے۔ کمالہ مخفی۔ یہ یاد رہے کہ اس سند میں راوی عبدالرحمن بن اسحاق المدنی ہیں جو کہ رجال مسلم میں سے ہیں نہ کہ الواسطی جن پر امام بیہقیؒ نے امام ابن معینؒ اور امام احمدؒ کا کلام نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب القراءة طبع دہلی) کیونکہ المدنی سے خالد بن عبداللہ الطحان الواسطیؒ کی اور المدنی کی سعید مقبریؒ سے روایت ہے۔ (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۳۷) مگر الواسطیؒ اس پوزیشن میں نہیں۔ امام بیہقیؒ غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔ (فصل الخطاب ص ۱۸) اور اسی عبدالرحمن بن اسحاقؒ سے فریق ثانی ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۸ کی روایت فالتی الناس کے مرسل ہونے پر استدلال کرتا ہے۔ (فصل الخطاب ص ۸۰ للعلامة الکشمیریؒ)

۱۰ علامہ ذہبیؒ ان کو امام، المحدث اور ثقہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۰) غرضیکہ حضرت ابوہریرہؓ تک تمام روایات ثقہ اور ثابت ہیں۔

**اعتراض:** یہی اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اصل روایت الاصلوة خلف امام کا جملہ نہیں ہے جیسا کہ علامہ بن عبد الرحمنؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کا موقوف اثر نقل کیا ہے اور اس میں یہ جملہ مذکور نہیں ہے اور یہ خالد الطحانؒ کی خطا ہے کہ وہ یہ جملہ زائد کر کے حدیث کا مطلب بگاڑ رہے ہیں  
(کتاب القراءة ص ۱۳۵ المحصلہ)

**جواب:** یہ اعتراض چنداں وقعت نہیں رکھتا؛ اولاً: اس لیے کہ مرفوع حدیث کو موقوف اثر کے تابع بنا کر مطلب لینا خلاف اصول ہے۔ وثانیاً: اس کی بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ کہ اعتبار راوی کی مرفوع حدیث کا ہوتا ہے۔ اس کی اپنی ذاتی رائے کا اعتبار نہیں ہوتا۔ وثالثاً: خالد الطحانؒ بالاتفاق ثقہ اور ثبت تھے۔ اور ثقہ کی زیادت بالاتفاق مقبول ہوتی ہے تو پھر نہ معلوم یہ غدر اور غلطی ان کے سر کیسے تھوپی جاسکتی ہے؟ و رابعاً: الزامی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر واقعی اس حدیث کے مضمون میں غلطی واقع ہوئی ہے تو کیوں نہ ہو کہ الاصلوة خلف امام کی زیادت صحیح ہو۔ اور علامہ بن عبد الرحمنؒ کی رواست میں غلطی اور خطا کی وجہ سے یہ زیادت چھوٹ چکی ہو۔ اور اس زیادت کے ترک کر دینے یا چھوٹ جانے کی وجہ سے حدیث کا مضمون بدل گیا ہو بلکہ قرین انصاف بھی یہی بات ہے کہ غلطی خالد الطحانؒ کی نہ ہو جو ثقہ اور ثبت تھے بلکہ یہ غلطی اور خطا علامہ بن عبد الرحمنؒ کی ہو۔ کیونکہ ان پر کتب رجال میں کلام اور جرح کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن عبد البرؒ اور علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن معینؒ فرماتے تھے لیس حدیث بحجة کہ علامہ بن عبد الرحمنؒ کی حدیث حجت نہیں ہو سکتی، ابن عدیؒ ان کو لیس بالقوی کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ کا بیان ہے کہ ان کی بعض حدیثیں منکر ہوتی ہیں۔ ابو زرہؒ کا بیان ہے کہ وہ کوئی زیادہ قوی نہ تھے، امام ابو داؤدؒ کا بیان ہے کہ محدثین نے ان کی حدیثیں شعبانؒ کی حدیث ان کے مناکیر میں شامل کی ہے، محدث خلیلیؒ کا بیان ہے کہ ان کی ایسی روایتیں بھی ہیں۔ جن میں ان کا کوئی منافع نہیں ہے۔ (دیکھئے کتاب الانصاف ص ۱۶ میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۱۲۔ اور تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۱۸۱) اس لیے قرین قیاس اور مبنی بر انصاف صرف یہی بات ہے کہ اس زیادت کے ترک کرنے میں غلطی علامہ بن عبد الرحمنؒ کی ہے اور یہ روایت ان کی منکر روایتوں میں شمار ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا ص ۱۸ میں یہ کہنا کہ علامہ بن عبد الرحمنؒ پر جرح مبہم ہے، اور نور الانوار کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جرح مبہم اثر انداز نہیں ہوتی۔ پس وہ ثقہ ٹھہرے۔



امام مسلمؒ نے ان سے استشہاد کیا ہے، لہذا ان کے ہاں بھی ثقہ تھے۔ اور اُمت نے مسلم کی روایات کو جن پر تنقید نہیں ہوئی صحیح کہا ہے لہذا بالاجماع صحیح ہوئی۔ (محصلہ) محض تسکین قلب کا سامان امام ابن معینؒ نے ان پر مفسر جرح کی ہے اور جرح مبہم سے بھی مؤلف مذکور کے نزدیک راوی گرجاتا ہے اور اس پر ابن معینؒ وغیرہ نے تنقید کی ہے۔ لہذا یہ کسی طرح صحیح نہیں یہ ان کی غلطی ہے اور خالد الطحانؒ کی زیادت بلا شک و شبہ صحیح ہے کیونکہ وہ ثقہ ثبت صحیح الحدیث اور اثبت ہیں۔ الغرض یہ روایت بالکل صحیح ہے نہ اس میں خالد الطحانؒ کا وہم ہے اور نہ عبدالرحمن بن اسحاقؒ کا، جیسا کہ امام بیہقیؒ وغیرہ نے کہا ہے۔ امام مسلمؒ نے مقدمہ میں یہ بتلایا ہے کہ وہ استشہاد میں متکلم فیہ راوی کو بھی لے لیتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ص ۱۲)۔ لہذا ان کا مسلمؒ آجانا جبکہ ان پر تنقید بھی ہوئی ثقاہت ثبوت نہیں نویں حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الحسنؒ علی بن احمد بن عبدانؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمد بن عبد الصفارؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمد بن غالبؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو عمرؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے امامؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے زیادؒ ابیٰ علمؒ نے بیان کیا۔ وہ حسنؒ سے روایت کرتے ہیں

۱۰ علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (بغدادی جلد ۱۱ ص ۲۲۹)

۱۱ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثقة لکھتے ہیں۔ دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے۔ (تذکرہ

جلد ۳ ص ۸۷)

۱۲ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الامام کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ص ۱۷۲) دارقطنیؒ ان کو ثقہ اور مامون اور

حافظ ابن حجرؒ ان کو الحافظ کہتے ہیں۔ (لسان المیزان جلد ۳ ص ۳۳۳) اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔

(ایضاً ص ۳۳۸) نیز امام دارقطنیؒ نے ان کو مکثر مجود اور حافظ ابن حجرؒ نے متقن کہا۔ (ایضاً)

۱۳ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور العلامة لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ص ۳۷۷)

۱۴ ذہبیؒ ان کو الامام، الحجة اور الحافظ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۸۸)

۱۵ امام احمدؒ، ابن معینؒ، ابو داؤدؒ، نسائیؒ اور ابن سعدؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو زرؒ حبانؒ کو شیخ کہتے

اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۷۲)

۱۶ امام حسن بصریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

اور وہ حضرت ابو بکرؓ سے:

انہ دخل المسجد والنبي صلى الله عليه وسلم  
راعى فركع قبل ان يصل الى الصف فقال للنبي  
صلى الله عليه وسلم زادك الله حرصا ولا تعد  
(سنن الكبير جلد ۲ ص ۹۰)

وہ کہتے ہیں کہ جب وہ مسجد میں داخل ہوئے تو ان  
حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رکوع میں چلے گئے تھے۔  
چنانچہ صف میں ملنے سے قبل ہی وہ (تکبیر تحریمہ ادا کر کے)  
رکوع میں چلے گئے اور آہستہ آہستہ چلتے چلتے صف  
میں مل گئے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تجھے نیکی کرنے  
پر اور حرص کرنے سے بچھریا نہ کرنا۔

ظاہر ہے کہ حضرت ابو بکرؓ بغیر سورۃ فاتحہ پڑھے رکوع میں شامل ہو گئے تھے۔ مع ہذا ان کی اس  
رکعت کو اور ان کی اس نماز کو جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مکمل اور صحیح سمجھا۔ اور  
ان کو عادتہ نماز کا حکم نہیں دیا اور یہ دعویٰ کہ انھوں نے وہ رکعت دوبارہ پڑھی تھی بالکل بے بنیاد بات  
ہے بلکہ ایک توجیہ کے لحاظ سے عدم اعادہ کا صریح حکم ارشاد فرمایا۔ اگر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ہر رکعت  
لے ان کا نام نصیح بن الحارث تھا۔ جنگ طائف کے دن مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ فضلاء صحابہ میں تھے۔

بصرہ میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔ اور وہیں ۴۹ ص ۱۲۹ میں وفات پائی۔ (مقدمہ تجرید البخاری ص ۳)  
۱۰ یہ روایت صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۹۹ و مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۲۹۹ و مسند احمد، ابوداؤد و جلد ۱ ص ۹۹ و نسائی جلد ۱ ص ۱۹۹  
اور الجامع الصغیر للسیوطی مع الشرح جلد ۲ ص ۳۷۸ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔ یہ بخاری شریف کی روایت ہے جس  
کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ اور مزید تسلی کے لیے ہم نے سنن الکبریٰ کے روایت کی توثیق بھی  
نقل کر دی ہے۔

۱۱ یہ جملہ بین القوسین اور بریکٹ میں تھا۔ کتابت کی غلطی کی وجہ سے قوس رہ گئے تھے۔ یہ حدیث کے ترجمہ  
میں داخل نہیں ہے۔ جیسا کہ الاعتصام ۲ نومبر ۱۹۴۲ء ص ۱۴۱ میں اس کو غلط ترجمہ اور اضافہ کہہ کر پھینکی اور ان کے  
بے جاسعی کی گئی ہے۔ اور چونکہ تکبیر تحریمہ جہود رابل اسلام کے نزدیک فرض ہے۔ اس لیے بین القوسین  
اس کا اضافہ کیا گیا ہے۔ حدیث مستی الصلوٰۃ میں جو صحیح اور مشہور حدیث ہے ثوکبیر ثواقدا کی تصریح  
موجود ہے اور حافظ ابن رشدؒ لکھتے ہیں کہ فمفہوم هذا هو ان التكبير الاولي هي الفوض فقط  
وجداية المجتهد جلد ۱ ص ۱۱۸ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ فرض منکر تکبیر تحریمہ ہی ہے۔

(حاشیہ نمبر ۲۲ کے صفحہ پر دیکھئے)



میں رکن اور ضروری ہے تو حضرت ابو بکرؓ کی نماز کیسے صحیح ہو گئی تھی؟ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ کے رکوع میں شریک ہونے کو بنظر کراہت نہیں دیکھا جیسا کہ قاضی مقبول احمد صاحب نے سمجھا ہے۔ (دیکھئے الاعتصام ۱۶، نومبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۵) بلکہ بحالت رکوع چل کر صف سے ملنے کو پسند نہیں فرمایا اور دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ اس سے صاف اور واضح طور پر معلوم ہوا کہ مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ کی قرأت ضروری نہیں ہے۔ وہو المطلوب۔

مؤلف خیر الکلام نے کہا ہے کہ قرأت خلف الامام کو ضروری قرار دینے والوں کے دو قول ہیں ایک یہ کہ رکوع کی حالت میں اگر امام کو پائے تو اس رکعت میں فاتحہ فرض نہیں ہوتی..... الخ (صفحہ ۴۵) لہذا یہ حضرات تو ہمارے ہمنوا ہوئے۔ رہے دوسرے حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ وہ رکعت اس کی شمار نہ ہوگی تو اس کا جواب انشاء اللہ تعالیٰ اپنے مقام پر آئے گا اور اس حکم میں حضرت ابو بکرؓ کی خصوصیت بھی نہیں۔ جیسا کہ ظاہر ہے اور اسی حدیث سے جمہور اہل اسلام اور حضرات ائمہ (پچھلے صفحہ کا حاشیہ نمبر ۴) بعض محدثین اس کو لا تعدّ و پڑھتے ہیں۔ یعنی نماز کے لیے دو رکعت نہ چلا کر۔

بلکہ اطمینان اور وقار سے چلو اور بعض اس کو لا تعدّ پڑھتے ہیں۔ یعنی پھر جماعت میں تاخیر اور تنہا صف کے پیچھے نماز شروع کرنے کی حرکت نہ کرنا اور بعض اس کو لا تعدّ پڑھتے ہیں۔ یعنی تھاری نماز بالکل صحیح ہے۔ نماز کا اعادہ نہ کرو۔ امام نوویؒ نے (ہاشم مشکوٰۃ ص ۹۹ ملاحظہ کریں) اور حافظ ابن حجرؒ نے لا تعدّ کو بھی نقل کیا ہے۔

(دیکھئے فتح الباری جلد ۲ ص ۲۱۴) قاضی شوکانیؒ اور نواب صدیق حسن خان صاحبؒ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے دوبارہ نماز پڑھی اور اس کا اعادہ کیا اور انھوں نے طبرانی کی اس روایت سے استدلال کیا ہے صل ما ادرکت واقض ما سبقک (امام الکلام ص ۵۱) لیکن حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنؤی نے غیث المقام

از ص ۴۶ تا ص ۵۰ میں اس کا عقلاً و نقلاً خوب رد کیا ہے۔ وہ بحث وہاں ہی ملاحظہ کریں یہاں اتنی بات پیش نظر رکھیں کہ طبرانی کی روایت کی سند کیا ہے؟ اور اگر سند صحیح بھی ثابت ہو جائے تو اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جو کہ روایتی تم نے کی پھر ایسا نہ کرنا بلکہ جو حصہ نماز کا تمہیں جماعت کے ساتھ مل جائے اس کو جماعت کے ساتھ پڑھو اور جو چھوٹ جائے اس کو جماعت کے بعد اکیلے پڑھو۔ اس سے ثابت کرنا کہ اس نماز کے اعادہ کا حکم دیا خالص کم نفی ہے۔

لہ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابو بکرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ بڑی محنت اور مشقت سے رکوع میں ملنے کی کوشش کیا کرتے تھے اور یہ اس کی واضح (بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اربعہ نے مدرک رکوع کے مدرک رکعت ہونے پر استدلال اور احتجاج کیا ہے جس کی پوری تفصیل اپنے محل میں بیان ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ علامہ ابن حزم ایک موقع پر حضرت ابوبکرؓ کی ایک

روایت سے یوں استدلال کرتے ہیں کہ

فہذا آخر فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان ابوبکر رضی اللہ عنہ واما کان اسلا  
یوم الطائف بعد فتح مکة وبعد حنین۔  
یہ فعل اور عمل آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا  
آخری عمل ہے کیونکہ اس میں ابوبکرؓ موجود اور حاضر تھے۔  
اور وہ فتح مکہ اور حنین کے بعد طائف کے دن مشرف باسلام  
(محل جلد ۲۲ جلد ۲۲) ہوئے تھے۔

اس صحیح اور مرفوع حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہوئی کہ امام کے ساتھ رکوع میں ملنے والے  
کی وہ رکعت صحیح ہے۔ اگر اس پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہوتا، جیسا کہ فریق ثانی کا زعم ہے تو یقیناً  
اس رکعت کا اعتبار نہ ہوتا اور فریق ثانی کے دعویٰ کے مطابق کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں  
سورۃ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ (بلفظ جیسا  
کہ سخن ہائے گفتنی میں عرض کیا جا چکا ہے) یہ نماز بھی کالعدم اور باطل ہونی چاہتے تھے۔ عیاذ اللہ  
تعالیٰ۔

تجکیر تحریر میں احناف کے نزدیک اتنا قیام جس میں تجکیر تحریر ادا ہو سکے فرض ہے۔ جب فرض  
ہے تو حضرت ابوبکرؓ پر یہ فرض کیسے غفی رہا پس لازمی امر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے بحالت قیام ہی تجکیر تحریر ادا  
کی ہوگی، مولف خیر الکلام کا (ص ۲۵۳) میں یہ کہنا کہ ابوبکرؓ نے قیام میں تجکیر کہہ کر رکوع کیا ہوگا۔ ایک فرضی  
(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) دلیل ہے کہ مدرک رکوع مدرک رکعت ہے۔ ورنہ یہ اکابر اس کی زحمت ہرگز گوارا نہ کرتے  
(بمعناہ) اور امام بیہقیؒ نے حضرت ابوبکرؓ سے ایک مرفوع روایت بھی نقل کی ہے کہ جس نے امام کے ساتھ  
رکوع پالیا۔ اس نے وہ رکعت پالی۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۹۰) اس روایت کی سند میں یحییٰ بن ابی سلیمان  
ہے جو متکلم فیہ ہے لیکن امام حاکم اور علامہ ذہبیؒ ان کی ایک سند کے بارے میں لکھتے ہیں کہ صحیح ولم یندکرہ جرح  
(مستدرک جلد ۳ ص ۲۷۳) اور دوسرے مقام پر امام حاکمؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقافت بصرین میں تھے۔ اور  
علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (مستدرک جلد ۳ ص ۲۱۶) اسی مضمون کی ایک اور مرفوع  
حدیث بھی امام بیہقیؒ نے نقل کی ہے۔ اور حضرت ابن مسعودؓ اور ان کے ساتھیوں کا بھی اسی پر عمل تھا۔  
(ادب المفرد ص ۱۵۳)



بات ہے۔ بالکل غلط ہے۔ یہ فرضی بات نہیں ایک واضح اور کھلی حقیقت ہے اور اس کا انکار کرنا بے سود ہے۔

دسویں حدیث : امام ابن ماجہ فرماتے ہیں کہ ہم سے علی بن محمد نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے وکیع نے بیان کیا۔ وہ اسراہیل سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابواسحاق (السبیعی) سے اور وہ ارقم بن شریح سے اور وہ حضرت ابن عباس سے (ایک طویل حدیث میں جن کا ضروری خلاصہ یہ ہے) روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ کو آپ نے امامت سپرد کی تاکہ وہ لوگوں کو نماز پڑھایا کریں۔ ایک مرتبہ آپ کو خیال ہوا کہ میں باجماعت نماز ادا کروں۔ پہلے آپ کو تکلیف زیادہ تھی۔ پھر جب مرض میں تخفیف ہوئی۔ تو آپ دو آدمیوں کے سہارے پر آہستہ آہستہ چل کر مسجد میں پہنچے۔ امام ابن ماجہ صاحب السنن (المتوفی ۲۴۳ھ) علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ الکبیر لکھتے ہیں۔ ابویعلیٰ الحمیلیؒ ان کو ثقہ کبیر اور متفق علیہ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۸۹)

۱۱ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ حافظ، الثبت، محدث اور عالم قزوین تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۹)  
۱۲ وکیع، الامام، الحافظ، الثبت، محدث العراق اور احد الائمة الاعلام تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۸۲) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ حافظ اور عابد لکھتے ہیں۔ (تقریب ص ۳۸۵)  
۱۳ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے بلاوجہ لوگوں نے ان میں کلام کیا ہے۔ (ایضاً ص ۳۲) امام احمد، علی، یعقوب بن شیبہ، ابو حاتم، ابن نمیر، ابن سعد اور نسائی سب ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ ابن حبان ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۹۲) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، الحجۃ، صالح، خدا ترس اور علم کا ظرف تھے جن لوگوں نے ان میں کلام کیا ہے۔ ان کا قول مردود ہے۔ امام بخاریؒ و مسلم نے ان سے احتجاج کیا ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۹)

۱۴ ان کا ترجمہ حدیث نمبر ۶ میں نقل ہو چکا ہے۔

۱۵ محدث ابو زرعہ اور ابن سعد ان کو ثقہ، اور ابن عبد البر ان کو ثقہ اور جلیل القدر محدث کہتے ہیں۔ ابن حبان ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۹۸) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔

(تقریب ص ۲۵)

اور آپ کے پاؤں مبارک زمین پر گھسٹتے جاتے تھے۔ اس سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نماز شروع کر چکے تھے۔ اور ایک حد تک قرأت بھی کر چکے تھے۔ غرضیکہ آپ صفوں میں سے گزرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں جا پہنچے چنانچہ وہ پیچھے ہٹ آئے اور ان کی جگہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور بلٹھ کر نماز پڑھائی۔ چونکہ آپ بیماری کی وجہ سے بلند آواز سے بول نہیں سکتے تھے۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں تک آواز پہنچانے میں بکتر کافر یضہ انجام دیا اور جب آپ پہنچے تو واخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من القراءة من حیث کان بلغم ابوبکر یرض۔ قرأت کر چکے تھے۔

(ابن ماجہ ص ۸۸ و مسند احمد جلد ۱ ص ۲۳۲)

اور ایک روایت میں (جو اس روایت کے لیے بطور شاہد اور تائید کے نقل کی جاتی ہے) یوں ہے: فقرا من المكان الذی بلغ ابوبکر یرض۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سورت کے اس من السورة۔ (مسند احمد جلد ۱ ص ۲۹) مقام سے قرآن شروع کی جہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔

اور ایک روایت میں اس طرح ارشاد ہوا ہے:

فاستفتح النبی صلی اللہ علیہ وسلم من حیث انتہی ابوبکر یرض من القرآن۔ اور جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن کے اس حصہ سے قرأت شروع کی جس تک حضرت (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۸۱ و مسند احمد جلد ۱ ص ۲۳۲) ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔

اور ایک روایت میں اس طرح آیا ہے:

فاستقر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حیث انتہی ابوبکر یرض من القراءة... الخ کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں سے قرأت پوری کی جہاں تک حضرت ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔ (طحاوی جلد ۱ ص ۱۹۷)

یہ روایت سند کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے۔ اس کا ایک ایک راوی ثقہ ہے جیسا کہ آپ لے یہ روایت طحاوی جلد ۱ ص ۲۳۵ مشکل الآثار جلد ۲ ص ۲۷۷، طبقات ابن سعد جلد ۱ ص ۱۳۱ نصب الرایۃ جلد ۲ ص ۱۵۱ اور فتح الباری جلد ۲ ص ۱۲۵، دارقطنی ص ۱۵۳ وغیرہ میں مذکور ہے اور ازالۃ الخفا جلد ۱ ص ۱۱۱ میں ہے واخرجه ابو یعلیٰ الموصلی فی مسندہ... الخ



ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اور مؤلف خیر الکلام کو بھی اس کا اقرار ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ روایات مکررہ بالاکے روایت ثقہ ہیں<sup>۲۵۹</sup>۔ الخ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ مسند احمد اور ابن ماجہ کی سند قوی ہے۔ (فتح الباری جلد ۵ ص ۶۷۹) چونکہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بیمار تھے، جلدی جلدی چلنا آپ کے لیے دشوار تھا اور دو آدمیوں کے سہارے آپ مسجد میں پہنچے، حتیٰ کہ آپ کے پاؤں مبارک زمین پر گھسٹتے جاتے تھے اور نماز آپ کے تشریف لانے سے قبل ہی شروع ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سورۃ فاتحہ مکمل پڑھ چکے ہوں گے اور ان حالات کے پیش نظر یہی بات قرین انصاف ہے۔ اور اس میں تو ذرا برابر شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ سورۃ فاتحہ اگر مکمل نہ ہوتی ہوگی تو اس کا اکثر حصہ تو یقیناً پڑھا جا چکا ہوگا۔ اور آپ نے وہیں سے اور اُس آیت سے قرأت شروع کی جہاں تک حضرت ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے اور جن کے نزدیک سورۃ فاتحہ مقتدی پر لازم ہے۔ وہ سب سورۃ فاتحہ کے لزوم کے قائل ہیں اور جو منکر ہیں وہ بھی۔ سب سورۃ فاتحہ کے منکر ہیں۔ اس میں قائل بالفصل کوئی بھی نہیں الغرض آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوری سورۃ فاتحہ چھوٹ گئی تھی یا اس کا اکثر حصہ مگر باوجود اس کے آپ کی نماز ادا ہو گئی۔ اور آپ نے اس نماز کو صحیح اور درست سمجھا، نہ آپ کی نماز کا عدم ٹھہری اور نہ باطل اور بیکار (عیا ذی اللہ تعالیٰ) اگر ہر رکعت میں امام کے

لہ اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں واسنادہ حسن (فتح الباری جلد ۲ ص ۱۳۸)

لے قاضی شوکانی کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے پوری فاتحہ چھوٹ چکی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ کیا بعید ہے کہ جس رکعت میں آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو پالیا تھا۔ اس رکعت کے علاوہ باقی سب رکعتوں میں آپ نے پوری اور مکمل سورۃ فاتحہ پڑھی ہو، آگے لکھتے ہیں:

لان النزاع انما هو فی وجوب الفاتحة کیونکہ سورۃ فاتحہ کے ہر رکعت میں وجوب جھگڑا فی جملة الصلوة لا فی وجوبها فی کل رکعة۔ نہیں ہے بلکہ سورۃ فاتحہ کے جملہ نماز میں وجوب جھگڑا اور نزاع ہے۔ (نیل الاطوار جلد ۲ ص ۱۴)

علامہ عبدالرحمن جزائریؒ لکھتے ہیں کہ مقتدی پر فرض ہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھے مگر جس صورت میں امام ساری فاتحہ یا اس کا کچھ حصہ پڑھ چکا ہو تو اس صورت میں امام اس کا متحمل ہو جاتا ہے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پیچھے اقتدا کر نیوالے پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا لازم اور ضروری ہوتا تو آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ نماز ہرگز صحیح نہ ہوتی ؟ حلالانکہ آپ کی یہ نماز بالکل صحیح تھی اور امام شافعیؒ و حافظ ابن حجر وغیرہ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ بیماری کے دنوں میں آپ نے صرف یہی ایک نماز جماعت سے ادا کی تھی۔ اور اس لحاظ سے آپ کے اس آخری فعل اور عمل سے بھی یہ حکم آشکارا ہو گیا کہ

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) (فقہ المذہب الاربعہ، جلد ۱ ص ۲۲۹) اور مولف خیر الکلام نے بھی یہ حوالہ نقل کیا ہے (دیکھئے صفحہ ۴۳) اور خود مولف مذکور لکھتے ہیں کہ جو لوگ فاتحہ خلف الامام کو فرض سمجھتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے ہاں رکوع میں شامل ہونے سے رکعت ہو جاتی ہے اور ان میں سے بعض اس طرف بھی گئے ہیں کہ جہری نمازوں میں اگر مقتدی پوری فاتحہ یا آدھی فاتحہ کے بعد آئے تو اس سے ساری فاتحہ یا آدھی فاتحہ ساقط ہو جاتی ہے۔ (خیر الکلام ص ۴۵۹) قاضی صاحب اور مولف خیر الکلام نے تو اس طرح کو خلاصی کر کے وقت پاس کر لیا ہے۔ لیکن تمام دنیا کے علماء احناف کو کھلا چیلنج اور انعامی چیلنج کرنے والے تو ہر ہر رکعت میں قرأت فاتحہ کو ضروری سمجھتے ہیں۔

۲۵ فتح الباری جلد ۲ ص ۱۳۵۔

۱۸۵۔ کتاب الامام جلد ۲ ص ۱۸۵۔

۳۷ روایات اور محدثین کا اس باب میں شدید اختلاف ہے کہ مرض الموت میں آپ نے مسجد میں باجماعت ایک نماز پڑھی تھی یا دو ؟ یہ نماز جہری تھی یا سری ؟ آپ امام تھے یا مقتدی ؟ وغیرہ وغیرہ صحیح یہ ہے کہ یہ ایک ہی نماز تھی جیسا کہ امام شافعیؒ وغیرہ نے فرمایا ہے اور یہ ظہر کی نماز تھی (بخاری جلد ۲ ص ۴۹۳) مولف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ ظہر میں قرأت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ سری نماز ہے .... الخ (ص ۴۹۵) بالکل مردود ہے۔ سری نمازوں میں قرأت ہوتی ہے جہر نہیں ہوتا ایک آدھ آیت کو قدرے آواز سے پڑھ لینا سر کے خلاف نہیں۔ مولف خیر الکلام نے محض اپنی گاڑی چلانے کے لیے قرآن کو نماز پر چل کیا ہے جو بالکل بے دلیل ہے اور ان بالا دلائل سے آنکھیں بند کر کے وہ یہ لکھتے ہیں کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ابتداء ہی سے امام تھے جو بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی صحیح روایت صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ الذی توفی فیہ خلف ابی بکر رضی اللہ عنہ قاعدًا اجوا پر گزر چکی ہے بالکل اس کے خلاف ہے اور یہ بھی صحیح روایت میں موجود ہے کہ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بیٹھنے لگے تو آپ نے اشارہ فرمایا کہ پیچھے مت بیٹھو، مگر ابتداء سے



مقتدی پر سورۃ فاتحہ لازم نہیں ہے۔ امام بخاریؒ کے حوالہ سے آئے گا کہ یہ نماز ظہر کی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ستری نمازوں میں بھی امام کے پیچھے قرأت ترک کرنا نہ صرف یہ کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مطابق ہے بلکہ آپ کا آخری عمل بھی یہی ہے۔ امام بخاریؒ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

انہا یؤخذ بالآخر فالآخر من فعل النبی یعنی آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جو آخری عمل صلی اللہ علیہ وسلم۔ (بخاری جلد ۱ ص ۹۶) ہوگا۔ قابل عمل صرف وہی ہوگا۔

(بقیہ جاشیہ پچھلا صفحہ) امامت کا ارادہ ہوتا تو ایسا نہ فرماتے، ہاں اس کے بعد آپ نے امامت کا فریضہ ادا کیا ہے اور امام طحاوی وغیرہ کی بھی یہی مراد ہے کہ آپؐ بالآخر امام تھے اور ابتدا میں آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدار کی تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں یوں آتا ہے: صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ الذی توفی فیہ خلف ابی بکر رضی اللہ عنہ کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدار میں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ (نسائی جلد ۱ ص ۱۲، طحاوی جلد ۱ ص ۲۳، بیہقی جلد ۳ ص ۸۶، ترمذی جلد ۱ ص ۴۲، محلی ابن جریر جلد ۳ ص ۶۷، ترمذیؒ فرماتے ہیں حسن صحیح) اور امام بخاریؒ (جلد ۱ ص ۹۶) نے یہ باب قائم کیا ہے۔ باب من قام الی جنب الہ ماہ لعلۃ اور امام نوویؒ (جلد ۱ ص ۱۶۹) نے باب استغلافا الہ ما اذا عرض لہ عذر اور امام نسائیؒ (جلد ۱ ص ۱۲) نے باب حملۃ الہ ما خلف رجل من رعیۃ قائم کر کے اور یہ حدیث اس باب میں نقل کر کے اس امر کو مبرا بنایا ہے۔ یہ دلائل بھی ملاحظہ ہوں اور قاضی مقبول احمد صاحب کی یہ تعلی بھی دیکھیں کہ کیا مولانا سرفراز صاحب کسی حدیث سے ثابت کر سکتے ہیں کہ آپؐ پہلے بطور مقتدی شامل ہوئے تھے؟ ہرگز نہیں۔۔۔۔۔ الخ الاعتصام ۱۶ (نومبر ۱۹۶۲ ص ۶) اور پھر جب حضرت ابوبکرؓ کو آپؐ کی آمد کا علم ہوا تو خود پیچھے بیٹھ گئے۔ اور آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنی جگہ پر بٹھا دیا اور آپؐ نے وہیں سے قرأت شروع کی۔ جہاں تک حضرت ابوبکرؓ پڑھ چکے تھے اور صدیقؓ نے بکر کا فریضہ ادا کیا (دیکھئے نووی جلد ۱ ص ۱۶۹، فتح الباری جلد ۱ ص ۱۲ وغیرہ) اور یہی بات صحیح اور صواب ہے و لیس وراء عبادان قریۃ حافظ ابن حجرؒ نے الفاظ حدیث کے ظاہری تعارض کی وجہ سے تعدد واقعہ کو الصواب کہا (الدرایہ ص ۱۰۰) مگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو واقعہ صرف ایک ہی ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ کے حوالہ سے عرض کیا گیا ہے تطبیقی آسانی سے ہو سکتی ہے اور تعدد واقعہ کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

الحمد للہ تعالیٰ کہ جس طرح جہور کا مسلک متعدد صحیح و مرفوع قولی حدیثوں سے حق ثابت ہو چکا ہے اسی طرح آپ کے آخری عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس روایت سے متعلق فریق ثانی کی طرف سے جو اعتراضات وارد کئے گئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نقل کر کے ان کے جوابات بھی عرض کر دیے جائیں۔

**پہلا اعتراض:** مولانا مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ابواسحاق السبئی واقع ہیں اور وہ مدلس تھے اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ علاوہ بریل خمر عمر میں وہ اختلاط کا شکار بھی ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کی روایت کارآمد نہیں ہو سکتی۔ (ا) و کما قال تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۷ وغیرہ) اور یہی عذر لنگ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے کہ ابواسحاق رحمہ اللہ تیسرے درجے کے مدلس ہیں جن کی روایت بدول تصریح سماع مقبول نہیں محصلہ خیر الکلام ص ۴۶، ۴۷) مگر بخاری میں ان کی معنعن حدیثوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ تاقیامت دے بھی نہ سکیں گے۔

**جواب:** حضرت قتادہ کی تدلیس کے ضمن میں حضرات محدثین کرام کا یہ ضابطہ نقل کیا جا چکا ہے کہ تدلیس کر نیوالے راویوں کا ایک گروہ وہ بھی ہے جن کی تدلیس کسی طرح مضر نہیں ہے اور مثلاً ان کی معنعن حدیثوں کو بھی صحیح سمجھتے ہیں، جن میں خصوصیت سے ابواسحاق السبئی کا نام بھی پیش کیا گیا ہے۔ رہا ابواسحاق السبئی کی تخلیط کا سوال تو وہ بھی چنداں باعث تشویش نہیں ہے۔ کیونکہ علامہ بیہقی ناقد فن رجال لکھتے ہیں کہ وہ ائمہ تابعین رحمہم اللہ اور اثبات میں تھے، بڑھاپے کی وجہ سے ان پر کچھ نسیان طاری ہو گیا تھا۔ ولم یخلط (میزان الوعدہ جلد ۲ ص ۲۹۳) لیکن وہ محتاط نہیں ہوتے تھے۔ اور تصریح کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں ان سے صرف ابن عیینہ نے سماعت کی ہے اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ

قلت ما اختلط ابواسحاق ابداً وانما یعنی  
بذلك التخيير ونقص الحفظ۔ (تذکرہ ۱) ۲۱۵  
میں کہتا ہوں کہ ابواسحاق تخلیط سے کبھی دوچار نہیں تھے۔ ہاں ان کے حفظ میں کچھ تغیر اور نقص واقع ہو چکا تھا۔  
اور فن اصول حدیث کا یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ معمولی و سہم تغیر لیسیر اور نسیان کی وجہ سے ثقل و  
لہ امام عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ وہیم سے کون بچ سکا ہے؟ (لسان المیزان جلد ۱ ص ۱) امام احمد فرماتے



کی روایتوں کو ہرگز رد نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال ابوالسحاق السبئی کی تدلیس اور تخیل کا بہانہ کر کے ان کی صحیح روایت کو رد کرنا سراسر باطل ہے۔

بعض محدثین (جن میں حافظ ابن حجر وغیرہ بھی ہیں) اختلاط وغیرہ کا لفظ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن صرف لغوی اور عمومی معنوں میں جس سے ان کی ثقاہت اور عدالت پر کوئی دھبہ نہیں لگ سکتا اور اسی لیے وہ ان کی روایت کی تصحیح اور تحسین کرتے ہیں۔ مگر مبارکپوری صاحب

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ہیں کہ امام بخاری بن سعید بخاری کا محدث تھے اور بہت کم خطا ان سے سرزد ہوتی تھی۔ مگر باوجود اس کے چند حدیثوں میں ان سے بھی خطا ہوئی ہے۔ آگے فرماتے ہیں: ومن يعزى من الخطاء والتصحييف (بخاری جلد ۱ ص ۱۲۷) یعنی متن اور سند میں خطا سے کون محفوظ رہ سکتا (بلکہ سکا) ہے، علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ ابوالحسن القطانؒ نے ہشام بن عروہؒ اور سہیل بن ابی صالحؒ پر جو تخیل کا الزام لگایا ہے وہ باطل ہے۔ ہاں ان کے حافظ میں کچھ نقص ضرور پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن کیا وہ نسیان سے معصوم تھے؟ پھر کیا ہوا؟ کیا اس قسم کا وہیم امام مالکؒ، امام شعبہؒ اور امام وکیعؒ وغیرہ اکثر ائمہ اور ثقات کو پیش نہیں آتا رہا؟ تو کیا ان کی روایتیں رد کر دی جائیں گی؟ خط چھوڑ دے اور ائمہ ثقات سے بدظنی نہ کر (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۵۵) محدث عقلیؒ نے امام علی بن المدینیؒ پر صرح کی تھی۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں: فما لك عقل يا عقلی اتدری فی من یعنی اے عقلیؒ تیری عقل کو کیا ہو گیا ہے؟ تو کس امام تکلم۔ میں کلام کر رہا ہے۔

پھر آگے جو شرح تحریر میں آکر عقلیؒ سے ملتی جلتی عقل والوں کو الٹی میٹم کرتے ہیں۔  
وانما اشتہی ان تعرفنی من هو الثقة الثبت میں چاہتا ہوں کہ میرے سامنے تم کسی ایسے ثقہ کا نام تو ذرا بہت کر کے پیش کرو جس سے غلطی سرزد نہ  
الذی ما غلط۔

(میزان جلد ۲ ص ۲۳۱) ہوئی ہو

اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ کبھی کبھی غلطی کا ہو جانا یہ کوئی ایسا اعتراض نہیں جس سے حدیث

ضعیف ہو جائے پس یہ حدیث صحیح ہے .... الخ ص ۳۰۶۔

اگر وہیم اور اختلاط کی مزید تحقیق مطلوب ہو تو دفع المغیث ص ۱۳۱ وغیرہ اصول حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے۔  
لہ (حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اس قاعدہ سے فاضل اور بے خبر ہیں اور خواجہ خواہ ان کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔  
 دوسرا اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اسرائیل بن یونس نے  
 ابواسحاق السبئی سے روایت کی ہے اور ان سے اسرائیل کی سماعت اختلاف کے بعد  
 ہوئی تھی۔ لہذا یہ روایت قابل توجہ نہیں (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۸۷)

جواب: یہ اعتراض بھی مردود ہے۔ اولاً۔ اس لیے کہ ابواسحاق اس اصطلاحی  
 تخلیط کا تو کبھی شکار ہی نہیں ہوئے جس کے سبب ان کی روایت کمزور اور ضعیف سمجھی  
 جاسکے اور ان کے معمولی وہم اور تغیر حفظ سے ان کی حدیث کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔  
 اس لیے اگر اسرائیل کی سماعت ابواسحاق کے لغوی اختلاف یا نقص حفظ کے بعد بھی ہو۔  
 تو اس کا اثر اور فرق کیا نکالے گا؟ ثانیاً۔ امام ترمذی لکھتے ہیں کہ ابواسحاق کے جملہ تلامذہ  
 میں اسرائیل ابواسحاق کی روایتوں میں اصح اثبت اور احفظ واقع ہوئے ہیں (جلد ۱ ص ۱۹۹)  
 امام ابن ہمدانی کا بیان ہے کہ اسرائیل کو اپنے دادا ابواسحاق کی جملہ روایتیں اس طرح  
 یاد تھیں جیسا کہ مسلمانوں کو سورۃ فاتحہ یاد ہوتی ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۹ و قلہ لیلہ التالیف)

جلد ۱ ص ۱۹۱) علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ اسرائیل صحیحین کے راوی ہیں۔ و ہو فی الثبت  
 کلامہ سطرانۃ۔ یعنی وہ حدیث کے بیان کرنے میں ایسے مضبوط تھے، جیسے ستون۔ السبۃ ہاں  
 امام شعبان سے زیادہ ثبت تھے لیکن ابواسحاق سے روایت کرنے میں اسرائیل امام شعبہ  
 سے بھی زیادہ ثبت تھے۔ (میزان جلد ۱ ص ۹۸) اور تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۵۲ میں ایک حدیث  
 کے بارے میں جس میں اسرائیل عن ابی اسحاق... الخ ہے فرماتے ہیں اسناد قوی امام دارقطنی  
 نے حافظ ابن حجر نے اس روایت کی ایک جگہ تصحیح (فتح الباری جلد ۵ ص ۲۶۹) اور دوسری جگہ تحمیں  
 کی ہے (جلد ۲ ص ۱۲۵) اور مبارک پوری صاحب کی بڑی ہی سعادت ہے کہ ان کو حافظ صاحب کی صرف  
 تحمیں ہی ملی ہے اور اس پر بھی وہ بڑے ناراض ہیں۔ اگر ان کی تصحیح بھی مل جاتی تو نہ معلوم ان پر کیا گذرتی؟  
 مگر ازراہ بزرگی یہ نہ سوچا کہ ابواسحاق رم کی تدلیس مضر ہے اور نہ نقص حفظ اور تغیر کی وجہ سے ان کی  
 حدیث ضعیف ہے بلکہ ان کی روایت اصول حدیث کے رُوسے بہر حال صحیح ہے۔ لا شک فیہ۔



کا بیان ہے کہ امام عید الرحمن بن محمدؒ نے فرمایا کہ ابواسحاقؒ کی روایتوں میں اسرائیلؑ امام شعبہؒ اور سفیان ثوریؒ سے بھی زیادہ ثقہ تھے۔ (دارقطنی جلد ۲ ص ۳۸۱) اور تقریباً یہی مضمون حافظ ابن حجرؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ (درایہ صفحہ ۲۲ و تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶۲) مولانا شمس الحق صاحب امیرؒ عن ابی اسحاقؒ.... الخ کی روایات کے بارے میں یہ فیصلہ درج کرتے ہیں کہ کلاماً صاحب حق التعلیق المغنی جلد ۲ ص ۳۸۱) اور حافظ ابن حجرؒ اسرائیلؑ عن ابی اسحاقؒ.... الخ کی سند کی تصحیح کرتے ہیں۔ حافظ ابن القیمؒ، ابواسحاقؒ کے تمام تلامذہ اور اصحاب میں اسرائیلؑ کو اتقن لکھتے ہیں۔ (زاد المعاد جلد ۲ ص ۳۳۶) اور لطف بالائے لطف یہ ہے کہ مبارک پوری صاحبؒ نے تحقیق الکلام اور ابکار المن میں جوش جوانی میں سب ان پشناپ لکھ مارا ہے۔ لیکن جب تحفۃ الاحوذی لکھنے کی باری آئی اور عقل اور علم میں پختگی ہو گئی اور اپنی ذمہ داری کا گہرا احساس ہوا تو اس قاعدہ کے لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ اسرائیلؑ ابواسحاقؒ سے روایت کرنے میں امام شعبہؒ اور سفیان ثوریؒ سے بھی زیادہ قوی اور ثبت تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۲ ص ۱)

اب انصاف شرط ہے کہ ہم مبارک پوری صاحبؒ کی اس سے بڑھ کر اور کیا تسلی کر سکتے ہیں ؟  
والثالث۔ اس روایت میں اسرائیلؑ کے ایک اور ثقہ اور ثبت متابع بھی موجود ہیں جن کا نام ذکر کیا بن ابی زائدؒ ہے۔ چنانچہ عبد اللہ بن احمدؒ اپنے والد امام احمد بن حنبلؒ سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ یحییٰ بن مثلاً دیکھتے فتح الباری جلد ۶ ص ۴۵۸ و جلد ۷ ص ۵۰ وغیرہ۔ اگر مبارک پوری صاحبؒ اور ان کے اتباع کے نزدیک اسرائیلؑ عن ابی اسحاقؒ.... الخ کی سند ضعیف اور کمزور ہے تو ازراہ کرم بخاری (مثلاً جلد ۱ ص ۵۱، جلد ۲ ص ۳۹۲، جلد ۳ ص ۲۵۹ و ۲۶۰ وغیرہ) اور مسلم کی تمام حدیثوں پر قلم پھیریں۔ کیونکہ ان میں ابواسحاقؒ کا اختلاط کار فرما ہوگا۔ قاضی نقوی صاحب ان کو نسبان کا مرض لگا کر وہی قرار دیتے ہیں۔ (دیکھیے الاعتصام ص ۱۶ نومبر ۱۹۶۲ء) لہذا بخاری اور مسلم سے اس وہی کی سب روایتیں نکال دیں۔ ملاحظہ کیجئے کہ غیر مقلدین کے تعصب اور گروہ بندی کی وجہ سے صحیحین کی کتنی احادیث غیر صحیح قرار پاتی ہیں۔ نعوذ باللہ تعالیٰ من شر و انفسنا۔

۳۔ اس سند کے باقی راویوں کی قرین پہلے نقل کی جا چکی ہے یحییٰ بن ابی زکریاؒ کو حافظ ابن کثیرؒ من الائمة الثقات لکھتے ہیں۔ (الہدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۱۸۴) علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ، الثبت، اتقن اور الفقیہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۴۶) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور متقن تھے۔ (تقریب ص ۳۹۱)

بن ابی زکریا سے اور وہ زکریا بن ابی زائدہؓ سے اور وہ ابواسحاق السبیعیؓ سے اور وہ ارقم بن شریکؓ سے اور وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حدیث کا وہی مضمون ہے جو پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ (مسند احمد جلد ۱ ص ۳۳) جب اسرائیلؑ خود اوثق اور اثبت ہیں اور ان کا متالاج بھی ثقہ اور ثبت ہے تو پھر ان کی روایت کیوں صحیح نہیں ہے؟ الغرض نہ تو یہ روایت فساد ہے جیسا کہ ازہ اعتصام ۱۹ نومبر ۱۹۶۷ء ص ۶۱ میں اس پر بلاوجہ زور لگا تعصب کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور نہ یہ مرجح اور بخاری کی روایت راجح ہے۔ راجح اور مرجح کا سوال تعارض کے وقت ہوتا ہے۔ جب دونوں میں تعارض ہی نہیں تو راجح و مرجح کا سوال بالکل بیکار ہے دونوں صحیح ہیں۔ ایک مجمل ہے اور دوسری مفصل ہے جس میں زیادت ثقہ ہے۔ جو باتفاق جملہ محدثین کرام قابل قبول ہے۔

### حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا شاہد:

اسد بن موسیٰ اپنی کتاب فضائل صحابہ میں فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو معاویہؓ نے بیان کیا۔ وہ

علامہ ذہبیؒ ان کو صداقت شعار مشہور اور حافظ لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۱ ص ۳۴) امام عجلؒ ابو زرعہ، ابو داؤد، نسائی، یعقوب بن سفیان اور ابویزید سب ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ امام قسطلانیؒ ان کو اباس بہ اور ابن معینؒ صالح لکھتے ہیں امام احمدؒ ان کو ثقہ اور حلو الحدیث اور علامہ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث لکھتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۳۳) غرضیکہ اس سند کے بھی جلد روایات ثقہ اور ثبت ہیں۔

علامہ بخاریؒ اسد بن موسیٰ کو مشہور الحدیث اور امام نسائیؒ اور ابن یونسؒ ثقہ لکھتے ہیں۔ خلیلؒ ان کو صالح لکھتے ہیں اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶) مولانا شمس الحق صاحبؒ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور صدوق تھے (الفتح جلد ۱ ص ۵۸) امام حاکمؒ اور علامہ ذہبیؒ ایک سند کو جس میں اسد بن موسیٰ ہے علی شرط مسلم صحیح لکھتے ہیں (مستدرک مع التخصیص جلد ۱ ص ۳۹)

سے مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ مجھے کتب اسماء الرجال میں ان کا پتہ نہیں مل سکا۔ نہ معلوم وہ کون اور کیسا؟ اگر ایسے مشہور اور ثقہ محدث کا پتہ بھی مبارک پوری صاحبؒ کو نہیں مل سکا تو ان کو کیا ملے گا؟ ان کا نام محمد بن خازم اور لقب ضریر تھا۔ حافظ ابن کثیرؒ ان کو احمد شاخ الحدیث الثقات المشہورین لکھتے ہیں۔ (المبداہ والنہایہ جلد ۱ ص ۲۳) علامہ ذہبیؒ ان کو احاد لائتہ الاعلام الثقات (میزان جلد ۳ ص ۳۸۲) اور ثقہ اور ثبت لکھتے ہیں (میزان جلد ۲ ص ۹۹) امام عجلؒ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)



عبدالرحمن بن ابی بکر سے اور وہ ابن ابی ملیکہ سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ اس حدیث کا بعینہ مضمون وہی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں گزر چکا ہے (حافظ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری جلد ۲ ص ۱۴۲ میں نقل کیا ہے)

تیسرا اعتراض: مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں اضطراب ہے کیونکہ پیش کردہ سندوں میں عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم.... الخ ہے۔ (بقیہ پچھلا صفحہ) یعقوب بن سفیان اور نسائی ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ ابن خراشؒ ان کو صدوق لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور متقن تھے۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۳۷) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ (تقریب ص ۳۱۸) علامہ خطیبؒ نے ان کا پورا ترجمہ نقل کیا ہے (بغدادی جلد ۵ ص ۲۴۲)

لے جو محدثین واقعی ان کی تضعیف کرتے ہیں مگر ابن عدیؒ لکھتے ہیں کہ ان کی حدیثیں لکھی جاسکتی ہیں۔ امام ساجیؒ ان کو صدوق لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان میں ضعف ہے مگر قابل برداشت ہے۔ فیہ ضعف یحتمل۔ ابن حبانؒ ان کی توثیق کی طرف مائل ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں ینفرد عن الثقات ما لا یشبہ حدیث الہ ثبات یعنی وہ ثقہ راویوں سے ایسی روایات میں منفرد ہوتے ہیں جو اثبات یعنی ثقہ اور ثبت راویوں کی روایات کے مشابہ نہیں ہوتیں کم ہوتی ہیں۔

(تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۱۴۶) امام ابن معینؒ نے ان کو ضعیف ابو حاتم نے یس بقوی فی الحدیث اور نسائی نے یس ثقہ اور متروک الحدیث کہا ہے لیکن مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۷ و ص ۴۸ میں الرفع والتکمیل ص ۸ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ جرح مفسر نہیں اور عام فقہاء اور محدثین کے نزدیک اس کا اعتبار نہیں۔ (محصلہ) البتہ امام بخاریؒ اور امام احمدؒ نے اس راوی کو منکر الحدیث کہا ہے۔ (تہذیب جلد ۶ ص ۱۴۶) لیکن مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اگر امام بخاریؒ کسی راوی کو منکر الحدیث کہیں تو اس سے روایت کرنا ان کے ہاں جائز نہیں۔ امام احمدؒ اور اس قسم کے لوگ کسی کو منکر کہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ قابل احتجاج نہیں ہے۔ (بلفظہ ص ۴۹) اور ہم نے تو ان کو صرف شاہد کے طور پر پیش کیا ہے کہ بطور احتیاج کے۔ اور مؤلف خیر الکلام ایک مقام میں لکھتے ہیں کہ ان (آثار) کے بعض راوی اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی حرج نہیں ہے۔ (بلفظہ ص ۳۱۶)

۴ ذہبی ان کو امام فقیہ حجت فصیح اور بلند مرتبہ لکھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ان کی ثقاہت پر سب کا اتفاق اور اجماع ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۹۶)

اور مسند بزرگ کی روایت میں عن ابن عباس عن ابیہ العباس عن النبی ص ..... الخ اس لیے یہ روایت قابل احتجاج نہیں ہو سکتی۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۵۳)

**جواب :** مبارکپوری صاحب کو لفظ اضطراب تو آتا ہے، مگر افسوس کہ وہ حقیقت اضطراب سے ناواقف ہیں۔ محدثین کرام کے نزدیک اضطراب کی چند شرطیں ہیں۔ ایک شرط یہ ہے کہ دونوں سندیں ہم پایہ اور ہم مرتبہ ہوں ورنہ اضطراب نہ ہوگا۔ صحیح قابل اخذ ہوگی اور ضعیف قابل رد ہوگی۔ (دیکھیے شرح منجۃ الفکیر ص ۶۴ وغیرہ) اور ہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی جو سندیں بیان کی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں اور ایک ایک راوی ثقہ اور ثبت ہے اور مسند بزرگ کی روایت میں قیس بن ربیع واقع ہے۔ امام بخاریؒ کا بیان ہے کہ امام وکیعؒ ان کو ضعیف کہتے تھے۔ (ضعفاء ص ۲۶) امام نسائیؒ اس کو مترک الحدیث کہتے ہیں (ضعفاء صغیر نسائی ص ۵۱) امام ابو حاتمؒ اور امام سبکیؒ اس کو لیس بالقوی اور ضعیف کہتے تھے۔ امام احمدؒ اس کو کثیر الخطا اور ابن مدینیؒ و دارقطنیؒ اس کو ضعیف کہتے تھے (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۱) اور لطف یہ ہے کہ خود

یہ روایت نصب الرایہ جلد ۲ ص ۱۵۳ میں بھی ذکر کی گئی ہے۔ اور مسند احمد جلد ۱ ص ۲۰۹، اور دارقطنی جلد ۱ ص ۱۵۳ وغیرہ میں بھی آتی ہے۔

۱۔ اگر کوئی صاحب حضرت ابن عباسؓ کی کم سنی کا بہانہ کرتے ہوئے ان کی روایت کے مرسل ہونے کا دعویٰ کرے تو یہ بھی باطل ہوگا کیونکہ اگر بالفرض حضرت ابن عباسؓ کی روایت مرسل بھی ہو تب بھی حضرات صحابہؓ کے مراسیل بالاتفاق حجت ہیں جس کی پوری تفصیل اپنے مقام پر بیان ہوگی۔ انشاء اللہ العزیز۔ علاوہ بریں اس میں قدرے اختلاف ہے کہ اس حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت ابن عباسؓ کی عمر دس سال تھی یا پندرہ؟ مسند احمد جلد ۱ ص ۳۳۷ میں اور مستدرک جلد ۲ ص ۳۳۲ میں بسند قوی اور صحیح یہ روایت موجود ہے کہ آپؐ کی وفات کے وقت ان کی عمر پندرہ برس کی تھی اور اس کی امام نوویؒ (جلد ۱ ص ۱۹۶) وغیرہ نے ترجیح دی ہے اور یہ روایت مرض الموت کی ہے۔ اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی کم سنی وغیرہ کے بہانے سے ان کی روایت کو مرسل قرار دینا مردود اور باطل ہوگا اور بخاری جلد ۲ ص ۵۳۷ کی روایت سے آپؐ کی وفات حسرت آیات کے وقت ان کی عمر دس سال ثابت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔



مبارک پوری صاحب بھی اس کو ضعیف اور کمزور بتاتے ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱) اس لیے اس حدیث کے اضطراب کا دعویٰ قطعاً مردود اور باطل ہے۔ یہ حدیث بلاچون و چرا صحیح ہے۔ البتہ لا فاسلم کا کوئی جواب نہیں ہے۔

چوتھا اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں (اور اسی کو مؤلف خیر الکلام نے دوہرا ہوا ہے ملاحظہ ہو ص ۴۶۴) کہ اس روایت سے یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے سورۃ فاتحہ چھوٹ گئی اور مع ہذا آپ کی نماز درست ہو گئی بلکہ روایات سے ثابت ہے کہ آپ نماز پوری کیے بغیر حجرہ میں تشریف لے گئے تھے۔ تو یقیناً آپ نے وہاں نماز مکمل کی ہوگی اور اس دعویٰ پر یہ حدیث نقل کی ہے:

فما قضی النبی صلی اللہ علیہ وسلم الصلوۃ  
حتی ثقل فخرج یہادی بین الرجلین۔  
پس آپ نے ابھی نماز مکمل نہ کی تھی کہ آپ کے مرض میں  
اضافہ اور تیزی ہو گئی۔ سو آپ دو آدمیوں کا سہارا  
لے کر مسجد سے باہر تشریف لے گئے۔

اس میں حرف فار ہے جو تعقیب بلا ملہ کے لیے آتا ہے۔ لہذا اس روایت سے ترک قرأت

لے یہ روایت مشکل الآثار جلد ۱ اور المختصر ص ۴۹ و طحاوی جلد ۵ ص ۲۳۵ وغیرہ میں مروی ہے اور سنن الکبریٰ جلد ۳ ص ۸۱ کے الفاظ یہ ہیں فما قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصلوۃ حتی ثقل جداً فخرج یہادی بین الرجلین وان رجلیہ لتخطان الارض فمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یوص۔ سو آپ نے نماز پوری نہ کی تھی۔ حتیٰ کہ آپ پر بیماری کا غلبہ ہو گیا۔ پس آپ دو آدمیوں کے سہارے سے تشریف لے گئے اور آپ کے پاؤں مبارک زمین پر گھسٹتے جاتے تھے۔ پس آپ کی وفات ہو گئی اور آپ نے کوئی وصیت نہ کی۔ فمات میں بھی حرف فاء ہے۔ کیا مبارک پوری صاحب کی تحقیق میں مسجد سے نکلنے کے فوراً بعد آپ کی وفات ہو گئی تھی۔ یا چارہ پانچ دن کے بعد وفات ہوئی تھی؟ (دیکھئے البدایہ والنہایہ جلد ۵ ص ۲۳۵ وغیرہ) اگر ان کے نزدیک ہر مقام پر حرف فار تعقیب بلا ملہ کے لیے آتا ہے تو موارد اقمتم الی الصلوۃ فاغسلوا الایۃ میں اور اذا قرأت القرآن فاستعذ

باللہ میں اور اذا صلیتم علی النبی فاخلصوا الہ الدعاء میں اور تزوج فلان فولدہ وغیرہ  
مقامات میں کیا ارشاد فرمائیں گے؟ اور اگر ان مقامات میں حرف فاء تفصیل کے لیے ہے یا کسی اور مناسب  
(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

سورۃ فاتحہ کا مسئلہ اور بصورت ترک تکمیل نماز کا ادعا صحیح نہیں ہے۔ (بمعناہ تحقیق الکلاہ جلد ۲ ص ۱۷)

جواب: مبارک پوری صاحب کا یہ دعویٰ کہ ناکہ آپ نماز کی تکمیل کے بغیر مسجد سے باہر نکل کر تشریف لے گئے تھے نہ معلوم کس بات پر مبنی ہے؟ اس دعویٰ کا ثبوت تو کسی روایت سے نہیں مل سکتا۔ اس روایت سے تو اتنا ہی ثبوت ملتا ہے کہ نماز کی تکمیل سے قبل ہی آپ پر بیماری کا زور ہو گیا۔ اور اگر خُرج میں حرف فاء کو مبارک پوری صاحب تعقیب بلا حملہ کے لیے سمجھتے ہیں اور اس پر اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھتے ہیں تو یہ ان کو سراسر مضر پڑے گا۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ علاوہ بری اس کی تصریح موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ نماز ہی پوری کی، بلکہ حضرات صحابہ کرام کو نماز کے بعد خطاب بھی فرمایا تھا۔ چنانچہ ایک روایت میں یوں الفاظ آتے ہیں: **فصلیٰ لہم وخطبہم** آپ نے حضرات صحابہ کرام کو نماز پڑھائی اور ان سے خطاب فرمایا (بخاری ۲ ص ۸۵)

اور ایک روایت میں یوں آتا ہے:

**ثوخرج الی الناس فصلیٰ لہم وخطبہم۔** (بخاری ۲ ص ۸۹ وفتح الباری)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) معنی میں مستعمل ہوا ہے تو خُرج میں حرف فاء سے کوئی ایسا مناسب اور موزوں معنی کیوں نہیں لیا جاسکتا کہ دوسری صحیح روایات سے تعارض پیدا نہ ہو اور اگر مبارک پوری صاحب اس پر بضط ہیں کہ حرف فاء تعقیب بلا حملہ کے لیے ہی ہوتا ہے تو کامیابی پھر بھی جبرور کی ہوگی۔ کیونکہ قرآن کریم کی آیت **واذا قرأ القرآن فاستمعوا لہ... الاٰیۃ اور حدیث اذا قرأ الامام فانصتوا میں بھی ان کے اصول کے تحت حرف فار تعقیب بلا حملہ کے لئے ہوگا۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ امام کی قرأت مشروع کرنے کے فوراً بعد مقتدیوں پر استماع اور انصات واجب ہے۔ اور سمجھی جانتے ہیں کہ امام کی قرأت سورۃ فاتحہ سے شروع ہوا کرتی ہے۔ نہ کہ ما زاد علی الفاتحہ سے۔ لہذا مقتدیوں پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا منوع ٹھہرا۔ اور قرأت کو ما زاد علی الفاتحہ پر چل کرنے کی رٹ باطل ہوگئی۔**

خوش نوا یان جن کو غیب سے مزہ ملا  
دام میں صیاد اپنے مبتلا ہونے کو ہے



فرمایا۔

جلد ۱۰ ص ۱۲۰ و عمدۃ القاری جلد ۱۰ ص ۱۴۱

اس صحیح اور صریح روایت سے معلوم ہوا کہ آپ نے جماعت کے ساتھ نماز کی تکمیل کی۔ اور پھر حضرات صحابہ کرام سے خطاب بھی کیا۔ اور جو روایت مبارک پوری صاحب نے پیش کی ہے۔ اس سے ان کا مدعی ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا مفہوم تو صرف اتنا ہے کہ تکمیل نماز سے قبل ہی آپ کا مرض بڑھ گیا تھا۔ اور اس کا کون منکر ہے؟ اور نماز اور خطاب سے فارغ ہونے کے بعد آپ دو آدمیوں کے سہارے سے جیسے تشریف لائے تھے۔ ویسے ہی واپس تشریف لے گئے۔ اگر مبارک پوری صاحب یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ بجاالت نماز مرض بڑھ نہیں سکتا یا تکمیل نماز کے بغیر ہی دو آدمیوں کے سہارے پر گھر جانا ہی متحقق ہو سکتا ہے۔ تو ہماری بلا سے مبارک پوری صاحب جانیں اور ان کی سمجھ۔ بہر صورت مسئلہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آخری جماعت نماز میں سورۃ فاتحہ مکمل یا اس کا اکثر حصہ نہیں پڑھا تھا۔ معذرتاً آپ کی نماز صحیح ہو گئی تھی۔ وہو المطلوب۔

پانچواں اعتراض: مولوی محمد صادق صاحب سرگودھوی (غیر مقلد) لکھتے ہیں کہ اگر آپ نے امام ہونے کے باوجود سورۃ فاتحہ ترک کی تو حنفیہ بھی کہتے ہیں کہ امام پر سورۃ فاتحہ واجب ہے تو حنفیہ کا اعتراض جیسا کہ اہل حدیث پر ہے۔ ویسا ہی ان حنفیوں پر بھی ہے۔ (خیر الکلام ص ۶)

جواب: یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے فقہائے حنفیہ کی کتابیں دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ورنہ وہ اس قسم کی سطحی بات ہرگز تحریر نہ کرتے۔ علماء اخاف کے نزدیک سورۃ فاتحہ کی قرآن اس امام پر ضروری ہے جو اقل سے آخر تک امامت کا فریضہ ادا کر رہا ہو۔ اگر کسی نے اس حالت میں امام کی اقتدا کی ہو۔ کہ امام سورۃ فاتحہ پڑھ چکا ہو یا رکوع کے لیے سر جھکا چکا ہو۔ اور امام کو حدیث کو لاحق ہو گیا ہو تو ایسے مقتدی کو امام اپنا نائب اور خلیفہ بنا سکتا ہے اور ایسے نائب امام کی نماز بغیر سورۃ فاتحہ پڑھے بھی جائز اور صحیح ہے۔ اور رکوع کی حالت میں بھی مسبوق کو نائب اور خلیفہ بنا سکتا ہے۔ (دیکھئے ہدایہ جلد ۱ ص ۱۱۰ وغیرہ) اور حضرت ابن عباس کی حدیث کا بھی یہی مطلب ہے کیونکہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا کی تھی اور بعد کو آپ نے امامت کا فریضہ ادا کیا تھا جیسا کہ اس کی پوری تشریح

پہلے ہو چکی ہے۔ لہذا حقیقوں پر تو مطلقاً اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ ہاں البتہ اپنے آپ کو اہل حدیث کہلانیوں لے اور مسکواً اکماراً یتسوّیٰ اصلاً کی حدیث پر عامل ہونے کے مدعی اس صحیح حدیث سے کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتے اور شاید کہ تا قیامت ہو بھی نہ سکیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دیگر صحیح قولی احادیث کی طرح آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اس صحیح اور فعلی حدیث سے بھی یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی آخری باجماعت نماز بغیر سورۃ فاتحہ پڑھے بھی درست اور صحیح ہو گئی تھی اور یہی جہور اہل اسلام کا مسلک ہے اور آپ کے آخری فعل کے حق اور درست ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اس کے بعد نسخ کا احتمال بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ازراہ انصاف خدا تعالیٰ سے ڈر کر فریق ثانی کو اپنے اس فتویٰ پر نظر ثانی کرنی چاہیے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اس آخری عمل کے پیش نظر یہ فتویٰ کس بے باکی اور جسارت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری کوتاہیاں اور لغزشیں معاف کرے۔

گیارہویں حدیث: امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسحاق ابن زرقؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سفیان ثورؒ اور شریکؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں روایت

۱۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۶)

۲۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۳۲۵) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثقہ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۹۴) حافظ ابن کثیرؒ ان کو احاد لائتہ الحدیث لکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ

جلد ۱ ص ۲۲۷)

۳۔ سفیان ثورؒ کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے اور شریکؒ ان کے متابع ہیں۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ ، الصادق اور احاد لائتہ لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۳۹۶) نیز لکھتے ہیں کہ وہ احاد لائتہ الاعلام، حسن الحدیث، امام، فقیہ اور کثیر الحدیث تھے وحدیثہ من اقسام الحسن (تذکرہ ۱ ص ۲۱۴) علامہ ابن سعدؒ ان کو ثقہ مامون اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۳۳۶) یہ یاد رہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)



کرتے ہیں موسیٰ بن ابی عائشہ سے۔ وہ عبد اللہ بن شداد سے اور وہ حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من کان  
لہ امام فقرأہ الا ما ملہ قرأۃ (بحوالہ)  
فرمایا کہ جس آدمی نے امام کی اقتداء کی تو امام کی قرأۃ  
بمقتدی کو بس ہے۔ فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۳۹

اس روایت میں جہری اور مسری نماز کی کوئی قید موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ اپنے عموم پر ہے کیونکہ اس میں حرف من شرطیہ ہے جو عموم کے لیے ہے۔ بخلاف لا صلوة لمن لم یقرأ کے کہ وہاں حرف من موصولہ یا موصوفہ ہے جس میں عموم و خصوص دونوں آسکتے ہیں۔ اور اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ امام کے پیچھے جب کسی نے اقتداء اختیار کر لی ہو تو مقتدی کو جدا اور الگ قرأت کرنے کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ امام کا پڑھنا گویا مقتدی کا پڑھنا ہے

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ہم نے شریک کو صرف متابع کے طور پر پیش کیا ہے۔ استدلال امام سفیان ثوری سے ہے جو ثقہ اور ثبت تھے۔ (ترجمان الحدیث ص ۲۱ ماہ جولائی ۱۹۷۳ء میں تصدیقات کے چند نمونے کا عنوان قائم کر کے اور ہماری اس عبارت سے لفظ متابع ہضم کر کے جو اعتراض کیا ہے، علی طور پر خالص بددیانتی ہے۔ ہم نے سفیان ثوری کو ان کا متابع نہیں بتایا بلکہ ان کو سفیان ثوری کا متابع کہا ہے مگر مضمون نگار نے ص ۲۱ میں دجل کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں جبکہ سفیان ثوری اس کا متابع موجود ہے۔

۱۔ امام حمید ان کو ثقات میں شمار کرتے ہیں۔ امام ابن معین اور یعقوب بن سفیان ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۵۲) حافظ ابن حجر ان کو ثقہ اور عابد لکھتے ہیں۔ (تقریب ص ۳۹۷) امام بخاری ان کو ثقہ کہتے ہیں (جلد ۲ ص ۴۳۳)

۲۔ یہ حضرت ام المومنین میمونہ کے بھانجے تھے (بخاری جلد ۱ ص ۴۲۷) حافظ ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان کا تولد ہوا تھا۔ امام عجل، خطیب، ابو زرعہ، نسائی، ابن سعد اور واقعی سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۳

۳۔ یہ روایت شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۲ آثار السنن جلد ۱ ص ۸۷ روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۳، تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۳۸، ابی الدین ص ۱۷، فتح الملم جلد ۲ ص ۲۴، حاشیہ طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۸، اعلار السنن جلد ۴ ص ۶۳ اور بغیۃ اللمعی جلد ۲ ص ۲ وغیرہ کتابوں میں اجمالاً و تفصیلاً نقل کی گئی ہے۔

اور مازاد علی الفاتحہ کی قرأت میں فریق ثانی کا کلی اتفاق ہے کہ اس میں امام کی قرأت مقتدی کی قرأت سمجھی جائے گی اور مقتدی پر الگ قرأت لازم نہیں ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی تھے۔ اور باقی سب راوی ثقہ اور ثبت ہیں۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں اور مبارکپوری صاحب نے اپنی افتاد طبع کے تحت گواہی باتیں شائیں سے کام لینے اور گلو خلاصی کی ناکام کوشش کی ہے، لیکن اتنی بات تسلیم کیے بغیر وہ کوئی مفسر نہیں پاتے کہ بظاہر صحیح ہے کیونکہ موصول بھی ہے۔ اس کے تمام روایات بالاتفاق ثقہ بھی ہیں اور کوئی علت قاعدہ بھی بظاہر اس میں نہیں پائی جاتی۔۔۔ الخ (بلفظہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۴۸)

انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ جب تمام راوی ثقہ ہیں اور سند بھی موصول ہے۔ اور بظاہر کوئی علت قاعدہ بھی اس میں پائی نہیں جاتی۔ تو مبارکپوری صاحب جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے۔ اور یا صحیح تسلیم کرتے ہوتے۔ اس کا کوئی معقول جواب دیتے۔ مگر چونکہ اپنی رائے کو ترک نہیں کرتا۔ اس لیے ان حضرات کی طرف سے صحیح حدیث کو معقول ٹھہرانے کی کوشش اور سعی کی گئی ہے۔ مبارکپوری صاحب نے جو کچھ کہا اس کو آپ پڑھ لیں اور ساتھ ساتھ جواب بھی ملاحظہ کرتے جائیں۔

پہلا اعتراض: مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں (اور یہی اعتراض خیر الکلام از ص ۴۵ تا ۴۷ میں پانی کی طرح بلویا گیا ہے) کہ یہ روایت مرفوع نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ہیں: (۱) اگر یہ طریق مرفوع ہوتا۔ تو محدثین کرام، امام سفیان ثوری، شریک، اور جریر کو امام ابو حنیفہ کا مخالف ہرگز نہ بتاتے۔

(۲) اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو امام طحاوی، علامہ مار دینی، حافظ زیلعی اور محدث علی وغیرہ محل احتیاج میں ضرور اس کو پیش کرتے۔

(۳) حافظ ابن ہمام نے مسند احمد بن حنبل کے جس نسخہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ اس میں کاتب کی غلطی کی وجہ سے عبد اللہ بن شداد کے بعد عن جابر کا جملہ زیادہ ہو گیا ہے۔ اور لے نواب صدیق حسن خان صاحب مسند احمد بن حنبل کے طریق سے دو سندوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ والہ مسند الاول صحیح علی شرط الشیخین والثانی علی شرط مسلم ۱۷ (ہدایۃ السائل ص ۲۲)



حقیقت میں یہ روایت مرسل ہے۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۳۸ و ابکار المنیٰ)

جواب : مبارکپوری صاحب کا یہ دعویٰ بے پندش کردہ دلائل کے از سر تا پا لغو اور بیہودہ

ہے۔ یہ روایت مرفوع ہے مرسل نہیں ہے، ترتیب وار ہر شق کا جواب ملاحظہ کیجئے :

پہلی شق کا جواب : یہ دعویٰ کرنا کہ جریر، سفیان اور شریک وغیرہ امام ابو حنیفہ رحمہ کی مخالفت کرتے ہوئے اس کو مرسل روایت کرتے ہیں باطل ہے، چنانچہ علامہ آلوسیؒ ان کی روایت کو کئی سندات کے ساتھ نقل کر کے لکھتے ہیں۔ (علامہ آلوسیؒ ثقہ ناقل ہیں ان کو متنازع آدمی کہہ کر نا لہذا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۷۳ میں کیا ہے نہرے تعصب پر مبنی ہے اور اہل علم کی شان کے لائق نہیں ہے)

فہو اء سفیان و شریک و جریر و  
ابو الزبیر رفعہ بالطرق الصحیحة  
صوبہ امام مثلاً سفیان ثوری، شریک، جریر اور ابوالزبیر  
(دغیرہ) صحیح اسانید کے ساتھ اس روایت کو مرفوعہ نقل  
کرتے ہیں جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اس  
کو مرفوع روایت نہیں کیا۔ ان کا قول سراسر باطل ہے۔  
(روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۳)

اور اسی طرح فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۳۹ میں بھی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام بیہقیؒ دارقطنیؒ اور ابن عدیؒ وغیرہ کا یہ دعویٰ کہ اس روایت کو تنہا حضرت امام ابو حنیفہؒ ہی مرفوع بیان کرتے ہیں اور اس رفع میں ان کا اور کوئی ساتھی نہیں محض باطل ہے اور امام ابو حنیفہؒ سے اس روایت کو نقل کرنے والے بھی اس کو مرفوع ہی بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں :

هذا حدیث رواہ جماعة من  
اصحاب ابی حنیفہ موصولاً وخالفہم  
امام ابو حنیفہ کے اصحاب اور تلامذہ میں سے ایک  
بہت بڑی جماعت نے اس کو مرفوع اور موصول بیان کیا  
عبداللہ بن المبارکؒ الامام فرواہ  
ہے لیکن امام عبداللہ بن مبارکؒ اس کو مرسل روایت  
عنه مرسلاً۔ (کتاب القراءة ص ۱۰۱) کرتے ہیں۔

اسحق ارزقؒ، ابویوسفؒ اور یونس بن بکرؒ وغیرہ کی روایتیں دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۳ اور ص ۱۲۳ میں  
مذکور ہیں اور محمد بن الحسنؒ، محمد بن الفضلؒ، البیہقیؒ، سلیم بن مسلمؒ، مکی بن ابراہیمؒ، علی بن یزید الصدیؒ

اور مردان بن شجاع کی روایتیں عقود الجواہر المنیفہ فی اولیۃ الاحکام لمنہ سب ابی حنیفہؒ میں مذکور ہیں۔ (کنافہ الدلیل المبین ص ۹۵) لولانا المحدث محمد حسن فیض پوریؒ (لہذا اسحاق ارزقؒ کی روایت کو شاذ، غلط اور ضعیف قرار دینا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے۔) (ملاحظہ ہو ص ۴۷۲ و ۴۷۳) محض بے بنیاد امر اور زرا باطل دعویٰ ہے۔ علاوہ ازیں مؤلف خیر الکلام خود ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ جب ان کا ثقہ ہونا ثابت ہوا تو اس صورت میں ان کا تفرّد کوئی مضر نہیں ہوگا۔۔۔ الخ ص ۲۸۸ اور اسحق ارزقؒ تو چوٹی کے ثقہ اور ثبت ہیں۔ پھر تفرّد کا ناکام بہانہ کون سنتا ہے اور کون ان کی اس صحیح زیادت کو شاذ مانتا ہے؟ اور دوسرے مقام پر امام بیہقیؒ لکھتے ہیں:

وهكذا رواه جماعة عن ابی حنیفہؒ اسی طرح امام ابو حنیفہؒ سے ایک بڑی تعداد نے موصولہ۔ (سنن الکبریٰ ج ۲ ص ۱۵۹) اس کو مرفوع اور موصول بیان کیا ہے۔

اور نو اب صدیق حسن خاںؒ لکھتے ہیں کہ

وبالجملة این حدیث بطرق متعدده ارسالاً و خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ حدیث متعدد طرق سے مرسلہ  
رفعا مروی شدہ و دروی دلالت است برانکہ اور مرفوعاً مروی ہے اور اس میں دلیل ہے کہ مقتدی  
مؤتم و رئیس امام فاتحہ نخاندزیر کہ قرأت امام امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے کیونکہ امام کی قرأت مقتدی  
قرأت مؤتم است اھ (ہدایت السائل ص ۲) کی قرأت ہے۔ الخ

پہلے اس کی تحقیق گزر چکی ہے کہ ثقہ راوی کی زیادت بالاتفاق مقبول ہوتی ہے۔ خواہ وہ زیادت متن حدیث میں ہو۔ خواہ سند میں اور جب حدیث کے مرفوع اور مرسل ہونے کا جھگڑا ہو تو وہ حدیث جہور علماء کے نزدیک مرفوع ہی سمجھی جائے گی۔ نیز مثبت کو نافی پر ترجیح ہوگی۔ اگر بالفرض اس زیادت کو تنہا حضرت امام ابو حنیفہؒ ہی بیان فرماتے۔ تب بھی حضرت محدثین کرامؒ کے طے شدہ اصول اور ضوابط کے تحت یہ روایت مرفوع اور موصول ہی ہوتی حالانکہ جریرؒ، سفیانؒ، شریکؒ اور ابو الزبیرؒ وغیرہ سب ثقہ راوی اس کو مرفوع اور موصول بیان کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ سے بھی ایک بڑی جماعت اس کو مرفوع اور موصول ہی روا کرتی ہے۔ امام ابن مبارکؒ چونکہ اس کو مرسل بیان کرتے ہیں اور دوسرے اس کو مرفوع



بیان کرتے ہیں۔ اس لیے قاعدہ کے مطابق مرفوع اور متصل ہی کو ترجیح ہے۔ نہ کہ اس کے مرسل ہونے کو علاوہ انہیں خود امام ابن مبارک کا بیان ہے کہ جب امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کسی بات پر متفق ہو جائیں تو میرا قول بھی وہی ہوگا (تبیض الصحیفہ ص ۱) اور امام ابو حنیفہؒ اور امام سفیان ثوریؒ دونوں اس روایت کو مرفوع اور موصول بیان کرتے ہیں اور امام حاکم علامہ شمس الدین ابن قدامہؒ، علامہ مارونینیؒ، حافظ ابن ہمامؒ، ملا علی القاریؒ اور علامہ آلوسیؒ وغیرہ اس روایت کو مرفوع ہی نقل کرتے ہیں۔ اور یہ مثبت بھی ہیں اور مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں: فقول هؤلاء العارفين مقدم على من لم يعرف۔ (البار والممن ص ۱۲) بہر حال مقدم ہے۔

اس لیے مبارک پوری صاحبؒ کے اعتراض کی یہ شق قطعاً باطل اور مردود ہے اور اسی طرح مؤلف خیر الکلام (ص ۴۷۳) کا اس کے جواب سے عاجز ہو کر اس کو مصادرہ علی المطلوب کہ کر گلو خلاصی کرنا بے معنی بات ہے کیونکہ دعویٰ یہ ہے کہ عن جابرؓ کا جملہ مسند احمد بن منیعؒ میں مذکور ہے اور دلیل یہ ہے کہ یہ مسلم ثقات اس کو اسی طرح نقل کرتے ہیں۔ اگر مؤلف مذکور کا یہ خانہ ساز مصادرہ مضرب ہے تو تمام کتب حدیث میں یہ جاری ہے کہ کمالاً بیخفی تو پھر کوئی روایت صحیح نہیں ہو سکتی بھلا ایسے ناکام بہانوں سے صحیح حدیث ضعیف قرار دی جاسکتی ہے؟ معاذ اللہ تعالیٰ۔

دوسری شق کا جواب: جہود اہل اسلام کے پاس قرآن کریم کی آیت اور حضرت ابو موسیٰ الاشعرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انس بن مالکؓ وغیرہ کی صحیح اور مرفوع حدیثیں موجود ہیں۔ لہذا اگر امام طحاویؒ وغیرہ ائمہ نے حضرت جابرؓ کی یہ روایت اپنے استدلال میں پیش نہیں کی۔ تو کیا بغیر اس روایت کے ان کی ضرورت اور حاجت پوری نہیں ہو سکتی تھی؟ اور کیا ان کے دعوے کی صرف یہی ایک حدیث دلیل رہ گئی تھی کہ بغیر اس کے بیان کرنے کے ان کا دعویٰ ناکام اور تشنہ رہتا؟ ہاں جہاں اور حدیثیں موجود ہیں۔ وہاں ان کی دلیل ایک یہ حدیث بھی ہے اور فرض کر لیجئے کہ ان حضرات کو مسند احمد بن منیعؒ کی سند سے اس روایت کا علم ہی نہ تھا تو کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ سرے سے یہ حدیث ہی نہ ہو؟ کسی حدیث کا کسی موقع پر بیان نہ کرنا اس کے عدم کی دلیل کیسے بن گئی؟

علاوہ انہیں امام ابن قدامہ، مارون بن، ابن ہمام، ملا علی قاری اور آلوسی وغیرہ باقاعدہ اس روایت سے استدلال کرتے ہیں اور اس کو مرفوع اور موصول ہی سمجھتے ہیں اور اسی طرح اس کو نقل بھی کرتے ہیں۔

مؤلف خیر الکلام ص ۲۶۳ میں (ونحوہ فی ص ۲۳۸) لکھتے ہیں کہ باقی رہا ارسال اور وصل کا اختلاف اس کے متعلق بیان ہو چکا ہے کہ راوی اسے مختلف حالات کی بنا پر کبھی متصل بیان کر دیتے ہیں اور کبھی مرسل۔ یہ اختلاف کوئی مضر نہیں۔ ثقہ کی زیادتی اس جگہ قابل قبول ہے۔ انتہی اور یہی ہم کہتے ہیں۔

تیسری شق کا جواب: اگر مسند احمد بن منیع کے نسخہ میں جو حضرات محدثین کرام کے نزدیک متداول کتاب تھی۔ کاتب نے عن جابر کے الفاظ زیادہ کر دیے تھے تو نہ معلوم بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد اور دیگر حدیث کی کتابوں میں کاتبوں نے کیا کچھ شکوئے کھلاتے ہوں گے؟ اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ انھوں نے حذف و اضافہ اور قطع و برید کر کے اصل مضمون کو کیا سے کیا کر دیا ہوگا؟ پھر حدیث کی کتابوں پر کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ اور شاید اسی بد اعتمادی کی وجہ سے بیشتر غیر مقلد حضرات (مثلاً عبد اللہ بن جابر، اسلم جبر، چوری، غلام احمد پرویز، ڈاکٹر احمد الدین وغیرہ) انکار حدیث کے قفسہ میں گرفتار اور مبتلا ہوئے ہیں۔ اور شاید تصحیح حدیث کی یہ شرط ہو کہ اگر مبارکپوری صاحب اور ان کی عبت کسی حدیث کو صحیح قرار دیں تو صحیح ہوگی۔ ورنہ اس کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

محترم جب سند کے تمام راوی بالاتفاق ثقہ اور ثبت ہیں۔ اور بظاہر اس میں کوئی علت قاعدہ بھی نہیں اور موصول بھی ہے تو بلاوجہ محض ہوائے نفسانی کے لیے کاتب پیچا رہے پر کیوں ایسا سنگین الزام عائد کیا جاتا ہے؟ اور کیوں طے شدہ قواعد اور اصول سے انحراف کیا جاتا ہے؟ فتح الباری کے حوالہ سے

لہٰذا مثلاً یہ کہ سند کے جملہ روایات بالاتفاق ثقہ ہیں۔ سند موصول ہے۔ بظاہر اس میں کوئی علت قاعدہ بھی نہیں پائی جاتی۔ ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے۔ موصول اور مرسل کے جھگڑے میں حدیث مرفوع ہی سمجھی جائیگی۔ ثبتت کو نافی پر ترجیح ہوتی ہے، عدم علم عدم ثبوت کی دلیل نہیں ہوتی۔ عارف کے قول کو جاہل کے قول پر ترجیح ہوتی ہے۔ اسقاط اور اولاج محض احتمال سے ثابت نہیں ہو سکتا وغیرہ وغیرہ یہ تمام اصول ایسے ہیں جو خود مبارکپوری صاحب کے نزدیک بھی مسلم ہیں۔ مگر افسوس کہ عملی طور پر وہ سب گریز کرتے ہیں۔ خواہ سفا۔



یہ بات نقل کی جا چکی ہے کہ ادراج واسقاط محض احتمال سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ ادراج مجرد دعویٰ سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ (نیل الاطوار جلد ۱ ص ۳۵۱)  
حضرات! یہ ہے مبارکپوری صاحب کا انصاف اور دیانت؟ اس سے بڑھ کر تعصب اور کیا ہو سکتا ہے؟

بصورت مرسل بھی یہ روایت حجت ہے؛

اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ روایت مرسل ہے، تب بھی جہور کا احتجاج اس روایت سے صحیح ہو گا۔ مرسل کی حجیت کے بارے میں ہم پہلے کچھ بحث باحوالہ کر چکے ہیں۔ امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ بعض اہل علم کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے۔ (کتاب العلل جلد ۱ ص ۲۳۹)  
امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ، ابو حنیفہؒ، امام احمدؒ اور اکثر فقہائے کرام کا یہ مسلک ہے کہ حدیث مرسل بھی حجت ہے۔ (مقدمہ نووی ص ۱۷) علامہ جزائریؒ کا بیان ہے کہ علماء سابقین میں امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ وغیرہ مرسل حدیث کو بھی حجت سمجھتے تھے۔  
(توجیہ النظر ص ۲۴۵) وخطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۱۰۷ (انواب صاحب) اور انواب صاحب لکھتے ہیں لیکن اعلان بار سال موجب ترک اونیست، زیر کہ قبول مراسیل مذہب جمعی از فحول علماء اصول است۔ (دلیل الطالب ص ۳۲۵) اور ایسے مرسل کے حجت ہونے میں جس کی تائید کسی اور حدیث سے ہوتی ہو۔ گو وہ مرسل ہی کیوں نہ ہو۔ سب کا اتفاق ہے۔ چنانچہ امام بیہقیؒ، امام نوویؒ، حافظ ابن القیمؒ اور مبارکپوری صاحب نے اس کی تصریح کی ہے۔  
(کتاب القراءۃ ص ۱۲۳)، مقدمہ نووی ص ۱۷، زاد المعاد جلد ۱ ص ۱۰۷، البکار المنہ ص ۱۳۵) اور مبارک پوری صاحب ایک مقام میں لکھتے ہیں اور مرسل معتقد کے حجت ہونے میں کوئی شبہ نہیں (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۹۱) اسی قاعدہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے علامہ آلوسیؒ یہ جواب دیتے ہیں کہ اگر حضرت جابرؓ کی یہ روایت مرسل بھی ہو تب بھی مرسل حدیث اکثر ائمہ کے نزدیک حجت ہے تو ہمیں عمل کے لیے یہی کافی اور بس ہے۔ (روح المعانی جلد ۱ ص ۹۱)  
یہ حکم تو عام مراسیل کا تھا۔ لیکن اگر کسی دلیل سے حضرت عبداللہ بن شدادؓ کا صحابی ہونا ثابت ہو جائے تو ان کی روایت مراسیل صحابہ کے قسم کی ہوگی اور حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل

بالاتفاق قابل قبول ہیں۔ بعض محققین کا بیان ہے کہ عبداللہ بن شداد صحابی تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو کتابیں صرف حضرات صحابہ کرامؓ کے حالات اور سوانح بیان کرنے کے لیے مخصوص ہیں۔ ان کا ذکر بھی ان کتابوں میں آتا ہے۔ (فصل الخطاب ص ۹۷) حافظ ابو عمر بن عبدالبر الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (جلد ۱ ص ۳۹۹) میں ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۲ اور تقریب ص ۲۰۲ میں درج ہے۔ ولد علی علیہ وسلم کے عہد اور زمانہ میں ہوئی تھی۔ اور اسی طرح اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہ اور تجرید اصحابہ میں ان کا ذکر ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں عبد اللہ بن شداد من صفار الصحابۃ۔ (فتح الباری جلد ۳ ص ۲۰۷) کہ عبداللہ بن شداد نو عمر صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ جو صحابی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت قدس میں کافی عرصہ رہا ہو یا جس نے آپ کی معیت میں دشمنان اسلام سے جہاد کیا ہو یا جس نے آپ کے جھنڈے کے نیچے شہادت کا رتبہ پایا ہو۔ ایسے صحابی کا مرتبہ یقیناً اس صحابی سے زیادہ ہے جس نے آپ کی خدمت اقدس میں کافی وقت نہ گزارا ہو۔ یا جس نے آپ کی معیت میں دشمنان اسلام سے جنگ نہ کی ہو، یا جس کو آپ کی معیت میں شہادت نصیب نہ ہوئی ہو، یا جس نے آپ سے معمولی گفت گو کی ہو یا تھوڑی مسافت آپ کے ساتھ طے کی ہو۔ پھر آگے لکھتے ہیں:

اور اہ علی بعد احوال الطفولیت وان کان شرف الصحبۃ حاصلہ للجمیع ومن لیس لہ منہم سماع منہ فحدیثہ مرسل من حیث الروایۃ وھو مع ذلک معدودون فی الصحابۃ لما نالوہ من شرف الرؤیۃ انتہی۔

(شرح نخبۃ الفکر ص ۸۳)

اور اسی طرح ان کا درجہ اس صحابی سے زیادہ ہوگا جس نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو در سے دیکھا ہو یا جس نے بچپن میں آپ کو دیکھا ہو۔ اگرچہ صحابی ہونے کا شرف ان سب کو حاصل ہو گا۔ ان میں سے جس نے براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع نہیں کیا۔ اس کی حدیث مرسل ہوگی لیکن شرف صحبت کی بنا پر ان کا شمار بھی بہر صورت حضرات صحابہ کرامؓ ہی میں کیا جائے گا۔



اس سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرامؓ کا دینی خدمات انجام دینے کی وجہ سے آپس میں یقیناً بہت تفاوت ہے، لیکن مع ہذا جنھوں نے عہد طفولیت اور بچپن کے زمانہ میں اپنی آنکھوں سے جناب رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔ ان کا شمار بھی صحابہ میں ہے اور وہ صفار صحابہ میں شامل ہیں اور چونکہ ان کی روایتیں براہ راست جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نہیں ہوتیں بلکہ حضرات صحابہ کرامؓ سے ہوتی ہیں۔ اس لیے بعض محدثین کرامؓ نے ایسے صفار صحابہ کو کبار تابعین میں شمار کر دیا ہے۔ وَلِکُلِّ وَجْهَةٌ اور ایسے صفار صحابہ کی روایات مراسل ہوں گی۔ مؤلف خیر الکلام ص ۴۷ میں لکھتے ہیں کہ صحابہ کی مرسل اگرچہ بالاتفاق حجت ہے، مگر اس جگہ صحابہ سے وہی لوگ مراد ہیں جنھوں نے سن تمیز میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا.... انحر مگر یہ محض فرار کا ایک ناکام بہانہ ہے امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ جہور محدثین کے نزدیک پانچ سال کا بچہ سن تمیز کو پہنچ جاتا ہے لیکن صحیح یہ ہے۔ (جو عبد اللہ بن الزبیرؓ کے واقع سے ظاہر ہے) کہ چار سال سے کم عمر میں بھی تمیز حاصل ہو جاتی ہے۔ (شرح مسلم جلد ۲ ص ۲۸۱) اور حضرت عبد اللہ بن شدادؓ جو صفار صحابہ شمار ہوتے ہیں تین چار سال سے کیا کم ہوں گے جب کہ انھوں نے آپ کی زیارت کی ہوگی۔

### مراسل حضرات صحابہ کرامؓ:

مراسل صحابہ کے بارے میں تقریباً تمام علماء کرام متفق ہیں کہ وہ حجت ہیں۔ چنانچہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مراسل سے حجت صحیح نہیں ہے مگر حضرات صحابہ کرامؓ اور سعید بن المسیبؓ کے مراسل حجت ہیں۔ (مقدمہ فتح الملہم ص ۳۲ عن الوجیز ابو بن برہان) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسل حجت ہیں۔ (شرح مسلم جلد ۳ ص ۲۸۳ و مقدمہ ص ۱) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اور دیگر تمام علماء کے نزدیک صحابی کا مرسل حجت ہے۔ (شرح مہذب جلد ۴ ص ۳۸۳) اور علامہ سیوطیؒ تدریب الراوی ص ۶۶ میں تصریح کرتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسل حجت ہیں اور التوضیح (نول کشور ص ۴۶۸) میں لکھا ہے فمرسل الصحابی مقبول بالاجماع کہ صحابی کا مرسل اجماعاً مقبول ہے۔ علامہ نیوویؒ لکھتے ہیں کہ صحابی کا مرسل حجت ہے (تعلیق احسن جلد ۲) اور قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسل حدیث سند کے حکم میں ہیں۔

(نیل الاوطار جلد ۱ ص ۳۴۱) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ و م ر ا س ی ل صحابہ حجت است (دلیل الظاہ ص ۳۸) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ م ر س ل صحابی محکوم بصحت است بر مذہب صحیح۔  
 ایضاً ص ۸۹) اگر فرقی ثانی اس قاعدہ کو تسلیم نہیں کرتا تو براہ کرم دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی م ر س ل روایات عموماً اور حضرت عائشہؓ کی بخاری شریف کی پہلی روایت (جس میں بدر الوحی کا ذکر ہے) اور جوان کی ولادت سے بھی تقریباً پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے) خصوصاً اور نیز حضرت ابن عمرؓ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انسؓ کی روایتیں جن میں ابتدائے اسلام کے احکام ہیں۔ کتابوں سے خارج کر دیں اور اگر حضرت عبداللہ بن شدادؓ کو تابعی ہی تسلیم کر لیا جیسا کہ تقریب ص ۲۰۲ میں ہے کہ وہ کبار تابعینؓ اور ثقات و فقہائیں تھے۔ تب بھی کوئی ہرج نہیں ہے، چنانچہ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ

و كذلك مراسيل كبار التابعين اذا انضم اليها ما يؤكدها من عدالة رجال من ارسل منهم حديث وشهر تلمح واجتنب رواية الضعفاء والجهولين۔ (كتاب المرقاة ص ۱۴۳)  
 اور اسی طرح (جس طرح حضرات صحابہ کے مراسیل حجت ہیں) کبار تابعین کے مراسیل بھی حجت ہیں جب کہ ان کے روایات میں عدالت اور شہرت موجود ہو اور کمزور اور مجہول روایات کی روایت سے اجتناب وغیرہ کی صفات شامل ہوں۔

اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص غور و فکر اور قلّت غفلت سے متصف ہو کر علمی دلائل پر نگاہ ڈالے گا تو وہ کبار تابعینؓ کے مراسیل کے علاوہ دیگر مراسیل سے منقبض ہو گا جس کے دلائل ظاہر ہیں۔ (الرسالۃ ص ۶۲ جو کتاب الام کی ساتویں جلد کے آخر منضم ہے)  
 الحاصل حضرت جابرؓ کی یہ روایت صحیح اور مرفوع ہے، اس کو م ر س ل بتلانے کی تمام دلیلیں بیگناہ اور لایعنی ہیں اور اگر بالفرض م ر س ل بھی ہو تب بھی جمہور کے نزدیک حدیث م ر س ل بھی حجت ہے۔ اور خاص طور پر کبار تابعینؓ کے مراسیل تو امام شافعیؒ اور امام بیہقیؒ کے نزدیک بھی حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل کی طرح حجت ہیں اور حضرت عبداللہ بن شدادؓ تو صغار صحابہؓ میں تھے جن کے مراسیل بالاتفاق حجت ہیں۔ خلاصہ امر یہ ہے کہ حضرات محدثین کرامؓ کے نزدیک کسی روایت کے صحیح اور حجت ہونے کے لیے کوئی قاعدہ اور ضابطہ ایسا نہیں ہے جو سو فیصدی اس روایت میں



نہ پایا جاتا ہو اگر باوجود اس کے یہ روایت مرفوع اور حجت نہیں ہے تو عالم اسباب میں صحت حدیث کے لیے کوئی اور معیار موجود نہیں ہے۔

دوسرا اعتراض: مولانا مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں کہ  
 حدیث من کان له امام فقراً الامام له  
 من کان له امام فقراً الامام له قراءة  
 قراءة من حدیث جابر و له طرق عن  
 جماعة من الصحابة وكلها معلولة ...  
 (تلخیص الجدید جلد ۱۸) انتہی۔

متعدد اسانید بالکل صحیح ہیں، اور یہ حدیث حضرت جابر کے علاوہ دیگر حضرات صحابہ کرام کی ایک کافی جانت سے بھی مروی ہے، لیکن وہ سب طرق معلول ہیں۔

مبارک پوری صاحب نے یہ عبارت تحقیق الکلام جلد ۱۸ ص ۱۱۱ اور ابکار المنہ ص ۱۵۱ میں نقل کی ہے اور اس پر اعتراض کی بنیاد رکھی ہے۔

جواب: یہ روایت متعدد اسانید کے ساتھ حضرت جابر سے مروی ہے۔ امام حاکم نے علم اصول حدیث کی مشہور کتاب معرفت علوم الحدیث میں تیسویں نوع اس موضوع پر قائم کی ہے۔

هذا النوع من هذا العلم معرفة المشهور من الاحاديث المروية عن رسول الله صلى الله عليه وسلم .... الخ پھر ان مشہور احادیث کے بعد یہ حدیث بھی بیان کی ہے ومنہ من کان له امام

فقراً الامام له قراءة اور دیگر متعدد احادیث بھی ذکر کی ہیں پھر فرماتے ہیں فكل هذه الاحاديث مشهورة باسانيدها وطرقها .... الخ (معرفت علوم الحدیث طبع قاہرہ ص ۹۷) اس سے بھی ثابت ہوا کہ

من کان له امام فقراً الامام له قراءة کی حدیث نہ صرف یہ کہ مرفوع اور صحیح ہے بلکہ مشہور حدیث ہے محض تعصب مذہبی میں آکر اس کا انکار کرنا کس قدر ناانصافی ہے اور ایسے ٹھوس ثبوت اور علم

ہی کی وجہ سے ہم حافظ ابن حجر کی اس بات کو رد کرتے ہیں اور کم و بیش چالیس سندیں اس روایت کی تو اس ناکارہ اور کوتاہ علم کو بھی معلوم ہیں۔ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ اور ان میں ستائیس کے

قریب فی الجملہ معلول ہیں ایک صحیح اور مرفوع سند آپ سن اور پڑھ چکے ہیں اور عنتریب چند ایک دیگر صحیح اسانید بمع توثیق روایت ہم آپ سے عرض کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔ باقی حافظ ابن حجر کا یہ دعویٰ

نہایت مجمل اور بے دلیل ہے اور ان حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کی تصحیح یا تضعیف

بلا دلیل کون سننا ہے؟ بعض علماء کرام نے حافظ صاحب موصوف سے انتہائی عقیدت اور  
حسن ظنی کرتے ہوئے اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ حافظ صاحب موصوفؒ کی عبارت میں  
دو چیزیں ہیں:

(۱) کہ یہ روایت حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔

(۲) کہ یہ روایت حضرت جابرؓ کے علاوہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے بھی متعدد طرق کے  
ساتھ مروی ہے اور کلاما معلولہ میں ہا کی ضمیر ان طرق کی طرف راجع ہے جو دیگر حضرات صحابہ  
کرامؓ سے مروی ہیں اور ان کی عبارت لکنتہ حدیث ضعیف عند الحافظ سے بھی یہی طرق مراد  
ہیں نہ کہ حضرت جابرؓ کی حدیث اور حضرت جابرؓ کی روایت مسکوت عنہا ہے اور یہ حافظ صاحبؒ  
کی عبارت کلاما معلولہ کی زد میں نہیں آتی اور گویا حافظ صاحب موصوفؒ نے ایک لطیف حیلہ  
کرتے ہوئے گول مول حکم صادر کر کے حضرت جابرؓ کی روایت سے گلو خلاصی کرنے کی کوشش فرمائی  
ہے، مگر ناکام۔ اگر حافظ صاحب موصوفؒ کی مراد یہ ہو کہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے من وعن روایت  
کے ایسے ہی الفاظ مروی ہیں جو حضرت جابرؓ سے مروی ہیں اور وہ طرق سب معلول ہیں۔ تو  
شاید بظاہر یہ صحیح ہو اور اس صورت میں اس عبارت کی اس سے بہتر توجیہ اور نہیں ہو سکتی  
اور اگر مراد یہ ہو کہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے جو روایتیں مروی ہیں گویا ان کی روایت کے الفاظ تو  
یہ نہیں لیکن ان کا مفہوم اور مضمون اس سے ملتا جلتا ہے اور وہ تمام طرق معلول ہیں تو یہ قطعاً  
باطل ہے۔ بطور نمونہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی بعض صحیح روایتیں نقل کر کے ان کے اس دعوای کے  
بطلان کو آشکار کیا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔ اس لیے آپ ان صحیح روایات کو دیکھ کر یہ کہتے ہوئے  
حافظ صاحبؒ کے ادھار سے نظر پھیر لیجئے اور یہ نقد و موصول کر لیجئے کہ شنیدہ کے بودماند دیدہ یاخذ  
ماصفادع ماکدر۔

تیسرا اعتراض: امام بیہقیؒ اور مولانا مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ حضرت جابرؓ  
کی اس حدیث میں قرأت سے ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت مراد ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ ایک  
شخص نے ظہر یا عصر کی نماز میں سبح اسم ربك الاکبر کی قرأت کی تھی تو آپؐ نے اس موقع پر  
مقتدیوں کو قرأت سے منع کیا تھا۔ (کتاب القراءة ص ۱۳۱ و تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۲)



جواب : یہ روایت حضرت جابر رضی سے مروی ہے اور ان کی روایت میں قرأت کو  
مَا زَادَ عَلَى الْفَاتِحَةِ کی قرأت پر حمل کرنا توجیہ القول بمالہ یعنی بہ قائلہ کا ارتکاب کرنا ہے کیونکہ حضرت  
جابر رضی راوی حدیث اس قرأت سے صرف سورۃ فاتحہ کی قرأت مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ارشاد فرماتے ہیں  
مَنْ صَلَّى رَكْعَةً لَمْ يَقْرَأْ فِيهَا بِأَمِّ الْقُرْآنِ فَلَمْ  
يَصِلْ إِلَّا وَرَاءَ الْإِمَامِ وَمَوْطَأَ إِمَامٍ مَالِكٌ  
جس کسی نے نماز کی ایک رکعت بھی ایسی پڑھی جس  
میں اس نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز ادا  
نہ ہوگی مگر ہاں امام کے پیچھے۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۴۲)

اور یہ بات باقر مبارکپوری صاحب اپنے مقام پر آئے گی کہ راوی حدیث (مخصوصاً جب کہ  
صحابی ہو) اپنی مروی حدیث کی مُراد کو دوسروں سے زیادہ بہتر جانتا ہے لہذا حضرت جابر رضی کی اس صحیح  
روایت میں قرأت سے ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت مراد لینا قطعاً اور یقیناً باطل ہے، یہ یاد رہے  
کہ یہ روایت حضرت جابر رضی سے مرفوعاً بھی مروی ہے۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں  
کہ در حدیث جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم آمدہ کہ فرمودہ من صلی رکتہ لم یقرأ فیہا بام  
القرآن فلم یصل الا وراۃ الامام رواہ الطحاوی فی معانی الآثار بسند متصل مرفوع ورواہ  
الترمذی موقوفاً وقال حسن صحیح... اھ (ہدایۃ السائل ص ۲۰۴) نواب صاحب نے  
جو کچھ کہا بالکل صحیح کہا ہے کیونکہ یہ روایت طحاوی جلد ۱ ص ۱۰۳ میں متصل اور مرفوع سند سے مروی ہے۔  
سندیوں ہے بکر بن نصر (امام ابو حاتم) فرماتے ہیں کہ وہ صدوق اور ثقہ تھے۔ امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ  
وہ ثقہ تھے مسلم بن قاسم فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ فاضل اور مشہور تھے۔ امامی الاحبار ج ۱ ص ۳۸، قال حدثنا  
یحییٰ بن سلام (امام بیہقی) فرماتے ہیں کہ وہ کثیر الوہم ہیں اور اس حدیث کے مرفوع بیان کرنے میں  
ان کا وہم ہے۔ (محصلہ کتاب القراءۃ ص ۱۱۰) بے شک ان پر بعض نے جرح کی ہے۔ امام دارقطنی ان کی  
لے امام مالک ابن نعیم وہب بن کیسان سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر بن عبد اللہ  
سے سنا۔ انھوں نے یہ ارشاد فرمایا... انھم حضرت امام مالک کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے اور حضرت جابر جلیل القدر  
صحابی تھے۔ ابن نعیم وہب بن کیسان کا ترجمہ سن لیجئے۔ امام نسائی اور ابن معین ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعد ان کو  
ثقہ اور محدث کہتے ہیں عجل ان کو ثقہ اور تابعی کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور امام احمد بھی ان  
کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۶۶) امام ترمذی لکھتے ہیں ہذا حدیث حسن صحیح (ص ۴۳)

تضعیف کرتے ہیں اور امام ابن عدیؒ فرماتے ہیں کہ باوجود ان کے ضعیف ہونے کے ان کی حدیث لکھی جاسکتی ہے امام ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں ربما اخطأ امام ابو زرعةؒ فرماتے ہیں لا بأس به ربما يهمل امام ابو حاتم رحمہ اللہ ان کو شیخ اور صدوق کہتے ہیں امام ابو العزیزؒ ان کو من الحفاظ اور من خيار خلق الله کہتے ہیں لسان المیزان ج ۴ ص ۲۶۰ و ۲۶۱ الغرض ان کی یہ حدیث حسن و درجہ سے کسی طرح کم نہیں ہے) قال حدثنا مالك عن وهب بن كيسان عن جابر بن عبد الله عن النبي صلى الله تعالى عليه وسلم — (الحديث) لهذا المؤلف خير الكلام (ص ۴۹۳ میں) یہ مطالبہ بھی پورا ہو گیا کہ حدیث قرأه الامام بصورت مرفوعہ زیر بحث ہے غرضیکہ یہ ارشاد مطلق اور صریح ہے اس کو محض لفظوں کی کراہت سے مقید کرنا اور محل قرار دینا جیسا کہ مؤلف مذکور نے ص ۱۵۹ میں کیا ہے بالکل باطل ہے اور اسی طرح اس کو رکوع والی رکعت سے مقید کرنا بلا دلیل ہے۔ نماز صرف وہی رکعت نہیں بلکہ تمام رکعات نماز اور صلوٰۃ ہے اور امام موفق الدین ابن قدامہؒ اور علامہ شمس الدین اہلبغلیؒ بھی اس روایت کو مرفوعہ روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ رواه الخلال عن جابر رضي ان النبي صلى الله عليه وسلم قال كل صلوٰۃ لا يقرأ فيها بام القرآن فهي خداج الا ان يكون وراءه امام (معنی جلد ۱ ص ۶۰۶ واللفظة وشح مقنع جلد ۲ ص ۲۱) یعنی آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو نماز بھی سورۃ فاتحہ کے بغیر پڑھی جائے تو وہ ناقص ہے۔ ہوتی ہے مگر ہاں یہ کہ امام کے پیچھے ہو۔ باقی ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص کا سبج اسم ربك الرحمن کی قرأت کرنا تو اس حدیث کا سیاق ہی بالکل الگ اور جدا ہے۔ وہاں ان بعضکم خالجنہا کے الفاظ موجود ہیں (دیکھئے مسلم جلد ۱ ص ۱۶۱) اس لیے خارجی اور بیرونی قرائتیں ہونے کی بجائے خود حضرت جابرؓ کا بیان اور تفسیر زیادہ قابل قبول ہے اور ان کی مرضی کے خلاف اس روایت میں قرأت کو مازاد علی الفاخذ پر حمل کرنا انصاف کا خون کرنا ہے۔ علاوہ بریں حدیث نمبر ۲۱ میں حضرت جابرؓ کی مرفوعہ حدیث میں ام القرآن کا خاص لفظ موجود ہے جیسا کہ اپنے مقام پر آئے گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔



چوتھا اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت جابر رضی کی حدیث سورۃ فاتحہ کے بارے میں نص صریح نہیں ہے۔ اور حضرت عبادہ بن الصامت کی روایت سورۃ فاتحہ کے بارے میں نص صریح ہے لہذا حضرت عبادہ کی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔ (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۶۵)

جواب: حضرت عبادہ الصامت کی روایت جو صحیح اور صریح ہے وہ صرف امام اور منفرد کے حق میں ہے۔ اس کا مقتدی سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسا کہ بیان ہو گا۔ انشاء اللہ العزیز۔ اور جو روایت حضرت جابر رضی کی ہے، وہ مقتدی کے حق میں ہے۔ اور حضرت جابر رضی کی اپنی صریح اور صحیح روایت میں مذکور ہے کہ قرأت سے سورۃ فاتحہ کی قرأت مراد ہے، علاوہ انہیں لفظ قرآنہ مصدر ہے جو مضاف ہے اور عربی کے طے شدہ قاعدہ کے لحاظ سے یہ سورۃ فاتحہ اور غیر فاتحہ ہر قسم کی قرأت کے تحت شامل ہے۔ چنانچہ امیر سیار نے لکھتے ہیں کہ لان لفظ قرآنہ الامام اسو جنس مضاف یعم کل ما یقرأہ الامام (سبل السلاہ جلد ۱ ص ۲۶۲) بے شک لفظ قرآنہ الامام اسم جنس ہے جو مضاف ہے اور یہ ہر اس قرأت کو عام ہے جو امام پڑھتا ہو۔ اور نواب صاحب لکھتے ہیں کہ زیر کہ مصدر مضاف یکے از صیغ عموم باشد کما تقدّر فی الاصول وقرآنہ الامام ویریں جا مصدر مضاف واقع شدہ پس شامل جمیع قرأت امام باشد و ایں عموم مخصوص است باحدیث صحیحہ مثل حدیث عبادہ رضی الخ (دلیل الطالب صفحہ ۲۹۳) لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہ وغیرہ کے حوالہ سے آئے گا کہ حضرت عبادہ کی خلف الامام کی قید سے کوئی نزاع صحیح نہیں لہذا تخصیص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور مولف خیر الکلام ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اگرچہ ان آثار میں فاتحہ کا ذکر نہیں بلکہ مطلق قرأت کا ذکر ہے اور قرأت فاتحہ ہی سے شروع ہوتی ہے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ (ترمذی جلد ۲ ص ۱۱۱) الخ اور حضرت جابر رضی کی روایت کو سورۃ فاتحہ کے بارے میں غیر صریح کننا ثابت شدہ حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ یہی حضرت عبادہ رضی کی خلف الامام کی قید اور مضمون سے روایت تو اپنے مقام پر پوری تفصیل آئیگی کہ ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ اندر میں حالات حضرت جابر رضی کی حدیث کا حضرت عبادہ رضی کی حدیث سے تعارض قائم کر کے ثانی کو اول پر ترجیح دینا صرف تسکین قلب کا سامان ہے اور بس۔

پانچواں اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ حدیث من کان له امام  
فقراً الا ماہر سے تو نفس کفایت ہی معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ خلفیہ امام کے پیچھے قرأت  
کی ممنوعیت اور حرمت بھی ثابت کرتے ہیں۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ صفحہ ۴۱)

جواب: قرأت خلف الامام کی ممنوعیت اور حرمت کے صرف خلفیہ ہی قائل  
نہیں، بلکہ جمہور اہل اسلام ان کے ساتھ ہیں خصوصاً جہری نمازوں میں جس کی پوری تحقیق گذر  
چکی ہے اور جمہور اہل اسلام عموماً اور خلفیہ نے خصوصاً یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ ہم نفس کفایت  
حرمت اور ممنوعیت وغیرہ سب کچھ اس ایک روایت ہی سے ثابت کرتے ہیں؟  
نفس کفایت اس روایت سے معلوم ہو گئی اور فریق ثانی کی یہ رٹ تو باطل ہو گئی کہ جو شخص  
امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز ناقص ہے کالعدم ہے بیکار ہے  
اور باطل ہے۔ باقی رہی ممنوعیت اور حرمت وغیرہ تو دیگر احادیث سے اور قرآن کریم کی  
نص فاستمعوا وانصتوا اور حدیث واذا قرأ فانصتوا وغیرہ سے ثابت ہے کیونکہ صیغہ  
امر وجوب کے لیے ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ  
وسلم کے امر کی مخالفت حرام بھی ہے اور ممنوع بھی جیسا کہ پہلے نواب صاحب کے حوالہ سے یہ  
بات ثابت کی جا چکی ہے۔

چھٹا اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم  
ہوتا ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے اور اس کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی  
حالانکہ احناف کہتے ہیں کہ اگر کچھلی دونوں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو۔ تو نماز جائز ہے۔  
تو خلفیہ کا عمل بھی حدیث جابر پر نہ ہوا۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ صفحہ ۲۱۴)

جواب: مبارک پوری صاحب نے اپنے اس دعویٰ کے اثبات کے لیے بعض فقہائے  
کرام کی عبارتیں بھی نقل کی ہیں لیکن کیا مولانا کو یہ معلوم نہیں کہ جتنی حدیثیں آج حضرت صلی اللہ  
تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ ان میں ہر ہر حدیث آپ کی فرمودہ نہیں ہے۔  
اور نہ عملی طور پر آپ سے ثابت ہے، بلکہ ان میں بہت حدیثیں جعلی، خانہ ساز، ضعیف،  
شاذ، منکر اور معلول وغیرہ سبھی کچھ موجود ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ نہ توفیقہ حنفی



کی ہر ہر جزئی امام ابو حنیفہ رحمہ کی فرمودہ ہے اور نہ ہر ہر جزئی قابل عمل ہے اور مجتہد کا مصیب اور غلطی ہونا اس پر مستزاد ہے۔ پھر بعض فقہار کی غیر معصوم آرا کو حتیٰ اور ضروری سمجھ کر تمام احناف کا مسلک بتانا اور پھر اس پر اعتراض کی بنیاد رکھنا محض باطل اور مردود ہے۔ اور اگر بعض نے ایسا لکھا ہے تو اس کو سہو نسیان پر حمل کرنے کا دروازہ بند نہیں ہو جاتا اور احکام عمد و سہو میں فرق مخفی نہیں ہے۔ (دیکھئے بدور الابلہ ص ۷۷ وغیرہ) لیکن مسئلہ زیر بحث میں تو حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ سے یہ روایت منقول ہے کہ پچھلی دونوں رکعتوں میں قرأت سورۃ فاتحہ ضروری ہے اور اسی روایت کو حافظ ابن ہمام رحمہ نے پسند کیا اور ترجیح دی ہے (فصل الخطاب) اور حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ حافظ ابن ہمام اور علامہ بدر الدین عینی (وغیرہ) نے ثمرۃ افعال ذلک فی صلوٰۃ کلاہا کی حدیث سے پچھلی دونوں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے وجوب پر استدلال کیا ہے (فیض الباری جلد ۲ ص ۲۰۰) اور نیز علامہ سندھی حنفی (المتوفی ۱۱۴۰ھ) اسی حدیث سے ہر ایک رکعت میں وجوب سورۃ فاتحہ پر احتجاج کرتے ہیں (سندھی علی البخاری جلد ۱ ص ۹) اور اسی طرح دیگر محققین علماء احناف بھی پچھلی دونوں رکعتوں میں قرأت سورۃ فاتحہ کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لہذا مبارکپوری صاحب کا قیاس ساقط الاعتبار ہے جملہ علماء احناف پر یہ اعتراض تو ہرگز وارد نہیں ہو سکتا۔ البتہ مبارکپوری صاحب کا مقتدی کو اللہم اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْہَیْ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ..... الایۃ پڑھنے کا حکم دینا (دیکھئے ابکار المنن ص ۱۱۷ وغیرہ) یقیناً حدیث لا تقراء ابشیء من القرآن کے مخالف ہے۔

ساتواں اعتراض: مبارکپوری صاحب وغیرہ کہتے ہیں کہ اس حدیث فقراء الامام لہ میں لہ کی ضمیر حرف من کی طرف نہیں لوٹتی بلکہ یہ ضمیر الامام کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں حدیث کا معنی یہ ہو گا کہ جس شخص نے امام کی اقتدا کی۔ تو امام کی قرأت صرف امام کے لیے ہے یعنی مقتدی کو اپنی الگ اور جدا قرأت کرنا ہوگی۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۸)

جواب: یہ اعتراض یا بزم خود جو اب محض بیہودہ اور لغو ہے: اولاً۔ اس لیے کہ سو فیصدی

لہ یہ روایت بخاری جلد ۱ ص ۱۰۵ مسلم جلد ۱ ص ۱ اور نسائی جلد ۱ ص ۱۴ وغیرہ میں مروی ہے۔

۵۔ یہ قاعدہ ہدایت النخو ص ۱ کافہ ص ۱ جامی ص ۶ مفصل ص ۱۸ رضی جلد ۱ ص ۹۲۔ متن متین ص ۹ سوال

کابلی ص ۱۴ اور سوال باسولی وغیرہ نحو کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔

نجات کا اس بات پر اتفاق اور اجماع ہے کہ جب جملہ خبر واقع ہو تو لابدی ہے کہ اس جملہ میں ربط پیدا کرنے والی کوئی چیز ہو مظهر ہو یا ضمیر جو مبتدا کی طرف راجع ہو، عام اس سے کہ مذکور ہو یا مقدار اس حدیث میں من کان له امام حرف من مبتدا ہے جو شرط کے معنی کو متضمن ہے اور جملہ فقرۃ الامام له قرۃ اس کی خبر ہے جو جزا پر مشتمل ہے۔ اگر لہ کی ضمیر حرف من کی طرف راجع نہ ہو تو مولانا مبارکپوری صاحب اور ان کے اتباع ہی یہ ارشاد فرمائیں کہ من کی طرف کوئی ضمیر راجع ہوگی یا ربط پیدا کرنے والی یہاں کیا چیز ہے؟ کیا علم نحو فریق ثانی سے اتنا مرعوب یا ان کا اتنا خیر خواہ ہے کہ اس کو یہاں اپنا عمل کرنے کی توفیق ہی نہیں اور نہ اس میں اس کی ہمت اور جرات قارئین کرام! ملاحظہ فرمائیے کہ مبارکپوری صاحب (مع اپنے اتباع کے) کیسے جگر اور دل کے مالک ہیں کہ حضرات محدثین کرام کے تمام طے شدہ اصول اور ضوابط کو روندتے آئے ہیں جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں اور ابھی ہ

ابتدا نے عشق ہے روتا ہے کب آگے آگے دیکھتے ہوتا ہے کب اور ان کی یہ ستم ظریفی بھی دیکھتے کہ وہ کس بے جگری کے ساتھ گیر اور نحو کے مسلمات کو بھی پامال کرتے جا رہے ہیں جن کے تسلیم کرنے میں غیر مسلموں اور دہریوں کو بھی تاثر نہیں ہوا۔ مولف خیر الکلام ص ۴۹ میں لکھتے ہیں کہ بلکہ ضمیر مقدر بھی ہو سکتی ہے جیسے اَلْبُؤْمُنُوَانِ بِدِرْهَمٍ الْخِ الْجَوَاب: بے شک مقدر بھی ہو سکتی ہے۔ مگر وہاں جہاں ظاہر اور مذکور نہ ہو یہاں مقدر ماننے کا کون سا داعیہ ہے جبکہ ضمیر ظاہر موجود ہے؟ باقی علامہ ابوالحسن حنفی سندھی کے حاشیہ ابن ماجہ ص ۱۲۵ کے حوالہ سے جو عبارت مولف خیر الکلام نے ص ۴۹ میں اپنی تائید کے لیے نقل کی ہے۔ قِيلَ يَحْتَمِلُ... الخ تو لفظ قیل سے علامہ موصوف نے اس کی تریض اور تضعیف کر دی ہے کیونکہ عموماً یہ لفظ تریض کے لیے آتا ہے نہ وہ اس تاویل پر راضی ہیں اور نہ یہ ان کا اپنا قول ہے جیسا کہ مولف خیر الکلام نے ص ۴۹ میں یہ لکھ کر علامہ ابوالحسن حنفی نے بھی ضمیر مقدر نکالی ہے راہ فرار اختیار کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو صحیح بات سمجھنے کا سلیقہ عطا فرمائے۔

و ثانیاً۔ چونکہ فریق ثانی کا عامل بالحدیث ہونے کا دعویٰ ہے (اور ان کے زعم میں دوسرے لوگ جو ان سے اختلاف رائے رکھتے ہیں صرف فقہ اور اماموں کے قول سے احتجاج کیا کرتے



ہیں) اس لیے بطور نمونہ صرف چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ اس خود ساختہ قاعدہ کے تحت ان کا مطلب ہمیں سمجھا دیا جائے :

(۱) من كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته (بخاری وغیرہ) آپ کے اس قاعدہ کے

رُوسے اس کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہی حاجات پوری کرتا رہتا ہے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ)

(۲) من فرّج عن مسلم كربة فرّج الله عنه (بخاری وغیرہ) آپ کے اس قاعدہ کے لحاظ

سے معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے مصائب دور کرتا ہے (عیاذ باللہ تعالیٰ)

(۳) من بنى لله مسجداً بنى الله له بيتاً في الجنة (متفق علیہ) آپ کے گھر پر ضابطہ

کے لحاظ سے معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے لیے جنت میں گھر بناتا ہے۔ (نعوذ باللہ تعالیٰ) (من عادی

لی ولینافقہ بارزۃ بالحرب۔ (صحیحین) آپ کے خود ساختہ قانون کے لحاظ سے معنی یہ ہوگا کہ اللہ

تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو جنگ کرنے کا چیلنج کرتا ہے (معاذ اللہ تعالیٰ) اسی طرح من کان لله کان الله له ،

اور من کان یؤمن بالله والیوم الآخر فلیکرم خلیفہ اور من کنت مولاه فعلی رض مولاه وغیرہ وغیرہ

سیکڑوں حدیثیں ایسی ہیں جن میں اس خانہ ساز قاعدہ کو جاری کرنے کے بعد نہ توحید باقی رہ سکتی ہے۔

اور نہ اللہ تعالیٰ کی ذات منزہ اور مبرا ثابت ہو سکتی ہے اور اسی طرح اسلام کے دیگر اہم مسائل

کا ثابت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اس فصیح العرب والعم کی ذات گرامی کی طرف ایسے مہمل احکام

منسوب ہوتے ہیں جن کی فصاحت و بلاغت مسلم چلی آتی ہے کہ نہ تو آج تک آپ اس فن میں

کوئی نظیر پیدا ہوا اور نہ ہوگا۔ ع

بعد از حدیث بزرگ توئی قصہ مختصر

آٹھواں اعتراض: بعض نہایت سطحی قسم کے دوست یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اگر امام کی قرأت

مقتدیوں کے لیے کافی ہے۔ تو مقتدیوں کو رکوع، سجود اور تشہد وغیرہ امور ادا کرنے اور تسبیحات

پڑھنے کی بھی ضرورت نہ ہونی چاہیے کیونکہ امام ہی سب کچھ کرتا رہے گا بلکہ لوگوں کو اپنے گھروں میں

آرام سے بیٹھا رہنا چاہیے۔ امام خود سب کچھ ادا کرتا رہیگا۔ (ایک صاحب)

جواب: امام مقتدی کی طرف سے صرف قرأت قرآن میں کفایت کرتا ہے جیسا کہ آیت واذا

قرأی القرآن... الآية۔ اور حدیث واذا قرأوا منہم فاصتوا وغیرہ دلائل بسط اور تفصیل کے ساتھ

پہلے نقل کئے جا چکے ہیں اور نواب صاحب کے حوالہ سے عرض کیا جا چکا ہے کہ مقتدی کو مانعت صرف قرأت کی ہے اور حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی کہو۔ جب وہ رکوع اور سجود وغیرہ کرے تو تم بھی کرو۔ ہاں مگر جب امام قرأت شروع کرے۔ تم خاموش رہو۔ اس لیے باقی امور کو قرأت پر قیاس کرنا مع الفارق ہونے کے ساتھ نص کے مقابلہ میں ہے جو ہر طرح سے مردود ہے۔ بہر حال حضرت جابرؓ کی یہ مرفوع حدیث سنداً و معنیً بالکل صحیح ہے اور جہور کی دلیل اور حجت ہے البتہ حقائق سے چشم پوشی کرنے کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔

نواں اعتراض: مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ امام کی قرأت کا ثواب مقتدی کو ملتا ہے۔ مولانا عبدالحیؒ لکھنویؒ فرماتے ہیں کہ امام کی قرأت کا مقتدی کے لیے حکمی قرأت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ شارع نے مقتدی کو امام کی قرأت سے قاری کے حکم میں کیا ہے اور اس کو اس کا ثواب عطا کیا ہے (عمدة القاری جلد ۱ ص ۱۴۱) جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص مسجد میں بیٹھ کر نماز کا منتظر ہو وہ نماز میں ہوتا ہے پس ثابت ہوا کہ یہ حدیث قرأت خلف الامام کے منافی نہیں۔ (محصلہ ص ۱۲۹، ص ۱۳۰)

الجواب: یہ سب کچھ قلت فہم کا نتیجہ ہے، مولانا عبدالحیؒ نے بحوالہ علامہ عینیؒ اس شبہ کا جواب دیا ہے کہ جیسا اور ظاہراً تو امام قرأت کرتا ہے پھر اس کی قرأت کو مقتدی کی قرأت کیوں قرار دیا گیا ہے۔ جواب یہ دیا کہ جتنا ثواب امام کو ملے گا شریعت نے اتنا ہی ثواب مقتدی کے لیے بیان کیا ہے کہ اگرچہ وہ خاموش بھی رہے گا۔ (جیسا کہ ما زاد علی الفاتحہ میں وہ خاموش رہتا ہے) تب بھی اس کو پورا ثواب ملے گا نہ یہ کہ وہ پیچھے پڑھتا بھی رہے جیسا کہ منتظر صلوٰۃ کو نماز کا ثواب ملتا ہے یہ مطلب تو مرگز نہیں کہ وہ بیٹھا بھی رہے اور ساتھ ہی وہ رکوع و سجود وغیرہ کی حرکات بھی کرتا رہے یہ تو دو متضاد چیزیں ہیں یہ بھلا کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟ ہاں جس طرح منتظر نماز کو اپنے وقت میں حکمی نماز کا ثواب ملتا ہے اور جب وہ دوسرے موقع پر نماز ادا کرے گا تو اس کو حقیقی نماز کا ثواب ملے گا۔ اسی طرح نمازی کو بحالت اقتدار حکمی قرأت کا ثواب ملتا ہے اور فراغت امام کے بعد جب مبسوق اپنی قرأت کرے گا یا وہ منفرد ہو کر نماز پڑھے گا تو اس کو حقیقی قرأت کا ثواب ملے گا۔ اگر یہ مطلب نہ لیا جائے تو حکمی نماز کے



ساتھ تشبیہ اور تنظیر درست نہیں ہے کیونکہ حقیقی اور حکمی نماز و انگ انگ حالتوں میں ہوتی ہے۔ کہا  
او یخفی۔

بارھویں حدیث !

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسود بن عامرؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حسن بن صالحؒ  
نے بیان کیا اور وہ ابو الزبیرؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت جابرؓ سے، وہ فرماتے ہیں کہ  
آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

من كان له امام فقرأه الا امام له قراءة  
یعنی جس آدمی نے امام اقتداء کر لی ہو تو امام کی  
قرأت ہی مقتدی کی قرأت ہے۔

لہ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور احادیث ثابت لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۲۵) امام ابن معینؒ ان کو لا باس بہ  
اور ابن مدینیؒ ان کو ثقہ اور ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور صالح اور ابن سعدؒ ان کو صالح فی الحدیث کہتے ہیں۔ اور  
ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۴۲) اور حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تقریب  
لہ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور القدوة لکھتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو ثقہ حافظ اور متقن کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۲۵) امام  
احمدؒ ان کو ثقہ اور ابن معینؒ ان کو ثقہ اور مامونؒ کہتے ہیں، امام ابو زرؒ ان کو متقن فقیہ عابد اور زاہد کہتے ہیں،  
ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں، ابن سعدؒ ان کو فقیہ، حجت، صحیح الحدیث اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔  
دارقطنیؒ ان کو ثقہ اور عابد کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۸۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ  
فقیہ اور عابد تھے (تقریب ص ۸۶)

سلہ ابو الزبیرؒ کا نام محمد بن مسلم بن تدرسؒ تھا۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور المکثر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۱۹)  
امام ابن معینؒ، نسائیؒ اور یحییٰ القطانؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، یعقوب بن شبیبؒ ان کو ثقہ اور صدوق اور ابن مدینیؒ  
ان کو ثقہ اور ثبت اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقہ  
میں لکھتے ہیں۔ محدث سابق کا بیان ہے کہ وہ احکام میں حجت تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۲۵) عطاء بن  
ابی رباحؒ کا بیان ہے کہ جب ہم حضرت جابرؓ سے احادیث کی سماعت کر کے واپس آتے اور آپس میں مذاکرہ اور تکرار  
کرتے تو ابو الزبیرؒ حفظ روایات اور ان کی ادائیگی میں ہم سب سبقت لے جاتے تھے (ترمذی جلد ۲ ص ۲۴۰ و مسند دارمی ص ۴۹)  
لکھ یہ روایت مسند احمد جلد ۳ ص ۳۳۹، شرح مقنع للبکیر جلد ۱ ص ۱۱، فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۴۰ اور بغیۃ الالمعی جلد ۲ ص ۲۴۰ وغیرہ  
کتبوں میں موجود ہے۔

اس حدیث کا مطلب اور مفہوم بھی بلکہ من وعن الفاظ بھی وہی ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں اور یہ روایت سابق کی طرح اس بات پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اس روایت کے جملہ روایات ثقہ اور ثبت ہیں جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس سند پر فریق ثانی کی طرف سے کوئی اعتراض راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابوالزبیر مدلس تھے اور وہ اس روایت کو عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن یہ سوال باطل ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ جبہ و محمد بن ابوالزبیرؒ کی معنعن حدیثوں کو صحیح سمجھتے ہیں (زاد المعاد جلد ۴ ص ۶۵)

وثانیاً۔ پچھلے توجیہ النظر کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ ابوالزبیرؒ کا شمار ان مدلسین میں ہے جن کی تدلیس کسی صورت میں مضر نہیں ہے۔ ایک سند یوں آتی ہے عن ابی الزبیر عن سعید بن جبیرؒ... الخ امام دارقطنیؒ لکھتے ہیں۔ هذا اسناد صحیح (جلد ۱ ص ۱۳۳) امام دارقطنیؒ ان کی معنعن سند کو بھی صحیح کہتے ہیں۔

وثالثاً۔ حضرت عبداللہ بن شدادؒ وغیرہ ان کے ثقہ متابع موجود ہیں۔ بہر حال یہ روایت متصل اور صحیح ہے، اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حافظ شمس الدینؒ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں۔  
ولهذا اسناد صحیح متصل رجالہ کلہم ثقات۔ کہ یہ سند صحیح اور متصل ہے اور اس کے تمام راوی (شرح مقنع للکبیر جلد ۲ ص ۲۸۱ بحاشیہ معنی) ثقہ ہیں۔

حافظ شمس الدینؒ کا ترجمہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے اور علامہ ذہبیؒ ان کو امام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۴ ص ۲۷۳) مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۸۱ و ص ۲۸۲ میں دارقطنیؒ اور بیہقیؒ کی روایتوں کا سہارا لے کر حسن بن صالحؒ اور ابوالزبیرؒ کے درمیان جابرجہ جفی کا واسطہ بتایا ہے مگر مسند احمد کی سند میں کوئی واسطہ نہیں اور یہ روایت صحیح اور متصل ہے جیسا کہ ابھی ابن قدامہؒ کے حوالہ سے عرض ہو چکا ہے۔

تیسرے حدیث: امام ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے مالک بن اسماعیلؒ نے بیان کیا وہ حسنؒ لہ علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ، عظیم النظر، الثبت اور انحریر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۱) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔  
باقی حاشیہ نمبر ۱ اور نمبر ۲ اگلے



بن صالحؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابو الزبیرؒ سے اور وہ حضرت جابرؓ سے اور وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: کل من کان له امام فقرأتہ له قرأۃ۔

(الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۹)

ہر وہ شخص جس نے امام کی اقتدار کر لی ہو تو امام کا پڑھنا اس کا پڑھنا ہے۔ اس روایت کے بھی تمام راوی ثقہ ہیں، علامہ مارینیؒ فرماتے ہیں ہذا سند صحیح (الجوہر النقی) کہ یہ سند بالکل صحیح ہے۔ چودھویں حدیث: امام عبد الرحمنؒ بن حمیدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو نعیمؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حسن بن صالحؒ نے بیان کیا وہ ابو الزبیرؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت جابرؓ سے اور وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

من کان له امام فقرأتہ له قرأۃ کہ جس کا امام قرأت کرتا ہو تو اس کے امام کی قرأت ہی اس مقتدی کی قرأت ہے۔

یہ روایت بھی صحیح ہے، علامہ آلوسیؒ اس کو علی شرط مسلم صحیح کہتے ہیں (روح المعانی جلد ۱ ص ۱۳۳)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ نمبر ۱۳۳) ہیں کہ وہ احمد بن حنبلہؒ سے روایت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ انھوں نے مصنف نامی ایک کتاب لکھی ہے نہ ان سے پہلے کسی نے ایسی کتاب لکھی ہے اور نہ بعد (البدایہ جلد ۱ ص ۳۱۵) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں۔ (تقریب ص ۲۱۳)

۱۵۔ (پچھلا صفحہ) علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ اور اچھے کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۲۴) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ اور متقن لکھتے ہیں (تقریب ص ۲۲۴) امام نسائیؒ عجلیٰ ابو حاتمؒ اور یعقوب بن شیبہؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ اور ابن شائبہؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ عثمان بن ابی شیبہؒ ان کو صدوق، ثبت، متقن اور امام الائمہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۱۳) باقی روایت کی توثیق گزر چکی ہے۔

۱۶۔ علامہ ذہبیؒ ان کو امام اور حافظ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کان من الائمۃ الثقات (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۰۴) ان کی وفات ۲۴۹ ھ میں ہوئی ہے۔

۱۷۔ ان کا نام فضل بن دکیںؒ تھا۔ علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ اور الثبت کہتے ہیں۔ (تذکرہ ص ۳۳۸) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص ۳۱۳) باقی روایت کا ترجمہ پہلے گزر چکا ہے۔

۱۸۔ یہ روایت ابوہریرہؓ سے جوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۹، فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۳۹، شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۸ اور روح المعانی جلد ۱ ص ۱۵۹ وغیرہ میں موجود ہے۔

اعترض: مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ مسند عبد بن حمید کے قلمی نسخہ ص ۲۲ میں (جو مولانا شمس الحق کے کتب خانہ میں موجود ہے) حسن بن صالح کے بعد جابر جعفی کا نام موجود ہے۔ اور جابر مذکور ضعیف تھا۔ کیونکہ بعینہ یہ روایت دارقطنی جلد ۲ ص ۲۹ اور کتاب القراءة ص ۱ میں مذکور ہے اور ان میں ایسا ہی لکھا ہے۔ لہذا یہ روایت کمزور ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۱)

جواب: نہ معلوم مبارکپوری صاحب اتنے زود فراموش کیوں واقع ہوئے ہیں؟

تمہیں عادت ہے بھول جانے کی

اگر کاتب کا قلم سنا محمد بن منیع کے نسخہ میں عن جابر کا جملہ زیادہ لکھ سکتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ وہ عبد بن حمید کے قلمی نسخہ میں جابر جعفی کا جملہ نہیں لکھ سکتا؟ وہ کوئی بڑا منطقی اور فلسفی قلم ہے۔ کہ بظاہر مطبوعہ نسخوں میں تو کام کر سکتا ہے لیکن زاویہ غول میں پڑے ہوئے قلمی نسخہ میں مجبور و لاچار ہو کر رہ جاتا ہے؟ وہ قلم تھا یا کسی یونیورسٹی کا ماہر پروفیسر تھا؟ کیا بعید ہے کہ وہ قلم تقدیر ہی ہو جو مبارکپوری صاحب کی بگڑی ہوئی قسمت کو سنوارنے کے لیے پھر ایک مرتبہ چل پڑا ہو؟ حافظ شمس الدین ابن قدامہ کے حوالہ سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ حسن بن صالح کی ابو الزبیر سے روایت کو متصل بیان کرتے ہیں اور اس کی تصریح کرتے ہیں والحسن بن صالح ادرك ابا الزبير (جلد ۲ ص ۱۱) کہ حسن بن صالح نے ابو الزبیر اور ان کے زمانہ کو پایا ہے۔ اور اصول حدیث کا یہ قاعدہ ہے (جیسا کہ مسلم شریف کے مقدمہ وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے) کہ جمہور محدثین کے نزدیک اتصال سند کے لیے امکان لقار کافی ہے۔

حسن بن صالح کی ولادت ۱۰۰ھ میں ہوئی ہے اور ابو الزبیر کی وفات ۱۲۸ھ میں (دیکھئے تذکرۃ الحفاظ جلد ۱۱ وغیرہ) اگر اٹھائیس سال کے اس طویل عرصہ کے اندر بھی امکان لقار ثابت نہیں ہو سکتا اور سند متصل نہیں ہو سکتی تو سرے سے فن روایت اور حدیث کا ہی انکار کر دیجئے اور منکرین حدیث کی طرح یہ کہتے ہوئے حدیث سے سبکدوشی اختیار کر لیجئے کہ

یہ اُمت روایات میں کھو گئی

حقیقت خرافات میں کھو گئی

مؤلف خیر الکلام ص ۲۸ میں لکھتے ہیں کہ مگر حدیث کے فن کی بنیاد ہر جگہ امکان پر نہیں ہوتی اس



میں وقوع کو بھی دیکھا جاتا ہے۔۔۔ الخ

الجواب : یہی وہ غیر صحیح نظریہ ہے جس کو امام مسلمؒ نے صحیح کے مقدمہ میں پُر زور الفاظ سے رد کیا ہے اور اتصال سند کے لئے غیر مدلس میں امکانِ لقاء کو کافی سمجھا ہے اور یہی نظریہ جمہور محدثین کرامؒ نے اپنا یا ہے۔ علاوہ انہیں خود مؤلف خیر الکلام ص ۲۲۳ میں لکھتے ہیں کہ کیونکہ صحت حدیث کے لیے صرف استاد اور شاگرد کی ملاقات کا ممکن ہونا کافی ہے۔ عدم ثبوت نفی لازم نہیں آتی۔ اھ بلقظم اور یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں خواہ مخواہ دوسرے کی معقول بات کو توڑ مڑ دینا کہاں کا انصاف ہے؟

علاوہ انہیں امام احمدؒ ابو بکر بن ابی شیبہؒ شمس الدین بن قدامہ حافظ مزنیؒ علامہ مارونیؒ حافظ ابن ہمامؒ ملا علی قاریؒ اور علامہ آلوسیؒ وغیرہ یہ سند اسی طرح نقل کرتے ہیں عن حسن بن صالح عن ابی الزبیرؒ... الخ اور اس میں جابر جعفی کا ذکر تک نہیں کرتے۔ مگر شومئ قسمت کا کیا کہنا کہ ان کو نہ تو قلمی نسخہ دستیاب ہو سکا ہے اور نہ مہربان قلم مل سکا ہے۔ ورنہ ذرا سی جنبش ان کے لیے بھی کر ہی گذرتا۔ ع:

گلابِ مانیز زبانے و بیانے دارد

رہا دارقطنی اور بیہقی کی سند میں حسن بن صالحؒ اور ابو الزبیرؒ کے درمیان جابر جعفی کا واقع ہونا تو یہ اس پیش کردہ سند کے عدم اتصال کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ حسن بن صالحؒ نے یہ روایت براہِ راست ابو الزبیرؒ سے بھی سنی ہو۔ اور جابر جعفی سے بھی سنی ہو۔ کسی وقت وہ ابو الزبیرؒ سے روایت بیان کرتے ہوں گے اور کسی وقت جابر جعفی سے یا یوں کہ لیجئے کہ

۱۔ باقی حضرات کے حوالے اور ان کے تراجم آپ پہلے پڑھ چکے ہیں، حافظ مزنیؒ نے اپنی کتاب اطراف میں یہ سند یوں ہی نقل کی ہے اور اس میں جابر جعفی کا ذکر نہیں ہے۔ (دیکھئے الجہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۹) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ جمال الدین ابو النجاشیؒ یوسف بن الزہرؒ المزنیؒ (المتوفی ۶۴۲ھ) العالم، الحبر، الحافظ، الاوحد، محدث الشام، ثقہ، مجتہد اور کثیر العلم تھے۔ نیز لکھتے ہیں کہ طبقات رجال اور معرفت روایت میں کبھی کسی آنکھ نے ان کا نظیر نہیں دیکھا ہوگا (مذکرہ جلد ۲ ص ۲۱۰)

۲۔ علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابوبکرؒ کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے : ع

ایں خاندہ ہمہ آفتاب است

جب صحت حدیث کا خیال ہوگا اس وقت ابو الزبیر کا طریق بیان کر دیتے ہوں گے اور جب محض روایت پیش کرنا ہی مد نظر ہوگا اس وقت وہ جابر جعفی کی سند روایت بیان کر دیتے ہوں گے اور فن حدیث میں اسکی بجزرت مثالیں موجود ہیں اور علماء اصول اسکا اپنی اصطلاح میں المنید فی متصل الاسانید سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر مکتبے میں اگر بعض طرق میں روایت مروی عنہ کے درمیان زائد راوی آجائے تو یہ اس کی دلیل نہیں کہ جس طریق میں زائد راوی کا تذکرہ نہیں ہوا۔ وہ منقطع ہو یا اس سے عدم لقار ثابت ہو (دیکھئے شرح نخبہ الفکر ص ۲۵ وغیرہ) حضرت مولانا محدث محمد حسن صاحب فیض پوریؒ لکھتے ہیں کہ ابو الزبیر سے ذیل کے حضرات روایت کرتے ہیں۔ الحسن بن صالحؒ جیسا کہ مسند احمد وغیرہ کا حوالہ ہم نے دیا اور ایوب السخنیانیؒ بھی۔ (موطاء امام محمد و کتاب القراءۃ) اور عبداللہ بن لہیعہؒ بھی (کتاب القراءۃ) اور الفضل بن عطیہؒ (کتاب القراءۃ) اور جابر جعفی اور لیث بن ابی سلیمؒ بھی (طحاوی جلد ۱ و دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۶) (الدلیل المبین ص ۲۶) اگر مبارک پوری صاحبؒ اس پر بضد ہیں کہ کاتب صاحب کی غلطی ہی تسلیم کی جائے تو تب ہی دل کو تسکین ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔ تو لیجئے ہم ان کی اس ضد کو بھی مان لیتے ہیں۔ یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ اصل عبارت یوں ہو:

عن الحسن بن صالح وعن جابر الجعفی... الخ مطلب یہ ہوا کہ ابو نعیمؒ نے حسن بن صالحؒ اور جابر جعفی دونوں سے روایت کی ہو، لیکن کاتب سے قلمی نسخہ میں صرف حرف واؤ چھوٹ گیا ہو، کیونکہ واؤ کا کاتب میں چھوٹ جانا بہت آسان ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ کسی دیانت دار کاتب کا قلم عن جابر زیادہ لکھ دے۔ اگر کاتب کی غلطی کی تو جہد و تاویل ہی معتبر ہو سکتی ہے تو یوں کیوں نہ ہو جاتے؟ بلکہ ابن ماجہ ص ۱۱ کے بعض نسخوں میں اصل عبارت ہی اسی طرح ہے جس طرح ہم نے تحریر کی ہے۔ عن الحسن بن صالح وعن جابر... الخ اور مولف خیر الکلام نے ص ۲۸۱ میں اس کو دینی زبان سے تسلیم کیا ہے۔

پندرھویں حدیث: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے امام ابو حنیفہؒ نے بیان کیا فرماتے ہیں کہ ہم سے موسیٰ بن ابی عائشہؒ نے بیان کیا۔ وہ عبداللہ بن شدادؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت جابرؒ سے، انھوں نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من کان لہ امام فقراءۃ (امام لہ فقراءۃ) (موطاء امام محمد ص ۹) کہ امام کا پڑھنا ہی مقتدی کو کافی ہے اور بس، اس پر



اگلی قرأت نہیں ہے۔ یہ روایت کتاب الآثار لابن یوسف <sup>رحمہ اللہ</sup> اور طحاوی جلد ۱۲ اور کتاب الآثار لمحمد بن یحییٰ میں بھی ہے  
مؤلف خیر الکلام <sup>رحمہ اللہ</sup> میں لکھا ہے کہ یزید بن عیینہ کہتے ہیں اس میں امام ابو حنیفہ نے غلطی سے جابر کا لفظ بڑھا دیا ہے۔

الجواب: امام ابو حنیفہ ثقہ اور ثبت ہیں اور دیگر ثقہ راوی بھی اس حدیث کو اس طرح بیان کرتے ہیں، اس پر اس کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے ہاں البتہ امام ابو حنیفہ اور ان کے تلامذہ سے تعصب اور عناد کا کوئی علاج نہیں ہے اور اس متعصبانہ انداز سے امام صاحب کی جلالت اور حدیث کی صحت پر کوئی زد نہیں آتی۔

سولہویں حدیث: امام محمد فرماتے ہیں کہ ہم سے اسرائیلؑ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے موسیٰ بن ابی عائشہ نے بیان کیا۔ وہ عبد اللہ بن شدادؓ سے روایت کرتے ہیں اور وہ فرماتے ہیں:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی العصر۔ کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عصر کی نماز میں  
قال فقراً رجل خلفه فغمزه الذی یلیہ فلما امامت کرائی اور ایک شخص نے آپ کے پیچھے قرأت کی جو نماز  
ان صلی قال لم غمزتینی؟ قال کان رسول اللہ اس کے ساتھ کھڑا تھا اس نے اس کا بدن فراد دیا تاکہ  
صلی اللہ علیہ وسلم قد امک فکرهت ان تقرأ وہ قرأت سے باز آجائے۔ جب نماز ادا ہو چکی تو اس نے  
خلفه فسمعه النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال کہا تم نے مجھے کیوں ٹٹولا اور دبا دیا تھا؟ منع کرنے والے  
مَنْ کان لہ امام فان قرأتہ لہ قرأت۔ نے کہا کہ چونکہ حضورؐ کے قرأت کرتے تھے میں نے مناسب  
(موظا امام محمد ص) سمجھا کہ تم بھی قرأت کرو، اپنے ساتوارث و فرمایا کہ امام کا پیچھا

اس روایت کے تمام روایات کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور گو اس میں حضرت جابرؓ کا ذکر نہیں لیکن اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اولاً اس لیے کہ حضرت عبد اللہ بن شدادؓ خود صغیر صحابہ میں تھے۔ اور حضرت صحابہ کے مرسل ااتفاق حجت ہیں۔ وثانیاً۔ ویسے بھی کبار تابعین کے مرسل صحیح اور حجت ہیں جیسا کہ نقل کیا جا چکا ہے۔  
وثالثاً۔ ہم نے یہ روایت پہلی روایت کی تائید میں پیش کی اور مرسل مقصد کے

لہ امام محمد: مؤلف خیر الکلام <sup>رحمہ اللہ</sup> میں لکھتے ہیں کہ علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ امام نسائیؒ وغیرہ نے امام محمدؒ کو حافظہ کی بنا پر کمزور قرار دیا ہے۔ (محصلاً)

الجواب: مؤلف خیر الکلام <sup>رحمہ اللہ</sup> میں لکھتے ہیں کہ جرح کرنے والا اگر قنصت اور متشدد ہو، تو اس کی توثیق تو معتبر ہے مگر پھر گے لکھتے ہیں کہ متشددین میں ابو حاتم نسائیؒ ابن معینؒ ابن قطانؒ کو شمار کرتے ہیں۔ بلقطہ۔ لہذا امام نسائیؒ کی جرح کا کوئی اعتبار نہیں اور امام محمدؒ ثقہ ہیں جیسا کہ ابتداء کتب میں باحوالہ ان کی توثیق نقل کر دی گئی ہے۔

جنت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

مؤلف خیر الکلام جلد ۲۸۹ میں لکھتے ہیں کہ محدثین کا خیال ہے کہ یہ حدیث مرسل ہونے اور امام محمدؒ کی وجہ سے ضعیف ہے۔

الجواب: ہم باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ جمہور محدثین کے نزدیک مرسل صحیح ہے اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ امام محمدؒ ثقہ ہیں اور امام نسائی متعنت ہیں۔ ان کی جرح کا اعتبار نہیں، امام ابن قدامہؒ فرماتے ہیں کہ

ولنا مارواه الزمارة احمد عن وكيع  
عن سفیان عن موسى بن ابي عائشة عن  
عبد الله بن شداد قال قال رسول الله صلى  
الله عليه وسلم من كان له امام فان قرأه  
الامام له قرأة۔

اور ہماری دلیل وہ حدیث ہے جو امام احمدؒ نے وکیع سے روایت کی ہے اور وہ سفیان سے اور وہ موسیٰ بن ابی عائشہ سے اور وہ حضرت عبد اللہ بن شدادؒ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا امام ہو تو بے شک اس کے امام کی قرأت اسی کی قرأت ہے۔

(مغنی ابن قدامہ جلد اٹھواں)

یہ روایت بھی اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل واضح ہے اور پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن شدادؒ صحابی ہیں، لہذا ان کی روایت مرسل صحابی ہونے کے اعتبار سے مرفوع ہے اور اس میں امام محمدؒ بھی نہیں ہیں جن پر فریق ثنائی ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ امام وکیع بن الجراحؒ کو علامہ ذہبیؒ الامام، الحافظ، الثبت، محدث العراق اور احد الائمة الاعلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲۸۲) اور سفیانؒ اس سند میں ثوریؒ ہیں جن کا ترجمہ مقدمہ میں بیان ہو چکا ہے اور بقیہ روایت کے تراجم بھی پہلے عرض کیے جا چکے ہیں۔

ایک شاہد: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے قاضی ابو عمروؒ بن حسینؒ بن محمدؒ بن ہشیمؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الحسن عبد الواحد بن حسن نیشاپوریؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں میں کہ ہم سے حسین بن مہمان عسکریؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہ بن حمادؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے سلیمان بن سلمہؒ نے بیان کیا۔ وہ محمد بن اسحاق اندلسیؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے مالک بن انسؒ نے بیان کیا، وہ یحییٰ بن سعید انصاریؒ سے اور



وہ سعید بن المسیب سے اور وہ حضرت نواس بن سمان سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ

صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
صلوۃ الظهر وکان عن یمینی رجل من  
انصار فخرأ خلف النبی صلی اللہ علیہ  
وسلم وعلی یساری رجل من منینۃ یلعب  
بالحصی فلما قضی صلوۃ قال من قرأ خلفی؟  
قال الانصاری انایا رسول اللہ قال لا تفعل  
من کان لہ امام فقرأہ الامام لہ قرأہ۔  
(کتاب القراءة ص ۱۳۹)  
میں نے آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے ظہر کی نماز  
پڑھی میرے دائیں پہلو میں ایک انصاری آپ کے پیچھے  
قرأت کر رہا تھا اور میرے بائیں پہلو میں قبیلہ مزینہ کا  
ایک شخص سنگریزوں سے کھیل رہا تھا۔ جب آپ نماز  
سے فارغ ہوئے تو فرمایا کس نے میرے پیچھے قرأت کی ہے؟  
انصاری نے کہا کہ میں نے یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا  
پھر ایسا نہ کرنا جو شخص امام کی اقتدا اختیار کر لے تو امام کا  
پڑھنا ہی مقدمی کے لیے کافی ہے۔

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس روایت کی سند میں محمد بن اسحاق عکاشی ہے۔ تو وہ  
کذاب تھا ان کاں ہوا عکاشی... الخ کہتے ہیں واقعی عکاشی کذاب ہے لیکن سند میں اندلسی  
کا ذکر ہے اگرچہ بعض نے عکاشی اور اندلسی کو ایک کہا ہے لیکن محدث ابن عدنی ان کو دو  
بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں ہو رجل لا یعرف یعنی وہ مجہول اور مستور ہے اور حافظ ابن حجر بھی  
دو ہی قرار دیتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں کہ والراجح التفرقة (لسان جلد ۵ ص ۶) کہ راجح بات یہ ہے  
کہ دونوں الگ الگ ہیں اور مؤلف خبیہ الکلام ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ان کے بعض راوی  
اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی ہرج نہیں ہے (ص ۳۱۶) اور دوسری جگہ  
لکھتے ہیں کہ مستور کی روایت کو متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی ہرج نہیں ہے (ص ۲۲۵) اور یہ روا  
ہم نے بھی صرف تائید اور شاہد کے لیے پیش کی ہے تو اس میں کیا ہرج ہے؟ بہر حال ہمارا استدلال  
اس روایت سے نہیں بلکہ محض شاہد کے طور پر ہم نے اس کو نقل کیا ہے۔

ان سابق پیش کردہ روایات سے معلوم ہوا کہ ظہر اور عصر کی قید کو صرف امام ابو حنیفہؒ ہی نہیں  
بیان کرتے بلکہ دوسرے ثقہ راوی بھی اس کو بیان اور نقل کرتے ہیں۔ اس شاہد کے علاوہ تین روایتیں  
بند صحیح نقل کی جا چکی ہیں۔ جن میں ظہر یا عصر کی قید موجود ہے۔ اس شاہد کو چھوڑ کر بھی امام ابو حنیفہؒ

کے علاوہ اسرائیل اور طلحہ (جو دونوں ثقہ اور ثبت راوی ہیں) اپنی روایت میں ظہر یا عصر کی نماز کا ذکر کرتے ہیں۔ لہذا جو حضرات ظہر وغیرہ کی قید بیان کرنے میں صرف امام ابو حنیفہؒ کو متفرد کہتے ہیں۔ ان کی تحقیق صحیح نہیں ہے۔

سترہویں حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہ بن سلیمان بن الاشعثؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد الملک بن شعیب بن لیث بن سعدؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہ بن وہبؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے لیث بن سعدؒ نے بیان کیا۔ وہ طلحہؒ سے روایت کرتے ہیں وہ موسیٰ بن ابی عائشہؒ سے، وہ عبد اللہ بن شداد بن الہاد سے، وہ

امام بیہقیؒ کا ترجمہ ص ۱۱ میں اور حافظ ابو عبد اللہؒ اور حافظ ابو علیؒ کا باب اول میں مجاہدؒ بن جبر کے اثر کے ذیل میں اور لیث بن سعدؒ کا مقدمہ میں اور موسیٰ بن ابی عائشہؒ اور عبد اللہ بن شدادؒ کا عنقریب گزر چکا ہے۔ عبد اللہ بن اشعثؒ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثقہ (میزان جلد ۳ ص ۴۳) اور العلامة اور قدوة المحدثین اور الحافظ الکبیر کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۹) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ من کبار الحفاظ اور من ائمة الاعلام تھے (لسان جلد ۲ ص ۲۹) محدث خلیلیؒ کا بیان ہے کہ وہ حافظ اور امام وقتہ اور متفق علیہ تھے (ایضاً ص ۲۹) اور وہ امام ابو داؤدؒ صاحب سنن کے فرزند ارجمند تھے۔

۱۷ ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور نسائی ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں، صحیح مسلم میں ان کی پچاس حدیثیں ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۹) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص ۲۳)

۱۸ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، الفقیہ اور احد ائمة الاعلام تھے۔ ایک لاکھ حدیث ان سے مروی ہے (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۸) خلیلیؒ کا بیان ہے کہ وہ بالاتفاق ثقہ تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۳)

۱۹ امام احمدؒ ان کو لو باس بن ابن مدینیؒ ان کو معروف ابو زرعہؒ ان کو ثقہ اور ابو حاتمؒ ان کو صالح کہتے ہیں۔

امام لیثؒ ان کی تعریف کرتے تھے۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۵ ص ۱۹) حافظ ابن حجرؒ

لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص ۱۸) اور تہذیب التہذیب وغیرہ میں تصریح ہے کہ لیث بن سعدؒ نے

اسی طلحہؒ سے روایت کی ہے روای عنہ اللیث.... الخ اور اس سند میں بھی لیث بن سعدؒ طلحہؒ

سے روایت کرتے ہیں، یہ تک بندی نہیں جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۳۸۵ میں یہ کہہ کر جان بچانے کی ناکام سعی کی ہے۔



ابو الولید سے اور وہ حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

ان رجلاً صلی خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الظہر والعصر یعنی یقرأ فاعطی الیہ رجل فنہاہ فابی فلما انصرف قال انتہانی ان اقرأ خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فتذاکراحتی سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال رسول اللہ علیہ وسلم من صلی خلف امام فان قرأۃ الامام لہ قرأۃ۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۰۲)

کہ ظہر یا عصر کی نمازیں ایک شخص نے آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کی۔ اثنائے نمازیں ایک آدمی نے اشارہ سے اس کو قرأت سے منع کیا۔ لیکن وہ قرأت سے باز نہ آیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو قرأت کر نیوالے نے منع کرنے والے کو کہا کہ تم مجھے آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت سے کیوں روکتے ہو؟ دونوں آپس میں ٹکرا کر رہے تھے کہ آپ نے ان کی گفتگو سن لی اور ارشاد فرمایا کہ جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھتا ہو اس کو (الگ قرأت نہیں کرنی چاہیے بلکہ) امام کی قرأت ہی اس کو کافی اور بس ہے۔

اور اس روایت کا ذکر اپنی سند کے ساتھ امام ابن قدامہ نے بھی کیا ہے مگر اس میں ظہر یا عصر کا

ذکر نہیں اور آخر میں ہے:

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان لک امام یقرأ فان قرأتہ لک قرأۃ۔ (معنی ج ۱ ص ۹۰)

کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تیرا امام قرأت کر رہا ہو تو اس کی قرأت ہی تیرے لیے کافی ہے۔

اس صحیح روایت میں ظہر یا عصر کی نماز کا ذکر ہے جو بالاتفاق سب سے زیادہ صحیح ہے۔ اور آپ کے

پیچھے قرأت کر نیوالا صرف ایک شخص تھا حالانکہ حضرات صحابہ کرام میں سے کئی حضرات بھی پڑھ سکتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کی یہی دلی خواہش ہوتی تھی کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز پڑھی جائے مگر باوجود اتنی بڑی عبت کے کثیر التعداد حضرات صحابہ میں سے نہ کسی نے آپ کے پیچھے قرأت کر نیوالا صرف ایک شخص ملتا ہے اور باقی سب خاموش رہتے ہیں۔ لیکن آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتے ہیں۔ اگر امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت ہوتی خصوصاً سب سے زیادہ عزیزوں میں تو یقیناً آپ اس کی تائید فرماتے اور قرأت سے روکنے والے کو تنبیہ فرماتے اور اگر

امام کے پیچھے قرأت کی گنجائش ہوتی خاص کر ستری نمازوں میں تو عین نماز کی حالت میں احسانِ صلوٰۃ سے صرف نظر کرتے ہوئے منع کرنے والے صحابی قرأت کرنے والے کو منع کرنے کی کبھی جرأت نہ کرتے۔ اور اگر سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کا استحباب یا جواز بھی ہوتا تو منع کرنے والے کو آپ فرمادیتے کہ ایک جائز اور مستحب حکم کی وجہ سے تم نے نماز میں اپنی توجہ کیوں دوسری طرف مبذول کر دی تھی؟ اور دوسرے حضرات صحابہ کرامؓ بھی منع کرنے والے کو یہ نہیں کہتے کہ بھائی تم نے اثنائے نماز میں بلا وجہ اس سے الجھنے کی کوشش کی ہے، یہ بھی تو اچھا کام ہی کر رہا تھا۔ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو بغیر کسی خارجی قرینہ کے یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ چہری نمازوں کا تو قصہ ہی چھوڑ لیے ان میں بھلا امام کے پیچھے قرأت کی کب اجازت نکل سکتی ہے؟ سری نمازوں میں بھی امام کے پیچھے قرأت کرنا نہ تو جائز ہے اور نہ مستحب پھر ضروری کہاں سے ہوگا؟ اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مطلق قرأت سے منع کیا ہے۔ اس لیے اس کو محض اپنی رائے سے قرأت دون قرأت پر حمل کرنا باطل اور مردود ہوگا۔ اور یہ روایت حضرت جابرؓ سے مروی ہے، جو قرأت کا اولین اطلاق سورہ فاتحہ اور ام الکتاب میں منحصر سمجھتے ہیں۔ لہذا قرأت کو مازاد علی الفاتحہ پر حمل کرنا توجیہ القول بمعادید ضعی بہ قائلہ کا ارتکاب کرنا ہوگا۔ جو محض بے بنیاد اور بیگار ہے۔

پہلا اعتراض: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں لیثؒ سے اوپر کی سند میں عبد الملک بن شعیبؒ نے غلطی کی ہے۔ .... الخ (کتاب القراءة ص ۱۲) اور اسی کا ذکر مولف خیر الکلام نے ص ۲۸۳ میں کیا ہے۔

جواب: جب یہ راوی بالاتفاق ثقہ ہیں اور بالذات پہلے یہ بات نقل کی جا چکی ہے کہ ثقہ کی زیادت متن اور سند دونوں میں بالاجماع حجت ہے اور یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ جب حدیث کے ارسال اور اتصال اور رفع و وقف کے بارے میں ثقہ روایات کا اختلاف ہو تو بالاتفاق وہ حدیث موصول اور مرفوع ہی تصور ہوگی اور ثقہ روایت کی تصحیح صحیح ہوتی ہے اس لیے امام بیہقیؒ وغیرہ کا یہ خلاف اصول اعتراض قابل التفات نہیں ہو سکتا



یہ حدیث بھی بہر حال موصول اور مرفوع ہی ہوگی۔

دوسرا اعتراض: امام بیہقیؒ اور امام دارقطنیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ابوالولید مجہول ہے تو یہ روایت کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ (کتاب القراءت ص ۱۳۰ و دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۳ اور مؤلف خیر الکلام ص ۴۸۳ میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں ابوالولید مجہول ہے۔ لہذا یہ قابل اعتبار نہیں)

جواب: واقعی یہ اعتراض قدرے معقول نہا ہے لیکن درحقیقت یہ بھی نہایت ہی سطحی ہے اور غلط فہمی کا نتیجہ ہے، کیونکہ ابوالولید کوئی الگ اور جدا گانہ ہستی نہیں، بلکہ ابوالولید عبد اللہ بن شدادؓ کی کنیت تھی۔ چنانچہ امام حاکمؒ لکھتے ہیں:

عبد اللہ بن شدادؓ ہو بنفسہ ابوالولید یعنی ابوالولید خود بعینہ عبد اللہ بن شدادؓ ومن تھا ومن بمعرفة الاسامی اور ثلہ تھے لیکن جن لوگوں نے روایت کے ناموں میں غفلت اور کوتاہی سے کام لیا ان کو ایسا وہم ہو جانا مثل هذا الوهم۔

کچھ بعید نہیں ہے۔

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں کہ  
عبد اللہ بن شدادؓ اصل مدینی و کنیتہ  
ابوالولید۔  
ان کی کنیت تھی۔

(معرفت علوم الحدیث، طبع قاہرہ ص ۱۶۸)

۱۔ لطیفہ: امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ بعض نے ایک طریق سے میری روایت نقل کی ہے اور اس میں ابوالولید کا جملہ ساقط کر دیا ہے اور دوسرے طریق میں عبد اللہ بن شدادؓ کا نام اڑا دیا ہے اور یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ ابوالولید عبد اللہ بن شدادؓ کی کنیت ہے، لیکن یہ انصاف سے بعید ہے۔ (کتاب القراءت ص ۱۳۰، امام حاکمؒ وغیرہ نے امام بیہقیؒ کا مغالطہ تو ایسا نکالا کہ ان کو شاید لب کشائی کی ہمت ہی نہ رہے۔ مگر خود انھوں نے سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۵۹ میں ابوالولید کا جملہ ساقط کر دیا ہے اور پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ امام بیہقیؒ نے امام مسلمؒ کی ایک عبارت میں مغالطہ دینے کی سعی فرمائی ہے۔ فسا محہ اللہ تعالیٰ بصوم فضلہ۔

علاوہ ازیں تاریخ بغدادی جلد ۹ ص ۴۷۳، جامع المسانید جلد ۱ ص ۳۳، کتاب الکفای دولابی جلد ۲ ص ۱۲۲، تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۱، لسان المیزان جلد ۶ ص ۲۲۵، تقریب ص ۲۰۲ اور توجیہ النظر ص ۱۹ وغیرہ کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے کہ ابو الولید عبد اللہ بن شدادؒ کی کنیت تھی۔ گویا اس لحاظ سے سند کی اصلی عبارت یوں تھی: عن عبد اللہ بن شداد ابی الولید... الخ روایت میں سے کسی نے ابو الولید کو بابت سے الگ سمجھ کر ایک جدا ہستی اور مستقل راوی سمجھ لیا ہے اور اسی حقیقت کو امام بیہقیؒ اور دارقطنیؒ نہ پاسکے۔ عربی زبان میں کنیت نام سے پہلے بھی آتی ہے اور نام کے بعد بھی آسکتی ہے۔ مثلاً دیکھئے محمد بن عبد الرحمنؒ ابو الاسود، محمد بن مقاتلؒ ابو الحسن (صحیح بخاری جلد ۲ ص ۶۱ وغیرہ) اور یحییٰ بن یحییٰؒ ابو زکریا (بخاری جلد ۲ ص ۸۴ وغیرہ) وغیرہ اور جملہ ابو الولید اعادہ جار کے ساتھ عبد اللہ بن شداد سے بدل بھی ہو سکتا ہے۔ (ہامش شرح نخبہ ص ۱۱)

مؤلف خیر الکلام کا صریح بہتان: جب ان ٹھوس حوالوں سے مؤلف مذکور کا سرچکر آیا تو انھوں نے یہ لکھ مارا کہ پھر امام حاکمؒ تو غلطی کی نسبت امام ابو حنیفہؒ کی طرف کر رہے ہیں کہ وہ ابو الولید کو الگ سمجھ کر سند میں بڑھا رہے ہیں کیونکہ ان کو روایت کے اسامی کی معرفت نہیں... الخ ص ۴۸۲، حالانکہ یہ امام حاکمؒ پر خالص بہتان ہے۔ امام حاکمؒ نے اول سے آخر تک اس عبارت میں کہیں اس کی تصریح نہیں کی کہ اس میں امام ابو حنیفہؒ نے غلطی کی ہے وہ تو ومن تھا ومن بمعرفۃ الاسامی اور ثہ مثل هذا الوهم کے عمومی الفاظ بول رہے ہیں کیونکہ مَنْ شرطیہ عموم کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ بیان ہوگا، لیکن غیر مقلدین کے شیخ الحدیث کے نزدیک اس حرف مَنْ سے صرف امام ابو حنیفہؒ ہی مراد ہیں۔ اور ص ۴۸ میں مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ اسی بنا پر حاکم نے امام ابو حنیفہؒ پر اعتراض کیا ہے۔ اور آگے لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کو مورد طعن قرار دیا ہے... الخ امام حاکمؒ نے اس وہم کی نسبت قطعاً امام ابو حنیفہؒ کی طرف نہیں کی۔ وہ تو حرف من استعمال کر رہے ہیں جو غیر مقلدین حضرات کے شیخ الحدیث کے نزدیک عموم کے لیے نص قطعی ہے جیسا کہ اپنے مقام پر بیان ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ یہ ہے ان کی دیانت۔ فوالسفا۔



اٹھارھویں حدیث: امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو احمد بکر بن محمد بن حمدان الصیرفی نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد الصمد بن فضل البلخیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے مکی بن ابراہیمؒ نے بیان کیا۔ وہ امام ابو حنیفہؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ موسیٰ بن ابی عائشہؒ سے اور وہ عبد اللہ بن شاذان بن الہاد سے اور وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے۔

ان رجلا قرأ خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم في الظهر والعصر فاذا ما اليه رجل فنهاه فلما انصرف قال اتنها في (الحديث)

وہ فرماتے ہیں کہ ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کر رہا تھا۔ نماز ہی کی حالت میں ایک شخص نے اشارہ سے اسے قرأت کرنے سے منع کیا مگر وہ باز نہ آیا۔ نماز کے بعد کہنے لگا تم مجھے قرأت سے منع کرتے ہو؟

(بحوالہ روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۴)

یہ روایت امام ابو یوسفؒ کی کتاب الآثار ص ۲۳ میں بھی ہے اس کے آخر میں ہے کہ حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ من صلی خلف امام فان قرأه الا ما مله قرأه۔

آگے روایت کا بعینہ وہی مضمون ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ پہلی روایت میں اصل مضبوط اور اس کی تشریح دیکھ لیں۔ امام حاکمؒ، مستدرک جلد ۱ ص ۴۹۶، ۲ ص ۱۲ وغیرہ میں ایک سند اس طرح پیش کرتے ہیں۔ اخبرنا بکر بن محمد بن حمدان الصیرفی نا عبد الصمد بن الفضل البلخی نا مکی بن ابراہیمؒ.... الخ اور فرماتے ہیں۔ صحیح ہے علامہ ذہبیؒ تلخیص المستدرک میں اس کے بارے میں صحیحؒ کہتے ہوئے صحت کا فیصلہ صادر کرتے ہیں اور بقیہ روایات کا ترجمہ گزر چکا ہے۔ مؤلف خیر الکلام ص ۴۸۸ میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے جملہ راوی سوائے امام ابو حنیفہؒ کے ثقہ ہیں اور جابر کے ذکر میں امام ابو حنیفہؒ کی طرف غلطی کی نسبت کی گئی ہے... الخ اور اس سے پہلے بحوالہ سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۹ لکھتے ہیں کہ ایک جماعت نے امام ابو حنیفہؒ سے اسی طرح موصول بیان کی ہے اور عبد اللہ بن المبارکؒ نے ان سے مرسل بیان کی ہے۔ جابر کا ذکر نہیں کیا اور یہی محفوظ ہے۔

الجواب: پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ ثقہ اور شریعت تھے لہذا ان کی تضعیف بغیر تعصب کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور حیب امام بیہقیؒ خود فرماتے ہیں کہ روایت کی ایک

خاصی جماعت اس روایت کو موصول بیان کرتی ہے اور اس میں حضرت جابرؓ کا ذکر ہے اور تنہا امام ابن مبارکؒ اس کو مرسل بیان کرتے ہیں تو جماعت کی روایت موصول ہی کیوں نہ محفوظ ہو جب کہ حقیقت وہ ہے بھی صحیح محفوظ اور موصول۔

انیسویں حدیث: امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو یحییٰ زکریاؒ بن الحارثؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن انیسؒ سرجزیؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے خلفؒ بن ابی ربیعؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے قاضی ابو یوسفؒ نے بیان کیا۔ وہ امام ابو حنیفہؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ موسیٰ بن ابی عائشہؒ سے اور وہ عبد اللہ بن شداد ابو الولیدؒ سے اور حضرت جابرؓ سے اور وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

من صلی خلف امام فان قرأ تلک قرأۃ۔ کہ جو آدمی امام کے پیچھے نماز پڑھے سو اس کے امام کا (معرفت علوم الحدیث ص ۱۷۸، طبع قاہرہ) پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے۔ (اس کو الگ قرأت کی ضرورت

نہیں)

۱۰ علامہ عبدالقادر القرشیؒ لکھتے ہیں کہ الامام المنزکی الفقیہ احمد مشائخ اصحاب ابی حنیفہ فی عصرہ واحد العباد تھے۔ (الجواہر جلد ۱ ص ۲۴۵)

۱۱ علامہ عبدالقادر القرشیؒ لکھتے ہیں کہ وہ من آئمة اصحابنا الخراسانیین اور اصحاب طبقہ عالیہ میں تھے۔ (الاجزایر المضمیہ جلد ۲ ص ۳۱) اور فاضل لکھنویؒ نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ (فوائد ہندیہ ص ۱۶۰)

۱۲ محدث ابن جانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ علامہ خلیلیؒ ان کو صدوق اور مشہور کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۱۲۸) علامہ فہرستیؒ کا بیان ہے کہ وہ احد الفقہاء الزوہاء، صاحب علم، عامل اور بڑے خدا پرست تھے (میزان جلد ۳ ص ۳۱۱)

۱۳ قاضی ابو یوسفؒ اور امام ابو حنیفہؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے اور دیگر روایت کے تراجم بھی یہاں دیے گئے ہیں۔ فائدہ: محدثین کرامؒ کی اصطلاح میں سند کے ایک راوی کے بدلنے سے روایت بدل جاتی ہے۔ اسی اصول کے پیش نظر ہم نے ان حدیثوں کا الگ الگ شمار کیا ہے۔ اس امر کو بخوبی ملحوظ رکھیں تاکہ غلط فہمی پیدا نہ ہو۔



یہ روایت بھی سند کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ علامہ ذہبیؒ ایک سند کو جس میں انا ابو یوسف القاضی انا ابو حنیفہؒ الخ آتا ہے لکھتے ہیں :  
 هذا اسناد متصل عال (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۷۱) کہ یہ سند متصل اور بلند پایہ ہے اور مفہوم  
 و مفہوم کے اعتبار سے بھی یہ روایت واضح ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ مؤلف خیر الکلام سے رہا نہیں  
 گیا۔ صفحہ ۴۹۰ میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بھی امام ابو حنیفہؒ کی ہے۔۔۔ الخ

**الجواب :** ہاں یہ روایت امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے جو ثقہ اور ثبت ہیں بغیر کسی  
 متعصب کے کون ان کی روایت کو رد کر سکتا ہے؟ جن کی علمی تحقیق سے امام سحنی القطانؒ اور ابن معینؒ  
 وغیرہ ائمہ جرح و تعدیل نے اپنے دامن بھرے اور ان کی تقلید کو اپنے گلے کا ہار بنایا ہے۔ دیکھئے  
 طائفہ منصورہ اور مقام ابی حنیفہؒ وغیرہ۔ رہا مؤلف خیر الکلام کا ص ۴۹ میں حوالہ تحقیق الکلام جلد ۱  
 یہ لکھنا کہ ابن عبد البرؒ نے لکھا ہے کہ وہ اہل حدیث کے ہاں سنی الحفظ ہیں اور علی بن المدینیؒ نے  
 سخت ضعیف کہا ہے (محصلہ) تو یہ بے سود ہے خود مؤلف خیر الکلام ص ۴۲ الرفع والتکملہ  
 کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ سنی الحفظ جرح غیر مفسر ہے جو قابل اعتبار نہیں (محصلہ) اور اسی صفحہ  
 میں لکھتے ہیں کہ اگر تعدیل کرنے والے زیادہ ہوں تو ان کا اعتبار ہوگا۔ اور ہم مبسوط اور باحوالہ بحث عرض  
 کر چکے ہیں کہ اکثر امت نے امام موصوفؒ کو ثقہ کہا ہے اور مؤلف خیر الکلام ص ۲۱ میں لکھتے ہیں کہ  
 اور ہم جرح توثیق کے بعد مقبول نہیں ہوتی۔ اور ص ۲۲ میں لکھتے ہیں کہ توثیق کے بعد جرح غیر مفسر  
 معتبر نہیں ہوتی پس وہ قطعاً ثقہ ہے۔۔۔ الخ اور یہی ہم کہنا چاہتے ہیں اور ان صحیح روایات سے  
 بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے علاوہ امام سفیان ثوریؒ، شریکؒ،  
 طلحہؒ اور ابو الزبیرؒ وغیرہ اس روایت کو موصول بیان کرتے ہیں اور حضرت جابرؒ کا ہر روایت میں ذکر  
 آتا ہے۔ اسی طرح امام ابو حنیفہؒ سے قاضی ابو یوسفؒ مکیؒ ابن ابراہیمؒ اور محمد بن الحسنؒ وغیرہ بلکہ بقول  
 امام بیہقیؒ محدثین کی ایک خاصی جماعت اس روایت کو موصول بیان کرتی ہے اور ظہر یا عصر کی قیدیہ  
 کرنے میں بھی امام ابو حنیفہؒ متفرد نہیں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں اور ہر ایک روایت کے ایک  
 ایک راوی کی توثیق بھی عرض کر دی گئی ہے۔ اندریں حالات یہ دعویٰ کرنا کہ امام ابو حنیفہؒ اس  
 میں متفرد ہیں یا ان کا کوئی شاگرد متفرد ہے، یا یہ روایتیں معلول ہیں۔ انصاف کا خون کرنا ہے۔ یہ

باحوالہ وائل بھی دیکھیے اور مؤلف خیر الکلام کی ہوائی طفل تسلی بھی دیکھیے کہ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ یہ حدیث مرسل ہے اور مرسل ضعیف ہوتی ہے اور موصول بیان کرنے والے صرف امام ابو حنیفہؒ ہیں باقی روایات سب کے سب ضعیف یا مجہول ہیں... الخ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

بیسویں روایت: امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن مخلدؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے شعیب بن ایوبؒ وغیرہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے زید بن جابرؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے معاویہ بن صالحؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الزہیرؒ نے بیان کیا۔ وہ اکثر بن مرہؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت ابو الدرداءؒ سے۔ وہ فرماتے ہیں:

۱۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام شیخ الاسلام اور حافظ زمان لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۱۸۳)۔  
۲۔ حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ مشہور اور اعلیٰ اہل عصمہ لکھتے ہیں۔ (لسان المیزان جلد ۵ ص ۳۶۴)  
۳۔ دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، ابن جابرؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ امام حاکمؒ ان کو ثقہ اور یاقوتؒ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۳۴۹)

۴۔ علامہ ذہبیؒ ان کو العابد الثقہ اور الصدوق لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۳۶۲ و تذکرہ جلد ۵ ص ۳۲۰)  
۵۔ علامہ خطیبؒ ان کو صاحب حدیث اور دانا محدث لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۸ ص ۴۳۳) امام ابن معینؒ علی بن مدینیؒ، عجلؒ، ابو جعفر بستیؒ، احمد بن صالحؒ، دارقطنیؒ، ابن ماکولؒ اور یعقوب بن شیبہؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن جابرؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن یونسؒ ان کو حسن الحدیث اور ابو حاتم صدوق اور صالح کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۴۰۰)

۶۔ ان کا ترجمہ باب اول میں حضرت ابن عباسؓ کے اثر کے ذیل میں گذر چکا ہے۔

۷۔ امام ابن معینؒ، عجلؒ، یعقوب بن سفیانؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ اور دارقطنیؒ لا بأس بہ اور ابن سعدؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۲ ص ۲۱۸)

۸۔ علامہ ابن سعدؒ اور عجلؒ ان کو ثقہ اور ابن خراشؒ صدوق کہتے ہیں، نسائیؒ لا بأس بہ کہتے ہیں اور ابن جابرؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۸ ص ۴۲۹) حافظ ذہبیؒ ان کو الفقیہ، امام عالم، عامل اور عالم اہل حص لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۴۹)



سُئِلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
 فِي كُلِّ صَلَاةٍ قِرَاءَةً قَالَ نَعَمْ فَقَالَ جِبِلٌّ  
 مِنْ آلِهِ نَصَارٌ وَجِبَّتْ هَذِهِ فَقَالَ  
 لِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
 وَكُنْتُ أَقْرَبَ الْقَوْمِ إِلَيْهِ مَا رَأَيْتُ الْوَهَامَ  
 إِذَا مَا الْقَوْمُ الْوَكْفَاهِمَ۔  
 (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۶)

کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے  
 سوال کیا گیا کہ کیا ہر نماز میں قراءۃ ہے؟ آپ نے  
 فرمایا ہاں۔ ایک انصاریؓ نے کہا پھر تو قرأت  
 ضروری ہوگئی؟ ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ میں  
 تمام اہل مجلس میں جناب رسول خدا صلی اللہ  
 تعالیٰ علیہ وسلم کے قریب تھا۔ آپ نے مجھ سے خطا  
 کرتے ہوئے فرمایا یہ یقینی جانتا ہوں کہ امام کی قرأت  
 مقتدیوں کو کافی ہے۔

یہ روایت مسند احمد جلد ۱ ص ۴۴، نسائی جلد ۱ ص ۱۱۸ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۲،  
 طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۹ اور مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۱ وغیرہ کتابوں میں مذکور ہے، بیہوشی فرماتے ہیں۔  
 (اسناد حسن) اس روایت میں حضرت ابوالدرداءؓ اس بات کی تصریح کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ جناب  
 رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا تھا۔ اور جواب بھی آپ ہی نے ارشاد فرمایا  
 اور حضرت ابوالدرداءؓ جلیل القدر صحابی تھے۔ اس لیے غیر رسول اور جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ  
 علیہ وآلہ وسلم میں یقیناً فرق اور تمیز کرتے ہوں گے۔ اور اس کی بھی تصریح کرتے ہیں کہ میں سب زیادہ  
 آپ کے قریب تھا۔ اور آپ نے خطاب کرتے وقت اور جواب دیتے وقت خاص طور پر میری طرف  
 توجہ فرمائی تھی۔ اگر اتنے قوی اور اندرونی قرات کے ہوتے ہوئے بھی یہ روایت مرفوع نہیں تو کوئی  
 روایت علم حدیث میں مرفوع ہوگی؟ چونکہ اس روایت میں سب سے زیادہ قوی اور جہری کی کوئی قید مذکور نہیں ہے  
 اس لیے یہ تمام نمازوں کو شامل ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ وہ مازاد یا جہر پر محمول ہے۔ (ص ۳۲۱)  
 بالکل مردود ہے کیونکہ بقول مؤلف مذکور قرأت سورۃ فاتحہ سے ہی شروع ہوتی ہے (کما حق)  
 پھر اس کو مازاد پر کون حمل کرنے دیتا ہے؟ اور روایت میں لفظ قرأت ہے جہر نہیں قرأ کو جہر پر  
 حمل بالکل بے بنیاد ہے۔ اور ایسی رکیک اور دوراز کار توجیہات کون سننا ہے؟

اعترض: امام نسائیؒ، دارقطنیؒ اور بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت حضرت ابوالدرداءؓ  
 پر موقوف ہے۔ زید بن جبابؓ نے اس حدیث کو مرفوع بیان کرنے میں غلطی کی ہے۔ (نسائی)

جلد ۱۰ ص ۱۰، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۶، کتاب القراءۃ ص ۱۱۸ اور یہی باتیں مؤلف خیر الکلام دہرائی ہیں۔ ملاحظہ ہو ص ۲۹۹ و ص ۵۰۱ و ص ۵۰۲ اور یہی کچھ ترجمان الحدیث ماہ دسمبر ۱۹۷۲ء ص ۲۲ تا ص ۲۴ اور ماہ جنوری ۱۹۷۳ء ص ۲۲ تا ص ۲۶ لکھا گیا ہے کہ فلاں نے اس کو قوف کہا اور فلاں اور فلاں نے۔

**جواب:** یہ اعتراض قطعاً باطل ہے: **اولاً** — اس لیے کہ زید بن حباب بالاتفاق ثقہ ہیں۔ اور ثقہ راوی کی متن سند میں ہدایت بالا جماع مقبول ہوتی ہے جس کی پوری تفصیل گذر چکی ہے۔ **وثانیاً** — یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ حدیث کے موقوف اور مرفوع ہونے کی صورت میں تمام محدثین کے نزدیک روایت موصول اور مرفوع ہی سمجھی جائے گی۔ **وثالثاً** — اگر تنہا زید بن حباب ہی اس کو مرفوع روایت کرتے تب بھی یہ حدیث مرفوع ہی ہوتی، کیونکہ زید بن حباب ثقہ تھے۔ حالانکہ ان کے علاوہ ابوصالح کاتب لیث رحمہ (جن کا ترجمہ باب اول میں حضرت ابن عباس کے اثر میں نقل کیا جا چکا ہے) بھی اس روایت کو مرفوع نقل کرتے ہیں۔ (دیکھئے سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۲ وغیرہ اور اس کی سند بھی صحیح ہے) جب یہ دونوں راوی ثقہ ہیں۔ اور اس روایت کو مرفوع بیان کرتے ہیں تو یہ حدیث محدثین کے طے شدہ قاعدہ کی رو سے مرفوع ہی ہوگی اور امام بیہقی وغیرہ کی بلا دلیل اصول شکنی قابل التفات نہیں ہو سکتی اور نہ اس کو کوئی سننے کے لیے تیار ہے چونکہ یہ اکابر غلطی سے پہلے یہ نظریہ قائم کر چکے ہیں کہ قرآنہ خلف الامام کی اجازت ہے، اس لیے اس کے خلاف تمام روایات کو وہ خواجہ خواہ معلول ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر خالی الذہن ہو کر پہلے جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کو ملاحظہ کر لیتے تو یقیناً ایسی رکیک اور بعید از انصاف تاویلات سے ہرگز کام نہ لیتے، فاسحہم اللہ تعالیٰ اور مولانا مبارک پوری صاحب صاحب کاغذ معاملہ ہی عجیب ہے وہ امام سفیان رحمہ بن عیینہ رحمہ اور حضرات صحابہ کرام کے صحیح آثار سے تو جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کو مقید کرنا گوارا نہیں کرتے، مگر اس مقام پر جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مطلق حدیث کو محض اپنی ناقص عقل اور فہم نارسا کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتے ہیں (دیکھئے ابکار المنہج ص ۱۶)



اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ بلا دلیل کرتے ہیں: —

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

باقی جس روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابوالدرداءؓ نے کثیر بن مرقہؓ سے یہ کہا تھا جیسا کہ بعض کتابوں میں آتا ہے تو وہ اپنے مقام پر صحیح ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ مرفوعاً بھی یہ روایت آتی ہے اور موقوفاً بھی جب مسئلہ بیان مقصود ہوگا تو اپنا قول بیان کر دیتے ہوں۔ اور جب حدیث کا بیان کرنا ملحوظ ہوتا ہوگا تو مرفوعاً بیان کر دیتے ہوں گے کیونکہ ارسال اور رفع میں روایت کے حالات مختلف ہوتے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

احسن الکلام پر بلا وجہ محض تعصب کی وجہ سے تنقید کرنے والے بزرگ علامہ عراقیؒ کی ایک عبارت کا (جس کا ذکر ص ۲۷ میں ہو چکا ہے) حوالہ دے کر لکھتے ہیں۔ لیکن اگر یہ اختلاف ایک راوی کے تلامذہ میں ہے تو پھر ثقہ اور اوثق کے اصول پر اس کی تنقیح کی جائے گی۔ اگر دونوں اسناد ہمہ عیوب سے صاف ہوں گی تو پھر مزید قرائن کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیصلہ کیا جائے گا جیسا کہ اس کی تفصیل ہم عرض کر آتے ہیں۔ (ترجمان الحدیث ص ۲۷ ماہ جنوری ۱۹۷۵ء)۔

**الجواب:** پہلے بیان ہو چکا ہے کہ علامہ عراقیؒ کے حوالہ سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ ثقہ راوی جب کسی وقت روایت موصول اور کسی وقت مرسل بیان کرے یا کسی وقت مرفوع اور کسی وقت موقوف بیان کرے تو اس کے بارے میں صحیح تر فیصلہ یہ ہے کہ وہ روایت موصول اور مرفوع ہی قرار دی جائے گی نہ کہ مرسل و موقوف۔ علامہ عراقیؒ کی اس عبارت میں راوی کے تلامذہ میں ثقہ اور اوثق کی تنقیح کا کوئی تذکرہ نہیں اور امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ اگر بعض ثقہ اور ضابطہ راوی حدیث کو متصل اور بعض مرسل بیان کرتے ہوں یا بعض مرفوع اور بعض موقوف بیان کرتے ہوں یا ایک ہی راوی کسی وقت مرفوع بیان کرتا ہے اور کسی وقت مرسل یا موقوف بیان کرتا ہے تو اس کے متعلق صحیح بات جو محققین محدثین اور فقہاء اور ارباب اصول نے بیان کی ہے اور اسی کو علامہ خطیب بغدادیؒ نے صحیح قرار دیا ہے یہ ہے:





اس سند کے اکثر روایات کے تراجم پہلے نقل کئے جا چکے ہیں اور بعض جلیل القدر اور نامور محدث تھے البتہ احمد بن عبد الرحمن بن وہب کا ترجمہ سن لیجئے اگرچہ ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ مہصر کے اساتذہ اس کے ضعیف ہونے پر متفق ہیں اور ابن یونسؒ فرماتے ہیں کہ اس سے حجت قائم نہیں ہوتی۔ (میزان جلد ۱ ص ۵۵۵ بحوالہ خیر الکلام ص ۱۱۵) مگر جمہور محدثین کرامؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ محمد بن عبد اللہ بن الحکمؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کے بارے میں کوئی کلام اور جرح نہیں سنی، عبد الملکؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام ابو زرؒ ان کی تعریف کرتے تھے۔ ابو حاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ محدث عبدانؒ ان کو مستقیم الامر کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ محدثین کے نزدیک ان کی حدیثیں قابل برداشت ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ نے پہلے ان میں کلام کیا تھا۔ لیکن بعد از تحقیق اس سے رجوع کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن خزیمہؒ متقدمین میں سے اور امام ابن قطنؒ متاخرین میں سے ان کو ثقہ سمجھتے ہوئے ان پر کئی اعتماد کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۵۴، ۵۵، ۵۶) یہ روایت بھی سند کے اعتبار سے صحیح اور مرفوع ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے صفحہ ۵۱۱ میں اس کے جواب میں بھی وہی پرانا رونا روبا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ ضعیف ہیں اور متفرد ہیں (محصلاً) جواب پہلے گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرات! ہم نے متابعات اور شواہد کے علاوہ بیس حدیثیں صحیح اور مرفوع (با سند اور سند کے ایک ایک راوی کی توثیق کے ساتھ آپ سے) باحوالہ عرض کی ہیں۔ اور فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ سوالات کے مسکت جوابات بھی عرض کر دیے ہیں۔ اب ہم آخر میں آپ کے سامنے چند اور حدیثیں بطور تائید عرض کرتے ہیں اور سند پوری نقل کر دیتے ہیں۔

بطور شاہد پہلی حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو سعید محمد بن جعفر بن خصیب ہرومیؒ نے اپنی کتاب سے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہ بن محمود سعدیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے

اسماعیل سدیقی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے مالک بن انس نے بیان کیا۔ وہ وہیب بن کیسان سے اور وہ حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

کل صلوة لا یقرأ فیہا بام القرآن فی  
خدا ج الا ولاء الوما۔ (کتاب القراءۃ ص ۵۵)  
ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو تو وہ نماز  
ناقص اور نامکمل ہوتی ہے۔ ہاں مگر وہ نماز جو امام  
کے پیچھے پڑھی جائے۔

یہ روایت صاف بتلاتی ہے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ اور ام القرآن پڑھنے کی بھی گنجائش  
نہیں ہے اور اسی کو فریق ثانی ضروری سمجھتا ہے۔ ہاں البتہ امام اور منفرد کی کوئی نماز بغیر سورۃ فاتحہ  
کے مکمل نہیں ہو سکتی جیسا کہ اس کی تصریح موجود ہے۔

اعتراض: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اسماعیل سدیقیؒ کا دوسرا شاگرد مسری بن خزمیہؒ  
اس روایت کو حضرت جابرؓ سے موقوف روایت کرتا ہے اس لیے یہ عبد اللہ بن محمود سعدی  
کی غلطی ہے کہ وہ اس کو مرفوع بیان کرتے ہیں اور یہی بات مؤلف خیر الکلام نے دہرائی ہے۔  
(ملاحظہ ہو ص ۵۰۴ و ۵۰۵)

الجواب: عبد اللہ بن محمود سعدیؒ کو علامہ ذہبیؒ، الحافظ، الثقف اور صوبہ مرو  
کا محدث لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۵۷) امام حاکمؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں، محدث  
خیلی ان کو الحافظ اور عالم فن حدیث کہتے ہیں (ایضاً جلد ۲ ص ۲۵۸) کیوں نہ ہو کہ حافظ اور  
ثقف راوی کی زیادت کو تسلیم کر لیا جائے۔ اور اصول شکنی کا ارتکاب نہ کیا جائے، کہ نہ  
ہینگ لگے نہ پھٹکڑی، اور یہی امر قرین قیاس اور انصاف ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۰۵ میں لکھا ہے کہ اس کے ثقہ ہونے سے حدیث کا  
صحیح ہونا ضروری نہیں اھ یعنی محض اس لیے کہ مؤلف صاحب اور ان کی جماعت اس  
کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہاں محمد بن اسحاقؒ جیسا کوئی ضعیف راوی ہوتا تو وہ ضرور  
مان لیتے اور پھر حدیث صحیح ہو جاتی، باقی امام مالکؒ کا یہ فرمانا کہ اس کی ٹانگ پکڑو یہ  
اس کے مرفوع ہونے کی نفی یا انکار کی قطعی دلیل نہیں۔ طحاویؒ کی شرح میں جذ و ابرجلہ



کا نسخہ بھی ہے (حاشیہ طحاوی جلد ۱ ص ۱) یعنی ان کی بات مان لو اور ان کے نقش قدم پر چلو اور اس کے پیش نظر خذ و ابجہ کا مطلب بھی یہ ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے امام مالکؒ کی تصدیق ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

دوسری حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ محمدؒ سے ابو عبد اللہ حسین بن محمد ہروی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو بکر احمد بن محمد بن عمرؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو عبد الرحمن محمد بن احمد نیمیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو محمد سوید بن سعیدؒ نے زبانی بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے علی بن مسہرؒ نے بیان کیا۔ وہ عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے اور وہ نافعؒ سے اور وہ حضرت عبد اللہ بن عمرؒ اور وہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: من کان لہ امام فقراء الامام لہ قراءة (کتاب القراءة ص ۱۲۵) کہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے یہ حدیث بھی اپنے مفہوم کے لحاظ سے واضح ہے اور حضرت ابن عمرؓ سے مرفوع مروی ہے۔ اعتراض: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت ابن عمرؓ سے موقوف مروی ہے یہ ابو محمد سوید بن سعیدؒ کی غلطی ہے کہ اس روایت کو مرفوع بیان کرتے ہیں۔

جواب: علامہ ذہبیؒ سوید بن سعیدؒ کو صاحب حدیث اور صاحب حفظ کہتے ہیں۔ امام مسلمؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے۔ ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور کثیر التذلیس (لیکن اس روایت میں وہ حدیث سے تحدیث کرتے ہیں) کہتے ہیں بغویؒ ان کا شمار حفاظ حدیث میں کرتے ہیں۔ صالح جزیرہؒ ان کو صدوق اور دارقطنیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (میزان جلد ۱ ص ۲۳۲) محدث عجلؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ مسلم بن قاسمؒ کا بیان ہے کہ وہ ڈبل ثقہ تھے۔ امام احمدؒ ان کو صالح یا ثقہ کہتے ہیں۔ میمون بن امام احمدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ مجھے ان میں کسی کا کلام اور جرح معلوم نہیں۔ امام ابو داؤدؒ ان کی صدوق و لا بأس بہ سے توثیق نقل کرتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۷۴۵) جزیریؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں اور امام مسلمؒ نے صحیح میں ان سے احتجاج کیا ہے۔ (حصن حصین ص ۱۳) باب ما رزمزم لما شرب لہ اس لیے ضابطہ کے لحاظ سے یہ زیادت بھی صحیح ہوگی اور یہ امام مسلمؒ کی شرط پر صحیح ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۶ میں بعض کتب رجال سے سوید بن سعید پر جرحی کلمات نقل کر کے آگے لکھا ہے، پس نتیجہ یہ نکلا کہ یہ حدیث قطعاً جھوٹ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن ائمہ نے ان کی توثیق کی ہے جیسے کہ اوپر باحوالہ گزر چکی ہے وہ غلط ہے؛ اور کیا امام مسلم نے صحیح میں جھوٹے راوی سے احتجاج کیا ہے؛ علاوہ انہیں علامہ خطیب بغدادی اپنی سند کے ساتھ ابی محمد بن عبدہ ناخارجۃ عن ایوب عن نافع عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فقرأۃ الا ماملہ قرأۃ روایت کرتے ہیں۔  
(ملاحظہ ہو تاریخ جلد ۱ ص ۳۳)

جس کے راوی اس مذکور سند کے متابع ہیں اور بزعم مؤلف خیر الکلام وغیرہ اگر کچھ سقیم بھی اس میں ہے تو دوسری سند سے پورا ہو جاتا ہے۔ علاوہ انہیں اس امر سے اختلاف تو نہیں کیا جاسکتا کہ بعض محدثین نے اس پر جرح کی ہے اور جبہور اس کی توثیق کرتے ہیں اور مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے اس کی حدیث حسن تو ضرور ہے خود مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ مختلف فیہ آدمی حدیث حسن ہوتی ہے۔ (خیر الکلام ص ۳۲۵) مگر اس حدیث کو قطعاً جھوٹ کہنا خالص در سفید جھوٹ ہے۔

تیسری حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہ رحمہ اللہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے ابو العباس بالوئید بن محمد بن بالوئید مرزبانیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عمرو بن زرارہؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے اسمعیل بن ابراہیمؒ نے بیان کیا۔ وہ علی بن کیسانؒ سے اور وہ ابن ملکۃؒ سے اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں اور وہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: کل صلوة لا یقذف فیہا بفاختہ الكتاب یعنی ہر وہ نماز جس میں نمازی سورۃ فاتحہ نہ پڑھے تو اس فلا صلوة لہ الا وراء الامام۔ کی نماز ادا نہ ہوگی۔ ہاں مگر امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھے بھی نماز صحیح ہے۔

(کتاب القراءۃ ص ۱۳۷)

یہ روایت بھی اپنے مدلول کے لحاظ سے بالکل عیاں ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔

اعتراض: امام بیہقیؒ اپنے استاد کے حوالہ سے یہ نقل کرتے ہیں کہ علی بن کیسانؒ کا نام



ہم نے صرف اسی سند میں سنا ہے۔

**الجواب:** حافظ ابن حجرؒ نے علی بن کیسانؒ کا نہایت مختصر ترجمہ یوں قائم کیا ہے وہی

علی بن سلیمان بن کیسان الکسانیؒ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۳۵۵) اور محدث فیض یوہیؒ فرماتے ہیں کہ ابن ابی حاتمؒ نے ان کو صالح الحدیث ما اری مجدثہ بأسا کہا ہے (لسان ج ۲ ص ۲۳۳) لہذا ان کی حدیث حسن یا صحیح ہے (الدلیل للبیین ص ۱۵۵) اور اگر بالفرض یہ مستور بھی ہو تب بھی مولف خیر الکلام کہتے ہیں کہ مستور بلکہ ضعیف کی روایت متابعت میں پیش کی جاسکتی ہے جیسا کہ باحوالہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔

چوتھی حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو حامد احمد بن محمد بن قاسم سرخسیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے احمد بن عبد الرحمن سرخسیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسمعیل بن فضلؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عیسیٰ بن جعفرؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سفیان ثوریؒ نے بیان کیا۔ وہ اعمشؒ سے اور وہ حکمؒ سے اور وہ عبد الرحمن بن ابی لیلیٰؒ سے اور وہ حضرت بلالؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

امری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا یقرأ خلف الامام۔  
کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھ یہ حکم دیا کہ میں امام کے پیچھے قرأت نہ کروں۔  
(کتاب القراءۃ ص ۱۳۹)

چونکہ قرأت خلف الامام کا مسئلہ اپنے ایجابی یا سلبی پہلو کے اعتبار سے کسی صحابیؒ سے مخصوص تھا اس لیے حضرت بلالؒ کو کسی خاص مصلحت کے پیش نظر آپؐ نے خطاب کیا ہو گا۔ ورنہ حکم سب کے لیے عام ہے۔

اعتراف: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ عیسیٰ بن جعفرؒ تو ثقہ اور ثبت تھے۔ اس لیے اس میں غلطی اسماعیل بن فضلؒ کی ہو گی کہ اس سند میں سفیان ثوریؒ کا ذکر ہے اور وہ اس سے بری ہیں اگر ان سے روایت ہوتی تو اس کے بارے میں اختلاف نہ ہوتا، اسمعیل بن فضلؒ اگر سچا ہے تو اس کی غلطی ہے۔ جھوٹا ہے تو اس کا افتراء ہے۔ (کتاب القراءۃ ص ۱۳۹ بحوالہ خیر الکلام ص ۵۱۰ محصلہ)

**الجواب :** حدیث کو باطل ٹھہرانے کا یہ نرا لاقاعدہ امام بیہقیؒ نے تجویز فرمایا ہے۔ کیا قرأت خلف الامام کی روایت کے امام ثوریؒ حجاز نہیں؟ یا ان کی کسی دیگر روایت میں اختلاف نہیں ہوا؟ اس سند اور حدیث پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ہاں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسمعیل بن فضلؒ کا حال معلوم نہیں یہ اصول کی بات ہے، مگر مؤلف خیر الکلام کے بیان کے مطابق مستور اور ضعیف کی حدیث بطور تائید و متابعت پیش ہو سکتی ہے اس میں کوئی ہرج نہیں۔ اور اصول کے لحاظ سے شاہد و متابع کا بھی کوئی فرق نہیں۔

قارئین کرام! اس مضمون کی کم و بیش ستائیس سندیں راقم الحروف کے بیاض میں ابھی اور موجود ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں ہر ایک سند فریق ثانی کی اجازت یا وجوب قرأت سورۃ فاتحہ خلف الامام کی روایتوں سے اگر زیادہ قوی اور صحیح نہیں تو یقین کیجئے کہ ان سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ مگر چونکہ ہمیں آپ سے ابھی بہت کچھ عرض کرنا ہے اس لیے سر دست ان پیش کردہ احادیث پر ہی ہم اکتفا کرتے ہیں اور ان سے ایک حقیقت پسندانہ سخن بخوبی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے والے کیا بے دلیل ہیں؟ اور کیا ان کے پاس جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیثیں موجود نہیں؟ اور کیا جن کتابوں کے حوالے درج کیے گئے ہیں وہ اس دنیا میں موجود نہیں؟ اور کیا ان میں سورۃ فاتحہ اور ام القرآن و ام الکتاب کی تصریح موجود نہیں؟ اور کیا یہ روایتیں صحاح ستہ و مواقیع بھا میں نہیں پائی جاتیں؟ اور کیا یہ کتابیں دنیا کے اسلامی کتب خانوں میں موجود نہیں؟ اور کیا ان حدیثوں میں کوئی حدیث صحیح اور مرفوعہ نہیں؟ اور کیا ان تمام دلائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے جمہور اہل اسلام (جو امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ اور دیگر کسی قسم کی قرأت کے قائل نہیں ہیں) نہ سادہ جیسی اہم اور بنیادی عبادت سے سبکدوش ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ یا ان کی نماز بھی ناقص کا علم بیگا اور محض باطل ہے؟ ان میں سے ایک ایک دعوے کا براہین کے ساتھ اثبات کیا جا چکا ہے اور فریق ثانی کے جملہ بے بنیاد دعوؤں کا دلائل سے بطلان ثابت کیا گیا ہے، جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں۔

الغرض حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت انس رضی بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن بکینہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابو بکرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ،



حضرت جابر بن عبد اللہؓ، حضرت عبد اللہ بن شدادؓ، حضرت نواس بن سمانؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ کی اکثر روایتیں صحیح اور مرفوع ہیں اور حضرت ابو موسیٰ الاشعرؓ کی حدیث کے علاوہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایتوں میں سورہ فاتحہ کا خاص لفظ موجود ہے جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اور آپ یہ بھی ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ فریق ثانی کے نزدیک بھی پیش کردہ احادیث کے تقریباً جملہ روایت کی ثقاہت، عدالت، امامت اور اتقانِ مسلم ہے، محض کسی کے تفرد پر گرفت کی گئی ہے تو کسی کی تدلیس پر کسی کی تخیل پر اور کسی کے تغیر بسیر پر اور کہیں مرفوع اور موصول روایت کو اصول شکنی کرتے ہوئے موقوف اور مرسل قرار دیا گیا ہے اور کہیں راوی حدیث کی مرضی کے خلاف بلکہ خود مرفوع حدیث کے خلاف حدیث کا مطلب لیا گیا ہے اور ان تمام خلاف قاعدہ باتوں کے علاوہ محض اپنی مرضی سے مطلق قرأت کو مقید کرنے کی ناکام سعی کی گئی ہے اور ایسی ایسی کمزور اور رکیک و ضعیف اور بعید از قیاس و انصاف تاویلات اور توجہات اختیار کی گئی ہیں کہ فنِ اصول حدیث بھی ان سے نالاں ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ کے اس دعوے کی حقیقت بھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ من کان لہ..... الخ کے تمام طرق معلول ہیں۔

قارئین کرام! ذرا ان راویوں کا ان راویوں سے تقابل کر لینا جن کی روایتوں سے فریق ثانی نے استدلال کیا ہے کیونکہ۔ ع: وبضہا تتبین الاشیاء

ہم دوسرے باب کو یہاں ختم کرتے ہیں اور تیسرا باب شروع کرتے ہیں۔ واللہ المستعان  
وہو نصر العین۔

# باب سوم

اہل اسلام سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف کے بعد دینی مسائل میں جن حضرات کی طرف نگاہیں اٹھ سکتی ہیں۔ وہ شمع نبوت کے پروانے اور فیض رسالت سے مستفید حضرات صحابہ کرامؓ کی مخلص جماعت ہی ہو سکتی ہے اور ان کے بعد حضرات تابعینؓ کا دور ہے کیونکہ یہی وہ حضرات ہیں جو خیر القرون کے درخشندہ ستارے تھے جن کی سعی بلیغ کی بدولت دنیا مے کفر و شرک میں روشنی پھیلی، بدعات و رسوم کا خاتمہ ہوا۔ جہالت و تاریکی دنیا سے مٹتی اور علم و عرفان کی بارش سے دلوں کی دنیا میں ایمان و بصیرت کی شادابی پیدا ہوتی۔ نیز یہ بات بھی مخفی نہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ شرف صحبت کی برکت سے سب کے سب عادل، ثقہ، متقی، خدا پرست اور پاکباز تھے۔ لیکن فہم قرآن اور تدبر حدیث میں سب برابر نہ تھے۔ اس لحاظ سے ان کے آپس میں مختلف درجات اور متفاوت مراتب تھے۔ چنانچہ امام مسروقؒ (المتوفی ۲۴۳ھ جو والد ماہر الفقیہ اور احاد الزوالہ مر تھے تذکرہ جلد ۱ ص ۱۶۷) فرماتے ہیں کہ میں نے حضرات صحابہ کرامؓ سے فیض صحبت اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ان سب کا علم چھ بزرگوں کی طرف لوٹتا ہے، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ، پھر میں نے ان چھ بزرگوں سے شرف صحبت حاصل کیا تو دیکھا کہ ان سب کا علم



حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر ختم ہو گیا ہے (طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۲۵، تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۲ و مقدمہ ابن الصلوح ص ۲۶۲ مع شرح العراقیؒ) امام حاکم نے بھی امام مسروقؒ سے یہ روایت نقل کی ہے، اس میں انھوں نے حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ کا نام لیا ہے (مستدرک جلد ۳ ص ۲۶۵ سکت عنہ الحاکمؒ والذہبیؒ) امام شعبیؒ (المتوفی ۱۰۴ھ) جو امام حافظ، فقیہ، متقن اور علامۃ التابعین تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۰۰) کا بیان ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضرات صحابہؓ میں دینی مسائل میں فیصلہ کرنے والے چھ حضرات تھے۔ تین مدینہ طیبہ میں اور ان کے نام یہ ہیں: حضرت عمرؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ اور تین کوفہ میں، ان کے اسماء یہ ہیں: حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ (مستدرک جلد ۳ ص ۲۶۵ و سکتا عنہ)

مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ دینی مسائل کی ترویج اور اشاعت کے لحاظ سے صحابہ کرامؓ کے تین طبقات تھے، پہلا طبقہ وہ ہے جس سے مسائل تواریخ ہوئے ہیں مگر کم۔ اور دوسرا طبقہ متوسط ہے اور تیسرا طبقہ وہ ہے جن سے دین کی بہت زیادہ اشاعت اور ترویج ہوئی ہے۔ ان میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۱) نواب صدیقی حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جن حضرات صحابہ کرامؓ سے دین، علم اور فقہ کی اشاعت ہوئی ہے ان میں حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ پیش پیش تھے۔ (الحجۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنتہ ص ۵)۔

الحمد للہ تعالیٰ کہ ان حضرات میں بیشتر وہ ہیں جو امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ ۵۔  
وفاؤں کے ہزاروں دے چکے ہیں امتحانِ تنگ  
مگر وہ ہیں کہ اس پر بھی ہیں ہم سے بدگماںِ تنگ  
حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ وغیرہ کی صحیح اور مرفوع حدیثیں عرض کی جا چکی ہیں، اسی طرح

حضرت ابوالدرداءؓ کی صحیح اور مرفوع روایت بھی پیش کی جا چکی ہے اور اس کے موقف تسلیم کرنے میں تو فریق ثانی کو بھی کسی طرح کا کوئی تامل نہیں ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا ص ۵۲ میں یہ کہتا کہ یہ ان کا اپنا خیال تھا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کے مقابلہ میں خیال پر اڑے رہنا ٹھیک نہیں ہوتا، اس لیے انھوں نے اس پہلے قول سے رجوع کیا۔ بالکل ایک بے بنیاد دعوے ہے۔ کسی صحیح روایت سے ان کا رجوع ثابت نہیں۔ لفظوں کے ہوائی قلعہ سے کچھ نہیں بنتا اور اس کے خلاف جو روایت ان سے آتی ہے اس کا ذکر جلد دوم میں آئے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔ اب اس کے بعد بعض حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم کی بعض روایتیں اور آثار سن لیجئے:

اثر حضرت عبداللہ بن عمرؓ (المتوفی ۴۲ھ) امام مالکؒ نافعؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

ان عبد اللہ بن عمرؓ کان اذا سئل هل یقرأ احد خلف الامام قال اذا صلی احد کو خلف الامام فحسبه قراءة الامام واذا صلی وحده فلیقرأ وکان ابن عمرؓ لو یقرأ خلف الامام۔  
 کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جب یہ سوال کیا جاتا تھا کہ کیا امام کے پیچھے کوئی نمازی قرأت کر سکتا ہے؟ تو وہ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی آدمی امام کی اقتدار کر چکے تو اس کو امام کی قرأت ہی کافی ہے اور جب کوئی اکیلا نماز پڑھے تو اس کو قرأت کرنی چاہئے اور ابن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے

امام مالکؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ نافعؒ الامام اور العلم تھے۔ (تذکرہ، جلد ۱ ص ۹۴) امام بخاریؒ کا بیان ہے کہ اصح الاسانید یہ ہے مالک عن نافع عن ابن عمرؓ (ایضاً) اس سے زیادہ قوی سند فن حدیث میں تقریباً محال ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ جلیل القدر صحابی تھے۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الفقیہ اور احد الاعلام فی العلم والعمل تھے۔ وہ اپنی علمی اور عملی قابلیت کی بنا پر خلافت اور حکومت کے



مستحق تھے۔ (ایضاً جلد ۱ ص ۳۵) بہر حال یہ روایت صحیح ہے اور قاسم بن محمد فرماتے ہیں کہ کان ابن عمر لا یقرأ خلف الامام جہر۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے اولہم جہر۔ (کتاب القراءۃ ص ۱۳۶) تھے۔ امام جہر سے پڑھتایا آہستہ (وہ خاموش پڑھتے تھے) اور میر صاحب کو بھی اقرار ہے کہ موطا کی مسند روایت صحیح ہوتی ہے۔ مولف خیر الکلام صفحہ ۵۲ میں لکھتے ہیں کہ یہ اثر صحیح ہے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحب سے جب اس کی سند پر کلام کرنے کی جرأت بھی نہ ہو سکی اور چونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حدیث رفع یدین کے راوی تھے۔ اس لیے اس روایت کو اپنے حال پر چھوڑ کر آگے نکلنا بھی گوارا نہ ہو سکا۔ تو زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی ٹھکان کی۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس اثر کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثر سے (جو دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲ وغیرہ میں ہے) تعارض ہے کہ انھوں نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت دی تھی اور چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے سنت کے زیادہ بڑے عالم تھے، (کاش کہ مبارکپوری صاحب اپنے اس خود ساختہ قاعدہ پر ہی قائم رہتے تو بھی ایک بات تھی۔ صنف) اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثر کو ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اثر پر ترجیح ہوگی۔ (ابکار المنن ص ۱۶۵)

جواب: اگر تعارض کا یہی مفہوم ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے لاکھوں بلکہ کروڑوں درجے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سنت کے زیادہ عالم تھے۔ اس لیے جب آپ نے امام کے پیچھے قرأت سے منع کیا ہے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثر پر آپ کے ارشاد کو بہر حال ترجیح ہوگی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اثر عنقریب ترک قرأت خلف الامام پر ذکر ہوگا اور جس اثر کا مبارک پوری صاحب نے حوالہ دیا ہے تو اس کی حقیقت بھی اپنے مقام پر واضح ہوگی۔ تعجب ہے کہ مبارکپوری صاحب کا وجود بھی اجتماع نقیضین سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ یہاں تو یہ لکھ کر وقت پاس کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنے بیٹے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مجرد اعلم بالسنۃ ہونا اس کا مقتضی نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثر کو ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اثر پر ترجیح دی جاسکے۔ (ابکار المنن ص ۲۲۲) شاید مولانا مبارک پوری صاحب کو جلدی سے پلینٹر ابلانے کا خاص لطف محسوس ہوتا

ہوگا۔ اور وہ ایسی رکیک اور بعید انقیاس توجیہ کر کے دل میں خوشی مناتے ہوں گے کہ  
ع: کہ مقابله تو دل ناتواں نے خوب کیا

مؤلف خیر الکلام نے اس صحیح اثر کا تقابل ان آثار سے کیا ہے جو کتاب القراءۃ ص ۶۱۱ اور  
ص ۶۱۵ میں حضرت ابن عمر رض سے اس کے خلاف آئے ہیں اور مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ یہ اثر بھی  
صحیح ہے اس پر مفصل بحث گذر چکی ہے (ص ۵۲) اور یہ بحث انھوں نے ص ۳۲۲ میں کی ہے۔  
کہتے ہیں کہ ان آثار میں سے ایک اثر کی سند میں ابو جعفر رازی عینی بن مایان جو متکلم فہیہ ہے  
مگر حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے صدوق ہے اور ایک راوی یحییٰ بکار ہے وہ ضعیف ہے مگر ابن

سعدؒ نے کہا ہے انشاء اللہ ثقہ ہے۔ الخ

الجواب: جب ہمارا پیش کردہ اثر آپ کے اقرار سے بھی صحیح ہے تو اس کے مقابلہ  
میں ضعیف راویوں کی روایتیں لے کر تنکوں کا پُل بنانا کہاں کا انصاف ہے؟ بس صحیح لے لیں  
اور ضعیف کو چھوڑ دیں یہ دونوں راوی نہ بے متکلم فہیہ نہیں بلکہ بہت زیادہ کمزور ہیں پھر کس قدر  
افسوس ہے کہ آپ ان کے اثر کو بھی صحیح کہہ رہے ہیں پھر صراحت و ابہام وغیرہ کی وجہ سے ترجیح دینا  
نرمی شعبہ بازی ہے۔ صحیح اثر اور ضعیف کا کیا تقابل؟

اثر حضرت جابر بن عبد اللہ (المتوفی ۳۸ھ) ان کا اثر بسند صحیح حدیث نمبر ۱۱  
کے ذیل میں نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرأت کے قاتل نہ تھے ،  
مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ یہ اثر صحیح ہے (ص ۵۱۹) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ حضرت  
جابر صرف رکوع والی رکعت کو بدون فاتحہ صحیح سمجھتے تھے اور یہ روایت اسی پر محمول ہے  
اور اصول فقہ حنفیہ کی رو سے مستثنیٰ میں کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا لہذا مقتدی کے لیے  
اس سے وہ کوئی حکم ثابت نہیں کر سکتے (محصلاً ص ۳)

الجواب: حرف مَنْ مؤلف مذکور کے نزدیک ویسے عام ہے اور ہمارے نزدیک  
بھی یہاں شرطیہ ہونے کی وجہ سے عام ہے اور سکاۃ نکرہ ہے اور ساتھ موصوفہ اور خود  
مؤلف مذکور کے نزدیک نکرہ موصوفہ عام ہوتا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۸۳) پھر اس تخصیص کو کون  
مانتا ہے؟ غرضیکہ حضرت جابرؓ ہر رکعت میں اور ہر ایسے نمازی کے لیے جو مقتدی ہو یہ حکم بیان



فرماتے ہیں اور مولف مذکور کا یہ لکھنا کہ اصول فقہ حنفیہ میں مستثنیٰ میں کوئی حکم نہیں ہوتا بالکل بے خبری پر مبنی ہے کیونکہ یہ بعض اصولیوں کا مسلک ہے۔ توضیح ص ۲۹۵ سے ص ۲۹۸ تک اس پر مبسوط بحث موجود ہے کہ استثناء میں حکم نفی سے اثبات اور اثبات سے نفی ہوتا ہے لہذا یہاں مقتدی کے لیے نفی فاسخ کا حکم بطریق منطوق ثابت ہے جیسے کلمہ توحید میں الا اللہ ثابت ہے۔ مبارکپوری صاحب نے نیز فی فقیر کے اثر سے اس کا معارضہ کیا ہے مگر اس کی پوری تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت جابرؓ بلند پایہ فقیہ اور مدینہ طیبہ کے مفتی تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے انھوں نے بہت سے مفید علوم حاصل کیے تھے۔ (تذکرہ اضع) اگر سورہ فاتحہ کے بغیر مقتدیوں کی نماز نہیں ہوتی، تو حضرت جابرؓ کو مکرانہ توحید و سنت کا مفتی کیسے انتخاب کر لیا گیا تھا، جو اس کے مخالف اور منکر تھے۔

۱۰ اشرف حضرت زید بن ثابتؓ (المتوفی ۴۵) امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے علی بن حجرؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے اسمعیل بن جعفرؒ نے بیان کیا۔ وہ نیز زید بن حصیفؒ سے اور وہ نیز زید بن عبد اللہ بن قسیطؒ سے اور وہ عطاء بن یسارؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت زید بن ثابتؓ سے دریافت کیا کہ کیا امام کے ساتھ قرأت کی جاسکتی ہے؟

۱۱ علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ الکبیر اور نسائیؒ ثقہ و مومن اور حافظ اور خطیب ان کو صادق، متقن اور حافظ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۳۲)

۱۲ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، العالم اور الثقہ لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۱ ص ۲۳۱)

۱۳ امام احمدؒ، ابو حاتمؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ، ابن معینؒ ان کو ثقہ اور حجت۔ ابن سعدؒ ان کو ثبت اور کثیر الحدیث اور حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ اور مومن لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۴)

۱۴ ابن معینؒ ان کو لا باس بہ نسائیؒ ان کو ثقہ ابن عدیؒ ان کو مشہور ابراہیم بن سعدؒ ان کو فقیہ اور ثقہ اور کثیر الحدیث اور ابن عبد البرؒ ان کو ثقہ من الثقات لکھتے ہیں (ایضاً ص ۳۴)

۱۵ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الربانی اور الفقیہ لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور جلیل اور علم کا ظرف تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۸)

قال (و قراءة مع الامام في شيء) انھوں نے جواب ارشاد فرمایا کہ امام کے ساتھ کسی  
(نسائی جلد ۱ ص ۲۱۱، ابو عوانہ جلد ۲ ص ۱۲۲، طحاوی ص ۱۲۲)

حضرت زید بن ثابت کا یہ پسند صحیح اثر اس امر کی واضح دلیل ہے کہ امام کے ساتھ مقتدی  
کو کسی نمازیں کسی قسم کی قرأت کرنے کا حق نہیں ہے اور ان ایک آیت یوں ہے: من قرأ  
خلف الامام فلا صلوة له (موطا امام محمد ص ۱۰۰ و کتاب النکاح ص ۱۴۷) کہ جس نے  
امام کے پیچھے قرأت کی تو اس کی نماز نہیں ہوتی۔ امام طحاوی رحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یونس بن  
عبدالاعلیٰ رحمہ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے عبداللہ بن مسیب نے بیان کیا وہ حیوہ بن شریح  
سے اور وہ بکر بن عمرو سے اور وہ عبید اللہ بن مقسم رحمہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے  
ہیں کہ میں نے قرأت خلف الامام کے بارے میں:

انہ سال عبد اللہ بن عمر بن زید بن ثابت ثابت  
وجابر بن عبد اللہ بن عمر بن زید بن ثابت  
الامام في شيء من الصلوة۔ (طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۹)  
حضرت عبداللہ بن عمر رحمہ حضرت زید بن ثابت اور  
حضرت جابر بن عمر رحمہ سے سوال کیا۔ ان سب نے فرمایا کہ امام  
کے پیچھے تمام نمازوں میں کوئی قرأت نہ کرو۔  
وزیلی جلد ۲ ص ۱۲۲ و اسنادہ صحیح)

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ وزید بن ثابت گفتہ لا قراۃ مع الامام  
فی شیء رواہ مسلم وعن جابر بن عبد اللہ بن عمر بن زید بن ثابت و هو قول علی بن ابی سعید و عن جابر بن عبد اللہ بن عمر بن زید بن ثابت  
(ہدایۃ السائل ص ۱۹۳) اور امام بخاری رحمہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رحمہ حضرت زید بن  
بن ثابت اور حضرت ابن عمر رحمہ امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ (جزء القراۃ ص ۳)  
علامہ ذہبی رحمہ لکھتے ہیں کہ حضرت زید بن ثابت کا تب وحی تھے۔ اور قرآن کریم کے جمع  
لہ امام طحاوی رحمہ کا ذکر آئے گا، ابن وہب کا ترجمہ حدیث نمبر ۱ میں گذر چکا ہے۔ یونس بن عبدالاعلیٰ رحمہ  
کو امام ابو حاتم رحمہ اور نسائی رحمہ ثقہ کہتے ہیں۔ علی بن الحسن رحمہ اور مسلمہ رحمہ بن قاسم رحمہ ان کو حافظ حدیث کہتے  
ہیں۔ ابن حبان رحمہ ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۱۱) حیوہ بن شریح رحمہ الامام القندوزی شیخ  
دیالمصریہ اور کبیر الشان تھے (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۲۱) بکر بن عمرو رحمہ کو ابو حاتم رحمہ شیخ اور ابن یونس رحمہ صاحب عبادت  
(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)



کرنے کی خدمت ان کے سپرد کی گئی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب حج وغیرہ کے لیے تشریف لے جاتے تو ان کو اپنا نائب اور خلیفہ مقرر کر کے جاتے تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۹) اور نواب صاحب کے بیان سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے ترک قرأت بعض یا چند حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل اور فتویٰ نہ تھا بلکہ اس مسلک پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بھاری اکثریت تھی۔ وکثیر من الصحابة۔  
اعتراض: امام بیہقی رحمہ اللہ، امام نووی رحمہ اللہ اور مبارکپوری صاحب وغیرہ نے اس اثر کی یہ تاویل کی ہے کہ اس اثر میں قرأت سے مراد ما زاد علی الفاتحة کی قرأت ہے یا قرأت جہر مراد ہے (بیہقی جلد ۲ ص ۱۶۳، شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۱۵ و بکار المنہن ص ۱۶۶)

جواب: یہ تاویل قطعاً باطل ہے کیونکہ اگر قرآن کریم اور کسی صحیح حدیث سے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت ثابت ہوتی تو تطبیق کے لیے یہ تاویل اختیار کی جاسکتی تھی۔ حالانکہ قرآن کریم اور صحیح و مرفوع حدیثوں سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ امام کے پیچھے عام قرأت تو کیا جائز ہوئی سورۃ فاتحہ اور اتمام القرآن پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے، باقی حضرت عبداللہ بن الصامت وغیرہ کی روایتوں کا ذکر بسط اور تفصیل کے ساتھ اپنے مقام پر آئے گا۔ کہ خلف الامام کی قید کے ساتھ کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ اور جو حدیثیں صحیح ہیں۔ وہ صرف امام اور مفرد کے حق میں ہیں، فریق ثانی کی یہ ستم ظریفی بھی قابلِ داد ہے کہ ایک طرف تو لا صلوة الخ کی روایتوں میں نکرہ پر لائے نفی جنس کو داخل سمجھ کر کہ اتنی تعمیم مراد لی جاتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کے اسلامی کتب خانوں کی کسی کتاب سے کوئی دلیل نہیں پیش کی جاسکتی اور دوسری طرف لا قرأۃ مع الامام فی شیء اور لا یقرأ خلف الامام فی شیء من الصلوة کو ایسا مقید کیا جاتا ہے کہ باوجود سورۃ فاتحہ ام القرآن اور قرآن عظیم ہے، مگر اس کی قرأت پر نہ تو لا نفی جنس اثر انداز ہو سکتا ہے اور نہ لفظ شیء اور یہ عجیب تر بات ہے کہ لا صلوة الخ میں نفی کمال تو مراد نہیں لی جاسکتی مگر یہاں لا قرأۃ مع الامام فی شیء میں نفس قرأت سے جہر مراد ہو سکتی ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! اور ان تینوں حضرات رضی اللہ عنہم سے بیک وقت سوال ہوتا ہے اور وہ اس کی اجازت نہیں (بقیہ پچھلا صفحہ) و فضیلت اور دارقطنی رحمہ اللہ معتبر کتب ہیں اور ابن حبان ثقات میں لکھتے ہیں اور یہ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۸۸) اور عبد اللہ بن مقسم رحمہ اللہ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص ۲۵۳)

دیتے کہ امام کے پیچھے کسی قسم کی کوئی قرأت کی جا سکے۔ اور ان میں حضرت جابرؓ بھی ہیں، جو بباکِ قیل قرأت سے ام القرآن کی قرأت مراد لیتے ہیں، بہر حال ان حضرات کی یہ تاویل قواعد اور اصول کے نیز صحیح احادیث کے خلاف ہوتے ہوئے۔ بعید از انصاف ہے، جو کسی طرح توجہ کی مستحق نہیں ہے اور صحیح اور مرفوع حدیثوں اور خود حضرت جابرؓ کے قول صریح کے مقابلہ میں یہ تاویل اس کی زیادہ مستحق ہے کہ — ع:

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

اثر حضرت عبداللہ بن مسعود: امام ابو بکرؓ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الاحوصؓ نے بیان کیا۔ وہ منصورؓ سے اور وہ ابو دائلؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے دریافت کیا:

اقرأ خلف الامام فقال ان في الصلوة شغلا  
وسيكفيك قراءة الامام (الجوهري النقي  
جلد ۱ ص ۱۷۰)  
کیا میں امام کے پیچھے قرأت کر سکتا ہوں، حضرت  
عبداللہؓ نے فرمایا کہ نماز میں امام قرأت میں  
مشغول ہے اور تجھے امام کی قرأت ہی کافی ہو  
جائے گی۔

اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں چنانچہ علامہ بیہقیؒ کہتے ہیں و رجالہ موثقون۔  
(مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۱) کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور مؤلف خیر الکلام ص ۵۲۱ میں لکھتے ہیں  
کہ صحیح ہے۔ اور کہتے ہیں کہ اثر مطلق ہے۔ اس میں فاسخ کا بالخصوص ذکر نہیں۔۔۔ الخ  
الجواب: مطلق کی نفی سے مقید کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے اور اس کے مقابلہ  
میں نہ تو ان کا کوئی اثر صحیح ہے اور نہ ام الکتاب کی تصریح ہے پھر کیوں اس صحیح اثر کو رد  
کیا جاتا ہے؟ اس کے صحیح نہ ہونے کی بحث جلد دوم میں آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔  
علاوہ انہیں اس کو مطلق (کہ فاسخ کو نہ شامل نہ ہو) کہنا بھی درست نہیں کیونکہ ایک روایت  
لے امام ابو بکرؓ بن ابی شیبہؒ کا ترجمہ حدیث نمبر ۱۳۱ میں اور منصورؓ و ابو دائلؓ کا باب اقل میں حضرت  
ابن مسعودؓ کے اثر کے ذیل میں نقل کیا جا چکا ہے۔ ابو الاحوصؓ کا نام سلام بن سلیم تھا۔ علامہ ذہبیؒ  
ان کو احفاظ اور احداثیات لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۳)



میں یوں تصریح آتی ہے جو بطور تائید پیش کی جا رہی ہے۔

ان ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا لایقراً خلف  
 الامام فیما یجہد فیہ و فیما یخاف  
 فیہ فی الاولیین و لا فی الآخریین و  
 اذا صلی وحده قرأ فی الاولیین  
 بفتح الکتاب و سورۃ... الخ  
 کہ عبد اللہ ابن مسعود امام کے پیچھے نہ ہری نماز  
 میں قرآن کرتے تھے اور نہ سب سے پہلی نماز میں پہلی  
 دو رکعتوں میں اور نہ پچھلی دو رکعتوں میں اور  
 جب اکیلے نماز پڑھتے تھے تو پہلی دونوں رکعتوں  
 میں سورۃ فاتحہ بھی پڑھتے اور دیگر کوئی اور  
 (موطا امام محمد ص ۹۶) سورت بھی۔

ان کی اس مفصل روایت سے معلوم ہوا کہ قرأت میں فاتحہ خصوصیت سے شامل ہے۔

اس کی سند یوں ہے: محمد بن ابان بن صالح القرشیؒ کہ اس پر محدثین کرام رحمہ اللہ نے کلام کیا ہے،  
 مگر مؤلف خیر الکلام وغیرہ کی تصریح عبارات عرض کی جا چکی ہیں کہ تائید اور متابعت میں ضعیف  
 حدیث بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ لہذا اس کو تائید اور متابعت میں پیش کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے،  
 عن حماد عن ابراہیم عن علقمہ بن قیس عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما... الخ  
 باقی تمام راوی ثقہ ہیں اور علقمہ بن قیس کے اثر میں ان کے تراجم آ رہے ہیں۔ امام بیہقیؒ نے حضرت  
 ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک اثر یوں نقل کیا ہے

لَوْنُ اعْتَصَى عَلَى جَبْرِ الْغَضَا حَتَّى الْيَمْنِ  
 اَقْرَأَ خَلْفَ الْاِمَامِ -  
 یعنی یہ کہ میں جند دخت کے جلتے کونلوں کو منہ  
 میں پکڑوں مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ امام

کے پیچھے قرأت کروں اور پڑھوں۔ (اور ظاہر  
 ہے کہ قرأت فاتحہ ہی سے شروع ہوتی ہے)

دوسری سند: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ اور ابو سعیدؒ  
 بن ابی عمروؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو العباس محمد بن یعقوبؒ نے بیان

لے حافظ ابو عبد اللہؒ اور شعبہؒ کا ترجمہ باب اول میں حضرت مجاہدؒ کے اثر کے ذیل اور ابن مہدیؒ کا  
 سعید بن المسیبؒ کے اثر کے تحت اور ثور بنی کا مقدمہ میں گزر چکا ہے۔ ابو العباس کو علامہ ذہبیؒ امام الثقاؤ  
 محدث مشرق لکھتے ہیں (ایضاً ص ۳۷)

کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ہارونؑ بن سلیمانؑ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد الرحمنؑ بن مہدیؑ نے بیان کیا وہ سفیان (ثوریؑ) سے اور شعبہؑ سے روایت کرتے ہیں وہ دونوں منصورؑ سے اور وہ ابو داؤدؑ سے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے سوال کیا :

عن القراءة خلف الامام فقال انصت للقرآن فان في الصلوة شغلاً وسيكيفك ذلك الامام۔  
 کہ کیا امام کے پیچھے قرأت کی جاسکتی ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ قرآن کے لیے خاموش رہو۔ امام نماز کے اندر قرأت میں مشغول ہے۔ اور تجھے سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۸۱)

حضرت ابن مسعودؓ کے ان صحیح آثار سے معلوم ہوا کہ وہ تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے، ان کا ترجمہ اور حجاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ان پر کلی اعتماد باب اول میں وضاحت اور صراحت سے گزر چکا ہے۔  
 اعتراض: امام بیہقیؒ کہتے ہیں: (۱) حضرت ابن مسعودؓ نے انصات کا حکم دیا ہے اور انصات جہری نمازوں میں ہو سکتا ہے۔

(۲) علقمہؒ کا بیان ہے کہ میں نے نماز میں حضرت ابن مسعودؓ کو قُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا پڑھتے سنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرأت کے قائل تھے۔

(۳) عبداللہ بن زیادؑ اسدیؒ کا بیان ہے کہ میں نے ظہر اور عصر کی نماز میں ابن مسعودؓ سے قرأت سنی ہے۔ (سنن الکبریٰ و کتاب القراءۃ)

جواب: امام بیہقیؒ کے اعتراض کی جملہ شقیں مردود ہیں علی الترتیب جواب سن لیجئے (۱) حضرت ابن مسعودؓ تمام سری اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور یہ تمام حضرات فقہاء اور محدثینؒ کے نزدیک مشہور و معروف ہے۔ (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۸۳)

انصات کی پوری تحقیق باب اول میں آیت کے ذیل میں عرض کی جا چکی ہے اور فریق ثانی کا یہ امام ابو العباسؒ کے حلیل القدر شیخ اور مشہور محدث تھے (دیکھئے تذکرہ جلد ۲ ص ۳۷) علامہ ذہبیؒ ان کی سند کو صحیح سمجھتے ہیں (ایضاً جلد ۲ ص ۳۷)



شعبہ اور مغالطہ بھی نکال دیا گیا ہے وہاں ہی ملاحظہ کر لیں، اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔  
 (۲) امام بیہقی رحمہ نے اس قول کی کوئی سند نقل نہیں کی اور خود امام بیہقی رحمہ کا ارشاد ہے، ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ہرگز مکلف نہیں ٹھہرایا کہ ہم اپنا دین، جہول نامعبر اور غیر معلوم راویوں سے اخذ کریں۔ (کتاب القراءة ص ۱۲ طبع دہلی) علاوہ بریں اس روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ ابن مسعود رحمہ نے امام کے پیچھے یہ آیت پڑھی تھی۔ اور اس کا بھی کوئی ذکر نہیں کہ قیام کی حالت میں پڑھی تھی۔ کیوں یہ ممکن نہیں کہ مسجد یا تشہد وغیرہ میں بطور دعا یہ آیت پڑھی ہو۔ اور مزید برآں اس آیت سے اُم القرآن اور فاتحۃ الكتاب کے خاص لفظ پر استدلال کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

(۳) عبد اللہ بن زیاد اسدی رحمہ کی روایت پر روایت اور درایت کلام اپنے موقع پر عرض کیا جائیگا۔ انشاء اللہ العزیز۔

تیسری سند: حضرت ابن مسعود رحمہ سے تیسری سند کے ساتھ یہ الفاظ مروی ہیں:

قال انصت للقراءة فان في الصلوة شغل و  
 سيقفك ذلك الوامر (طحاوی جلد ۱ ص ۱۸۵)  
 مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۸۵، کتاب القراءة ص ۱۸۵  
 موطا امام محمد ص ۹۳، فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۱۳۵  
 وآثار السنن جلد ۱ ص ۸۹ وغیرہ۔  
 فرمایا قرأت کے لیے خاموش رہو کیونکہ نماز میں  
 امام قرأت میں مشغول ہوتا ہے اور وہی امام تمہارے  
 لیے کافی ہے۔ (تمہیں الگ قرأت کرنے کی ضرورت  
 نہیں ہے۔)

اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں: (۱) سند میں وہیب رحمہ بن خالد رحمہ ہے، حافظ ابن حجر رحمہ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھا۔ لکنہ تغیر قلیلاً بآخرہ (تقریب ص ۳۸۸) آخر عمر میں تھوڑا سا تغیر ان کے حافظہ میں آچکا تھا۔

(۲) اس اثر کی سند میں نصر بن مزروق رحمہ ہے اور مجھے اس کا ترجمہ نہیں مل سکا۔  
 (۳) اس میں خصیب واقع ہے نہ معلوم وہ کون اور کیسا تھا؟ (ابکار المنن ص ۱۹۵)  
 جواب: یہ تمام شقیں باطل ہیں: (۱) ثقہ اور ثبت راوی کا تغیر سیر اور قلیل مضر نہیں ہے جیسا کہ گذر چکا ہے۔

(۲) خصیب سے خصیب بن ناصح رحمہ فرمادیں۔ امام ابو زرہ رحمہ فرماتے ہیں ما بہ  
بأس انشاء اللہ اور ابن حبان رحمہ ان کو ثقات ہیں لکھتے ہیں (تہذیب جلد ۳ ص ۱۲۳)

(۳) نصر بن مزوق رحمہ کا ترجمہ اگر مبارک پوری صاحب نے کو نہیں ملا تو کیا ہرج ہے۔  
علامہ بیہقی رحمہ فرماتے ہیں رجالہ موثقون (مجمع الزوائد جلد ۵ ص ۱۸۵) اس کے تمام راوی  
ثقة ہیں اور علامہ نیموی رحمہ لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے (آثار السنن جلد ۱ ص ۸۹) اور  
باقرار مبارک پوری صاحب نہ جاننے والوں پر جاننے والوں کو ترجیح ہوا کرتی ہے۔ قاضی شوکانی  
لکھتے ہیں ومن علم حجة علی من لا یعلم (نیل الاوطار جلد ۱ ص ۳۴۲) کہ جاننے والا نہ جاننے  
والے پر رجحان ہے، یعنی جاننے والے کی بات نہ جاننے والے کی بات پر راجح ہوگی۔ حضرت  
عبداللہ بن مسعود کی بعض صحیح روایتیں باب اول میں نقل کی جا چکی ہیں اور متعدد سندیں  
ان سے اور بھی مروی ہیں۔ مگر ہمارا مقصد تمام روایات و آثار کا استیعاب نہیں صرف اپنے  
دعویٰ کو روشن کرنا ہے۔

**اثر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما:** امام طحاوی رحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے

امام طحاوی ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامہ الحنفی (المتوفی ۳۲۱ھ) علامہ ذہبی رحمہ لکھتے ہیں کہ وہ  
الامام العلامة اور الحافظ تھے اور انھوں نے بہترین کتابیں لکھی ہیں، محدث ابن یونس کا بیان ہے  
کہ وہ ثقة، ثبت، فقیہ اور بڑے عقلمند تھے۔ اور انھوں نے اپنے بعد کوئی اپنا نظیر نہیں چھوڑا۔  
(تذکرہ جلد ۳ ص ۲) مسلم بن قاسم رحمہ کا بیان ہے کہ وہ ثقة جلیل القدر، فقیہ البدن اور علماء کے مختلفا  
کے جاننے میں بڑی مہارت رکھتے تھے (لسان المیزان جلد ۱ ص ۲۷۹) حافظ ابو عمر رحمہ بن عبد البر کا بیان  
ہے کہ وہ تمام فقہاء کے مذاہب پر گہری نگاہ رکھنے والے تھے۔ (الجوامع المصنوعة جلد ۱ ص ۱۰۱) امام  
ابن ندیم رحمہ فرماتے ہیں کہ وہ کان اوحد اہل زمانہ علما و زہدا (الفہرست لابن ندیم ص ۳)  
کہ وہ اپنے زمانہ میں علم و زہد میں یکتا تھے اور حافظ ابن القیم لکھتے ہیں: امام الحنفیۃ فی وقتہ  
فی الحدیث والفقہ ومعرفۃ اقوال السلف۔ ۱ھ (اجتماع جیوش الاسلام ص ۹۷)  
کہ وہ اپنے وقت میں حدیث فقہ اور معرفت اقوال سلف میں اخاف کے امام تھے۔



ابراہیم رحمہ اللہ بن ابی داؤد نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو صالح عبد الغفار بن داؤد الحارثی نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حماد بن سلمہ نے بیان کیا۔ وہ ابو حمزہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ رحمہ بن عباس رضی سے سوال کیا۔

اقراء والامامین یہی قال (۱)۔ یعنی کیا امام کے پیچھے قرأت کر سکتا ہوں؟

(طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۹ والجوہر النقی جلد ۱)

حضرت ابن عباس رضی نے ارشاد فرمایا۔ ہرگز نہیں۔

۱۔ وآثار السنن جلد ۱ ص ۸۹ وغیرہ)

اس صحیح روایت میں سسری اور بھری کی کوئی قید موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ تمام نمازوں کو شامل ہے اور یہی حضرت ابن عباس رضی کا مسلک تھا۔

اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں:

(۱) حماد بن سلمہ کا آخر عمر میں حافظہ کچھ خراب ہو گیا تھا۔

(۲) عزیز اگر حضرت ابن عباس رضی سے اجازت قرأت خلف الامام کی روایت نقل کرتے

ہیں اور اس کی سند بالکل بے غبار ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۶۶)

جواب: یہ اعتراض بھی باطل ہے: (۱) تغیر لیسیر کا محقق حکم پہلے لکھا جا چکا ہے

اور حماد بن سلمہ کا ترجمہ بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ امام احمدؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ جو شخص حماد بن

سلمہ حافظ ابن حجرؒ ان کو من الحفاظ المکثرین لکھتے ہیں (لسان المیزان جلد ۱ ص ۲۴۵) کہ وہ حفاظ

حدیث میں شمار ہوتے ہیں جن سے بکثرت حدیثیں مروی ہیں۔ علامہ یاقوت حمویؒ فرماتے ہیں کہ ۲۴۶ میں

ان کی وفات ہوئی ہے اور وہ ثقہ اور حفاظ حدیث میں تھے۔ محدث ابن یونسؒ ان کو ثقہ اور من حفاظ

الحدیث کہتے ہیں۔ علامہ سمعانیؒ بھی ان کو ثقہ اور من حفاظ الحدیث کہتے ہیں اور امام ابن عساکرؒ

بھی ان کو ثقہ من حفاظ الحدیث کی صفت سے یاد کرتے ہیں۔ (امانی الاحبار جلد ۱ ص ۸)

۲۔ وہ ثقہ اور فقیہ تھے۔ (تقریب ص ۲۳۳)

۳۔ ان کی توثیق باب اول میں سعید بن السیبؒ کے اثر کے تحت نقل ہو چکی ہے۔

۴۔ ان کا نام نصر بن عمرانؒ تھا جو ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص ۳۴۷) حضرت ابن عباس رضی

جلیل القدر صحابی ہیں۔

سلمہ پر اعتراض کرنا چاہتا ہے تو اس کو اس کے اسلام میں متہم سمجھو۔ اصل الفاظ یہ ہیں  
فاتھمہ علی الاسلام اور لو اب صاحب لکھتے ہیں کہ گویم حماد بن سلمہ امام است

تفردش ما دام کہ در رویش مانعی از اصول نبود مفریست» (بدور اللہ ص ۱۳۲)

(۲) یہ اپنے مقام پر عرض کیا جائے گا کہ غیر ائمہ کی روایت میں کوئی غبار ہے یا نہیں؟

علاوہ بریں حضرت ابن عباسؓ کی بسند صحیح دو روایتیں باب اول میں نقل کی جا چکی ہیں۔

ایک اور روایت: حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ رضی بن عباسؓ سے

سوال کیا گیا۔

قيل له ان ناسا يقرئون في الظهر والعصر

فقال لو كان لي عليهم سبيل لقلعت

السننهم ان رسول الله صلى الله عليه وسلم

قرأ فكانت قرأته لنا قراءة وسكوته لنا

سكوتاً۔

کہ کچھ لوگ ظہر اور عصر کی نماز میں قرأت کرتے

ہیں کیا یہ درست ہے؟ حضرت ابن عباسؓ نے

فرمایا۔ اگر میرا ان پر پس چلتا تو میں ان کی زبانیں کھینچ

لیتا۔ کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے

قرأت کی ہمیں بھی قرأت کرنی چاہیے اور آپ

نے سکوت اختیار کیا، ہمیں بھی سکوت کرنا چاہیے۔

(طحاوی جلد ۱ ص ۱۷۱)

اس اثر میں اگرچہ خلف الامام کی قید مذکور نہیں ہے۔ لیکن بادی تا مل یہ بات بخوبی معلوم ہو سکتی

ہے کہ امام اور منفرد کو تو بالاتفاق قرأت کرنا ضروری ہے۔ پھر نہ معلوم حضرت ابن عباسؓ جیسے

یہ اس اثر کی سند کے راوی یہ ہیں: (۱) امام طحاوی (۲) ابن مردوقہ، ان کا نام ابوالیم بن مردوق تھا۔ امام

نسائی رحمہ اللہ ان کو صالح اور لا بأس بہ کہتے ہیں دارقطنی رحمہ اللہ ان کو ثقہ خطی کہتے ہیں۔ ابن یونس کہتے ہیں کہ وہ

ثقة اور ثبت تھے۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ وہ ثقة اور صدوق تھے۔ ابن حبان ان کو ثقافت میں لکھتے ہیں اور

سعید بن عثمان کہتے ہیں کہ وہ ثقة تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۶۳ محصلہ)

(۳) وہب بن جریر ثقہ تھے (تقریب ص ۲۸۸) (۴) جریر بن حازم ثقہ تھے۔ (ایضاً ص ۲۶)

(۵) ابو یزید مانی، ابو حاتم رحمہ اللہ امام احمد اور ابو داؤد ان پر اعتماد کرتے تھے، ابن معین ان کو ثقہ کہتے ہیں۔

(تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۸۸) حافظ ابن حجر ان کو مقبول کہتے ہیں (تقریب ص ۲۳۲) (۶) عکرمہ ثقہ تھے

(ایضاً ص ۲۶۸) (۷) حضرت عبداللہ رضی بن عباسؓ صحابی ہیں۔



ترجمان القرآن اور جبر الامۃ ان لوگوں کی زبانیں کھینچنے کے لیے کیوں آمادہ ہو گئے تھے؟ اگر ان کے بس اور قدرت میں ہوتا تو ضرور اپنا ارادہ پورا کر گزرتے، ناچار یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ لوگ امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے اور حضرت ابن عباسؓ نے ان کی اس مذموم حرکت سے انتہائی نفرت کی اور یہ بھی مت بھولئے کہ پڑھنے والے ظہر اور عصر کی نماز میں پڑھتے تھے جو بالاجماع سترہ نمازیں ہیں اور یہ ممکن تھا کہ قرأت مازاد علی الفاتحہ کی قرأت پر حمل کر لیا جاتا، مگر اس کو کیا کیا جائے کہ حضرت ابن عباسؓ امام کے پیچھے مطلقاً قرأت کے قائل نہ تھے، اور گزر چکا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایت میں امام کے پیچھے خاص لفظ فاتحہ الکتاب کے پڑھنے کی ممانعت آتی ہے۔ اور یہ بھی درست نہیں ہو سکتا کہ قرأت کو جہر پر حمل کر لیا جائے، اس لیے کہ قرأت کا تقابل سکوت سے کیا گیا ہے اور سکوت کے معنی آپ پہلے وضاحت کے ساتھ پڑھ چکے ہیں، بہر کیف خود اس اثر کے اندر ایسے قرائن موجود ہیں، جو اس امر کو متعین کر دیتے ہیں کہ یہ بحالت اقتدار امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے جس پر حضرت ابن عباسؓ طیش میں آکر یہ ارشاد فرماتے ہیں۔ باقی اثر کے اس حصہ کا مطلب کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرأت کی اور ہمارے لیے آپ کی اقتدار ضروری ہے اور آپ نے سکوت بھی کیا۔ اور ہمارے لیے سکوت میں بھی آپ کی پیروی لازمی ہے۔ تو اس کی پوری بحث سکوت کے ذیل میں کی جا چکی ہے کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بحالت امت قرأت کی اور بحالت اقتدار سکوت اختیار کیا۔ یا یہ مطلب ہو کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمارے امام تھے۔ اور آپ کی قرأت ہم سب مقتدیوں کی قرأت تھی۔ اور آپ کا پچھلی دونوں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد کی قرأت کو ترک کر کے اس سے سکوت اختیار کرنا ہمارے لیے کافی ہوتا تھا تو اس لحاظ سے حدیث من کان لہ امام فقراۃ الامام لہ قراۃ کی گویا یہ اثر تفسیر اور تشریح ہو گا۔ اس حصہ کا یہ مطلب ہو یا کوئی اور ہو ہمارا استدلال واضح ہے اور اس پر موقوف نہیں ہے۔ مؤلف خیر الکلام نے ص ۱۳۱ میں ہمارے اس مطلب کو ایک قسم کی تحریف معنوی ہے" سے تعبیر کیا ہے اور دلیل یہ بیان

کی کہ بخاری اصلہ کی روایت میں ابن عباسؓ سے آتا ہے قرآن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما امر وسکت فیما امر... الخ امام بخاری نے اس سے جہر مراد لی ہے اور اس پر باب الجہر بقراءة صلوٰۃ الصبح قائم کیا ہے اور پھر ص ۳۱۹ اور ص ۳۲۰ میں لکھتے ہیں کہ امام اسمعیلیؒ اور حافظ ابن حجرؒ یہ مطلب لیتے ہیں کہ ابن عباسؓ کو ستری نمازوں میں قرأت کا شک تھا اور بعض روایتوں میں ہے کہ وہ نفی کرتے تھے مگر آخر میں قائل ہو گئے تھے لہذا اس سے مراد یا تو جہر ہے یا ان کا پہلا نظریہ ہے اور بعض حنفیہ کا مطلب قطعاً غلط ہے (مصلحہ) الجواب: مگر ہم نے استدلال بخاری کی روایت سے نہیں کیا بلکہ طحاوی کی روایت سے کیا ہے جس کے الفاظ اور ہیں اور اس میں تفصیل ہے اور ظہر اور عصر کی قید موجود ہے وہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ پہلے قرأت میں شک یا انکار کرتے تھے تو بات قدسے معقول ہے مگر اس کا صحیح ثبوت درکار ہے اور در صورت صحت امام بخاریؒ کی روایت کا یہ مطلب لیا جاسکتا ہے مگر ان سے ستری نمازوں میں قرأت اور ترک القراءة خلف الامام کی روایتیں بالکل صحیح ہیں اور دوسری روایتیں اس پایہ کی نہیں ہیں اس لیے ان کے آئینہ میں ان صحیح روایات کا مطلب لینا غلط ہے۔

اثر حضرات خلفاء راشدینؓ: امام عبدالرزاقؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے موسیٰ بن عقبہؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں:

ان ابابکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ كانوا ينهلون  
عن القراءة خلف الامام  
(المتوفی ۷۲ھ) اور حضرت عثمانؓ (المتوفی ۳۵ھ)  
امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتے تھے۔  
(بحوالہ عمدة القاری جلد ۳ ص ۶۸ و اعطاء السنن جلد ۴ ص ۴۵)  
امام عبدالرزاقؒ اپنے مصنف میں داؤد بن قیسؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ

لہ ثقہ اور حافظ تھے۔ (تقریب ص ۲۴۰)

لہ ثقہ اور فقیہ تھے (تقریب ص ۳۶۸) ثبت اور کثیر الحدیث تھے (تہذیب التہذیب ص ۳۶) حجت اور صغار تابعین میں تھے (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۱۳)

لہ امام شافعیؒ ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں امام احمدؒ، ابو زرعہؒ، نسائیؒ، ابو حاتمؒ (باقی اگلے صفحہ پر)



محمد بن عجلان سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: قال علیؑ من قرأ مع الامام فلیس علی شخص نے امام کے ساتھ قرأت کی تو وہ فطر الفطرة۔

(بحوالہ الجوهر النقی جلد ۲ ص ۱۴۹) پر نہیں ہے۔

اور دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲ کی روایت میں ہے:

من قرأ خلف الامام فقد اخطأ الفطرة۔ کہ جس نے امام کے پیچھے قرأت کی اس نے فطر کو کھو دیا۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے داؤد بن قیسؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن عجلانؒ

بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں:

ان عمر بن الخطاب قال لیت فی فم الذی یقرأ خلف الامام حجراً (موطا امام محمد ص ۱) کہ حضرت عمر بن الخطاب نے فرمایا۔ کاش جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر ڈالے جائیں۔

اور حافظ ابو عمرؒ بن عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ: ثبت عن علیؑ وسعد بن زید بن ثابت انه قال لا قرأ مع الامام لا فیما اسر ولا فیما جہر حضرت علیؑ اور حضرت سعد بن زید اور حضرت زید بن ثابت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ امام کے ساتھ نہ سری نمازوں میں قرأت

کیجا سکتی ہے اور نہ جہری نمازوں میں۔ (بحوالہ الجوهر النقی جلد ۲ ص ۱۴۹)

حضرت علیؑ رض سے ایک دوسری روایت یوں مروی ہے، جو صرف متابعت کے طور پر نقل کی جاتی ہے:

من قرأ خلف الامام فلیس علی الفطرة۔ کہ جس شخص نے امام کے پیچھے قرأت کی وہ فطر پر

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ابن سعد، ابن مینی، ابن سب، ابن کوفہ کہتے ہیں۔ ابن معین، ابن کوفہ، صالح الحدیث کہتے ہیں، ابن حبان ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۱۹۸) بلکہ ان کا ترجمہ باب دوم حدیث نمبر ۲ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

(طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۹ و منتخب کنز العمال<sup>۱۸۴</sup>) ہیں۔

اور گو موسیٰ بن عقیقہ اور محمد بن عجلان کی روایتیں مرسل ہیں لیکن جبور ائمہ کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے جس کی تحقیق پہلے گذر چکی ہے۔ یہی اعتراض مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۱۴ میں کیا ہے کہ یہ دونوں اثر ضعیف ہیں کیونکہ یہ دونوں مذکور راوی صغار تابعین میں ہیں۔ حضرت عمرؓ سے ان کی لقائ ثابت نہیں ہے۔ (محصلاً) ہم بھی ان کو مرسل مانتے ہیں، مگر معتضد ہے جو حجت ہے اور مرسل معتضد کے حجت ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں اور یہ ایک دوسرے کے اعتضاد کے لیے کافی ہیں اور دوسری حدیثیں اس پر مستزاد ہیں، حضرت علیؓ کی دوسری روایت میں ابن ابی لیلیٰ رحمہ اور مختار بن ابی لیلیٰ رحمہ کمزور اور ضعیف ہیں۔ اور اسی وجہ سے مبارکپوری صاحب نے اس پر اعتراض کیا ہے (دیکھئے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۰۹) مگر ہم نے اس سے استدلال نہیں کیا۔ بلکہ اس کو محض متابعت میں نقل کیا ہے، اور بقول مؤلف خیر الکلام ان میں بعض راوی اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی ہرج نہیں ہے۔ ص ۳۱۴ حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور حضرت معاذ بن ابی وقاص، ایسے جلیل القدر اور بلند مرتبہ صحابہ کی دینی خدمات اور دیگر علمی اور عملی فضائل کا کون انکار کر سکتا ہے؟ ہاں البتہ کوڑ مغز اور خیرہ چشم کی بات ہی الگ ہے۔ یہ وہی اکابر ہیں جن کو دنیا میں حضرت محمد رسول اللہ تعالیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے جلتی ہونے کی بشارت اور خوشخبری مل چکی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو مومن کا خطاب عنایت فرما کر ابدی رضا کا پروانہ دے دیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (المتوفی ۵۸ھ) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (المتوفی ۵۷ھ) کا اثر؛ امام بیہقی رحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہ رحمہ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے ابو یحییٰ سمرقندی رحمہ نے بالمشافہ بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن نصر رحمہ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ان کا نام محمد بن اسحاق سمرقندی ہے، جلیل القدر محدث اور فقیہ تھے۔ علامہ ذہبیؒ نے (تذکرہ جلد ۲ میں ص ۲۰۱) ان کا نام ذکر کیا ہے

۵ علامہ ذہبی رحمہ لکھتے ہیں کہ وہ الامام شیخ الاسلام اور الفقیہ تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۰۱) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ الفقیہ اور الحافظ تھے۔ (تہذیب التہذیب ۹ ص ۳۸۹) ابن حبانؒ ان کو احد الائمة فی الدنیا کہتے ہیں (انصاف)



ہیں کہ ہم سے محمد بن یحییٰ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمد بن یوسف نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عاصم نے بیان کیا، وہ ابو صالح ذکوان سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

انہما کانَا یا مَرْن بِالْقِرْأَةِ وَرِاعَ الْإِمَامِ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دونوں اس بات کا حکم دیتے تھے کہ جب امام جہر سے قرأت نہ کرتا ہو تو اس کے پیچھے قرأت کرنی چاہیے۔

دوسری سند: امام بیہقی رحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمد بن محمد بن الحارث رحمہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو محمد بن حیان نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمد بن عبد اللہ بن رستہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے شیبان بن فروخ رحمہ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے علامہ ذہبی رحمہ ان کو امام شیخ الاسلام اور حافظ نیشاپور لکھتے ہیں (تذکرہ ص ۲۷۱) ابو حاتم رحمہ ان کو امام اہل زمانہ اور ابو بکر بن زیاد رحمہ ان کو امیر المومنین فی الحدیث کہتے ہیں (ایضاً ص ۱) حافظ ابن حجر رحمہ ان کو احکا لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ص ۵۱۱)

علامہ ذہبی رحمہ ان کو حافظ العابد اور شیخ الشام لکھتے ہیں، امام بخاری رحمہ ان کو افضل اہل زمانہ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۳۱) امام بخاری رحمہ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابو حاتم رحمہ ان کو صدوق اور ثقہ کہتے ہیں۔

(تہذیب التہذیب ۹ ص ۵۳۶)

علامہ عاصم رحمہ بن ہمدان رحمہ اگرچہ بعض محدثین نے خطا واضطراب اور وہم کی وجہ سے ان میں کلام کیا ہے لیکن جہور ان کو ثقہ کہتے ہیں چنانچہ امام احمد رحمہ، علامہ ابن سعد رحمہ اور ابو زر رحمہ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن معین رحمہ ثقہ اور لا بأس بہ نسائی رحمہ لیس بہ بأس اور یعقوب بن سفیان رحمہ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتم رحمہ ان کو صداقت شعار اور صالح الحدیث کہتے ہیں۔ بزار کا بیان ہے کہ مجھے کوئی ایسا محدث معلوم نہیں جو ان سے روایت نہ کرتا ہو۔ امام یحییٰ رحمہ ان کو امام اعمش رحمہ کا ہم پایہ کہتے ہیں، ابن حبان رحمہ اور ابن شاپور رحمہ ان کو ثقات میں لکھتے

ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۳۹) علامہ ذہبی رحمہ ان کو حسن الحدیث لکھتے ہیں (میزان جلد ۲ ص ۵۰)

حافظ ابن کثیر رحمہ عاصم بن ہمدان کی سند کو حید اور قوی کہتے ہیں (ابن کثیر جلد ۲ ص ۵۳۶) امام حاکم رحمہ اور (باقی اگلے صفحہ پر)

عکرم بن زہیر نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عاصم بن بہد لکھنے نے بیان کیا۔ وہ ابو صالح سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں:

انہما کانما یأمران بالقراءة خلف الإمام  
فی الظہر والعصر فی الرکعتین الاولیین  
بفاتحة الكتاب وشئ من القرآن وكانت  
عائشة تقرأ فی الاخریین بفاتحة الكتاب۔  
(سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱)

کہ وہ دونوں ظہر اور عصر کی نماز میں امام کے  
پچھے قرأت کرنے کا حکم دیتے تھے اور دونوں  
فرماتے تھے کہ پہلی دونوں رکعتوں میں سورۃ  
فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنا چاہیے  
اور حضرت عائشہؓ ظہر اور عصر کی پچھلی دونوں رکعتوں میں

صرف سورۃ فاتحہ پڑھا کرتی تھیں۔

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ جہری نمازوں میں امام  
کے پچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ صرف ظہر اور عصر کی سب سے پہلی نمازوں میں وہ امام کے پچھے قرأت  
کے قائل اور اس پر عامل تھے۔ اور وہ دونوں پہلی رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ وشیء  
من القرآن کی قرأت کے بھی قائل تھے۔ اور فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے اور اس روایت  
سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظہر اور عصر کی پچھلی دونوں رکعتوں میں امام کے پچھے حضرت ابو ہریرہؓ قرأت  
سورۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔ ہاں حضرت عائشہؓ صدیقہ کا اس پر عمل تھا، حضرت عائشہؓ

اور حضرت ابو ہریرہؓ رضا کا حضرات صحابہ کرام رض میں اور خاص طور پر فن روایت میں جو مقام  
اور رتبہ ہے اور دین کی جتنی خدمات ان سے سرانجام ہوتی ہیں وہ کس سے مخفی ہیں؟

مبارکپوری صاحب نے عاصم بن بہد لکھنے کی وجہ سے اس روایت پر کلام کیا ہے۔

(دیکھئے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۹۸) لیکن مولانا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر ان کا موازنہ ذہن محمد بن

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) علامہ ذہبیؒ عاصم بن بہد لکھنے کی روایت کو صحیح کہتے ہیں۔ (مستدرک جلد ۲

صفحہ ۲۱۶)

۳ امام احمدؒ ان کو ثقہ اور علامہ ذہبیؒ ان کو من اجل الناس واثقہم کہتے ہیں (تذکرہ جلد

ص ۸۳) اصول حدیث اور محدثین کی تصریح کے مطابق یہ حدیث حسن بحیث قوی اور صحیح ہے۔



اسحاق وغیرہ سے کر دیکھیں۔ مؤلف خیر الکلام ص ۵۱۸ میں لکھتے ہیں کہ یہ اثر بھی بظاہر صحیح ہے مگر اس میں ممانعت کا ذکر نہیں اور یہ اثر جہری نماز کی نفی میں صریح نہیں۔  
 الجواب: ممانعت کا نہ سہی جہری نمازوں میں ترک قرأت کا ذکر تو ہے اور اذالم  
 یجھل شرط اور قید ہے اور صراحت کیا ہوتی ہے؟ اور ترک قرأت خلف الامام کی وجہ سے  
 بطلان نماز کی رٹ تو باطل ہوتی۔

### حضرات! قارئین کرام! ابھی حضرات صحابہ کرام کے بہت سے آثار پیش کیے

۱۔ امام ابن قدامہ نے کئی سندات کے ساتھ حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ،  
 حضرت ابو سعیدؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابن عمرؓ اور  
 حذیفہؓ کی روایتیں نقل کی ہیں (معنی ابن قدامہ جلد ۱ ص ۶۵) اور حافظ ابو عمرؓ بن عبد البرؓ کے  
 حوالے سے حضرت علیؓ، حضرت سعدؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کے نام نقل کیے جا چکے ہیں۔  
 اور امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابن عمرؓ امام کے  
 پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے (جزء القراءة ص ۳) اور علامہ عینیؒ نے مانعین قرأت خلف الامام  
 میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبد الرحمنؓ بن عوفؓ،  
 حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت  
 ابن عباسؓ کا ذکر بھی کیا ہے اور اس پر ایک روایت بھی وہ نقل کرتے ہیں (عمدة القاری جلد ۳ ص ۶۷)  
 نیز علامہ عینیؒ اور ملاح علیؒ القاریؒ لکھتے ہیں کہ اسی حضرات صحابہ کرامؓ سے امام کے پیچھے قرأت کی نفع  
 کا ثبوت ملتا ہے۔ (عمدة القاری جلد ۳ ص ۶۷ اور شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۳) بلکہ امام شعبیؒ نے تو یہاں تک فرمایا  
 ہے: قال ادركت سبعين بدريا كلهم يمنعون المقتدى عن القراءة خلف الامام۔  
 (روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵) کہ میں نے ستر عدد بدری حضرات صحابہ کرامؓ کو دیکھا ہے کہ وہ سب مقتدی  
 کو امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتے تھے اور صاحب ہدایہ نے جلد ۱ ص ۱۱۱ میں تو اجماع صحابہ  
 کا دعویٰ کیا ہے، حافظ ابن عبد البرؒ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وغیرہ کی ان عبارتوں کو پیش نظر رکھتے  
 ہوئے جواب اول میں نقل کی جا چکی ہیں (کہ آیت کا شان نزول بالا جماع خلف الامام کا مسئلہ ہے،  
 اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرنا منکر شاذ اور مخالف اجماع ہے) (باقی اگلے صفحہ پر)

جا سکتے ہیں۔ مگر ہمارا مقصد ان کا استیعاب نہیں ہے بلکہ ہم نے عمداً صرف ان حضرات صحابہ کرامؓ کے جن پر زیادہ تر علم حدیث فقہ اور دین موقوف ہے۔ (مثلاً حضرات خلفائے راشدینؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت زیدؓ بن ثابتؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہم) صحیح آثار صرف بطور نمونہ عرض کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جہور اہل اسلام کا دامن قرآن کریم صحیح اور مرفوع احادیث کے علاوہ حضرات صحابہ کرامؓ کی کیسی با عظمت جہالت وابستہ ہے اور آخر میں ہم صرف ایک ہی اثر نقل کر کے حضرات صحابہ کرامؓ کے ان پیش کردہ آثار پر اکتفا کرتے ہیں۔ وفيہا کفاية لمن له هداية۔

اثر حضرت سعد رضی (المتوفی ۵۵ھ) امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ داؤد بن قیسؒ نے ابن نجادؒ سے روایت کی ہے جو حضرت سعد بن ابی وقاصؒ کی اولاد میں تھے اور وہ حضرت سعدؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

وددت ان الذي يقرأ خلف الامام في جمره (جزء القراءة من موطا امام محمد بن) کہیں اس کو پسند کرتا ہوں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہو، اس کے منہ میں آگ کی چٹکڑی ڈال دوں۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) صاحب ہدایہ کا یہ دعویٰ مبنی برانصاف معلوم ہوتا ہے اور محض تعصب ہی پر اس کو حمل کر لینا قرین قیاس نہیں ہے (واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)۔

لہٰذا یہ سخت الفاظ صرف حضرت سعدؒ ہی سے منقول نہیں بلکہ دوسرے حضرات صحابہ کرامؓ وغیرہم سے بھی اسی طرح کے تہدیدي الفاظ مروی ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے اس کے منہ میں تیغ ڈالنا چاہیے (موطا امام محمد ص ۹۸ منتخب کنز ص ۱۸۷ و البحر النقی ص ۱۹۹، طحاوی ج ۱ ص ۱۶۹) اور ایک روایت میں تلقن (بدلو دار چیز) اور ایک میں سرفض (گرم تھمر) کے الفاظ آئے ہیں (جزء القراءة صلا وغیرہ) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأت کر نیوالے کے منہ میں آگ بھر دی جائے (زیلعی جلد ۲ ص ۱۶) اور حضرت اسودؒ تابعی کہتے ہیں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے، اس کے منہ میں مٹی ڈالی جائے (البحر النقی جلد ۲ ص ۱۹۹) اور حضرت علقمہؒ تابعی سے مٹی اور سرفض دونوں الفاظ منقول ہیں (البحر النقی جلد ۲ ص ۱۹۹) اور حضرت زیدؓ بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ امام (باقی اگلے صفحہ پر)



اعتراض: امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے: (۱) ابن نجاد مجہول ہے۔  
(۲) آگ کی چنگاری اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے اور انسانوں کو ایسی سزا دینے کی صحیح حدیث میں  
نہی آتی ہے (بخاری جلد ۱ ص ۲۲۳ وغیرہ)

(۳) محاذ کتے ہیں کہ مجھے یہ پسند ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کر نیوالے کا منہ شکر سے بھر دیا جائے۔  
جواب: حضرت امام بخاریؒ کا یہ اعتراض تمام شقوں کے ساتھ مخدوش ہے،  
ترتیب وار ہر ایک شق کا جواب ملاحظہ کریں: (۱) ابن نجاد کی جہالت کا دعویٰ کر کے اس اثر  
سے اغماض کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام حاکمؒ تحریر فرماتے ہیں:

وولد سعد بن ابی وقاص الیٰ سنۃ خمسین کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کی اولاد میں  
ومأتین فیہم فقہاء واثمہ وثقات و  
۷۵۰ تک بڑے بڑے فقیہ، امام ثقہ اور حافظ

پیدا ہوتے رہے ہیں۔

حفاظ۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۵)

اور امام بخاریؒ کی وفات ۷۵۰ھ میں ہوئی ہے۔ اس لیے ابن نجادؒ (جو حضرت سعد بن ابی وقاص  
کی اولاد میں تھے) کی جہالت کو بہانہ بنا کر اس اثر کو رد کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام حاکمؒ کی عبارت  
کے پیش نظر ابن نجاد ثقہ حافظ اور امام تھے۔ علامہ علی بن عبد الرزاق بن ہمام کے طریق سے روایت  
نقل کرتے ہیں:

عن داؤد بن قیس عن محمد بن بجاؤد (بکسر الباء) کہ داؤد بن قیسؒ محمد بن بجاؤدؒ سے روایت کرتے  
الموحدة وتخفيف الجیم) عن موسى بن سعد ہیں اور وہ موسیٰ بن سعدؒ سے روایت کرتے ہیں

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) کے پیچھے قرأت کر نیوالے کی ناز ہی سرے سے نہیں ہوتی (موطا امام محمدؒ) اگرچہ  
ان میں بعض آثار کمزور ہیں، مگر کچھ صحیح بھی ہیں اور یہ سب مل ملا کر اس امر کی غمانزدگی کرتے ہیں کہ ان کی بھی  
کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہے، اگر نص قرآنی اور صحیح و مرفوع احادیث اور جہود ائمہ کا اس بات پر اتفاق  
نہ ہوتا کہ امام کے پیچھے قرأت صحیح نہیں ہے تو یہ الفاظ یقیناً غلو اور زیادتی پر محمول ہو سکتے تھے مگر سابق  
ابواب کو پیش نظر رکھنے کے بعد قرآن کریم اور صحیح حدیث کی مخالفت کر نیوالے کے حق میں یہ الفاظ زیادہ  
سنگین نہیں ہیں۔ ہاں البتہ ان دلائل سے جو شخص واقف ہو اور یہ ناواقفی بھی محض دیانت پر مبنی ہو تو اس کے  
لیے مزید احتیاط کی ضرورت ہے، خصوصاً وہ حضرات جو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور جن کی نگاہوں اس طرح یکجا جمع  
کئے ہوئے دلائل نہیں گذر سکے مگر یہ سب دلائل دیکھ کر ضد کر نیوالے کے لیے یہ الفاظ بالکل مناسب ہیں۔

بن ابی وقاص قال ذکر لی ان سعد بن وقاص  
قال وددت ان الذی یقرأ خلف  
الامام فی فیه حجر (عمدة القاری جلد  
۶) مٹا  
کہ انھوں نے حضرت سعدؓ سے روایت کی  
انھوں نے فرمایا کہ میں پسند کرتا ہوں کہ جو شخص  
امام کے پیچھے قرآن کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر  
ڈالا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض ولد سعدؓ سے مراد موسیٰ بن سعدؓ ہیں۔ محدث مولانا محمد حسن  
صاحب فیض پور می فرماتے ہیں کہ  
سہال اسنادہ ثقات  
اس روایت کی سند کے راوی ثقہ ہیں۔  
(الدلیل المبین ص ۳۴۴)

لہذا مولف خیر الکلام کا عثمان بن عبد الرحمن وقاصی کے متروک اور جھوٹا ہونے سے اس  
مذکور سند کے ضعف پر استدلال کرنا (ملاحظہ ہو ص ۵۲۳) باطل ہے کیونکہ یہ مذکورہ روایت  
صحیح اور اس کی سند کے روایت ثقہ ہیں جن میں ابن سجادؓ بھی ہیں اور اغلب ہے کہ  
جزء القرآن میں ابن سجادؓ ہی کا ابن سجادؓ بنا ہوا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں  
کہ جس مسئلہ میں جہور صحابہ کرامؓ کے دو یا تین قول ہوں تو ان سب پر اہل علم کے کسی نہ کسی  
طائفہ نے عمل کیا ہے۔

وآیۃ ذلک ان تظہری فی مثل الموطاء  
وجامع عبد الرزاق روایا تھو اھ  
اور اس کی علامت یہ ہے کہ ان کی روایتیں،  
موطاء اور جامع عبد الرزاق میں بیان ہوئی ہوں۔  
(حجة اللہ جلد ۱ ص ۱۸۷ طبع مصر)

اس سے معلوم ہوا کہ وہ اقوال صحابہ کرامؓ جو موطاء اور جامع عبد الرزاق میں ہوں وہ مستند  
اور قابل اعتبار ہیں۔

(۳) قلعوں، سواری کے جانوروں اور انسانوں کو جلانے کے بارے حضرت صحابہ کرامؓ میں خلصا اختلاف  
ہے ایک گروہ جواز کا اور دوسرا عدم جواز کا قائل ہے۔ (فتح الباری ج ۱، حافظ ابن حجرؒ نے جلانے کی حدیثوں  
کے منسوخ ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ فتح الباری ج ۱ ص ۱۲۶ و ۱۲۷) لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ  
نے حضرت صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں باغیوں کو آگ میں جلایا تھا اور حضرت خالد بن الولیدؓ نے بھی مرتدوں



کو جلا یا تھا اور آگے لکھا: واكثر علماء المدينة يجيزون الخ (فتح الباری ۶/۲۶۷) اس سے معلوم ہوا کہ نسخہ کا مسئلہ اتفاقی نہیں اغلب ہے کہ حضرت سعدؓ بھی جواز کے قائل تھے ان حضرات کا استدلال ان احادیث سے ہے جن میں وددت سے بڑھ کر لفظ ہممت (کہ میں البتہ قصد اور ارادہ کر چکا ہوں) کے الفاظ آئے ہیں مثلاً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں بختمہ ارادہ کر چکا ہوں کہ جو لوگ جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے۔ ان کو گھروں کے اندر بند کر کے آگ میں جلا دوں (بخاری ص ۸۶ و مسلم ۲/۳۳۲) نیز آپ نے فرمایا کہ جو لوگ جمعہ کی نمازیں شریک نہیں ہوتے ہیں ان کو گھروں میں بند کر کے آگ میں جلانے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ مسلم ۲/۳۳۲ و مشکوٰۃ ص ۱۲۱) اور آپ نے فرمایا کہ اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے، تو میں اپنا ارادہ پورا کر چکتا (مسند احمد ص ۱۰۷ و ابوداؤد طیالسی مشن ۳) حضرت سعدؓ نے تو خلاف شرع کام کرنے والوں کے لیے صرف آگ کے عذاب کی آرزو کی ہے لیکن جناب رحمۃ اللہ علیہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو مجرموں کو آگ میں جلانے کا قصد تک فرما چکے تھے اور اگر عورتوں اور بچوں کا سوال سامنے نہ آتا تو آپ یقیناً اپنا ارادہ پورا کر گزرتے کیا یہ روایتیں امام بخاریؒ کے نزدیک صحیح نہیں ہیں؟ اور کیا یہ حدیثیں امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس قاعدہ کے لحاظ سے لا تعدو ابعد اب اللہ کی حدیث کے خلاف ہیں؟ اگر نہیں تو اُمید قوی ہے کہ حضرت سعدؓ کا اثر بھی مخالف نہ ہوگا، بلکہ اس کو بطریق اولیٰ مخالف نہ ہونا چاہیے۔

ع: ”مانتے جس کو نہ تھے لیجئے پہنچے وہاں“

(۳) امام بخاریؒ نے حمادؒ کے قول کی سند بیان نہیں کی تو ایسی بے سند بات کا کب اعتبار رہے؟ علاوہ انہیں اگر حمادؒ کے قول کی سند بھی مل جائے، تب بھی قرآن کریم صحیح احادیث اور آثار صحابہؓ کے مقابلہ میں حمادؒ کے قول کی کیا وقعت ہے؟ خود امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ جب ایک چیز آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرامؓ سے ثابت ہو جائے تو اسود درجہ وغیرہ کی بات کیسے محبت ہو سکتی ہے؟ (جزء القراءة، ص ۱) بیچ ہے نگار خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے؟

مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ جو چیز منع ہوتی ہے اس کی تمنا بھی منع ہوتی ہے آپ کی تمنا ہی سے پہلے کی ہے اس کے بعد آپ نے منع کیا قرآن کریم میں ہے: لَا تَتَمَنَوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ... الخ ص ۵۲۳

الجواب: بے شک جو چیز منع ہوتی ہے اس کی تمنا بھی منع ہوتی ہے لیکن

جن حضرات کے نزدیک آگ میں جلانا جائز ہے ان کے نزدیک اس کی تمنا بھی جائز ہے۔ باقی قرآن کریم میں تمنائے عذاب کی نہیں ہے اس میں حسد سے منع کیا گیا ہے و آں چیزے دیگر است۔

**لطیفہ:** اگر حضرت حماد کے اس قول کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کا — (ملیٰ فوہ سکرا) منہ شکر سے بھر دیا جائے تو بھی اس سے حضرت امام بخاریؒ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اگر عین نماز کی حالت میں قاری کا منہ شکر سے بھرنا مراد ہے تو بیچارہ قرأت تو کیا کرے گا۔ جہر کے ساتھ آمین بھی نہیں کہہ سکیگا یک نہ شد و شد، بلکہ وہ تو آہستہ آمین کہنے سے بھی رہا اور شکر بھی حضرت حمادؒ نے تھوڑی تجویز نہیں کی بلکہ اچھی خاصی تجویز کی ہے جس سے (ملیٰ فوہ سکرا) اس کا منہ خوب بھر سکے، کیا بعید ہے کہ حمادؒ نے امام کے پیچھے قرأت کی بندش کا یہ طریقہ ایجاد کیا ہو مگر امام بخاریؒ اس کی سطحی مٹھاس کو دیکھ کر ان کو اپنا ہمنوا سمجھ بیٹھے ہوں، مشہور ہے کہ گڑ سے مخالف کو جلدی قابو کیا جاسکتا ہے اور اگر امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کا خارج از نماز شکر سے منہ بھرنا مراد ہے تو اس نمازک دور میں دوسری اشیا خوردنی کی طرح شکر کے لیے بھی لوگ سرگرداں پھر رہے ہیں۔ فریق ثانی حضرت حمادؒ کے اس قول کا اعلان کر دے، پھر قدرت خدا کا تماشا دیکھے کہ جماعت کی تعداد کیسے بڑھتی اور اس کو کیسے ترقی حاصل ہوتی ہے؟ بلکہ ہمیں تو یقین ہے کہ عوام تو کیا اچھے خاصے محدث بھی حضرت ابوسعید الخدریؒ کی مرفوع حدیث ان احق ما اخذتہ علیہ اجل کتاب اللہ (او کہا قال) سے اس شکر خوردی پر استدلال کرتے نظر آئیں گے اور حمادؒ کے زمانہ کی شکر سے اس ترقی یافتہ دور کی شکر بد بھان زیادہ سفید اور عمدہ ہے اور بہت ممکن ہے کہ جو لوگ فریق ثانی سے فرعی مسائل میں قدرے دور ہیں (مثلاً پٹھان وغیرہ) اور چائے کے اشد عادی ہیں اور کھانڈ اور شکر نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ اس شکاری اعلان کے بعد فریق ثانی کے حلقہ گوش ہو جائیں اور بیماروں کو تو یونانی قدحوں پر قدحے پینے کے لیے شکر مل جائیگی۔ غرضیکہ اس اعلان کے بعد سورۃ فاتحہ کی برکت سے ہر کس و ناکس کو اس کا سورۃ الشفا اور سورۃ



السوال وغیرہ ہونا آسانی سے سمجھ آ سکتا ہے اور اس کی برکت سے ہمیں توفیق حاصل ہے ہی، فریق ثانی کو بھی بڑی فتح اور کامرانی حاصل ہوگی۔ الغرض امام بخاریؒ نے امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کے لیے شکر تحریر فرمائی اور عین نماز کی حالت میں جیسا کہ ان ظاہری الفاظ سے متبادر ہوتا ہے مگر یہ خیال نہ کیا کہ گھر کس کا پورا ہو رہا ہے؟ سچ ہے۔

ع۔ میری تعمیر میں مضمر ہے اک ضرورت خرابی کی

حضرات! حضرات صحابہ کرامؓ کے ان مختصر سے آثار کے بعد مشتے نمونہ از خروا کے طور پر بعض حضرات تابعینؓ و اتباع تابعینؓ وغیرہم کے کچھ آثار آپ کے سامنے عرض کیے جاتے ہیں تاکہ آپ کو حضرات تابعینؓ وغیرہم کا نظریہ بھی بسلسلہ قرأت خلف الامام معلوم ہو سکے اور اختصاراً نقل سند کے بعد ہم روایت کی توثیق بھی عرض کریں گے، اور فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ اعتراضات کے جوابات بھی عرض کر دیے جائیں گے۔

اثر علقمہ بن قیسؓ (المتوفی سنہ ۴۸ھ) امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے امام ابو حنیفہؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حمادؒ نے بیان کیا۔ وہ ابراہیم نخعیؒ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ

لہ علامہ ذہبیؒ ان کو امام بارع لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۴۱) امام نوویؒ ان کو صاحب کمال فقیہ لکھتے ہیں (تہذیب اللہ جلد ۱ ص ۳۴۲) علامہ ابن سعدؒ ان کو کثیر الحدیث لکھتے ہیں (طبقات ابن سعد جلد ۴ ص ۶۲) ابو ظبیانؒ کا بیان ہے کہ میں متعدد حضرات صحابہ کرامؓ کو علقمہؒ سے مسائل پوچھتے اور استفسار کرتے دیکھا ہے (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۴۸) حماد بن ابی سلیمانؒ، امام مسلمؒ اور دیگر محدثینؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے (الجواہر المصنیہ جلد ۱ ص ۲۲۶) امام احمدؒ ان کی تعریف کرتے تھے اور ان کو قابل اعتبار سمجھتے تھے۔ امام معمرؒ کا بیان ہے کہ میں نے امام زہریؒ، حماد اور قتادہؒ سے بڑھ کر دین کی سمجھ رکھنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ امام ابن معینؒ، عجلؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور مستقیم کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ (اباؤس) کہتے ہوئے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ (تہذیب

التہذیب جلد ۳ ص ۱۶ و ۱۷)

۳۔ ان کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

ماقرأ علقمة بن قیس قط فیما یجهر فیہ  
 و لا فیما لا یجهر فیہ و لا الرکتین الا خیرین  
 امر القرآن و لا غیرها خلف الامام -  
 (بحوالہ تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹۰)  
 علقمة بن قیس نے امام کے پیچھے کبھی کسی نماز میں  
 قرآن نہیں کی نہ جہری نمازوں میں اور نہ ستری میں  
 (نہ پہلی رکعتوں میں اور نہ پچھلی رکعتوں میں، نہ  
 سورۃ فاتحہ اور نہ کوئی سورت امام کے پیچھے وہ  
 کچھ بھی نہیں پڑھتے تھے۔

اور یہ اثر اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل واضح ہے کہ حضرت علقمةؓ امام کے پیچھے کسی نماز  
 میں کوئی قرآن نہیں کیا کرتے تھے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اولاً۔ اگرچہ حماد ثقہ تھے مگر مدلس  
 اور مختلط تھے۔ وثانیاً۔ ابراہیم نخعیؒ کی علقمةؓ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ لہذا یہ روا  
 صحیح نہیں ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۶۹)

جواب: جب حماد ثقہ ہیں اس روایت میں اختلاط سے کوئی فرق نہیں پڑیگا کیونکہ محدثین نے اس امر کی تصریح  
 کی ہے کہ انکو اختلاط کا عارضہ آخری لاثق ہوا تھا اور ابراہیم نخعیؒ کی روایتوں میں وہ خطا نہیں کرتے تھے (تہذیب التہذیب ص ۱۸۰)

مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ اور سفیانؒ اور ان کے طبقہ کے مدلسین کی تدلیس مضر  
 نہیں ہے۔ علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ نے علقمةؓ سے سماعت کی ہے۔

(تذکرہ جلد ۱ ص ۲۹۹ و تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۸۰) اس لیے مبارکپوری صاحبؒ کا یہ دعویٰ کرنا کہ ابراہیم  
 نخعیؒ نے علقمةؓ سے ملاقات نہیں کی مردود ہے۔ علاوہ بریں اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ابراہیم نخعیؒ

کی ملاقات علقمةؓ سے نہیں ہوئی تو یہ روایت مرسل ہوگی۔ اور امام دارقطنیؒ، امام طحاویؒ، حافظ  
 ابن قیمؒ اور حافظ ابن حجرؒ وغیرہ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ کی مرسل روایتیں بھی حجت اور

صحیح ہیں۔ (دارقطنی جلد ۲ ص ۳۶۱، طحاوی جلد ۱ ص ۱۳، زاد المعاد جلد ۲ ص ۲۵۴ و درایہ حل) اور امام  
 بیہقیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ مرسلات ابراہیم صحیحۃ الا حدیث تاجر البحرین۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۳۸)

یہ یاد رکھنا کہ یہ روایت صرف مرسل ہی نہیں بلکہ مسند اور مرفوع بھی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرما  
 ہیں کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اس نے کہا کہ حضرت! میں بحرین کے علاقہ میں

تجارت کے لیے جانا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ دو رکعت نماز پڑھو (رواہ الطبرانی فی الکبیر و رجالہ موثقون مجمع الزوائد  
 جلد ۲ ص ۲۸۳)



کہ تاجربحرین کے مضمون والی روایت کے علاوہ ابراہیمؒ کی تمام مرسل روایتیں صحیح ہیں، بہر حال یہ روایت فن روایت اور محدثین کے اصول کے ماتحت بالکل صحیح اور حجت ہے۔  
**اثر عمر بن ميمونؒ (المتوفى سنة ۳۷۵ھ)** وغیرہ ابو بکر بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں ہم سے یزیدؒ بن ہارونؒ نے بیان کیا، وہ اشعثؒ سے اور وہ مالک بن عمارہؒ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود کے اصحابؓ اور تلامذہ سے جن میں خصوصیت سے عمر بن ميمونؒ قابل ذکر ہیں۔ امام کے پیچھے قرآن کرنے سے متعلق سوال کیا۔ کلہو یقولون لا یقرأ خلف الامام (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹) تو ان سب نے جواب یہ دیا کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہئے، محقق نیمویؒ نے فرمایا تھا کہ مجھے مالک بن عمارہؒ کا ترجمہ نہیں مل سکا، مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ تو اس اثر کا پیش کرنا بے سود ہے۔ (ابکار المنیر ص ۱۶) مگر ہم ثابت کر چکے ہیں کہ یہ مالک بن عامرؒ ہیں جو ثقہ اور ثبوت تھے اور یہ اثر بھی صحیح ہے، حضرت علیؒ جب کوفہ تشریف لے گئے تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ

لہ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الامام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۱)

لہ ان کا ترجمہ گذر چکا ہے۔ لہ وہ ثقہ متقن اور عابد تھے (تقریب ص ۱۲)

لہ اشعث بن ابی الشعثاءؒ، امام ابن معینؒ، ابو حاتمؒ، نسائیؒ، ابوداؤدؒ اور بزارؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، علیؒ ان کو شیوخ کوفہ اور ثقات میں لکھتے ہیں اور ابن جبانؒ اور ابن شاپرؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔

تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۵۵، حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تقریب ص ۱۲)

لہ یہ مالک بن عمارہؒ نہیں بلکہ مالک بن عامرؒ ہیں جو اشعثؒ سے روایت کرتے ہیں (دیکھئے تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۵۵ وغیرہ) علامہ ذہبیؒ ان کو صاحب ابن مسعودؒ قدیم الموت اور ثقہ لکھتے ہیں، (میزان جلد ۱ ص ۳) امام ابن معینؒ، ابوداؤدؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن جبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۲) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں (تقریب ص ۱۲) ابوعطیہؒ ان کی

کنیت تھی بخاری ۲ ص ۶۵ اور ترمذی جلد ۱ ص ۸۸ میں ان کا ذکر ہے۔

لہ نواب صاحبؒ نے اصحاب علیؒ اور عبداللہؒ سے اشعائیس کے نام بتلائے ہیں جو جلیل القدر محدث اور امام تھے۔ (الجنہ ص ۱)

اصحاب عبد اللہ ﷺ شرح هذه القرية (طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۴) عبد اللہ بن مسعود کے اصحاب اس شہر کے روشن چراغ ہیں اور آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ اصحاب عبد اللہ ﷺ سب کے سب امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور یہی فتویٰ دیا کرتے تھے۔

اثر اسود بن یزید (المستوفی ص ۵۷) ابو بکر بن ابی شیبہ فرماتے ہیں ہم سے ابن علیؓ نے بیان کیا۔ وہ ایوبؓ اور ابن ابی عروہؓ سے روایت کرتے ہیں، وہ دونوں ابو معشرؓ سے وہ ابراہیم نخعیؓ سے اور وہ اسود بن یزیدؓ سے۔

قال لان اعرض جمرة احب الى من ان اقراء خلف الامام اعلم انه يقرأ۔  
انہوں نے فرمایا کہ میں اس بات کو زیادہ پسند کرتا ہوں کہ اپنے منہ میں آگ کی چنگاری

ڈال لوں بجائے اس کے کہ میں امام کے پیچھے قرأت (آثار السنن جلد ۱ ص ۹)

کروں جبکہ مجھے علم ہے کہ وہ پڑھتا ہے۔

یہ روایت بھی اپنے مدلول میں واضح ہے۔ مبارکپوری صاحب نے ابراہیم نخعیؓ کی تہلیل کا بہانہ کیا ہے۔ (ابکار وغیرہ) مگر بے سود ہے کیونکہ یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ

۱۔ علامہ ذہبیؒ ان کو امام فقیہ، زاہد، عابد اور کوفہ کا امام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۴۳) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق اور جلالت شان پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۱۲) محدث

ابن حبانؒ ان کو فقیہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۴) حافظ ابن کثیرؒ ان کو من کبار التابعین اور من اعیان اصحاب ابن مسعودؓ اور من کبار اهل الکوفة لکھتے ہیں (الہدایہ والنہایہ

جلد ۱ ص ۱۲)

۲۔ ان کا نام اسمعیل بن ابراہیم بن مقسمؓ تھا، جو ثقہ اور حافظ تھے۔

۳۔ ایوبؓ کا ترجمہ باب اول میں حضرت ابن مسعودؓ کے اثر کے تحت اور ابن ابی عروہؓ کا باب دوم حدیث ۱ کے ذیل میں گزر چکا ہے۔

۴۔ ابو معشرؓ کا نام زیاد بن کلیبؓ تھا۔ محدث عجلؓ، نسائیؒ، ابن مدینیؒ اور ابو جعفر بستیؒ سب ان کو

ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ ان کو حفاظ متقین میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۳۸۳)



ابراہیم نخعیؒ اس طبقہ کے ماس تھے جن کی تدلیس مضر نہیں ہے اور ان کی جملہ روایتیں (علاوہ ایک روایت تاجہ بخرین کے) حجت ہیں، چنانچہ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں: قلت استقر الومر علی ان ابراہیم حجتہ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۳۵) میں کہتا ہوں یہ طے شدہ بات ہے کہ ابراہیم حجت تھے۔

دوسری سند: ابو بکرؒ بن ابی شیبہؒ، ہشتمؒ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسمعیلؒ بن ابی خالدؒ نے بیان کیا۔ وہ وبرہؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت اسود بن یزیدؒ سے وہ فرماتے ہیں قال وددت ان الذی یقرأ خلف الامام ملى فاه ترابا (تعليق الحسن جلد ۱ ص ۹۰) کہ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کا منہ مٹی سے بھر دیا جائے۔

تیسری سند: عبدالرزاقؒ بن ہمامؒ اپنے مصنف میں سفیان ثوریؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ امام اعمشؒ سے اور وہ ابراہیم نخعیؒ سے اور وہ اسود بن یزیدؒ سے وہ فرماتے ہیں کہ

قال وددت ان الذی یقرأ خلف الامام ملى فوه ترابا (الجوهر النقی جلد ۲ ص ۱۶۹) میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے اس کا منہ مٹی سے بھر دیا جائے۔

۱۔ ہشتم بن بشیر ثقہ اور ثبت لیکن کثیر التدلیس تھے (تقریب ص ۳۸۱) مگر اس روایت میں وہ تحدیث کرتے ہیں۔

۲۔ امام ابن حمدیؒ، ابن معینؒ، نسائیؒ اور علیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن عمار موصیٰ ان کو حجت اور یعقوب بن سفیانؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ، یعقوب بن شیبہؒ، ابن حبانؒ اور ابن عیینہؒ ان کو ثقہ، ثبت اور حافظ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۹۱)

۳۔ وبرہ بن عبد الرحمنؒ امام ابو زرہؒ، ابن معینؒ اور علیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۱ ص ۱۱۱)

۴۔ عبدالرزاق بن ہمامؒ کا ترجمہ اثر حضرت علیؒ میں اور سفیان ثوریؒ کا مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ بقیہ روایات کا ترجمہ بھی گذر چکا ہے۔ امام اعمشؒ ثقہ اور حافظ تھے (تقریب ص ۱۶۹) البتہ مدلس تھے، لیکن حضرت قتادہؒ کی بحث ملاحظہ کر لیجئے کہ ان کی تدلیس بھر مضر نہیں ہے۔

غالباً حضرت اسود کے یہی وہ الفاظ ہیں، جن پر حضرت امام بخاریؒ بہت ناراض ہوئے ہیں (دیکھتے جزاء القرآۃ ص ۱)

اثر سوید بن غفلہ (المستوفی سلّمہ) ابو بکرؓ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے فضل بن دکیّن نے بیان کیا۔ وہ زہیرؓ سے روایت کرتے ہیں، وہ ولیدؓ بن قیسؓ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سوید بن غفلہ سے سوال کیا۔ اقرأ خلف الامام فی الظہر والعصر قال لا (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹) کیا میں ظہر اور عصر کی نمازیں امام کے پیچھے قرأت کر سکتا ہوں؟ فرمایا نہیں، اس اثر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سائل کو دوسری نمازوں کے بارے میں تو یہ علم تھا کہ ان میں امام کے پیچھے قرأت صحیح نہیں ہے۔ لیکن اس کو صرف ظہر اور عصر کی نماز میں قرآۃ خلف الامام کے بارے میں تردد تھا۔ سو حضرت سویدؓ نے اس کا یہ مغالطہ بھی نکال دیا ہے۔

اعترض: مبارکپوری ص ۱۱۱ لکھتے ہیں کہ سند میں ولید بن قیسؓ بخاریؒ ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ کو مقبول لکھتے ہیں (تقریب ص ۳۸۶) اور علامہ بیہقیؒ نے حیل المتین میں لکھا ہے کہ جس آدمی کے متعلق حافظ ابن حجرؒ مقبول لکھتے ہیں وہ کمزور ہوتا ہے۔ لہذا یہ اثر کمزور ہے (اجار المتین ص ۱۹۶) جواب: حیل المتین ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ نہ معلوم محقق

لے علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ بلند مرتبہ عابد، زاہد، قانع بالیسیر اور کبیر الشان تھے (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۱۱) امام ابن معینؒ اور عجمیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، محدث ابن قانعؒ قرآن کو صحابہؓ میں شمار کرتے ہیں (تہذیب التہذیب ص ۲۸۸) حافظ ابن کثیرؒ نقل کرتے ہیں کہ حضرت سوید بن غفلہ نے فرمایا کہ میں آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ہم عمر ہوں کیونکہ میری ولادت بھی عام فیل میں ہوئی ہے اور امام بیہقیؒ ان سے یہ نقل کرتے ہیں کہ میں آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے صرف دو سال عمر میں چھوٹا ہوں (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۲۶۲)

ابو بکرؓ بن ابی شیبہؒ اور فضل بن دکیّنؒ کا ترجمہ گذر چکا ہے۔

ابو زہیرؓ بن معاویہ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص ۱۱۱)

ولید بن قیسؓ سکونی امام ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں امام نسائیؒ ان کی تعریف کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۱۱) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص ۳۸۶)



نیموئی یہ کس راوی اور کس موقع اور محل لکھا ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اس راوی کے متعلق لکھا ہو، جس کو دیگر محدثین کمزور بتاتے ہوں اور صرف حافظ ابن حجر ہی اس کو مقبول کہتے ہوں اور ولید بن قیس کو تو دیگر محدثین بھی ثقہ کہتے ہیں۔ علاوہ بریں مبارکپوری صاحب کو یہ مغالطہ ہوا ہے۔ یہ راوی ولید بن قیس تجلی نہیں جن کو حافظ ابن حجر مقبول لکھتے ہیں (اور محدث عجل تاہی اور ثقہ لکھتے ہیں۔ اور ابن حبان ان کو ثقافت میں لکھتے ہیں تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۲۷) بلکہ یہ ولید بن قیس سکونی ہیں جو نہ ہیر سے روایت کرتے ہیں (دیکھتے تہذیب التہذیب ص ۱۲۷) ع: "میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا"

اثر نافع بن جبیر (المتوفی ۳۹۷ھ) امام مالکؒ یزید بن رومان سے روایت کرتے ہیں اور وہ نافع بن جبیر سے کان یقر خلف العلم فیما لا یجہر فیہ الامام (موطا امام مالک ص ۲) لے محقق نیموئی کا نام طہیر حسن ابوالخیر کنیت اور شوق تخلص تھا۔ آپ مولانا علامہ محمد عبدالحی لکھنوی (المتوفی ۱۳۸۷ھ) کے شاگرد رشید تھے، بڑے پایہ کے محدث اور فقیہ تھے، فن اسماء الرجال پر گہری نظر رکھتے تھے، اور خداداد ذہانت اور فطانت میں قاضی شوکانی سے بھی انکا پایہ بہت بلند تھا۔ مگر افسوس کہ ناپائیدار زندگی نے ساتھ نہ دیا اور ان کی قابلیت کے پورے جواہر بھی اچھی طرح اجاگر نہ ہوئے تھے کہ ۱۷ رمضان ۱۳۲۲ھ میں اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ آپ کی مشہور کتاب آثار السنن (مع حاشیہ تعلیق الحسن) کو علامہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور فریق ثانی کی نگاہوں میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے، مولانا مبارکپوری صاحب نے ابکار المعنی لکھ کر اپنی جماعت کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ آثار السنن کا جواب ہے، مگر وہ بری طرح اس میں ناکام رہے ہیں، فریق ثانی کے چیدہ چیدہ علماء کو بلکہ خود مبارکپوری صاحب کو بھی اس کا گہرا احساس تھا اور یہ سلیم الطبع آدمی اس ٹھوس نظریہ کا یقیناً احساس کر سکتا ہے ولین الخیر کالمعاينة۔

۵ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ نافع بن جبیر امام اور فاضل تھے۔ ان کی قرین اور جلالت شان پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسما جلد ۱ ص ۱۲۷) ابن خراشؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ مشہور اور امام تھے۔ وہ مدینہ طیبہ کے صاحب افتار علماء میں تھے اور ان کے فتاویٰ معتبر سمجھے جاتے تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۲۷) حافظ ابن کثیرؒ ان کو من الثقات النبلاء اور من ائمة الاجلاء لکھتے ہیں (الہدایہ والنہایہ جلد ۳ حضرت امام مالکؒ کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے) ص ۵۰۵)

کہ وہ امام کے پیچھے صرف ان نمازوں میں قرأت کرتے تھے جن میں امام جہر سے قرأت نہیں کرتا تھا۔ اگر ہر نماز اور ہر رکعت میں امام کے پیچھے قرأت سورۃ فاتحہ ضروری ہوتی۔ تو حضرت نافع بن جبیرؓ سب نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے، مگر وہ صرف ستر نمازوں میں قرأت کرتے تھے۔ اور کیا بعید ہے کہ امام مالکؒ وغیرہ کی طرح وہ بھی استحباب کے قائل ہوں اگر وہ وجوب کے بھی قائل ہوں۔ تب بھی فریق ثانی کی جہری نمازوں میں بطلان نماز کی رٹ تو غلط ہو جائیگی۔ وعلیٰ ہذا القیاس ہم جتنے آثار نقل کریں گے، جن میں صرف جہری نمازوں میں امام کے پیچھے ترک قرأت کا ثبوت ہوگا۔ ان سے ہمارا مدعا بھی محض یہ ہے کہ فریق ثانی کا عمومی نظریہ صحیح نہیں ہے اور بس گو ان میں ستر نمازوں کے اندر قرأت کا ثبوت بھی ہوگا، استحبابی طور پر ہو یا وجوبی طور پر بہر حال ہمارا مطلب اور مدعا واضح ہے۔

اثر سعید بن المسیبؓ (المتوفی ۹۲ھ) ابو بکرؓ بن ابی شیبہؓ فرماتے ہیں کہ ہم سے ویکعؓ نے بیان کیا۔ وہ ہشامؓ دستوائیؓ سے اور وہ حضرت سعید بن المسیبؓ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: انصت للامام (آثار السنن جلد ۱ ص ۱۸۱) یعنی امام کے پیچھے بالکل خاموشی اختیار کرو، اور قرأت نہ کیا کرو۔ حضرت سعید بن المسیبؓ کا ایک اثر باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے اور یہ اثر بھی اپنے معنوی اعتبار سے واضح ہے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اولاً۔ اس اثر کی سند میں قنادہ مدلس ہیں، جو عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ ثانیاً۔ امام بخاریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ سعید بن المسیبؓ، عروہؓ، شعبیؓ، عبید اللہؓ بن عبد اللہؓ، نافع بن جبیرؓ، ابو الملیحؓ، قاسم بن محمدؓ، ابو مجلزؓ، مکحولؓ، مالک بن عوفؓ اور سعید بن ابی عروہؓ قرأت خلف الامام کے قائل تھے۔ (جزء القرآن ص ۱) لہذا یہ اثر حجت نہیں ہو سکتا (ابکار المنن وغیرہ)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) زبید بن رومانؓ کو امام نسائیؒ رح اور ابن معینؒ ثقہ لکھتے ہیں۔ علامہ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ علامہ ابن سعدؒ ان کو عالم، کثیر الحدیث اور ثقہ لکھتے ہیں (تہذیب ۱ ص ۳۲۵) ہشام دستوائیؒ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص ۳۸) حضرت سعید بن المسیبؓ کا ترجمہ باب اول میں اور قنادہ ویکعؓ اور ابو بکرؓ بن ابی شیبہؓ کا باب ثانی میں نقل ہو چکا ہے۔ وہاں ہی ملاحظہ کر لیں۔



جواب: حضرت قتادہؓ کی تدلیس کا مفصل جواب پہلے دیا جا چکا ہے اور حضرت سعید بن المسیبؓ کے بسند صحیح و اثر ہم پہلے عرض کر چکے ہیں اور امام بخاریؒ نے اپنے استدلال میں ان کے اثر کی کوئی سند نقل نہیں کی اور بے سند بات حجت نہیں ہو سکتی۔ اور حضرت عروہ بن زبیرؓ نافع بن جبیرؓ اور قاسم بن محمدؓ وغیرہ کو مطلقاً مجزین قرأت خلف الامام میں شمار کرنا باطل ہے بعض کے آثار اس کے خلاف نقل کیے جا چکے ہیں اور بعض کے عرض کر دیے جائیں گے۔ اور بقیہ آثار کی اسانید پر آثار خصوم میں بحث کی جائیگی۔ انشاء اللہ العزیز۔

اثر سعید بن جبیرؓ (المتوفی ۹۴ھ) ابو بکر بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ہیشتمؒ نے بیان کیا۔ وہ ابوشیرؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سعید بن جبیرؓ سے سوال کیا۔

عن القراءة خلف الامام قال ليس خلف الامام قراءة۔  
کیا امام کے پیچھے قرأت کی جاسکتی ہے؟ فرمایا کہ امام کے پیچھے کسی قسم کی کوئی قرأت نہیں کی جاسکتی۔ (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹)

اعتراض: مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اقلاً — ہیشتمؒ مدلس تھے۔ اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں و ثانیاً — حضرت سعید بن جبیرؓ سکتا امام میں قرأت کے قائل تھے (جزء القراءة ص ۵) اس لیے یہ اثر قابل احتجاج نہیں ہو سکتا۔ (ابکار المنہن ص ۶۷ وغیرہ)

جواب: یہ بالکل صحیح ہے کہ ہیشتمؒ کثیر التدلیس تھے، لیکن حضرت امام بخاریؒ اور علامہ ذہبیؒ ان کی معنعن حدیث سے استدلال کرتے ہیں (دیکھئے صحیح بخاریؒ جلد ۱ ص ۱۰۷ و تذکرہ ج ۲ ص ۲۴۷ وغیرہ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تدلیس بھی مضر نہیں ہے، مزید تائید کے لیے علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ علماء اعلام میں تھے (تذکرہ جلد ۱ ص ۶۵) امام نوویؒ کا بیان ہے کہ وہ تابعینؓ کے ائمہ کبار میں تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، عبادت اور زہد و ورع اور جملہ کمالات میں وہ کبار ائمہ اور سرگروہ تابعینؓ میں تھے۔ (تمہذیب الاسما جلد ۱ ص ۲۱۶)

علامہ ابوبشرؒ کا نام جعفرؒ بن ایاسؒ تھا اور وہ ثقہ تھے (تقریب ص ۶) ہیشتمؒ کا ترجمہ پہلے گزر چکا ہے۔

ایک اور روایت سن لیجئے امام ابن جریر رحمہ اللہ بن مبارک کے طریق سے روایت کرتے ہیں اور وہ بقیہ بن ولید سے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ثابت بن عجلان سے سنا۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سعید بن جبیر سے سنا۔ انھوں نے فرمایا کہ آیت واذا قرئ القرآن... الا یہ خطبہ، جمعہ اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کی نعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۸۳) اور سعید بن جبیر کے سنا والے اثر کا جواب باب اول اعتراض کے جواب میں دیکھ لیں کہ نہایت کمزور اور ضعیف ہے۔

اثر عروہ بن زبیر (المتوفی ۹۲ھ) امام مالک ہشام بن عروہ اور وہ اپنے والد عروہ بن زبیر سے روایت کرتے ہیں:

انہ کان یقرأ خلف الامام اذا لم یجہد فیہ الامام بالقرۃ (موطا امام مالک ص ۱۷۱ کتاب القراءۃ ص ۱۷۱) کہ وہ امام کے پیچھے صرف ان نمازوں میں قرأت کیا کرتے تھے جن میں اہل جہر سے قرأت نہیں کیا کرتا تھا۔

اثر ابراہیم نخعی (المتوفی ۱۱۱ھ) ابو بکر بن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو خالد نے بیان کیا وہ اعمش سے اور وہ حضرت ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

لہ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کے مناقب بشمار ہیں، ان کی جلالت علوئے مرتبت اور وفور علم پر سب کا اتفاق ہے فقہ میں ان کو اتنا کمال حاصل تھا کہ مدینہ منورہ کے سات مشہور فقہاریں ایک فقیہ مانے جاتے تھے (تہذیب الاسما جلد ۱ ص ۳۳۱) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور عالم مدینہ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۵۳) علامہ ابن سعدؒ ان کو ثقہ ثبت کثیر الحدیث فقیہ اور بلند قدر لکھتے ہیں (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۱۳۳) ان کا علمی کمال اس قدر مسلم تھا کہ بڑے بڑے حضرات صحابہ کرام مسائل ان کی طرف رجوع کرتے تھے (البدایہ والنہایہ ۹ ط ۱) اس کمال کے باوجود اس قدر محتاط تھے کہ کوئی مسئلہ غرض اپنی دانتے نہ بیان کرتے تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۸۳) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ، الحجۃ الفقیہہ لکھتے ہیں (تذکرہ ۱ ص ۱۳۶) ابو خالد الاثر کا ترجمہ باب دوم حدیث میں اور ابراہیم نخعی کا مقدمہ میں اور امام اعمش کا حضرت اسود



اول ما احد ثوالقراءة خاف الامام  
وكافوا لا يقرأون (البحر المنقى جلد ۲ ص ۱۶۹)  
اور یہی مضمون بعینہ شمس الدین ابن قدامہ نے  
بھی نقل کیا ہے۔ (شرح مقنع جلد ۲ ص ۱۲) کرتے تھے۔  
یعنی لوگوں نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی  
بدعت ایجاد کی ہے۔ اور وہ (یعنی حضرات  
صحابہ کرام و تابعین) امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا

امام ابن قدامہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؒ نے فرمایا کہ لوگوں نے امام کے پیچھے  
قرأت کرنے کی بدعت مختار کے زانیہ نکالی، کیونکہ وہ لوگوں کو دن کی نمازیں تو پڑھا  
دیا کرتا تھا۔ مگر رات کی نمازیں نہیں پڑھاتا تھا (اور حاکم ہونے کے باعث ناچار لوگوں  
کو اس کے پیچھے نمازیں پڑھنی پڑتی تھیں اس لیے) اس سے بظن ہو کہ لوگوں نے اس  
کے پیچھے قرأت شروع کر دی (مغنی ابن قدامہ جلد ۱ ص ۱۸۱) اگر یہ نقل صحیح ہے تو  
امام کے پیچھے قرأت کرنے کے بدعت ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت مل سکتا  
ہے؟ تسلیم کرنے والے کے لیے یہ دلائل بڑے مضبوط اور ٹھوس ہیں البتہ نہ ماننے والے کا  
کوئی علاج نہیں۔

اثر قاسم بن محمد (المتوفی سنہ ۳۸۵ھ) امام مالکؒ یحییٰ بن سعیدؒ اور امام ربیعہ بن عبد الرحمنؒ  
۱ علامہ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ قاسم بن محمدؒ امام القدوہ اور الفقیہ تھے (تذکرہ جلد ۱ ص ۹) علامہ ابن سعد  
لکھتے ہیں کہ وہ رفیع المنزلت و عالی مرتبت فقیہ امام اور بڑے حافظ حدیث تھے اور متورع تھے (طبقات  
جلد ۵ ص ۱۲۳) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ وہ بڑے جلیل القدر تابعی ہیں۔ ان کی جلالت و شوق اور امامت  
سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسما جلد ۱ ص ۵۵) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد الفقہار المشہورین  
اور افضل اہل مدینہ اور اعلم اہل زمانہ تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۵) امام مالکؒ فرماتے تھے کہ قاسمؒ  
اس امت کے فقہار میں تھے (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۳۳۸) ابو الزنادؒ کہتے ہیں کہ میں نے قاسمؒ  
سے زیادہ سنت کا عالم اور فقیہ نہیں دیکھا (تذکرہ جلد ۱ ص ۹)

۲ علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ، شیخ الاسلام، عالم اور قاضی المدینہ لکھتے ہیں (ایضاً ص ۱۲۸)  
۳ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ امام، حافظ، فقیہ اور مجتہد تھے۔ علامہ خطیبؒ کا بیان ہے کہ وہ  
فقیہ، عالم اور حافظ فقہ اور حدیث تھے (ایضاً جلد ۱ ص ۱۲۸)

سے روایت کرتے ہیں اور وہ دونوں حضرت قاسم بن محمدؒ سے کہ وہ کان یقرأ خلف الامام فیہما لا یجہر فیہ الامام بالقراءة (موطا امام مالک ص ۲۹) صرف ان نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے جن میں امام جہر سے قرأت نہیں کرتا تھا۔ یہ اثر بھی جہری نمازوں میں ترک القراءت خلف الامام کے بارے میں بالکل روشن اور واضح ہے۔

امام اوزاعیؒ (المتوفی ۱۵۷ھ) بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ جیسا کہ امام ابن قدامہؒ کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے فتاویٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل تھے لیکن صرف استحباب کے طور پر چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

ومذهب طائفة کالاوزاعی وغیرہ  
من الشامیین یقرأھا استحبابا وھو  
اختیار جہدا انتھی (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴)  
اور ایک گروہ کا یہ مسلک ہے جیسے امام اوزاعیؒ  
اور ان کے علاوہ دوسرے شام میں رہنے والے  
علماء کہ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا صرف استحباب کے  
درجے میں ہے اور اسی مسلک کے ہمارے دادا  
نے اختیار کیا۔

کیا بعید ہے کہ حضرت عبادہ بن الصامت اور حضرت مکحولؒ وغیرہ شامی علماء اور ائمہ  
وغیرہ من الشامیین کی مد میں شامل ہوں اور امام کے پیچھے قرأت سورۃ فاتحہ کے صرف  
استحباب کے قائل ہوں؟ آخر شیخ الاسلام کی بات ہے اور اس کی مزید تشریح اپنے مقام پر  
آئے گی۔ امام اوزاعیؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

امام سفیان ثوریؒ (المتوفی ۲۵۵ھ) بھی سری اور جہری کسی نماز میں امام کے پیچھے کسی قسم  
کی قرأت کے قائل نہ تھے (جیسا کہ تفسیر معالم التنزیل جلد ۲ ص ۴۲۲ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱  
ص ۲۵۷ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے) اور امام سفیان ثوریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں  
نقل کیا جا چکا ہے۔

لہ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام بالمجتہد شیخ الاسلام اور احد الاعلام کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۷۸) مجد الدین لقب  
عبد السلام نام اور ابو البرکات کنیت تھی (دیکھئے الجنة ص ۳۸ فی السوۃ الحسنۃ بالسنة)



امام لیث بن سعد (المتوفی ۱۷۵ھ) کا مسلک بھی ترک القراءۃ خلف الامام  
 تھا جیسا کہ مغنی ابن قدامہ کے حوالہ سے مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ حضرت مولانا السید  
 العلامة، بحر العلوم، سید الحفاظ محمد انور شاہ (المتوفی ۱۳۵۶ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ ان کا  
 مسلک بھی امام کے پیچھے ترک قراءۃ ہی تھا جیسا کہ حافظ ابو عمر بن عبد البر نے استدکار میں  
 لکھا ہے اور وجوب کا مسلک تو ہرگز نہ تھا جیسا کہ شیخ الاسلام نے (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۲۲)  
 میں لکھا ہے (فصل الخطاب ص ۸) امام ابن لیثؒ کا ترجمہ بھی مقدمہ میں گزر چکا ہے۔  
 امام عبد اللہ بن المبارکؒ (المتوفی ۱۸۱ھ) امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ابو وائلؒ حضرت ابن  
 مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کیا کرو، بلکہ خاموش رہا کرو۔ ابن مبارکؒ  
 فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ ہر نماز میں امام کے پیچھے قرأت نہ کرنی چاہیے، کیونکہ  
 انصات جہری نمازوں میں ہی ہو سکتا ہے (جزء القراءۃ ص ۸) اور جہری نمازوں میں ان کا  
 محقق مسلک امام کے پیچھے ترک القراءۃ ہی تھا (معالم التنزیل جلد ۳ ص ۶۶۲،  
 روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷ وغیرہ میں اس  
 کی تصریح کی گئی ہے) اور تبلیض الصحیفہ مصنفہ علاء سیوطیؒ جو اپنے وقت  
 کے سب سے بڑے حافظ تھے (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۱۲) کے حوالہ سے یہ بات  
 نقل کی جا چکی ہے کہ امام عبد اللہ بن المبارکؒ نے فرمایا کہ جس مسئلہ پر حضرت امام ابو حنیفہؒ اور  
 امام سفیان ثوریؒ مجتمع ہو جائیں تو وہی میرا مسلک ہوگا اور چونکہ یہ دونوں بزرگ ستر نمازوں  
 میں بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ اس لیے یہی مذہب امام ابن مبارکؒ  
 کا ہوگا۔

امام عبد اللہ بن وہبؒ (المتوفی ۱۹۷ھ) حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن  
 وہبؒ کا مسلک بھی امام ابن عیینہؒ کی طرح امام کے پیچھے ترک قرأت ہی ہے (فصل الخطاب)  
 اور محدث مولانا محمد زکریا صاحب اس کی تصریح کرتے ہیں کہ امام ابن وہبؒ اور علامہ  
 اشہبؒ وغیرہ مالکی علماء کا یہی مسلک تھا کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہیے۔  
 (اجز المسالک جلد ۱ ص ۲۳۹) اور امام ابن وہبؒ کا ترجمہ حدیث ۷۷۱ کے ذیل میں نقل کیا جا چکا۔

امام سفیان بن عیینہ (المتوفی ۱۹۸ھ) امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ ہم سے قتیبہ بن سعیدؒ اور ابن ابی السرح نے بیان کیا، وہ دونوں حضرت سفیان بن عیینہؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عبادہ بن الصامت کی مرفوع حدیث (وصلو لمن لعیرقراً بفاتحة الكتاب فصاعداً او كما قال) کا یہ مطلب بیان کیا لمن یصلی وحده (ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۹) یعنی جو شخص تنہا نماز پڑھتا ہو تو اس کو سورہ فاتحہ کی قرأت کرنی ہوگی، اور یہ حدیث مقدمہ کی کو شامل نہیں ہے، مطلب ظاہر ہے کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کی جاسکتی امام ابن عیینہؒ کا ترجمہ بھی مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے اور ابن ابی السرح کا ترجمہ باب دوم حدیث ۲۷ میں نقل ہو چکا ہے۔

امام اسحاق بن راہویہ (المتوفی ۲۴۱ھ) امام بغوی علامہ آلوسی اور مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ امام موصوف جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے (معالم التنزیل جلد ۲ ص ۶۲۲، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷) امام موصوف کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

قارئین کرام! ہم نے بعض حضرات تابعین و تابع تابعین کے آثار باب اول میں (مثلاً حضرت محمد بن کعب، مجاہد بن جبر، حسن بصری، ابو عالیہ الریاحی اور امام زہری وغیرہ کے آثار) اور بعض دیگر اکابر علم امت اور حضرات ائمہ اربعہ کے اقوال مقدمہ میں پوری تفصیل کے ساتھ عرض کر دیے ہیں اور گوان کے علاوہ ابھی بہت سے آثار اور اقوال اس مضمون کے موجود ہیں۔ لیکن چونکہ ان حضرات کے مسلک کے سمجھنے میں فریق ثانی کو ایک نمایاں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس لیے ہم نے خصوصیت کے ساتھ ان کے نام پیش کیے ہیں۔ ورنہ مقدمہ میں اجماع نقل کیا جا چکا ہے اور اس کے بعد مزید کسی اور صراحت اور وضاحت اور تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔  
وفیه کفایۃ لمن لہ ہدایۃ۔

امام ابو داؤد صاحب سنن (المتوفی ۲۵۵ھ) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الثبت اور سید الحفاظ تھے (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۲)

قتیبہ بن سعیدؒ کو علامہ ذہبیؒ الشیخ، المحافظ اور محدث خراسان لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۳)



حضرات! آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن... الآية کا شان نزول صحیح روایات اور اجماع امت سے قرآنہ خلف الامام کا مسئلہ ہے اور اکیس<sup>۲۱</sup> حدیث صحیح اور مرفوع روایات سے امام کے پیچھے قرأت کی مانعت اس کتاب میں ثابت کی جا چکی ہے۔ اور اس حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا آخری عمل بھی اس کی تائید کرتا ہے اور متعدد صحیح اور مرفوع حدیثوں سے خاص فائزہ کا لفظ بھی نقل کیا جا چکا ہے اور فریق ثانی کی ہر طرح سے منہ مانگی مرادیں بھی پوری کی جا چکی ہیں اور حضرات صحابہ کرامؓ کی وہ جماعت جن سے باقرار فریق ثانی، دین، علم فقہ اور حدیث مروی اور منقول ہے۔ وہ بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہیں تھے۔ اور حلیل القدر حضرات تابعینؒ واتباع تابعینؒ اور دیگر بڑے بڑے حضرات محدثینؒ اور فقہاء بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور جہری نمازوں میں تو امام کے پیچھے قرآن کو مخالف قرآن شاذ منکر اور اجماع کے خلاف سمجھتے تھے، جیسا کہ شیخ الاسلام کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے اور جو سری نمازوں میں امام کے پیچھے قائل بھی تھے۔ وہ بھی صرف استحباب کے درجہ میں اور آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مانعین قرآنہ خلف الامام صرف اخاف ہی نہیں — (جس طرح کہ فریق ثانی نے تمام دنیا کے حنفی حضرات کو کھلا اور انعامی چیلنج دے کر یہ مغالطہ دینے کی ناکام کوشش کی ہے کہ یہ صرف اخاف کا قول اور ان کا مسلک ہے) بلکہ جمہور اہل اسلام اور فقہاء و محدثینؒ کا یہ محقق مسلک ہے اور فریق ثانی نے غلطی کی وجہ سے صرف اخاف کے مقتدر علماء مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ، اور مولانا شبیر احمد صاحبؒ کی خدمت میں چیلنج پیش کر کے یہ سمجھنے یا سمجھانے کی بالکل ناکام سعی کی ہے کہ یہ مسئلہ صرف ان کا ہے اور آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ پیش کردہ روایات میں کم و بیش سچا نوے فی صدی روایت وہ ہیں، جو ثقہ، مثبت، حافظ اور حجت ہونے کے علاوہ بخاری اور مسلم کے مرکزی روایت ہیں اور تقریباً پانچ فی صدی وہ راوی ہیں جن میں بعض حضرات محدثین کرامؓ نے کلام کیا ہے، لیکن ان کو بھی نوے فی صدی اور جمہور محدثینؒ ثقہ کہتے ہیں اور ان کی روایتوں کو صحیح، حسن، صالح، جید اور قوی کہتے ہیں، جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان روایت کی (بغیر تین چار کے حالانکہ جمہور محدثینؒ کے نزدیک وہ بھی ثقہ ہیں) ثقاہت اور عدالت فریق ثانی کے

نزدیک بھی مسلم ہے۔ صرف ان پر تدلیس، تخلیط، تغیر سیر و ہم اور تفر دو غیرہ کے معمولی الزامات لگاتے گئے ہیں یا مرفوع کو موقوف اور موصول کو مرسل کہنے کی بے جاسعی کی گئی ہے اور یا محض اپنی مرضی یا معمولی سے شبہ کی بنا پر مطلق قرأت کو مقید کرنے کی بعد از انصاف کاوش کی گئی ہے، اب ذرا فریق ثانی کی پیش کردہ روایات اور ان کے روایات اور رجال کا حال بھی دیکھ لینا تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ فریق ثانی کتنے پانی میں ہے۔ ان تمام پیش کردہ دلائل کو سامنے رکھ کر میں فریق ثانی کے اہل علم طبقہ سے نہایت تودبانہ اور مبنی بر انصاف مطالبہ بلکہ دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ حق کا ساتھ دے اور تعصب اور غلو سے کام نہ لے اور اگر وہ کسی خاص مصلحت کے پیش نظر اپنی پارٹی کا ساتھ نہ چھوڑ سکے یا نہ چھوڑنا چاہے تو اس چیلنج بازی سے باز آجائے اور یہ الفاظ اور نظریہ واپس لے لے کہ

جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے (انتہی بلفظہ دیکھتے فصل الخطاب ص ۱۔ جس میں تمام دنیا کے علمائے اخاف کو کھلا چیلنج دیا گیا ہے)

اس سے قبل کہ باب چہارم شروع کیا جائے یہ کہ دنیا نہایت ضروری سمجھتا ہوں (اور سخن مانے گفتنی میں بھی عرض کیا جا چکا ہے) کہ ہر مقام پر حضرات محدثین کرام اور فقہائے عظام کے ناموں کے قبل، امام، علامہ، محدث، فقیہہ یا حضرت وغیرہ کے توصیفی القاب نہیں لکھے جاسکے۔ اس لیے کہ ان کے نام بار بار آتے رہتے ہیں۔ ورنہ نہ صرف یہ کہ مجھے ان سے عشق اور محبت ہے، بلکہ ان کے نام لینے کو موجب نزول رحمت خداوندی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ انھیں کی کاوش اور سعی کی بدولت قرآن کریم اور حدیث شریف ہم تک پہنچی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظیم الشان ہستی تک ہماری رسائی کا عالم اسباب میں یہی اکابر بہترین ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور جہاں ان اکابر سے (خصوصاً حضرت امام بخاریؒ اور امام بیہقیؒ وغیرہ) علمی اور تحقیقی رشتہ کشی کی گئی ہے، تو ماشاؤکلاثم ماشاؤکلا کہ اس سے ان کی تذلیل اور تحقیر مراد نہیں کیونکہ ان کی تذلیل کو نفجواتے حدیث من عادی لی ولیا فقد بارزته بالحرب۔ اللہ



تعالیٰ کی ذات سے اعلان جنگ کے مترادف سمجھتا ہوں۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ) بلکہ جہاں بھی ان اکابر سے اختلاف کیا گیا ہے۔ وہ صرف ان کی پیش کردہ دلیل کی خامی بتلانا مقصود ہے، وکل احد یؤخذ عنه ویترک الا قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایک بات اور خصوصی طور پر قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ راقم الحروف نے فریقِ ثانی کی طرف سے پیش کردہ اعتراضات کے مفہوم کو اختصاراً اپنی عبارت میں پیش کیا ہے، مگر صرف بعض مواقع پر الفاظ بھی انہیں کے ہیں جہاں انتہی بلفظ یا بلفظ غیر لکھ کر اشارہ کر دیا ہے۔ ہاں البتہ ان کی کتابوں کے حوالے ضرور درج کر دیے گئے ہیں تاکہ مزید تسلیٰ اور اطمینان کے لیے اصل کتاب کی طرف باسانی مراجعت کی جاسکے۔ مجھے اپنی علمی بے بضاعتی کا علم ہے۔ معصومیت کا دعوائے کب ہو سکتا ہے؟ اور حضراتِ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بغیر معصوم ہے کون؟ و العصمة بید اللہ تعالیٰ وحدہ۔

## چوتھا باب

قرآن کریم، صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرام، تابعین و تابعین وغیرہم سے بلکہ  
 جمہور امت سے یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح نہیں ہے اور  
 جہری نمازوں میں تو مخالف اجماع اور شاذ و منکر ہے۔ قرآن کریم، حدیث شریف اور اجماع  
 امت کے بعد کسی اور دلیل کی نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت، لیکن ہم محض تکمیل فائدہ کے  
 لیے نہایت اختصار سے چند عقلی ترجیحی اور قیاسی دلائل بھی اس باب میں عرض کر دیتے ہیں  
 تاکہ اصول فقہ کی رو سے قرآن کریم، حدیث شریف، اجماع امت اور قیاس کے جملہ دلائل سے  
 آپ کو جمہور اہل اسلام کا محقق مسئلہ معلوم ہو جائے کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو سورہ فاتحہ  
 وغیرہ کسی قسم کی قرأت کرنا درست اور صحیح نہیں ہے۔

پہلی دلیل: علامہ حازمیؒ (المتوفی ۸۲۴ھ) لکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف کی حدیث ظاہر

۱۔ ابو بکر محمد بن موسیٰ بن عثمان الشافعیؒ علامہ مذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، البارع اور النسابة تھے،

نیز لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ، حجت، نبیل، زاہد، عابد، متورع اور من الوثمة الحفاظ تھے (تذکرہ جلد ۴ ص ۱۵۱)

اور علامہ تاج الدین السبکیؒ (المتوفی ۸۴۵ھ) ان کو امام متقن اور مبرز لکھتے ہیں (طبقات

الشافعیہ، جلد ۴ ص ۱۸۹)



قرآن کے موافق ہو، اور دوسرے طرف کے ایسی نہ ہو، تو وہ حدیث قابل اخذ اور حجت ہوگی جو ظاہر قرآن کے موافق ہوگی۔ (کتاب الاعتبار ص ۱۱) امام کے پیچھے ترک قرأت کی روایتیں نہ صرف یہ کہ ظاہر قرآن کے مطابق ہیں، بلکہ آیت واذا قرئ القرآن... الاية کا شان نزول ہی بالاجماع مسئلہ خلف الامام ہے، جس کی پوری تشریح باب اول میں عرض کی جا چکی ہے اور فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ روایات کی تائید میں قرآن کریم کی کوئی آیت موجود نہیں ہے، لہذا جمہور کے مسلک کو ترجیح ہوگی۔ مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۲۹ اور ص ۵۳۰ میں اس کا جو جواب دیا ہے وہ بالکل غیر متعلق ہے۔ اولاً۔ اس لیے کہ انصاف و استماع قرأت فی السر کے منافی ہیں۔ کما مر و ثانیاً۔ خلف الامام کی قید سے روایت نہ صحیح ہے اور نہ مشہور پھر اس سے تخصیص کیسی؟ و ثالثاً۔ اختلاف نفس وجوب فاتحہ کا نہیں ہے جس کے لیے انھوں نے تین آیتیں پیش کی ہیں۔ (جو اصل مسئلہ سے بھی غیر متعلق ہیں) بلکہ اختلاف وجوب یا ترک فاتحہ خلف الامام میں ہے اور مقتدی کے لیے بحالت قرأت امام جواز اور اباحت قرأت کے لیے کوئی آیت موجود نہیں ہے محض کشیدہ ہے بخلاف قرأت خلف الامام کے اس پر بالاجماع آیت واذا قرئ القرآن... الاية دلیل ہے۔

دوسری دلیل؛ علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ اگر ایک جانب کی حدیث پر اکثر امت کا عمل ہو اور دوسری جانب اتنا عمل نہ ہو تو اس روایت کو ترجیح ہوگی، جس پر جمہور امت کا اتفاق ہوگا۔ (ایضاً ص ۱) اور امام کے پیچھے قرأت کے ترک کرنے کا مسئلہ جمہور امت کے اقوال اور عبارات سے آپ معلوم کر چکے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی مانعین قرأت خلف الامام کی احادیث اور مسلک کو ترجیح ہوگی۔ مؤلف خیر الکلام ص ۵۳۱ میں اس کا جو جواب دیتے ہیں وہ بالکل ناکام ہے کیونکہ عام کی تخصیص اور مطلق کی تقیید اور تطبیق و ترجیح کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دونوں دینیں مساوی ہوں اور یہاں ایسا نہیں ہے کیونکہ خلف الامام کی قید سے کوئی روایت صحیح نہیں ہے اور نزاع محض فاتحہ کے ایجاب کا نہیں جس کی حدیث صحیح ہے بلکہ فاتحہ برائے مقتدی میں نزاع ہے اور آیت انصاف قطعی ہے وہ بھلا حضرت ابوہریرہؓ کی ضعیف حدیث سے کیونکر منسوخ ہو سکتی ہے؟ اور معدودے چند حضرات صحابہ کرامؓ کے بغیر باقی تمام حضرات قرن اول میں خلف الامام

قرآن کے منکر تھے اور بعد کے لوگوں کی اکثریت کا تو مؤلف مذکور کو بھی دینی زبان سے اقرار ہے اور قرآن خلف الامام سے منع کر نیوالے بے شمار حضرات صحابہ اور تابعین تھے بلکہ وہ تو منہ میں پتھر اور مٹی ڈالنے پر بھی اترے ہوئے تھے اور احناف کا مذہب باحوالہ گذر چکا ہے کہ منع قرآن خلف الامام ہے۔ اس لیے ترک القراءۃ خلف الامام جمہور کا مسلک ہونا واضح ہے۔ لا شک فیہ۔

**تیسری دلیل:** علامہ موصوفؒ لکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قولی حدیث کے ساتھ آپ کا عمل بھی موجود ہو۔ اور دوسری طرف صرف آپ کا قول ہو تو آپ کی اس حدیث کو ترجیح ہوگی جس پر آپ کا قول اور فعل دونوں موجود ہوں۔ (کتاب الاعتبار ص ۱۱) اور باب دوم میں آپ کی بہت سی قولی صحیح اور مرفوع حدیثوں کے علاوہ حدیث منامیں آپ کا آخری عمل بھی پیش کیا جا چکا ہے کہ آپ نے نظریہ ظاہر ساری سورۃ فاتحہ ترک کی اور آپ کے سامنے حضرت ابوبکرؓ کی عملی اور فعلی حدیث بھی نقل کی جا چکی ہے۔ اور ایسی کوئی روایت بسند صحیح نہیں پیش کی جاسکتی کہ آپ نے اقتدار کی حالت میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرأت کی ہے۔ ومن ادعی فعلیہ البیان دیدہ باید، اگر قرأت خلف الامام کی روایتیں صحیح بھی ہوں تب بھی ان کو ترجیح نہیں دی جاسکتی حالانکہ ان میں ایک بھی صحیح نہیں ہے۔ اس میں بھی مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۳۲ میں کلام کیا ہے مگر معقول نہیں کیونکہ باحوالہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ آپ پہلے مقتدی تھے۔ پھر آپ نے امامت اختیار کی اور بالاجماع اور باقرار مؤلف مذکور قرأت سورۃ فاتحہ سے شروع ہوتی ہے اور وہی آپ سے چھوٹ گئی تھی اور بایں ہمہ نماز ہو گئی، قرأت سے نماز مراد لینا بے دلیل ہے اور یہ ترک فاتحہ کلاً یا بعضاً عذر کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اقتدار کی وجہ سے تھا۔

**چوتھی دلیل:** علامہ موصوفؒ لکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف کی روایت قیاس کے موافق ہو اور دوسری قیاس کے موافق نہ ہو تو اس روایت کو ترجیح ہوگی، جو قیاس کے مطابق ہوگی (کتاب الاعتبار ص ۱) اور امام کے پیچھے قرأت ترک کرنا قیاس کے مطابق ہے، اور فریق ثانی کا بھی اس امر پر اتفاق ہے کہ ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت اور اسی



طرح مقتدیوں کو جہر بالقراءة کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ ما زاد علی الفاتحة کی قرأت اور جہر سے پڑھنا امام کا فریضہ ہے تو اس پر سورۃ فاتحہ کی قرأت کو قیاس کر لیں۔ ہاں اگر کسی صحیح سند کے ساتھ امام کے پیچھے مقتدیوں کو قرأت کرنے کی اجازت ہوتی تو الگ بات تھی۔ اس صورت میں قیاس نص کے مقابلہ میں باطل ہوتا۔ مگر خلف الامام کی ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے، جیسا کہ بیان ہو گا۔ مؤلف خیر الکلام کا فاتحہ کو نماز کی صحت کے لیے شرط قرار دینا اور قرآن کی قرأت کو رکن قرار دینا سچا ہے مگر مقتدی کے لیے دونوں شرط نہیں اور نزاع صرف اس میں ہے اور مانسدا کو بالاجماع عدم رکن قرار دینا غیر مسلم ہے قرأت کے سلسلے میں فاتحہ اور مانسدا کا ایک ہی حکم ہے امام اور منفرد کے لیے دونوں ہیں اور اور مقتدی کے لیے دونوں نہیں۔ اس لیے ترک قرأت للمقتدی ہی قیاس کے مطابق ہے۔

پانچویں دلیل: اگر ایک طرف کی حدیث منکر اور دوسری طرف کی بیحد ہو تو منکر کو ترجیح ہوگی۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ حضر مقدم باشند بر جانب اباحت (بدور الاہل ص ۱۸) اور یہ گدڑ چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اور اس حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فاستمعوا له وانصتوا اور واذا قرأ فأنصتوا وغیرہ امر کے الفاظ سے مقتدیوں کو قرأت سے منع کیا ہے اور خدا تعالیٰ اور اس کے برحق رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم اور امر کا خلاف کرنا یقیناً حرام ہے۔ اور حضرات صحابہ کرام اور تابعین کے جو تہدید فی الفاظ نقل ہو چکے ہیں (کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کے منہ میں چنگاری ہو، خاک ہو، نتن ہوں، پتھر ہو وغیرہ وغیرہ) وہ اس پر مستزاد ہیں۔ اس لیے منکر کو بیحد پر ترجیح ہوگی۔ اور اس لحاظ سے بھی جہور کی دلیل کا پلہ بھاری رہے گا۔ مؤلف خیر الکلام کا ایجاب فاتحہ خلف الامام کا دعویٰ کر کے اور ترک قرأت کو تخیر سے تعبیر کر کے ترجیح دینا مردود ہے کیونکہ ایجاب فاتحہ خلف الامام کی جب سرے سے کوئی حدیث ہی صحیح نہیں تو پھر راجح و مرجوح کا کیا سوال؟ اور قرآن کریم و حدیث شریف سے ثابت ہے، کہ مقتدی کو خلف الامام استماع و انصات کا وجوبی حکم ہے پھر تخیر کہاں سے؟

چھٹی دلیل: اس امر پر تمام محدثین اور فقہاء کا اتفاق ہے جن میں خصوصیت حضرت امام بخاریؒ اور امام بیہقیؒ قابل ذکر ہیں کہ امام کا سترہ مقتدیوں کو کافی ہے اور ان کو الگ سترے

کی ضرورت نہیں ہے (دیکھئے بخاری جلد ۱ ص ۳۵۲) اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۳۵۲ جب وہی امام، نماز اور مقتدی جمع ہیں تو امام کی قرأت مقتدیوں کو کیوں کافی نہیں ہے؟ جب کہ ماثر ادا علی الفاتحۃ کی قرأت میں سب کے نزدیک امام کفایت کرتا ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ سترہ نماز کے ارکان اور شرائط سے نہیں قرأت نماز کے ارکان سے ہے... الخ صحیح نہیں ہے کیونکہ جیسے سترہ رکن نہیں اسی طرح مقتدی کے لیے قرأت بھی رکن نہیں مطلق نماز کا جھگڑا نہیں بات مقتدی کی ہو رہی ہے اور جیسے سترہ آگے ہونے کی وجہ سے بقول مؤلف خیر الکلام بمنزلہ کعبہ ہے اور سب کے لیے ایک ہی کعبہ کافی ہے تو اسی طرح امام بھی سب کے آگے ہوتا ہے اور قرأت میں سب کی کفایت کرتا ہے۔ لہذا امام کی قرأت اور سترہ سب کے لیے کافی ہے۔

ساتویں دلیل: صاحب امر کے آخری قول و فعل سے بظاہر ہی متبادر ہو سکتا ہے کہ پہلا قول اور فعل منسوخ قرار دیا جائے۔ اور اس سے کیا کم ہو سکتا ہے کہ اگر آخری عمل ناسخ نہ ہو۔ تب بھی ترجیح تو اس کو بہر حال ہوگی۔ جیسا کہ حضرت امام بخاریؒ نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے وانما یؤخذ بالآخر فالآخر من فعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری جلد ۱ ص ۱۱۱) لہٰذا شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: لا امام یحمل عن العامة مومنین السہو وکذا القرأت عند

الجمہور (منہاج السنہ جلد ۳ ص ۱۱) امام سہویں اور جہور کے نزدیک قرأت میں مقتدیوں کی طرف سے کافی ہوتا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک جنازہ پر بلند آواز سے قرأت کی۔ پھر ارشاد فرمایا، وانما جہرت لا علمکم انہا سنۃ والامام کفأھا (منتقی ص ۲۶۲) میں نے جہرا اس لیے قرأت کی ہے تاکہ تمہیں اس کا سنت ہونا معلوم ہو جائے ورنہ امام کی قرأت کافی ہے۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حدیث آتی ہے لا صلوة الا بخطبة کہ خطبہ کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی، حالانکہ فریق ثانی بھی متفق ہے کہ خطبہ پڑھنا صرف امام کا کام ہے۔ (فیض الباری جلد ۲ ص ۷۷) بہر حال جب امام ماثر ادا علی الفاتحۃ سترہ، سہو اور خطبہ وغیرہ میں کفایت کرتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ باقر فریق ثانی تو قرأت میں بھی یقیناً وہ کفایت کر سکتا ہے۔



یعنی آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سب سے آخری فعل ہی قابل عمل ہوگا۔ اور آپ پڑھ چکے ہیں کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آخری نماز میں باقرار قاضی شوکانی ۷ پوری سورۃ فاتحہ بحالت اقتدار ترک کی۔ مگر آپ کی نماز صحیح ہوگئی اور آپ کے آخری فعل کے حجت ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

مؤلف خیر الکلام کا حضور علیہ السلام کی ابتداء اقتدار کا اور پھر ترک فاتحہ کلاً یا بعضاً کا انکار کرنا بالکل مکابہ ہے جب روایات سے ثابت ہے کہ امر تو انکار کا کیا معنی؟ باقی نماز میں قیام وقوع اور نیابت وغیرہ میں عذر تو شریعت نے خود بتایا ہے مگر قرأت اور ترک قرأت میں عذر اور غیر عذر کا کوئی فرق نہیں کیا اس لیے قرأت یا ترک قرأت کو دیگر امور پر قیاس کرنا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے قیاس مع الفارق ہے جو قابل سماعت نہیں ہے۔

آٹھویں دلیل: آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ الامام ضامن امام ضامن اور کفیل ہے ضامن اور کفیل جب قرض وغیرہ ادا کر دے تو اصل مقرض سبکدوش ہو جائے گا۔ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حضرات صحابہ کرام کے ابتداء اس لیے جنازے نہیں پڑھائے تھے کہ وہ مقرض تھے اور ان کے پاس قرض کی ادائیگی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اور جب ان کے قرض کو ان حضرات صحابہ کرام نے اپنے ذمہ لے لیا جو زندہ تھے۔ اور ان کے کفیل اور ضامن بن گئے تو آپ نے اصل کو بری الذمہ سمجھتے ہوئے ان کا جنازہ پڑھا دیا۔

یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الامام ضامن امام مقتدیوں کا ضامن اور کفیل ہے۔ یہ روایت ابوداؤد جلد ۱ ص ۸۴، ترمذی جلد ۱ ص ۲، معجم صغیر طبرانی ص ۱۲۳، اور مسند احمد جلد ۲ ص ۴۱۹ وغیرہ میں موجود ہے۔ صاحب تنقیح کتبہ کہ مسند احمد کی تصحیح علی شرط مسلم صحیح ہے اور علامہ زبیدی فرماتے ہیں کہ یہ سند صحیح ہے (نصب الرایہ جلد ۲ ص ۵۲) علامہ بیہقیؒ کہتے ہیں کہ بزار نے یہ روایت بیان کی ہے: ورجاله کلہم موثقون (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱) اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور یہ روایت حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے بھی مروی ہے کہ آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الامام ضامن (الحديث) علامہ بیہقیؒ کہتے ہیں کہ امام احمد نے اور طبرانی نے معجم کبیر میں یہ روایت بیان کی ہے ورجاله موثقون طبرانی کے سب راوی ثقہ ہیں (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱)

(دیکھیے بخاری و مسلم وغیرہ) باقی باریک فقہی تدقیقات کا یہ مقام نہیں ہے ہم ان کو یہاں نہیں چھیڑتے۔ لہذا جب امام سورہ فاتحہ کی قرأت کر لے تو مقتدیوں کو کافی ہوگی جیسے کہ ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت بالاتفاق مقتدیوں سے ساقط ہے اور امام کی قرأت ہی کفایت کرتی ہے۔ مؤلف خیر الکلام ص ۵۳۵ میں لکھتے ہیں کہ اگر ایک شخص کا بہت سے آدمیوں نے سو سو روپیہ ادا کرنا ہو تو یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کفیل ان سب کی اور اپنی طرف سے ایک سو روپے لے کر سب کی ذمہ داری سے بری ہو جائے۔۔۔ الخ

الجواب: مگر یہ سب کچھ ان کی قلت فہم کا نتیجہ ہے کیونکہ یہاں ایک آدمی کا بہت سے آدمیوں نے نہیں دینا بلکہ کئی آدمیوں پر صرف سو روپیہ ہے اور اس کو کفیل ادا کر رہا ہے۔ کیونکہ قرأت جماعت کی نماز میں صرف ایک ہے اور ما زاد علی الفاتحۃ میں تو فریق ثانی کو بھی مُسَلَّم ہے کہ امام اور کفیل سب کی طرف سے ادا کر رہا ہے۔ منفرد ہوتے تو ان کو خود پڑھنی ہوتی، لیکن یہاں بحث تو مقتدی کی ہو رہی ہے اور اس پر سرے سے قرأت ہی نہیں جو ہے وہ امام ادا کر رہا ہے۔

نویں دلیل: امام طحاویؒ نے ترک قرأت خلف الامام پر متعدد مرفوع حدیثیں اور آثار حضرات صحابہ کرام رض و تابعینؒ وغیرہم نقل کرنے کے بعد اپنی عادت کے مطابق نظر فقہی اور عقلی دلائل بیان کی ہے۔ اگر کوئی شخص رکوع کی حالت میں امام کے ساتھ شریک ہو جائے اور سورہ فاتحہ اس سے کلیتہً چھوٹ چکی ہو تو جہور اہل اسلام کے نزدیک (جس کی تحقیق اپنے مقام پر آئیگی۔ اور دو مرفوع روایتیں اور متعدد حضرات صحابہ کرامؓ کے اقوال پہلے نقل بھی ہو چکے ہیں) اس کی وہ رکعت بالکل صحیح اور درست ہے۔ اگر تکبیر تحریمہ اور قیام (جس میں کم از کم تکبیر تحریمہ ادا ہو سکتا ہو) کی طرح مقتدی پر سورہ فاتحہ بھی پڑھنی لازم اور فرض اور رکن ہوتی تو جیسے تکبیر تحریمہ اور قیام اس سے ساقط نہیں ہوتے اسی طرح اس پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا بھی فرض ہوتا اور بغیر اس کے اس کی نماز نہ ہو سکتی۔ حالانکہ جہور کے نزدیک اس کی یہ رکعت بالکل صحیح ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ وہو المطلوب (محصلاً طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۸) مؤلف خیر الکلام کہتے ہیں کہ رکوع میں ملنے سے رکعت کا ہو جانا ان احادیث کے منافی نہیں جن میں آتا ہے کہ نماز میں ایک بار فاتحہ پڑھنی چاہیے جیسا کہ ہادیہ اور فتح الباری کے حوالہ سے گذر چکا ہے۔ ہاں ان احادیث کے منافی ہے



جن میں ہر رکعت میں فاتحہ کا ذکر آتا ہے اس صورت کو خاص کر لیا جائے گا یا عذر شرعی پر  
مخمول ہوگا۔ (محصلا ص ۵۳۶)

الجواب: جس طرح یہ صورت رکوع والی رکعت کے منافی نہیں، اسی طرح یہ ان احادیث  
کے عین مطابق ہے جن میں قرأت صرف امام کا فرض بتلایا گیا ہے باقی مقتدی کے لیے ہر رکعت  
میں بلکہ کسی بھی رکعت میں قرأت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے نہ تو یہاں منافاة کا سوال  
ہے اور نہ تخصیص اور عذر شرعی پر عمل کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

دسویں دلیل: بحر العلوم، حجت الاسلام اور شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحم  
(المتوفی ۱۲۹۷ھ) بانی دارالعلوم دیوبند نے عقلی رنگ میں یہ مسئلہ یوں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ  
ہر چیز کا صرف ایک طول اور ایک ہی عرض ہوتا ہے۔ سو باعتبار طول کے ایک رکعت ایک نماز  
ہے اور ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے۔ اور باعتبار عرض کے امام اور مقتدی کی نماز  
ایک ہے۔ تو یہاں بھی ایک ہی سورۃ فاتحہ کافی ہوگی جس کا امام ادا کر رہا ہے۔ اور اگر امام اور مقتدی  
کے لیے الگ الگ اور مجزاً سورۃ فاتحہ ضروری ہو تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ ایک چیز کے  
لیے ایک سے زیادہ عرض ثابت ہو اور یہ اصول موضوعہ کے خلاف ہے (توثیق الکلام ص ۹،  
تبغیر) متولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ہر رکن چونکہ امام اور مقتدی کو الگ الگ ادا کرنا پڑتا ہے پس  
قرأت بھی ہر ایک کو الگ الگ ادا کرنی چاہیے۔ (بلفظہ ص ۵۳۶)

الجواب: جب قرأت مقتدی کے لیے رکن ہی نہیں تو اس کے لیے الگ پڑھنے کا کیا سوال؟  
مقتدی کا رکن تو صرف استماع و انصات ہے جس کو وہ ادا کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مانا د علی الفاتحۃ  
کی قرأت آپ حضرات کے نزدیک بھی مقتدی پر نہیں ہے۔

گیارہویں دلیل: مولانا موصوفؒ فرماتے ہیں کہ بسلسلہ قرأت امام اور مقتدی کی مثال  
ایسی سمجھ لیں جیسے سواری اور مسافر، مسافر کا کام صرف یہ ہے کہ وہ گاڑی، موٹر، بس، جہاز اور  
ٹانگہ وغیرہ میں اطمینان سے سوار ہو کر بیٹھ جائے۔ گاڑی وغیرہ حرکت کرے گی تو مسافر کی مسافت  
خود بخود طے ہوتی جائے گی اور مسافر کو ساتھ ساتھ دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بالذات  
حرکت گاڑی کی ہے مگر بالعرض مسافر کی۔ اور باوجودیکہ مسافر آرام کے ساتھ گاڑی وغیرہ میں

بیٹھا رہتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہے اور کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ مسافر نے اتنا راستہ طے کیا ہے۔ اسی طرح امام جو بمنزلہ گاڑی کے ہے قرأت کرتا جائے گا اور یہی قرأت مقتدی کو کافی ہوگی (توثیق الکلاہ ص ۷، ص تبغیہ) مولانا کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کیونکہ ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت میں فرق ثانی بھی متفق ہے کہ امام کی قرأت مقتدیوں کو کافی ہے اور اگر سورۃ فاتحہ کی قرأت مقتدیوں کو کافی نہ ہو تو اس مثال کے پیش نظر مطلب یہ ہوگا کہ ایک دو اشیش تک مسافر گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتا چلا جائے اور پھر گاڑی میں بیٹھ جائے۔ جہاں تک گاڑی کا تعلق ہے اس کا سفر خود بخود طے ہوتا جائے گا۔ لیکن طبعی، شرعی اور دیگر ضروریات میں خود کوشش اور کاوش کرنی پڑیگی اور بغیر اپنی ہمت اور حرکت کے دیگر ضرورتیں پوری نہیں ہوں گی۔ مشہور ہے کہ حرکت ہی میں برکت ہوتی ہے۔ اسی طرح جب گاڑی کی مسافت طے ہو جائے گی تو اپنے گاؤں محلہ اور گھر تک پہنچنے کے لیے خود عمل کی ضرورت ہے، اس لیے امام بمنزلہ گاڑی تو ہے لیکن صرف قرأت کی مسافت میں باقی رکوع وسجود تسبیح وشہد وغیرہ میں مقتدی کو خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔ مؤلف خیر الکلام کا امام کی نماز کو حقیقت اور مقتدی کی نماز کو مجاز سمجھ کر جواب میں دونوں کی نماز کو حقیقت سے تعبیر کرنا اور اس پر جواب کی بنیاد رکھنا بالکل غلط ہے نماز تو امام اور مقتدی دونوں کی حقیقت ہے، ہاں قرأت میں فرق ہے، امام حقیقی قرأت کرتا ہے اور مقتدی کی قرأت حکمی ہے اور ہم نے کتاب میں اس کی تصریح کر دی تھی کہ اس لیے امام بمنزلہ گاڑی تو ہے لیکن صرف قرأت کی مسافت میں ... لہذا مؤلف مذکور کا ہمارے عبارت سے مقتدی کی نماز کو مجاز سمجھنا غلط ہے۔

بارہویں دلیل: شمس العکام مؤرخ اسلام علامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ) نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے حالات میں ایک واقعہ نقل کیا ہے (جس کا خلاصہ راقم کی عبارت میں یہ ہے) کہ چند آدمی مل کر مسئلہ خلف الامام پر امام صاحب سے بحث کرنے آئے، آپ نے فرمایا کہ میں لے یہ واقعہ مناقب موفی جلد ۱ ص ۱۷۷ میں مذکور ہے ان جماعۃ من اهل المینۃ جاؤ الی ابی حنیفہؒ لینا ظروہ فی القرۃ خلف الامام ۱۷۷ اور اسی طرح مناقب کردی جلد ۱ ص ۱۷۷ بھی ہے اور نواب صاحب بھی اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں۔ و حکایتی کہ از امام اعظم دربارۃ الزام خصم باختیار یکی برائے مناظرہ از میان جماعۃ و بدون الزام او الزام جماعۃ نقل کردہ اند (باقی اگلے صفحہ پر)



اکیلا اتنے آدمیوں سے کیسے بحث کر سکتا ہوں؟ ایک آدمی کو اپنا وکیل اور مختار بنا لو کہ اس کی فتح تمھاری فتح اور اس کی شکست تمھاری شکست متصور ہو، چنانچہ وہ سب اس پر راضی ہو گئے اور اپنا ایک وکیل انھوں نے انتخاب کر لیا۔ جب وکیل نے بحث شروع کی۔ تو حضرت امام صاحبؒ نے فرمایا کہ مسئلہ تو حل ہو چکا ہے۔ وہ بولا کیسے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ جب تم اکیلے سب کی طرف سے وکیل ہو کر گفتگو کر رہے ہو اور تمھاری بات ان سب کی بات سمجھی جاتی ہے تو اسی طرح امام کی قرأت سب مقتدیوں کی قرأت سمجھی جائیگی وہ سب شکست تسلیم کرتے ہوئے لاجواب ہو کر چلے گئے۔ (سیرت النعمان ص ۵۶)

مبارک پوری صاحبؒ نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ امام صاحبؒ کی طرف اس واقعہ کی نسبت غلط ہے۔ کیونکہ امام جب وکیل ہے تو قیام، رکوع، سجود، تشہد اور سلام وغیرہ جملہ امور میں امام کو وکیل ہونا چاہئے۔ (بمعنا تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱) لیکن مبارک پوری صاحبؒ کا یہ اعتراض محض بیج اور باطل ہے۔ اس کی پوری تشریح گزر چکی ہے کہ امام مقتدیوں کا وکیل صرف قرأت قرآن میں ہے، باقی امور میں ان کا وکیل نہیں ہے اور اس کو ایسا سمجھ لیں جیسے بادشاہ کے حضور میں ایک وفد اپنی معروضات پیش کرنے کے لیے حاضر ہو۔ گفتگو تو صرف وفد کا وکیل اور پارٹی لیڈر ہی کرے گا۔ لیکن ارکان وفد کی طرف سے پارٹی لیڈر کی تائید بھی ضروری ہے، قرأت قرآن کریم کو اصل معروضات اور تسبیحات و تشہد وغیرہ کو اس کی تائید سمجھ لیجئے۔

نواب صاحبؒ کی یہ عبارت نقل کی جا چکی ہے کہ منہی عنہ نزد قرأت امام ہمہ قرأت قرآن کریم است فقط (دلیل الطالب ص ۲۹۴) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ وقول نبویؐ اذ اقراء فانصتوا وقول من کان له امام فقرأة الامام له قرأة دال است برآنکہ امام متحمل قرأت است از سامع (بدور الابلہ ص ۵۱) اس لیے مبارک پوری صاحبؒ کا یہ اعتراض (باقی پچھلا صفحہ) لطیفہ شاعرانہ و مجرور تجرید عقلی بیش نیست در مقام استدلال و احتجاج بنصوص قابل التفات

نہی تواند شد ۱ھ (ہدایۃ السائل ص ۲۰۴) ہم نے بھی اس واقعہ کو قرآن و حدیث کے دلائل کی مدد میں پیش نہیں کیا بلکہ عقلی دلائل میں نقل کر کے نواب صاحبؒ کی عقلی تجرید کی تائید کی ہے۔

سراسر باطل ہے۔ اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کا ارشاد سو فی صدی صحیح ہے۔ مولف خیر الکلام ص ۵۳۷ میں لکھتے ہیں کہ امام وکیل نہیں بلکہ مقتدی ہے اور ہر نمازی صرف اپنے لیے نماز پڑھتا ہے اور ہر نمازی رب سے باتیں کرتا ہے اور مناجات صرف فاتحہ پڑھنے میں ہوتی ہے اور فاتحہ فرض ہے اور دعا ہے اور یہ امام اور مقتدی دونوں پر لازم ہے۔ (محصلاً)

اجواب: جب صحیح حدیث میں الامام ضامن آتا ہے تو اس کی کفالت اور ضمانت کا انکار کون سنا ہے؟ وہ مقتدی بھی ہے اور کفیل بھی ہے۔ مقتدی تمام ارکان و افعال میں ہے اور کفیل صرف قرأت میں ہے اور نمازی نماز خدا تعالیٰ کے لیے پڑھتا ہے جس کا ثواب نمازی کو ملتا ہے اور بے شک نمازی اللہ تعالیٰ سے مناجات کرتا ہے مگر وہ مناجات صرف ثنا اور تسبیحات وغیرہ ہی میں ہے قرأت میں تو اس کو صرف انصات و استماع کا حکم ہے جیسا کہ اس کے دلائل گزر چکے ہیں اور مناجات کو صرف فاتحہ میں بند کر دینا عقلاً اور نقلاً باطل ہے۔ سارا قرآن کریم اللہ تعالیٰ سے مناجات ہے اور سب تسبیحات اس سے سرگوشی ہے اور اول سے آخر تک نماز اس سے ہم کلامی ہے۔ باقی امور میں اصالتہ مقتدی خود عمل کرتا ہے اور قرآن میں اس کا امام و کالت سرگوشی کرتا ہے اور فاتحہ صرف امام پر لازم ہے۔ مقتدی کا فریضہ صرف انصات و استماع ہے، مقتدی پر فاتحہ فرض نہیں ہے۔ فاتحہ دعا ہے، لیکن مقتدی حکماً دعا خواں ہے اور آمین سے اس کی تصدیق کرتا ہے۔

حضرات! ابھی ترجیحی، عقلی اور قیاسی دلائل اور بھی پیش کیے جاسکتے ہیں مگر ہمارا مقصد دلائل کا استقصار اور استیعاب نہیں ہے، بلکہ عامۃ المسلمین کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ ترک القراءۃ خلف الامام صرف احناف ہی کا مسلک نہیں ہے بلکہ جمہور اہل اسلام کا مسلک ہے اور جمہور اپنے اس محقق مسلک پر قرآن کریم، صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؓ و تابعینؓ وغیرہم اور اجماع اُمت اور قیاس سے ٹھوس وزنی اور صحیح معیاری دلائل اور براہین پیش کرتے ہیں اور وہ ہرگز بلا دلیل نہیں ہیں جیسا کہ



آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب ہم بطور تبرک اس باب کو قرآن کریم کی ایک آیت کے ایک حصہ پر ختم کرتے ہیں، جیسا کہ پہلا باب بھی قرآن کریم کی آیت ہی سے شروع ہوا تھا۔ کہ  
اَوَّلُ بَآخِرٍ نَسَبَةٍ وَارِدٍ۔ اِنَّ عِلَّةَ الشَّهَادَةِ عِنْدَ اللّٰهِ اَشْنَا عَشَرَ شَهْرًا۔ اور  
 آخر میں نہایت اخلاص اور دلسوزی کے ساتھ فریقِ ثانی سے استدعا ہے کہ وہ اپنے  
 اس غلو آمیز نظریہ سے باز آجائے۔ کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ  
 پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ اس پوری کتاب  
 کو پیش نظر رکھ کر انصاف سے فرمائیں کہ کس کس کی نماز باطل، کالعدم، بیکار اور ناقص  
 ہوگی؟ غور تو کیجئے کہ جہور امت کی نمازوں پر یہ حکم لگانا کیسی کھلی گستاخی اور بے ادبی ہے۔  
 اور گویا اس اعلان کے مطابق جہور امت نماز پڑھتے ہوئے بھی بے نماز ہی ٹھہرے اور تارک  
 صلوٰۃ کے بارے میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں وہ کس مسلمان سے مخفی ہو سکتی ہیں؟ فریق  
 ثانی نے اخلاف کے مقتدر علماء حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب و حضرت شیخ الاسلام  
 مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کی خدمت میں  
 یہ اعلان پیش کیا ہے، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے۔ راقم الحروف دارالعلوم دیوبند کا خوش چین اور  
 ان اکابر کے فضالہ علم اور پس خوردہ سے فیضیاب ہوا ہے۔ اس لیے اس حقیر پر یہ لازم تھا  
 کہ اپنے محسن اکابر کا مسلک بیان کرتا اور ان سے سو وطن کو دور کرتا۔ نیز فقیر فروعی مسائل میں  
 اپنے اکابر کی طرح حنفی ہے۔ اس لیے فریقِ ثانی کا یہ مطالبہ بھی پورا ہو جاتا ہے۔ مگر آج تک  
 ہمارے کسی حنفی بھائی کو یہ توفیق نہ ہوئی۔ کہ وہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے کی  
 ایک ہی صحیح صریح مرفوع حدیث پیش کر کے انعام لے (بلفظہ فصل الخطاب ص ۱) اور  
 انعام کی بابت وہ یوں لکھتے ہیں اور مخالفین کو ایک ہزار روپے کا انعامی کھلا چیلنج دیتے  
 (بلفظہ فصل الخطاب ص ۱) اب فریقِ ثانی کو دیانتہ از خود ہی یہ انعام دے دینا چاہئے۔  
 ورنہ اگر ہم چاہیں تو قانونی اور آئینی طور پر لے سکتے ہیں اور انھیں دینا پڑے گا۔ اور اس  
 سے کیا کم ہے کہ۔ ع: شاد م کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی  
 حضرات! آپ دیکھ چکے کہ ہمارا مسلک کیا ہے اور اس کے دلائل کیا ہیں؟ ع:

## قیاس کن زنگستان من بہار مرا

آخری التماس۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ جس طرح جہور اہل اسلام کے دلائل اور براہین پیش کرنے کا صحیح حق تھا، میں ادا نہیں کر سکا۔ اہل علم حضرات سے التماس اور التجار ہے کہ وہ مجھے میری کوتاہیوں اور لغزشوں پر مطلع فرماتے رہیں۔ کیونکہ ایک نوعمر آدمی سے جس کو اپنی بے بضاعتی اور کم علمی کا بھی پورا احساس اور اقرار ہو۔ اور ایسے اہم مسئلہ میں جس میں حضرت امام بخاریؒ اور حضرت امام بیہقیؒ وغیرہ ائمہ حدیث اور فرسان علم نے خامہ فرسائی کی ہو، لغزشوں کا صادر ہو جانا کچھ بعید نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ سے نہایت اخلاص اور صدق دل سے دعا ہے کہ وہ حقیر کو جملہ جسمانی و روحانی، ظاہری اور باطنی بیماریوں سے محفوظ رکھے۔ اور کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور حضرات صحابہ کرامؓ، محدثینؒ اور فقہاءؒ اور جہور اہل اسلام کی محبت اور اطاعت کا صحیح جذبہ عطا فرمائے جن کا ذکر موجب رحمت خداوندی ہے۔

پینے میں آگیا کہاں لپٹی ہیں اڑ کے مستیاں

اتنی ہے تندھے یہاں مست ہوں اور پی نہیں

جلد دوم میں فریق ثانی کے پیش کردہ دلائل کا جائزہ لیا جائے گا کہ ان کی حقیقت کیا

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وعلی

ہے؟

الہ واصحابہ ومنتحبین اجمعین۔

ابوالزاہد محمد سر فراز خاں صفدر

خطیب جامع لکھنؤ، ضلع گوجرانوالہ

۳ رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ بمطابق

۲۵ اپریل ۱۹۵۵ء



لَا صَلَوةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَصَاعِدًا (حدیث شریف)  
 جس شخص نے سورہ فاتحہ اور اس کے ساتھ قرآن کریم کا کوئی اور بھی حصہ نہ پڑھا تو اس کی نماز نہ ہوگی (حدیث رسول)

# أَحْسَنُ الْكَلَامِ

فِي

تَرْكِ الْقِرَاءَةِ خَلْفَ الْإِمَامِ

جلد دوم

”جس میں اہم کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کو رکن اور ضروری ٹھہرانے والے فریق کے پیش کردہ نقلی اور عقلی دلائل پر روایت و درایت سیر حاصل کیا گیا ہے۔ اور یہ امر واضح تر براین سے ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت عباد بن الصامت وغیرہ کی اس روایت کے علاوہ جس میں فصاعداً ما تيسر اور ما زاد کی زیادتیاں آئے ورنہ الامام کی استثناء بھی مذکور ہے اور کوئی روایت صحیح نہیں ہے، خصوصاً وہ روایات جن میں خلف الامم کی قید اور الابفاحۃ الکتاب کی استثناء موجود ہے وہ تمام ضعیف کمزور اور معقول ہیں نیز حضرات صحابہ کرام اور تابعین وغیرہم کے آثار کا پس نظر بھی اٹھایا گیا ہے اور مؤلف خیر الکلام کے اعتراضات کا آنا بانا بھی پیش نظر رکھا گیا ہے“

تالیف

ابو الزاہد محمد سرسبز از خان صفدر، گوجرانولہ

# فہرست مضامین حسن الکلام (جلد دوم)

۴۰	تخصیص کن کن دلائل سے ہو سکتی ہے؟	۵	پیش لفظ
۴۲	چوتھا جواب مذکور کے اس سے جہو امت کے نزدیک متشبی ہے۔	۷	پہلا باب قرآنی استدلالات
۴۶	مذکور کے بارہ میں حضرت امام بخاری کی دلیلوں کا حال	۸	پہلی آیت اور اس کا جواب
۴۷	پانچواں جواب اس روایت کے مرکزی ردی بھی	۱۰	دوسری آیت اور اس کا جواب
۴۷	اس حدیث کو صرف منفرد کے حق میں سمجھتے ہیں	۱۳	تیسری آیت اور اس کا جواب
۵۰	اس روایت کا چھٹا جواب فریق ثانی کو امام کی تہجے جہرے قرأت کرنی چاہیے کیونکہ حضرت عبادہ ای ہی کیا کرتے تھے	۱۴	چوتھی آیت اور اس کا جواب
	دوسری روایت	۱۷	دوسرا باب مرفوع روایتیں
۵۱	حضرت ابو ہریرہ کی خلع والی روایت اور اس کا جواب	۱۷	پہلی روایت
۵۲	علاء بن عبد الرحمن محدثین کی نگاہ میں؟	۱۸	حضرت عبادہ بن الصامت کی مرفوع حدیث
۵۵	لفظ خلع اور غیر تمام کنیت کو نہیں چاہتا	۲۳	اس روایت کا پہلا جواب حرف منہ
۵۸	قرآن فی النفس کا اطلاق تدریجاً بھی صحیح ہے	۲۳	عموم میں نص قطعی نہیں ہے۔
۶۱	فی نفس کے معنی اکیلے کے بھی آتے ہیں۔	۲۳	مؤلف خیر الکلام کے اعتراضات اور ان کے جوابات
۶۳	احادیث خلع کی بحث	۲۴	اس روایت کا دوسرا جواب کہ اس روایت میں فصاعداً ماقبلاً اور مازاد کی زیادہ بھی ہے
۶۳	حضرت عائشہ کی روایت اور اس کا جواب	۲۸	فصاعداً سے انکار کی دلیلیں اور ان کے
۶۴	حضرت ابن عمر کی روایت اور اس کا جواب	۳۹	ممکنہ جوابات
۶۵	حضرت عبد اللہ بن عمر کی روایت اور اس کا جواب	۳۹	اس روایت کا تیسرا جواب بعض حضرات صحابہ کرام اور محدثین کی تصریح ہے کہ یہ روایت صرف منفرد کے حق میں ہے
		۴۰	اس تخصیص پر ایک اعتراض اور اس کا جواب



۹۹	دوسری روایت اور اس کا جواب	۶۶	حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت اور اس کا جواب
۹۹	تیسری روایت اور اس کا جواب	۶۷	حضرت ابو امامہؓ کی روایت اور اس کا جواب
۱۰۰	تیسرا جواب نافع مجمل ہے	۶۷	ایک دیہاتی (گنوار) کی روایت اور اس کا جواب
۱۰۱	نافع کی جہالت پر کلام اور اس کا جواب	۶۸	حضرت ہریرؓ کی روایت اور اس کا جواب
۱۰۸	چوتھا جواب یہ روایت مضطرب ہے	۶۸	حضرت جابرؓ کی روایت اور اس کا جواب
۱۰۹	رفع اضطراب کی کوشش اور اس کا جواب	۶۸	اصل روایت میں اَلْاَوْرَاءُ الْاِمَامِ کی استثنائی موجود ہے
۱۱۰	پانچواں جواب یہ روایت موقوف ہے	۷۰	لفظ کل کی تحقیق
۱۱۱	چھٹا جواب الْاَوْبَامُ الْقُرْآنِ کی جملہ روایتیں ضعیف ہیں	۷۶	تیسری روایت
۱۱۲	ساتواں جواب لفظ خلف الْاِمَامِ مدرج ہے	۷۶	پہلا جواب اس میں محمد بن اسحاق ضعیف ہے
۱۱۵	اُمّ تومثیٰ کی تحسین کا جواب	۸۳	اُمّ بخاریؓ کی توثیق کا جواب
۱۱۵	اُمّ حاکم کی تصحیح کا جواب	۸۴	اُمّ شعبہؓ کی توثیق کا جواب
۱۱۶	اُمّ دارقطنیؓ کی تصحیح کا جواب	۸۵	اُمّ احمدؓ اور ابن مدینیؓ وغیرہ کی طرف اس کی توثیق کی نسبت غلط ہے
۱۱۶	اُمّ خطابؓ کی تصحیح کا جواب	۸۵	علماء احناف نے اِذْاَنْ اَنْصَابِ سمرقند اور تجیل اظہار میں اس سے استدلال نہیں کیا
۱۱۶	مولانا عہدیؒ کی تصحیح کا مقام	۸۶	ان مسائل میں احناف کے دلائل کیا ہیں؟
۱۱۷	اُمّ بہیقہؓ کی تصحیح کا حال	۹۱ تا ۹۶	ابن اسحاقؓ کی تحدیث بے کار ہے
۱۱۷	اٹھواں جواب بشتوز صحت خلف الْاِمَامِ کا مطلب کیا ہے؟	۹۲	اس کی متابعت میں پہلی روایت اور اس کا جواب
۱۲۰	نواں جواب اگر بالفرض فاتحہ کا پڑھنا ثابت بھی ہو جائے تو اس سے لزوم اور وجوب ثابت نہیں ہو سکتا۔	۹۲	دوسری روایت اور اس کا جواب
۱۲۱	چوتھی روایت	۹۳	تیسری روایت اور اس کا جواب
۱۲۲	اور اس کا جواب	۹۵	چوتھی روایت اور اس کا جواب
۱۲۳	عن رجل من الصحابة کی سند کا حال	۹۵	پانچویں روایت اور اس کا جواب
۱۲۴	صحیح حدیث کی تعریف کیا ہے؟	۹۶	دوسرا جواب محمولٌ دس تھے اور وہ معیاری فقہ بھی دیکھتے
۱۲۵	اجازت فاتحہ خلف الْاِمَامِ سے ذاتِ رسول پر حرف آئے ہے	۹۸	انکی متابعت کی پہلی روایت اور اس کا جواب
۱۲۶	پانچویں روایت		

۱۵۸	صحابہ کرام الیہ نہیں کرتے تھے	۱۲۷	اور اس کا جواب
۱۵۹	آثار حضرت تابعین وغیرہم	۱۲۹	چھٹی روایت
۱۶۰	حضرت کحل کا اثر اور اس کا جواب	۱۲۹	اور اس کا جواب
۱۶۰	حضرت عروہ بن زبیر کا اثر اور اس کا جواب	۱۳۰	ساتویں روایت اور اس کا جواب
۱۶۱	حضرت حسن بصری کا اثر اور اس کا جواب	۱۳۱	تیسرا باب آثار صحابہ و تابعین وغیرہم
۱۶۱	حضرت امام شعبی کی مرسل روایات کا حکم	"	حضرت عمر کا اثر اور اس کا جواب
۱۶۲	حضرت امام اوزاعی کا اثر اور اس کا جواب	۱۳۲	حضرت علی کا اثر اور اس کا جواب
۱۶۳	حضرت مجاہد کا اثر اور اس کا جواب	۱۳۷	حضرت ابی بن کعب کا اثر اور اس کا جواب
"	حضرت قاسم بن محمد کا اثر اور اس کا جواب	۱۴۰	حضرت ابن مسعود کا اثر اور اس کا جواب
۱۶۴	فریق ثانی کی پیش کردہ روایتوں میں اولیوں کا جہور اہل اسلام کے روایت سے مقابل	۱۴۱	حضرت عبداللہ بن مغفل کا اثر اور اس کا جواب
۱۶۵	چوتھا باب قیاسی دلائل	۱۴۲	حضرت ابوسعید الخدری کا اثر اور اس کا جواب
۱۶۵	پہلی قیاسی دلیل اور اس کا جواب	۱۴۲	حضرت انس بن مالک کا اثر اور اس کا جواب
۱۶۶	دوسری قیاسی دلیل اور اس کا جواب	۱۴۳	حضرت عبداللہ بن عمرو کا اثر اور اس کا جواب
۱۶۷	تیسری قیاسی دلیل اور اس کا جواب	۱۴۴	جابر کا اثر اور اس کا جواب
۱۶۸	چوتھی قیاسی دلیل اور اس کا جواب	۱۴۶	حضرت ابن عباس کا اثر اور اس کا جواب
۱۶۹	فریق ثانی سے مخلصانہ اپیل	۱۴۹	حضرت ابو الدرداء کا اثر اور اس کا جواب
		۱۵۰	حضرت عمران بن حصین کا اثر اور اس کا جواب
		۱۵۱	ان کی مسلم وغیرہ کی روایت کا مطلب ؟
		۱۵۲	حضرت ہشام بن عمار کا اثر اور اس کا جواب
		۱۵۲	حضرت معاذ بن جبل کا اثر اور اس کا جواب
		۱۵۳	حضرت ابن عمر کا اثر اور اس کا جواب
		۱۵۵	حضرت عبادہ بن الصامت کا اثر اور اس کا جواب
		۱۵۶	حضرت عبادہ و جوب قرآن کے قابل نہ تھے
		۱۵۷	جبری نمازوں میں صرف حضرت عبادہ ہی
		۱۵۸	ام کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے دیگر حضرات



## پیش لفظ

”احسن الکلام“ کے حصّہ اول میں جمہور اہل اسلام کے اس دعویٰ کو قرآن کریم صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ اور دیگر فقہاء اور محدثینؓ کے اقوال سے نیز بعض عقلی و تریجی اور قیاسی دلائل سے نہایت وضاحت کے ساتھ مبرہن کیا گیا ہے کہ مقتدیوں کو امام کے پیچھے کسی قسم کی قرأت کرنی جائز نہیں ہے اور متعدد صحیح احادیث اور آثار صحابہ کرامؓ سے اہل القرآن اور فاتحۃ الکتاب کے خاص الفاظ بھی عرض کر دیے گئے ہیں اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح نہیں ہے اور یہ کہ جہری نمازوں میں تو امام کے پیچھے قرأت کرنا شاذ، منکر اور خلاف اجماع ہے۔ اب اس حصّہ میں فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ استدلال اور دلائل کا معیار اور ان کا پس منظر عرض کرنا ہے اور انصاف و دیانت سے یہ بات بعید ہے کہ ہم ان کے دلائل سے چشم پوشی کرتے ہوئے آگے نکل جائیں اور ان کو ہر یہ قارئین کرام نہ کہیں، بلکہ ان کی طرف سے بطور وکیل اور ہی خواہ کے جوہر نکالیں (اگرچہ انہوں نے پیش نہیں کی لیکن) ان کی دلیل بن سکتی ہے اس کو بھی نقل کر دیا گیا ہے، اور ان کے تمام پیش کردہ دلائل اور براہین کے صحیح محال عرض کر دیئے گئے ہیں اور حوالے بھی ساتھ ہی نقل کر دیئے گئے ہیں تاکہ ایک طرف ان کو اصل عبارت اور مضمون کی طرف مراجعت کرنا دشوار نہ ہو اور دوسری طرف شاید ”الانسان عبد النحسان“ پر نگاہ کرتے ہوئے وہ کچھ نرم بھی ہو جائیں اور ساری دنیا کو چیلنج نہ کرتے پھریں۔

مری ضد سے ہوا ہے مہرباں دوست

مرے احساں ہیں دشمن پر ہزاروں

چونکہ فریقِ ثانی کا دعویٰ بڑا سنگین ہے اس لیے اگر ہم سے کسی دلیل کی گرفت میں کوئی سختی ہو گئی

تو معذور تصور کیجئے کیونکہ البیادہ اظلم مالم یتعد المظلوم کے پیش نظر ہم مظلوم ہیں اور

ان لصاحب الحق مقالہ ارشاد نبوی ہی تو ہے۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ عوض و معاوضہ گمہ نذر و اور

حتی الوسع اس پر خطر وادی سے دامن بچا کر نکلنے کی کوشش کی جائے گی۔ والعصمة بيد الله تعالى وحده



## پہلا باب

فریق ثانی کا یہ دعویٰ ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ انصاف اور دیانت کا تقاضا تو یہ تھا کہ جیسے ہم نے حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ سے متعدد صحیح روایتیں پیش کی ہیں کہ آیت واذا قرأ القرآن الایۃ کا شان نزول نماز ہے اور اس پر اجماع بھی ہے اسی طرح فریق ثانی بھی کم از کم کسی ایک ہی صحابی سے بسند صحیح یہ روایت نقل کر دیتا کہ فلاں آیت کا شان نزول یہ ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح بلکہ ضروری اور واجب ہے اور خاص طور پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا لازمی ہے اور اس کے بغیر اس کی نماز کالعدم ہے بیکار ہے، اور باطل ہے مگر یقین کیجئے کہ دنیا کے کسی اسلامی کتب خانہ میں کوئی ایسی اسلامی کتاب موجود ہی نہیں ہے جس میں کسی صحابی سے صحیح اور متصل سند کے ساتھ یہ روایت موجود ہو کہ فلاں آیت اس بارے میں نازل ہوئی ہے کہ امام کے پیچھے مقتدیوں پر سورۃ فاتحہ کی قرأت ضروری ہے ورنہ نماز باطل اور کالعدم ہوگی یہ ہے ہل من مبارذیہ رزنی کا صحیح مقام، مگر نہ معلوم فریق ثانی اس سے کیوں انغاض کر جاتا ہے کیا ہے کوئی خوش نصیب اور زندہ دل غیر مقلد بھائی جو یہ مطالبہ پورا کر دے اور جیسے ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے مفسر قرآن صحابہؓ سے صحیح اسانید کے ساتھ آیت کا شان نزول بیان کیا ہے ایسا ہی وہ بھی کسی ایک صحابی سے آیت کا شان نزول نقل کر دے (دیدہ باید) باقی انعامی چیلنج کا عجب تو اقم الحروف کثیر العیال اور مفلوک الحال آدمی ہے۔ نہ مال ہے اور نہ لاف و گزاف اور ڈھینگیں مارنے کی عادت ہے۔ دلائل آپ کے سامنے ہیں جو بیان کر دیے گئے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ کہ ایسی کوئی آیت فریق ثانی پیش نہیں کر سکتا جس کا حضرات صحابہؓ

اور تابعین سے صحیح اور متصل مند کے ساتھ شان نزول یہ ثابت ہو چکا ہو کہ اہم کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرأت ضروری ہے پھر بھی مجوزین قرأت خلف الامام نے قرآن کریم کی آیات سے اس دغی پر استدلال و احتجاج کرنے کی ناکام سعی کی ہے۔ ہم ان کے قرآنی استدالات نقل کر کے ان کا صحیح محل عرض کرتے ہیں اور فرقی ثانی کی خامی بھی عرض کر دیتے ہیں تاکہ مسئلہ زیر بحث کا کوئی پہلو نشہ نہ رہے اور حق بات بھی سامنے آجائے۔

پہلی آیت: حضرت امام بیہقی فرماتے ہیں کہ ہر نمازی اپنے لیے نماز پڑھتا ہے اور قرأت نماز کا ایک حصہ ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بعض نماز تو خود مقتدی ادا کرے اور بعض (یعنی قرأت سورۃ فاتحہ) اس کا امام ادا کرے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَنْ لِّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (پہلی سورۃ نجم، رکوع ۲) اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا۔

اور اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے لَتَجْزِيَنَّ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی (پہلی سورۃ طہ، رکوع ۱) تاکہ بدلہ ملے ہر شخص کو جو اس نے کمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہم کی قرأت صرف اس کے لیے ہے اور مقتدی کو الگ سورۃ فاتحہ پڑھنی ہوگی۔ (محصلہ کتاب الفراء ص ۵۴) اور یہی کچھ تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ خیر الکلام ص ۶۱ میں کہا گیا ہے۔

جواب: یہ استدلال محض باطل ہے اولاً اس لیے کہ کسی صحابی یا تابعی سے بلند صحیح ثابت نہیں کہ ان آیتوں کا شان نزول قرأت خلف الامام کا مسئلہ ہے اور خاص طور پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ان سے ثابت ہے اور نہ ان آیتوں میں سورۃ فاتحہ اور قرأت کا اور امام و مقتدی کا کوئی لفظ ہی موجود ہے اس لیے دعویٰ کا دلیل سے معمولی سا تعلق بھی نہیں ہے، بلا شک قرآن کریم کی کوئی آیت اور حکم شان نزول پر بند نہیں اور قرآن کریم قیامت تک اقوام عالم کے لیے دستور ہے لیکن اگر کسی مسئلہ کے استدلال پر کوئی ایسی آیت پیش کی جائے جس سے نہ تو حضرات صحابہ کرامؓ نے وہ مسئلہ سمجھا ہو۔

اور نہ تابعین نے اور نہ وہ مسئلہ اس کا شان نزول ہو تو یقیناً وہ کشید ہوگا۔ مولف خیر الکلام اس نقطہ کو نہیں سمجھے یا بالکل پی گئے ہیں۔ وثانیاً پہلے تو قرأت کا فریضہ صرف امام پر ہے مقتدی پر نہیں اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے جیسا کہ بقول مولف خیر الکلام فیض الباری کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مقتدی پر بھی قرأت ہے لیکن امام اس کا متحمل ہے تو کیا امام بیہقی وغیرہ کے نزدیک امام کا سترہ اور ہر غیر مقتدیوں کو کافی نہیں ہے؟ یہ کہنا کہ اسی طرح جماعت کی



صورت میں امام کے آگے سترہ کافایت کرنا اس لیے نہیں کہ امام کا سترہ مقتدی کو کفایت کرتا ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جیسے استقبال کعبہ مقتدی کا فعل ہے اور وہ ہر نمازی سے مطلوب ہے اسی طرح نمازی کے آگے سترہ کا ہونا ہر نمازی سے مطلوب ہے اگر ایک نمازی ہو تو اس کے آگے ہو اگر جماعت نماز پڑھے تو امام کے آگے ہو جیسے کعبہ ایک ہے اور سب کا ہے اسی طرح سترہ اگرچہ ایک ہے مگر سب کا ہے نہ خاص امام کا نہ خاص مقتدی کا ۱۵ (خیر الکلام ص ۶۵ محصلہ) ان کے لیے سود مند نہیں بلکہ نری دفع الوقتی ہے۔ اُولَئِکَ اس لیے کہ سترۃ الامام سترۃ لمن خلفہ (بخاری جلد ۱ ص ۱)

ایک مسلمہ قاعدہ ہے پھر اس کا انکار کون تسلیم کرے وہ بتائے یعنی یہی دلیل بسلسلہ قرأت ہماری طرف سے سمجھے کہ منفرد ہو تو اس پر قرأت لازم ہے جماعت کی نماز ہو تو امام کی قرأت مقتدی کے لیے ہے جیسے کعبہ ایک ہے اور سب کا ہے اسی طرح قرأت بھی ایک ہے مگر سب کی ہے نہ خاص امام کی نہ خاص مقتدی کی جیسے مذکورہ دلیل میں باوجودیکہ سترہ امام کے آگے ہے مگر سب کا ہے اسی طرح قرأت بھی بظاہر امام کر رہا ہے مگر سب کی ہے جیسے نمازی سے مطلوب یہ ہے کہ سترہ اس کے آگے کی جانب ہو یہ مطلوب نہیں کہ ہر نمازی اس کو گاڑے اسی طرح قرأت میں بھی یہی مطلوب ہے کہ آگے امام قرأت کرے اور مقتدی نہیں نہ یہ کہ سب مقتدی قرأت کریں۔ اور کیا ہمیری نمازوں میں امام کا ہر مقتدیوں کو کافی نہیں ہے؟ اور کیا مازاد علی الفاتحہ میں امام کی قرأت مقتدیوں کو کفایت نہیں کرتی؟ دوسری باتوں میں نیابت اور کفالت کا مسئلہ تو الگ رہا نفس نماز میں یہ آیتیں امام بھیجتی تھے مخالفت پڑتی

بیٹاری اور عجز کے وقت حج کے سلسلے میں نیابت فذین اللہ احق بالتفقد کے تحت جمہور کا مسکن اور من مات وعلیہ صوم صام عنہ ولیہ برفیق ثانی کا خاصا احرا ہے وعلی ذیہیح نکاح اور طلاق وغیرہ میں وکالت و نیابت امام بھیجتی تھے قاعدہ کے خلاف پڑتی ہے اور اسی طور پر ایصال ثواب میں تمام اہل الشنت کا اتفاق ہے (دیکھیے نووی ص ۲۲۴ و شرح فقہ اکبر ص ۱۵۸) اور بخاری حدیث کا ایصال ثواب کے انکار پر ان آیتوں کو پیش کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ میت نے اپنی زندگی میں کوشش کر کے علم حاصل کیا، شادی کی اور اولاد پیدا ہوئی، انکاروں کی اعانت کی اچھے اخلاق سے برتاؤ کر کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا اسکی وفات کے بعد لوگوں نے اسکو ایصال ثواب کیا تو اسکو اپنی ہی کوشش کا ثمرہ اور چل ملاوان لیکس لیلۃ منکان الامام ساجی لندیہ آیتیں ایصال ثواب کی دلیل میں نہ کر انکار کی روکھے کتاب لرح ص ۱۵۸ الحافظ ابن القیم و شرح تھیۃ الطحاوی ص ۳۸۴ وغیرہ جن سطحتی قسم کے لوگوں نے اس آیت کریمہ کو ایصال ثواب کے لیے حجت گردانا ہے انکو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ تو سرسراں کے خلاف جاتی ہے لیکن ہر بات میں فہم اور تسلیم شرط ہے جو فہم سے محروم ہو تو تسلیم کے لیے آمادہ نہ ہو اس کو جھلاد لائل سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے!

ہیں۔ مولف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ ما زاد علی الفاتحہ اور ہر مقتدی پر ہے ہی نہیں یہ امام کا فریضہ ہے۔ (محصلاً ص ۶۱) ہمیں ضرور نہیں کیونکہ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ قرآنہ امام کا فریضہ ہے مقتدی کا فریضہ صرف استماع و انصات ہے۔ رہا ان آیتوں کا مطلب تو بالکل واضح ہے کہ توحید و رسالت اور معاد وغیرہ کے بنیادی عقیدوں اور اصولی امور میں جہاں کسی دوسرے کی نیابت اور وکالت کام نہیں آسکتی وہاں ہر ایک کو اپنا عقیدہ اور عمل ہی کام آئے گا وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَهٌ مَّا سَعَى اور جہاں نیابت اور وکالت درست ہے، تو وہاں بھی اصل اور موکل کی محنت اور مشقت کا فرما ہے کہ اُس نے اپنا نائب اور وکیل مقرر اور انتخاب کیا ہے اور اس کو اپنی ہی کوشش اور سعی کا نتیجہ ملتا ہے عام اس سے کہ اس کی سعی بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ وہ اس کا موجب ہو یا عامل، داعی ہو یا سبب، علت سب کی ایک ہے۔

دوسری آیت :- امام بیہقیؒ اور مولانا عبد الصمد صاحب پشوریؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے  
 وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَ  
 دُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ (پہ، اعدا، ۲۴۱)  
 اور یاد کرتا رہے اپنے رب کو اپنے دل میں گڑگڑاتا ہوا اور  
 ڈرتا ہوا اور ایسی آواز سے جو کہ پکار کر بولنے سے کم ہو  
 صبح کے وقت اور شام کے وقت اور مت رہ بے خبر۔

ان اکابر کا کہنا ہے کہ یہ آیت امام اور مقتدی کو نیز جہری اور سہری تمام نمازوں کو شامل ہے اور سورہ فاتحہ وغیرہ فاتحہ کی قرأت کو عام ہے اس سے ثابت ہوا کہ مقتدی کو امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کی اپنے دل میں آہستہ آہستہ قرأت کرنا صحیح ہے اور امام بیہقیؒ اپنی سند کے ساتھ یہی مطلب اس آیت کا حضرت زید بن اسلمؒ سے نقل کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ علمائے تابعین میں بڑے پایہ کے مفسر تھے۔ (محصلاً کتاب القراءۃ ص ۸۲ و اعلام الاعلام ص ۱۹) اور حافظ ابن تیمیہؒ نے سہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے جواز میں یہ آیت پیش کی ہے (ملاحظہ ہو فتاویٰ ص ۱۴۹) اور مولف خیر الکلام نے بھی اس استدلال کا ذکر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو خیر الکلام ص ۶۸)

جواب :- اس آیت سے امام کے پیچھے قرأت سورہ فاتحہ پر استدلال کرنا باطل ہے اولاً اگر واقعی اس آیت سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور جمہور سلف و خلفؓ پر یہ مطلب ہرگز مخفی نہ رہتا چونکہ یہ تفسیر صحیح حدیث اور حضرت ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ کی صحیح تفسیر کے (جس کا حوالہ کے ساتھ ذکر جلد اول میں ہو چکا ہے) مخالف ہے اس لیے



یہ قابل قبول نہیں ہے لہذا اس کی صحت میں کلام ہے وثانیاً نہ اس آیت میں اہم کا لفظ ہے اور نہ مقتدی کا نہ قرأت کا اور نہ سورہ فاتحہ کا مطلق ذکر کو خود ساختہ قیود میں جبراً ناکیوں کو صحیح ہو سکتا ہے؟ علاوہ انہیں اگر آیت کا عموم ملحوظ رکھا جائے تو کیا فرق ثانی سورہ فاتحہ کے علاوہ کسی اور قرأت کو مقتدی کے لیے تسلیم کر لے گا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ جو جواب وہ غیر سورہ فاتحہ کاٹے گا۔ فہو جواب عن الغائتہ اور اہم سیوطی نے نتیجۃ الفکر میں لکھا ہے کہ اس آیت میں ذکر سے قلبی ذکر مراد ہے زبان سے پڑھنا مراد ہی نہیں (کذا فی الدلیل الملبین ص ۳۶) لہذا یہ ہمیں مضر نہیں ہے کمالاً یخفی۔ وثالثاً اگر واقعی یہ آیت تمار کے بارے میں ہے تو اس سے صرف اہم مراد ہوگا نہ کہ مقتدی کیونکہ اذبح اور دیک ولا تکن میں مفرد صیغے اس پر دلالت کرتے ہیں اور اس سے پہلی آیت فاستمعوا لہ وانصتوا اور لعلکم ترحمون میں مقتدیوں کو خطاب کیا کیونکہ یہ تمام جمع کے صیغے ہیں جو تقابل کی صورت میں بیان ہوئے ہیں محض مفرد ہی نہیں جس سے جمع بھی مراد ہو سکتی ہے جس طرح وکونتم فی میں ہے جس سے مؤلف خیر الکلام کو مغالطہ ہوا ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ امام کو تہری نمازوں میں اپنے دل میں قرأت کرنی چاہیے اور مقتدیوں کو استماع اور انصات کرنا ہوگا اور پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ استماع اور ہے اور سماع اور، بلکہ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت اور صحیح حدیث اس مطلب کی تائید کرتی ہے وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ابتداء میں حضرات صحابہ کرام کو بلند آواز سے قرأت کر کے نماز پڑھایا کرتے تھے، مشرکوں نے آپ کو اور قرآن کریم و جبریل علیہ السلام کو سب دشمن کا نشانہ بنایا، آپ نے بحالت امامت اتنی آہستہ قرأت شروع کر دی کہ مقتدی نہیں سن سکتے تھے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نازل ہوا۔

ولا تجھد بصلواتک ولا تخافنہا  
اور مت پکار کر پڑھ اپنی نماز اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈ  
وَابْتَغِ بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا (دیک، بنی اسرائیل ۱۲) سے اس کے بیچ میں راہ۔

اور انہیں کتابوں میں اس آیت کا مفہوم اعتدال فی الدعاء بھی مذکور ہے (بخاری جلد ۲ ص ۶۸۶ و مسلم جلد ۱ ص ۱۸۳ والیو عوانہ جلد ۲ ص ۱۲۳) ولایعیا مافظ ابن کثیر کے حوالہ سے پہلے یہ نقل کیا جا چکا ہے کہ مقتدیوں کے لیے اس آیت سے قرأت کرنے کا اثبات (بعید منافی للانصات المأمور بہ) تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۸۲ (بعید ہے اور انصات کے بالکل مخالف



ہے جس کا مقتدیوں کو حکم ہے بہر حال اس آیت کے مقتدیوں کے لیے نفس قرأت پر استدلال کرنا انصاف سے بعید اور حکم خداوندی کے سرسرم مخالف ہے چہ جائیکہ سورج فاتحہ کی قرأت کا حکم اس مقتدیوں کے لیے ثابت ہو سکے۔ مولف خیر الکلام نے ص ۶۹ میں بحوالہ تفسیر نیشاپوری یہ لکھا ہے کہ آہستہ پڑھنا انصاف کے منافی نہیں۔ لیکن ہم پہلے باحوالہ کتب لغت عرض کر چکے ہیں کہ آہستہ پڑھنا بھی استماع و انصات کے بالکل منافی ہے، ارہی حضرت زید بن اسلم کی تفسیر تو وہ درایت اور روایت قابل توجہ نہیں ہے درایت تو آپ حافظ ابن کثیر کے حوالہ سے سن ہی چکے ہیں اور خود حضرت زید بن اسلم سے قرأت خلف الامام کی ممانعت کی تفسیر منقول ہے چنانچہ امام ابن قدامہ لکھتے ہیں۔ وقال زید بن اسلم والوالعالیۃ کانوا یقرؤن خلف الامام فخلت واذا قرئ القرآن اللہ (معنی جلد ۱ ص ۵۸) زید بن اسلم اور ابو العالیہ فرماتے ہیں کہ لوگ امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے اس پر یہ آیت واذا قرئ القرآن الایۃ نازل ہوئی۔ اور روایت بھی یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس روایت کی سند میں عبد الغزیز بن محمد ہے گو وہ ثقہ ہے لیکن ابو زرعمہ اس کو سنی الحفظ سے اور امام احمد اور ابن حبان اس کو غلطی سے اور ابن سعد ان کو یغلط سے اور ساجی ان کو کثیر الوہم سے تعبیر کرتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۵۳) کیا معلوم کہ حضرت زید بن اسلم نے اس آیت کی کیا تفسیر بیان کی تھی اور راوی مذکور کی غلطی اور وہم سے وہ کیا سے کیا ہو گئی ہے مولف خیر الکلام ص ۶۹ میں لکھتے ہیں مگر یہ جرحیں بھی بلا سند ہونے کی بنا پر مردود ہیں الخ مگر یہ محض ان کی دفع الوقتی ہے امام ابو زرعمہ، امام احمد، امام ابن حبان وغیرہ کیا ائمہ جرح و تعدیل نہیں؟ اور معتبر کتب رجال میں ان کے اقوال کیا بلا سند ہیں؟ جب سنی الحفظ وغیرہ کی جرح امام ابو حنیفہ وغیرہ پر ہو تو وہ مولف مذکور کے نزدیک معتبر ہو اور یہاں مردود ہو آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اور ائمہ جرح کے اقوال کے مقابلہ میں اٹکل پچو باتیں کون سناتے؟ باقی آیت کا مطلب بالکل عیاں ہے جو خلقا اللہ تعالیٰ کے ذکر، یاد اور دعا پر مشتمل ہے جیسا کہ دو سر مقام پر ارشاد ہوتا ہے ادْعُوا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْیَةً۔ (پ، اعراف) پکارو اپنے رب کو گڑ گڑا کر اور چپکے چپکے اور ایک مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے۔ تَدْعُوْنَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْیَةً۔ (پ، انعام، ۸) پکارتے ہو تم اس کو گڑ گڑا کر اور چپکے چپکے، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ خود بنفس نفیس تحریر فرماتے ہیں کہ دعائیں سنت



طریقہ یہ ہے کہ آہستہ دعا کی جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **وَ اذْكُرْ دِيْكَ فِیْ بُفْسِكَ الْیَّتِ**  
 (فتاویٰ جلد ۱ ص ۶۶) خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت کو مقتدیوں کی قرأت (خصوصاً قرأت فاتحہ)  
 پر دلیل بنانا اندرونی اور بیرونی عقلی اور نقلی تمام دلائل کے سراسر مخالفت ہے۔ الغرض اس سے مراد  
 ذکر اور دعا ہے گو خطاب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہے مگر حکم امت کو ہے گفتہ آئید در حدیث  
 و دیگران۔

**تیسری آیت :-** مولوی محمد صادق صاحب دخطیب جامع المحدث قلعہ دیدار سنگھ ضلع گوجرانوالہ  
 لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَلَا تَزِدْوا زَرْءَ وَ ذَرَّ اخْوا ی (پا۔ بنی اسرائیل ۲۰) اور**  
 کسی پر نہیں پڑتا بوجھ دوسرے کا۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ امام کی قرأت سورہ فاتحہ مقتدیوں کو کفایت نہیں کر سکتی کیونکہ  
 ایک آدمی کا بوجھ دوسرے کیسے اٹھا سکتا ہے؟ (بحوالہ ازالہ ستر ص ۵۸) مولفہ جناب مولانا قاضی نور محمد  
 صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ المتوفی ۱۳۸۲ھ (۱۹۶۲ء)۔

**جواب :-** یہ استدلال بھی نہایت کمزور ہے اولاً حضرت مولانا قاضی نور محمد صاحب تحریر  
 فرماتے ہیں کہ شریعت کی اصطلاح میں کسی شے کو جواز قبیل عبادت ہو و ذر ہرگز نہیں کہا جاتا اگر  
 کہیں قرآن اور حدیثیں و ذر کا لفظ کسی عبادت پر اطلاق کیا گیا ہو تو پیش کریں ورنہ (سعدہ)  
 فاتحہ کو و ذر بنانے سے شرمائیں (بلغفظ ازالہ ستر ص ۶۲) وثانیاً کیا سورہ فاتحہ ہی و ذر ہے یا ما  
 زاد علی الفاتحہ قرآن کریم کی ایک سوترہ سورتیں بھی و ذر ہیں تو صرف فاتحہ کی تخصیص کیوں کی  
 گئی ہے؟ اور ان میں امام کیوں کفایت کر جاتا ہے؟ اور اگر وہ و ذر نہیں تو کس مطلق کے رُوسے  
 وثالثاً جہری نمازوں میں جہر اور سترہ وغیرہ و ذر کو امام کیوں اٹھا لیتا ہے کیا ان میں و ذر والا  
 فلسفہ اپنا کام نہیں کرتا؟ عجیب بات ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تو فرماتے  
 ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ایسی سورت (فاتحہ) عطا کی ہے کہ نہ تو تورات و انجیل اور زبور میں ایسی  
 سورت نازل ہوئی ہے اور نہ قرآن کریم میں اس کی مثال موجود ہے۔ (مشکوٰۃ جلد ۴ ص ۵۸) و  
 معطاً امام مالک ص ۲۸ و ترمذی جلد ۲ ص ۱۱۱ (وقال صحیح) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ  
 علیہ وآلہ وسلم تو اس سورت کو نعمت عظمیٰ بتلاتے ہیں مگر مدعیان عمل بالحدیث اس کو و ذر سے

تعبیر کرتے ہیں فوا اسفا۔ آیت کریمہ کا مضموم بالکل ظاہر ہے کہ ہر آدمی صرف اپنا ہی بوجھ اٹھائیگا خواہ وہ اس عمل کا موجب ہو یا مروج عامل بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ اپنے ہی کئے کا پھل پائے گا اور وہ معنوی اور ماضی جو دوسروں کے گناہوں کو اپنے پیٹے ڈالنے کا معنی ہے اس کو عدالت عالیہ اور سچی سرکار سے گویا یہ خطاب ہوگا۔ ع۔ تجھ کو پرانی کیا پڑی اپنی نیٹر تو۔ ہاں مگر اغوا اور اضلال چونکہ اس کا اپنا عمل ہے لہذا اس کا بوجھ اس پر ضرور پڑے گا اور گمراہ کرنے پر اپنے کئے کا ضرور پھل پائیگا وہ ہی الذمہ نہیں ہو سکتا۔  
 الغرض اہم کے پیچھے مقتدیوں کے لیے قرأت سورۃ فاتحہ کا اس آیت سے اثبات تحریت قرآن کریم کے مترادف ہے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ)

چوتھی آیت :- مولانا محمد اسماعیل صاحب (خطیب جامع مسجد اہل حدیث گوجرانوالہ) فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمًی (پہلا سورۃ طہ - رکوع ۷) اور جس شخص نے منہ پھیرا میرے ذکر اور یاد سے تو اس کو ملتی ہے گدازان تنگی کی اور لایں گے ہم اس کو قیامت کے دن اندھا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ذکر سے مراد اہم کے پیچھے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ہے اور جو شخص اس سے اعراض کرتا ہے وہ عذاب خداوندی کا شکار ہوگا۔ (محصلہ اخبار تنظیم ص ۱۰۳۳ ماخذ از برہان ساطع ص ۳)

جواب :- فریق ثانی کا دوسرا ہی عجیب آیت وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (پہلا سورۃ بقرہ - رکوع ۲) کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر وہ آیت ان کے نزدیک کافروں کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور یہ آیت جو بالاتفاق کفار منافقین اور عصاة کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس کو وہ مسلمانوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ بعض مفسرین کرام نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے۔ کہ معیشۃ ضنک کے یہ معنی ہیں کہ زندگی میں خیر اور بھلائی داخل نہ ہو سکے گویا خیر کو اپنے اندر لینے سے تنگ ہو گئی ہے اور اکثر مفسرین یہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور قرآن کریم سے اعراض کرنے والے کافروں اور منافقوں کو اگرچہ مال، اولاد اور دنیا کی ترقی حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن زندگی کا وہ سکون جو خدا تعالیٰ کے احکام ماننے سے ہوتا ہے اس سے وہ محسوس خالی اور محروم ہوتے ہیں اور اس دنیائے خاک و گل میں حقیقی امن اور تسلی ہی ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ جو



اللہ تعالیٰ کی یاد سے اپنے دل کو معمور رکھتے ہیں سچ ہے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دل مطمئن ہو سکتے ہیں۔ الا بذكر الله تطمئنن القلوب اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے معیشتہ فتنہ کی تفسیر عذاب قبر سے کی ہے چنانچہ حضرت ابوسعید الخدریؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا معیشتہ فتنہ قال عذاب القبر (مسند جلد ۲ ص ۳۸) قال الحاكم والذهبی علی شرط مسلم کہ اس آیت میں معیشتہ فتنہ سے عذاب قبر مراد ہے۔ اور امام بزارؒ نے بھی حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً یہ روایت نقل کی ہے حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں اسناد جید (جلد ۳ ص ۱۶۹) کہ اس کی سند جید اور عمدہ ہے اب مولانا صاحب ہی ازراہ بزرگی ارشاد فرمائیں کہ کیا ان تمام حضرات کو عذاب قبر ہو گا جن کے حوالے پوری تفصیل کے ساتھ جلد اول میں بیان ہو چکے ہیں جو قرأت خلف اللہام کے قائل نہ تھے؟ اور کیا عذاب قبر مشرکوں، کافروں، منافقوں اور گنہگاروں کو ہو گا یا قرآن کریم اور صحیح احادیث پر عمل کرنے والوں کو جن کا دامن تحقیق اکثر حضرات اصحابہ وتابعینؓ اور جو فقہاً اور محدثینؓ کی معیت سے بھی وابستہ ہے؟ اگر استدلال اسی کا نام ہے تو کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ واذا قرأ القرآن الآية اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کا حکم ہے اور فریق ثانی اس سے عرض کر رہا ہے انہما ان کی منطق کی رو سے وہ معیشتہ فتنہ کے مستحق ہیں بلکہ یہ مطلب زیادہ صحیح ہو گا۔ کیونکہ اس کا مطلب ہی صحیح روایات اور اجماع امت سے مسئلہ عدم قرأت خلف اللہام ثابت ہو چکا ہے اور من اعرض عن ذکرہی الآية کا یہ مطلب کہ اس سے اہم کے پیچھے سورہ فاتحہ سے اعراض کرنا ہے نہ تو جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اور نہ حضرات صحابہ کرامؓ سے بلکہ کسی بھی معتبر اور مستند مفسر سے یہ ثابت نہیں ہے پھر کیونکہ اس سے قرأت خلف اللہام کی اور خصوصاً اہم کے پیچھے سورہ فاتحہ کی اجازت ثابت ہے۔ مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۸ میں فاقدوا ماتیتہم الآية سے بھی اپنے دعویٰ پر استدلال کیا ہے مگر ہم نے جلد اول میں باحوالہ بحث عرض کر دی ہے کہ یہ آیت ہی نماز تہجد سے متعلق ہے نہ کہ مسئلہ خلف اللہام سے حضرات! اسی قسم کی بعض اور آیات بھی فریق ثانی نے اپنے اس دعوے کے اثبات پر پیش کی ہیں مگر ان کو وہ کسی طرح بھی مفید نہیں ہو سکتیں بخلاف اس کے ہم نے محض حضرات صحابہ کرامؓ سے نہیں بلکہ ان حضرات صحابہ کرامؓ سے جن کا فن تفسیر میں مقام حضرات غفار راشدینؓ سے

بھی بڑھا ہوا ہے صحیح اسانید کے ساتھ ایک آیت کا مطلب اور شان نزول پیش کیا ہے اور حدیث تابعین و مجہور مفسرین سے بلکہ اجماع امت سے بھی آیت کی تفسیر نقل کی جا چکی ہے اور فریق ثانی صحابی چھوڑ کسی تابعی سے بھی اس صحیح کی آیت کا مطلب نہیں پیش کر سکا صرف تفسیر بالرائے اور سینہ زوری سے کام لیتا ہے۔

فَاللّٰهُ تَعَالٰی الْمُسْتَكْمِلُ۔



## دوسرا باب

اس باب میں وہ مرفوع روایات اور احادیث پیش کی جاتی ہیں جن سے فریق ثانی نے مقتدی کے لیے امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے پڑھنے کا وجوب ثابت کیا ہے اور ہم ان پر روایت اور درایت سنداً اور معنی کلام کریں گے اور یہ واضح کریں گے کہ ان کا یہ دعویٰ اور اس کی دلیل کہاں تک اور کیسے ان کو مفید ہے؟ اور دعویٰ و دلیل کی مطابقت کیا ہے؟

پہلی روایت :- حضرت عبادة بن الصامت کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :- لا صلوة لمن لم یقرأ بفاتحة الكتاب (بخاری ج ۱ ص ۱۳۲ و مسلم جلد ۱ ص ۱۶۹) کہ جس نے سورہ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہوتی۔ چونکہ اس روایت میں مقتدی اور خلف الامام کی کوئی قید مذکور نہیں اس لیے فریق ثانی کو اس حدیث سے استدلال کرنے میں علوم آلی خارجی قرآنی اور حضرات محدثین کرام کے مفروض اجماع ایسے خوش کن الفاظ سے مدد لینے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے چنانچہ مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ لفظ من عام ہے جس میں امام مفرد اور مقتدی سب داخل ہیں (ابکار المن من تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۲ و تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷) اور مولانا محمد ابراہیم صاحب میر لکھتے ہیں کہ غرض تمام محدثین بالاتفاق اس حدیث کو ہر نماز اور ہر نمازی پر شامل

لے یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۱۰۵، البیہقی جلد ۲ ص ۱۲۴، دارمی ص ۱۳۶، البیہقی جلد ۱ ص ۱۱۹، ترمذی جلد ۱ ص ۱۷۱، ابن ماجہ ص ۷۰، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۲، سنن البیہقی جلد ۲ ص ۶۱، جزء القراءة ص ۲، کتاب القراءة ص ۹، کتاب الاعتبار ص ۹، اور مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۷۰ وغیرہ کتابوں میں موجود ہے یہ روایت متعدد حضرات صحابہ کرام سے بلند صحیح مروی ہے مثلاً حضرت ابن عمرؓ اور حضرت جابرؓ سے صحیح سند سے مرفوع مروی ہے لا صلوة لمن لم یقرأ بفاتحة الكتاب (کتاب القراءة ص ۳۲) کلاهما

بطریق اسحاق بن بنان البغدادی (وغیرہ)

کہتے ہیں۔ (تفسیر واضح الیمن ص ۱۷۱) اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ یہ حدیث عام ہے اس میں کسی نماز کی تخصیص نہیں اہم یا منفرد کا کوئی ذکر نہیں ہے جیسے یہ حدیث اہم یا منفرد کو شامل ہے۔ اسی طرح مقتدی کو بھی شامل ہے الخ (ص ۷۷)

جواب اول :- بلاشبہ سند کے لحاظ سے یہ روایت صحیح ہے لیکن اس روایت سے فریق ثانی کا استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ دعویٰ خاص اور دلیل عام ہے (تقریب نام نہیں نرمی منطقی اصطلاح ہی ملحوظ نہیں کیونکہ) نہ اس میں مقتدی کی قید موجود ہے اور نہ خلف الامام کی اور جب تک دعویٰ اور دلیل میں مطابقت نہ ہو کسی بانصاف عدالت میں ایسا دعویٰ ہرگز سموع نہیں ہو سکتا۔ رہا حرف من سے استدلال تو وہ بھی قابل التفات نہیں ہے اس لیے کہ فریق ثانی جیت تک یہ نہ ثابت کرے کہ حرف من تعمیم میں نص قطعی ہے اور کبھی کسی مقام میں تخصیص کے لیے مستعمل نہیں ہوا تو پھر ان کا دعویٰ ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے مگر یقین کیجئے کہ اس کا اثبات کارے دار دیہ صحیح ہے کہ بعض اوقات حرف من عموم کے لیے آتا ہے لیکن بسا اوقات اس میں تخصیص بھی مراد ہو سکتی ہے نہایت اختصار کے ساتھ ہم بعض حوالے درج کرتے ہیں ملاحظہ کریں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ (پڑھو ص ۱) کہ فرشتے زمین پر بسنے والوں کے لیے طلب مغفرت کرتے ہیں۔ اس آیت میں حرف من ہے اور ظاہر ہے کہ زمین پر سب بسنے والوں کے لئے فرشتے دعا مغفرت نہیں کرتے بلکہ مومنوں کے لیے طلب استغفار کرتے ہیں جیسا کہ دو سکر مقام پر ارشاد ہوتا ہے وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا (پ ۲۴ مومن) کہ فرشتے صرف مومنوں کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں نہ یہ کہ ہندو، سکھوں، یہودیوں اور نصرانیوں اور دیگر مشرک قوموں کے لیے خواہ وہ انسانوں میں ہوں یا جنوں میں تو یہاں حرف من تخصیص کے لیے آیا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ عَاَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ اِنَّ يَخْشِفُ بِكُمْ الْأَرْضَ (پڑھا، ملک، ۲) کیا تم نڈر ہو چکے ہو اُس سے جو آسمان میں ہے اس سے کہ دھندلے تم کو زمین میں یہاں بھی حرف من ہے اور اس سے مراد صرف اللہ کی ذات ہے نہ کہ ہر ایک من فی السماء اور قرآن کریم صحیح احادیث اور اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ آسمانوں میں فرشتے اور ارواحِ حق



انبیاء علیہم السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب غصہ غصہ کی حالت میں تھے اور ان کی روحیں آسمانوں پر موجود ہیں اور ایک صحیح روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وہ اولاد جو اہل النار سے ہے پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں جانب موجود ہے (بخاری ص ۵۱۱) مسند ج ۱ ص ۹۲ والبعوانہ جلد ۱ ص ۱۲۳) اور آسمان پر کوئی چپہ ایسا نہیں جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ عبادت اور سجدہ میں مشغول نہ ہو (مستدرک جلد ۴ ص ۵۴) قال الحاکم والذہبی علی شرطہما

۳۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَمْ اَمْنَتْهُمْ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ اَنْ يُّسَلَّ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا (پہا، ملک ۲۰) کیا نذر ہو چکے ہو تم اُس سے جو آسمان میں ہے اس سے کہ برسائے تمہارے اوپر پتھروں کا مینہ اس آیت میں بھی حرف من ہے مگر اُد صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں انما هلك من كان قبلكم (الحديث) بخاری جلد ۲ ص ۱۳۱ کہ تم سے پہلے لوگ صرف اس لیے ہلاک ہوئے ہیں کہ احکام خداوندی میں امیر و غریب اور اعلیٰ و ادنیٰ کا فرق کرتے تھے، اس حدیث میں حرف من ہے مگر اُد صرف بعض قومیں ہیں نہ کہ حضرات انبیاء عظام اور ان کے مومن ساتھی (علیہم الصلوٰۃ والسلام)

۵۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لَتَتَّبِعَنَّ سَنَنْ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ (الحديث) بخاری ص ۳۸۸ و مسند ج ۲ ص ۳۳۹) تم پہلے لوگوں کی (جو یہود اور نصاریٰ ہیں جیسا کہ اسی حدیث میں اس کی تصریح ہے) اتباع کرو گے جو تمہاری گمراہی کا موجب بنے گی اس میں بھی حرف من ہے اور اس سے مراد بعض قومیں ہیں نہ کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کیونکہ ان کی اتباع کا تو آپ کو حکم ہے فَبِعَدَاهُمْ اُقْتَدِ (پہا۔ انعام) سو آپ ان پیغمبروں کی رحن میں اٹھارے کے مترادف نام لیے گئے ہیں اور باقی حضرات کا اجمالاً ذکر ہوا ہے، اقتدائیجے اور آپ کی وساطت سے آپ کی تمام امت کو ان کی اتباع اور اقتدار کا حکم دیا گیا ہے۔

۶۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ طاعون اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب ہے (جس اورسل علی من قبلکم) بخاری جلد ۱ ص ۴۹۴ و مسند جلد ۲ ص ۲۲۸) جو تم سے پہلے لوگوں پر نازل کیا گیا ہے اس حدیث میں بھی حرف من ہے حالانکہ یہ عذاب صرف بعض مجرموں پر نازل کیا گیا تھا نہ کہ پیغمبروں اور مومنوں پر علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

۷۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عصر کی نماز تم سے پہلے لوگوں پر پیش کی گئی مگر انہوں نے پروا نہ کی۔ عرضت علی من قبلکم (مسلم جلد ۱ ص ۲۵۵) حالانکہ حضرت انبیاء عظام علیہم السلام اور ان کے پیروکار اس جرم سے مبرا تھے۔

۸۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو زمین پر بسنے والوں پر رحم نہیں کرتے نہ یرحمہم فی السماء (الترغیب والترہیب جلد ۳ ص ۱۵۵) بتدقیق) ان پر آسمان والا رحم نہیں کرے گا، یہاں بھی حرف من ہے اور مراد صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

۹۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرشتوں کو اور نیک بندوں کو ارشاد فرمائیں گے اخرجوا من النار من ذکر فی یوماً مشکوۃ جلد ۲ ص ۴۵ و متدرک ص ۱۰۱ جن لوگوں نے مجھے ایک دن بھی یاد کیا ہے۔ ان کو دوزخ سے نکال لو اس حدیث میں بھی حرف من ہے لیکن اس سے مراد صرف اہل توحید ہیں گو کہتے ہی گنہگار ہوں نہ کہ کافر اور مشرک حالانکہ وہ بھی خدا کا نام تو لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اگر آپ ان سے سوال کریں تمہیں کس نے پیدا کیا ہے لَیَقُولُنَّ اللہ تو ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے کثرت حدیث میں سینچ کر مثالیں ایسی موجود ہیں جن سے بخوبی یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ حرف من تخصیص کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے، ہم نے صرف بطور مثال کے چند نمونے عرض کئے ہیں، اب آپ علمائے عربیت کی چند عبارتیں ملاحظہ کریں۔

۱۔ علامہ زحشریؒ آیت ۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ حرف من تعمیم کے لیے نہیں بلکہ جنس کے لیے اور جنسیت کل افراد میں بھی متحقق ہو سکتی ہے اور بعض میں بھی لیکن اس مقام میں بعض یعنی اہل ایمان مراد ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے کافروں کے لیے دعائے مغفرت نہیں کرتے۔

۲۔ مولف خیر الکلام نے ان عبارات کا جو یہ مطلب بیان کیا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک حرف من وضع تو عموم کے لیے ہے اور اس مقام پر خصوص کے معنی پر لگی دلالت ہے اور وضع و دلالت میں فرق ہے (محصلا ص ۸۵) تو یہ ایک ناکام بہانہ ہے کیونکہ علامہ زحشریؒ وغیرہ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ حرف من تعمیم کے لیے نہیں بلکہ جنس کے لیے ہے تو پھر بکا مطلب کو کون مانتا ہے؟ اور اگر دلالت کے لحاظ سے خصوص آیا ہے تب بھی استعمال کے لحاظ سے عموم میں نص قطعی تو نہ رہا وهو المطلوب۔ اور پھر علامہ سید شریف جربانیؒ کی صریح اور واضح عبارت کا کیا جواب ہے جس میں وہ تصریح فرماتے ہیں کہ یہ عموم کیلئے وضع ہی نہیں بلکہ جنس کے لیے وضع ہیں۔



۲۔ ام رازی لکھتے ہیں کہ حرف من لا یفید العموم یہاں عموم کا فائدہ نہیں دیتا بلکہ اس سے بعض مراد ہیں (جواہل ایمان ہیں) (تفسیر کبیر جلد ۷ ص ۴۳۹)

۳۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ حرف من یہاں جنس کے لیے ہے نہ کہ عموم کیلئے (روح المعانی ص ۱۲۹)

۴۔ ام ابو بکر رازی بھی اسی کے قریب قریب الفاظ لکھتے ہیں (احکام القرآن ص ۴۳۹)

۵۔ ملا احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں ما ومن یحتمل ان العموم والخصوص واصلهما العموم (نور الانوار ص ۵۷) کہ حرف ما اور من عموم اور خصوص دونوں کا احتمال لکھتے ہیں۔ اصل اگرچہ ان دونوں کا عموم ہے۔

مطلب واضح ہے کہ اگرچہ اصل میں دونوں عموم کے لیے ہیں لیکن استعمال کے لحاظ سے دونوں عموم کے لیے نص قطعی نہیں کہ ان میں تخصیص نہ آ سکے بلکہ استعمال میں عموم و خصوص دونوں کا برابر احتمال لکھتے ہیں اور ص ۸۱ میں لکھتے ہیں۔ وکلمة من لیست بحکمة فی العموم الخ کہ کلمہ من عموم میں محکم اور نص قطعی نہیں ہے۔

۶۔ ام اہل عربیت علامہ سید شریف جرجانی (المتوفی ۸۱۶ھ) تحریر فرماتے ہیں (المصولات لم توضع للعموم بل ہی للجنس یحتمل العموم والخصوص (شرح مواقف جلد ۲ ص ۴۵۵ طبع مصر ص ۲۳) طبع نوک کشوں کہ جملہ مصولات (جن میں ما ومن داخل ہیں) عموم کے لیے موضوع ہی نہیں بلکہ ان میں عموم و خصوص دونوں کا احتمال ہے اور ابو بکر محمد بن احمد السرخسی (المتوفی ۴۹۰ھ) لکھتے ہیں ومن هذا القسم کلمة من فانها کلمة مبہمة وهی عبارة عن ذات من یعقل وهی تحتل الخصوص والعموم الخ (اصول سرخسی جلد ۱ ص ۵۵ طبع مصر) کہ اسی قسم سے کلمہ من بھی ہے کہ وہ مبہم اور مجمل ہے اور وہ عقل والی شخصیت پر دلالت کرتا ہے اور خصوص و عموم دونوں کا احتمال رکھتا ہے اور اصول فقہ کی مشہور کتاب التوضیح والتلویح ص ۱۵۹ میں بھی اس کی تصریح ہے کہ کلمہ من خصوص اور عموم دونوں کے لیے آتا ہے۔

قارئین کرام! آپ قرآن کریم، صحیح احادیث اور ائمہ تفسیر اور علماء عربیت کی واضح عبارت سے یہ معلوم کر چکے ہیں کہ حرف من تعمیم کے لیے نص قطعی نہیں ہے اور اسی پر فریق ثانی کے استدلال

کی عمارت قائم تھی جو اس بحث کے بعد بیوند زمین ہو جاتی ہے کیونکہ حرف من تخصیص کے لیے بھی آتا ہے اور ادب عربی کے ساتھ تعلق رکھنے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ بہت کم ایسے مقامات ہوں گے جہاں اندرونی اور بیرونی قرائن سے حرف من سے حقیقی تعمیم مراد لی جائے۔ حضرت شاہ ولی نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے (اور قرائن و شواہد کی روشنی میں ان کا دعویٰ بیجا نہیں ہے)

الاصول فی العمومات التخصیص بمعانی سبب المقام (تفہیمات الہیہ ج ۱ ص ۲۵)  
 کہ عمرات میں قاعدہ اور اصل یہی ہے کہ ان میں مقام اور محل کے مناسب تخصیص مراد لی جائے گی۔ قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ عام کو مطلقاً خاص پر حمل کیا جائے گا، امام شافعی اور دیگر ائمہ اصول کا یہی مسلک ہے، وهو الحق (رسید جلد ۱ ص ۱۹۵) مبارکپوری صاحب بجا کہ قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ مطلق کو مقید پر اور عام کو خاص پر حمل کرنا واجب ہے اور یہی قوی ترین مذہب ہے (تحفۃ الاحق جلد ۲ ص ۶۳) اور نواب صاحب بھی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ درحقیقت از باب تخصیص است (افادۃ الشیوخ ص ۱۵) اور مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ خاص عام پر اور مقید مطلق پر مقدم ہوتا ہے، ان تمام حوالوں اور دلائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میر صاحب کا ہر نماز میں لفظ ہر پر اور مبارکپوری صاحب اور مولف خیر الکلام کا حرف من پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھنا باطل ہے اور اس سے امام مقتدی، منفرد اور ہر نمازی ہی مراد لینا صحیح نہیں ہے بلکہ اس سے صرف امام اور صرف منفرد مراد لینا بھی یقیناً صحیح ہے۔ مولف خیر الکلام نے ان ٹھوس اور صریح حوالوں سے انتہائی ناراض اور تنگدل ہو کر بلکہ گھبرا کر جو مخفی تلاش کیا وہ یہ ہے۔  
 ۱۔ مولف "احسن الکلام" نے یہ تو تسلیم کر لیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے مگر اپنی طرف سے یہ اعتراض کیا ہے کہ حدیث عام ہے یعنی مقتدی، امام اور منفرد سب کو شامل ہے اس میں خاص مقتدی کا ذکر نہیں اور نہ خلف الامام کا ذکر ہے۔

۲۔ دوسرے لفظوں میں ان کا یہ مطلب ہوا کہ یہ حدیث لغو اور بیکار ہے کیونکہ اس میں حکم عام ہے نہ منفرد کا ذکر ہے نہ امام کا اور نہ مقتدی کا۔

۳۔ حنفیوں کی معتبر کتاب حسامی میں ہے کہ عام کا حکم یہ ہے کہ جتنے افراد کو وہ لفظ شامل ہو ان تمام کو عام کا حکم قطعی اور یقینی طور پر شامل ہوتا ہے خاص و عام میں کوئی فرق نہیں اور یہی ہمارا



مذہب ہے۔

۴۔ حنفیوں کی بہترین کتاب توضیح میں ہے کہ ہمارے اور اہم شافعی کے نزدیک عام جمیع افراد میں حکم واجب کرتا ہے یعنی عام کے حجت ہونے میں حنفی اور شافعی متفق ہیں۔

۵۔ توح میں ہے کہ عام کے حجت ہونے پر امت کا اجماع ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ صحابہؓ اور غیر صحابہؓ سے عموماً اسے استدلال کرنا ثابت اور مشہور و معروف ہے۔

۶۔ حرف من کی دلالت عموم پر قطعی ہے کیونکہ من عموم کے لیے موضوع ہے اور بدول قرینہ لفظ اپنے اصل معنی پر قطعاً دلالت کرتا ہے۔

۷۔ مولف احسن الکلام نے جو حوائے نقل کئے ہیں ان تمام سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حرف من میں بسا اوقات تخصیص بھی مراد ہو سکتی ہے اور اصل میں من عام ہے مگر یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ لفظ من عام و خاص دونوں کے لیے موضوع ہے یا دونوں اس میں اصل ہیں۔

۸۔ مولف احسن الکلام کی اس جگہ روش مرزائیوں کی سی ہے کہ وہ لَآ نَبِيَّ بَعْدِي کی حدیث میں جمیع افراد کی نفی مراد نہیں لیتے حالانکہ اس میں ہر قسم کی نبوت کی نفی ہے۔

۹۔ قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ جمہور کا مذہب ہے کہ عموم کے لیے ایسے الفاظ ہیں جو اس کے لیے حقیقہ موضوع ہیں وہ اسماء شرط اور اسماء استفہام اور اسماء موصولات ہیں (ارشاد الفحول ص ۱)

۱۰۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ من جنس کے لیے موضوع ہے ان کے نزدیک بھی یہاں عام ہونا چاہیے کیونکہ صفت عام ہے نہ من اور نور الانوار ص ۵۷ میں ہے کہ کوئی شخص یہ کہے ہن شاء من عبیدی العتق فهو حرّ فثا و اعتقوا (جو شخص کے میرے غلاموں میں سے جو آزاد ہونا چاہے وہ آزاد ہے اگر وہ چاہے گے تو آزاد ہو جائیں گے الخ) (محصلہ خیر الکلام از ص ۵۷ تا ص ۵۸)

الجواب :- ترتیب وار ہر ایک شق کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ راقم نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ یہ حدیث عام ہے اور یہ اہم و منفرد اور مقتدی سب کو شامل ہے جیسا کہ مولف خیر الکلام نے غلط بیانی سے کام لیا ہے، راقم تو اس حدیث کو عام مانتا ہی نہیں بلکہ یہ کہتا ہے کہ یہ اہم و منفرد کے ساتھ خاص ہے اور اسی لیے حرف من کی تخصیص کی یا حوالہ بحث درج کی ہے کہ وہ عموم میں محکم اور نص نہیں ہے راقم نے تو یہ لکھا ہے کہ اس روایت سے فریق ثانی کا

استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ دعویٰ خاص اور دلیل عام ہے نہ اس میں مقتدی کی قید موجود ہے اور نہ خلف اللہ کی الخ اور دلیل کو بھی اس لیے عام کہا کہ فریق ثانی اس کو عام کہتا ہے اور یہ لفظ عام بھی صرف الزامی طور پر استعمال کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ مؤلف خیر الکلام کو حدیث کے عام ہونے اور مقام استدلال میں دلیل کے عام ہونے کے واضح فرق کو سمجھنے کی توفیق بخشے گا۔

ایں دعا ہ از من و از جملہ جہاں آمین یاد

۲۔ یہ بھی خوب کسی کہ حدیث لغو اور بیکار ہے (معاذ اللہ تعالیٰ) اپنے ناخواندہ حواریوں کو بھڑکانے کا کیا ذرا ڈھنگ ہے، راقم جب چلا چلا کہ یہ کہتا ہے کہ اس حدیث کا مصداق ہی صرف امام اور مفرد ہیں، اندرونی اور بیرونی مٹوس دلائل سے مقتدی اس میں داخل نہیں تو انصاف سے فرمائیے دلیل طیکہ فریق ثانی انصاف کی قدر کرتا ہو کہ راقم کے نزدیک یہ حدیث لغو اور بیکار کیونکر ہوئی؟ اور راقم نے یہ کب تسلیم کیا ہے کہ اس میں حکم عام ہے جس پر مؤلف "خیر الکلام" نے بلاوجہ حاشیہ آرائی کی ہے۔

۳۔ حامی کا حوالہ مؤلف مذکور کو مفید نہیں کیونکہ نزاع اس میں نہیں کہ عام اپنے افراد کو قطعی طور پر شامل ہے یا نہیں؛ بلکہ نزاع اس میں ہے کہ حرف من عموم کے لیے موضوع ہے یا جنس اور ابہام کے لیے موضوع ہے؟ جب کسی لفظ کو عام تسلیم کر لیا جائے تو اس کا اپنے افراد پر شمول قطعی ہو گا مگر حرف من ایسا نہیں۔

۴ و ۵۔ توضیح و تلویح کے حوالے بھی مؤلف خیر الکلام کو سود مند نہیں ہیں کیونکہ نہ تو عام کے حجت ہونے میں اختلاف ہے اور نہ لفظ عام کے اپنے جمیع افراد میں حکم واجب کرنے میں یہ دونوں باقیں محل نزاع سے خارج ہیں۔ نزاع صرف اسی میں ہے کہ حرف من عموم میں محکم اور قطعی ہے یا نہیں؟ ۶۔ ہم باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ حرف من عموم میں محکم اور قطعی نہیں بلکہ یہ مبہم ہے اور موصولات عموم کے لیے موضوع نہیں ہیں اور حافظ ابن ہمام اپنی دقیق کتاب میں تحریر فرماتے ہیں۔

هل الصيغ من اسماء الشرط والاستفهام والموصولات والمحلل والمنفية والجمع باللام والاضافة موصولة للعموم على الخصوص او مجاز فيه او مشتركة  
کیا اسماء شرط، استفهام، موصولات، محلی، منفی، جمع باللام اور اضافات کے صیغے علی الخصوص عموم کے لیے موضوع ہیں؟ یا اس میں مجاز ہیں؟ یا مشترک ہیں؟ اس میں اختلاف ہے، امام ابو الحسن اشعریؒ نے قاضی ابوبکر



وتوقت الاشعری مرة كالقاضي و  
 الباقی فی طر ح کبھی تو وقت کیا اور کبھی اشتراک  
 مرة بالاشتراك ۱۷۔ (التحریر طبع مصر) کے قابل ہوئے۔

ملاحظہ کیجئے کہ علم عربیت کے پہاڑ اور ماہر اہم بھی موصولات وغیرہ کے بارے میں جتنی طور پر یہ کہنے  
 سے قاصر ہیں کہ وہ قطعاً عموم کے لیے موضوع ہیں۔ کوئی تو عموم کے لیے ان کی وضع کو مجازی کہتے ہیں اور  
 کوئی اشتراک اور وقت کے قابل ہیں پھر بھلا مولف خیر الکلام کے اس دعویٰ کو کون سنتا اور مانتا ہے کہ من  
 عموم کے لیے موضوع ہے جب عموم کے لیے وضع ہی نہیں اور کم از کم ائمہ عربیت کا اس میں شدید رد قوی  
 اختلاف ہے تو حرف من کی عموم میں قطعیت کا دعویٰ باطل ہے اور جب قطعی طور پر اس کا معنی عموم ہے  
 ہی نہیں تو قرینہ اور غیر قرینہ کا کیا سوال؟ جس کے پیچھے مولف خیر الکلام پڑے ہوئے ہیں اور خصوص  
 کے لیے قرینہ کے طالب ہیں۔

۷۔ جب مولف خیر الکلام کو اس کا اقرار ہے کہ حرف من میں لبا اوقات تخصیص بھی مراد ہو سکتی  
 ہے تو انہیں کے اس اقرار کے موافق یہاں حرف من سے خاص مراد ہے یعنی اہم اور منفرد تاکہ دیگر  
 صحیح اور صریح دلائل سے تعارض بھی نہ ہو اور فضا عدا کی زیادت بھی بر محل ثابت ہے۔

۸۔ مولف خیر الکلام کا رویہ بھی رافضیوں سے کسی طرح کم نہیں کہ وہ دیگر تمام نصوص سے انماض  
 کر کے محض سینہ زوری سے تَبَيَّنَا لِكُلِّ شَيْءٍ میں لفظ کل کے عموم پر اصرار کر کے اپنے ائمہ کے  
 لیے مَا كَانَ وَمَا يَكُون کا علم غیب ثابت کرنے پر کمر بستہ ہیں (ملاحظہ ہو اصول کافی جلد ۱  
 ص ۱۸۱) باقی حدیث لابی بعدی نکرہ لقی کے پیچھے داخل ہے جس کا حکم واضح ہے۔

۹۔ قاضی شوکانی کا یہ دعویٰ کہ جمہور کے نزدیک موصولات وغیرہ عموم کے لیے وضع ہیں مسموع  
 نہیں کیونکہ ہم باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ یہ عموم کے لیے موضوع ہی نہیں اور ائمہ فن کا اس میں  
 خاصا اختلاف ہے علاوہ ازیں تلویح ص ۱۶ میں اس کی تصریح ہے کہ حرف من کی چار قسمیں  
 ہیں شرطیہ، استفہامیہ، موصولہ اور موصوفہ پہلی دونوں قسموں میں وہ عموم کے لیے اور دوسری دونوں  
 قسموں میں (یعنی موصولہ اور موصوفہ ہونے کی صورت میں) عموم اور خصوص دونوں کیلئے

استعمال ہوتا ہے اور حدیث زیر بحث میں حرف من نہ شرطیہ ہے اور نہ استفہامیہ چنانچہ محقق نہیں  
 ہے لہذا اگر حرف من اپنی پہلی دو قسموں کے اعتبار سے عام بھی ہو تو جمہور کا یہ ارشاد بجا ہے لیکن

حدیث مذکور میں مَنْ یا موصول ہے یا موصوف اور اس میں عموم و خصوص دونوں مراد ہو سکتی ہے اور یہاں صحیح اور ٹھوس دلیل کے پیش نظر خصوص مراد ہے اور اس عبارت سے بھی واضح ہو گیا کہ مطلق حرف مَنْ عموم کے لیے وضع نہیں اس کی بعض اقسام عموم کے لیے ہیں اور بعض خصوص کے لیے اس لحاظ سے بھی وہ علی الاطلاق عموم میں نص اور محکم نہ رہا اور یہی ہم کہتے ہیں۔

۱۰۔ نور الانوار کے حوالہ میں جو عموم آیا ہے تو بلاشبہ وہ درست ہے ایک تو اس لیے کہ اس میں حرف مَنْ شرطیہ ہے اور ابھی گزر چکا ہے کہ وہ استعمال میں عام ہوتا ہے اور دوسریاں مشیت کے فعل کی اسناد میں عبیدہ کی جمع کی طرف کی گئی ہے اور وہ عام ہے اور مَنْ بیانیہ ہے بخلاف حدیث مذکور کے کہ اس میں لَمْ یَقْرَأْ فعل کی اسناد حرف مَنْ کی طرف ہے جو موصول یا موصوف ہونے کی وجہ سے عموم و خصوص دونوں کے لیے ہوتا ہے اور یہاں خصوص کے لیے آیا ہے جس کی مفصل بحث کتاب میں مذکور ہے غرض کہ نہ تو یہاں حرف مَنْ عام ہے اور نہ اس کی صفت عام ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام کو دھوکہ ہوا ہے اور اگر بالفرض عام بھی ہو تو بھی فصاعداً وغیرہ کے قرینہ سے اس سے خاص منفرد ہی لیا جاسکتا ہے چنانچہ خود مؤلف خیر الکلام نے ایک جگہ لکھا ہے کہ پس یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ جو حدیث عام ہے، اس سے مراد بھی خاص مقتدی ہی لیا جائے۔ انتہی بلطفہ (۲)

تو یہاں اس عام سے خاص منفرد لینے میں کیا رکاوٹ ہے؟ مؤلف خیر الکلام نے ص ۸۳ میں بحوالہ نور الانوار ص ۹۷ یہ لکھا ہے کہ اگر نکرہ کی صفت عام ہو تو عام ہو جاتا ہے اھ مگر یہ قاعدہ تمام احناف کے ہاں مسلم نہیں ہے، اس پر اباب اصول نے خاصی بحث کی ہے۔ توضیح و تلویح وغیرہ میں اس پر سیر حاصل بحث موجود ہے۔ اور علامہ تفتازانی لکھتے ہیں کہ۔

والقول بعموم التکرۃ الموصوفۃ مما نکرہ موصوفہ کے عموم میں بہت سے علماء حنفیہ نے قدح فیہ کثیر من العلماء الحنفیۃ اھ کلام کیا ہے۔

(التلویح ص ۹۶)

مؤلف مذکور اور اُن کی جماعت پر لازم ہے کہ وہ صرف نور الانوار ہی کو نہ دیکھا کہ میں کیونکہ وہ تو برائے درس طلبہ بڑی مختصر سی کتاب ہے اس میں تمام تفصیل موجود نہیں ہوتیں دیگر اصول کی کتابوں کو بھی اگر بن پڑے تو (اگرچہ میں تو وہ دقیق اور مشکل ہی) پڑھا کریں تاکہ حقیقت



منکشف ہو جائے۔

جواب دوم :- جب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ حروف من عموم میں نص قطعی نہیں تو اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ حدیث کس کے حق میں ہے؟ اہم اور منفرد کے بارے میں یا مقتدی کے حق میں؟ سو اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم اسی حدیث کے تمام طرق پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں شاید کہ کوئی سراغ مل جائے چنانچہ یہ بات زبانِ زدِ خلاق ہے جو بندہ یا بندہ، جب ہم نے دیکھا تو اسی حدیث میں یہ زیادت بھی مل گئی۔ **لَا صَلَوةَ لِمَنْ لَمْ يَقْدَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَصَاعِدًا** کہ جس شخص نے سورۃ فاتحہ اور اس سے زیادہ کچھ اور نہ پڑھا تو اس کی نماز نہ ہوگی اگر فریق ثانی کے نزدیک مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ اور فصاعداً اس کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنا جائز ہے تو یہ حکم مقتدی کو بھی شامل ہے، ورنہ یہ حدیث صرف اور صرف اس شخص کے بارے میں ہوگی۔ جس کو سورۃ فاتحہ کے ساتھ فصاعداً کچھ اور بھی پڑھنا ضروری ہے اور وہ صرف امام یا صرف منفرد ہے اس سے مقتدی ہرگز مراد نہیں کیونکہ فریق ثانی کے نزدیک بھی مقتدی کو سورۃ فاتحہ کے علاوہ اور کچھ بھی پڑھنا جائز نہیں ہے تو اس فصاعداً کی زیادت نے یہ بات متعین کر دی ہے کہ حروف من سے مراد امام یا منفرد ہے مقتدی اس سے یقیناً خارج ہے۔ یہ زیادت بطریق اہم معمر صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۶۹ والیو خوانہ ص ۱۲۳ اور نسائی جلد ۱ ص ۱۶۸ وغیرہ میں لیس صحیح مروی ہے صحیح مسلم اور الیو خوانہ کی سند کے صحیح ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا نسائی کے روایہ ہیں۔ (۱) سوید بن نصر اہم نسائی انکو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور ان کو متقن لکھتے ہیں، مسلم ان کو ثقہ کہتے ہیں، تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۸ (۲) عبد اللہ بن مبارک ان کا ترجمہ جلد اول کے مقدمہ میں گذر چکا ہے (۳) اہم معمر بن راشد ان کا ترجمہ بھی جلد اول باب اول میں گذر چکا ہے۔ (۴) اہم زہری ان کا ترجمہ بھی جلد اول کے مقدمہ میں گذر چکا ہے (۵) حضرت محمود بن الرزیح، آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر پانچ سال کی تھی ابن حبان ان کو صحابہ میں لکھتے ہیں ابو حاتم کا بیان ہے کہ انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا ہے لیکن صحبت حاصل نہیں کر سکے، اہم علی ان کو ثقہ اور من کبار التابعین کہتے ہیں اور یہ حضرت عبادہ بن الصامت کے داماد تھے۔

(تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۶۳) (۶) حضرت عبادہ بن الصامت جلیل القدر صحابی تھے  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی خالہ حضرت ام مرام بنت طحان ان کے نکاح میں تھیں۔ (دیکھئے  
ہامش بخاری جلد ۱ ص ۳۹۱ وغیرہ)

اختر ارض ۱۔ فصاعداً کی اس زیادت کے سلسلہ میں جو اعتراضات اس ناچیز کی نگاہ سے گذرے  
ہیں یہ ہیں (۱) فصاعداً کی زیادت نقل کرنے میں اہم معمر متفرد ہیں (جزء القراءة ص ۱ کتাব  
القراءة ص تلخیص الجبیر ص ۵ تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۳۲ و البکار  
المنن ص ۱۲۲ اور مؤلف خیر الکلام نے بھی اہم بخاری کے حوالہ سے اس کو شاذ کہلے ہے ص ۱۸) (۲) اگر  
یہ زیادت صحیح بھی ہو تب بھی اس سے مازاد علی الفاتحہ کا وجوب ثابت نہیں ہوگا۔ اور اس  
حدیث میں فصاعداً کی زیادت اس لیے بیان کی گئی ہے تاکہ یہ وہم دور ہو جائے کہ شاید صرف  
فاتحہ ہی پڑھنی چاہیے جیسے تقطع الید فی ربع دینار فصاعداً میں ہے (جزء القراءة  
ص فتح الباری جلد ۲ ص ۱۹۳ و تحقیق الکلام و البکار المنن وغیرہ) (۳) مبارک پوری  
صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم  
نے ایک مرتبہ دو رکعت نماز پڑھائی اور ان میں سورۃ فاتحہ ہی پڑھی (فتح الباری جلد ۲ ص ۲۰۲۔  
کتاب القراءة ص ۱ و مسند احمد جلد ۱ ص ۲۴۳ وغیرہ) اگر مازاد واجب ہوتا تو آپ کیوں  
مازاد اور فصاعداً کو ترک کرتے لہذا فصاعداً واجب نہ ہوا (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۴  
رم ۱ موصوف لکھتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ سورۃ فاتحہ سب نمازوں میں کافی  
ہے اگر زیادہ ہو جائے تو بہتر ہے (کتاب القراءة ص ۱) معلوم ہوا کہ مازاد علی الفاتحہ واجب  
نہیں ہے (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۴) (۵) موصوف لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجرؒ نے اس  
پر اجماع نقل کیا ہے کہ مازاد علی الفاتحہ واجب نہیں ہے (فتح الباری جلد ۲ ص ۲۰۲) اور  
یہ نقل اجماع اس بات کی دلیل ہے کہ مازاد علی الفاتحہ واجب نہیں ہے (تحقیق الکلام ص ۱۴)  
(۶) اہم شہقی لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا اہل القرآن عوض من  
غیرہا و لیس غیرہا عوض منہا (کتاب القراءة ص ۱ و مستدرک جلد ۱ ص ۲۳۸) کہ  
سورۃ فاتحہ باقی تمام سورتوں کا عوض ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی اور سورت اس کا عوض نہیں



ہو سکتی لہذا سورہ فاتحہ کا پڑھنا ہی کافی ہے اور فصاعدا کی حاجت نہ ہوگی کیونکہ جو  
کل الصيد فی جوف القراءۃ ہیں وہ اعتراضات جو فصاعدا کی زیادت کو رد کرنے یا  
غیر ضروری ٹھہرانے کے لیے کئے گئے ہیں۔

جواب :- ان جملہ اکابر اور حضرات نے فصاعدا کی زیادت کے سلسلے میں جو اعتراض کئے  
ہیں ٹھوس دلائل اور واضح براہین کی بناء پر وہ باطل اور بے بنیاد ہیں علی الترتیب وار  
سب کے جوابات سن لیجئے۔

۱۔ ان اکابر کا یہ دعویٰ کہ فصاعدا کی زیادت بیان کرنے میں معمر متفرد ہیں خود ان کے قواعد  
اور مسلمات کے خلاف ہے۔ اولاً اس لیے کہ معمر بالاتفاق ثقہ، ثبوت اور حجت ہیں اور ثقہ کی زیادت  
بالاتفاق قابل قبول ہوتی ہے جس کی پوری تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ پھر یہ خلاف اصول دعویٰ  
کون سنتا ہے کہ معمر کا تفر و مضرب و ثانیاً امام زہری کے تمام تلامذہ میں معمر زیادہ قابل اعتماد  
اور (اثبت الناس فی الزہری) ہیں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس لیے قاعدہ اور ضابطہ  
کے پیش نظر معمر کی یہ زیادت صحیح اور معتبر ہے اور جن راویوں نے یہ زیادت نقل نہیں کی اصل  
قصور ان کا ہے و ثالثاً فصاعدا کی زیادت دیگر ثقہ راویوں سے بھی مروی ہے چنانچہ یہی  
فصاعدا کی زیادت سفیان بن عیینہ سے بسند صحیح مروی ہے (البوداؤد جلد ۱ ص ۱۱۹)

علاوہ انہیں فصاعدا کی زیادت امام اوزاعی اور شعب بن ابی حمزہ سے بھی مروی ہے (کتاب  
القدۃ ص ۱۱) امام اوزاعی کا ترجمہ نقل کیا جا چکا ہے اور شعب بخاری و مسلم کے مرکزی راوی ہیں حافظ  
ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور عابد تھے (تقریب ص ۱۶۹) مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اس کی سند  
میں احمد بن حارون مستملی ہے۔ ذہبی فرماتے ہیں کہ ثقہ راویوں سے منکر روایتیں بیان کرتا ہے (الاصحاح ص ۱۸)

۲۔ سند کے راوی یہ ہیں قتیبہ بن سعید و ابن السرح، سفیان بن عیینہ، امام زہری، محمود بن ریح، حضرت عبادہ بن، ان تمام کی توثیق  
پنپے اپنے موقع پر نقل کی جا چکی ہے اور ان میں ہر ایک ثقہ اور ثبوت ہے مولف خیر الکلام نے یہ بیکار بہانہ کیا ہے کہ امام البوداؤد  
قتیبہ اور ابن السرح کے طریق سے یہ زیادت نقل کرتے ہیں مگر دوسری کتابوں میں قتیبہ کی یہ زیادت نہیں لہذا ابن السرح متفرد  
ہیں (مصدقہ ص ۱۸) مگر یہ کوئی جواب نہیں کیونکہ دوسری کتابوں میں نہیں تو نہ سہی البوداؤد میں تو بسند صحیح دونوں سے مروی ہے

الجواب :- خود مولف مذکور کے قلم سے وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ان کے بعض راوی اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی حرج نہیں ہے بلفظہ (خیر الکلام ص ۳۱) اور یہی فصاعداً کی زیادت عبد الرحمن بن اسحاق مدنی سے بھی مروی ہے (کتاب القراءۃ ص ۱) وفصل الخطاب ص ۱) اور جلد اول باب دوم حدیث ۱۲ میں ان کا ترجمہ نقل کیا جا چکا ہے اور ان کے علاوہ یہی فصاعداً کی زیادت صالح بن کیسان سے بھی منقول ہے (معدۃ القاری جلد ۳ ص ۶۹) اور صالح بن کیسان ثبت اور فقیہ تھے (تقریب ص ۱۴۱) مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ علامہ عینی نے خواہ نہیں دیا (محصلا ص ۸۸) الجواب :- اگر اس میں کچھ کمزوری بھی ہوئی تب بھی متابعت میں پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور خود مولف مذکور اس کے قائل ہیں کہما مت۔

آپ نے دیکھ لیا کہ فصاعداً کی زیادت کو امام معمرؒ، امام صفیان بن عیینہؒ، امام اوزاعیؒ، امام شعبہؒ بن ابی حمزہؒ، امام عبد الرحمن بن اسحاق مدنیؒ اور امام صالح بن کیسانؒ جیسے جلیل القدر ائمہ حدیث اور ثقات و حفاظ نقل کرتے ہیں مگر فریق ثانی کا یہ پادر ہوا دعویٰ ہے کہ اس زیادت کے نقل کرنے میں معمرؒ متفق ہیں اور دوسرے ثقات ان کی مخالفت کرتے ہیں فوا سفا۔ فصاعداً کے بجائے حضرت ابوسعید الخدریؒ سے مرفوع روایت میں ماتیسر کی زیادت بھی مروی ہے (البدایہ جلد ۱ ص ۱۸) مستد احمد جلد ۳ ص ۵۴ سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۲ اور معرفت علوم الحدیث ص ۹ وغیرہ) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اس کی سند قوی ہے وفتح البیاری جلد ۲ ص ۲۱) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ اسناد صحیح (تلخیص الجید ص ۸۸) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ماتیسر کی زیادت بخاری اور مسلم کی شرط پر صحیح ہے (شرح المہذب جلد ۳ ص ۳۲۹) قاضی شوکانیؒ، امام ابن سید الناسؒ سے (جو الشیخ العلامة، المحدث، الحافظ، الادیب اور البارع تھے۔ تذکرہ جلد ۴ ص ۲۸۵ نقل کرتے ہیں کہ اسناد صحیح و رجالہ ثقات۔

رسائل الاوطار جلد ۲ ص ۱۱) اس کی سند صحیح اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ نواب صاحبؒ بھی اس زیادت کی تصحیح نقل کرتے ہیں وفتح البیان جلد ۳ ص ۴۲) مولانا ثمن الحق صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجرؒ، امام ابن حبانؒ اور علامہ ابن سید الناسؒ وغیرہ اس کی تصحیح کرتے ہیں۔ (معون المعبود جلد ۳ ص ۳) حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم



نے حکم دیا کہ جاکر لوگوں میں یہ اعلان کرو کہ ان لاصلاۃ الا بقراءة فاتحة الكتاب وما تيسر  
(موارد النظار ص ۱۲۶)

حضرات! فن روایت میں اس سے بڑھ کر کسی روایت کی صحت ناممکن ہے فصاعداً  
لورما تيسر کے علاوہ مازاد کی زیادت بھی مروی ہے (جزء القراءة ص ۳۱، کتاب القراءة  
ص ۱۲ مستدرک جلد ۱ ص ۲۳۹ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۳۱ وغیرہ) رہا مبارکپوری  
صاحب کا یہ اعتراض کہ اس میں جعفر بن میمون ضعیف ہے (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۳۳ جلد  
ص ۳۳ وایکار المنن ص ۱۲۲) تو یہ کوئی وقعت نہیں رکھتا اہم حاکم ان کو بصرہ کے ثقافت میں لکھتے  
ہیں۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور جعفر ثقہ ہیں (مستدرک مع التلخیص جلد ۱  
ص ۲۳۹) ابن معین ان کو ثقہ اور صالح الحدیث کہتے ہیں۔ دارقطنی ان کو معتبر کہتے ہیں۔ ابن عدی  
کہتے ہیں کہ ان کی کوئی روایت منکر نہیں ہے ابن حبان اور ابن شامہ ان کو ثقافت میں لکھتے ہیں  
(میزان جلد ۱ ص ۱۹۲) و تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۹۱ فصاعداً، ماتیسر اور مازاد  
کے علاوہ اور بھی متعدد الفاظ ایسے ہیں جو مازاد علی الفاتحة کی اصلیت پر وضاحت و دلالت  
کرتے ہیں اندر اس حالات اس زیادت کا انکار کرنا تعصب کے علاوہ سراسر اصول شکنی اور مسلمات کی  
خلاف ورزی ہے جو قطعاً قابل قبول نہیں۔

لہ ایک روایت میں وسورة معها کی زیادت ہے (ترمذی جلد ۱ ص ۳۲) ابن ماجہ ص ۱۱ اور ایک روایت میں وآیتین  
وثلاث کی زیادت ہے (جزء القراءة ص ۱۳) ایک روایت میں والسورة کی زیادت ہے (زمعی جلد ۱ ص ۳۶) ایک روایت  
میں وثلاث آیات فصاعداً کی زیادت ہے (نصب الریہ جلد ۱ ص ۲۹) ایک روایت میں وآیتین من القرآن  
کی زیادت ہے (مجمع الزوائد جلد ۱ ص ۱۱۵) ایک روایت میں ثم اقراء بما شئت کی زیادت ہے (منہ احمد جلد ۱ ص ۲۱)  
ایک روایت میں وبما شاء الله ان تقرأ کی زیادت ہے (البدو اور جلد ۱ ص ۱۳) ایک روایت میں وثنیٰ معها  
کی زیادت ہے۔ کتاب القراءة ص ۱۱۵ ایک روایت میں ثم قدأت بعامل من القرآن کی زیادت ہے (کتاب القراءة ص ۱۳)  
اور ایک روایت میں معها غیرہا کی زیادت ہے (ایضاً) اور ایک روایت میں بفاتحة الكتاب وثنیٰ  
فہی حجاج کے الفاظ ہیں (ایضاً ص ۱۳) اور ایک روایت میں الا بفاتحة الكتاب فافوق ذلك کے الفاظ  
ہیں (ایضاً ص ۱۵) اور اسی قسم کے الفاظ کتب حدیث میں اور بھی موجود ہیں مگر غور نہ کیے لیے ہم انہیں پر اکتفا کرتے ہیں۔

۲۔ فرق ثانی کا یہ کہنا کہ مازاد علی الفاتحۃ کا وجوب اور اس کی کنیت مسلم نہیں ہے یہ بھی محض اپنے دل کو عارضی تسکین پہنچانے کا سامان ہے اور ان کا مازاد علی الفاتحۃ کے وجوب کے انکار کرنا باطل ہے بلکہ اس لیے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے لا صلوة کے عمومی الفاظ کے تحت سورۃ فاتحہ اور فصاعداً (وما تیسر اور مازاد) کا حکم دیا ہے تو جیسے سورۃ فاتحہ واجب ہے اسی طرح فصاعداً اور مازاد علی الفاتحۃ بھی واجب ہے اور ہر کسی صحیح منقول یا مقول دلیل کے فصاعداً کے وجوب کا انکار کون تسلیم کرتا ہے؟ وثانیاً حضرت ابوسعید بن الخدریؓ کے حوالہ سے مرفوع اور صحیح حدیث (جس کی تصحیح پر امام نوویؒ ابن سید الناسؒ حافظ ابن حجر قاضی شوکانیؒ اور نواب صاحبؒ وغیرہ سب متفق ہیں) پہلے نقل کی جا چکی ہے اس کے پورے الفاظ یوں ہیں امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان نقرأ بفاتحة الكتاب وما تيسر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں یہ حکم دیا کہ ہم سورۃ فاتحہ اور اس کے علاوہ کچھ اور بھی جو آسانی سے پڑھا جا سکے پڑھا کریں۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ جس طرح آپؐ سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا ہے اسی طرح آپؐ ما تیسر کی قرأت کا بھی حکم دیا ہے اگر آپؐ کے حکم اور امر سے بھی وجوب ثابت نہیں ہوتا تو کس کے حکم سے ثابت ہوگا؟ وثالثاً مشہور مسئلۃ الصلوۃ کی حدیث میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائے ثم اقرأ يا امر القرآن ثم اقرأ بما شئت (مسند احمد وابن حبان، قبل السلام جلد ۱ ص ۳) پھر تم سورۃ فاتحہ پڑھو اور پھر اس کے بعد تم قرآن کا جو حصہ چاہو پڑھو اور البوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۵) میں بسند صحیح یہ روایت ان الفاظ سے مروی ہے ثم اقرأ يا امر القرآن وبما شاء الله ان نقرأ پھر تم سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی جو اللہ کو منظور ہو پڑھو۔ ان روایتوں میں آپؐ مازاد علی الفاتحۃ کی قرأت کا امر کے صیغہ (اقرأ) سے حکم دیا ہے اور اس کی پوری تحقیق پہلے ہو چکی ہے کہ امر وجوب کے لیے ہوتا اور حافظ ابن حجرؒ اسی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ امر وجوب کے لیے ہے۔

(فتح الباری جلد ۲ ص ۲۲۲) جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے صحیح اور صریح امر اور حکم کو اپنی مرضی اور خواہش سے رو کر دینا کمال کا انصاف ہے؟ ان دلائل سے معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ کے علاوہ مازاد علی الفاتحۃ کی قرأت یا بالفاظ دیگر ضد السورۃ مع الفاتحۃ



بھی واجب ہے رہا اس حدیث میں فصاعدا کی زیادت کو قطع الید فی ربع الدنیا و فصاعداً  
 (کہ چور کا ہاتھ ربع دینار اور اس سے زیادہ میں قطع کرنا چاہیے) پر قیاس کرنا تو قیاس مع الفارق اور باطل  
 ہے۔ اولاً اس لیے کہ محض عبادت کو محض عقوبت پر قیاس کرنا غلط ہے کیونکہ سورۃ فاتحہ اور اس کے  
 بعد کسی بھی سورۃ کا پڑھنا بالاتفاق عبادت اور کارِ ثواب ہے، اور ربع دینار یا اس سے زیادہ میں قطع یہ  
 کی سزا، نکال اور عقوبت ہے، اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، پھر ایک کو دوسرے پر قیاس  
 کرنا چہ معنی وار د؟ مولف خیر الکلام کہتے ہیں کہ یہ قیاس نہیں بلکہ ایک مثال کے کہ فصاعداً والی  
 ترکیب کا مفہوم واضح کرنا ہے الخ (ص ۱۳۳) کیا اس مثال کے لیے کتب حدیث کے ذخیرہ میں قطع  
 سرقہ والی حدیث ہی مثال کے لیے دستیاب ہوئی ہے اور کوئی چیز موجود نہیں؟ اور جو لوگ  
 عبادت کو عقوبت پر قیاس بھی کرتے ہیں وہ کب تمام دنیا کو چیلنج کرتے ہیں؟ اور کب دوسرے  
 فریق کے عمل کو باطل بیکار اور کالعدم قرار دیتے ہیں؟ دثانیاً چوری کے سلسلہ میں تو صرف فصاعداً  
 کا لفظ مذکور ہے اور یہاں فصاعداً۔ ماتیسر اور ما زاد وغیرہ دیگر بے شمار الفاظ وارد ہیں  
 جیسا کہ آپ بعض کا مطالعہ کر چکے ہیں اس میں نرا فصاعداً ہی نہیں تاکہ آسانی کے ساتھ اس کو  
 اس پر قیاس کر لیا جائے۔ مولف خیر الکلام اس سے یوں گلو خلاصی کرتے ہیں کہ ہماری بحث عبادہ کی  
 حدیث میں ہے دوسری احادیث زیر بحث نہیں (ص ۱۳۴) الجواب :- آخر کیوں نہیں؟ کیا وہ اس  
 باب کی حدیثیں نہیں ہیں؟ بات واضح ہے کہ چونکہ وہ صحیح بھی ہیں اور ان میں حرف واو کے ساتھ  
 (جو مغائرت کے لیے ہوتا ہے) و ہائیں تر وغیرہ آیا ہے جن کو مولف مذکور کا معرہ، مضم نہیں کہہ  
 سکتا اس لیے وہ زیر بحث نہیں و ثانیاً اگر اس قیاس کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ ہمیں  
 مضر نہیں ہے کیونکہ جیسے ربع دینار ادنیٰ نصاب ہے جس میں ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور فصاعداً  
 میں بطریق اولیٰ کاٹا جائے گا، اسی طرح سورۃ فاتحہ اقل درجہ کا واجب ہے اور ما زاد علی الفاعلۃ  
 کامل اور مکمل واجب ہوگا۔ و ثالثاً جب اصل مقیس علیہ ربع دینا ہی حنفیہ وغیرہ کے نزدیک مختلف  
 فیہ ہے تو اس پر قیاس کرنے کا کیا مطلب؟ و خامشاً یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ نص کی موجودگی  
 میں قیاس باطل ہے۔ اور جمہور کی طرف سے مقتدی پر فاتحہ کے نہ ہونے کی صحیح اور صریح حدیثیں پیش  
 کی جا چکی ہیں جو اس مسئلہ میں نص ہیں۔ مولف خیر الکلام نے لفظ فصاعداً پر ضرورت سے زیادہ

لاطلاع بحث کی ہے جس میں کام کی بات ایک بھی نہیں اس لیے ہم قارئین کرام کے ذہن کو پریشان نہیں کرتے

۳۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے طریق سے جو روایت پیش کی گئی ہے وہ نہایت ہی کمزور اور ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں حنظلہ سدوسی نامی راوی ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ امام یحییٰ القطانؒ نے فرمایا کہ میں نے عمداً اس کو ترک کر دیا تھا اور بعد کو وہ مختلط بھی ہو گیا تھا (ضعفاً ضعیفاً) امام نسائیؒ لکھتے تھے کہ وہ ضعیف تھے (ضعفاً ضعیفاً امام نسائی ص ۱۷۱) امام احمدؒ اس کو منکر الحدیث اور ابن معینؒ اس کو لیس ہشٹی کہتے ہیں (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۲۹۲ والجوہر النقی جلد ۲ ص ۶۱) محدث میمونؒ، امام ابو عبد اللہؒ سے اس کی تضعیف نقل کرتے ہیں۔ ابو حاتمؒ اس کو لیس بالقوی کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ اس کو ضعیفاً لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ایسے مختلط ہو چکے تھے کہ ان کی اگلی اور پچھلی سب روایتیں غلط ہو چکی تھیں کہ ان میں تمیز نہیں ہو سکتی (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۶۱) یہ ہے وہ روایت جس سے مبارکپوری صاحب فصاعداً، مائیسر اور ما زاد وغیرہ کی صحیح زیادت کو رد کرتے ہیں تعجب اور حیرت ہے، اس انصاف پر حضرت ابوہریرہؓ سے بھی ایک روایت مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص آیا اور اس نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوال کیا یا رسول اللہ اُتیت ان لم یکن معی الا امر القرآن قال ہی حسبک ہی السبع المثانی (کتاب القراءة ص ۱) یا رسول اللہ یہ فرمایئے کہ اگر مجھے سورۃ فاتحہ کے علاوہ اور کوئی سورت یاد نہ ہو تو میں کیا کر دوں؟ آپ نے فرمایا یہی تجھے کافی ہے کیونکہ یہ سبع مثانی ہے لیکن اس کی سند میں ابراہیم بن فضل مدنیؒ ہے امام احمدؒ اور ترمذیؒ اس کو ضعیف الحدیث کہتے ہیں ابن معینؒ کہتے ہیں لیس حدیثہ ہشٹی امام بخاریؒ اس کو منکر الحدیث اور ابو حاتمؒ ضعیف الحدیث اور منکر الحدیث کہتے ہیں ابو زرہؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں نسائیؒ اس کو لیس بشقہ اور منکر الحدیث کہتے ہیں ابو احمد حاکمؒ کہتے ہیں کہ وہ محدثین کے نزدیک قوی نہیں ہے، دارقطنیؒ اور ازدمیؒ اس کو متروک کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۵۱) الخرض ما زاد علی الفاتحہ کی تفسیر پر صریح، صحیح اور مرفوع روایت موجود نہیں ہے بخلاف اس کے ما زاد، مائیسر اور فصاعداً کی روایتیں بالاتفاق صحیح صریح اور مرفوع ہیں پھر ان کا انکار محض تعصب ہے۔



۴۔ مبارکپوری صاحب نے کفایت سورۃ فاتحہ پر حضرت ابوہریرہؓ کی جو روایت پیش کی ہے۔ وہ ان کے لیے ہرگز مفید مطلب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ حضرت ابوہریرہؓ پر موقوف ہے اور کسی مرفوع اور صحیح روایت میں اس قسم کے الفاظ منقول نہیں ہیں (دیکھئے فتح المسلمین جلد ۲ ص ۳۱ وغیرہ) اور موقوفات صحابہ کے بارے میں فریق ثانی کا مسک نقل کیا جا چکا ہے کہ در موقوفات صحابہ محبت نیست اگرچہ بصورت رد و ثانیاً یہ تو ان موقوفات کا حکم ہے جو بظاہر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مخالف نہ ہوں اور یہاں تو یہ قول فصلاً، ماتیسراً اور ما زاد کے مخالف ہے پھر یہ کیسے محبت ہو گا؟ بجائے اس کے کہ خود اس موقوف اثر کا کوئی مناسب اور صحیح محل بیان کیا جائے اس کو مرفوع حدیث کے مقابلہ میں پیش کرنا عجیب تر بات ہے۔

۵۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اہم قرطبیؒ اور ابن حبانؒ وغیرہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت بالاجماع نہیں ہے لیکن حافظ موصوفؒ ان پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں فیہ نظر لثبوتہ عن بعض الصحابۃ ومن بعدہم دفعہ الباری جلد ۲ ص ۲۲۱ اجماع کا دعویٰ محل غور ہے کیونکہ بعض حضرات صحابہ کرامؓ اور بعد کے سلفؓ سے ما زاد کا وجوب بھی ثابت ہے اور حافظ ابن القیمؒ بفاتحۃ الكتاب میں حروف با کے تعدیہ سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وهذا یعطی الاقتصار علیہ ما بل یشعر بقراءة غیرہا معہا رید الیع القوائد جلد ۴ ص ۱۱ اس سے صرف سورۃ فاتحہ پر اقتصار ہی ثابت نہیں بلکہ غیر فاتحہ کی قرأت پر بھی یہ دال ہے۔ اور قاضی شوکانیؒ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:-

وهذه الأحادیث لا تقصر عن الدلالة على وجوب قرآن مع الفاتحة الى ان قال وقد ذهب الى ايجاب قرآن مع الفاتحة عمر وابنه عبد الله وعثمان بن ابی العاص والہادی و القاسم والمؤید بالله الى ان قال والظاهر ما ذهبوا اليه من ايجاب شئ من القرآن

اور یہ حدیثیں (جن میں فصلاً، ماتیسراً اور ما زاد کی زیادت موجود ہے) اس حکم پر دلالت کرنے سے قاصر نہیں ہیں کہ سورۃ فاتحہ کے ساتھ قرآن کا کوئی اور حصہ بھی واجب ہے چنانچہ حضرت عمرؓ حضرت ابن عمرؓ حضرت عثمانؓ بن ابی العاصؓ ہادیؓ قاسمؓ اور مؤید باللہؓ کا یہی مسک ہے اور ان احادیث کے پیش نظر بظاہر ان کا

یہ مسلک صحیح ہے کہ سورۃ فاتحہ کے علاوہ قرآن کریم کا کوئی اور حصہ بھی واجب ہونا چاہیے۔

حضرت مولانا شیخ الاسلام شبیر احمد صاحب عثمانی لکھتے ہیں کہ

ولهذا اوجب الحنفية قراءة الفاتحة  
وضم السورة اليها قال في البحر  
وما واجبتان للمواظبة -

ان احادیث کو مد نظر رکھ کر فقہاء احناف نے سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ کسی اور سورت (خواہ چکی سورت ہی ہو) کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔ صاحب البحر الرائق کہتے ہیں کہ چونکہ آپ نے ان پر مواظبت کی ہے۔ لہذا سورۃ فاتحہ اور اس کے علاوہ کوئی اور سورۃ دونوں

(فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۰)

واجب ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا بھی یہی مسلک ہے (فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۹) اور ابن کنازہ ماہی کا بھی یہی مسلک

ہے رہا مشنائی جلد ۱ ص ۱۵ اور امیر میانیؒ حدیث مسنی الصلوٰۃ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ فتنجب الفاتحة فی کل رکعة وتجب قراءة ما شاء معها فی کل رکعة اه (سبل السلام جلد ۱ ص ۲۸) کہ ہر رکعت میں اس کے ساتھ جتنی قرأت نمازی چاہے وہ بھی واجب ہے، اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

ووجوب السورة قول عند المالكية والحنابلة (فضل الخطاب ص ۱) یعنی

سورۃ فاتحہ کے ساتھ کسی اور سورت کا ملنا اور اس کو واجب قرار دینا مالکیوں اور حنبلیوں کا بھی ایک قول ہے، بلکہ حضرت امام شافعیؒ کی ایک عبارت سے بھی مازاد علی الفاتحة کا وجوب ہی مترشح ہوتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:-

وهو قد يحتمل ان يكون الفرض على

اور اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ جو شخص قرآن کریم کی

اچھی طرح قرأت کر سکتا ہو اس پر سورۃ فاتحہ اور ایک

من احسن القراءة قراءة ام القرآن وآية

آیت اور اس سے زیادہ کی قرأت بھی فرض ہو۔

واكثر۔ (کتاب الام جلد ۱ ص ۸۹)

اگر اتنی خدا کی دنیا کے مکمل جاننے کے بعد بھی اجماع باقی رہتا ہے تو وہ کوئی عجیب سخت

جان اجماع ہو گا۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ وضو اور غسل میں پانی استعمال کرنے کی کوئی حد اور



مقدار متعین نہیں ہے اور اس پر اجماع ہے (شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۴۸) مبارکپوری صاحب ان پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں فی دعویٰ الاجماع کلام کہ اجماع کے دعویٰ کرنے میں کلام ہے کیونکہ ابن شبحان مالکی اور محمد بن الحسن اس سے اختلاف کرتے ہیں (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۱۴۸) اہم ابن حزم ایک مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت عطاء بن عمر بن عبد الغزیز، حسن، زہری، ابو سلمہ بن عبد الرحمن اور سلیمان بن یسار اس سے اختلاف کرتے ہیں وَأَفْ لَکَلِّ اِجْمَاعٍ یُخْرِجُ عَنْهُ هَؤُلَاءُ (محلّی جلد ۲ ص ۳۷) اور حیف ہے اس اجماع پر جس سے یہ بزرگ خارج ہوں۔

قاریں کرام! آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ فرق ثانی فصاعداً، مَا تَسَّرَ اور ما زاد کی صحیح زیادت سے کیے پہلو تہی کرتا ہے اور عدم وجوب ما زاد علی الفاتحہ پر کیسی روایات استدلال کرتا ہے اور اجماع کے خوش کن الفاظ کے ہوائی قلعے میں کیے بچاؤ کا انتظام کرتا ہے مگر یہ سب کچھ کرتے ہوئے وہ اہل حدیث اور ان کے مخالف تمام صرف اہل الرائے ہیں۔ انوس اور حدافوس ہے ایسے تعصب پر۔ مؤلف خیر الکلام نے اس سے یہ غلص تلاش کیا ہے کہ ان روایات میں مقدار کا ذکر نہیں اور واجب میں تعین لازمی ہوتی ہے (محصلہ ص ۱۶۲) الجواب :- ہر واجب میں تعین غیر مسلم ہے اصول فقہ کی کتابوں (مثلاً التحریر ص ۲ اور مسلم الثبوت ص ۲۹ وغیرہ) میں اس کی تصریح موجود ہے کہ واجب میں کبھی تخیر بھی ہوتی ہے جس کو واجب مخیر کہتے ہیں جیسے قسم کے کفارہ میں متخیر اشیاء میں سے جو چاہے کرے اور جنایات حج میں بعض صورتوں میں دم (یعنی قربانی) لازم ہے ادنیٰ بکری وغیرہ ہے اور اعلیٰ کی کوئی مقدار متعین نہیں اونٹ ہو یا گائے وغیرہ اور یہاں عند البعض ادنیٰ تین آیتیں اور عند البعض ایک آیت طویلہ ہے زیادہ کی کوئی حد نہیں علاوہ انہیں ابھی امیر میانی وغیرہ کے حوالہ سے عرض کیا گیا ہے کہ وہ سورۃ فاتحہ کی قرآن کے سوا اور قرآن کو بھی واجب کہتے ہیں جو نمازی کی مرضی پر ہے ماشاء معہا اھ۔

۴۔ ام القرآن عوض عن غیرھا لکی روایت ما زاد علی الفاتحہ کی نفی پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ اولاً ایسے کہ اس کی سند میں محمد بن غلام ہے علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں - لا یدری من هو (میزان جلد ۳ ص ۵۳) معلوم نہیں کہ وہ کون اور کیسا تھا۔ ابو سعید بن یونسؒ ان کو صاحب مناکیر بتاتے ہیں (ایضاً) امام دارقطنیؒ کا بیان ہے کہ ام القرآن عوض عن غیرھا الخ کے الفاظ بیان کرنے میں محمد بن غلام متفرد ہے صحیح الفاظ

وہی ہیں جو امام زہریؒ (دوغیر) نے بیان کئے ہیں لا تجزئ صلاۃ لا یقرأ فیہا بام القرآن۔  
 (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۱۲۲) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اگرچہ محدث عجمیؒ اور ابن حبانؒ نے  
 ان کی توثیق کی ہے لیکن معند امر القرآن الخ میں محمد بن غلام نے غلطی کی ہے اور نقل بالمعنی کا ارتکاب  
 کیا ہے صحیح الفاظ وہی ہیں جو لا صلوۃ الا بفتح الکتاب سے مروی ہیں کیونکہ جہور محدثینؒ  
 جن میں حضرت امام احمدؒ ابن ابی شیبہؒ اسحاقؒ بن راہویہؒ ابن ابی عمرؒ عمرو الناقدؒ معمرؒ صالحؒ بن کسیرؒ  
 اور زعمیؒ اور یونسؒ بن یزیدؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں اس حدیث کو لا صلوۃ لمن یقرأ بفتح الکتاب  
 کے الفاظ ہی سے نقل کرتے ہیں (لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۵۱) وثانیاً اگر یہ روایت انہیں الفاظ کے  
 ساتھ صحیح بھی ہو تب بھی ما زاد علی الفاتحۃ کی نفی پر اس سے استدلال صحیح نہیں ہے اس لیے  
 کہ اس میں نہ خلط الالہام کی قید ہے اور نہ مقتدی کی تصریح ہے لہذا یہ امام اور منفرد کے حق میں ہوگی  
 اور اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے سورۃ فاتحہ کی جگہ کوئی اور سورت قائم نہیں ہو سکتی جیسا کہ  
 محققین احنافؒ کا مسلک ہے اور اس کے وجوب پر تو تمام کا اتفاق ہے اور مطلب واضح ہے کہ سورۃ فاتحہ  
 باقی تمام سورتوں کی عوض ہے مگر اس کی جگہ کوئی اور سورت قائم نہیں ہو سکتی اس کو نفی ما زاد سے  
 کیا تعلق ہے؟ اسی طرح ایک روایت ان الفاظ سے مروی ہے لا تجزئ صلوۃ لا یقرأ  
 الرجل فیہا فاتحۃ الکتاب (کتب القراءۃ ص ۱۵۱) لیکن حافظ ابن حجرؒ اور صاحب تعلیق المغنی  
 (جلد ۲ ص ۱۲۲ میں) اس کی تصریح کرتے ہیں رواہ جماعة بلفظ لا صلوۃ لمن لم یقرأ  
 وهو الصحیح وکان زیاد رواہ بالمعنی۔ (فتح الباری) کہ محدثینؒ کی جماعت اس روایت  
 کو لا صلوۃ لمن یقرأ کے الفاظ سے روایت کرتی ہے یہ زیاد بن ایوبؒ کی غلطی ہے کہ انہوں  
 نے روایت بالمعنی کا ارتکاب کر کے اس کا مطلب بدل دیا ہے اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ  
 اشہبؒ اور زیاد بن ایوبؒ کی روایت منقولۃ بالمعنی (لسان جلد ۵ ص ۱۵۱) منقول بمعنی  
 ہے۔ پہلے تو مثال کے طور پر ہم یہ سن کر کہ تھے کہ بعض لوگ لا یقرؤوا الصلوۃ کے قائل  
 ہوتے ہیں اور آگے نہیں پڑھا کرتے مگر اب تو اپنے ماتھے پر ٹپکی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ایسا  
 فرقہ بھی دیکھ لیا ہے جو کبھی تو واذا قرأنا فاصتوا کی صحیح زیادت کو کھا جاتا ہے۔ اور کبھی  
 فصاعداً۔ ما قیسر اور ما زاد کی صحیح زیادت کو ہضم کر جاتا ہے اور کبھی الاولاد الالہام



کی استثناء کہ ٹہرپ کر جاتا ہے اور اس زیادت کو اڑا کر ساری دنیا کے مسلمانوں کو یہ چیلنج کرتا ہے کہ تمہاری نماز باطل ہے، بیکار ہے، اور کالعدم ہے۔ تعجب اور حیرت ہے اس دیانت پر سو فیصدی محدثین کا اتفاق پیدے نقل کیا جا چکا ہے کہ زیادت جو ثقہ راوی سے منقول ہو وہ واجب القبول ہوتی ہے اور حافظ ابن حجرؒ بھی الانخذ بالزاید فالزاید کا ضابطہ بیان کرتے ہیں رفع الباری جلد ۲ ص ۲۲ اور اس زیادت کو بیان کرنے والے بال اتفاق ثقہ، ثبت اور حجت بلکہ اثبوت الناس فی فلاں کا مصداق ہیں مگر باوجود اس کے فرقی ثانی تمام طے شدہ اصول وضوابط کو پامال کرتا ہوا صرف اپنی ضد پر قائم ہے اعاذنا اللہ تعالیٰ منہ۔

جواب سوم :- جب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ حرف من عموم میں نص قطعی نہیں ہے اور یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اسی روایت میں صحیح اسانید کے ساتھ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فصاعداً ما تيسر اور ما زاد کی زیادت بھی مروی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ قرآن کریم کے کسی اور حصہ کی قرأت نہ کی تو اس کی نماز نہ ہوگی اور گو مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ کی قرأت کا پڑھنا اور نہ پڑھنا محل نزاع ہے لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت مقتدی کے لیے جائز نہیں اس لیے اس حدیث کا صحیح اور حقیقی مصداق صرف امام یا منفرد ہے کیونکہ سورۃ فاتحہ کے ساتھ قرآن کریم کے کسی اور حصہ کا پڑھنا صرف امام اور منفرد کے لیے ہی ضروری ہے مقتدی پر اس روایت کے مشتمل نہ ہونے کے لیے فصاعداً ما تيسر اور ما زاد کی زیادت نہ صرف کافی ہے بلکہ نص صریح ہے اور اس حدیث کا امام پر مشتمل ہونا اتفاقی امر ہے البتہ بعض حضرات صحابہ کرامؓ اور دیگر ائمہ حدیث کے بیان سے یہ بات صاف آشکارا ہوتی ہے کہ اس حدیث کا اصلی مصداق صرف منفرد اور اکیلا ہے اور ضمنی طور پر امام بھی اس میں داخل ہے لوجود العلة۔ ہاں مگر مقتدی اس سے بہر حال خارج ہے۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں کہ حدیث لا صلوة لمن یقدا بفاتحۃ الكتاب فصاعداً منفرد کے حق میں وارد ہوئی ہے (موطا امام مالک ص ۲۸ وترمذی جلد ۱ ص ۲۸۰ وقال هذا حدیث حسن صحیح) اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہ حکم منفرد کے لیے ہے (موطا امام مالک ص ۲۹) امام احمد بن حنبلؓ فرماتے ہیں

کہ یہ حکم منفرد کے لیے ہے۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۱۲) امام سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم منفرد کے لیے ہے (ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۱۹) اور امام اسماعیلی (المعروفی ص ۳۷) جو الامام، الحافظ الثبت، شیخ الاسلام اور کبیر الشافعیہ تھے، تذکرہ جلد ۲ ص ۱۴۹) امام حاکم کہتے ہیں کہ وہ شیخ المحدثین والفقہاء تھے (الایضہ ص ۱۱) خطیب تبریزی لکھتے ہیں کہ وہ الامام اور الحافظ تھے (کمال ص ۶۲۸) فرماتے ہیں کہ یہ حدیث منفرد کے بارے میں ہے (بذل الجہود جلد ۲ ص ۵۲) امام موفق الدین ابن قدامہ الحنبلی فرماتے ہیں کہ :-

فاما حدیث عبادۃ الصبیح فهو محمول علی غیر المأمور وكذلك حدیث ابی ہریرۃ الخ (معنی جلد ۱ ص ۲ طبع بولاق) حضرت عبادۃ کی جو حدیث صحیح ہے تو وہ غیر مقتدی پر محمول ہے اور اسی طرح حضرت ابو ہریرہ کی روایت بھی غیر مقتدی پر محمول ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کی حدیث آگے دوسری حدیث کے عنوان سے آرہی ہے اور امام شمس الدین فرماتے ہیں کہ :-

فالحديث الاول الصحيح محمول علی غیر المأمور وكذا حدیث ابی ہریرۃ الخ (شرح مقنع للکبیر جلد ۲ ص ۱۳) وہ مقتدی کے علاوہ دوسروں پر محمول ہے اور اسی طرح حضرت ابو ہریرہ کی روایت بھی غیر مقتدی کے حق میں ہے۔

فصاعداً، مائیسراً اور مازاد کی زیادت کے پیش نظر ان اکابر کا یہ ارشاد سوفیصدی صحیح ہے جس میں شک نہیں ہو سکتا۔ مؤلف خیر الکلام کہتے ہیں کہ حضرت جابر اور حضرت ابن عمرؓ کی یہ بات نہایت کمزور ہے کیونکہ وہ اس حدیث کے راوی نہیں ہیں بخلاف حضرت عبادۃؓ کے کہ وہ اس کے راوی ہیں، باقی امام احمدؒ اور سفیانؒ کے قول سے اس کو منفرد پر کوئی محمول کرے تو اس کی مرضی دوسرے کے لیے حجت نہیں (محصلا ص ۱۳۵)

الجواب :- حضرت عبادۃ کی روایت بقید خلف الامام ہے ہی ضعیف جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ آئے گا جس کا کوئی اعتبار نہیں بخلاف حضرت جابرؓ وغیرہ کی حدیث کے جو بالکل صحیح ہے اور حرف منہ کی تخصیص کا (بشرطیکہ عام ہو) یہ واضح قرینہ ہے اور اسی لیے حضرت امام احمدؒ وغیرہ نے اس روایت کو غیر مقتدی کے لیے کہا ہے جو مبنی بر دلیل ہے، انہی مرضی کا سوال نہیں



کیونکہ اسی حدیث میں فصاعداً اور مائتین وغیرہ کی زیادت بھی تو موجود ہے جو غیر مقتدی کے  
ہائے میں ایک گونہ نص ہے۔

**اعتراف :-** مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے  
قول کی تخصیص کتاب اور سنت سے ہی ہو سکتی ہے امام احمد اور سفیان بن عیینہ کے قول سے نہیں  
ہو سکتی (ابکار الممن)

**جواب :-** مبارکپوری صاحب نے کیسی دُور اندیشی کا ثبوت دیا ہے کہ حضرت جابرؓ اور  
حضرت ابن عمرؓ کا نام تک نہیں لیا اور صرف امام احمدؓ اور ابن عیینہؓ کا نام لے کر دفع الوقتی  
کی ناکام کوشش کی ہے لیکن موصوف کا یہ اعتراف بھی باطل ہے اولاً اس لیے کہ حرف من  
کی تخصیص کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی سے کی گئی ہے اور علمائے بیت  
کے حوالے اس پر تشراوہیں وثانیاً اگر اس حدیث میں منفرود وغیرہ کی تخصیص کی گئی ہے تو جناب  
رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحیح ارشاد فصاعداً، مائتین اور ما زاد وغیرہ کی زیادت  
کی بنا پر نہ کہ صرف امام احمدؓ اور ابن عیینہؓ وغیرہ کے قول سے ان کا اگر کوئی قصور ہے تو صرف  
یہ کہ انہوں نے اس کو بیان کیوں کیا ہے؟ وثالثاً ضرورت تو نہیں مگر مبارکپوری صاحب کا  
مغالطہ بھی نکالنا ہے کہ عام کی تخصیص کتاب اور سنت کے علاوہ کسی اور چیز سے بھی ہو سکتی ہے۔  
یائیں؟ قاضی شوکانیؒ جو علامہ زمن اور مجتہد مطلق تھے (تفسار ص ۸۲) لکھتے ہیں فذلک  
على ان العموم ينقص بالقياس (نیل الاوطار جلد ۴ ص ۵) اس سے معلوم ہوا کہ عموم کی  
تخصیص قیاس سے بھی صحیح ہے امام ابن وقیف العید (المستوفی ص ۲) جو الامام الفقیہ  
المجتہد، المحدث، الحافظ، العلامة اور شیخ السلام تھے (تذکرہ جلد ۴ ص ۲۶۲)  
فرماتے ہیں کہ جب تخصیص کی وجہ ظاہر ہو تو بلا اختلاف احدے قیاس اور رائے سے بھی عموم  
کی تخصیص جائز ہے (بحوالہ فیض الباری جلد ۲ ص ۱۳) علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں کہ تمام  
علماء اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عموم کی تخصیص دلالت عقلی اور قیاس سے بھی جائز ہے  
(توجیہ النظر ص ۶) اور حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں ۔

لان القیاس مقدم علی العموم کما حضرت امیر اربعہ اور جمہور اہل اسلام کے نزدیک

ہو مذہب ائمۃ الذیعة والجمہور قیاس عموم سے مقدم ہے۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۵)

مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ لکھتے ہیں کہ خبر واحد کی تخصیص جب عقل، عرف اور قیاس سے جائز ہے۔ جیسا کہ فن اصول کی یہ طے شدہ اور برہن حقیقت ہے تو صحابی کے قول سے خبر واحد کی بطریق اولیٰ تخصیص جائز ہوگی (اعلاء السنن جلد ۸ ص ۵۳) اور اصول فقہ کی کتابوں میں اس پر مستقل بحث موجود ہے کہ عموم کی تخصیص عقل، جس اور عادت وغیرہ سے جائز اور صحیح ہے مثلاً دیکھیے توضیح وتلویح ص ۱۱۸ وغیرہ)

مولف "خیر الکلام" لکھتے ہیں کہ مطلق کے بعض افراد کی تفسیر موقع اور محل کے اعتبار سے جائز ہے (ص ۳۸۳) نہ معلوم مبارکپوری صاحب کس سادگی سے عموم کی تخصیص کے لیے کتاب سنت کی دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں؟ حالانکہ اس روایت میں عموم کی تخصیص محض قیاس سے نہیں کی گئی بلکہ کتاب اللہ اور صحیح احادیث سے بلکہ خود اسی روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحیح ارشاد سے تخصیص کی گئی ہے، تاکہ مبارکپوری صاحب ناراض نہ ہو جائیں الحاصل اس روایت میں فصحاء، مکتبہ اور مازاد وغیرہ کی زیادت کے مد نظر رکھنے سے یہ بات واضح سے واضح تر ہو جاتی ہے کہ اس حدیث کا مصداق ہرگز ہرگز مقتدی نہیں ہے اور مقتدی کو اہم کے پیچھے بغیر استماع اور انصات کے کوئی چارہ نہیں ہے ہاں جو جماعت نظریہ بدلنے میں ہتک شان سمجھے تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

جواب چہارم :- جمہور اہل اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص رکوع کی حالت میں اہم کے ساتھ نماز میں شریک ہوا تو اگرچہ اُس نے خود سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی اور نہ اہم سے سنی ہے لیکن اس کی وہ رکعت اور نماز صحیح ہے چنانچہ اہم شافعیؒ لکھتے ہیں کہ رکوع کی حالت میں جس نے اہم کو پالیا اس کی وہ رکعت صحیح ہو جاتی ہے۔ (کتاب الام جلد ۱ ص ۵)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ جس نے اہم کے ساتھ رکوع پالیا اس کی وہ رکعت ہو گئی (منہاج السنۃ جلد ۵) اہم نوویؒ لکھتے ہیں کہ جو شخص اہم کو رکوع میں پالے اس کی وہ رکعت سورۃ فاتحہ پڑھے بغیر بھی جائز ہے (شرح مسلم جلد ۳ ص ۱۳۵) و مثله فی شرح



المہذب جلد ۳ ص ۳۲۶) حافظ ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ جمہور فقہاء کا اس بات پر کلی اتفاق ہے، کہ جس شخص نے اہم کو رکوع کی حالت میں پالیا ہو اور سورۃ فاتحہ نہ پڑھی ہو تو اس کی وہ رکعت اور نماز صحیح ہے، اہم مالک اور اہم شافعی، اہم ابو حنیفہ، اہم ثوری، اہم اوزاعی، اہم ابو ثور، اہم احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ (وغیرہ) کا یہی مسلک ہے اور حضرات صحابہ کرام میں حضرت علیؑ حضرت ابن مسعودؓ حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابن عمرؓ کا یہی مسلک ہے اور ہم نے تمسید میں ان کی جملہ اسانید درج کر دی ہیں (بحوالہ امام الکلام وادجز المسالك جلد ۲ ص ۲۴۷ واعداء السنن جلد ۴ ص ۳۲۹) نواب صاحب لکھتے ہیں کہ جمہور کا یہی مسلک ہے کہ جس نے رکوع میں اہم کو پالیا ہو تو اس کی وہ رکعت صحیح ہے۔ (بدور الاولہ ص ۶۵ و دلیل الطالب ص ۴۲۲) مولانا شمس الحق صاحب عظیم آبادی لکھتے ہیں کہ قاضی شوکانی صاحب نے (نیل الاوطار جلد ۲ ص ۱۳۳) میں پہلے یہ لکھا تھا کہ مذکر رکوع کی وہ رکعت شمار نہ ہوگی لیکن بعد کو جمہور کے مسلک کی طرف رجوع کر لیا چنانچہ انہوں نے اپنے فتعہ الزبانی میں اس کی تصریح کی ہے کہ اہم کے ساتھ رکوع میں مل جانے والے کی وہ رکعت بالکل صحیح ہے (عون المعبود جلد ۱ ص ۳۳۲) مبارک پوری صاحب حدیث میں من صلی رکعتہ لَوَقِّرَ اِنْهَا رِ الْحَدِيثِ کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ اس سے مراد وہ رکعت ہو سکتی ہے جس میں مقتدی نے اہم کو بجالت رکوع پالیا ہو اور خود قرأت نہ کی ہو اس کی وہ رکعت جائز اور صحیح ہوگی۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۶۱) مؤلف "خیر الکلام" لکھتے ہیں کہ اسی طرح اگر رکوع والی حالت میں رکعت کا صحیح ہونا دلائل سے ثابت ہو جائے (جو ٹھوس حوالوں سے یقیناً ثابت ہے) صرفاً تو اس کی تخصیص کر لی جائے گی نہ یہ کہ اس کو لے کر اعتراض کیا جائے گا۔ بلفظہ ص ۱۳۶) ہم تو پہلے ہی سے اس حدیث کی تخصیص کے قائل ہیں لیجئے اب مؤلف مذکور بھی تخصیص کو مان رہے ہیں البتہ اعتراض کے لفظ سے ذرا گھبراتے ہیں۔ اور اسی صفحہ میں اس سے پہلے لکھتے ہیں کہ اور اس حدیث سے صرف ایک بار فاتحہ کا واجب ہونا ثابت ہو تا ہے، اگر کوئی شخص رکوع میں رکعت کے جواز کا قائل ہے تو اس سے اس حدیث کی مخالفت لازم نہیں آتی اھ

الجواب نہ میں اسی طرح اگر کوئی شخص صرف منفرد کے لیے فاتحہ پڑھنے کا قائل ہو تو اس سے اس حدیث کی عین مطلقیت پیدا ہوتی ہے کیونکہ یہ حدیث ہی لمن یصلی وحدہ

کے بارے میں ہے، اگر اس حدیث سے ہر رکعت میں صرف ایک بار فاتحہ کا ثبوت ہے تو حدیث  
 مسنی الصلوٰۃ سے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کا ثبوت ہے۔ چنانچہ امیر یمنیؒ اس کے فوائد میں لکھتے ہیں  
 کہ فتیح الفاتحة فی کل رکعة اھ (سبل السلام جلد ۱ ص ۲۸۱) حضرات! انصاف کے  
 ساتھ آپ ایک طرف حضرات محدثین کرامؒ کی ان تصریحات کو ملاحظہ کیجئے اور دوسری طرف تفسیر  
 ثانی کا یہ دعویٰ دیکھئے کہ غرض تمام محدثین بالاتفاق اس حدیث کو ہر نماز اور ہر نمازی پر شامل کہتے  
 ہیں۔ اور یہ کہ جو شخص اہم کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے کالعدم ہے  
 بیکار ہے اور باطل ہے۔ کہ یہ کہاں تک مبنی بر انصاف ہے۔ افسوس اور حیرت ہے اس تحقیق پر مولانا  
 میر صاحبؒ ہی فرمائیں کہ کیا حضرت جابرؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ،  
 اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ حضرات صحابہ کرامؓ اور اہم مالکؓ، اہم احمدؓ، اہم ابو حنیفہؓ، اہم شافعیؓ، اہم ابن  
 عیینہؓ، حافظ اسمعیلیؓ، حافظ ابن عبد البرؓ، اہم موفق الدینؓ ابن قدامہؓ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؓ، اور حافظ  
 ابن القیمؓ، وغیرہ (جن کی پوری تشریح جلد اول میں عرض کی جا چکی ہے) آپ کے نزدیک محدث  
 نہیں ہیں؟ اور کیا ان میں بعض جہری نمازوں کو اور بعض مقتدی کو اور اکثر مدرک رکوع کو اس حدیث  
 سے کتاب و سنت کے دلائل سے مستثنیٰ نہیں کرتے؟ تعجب ہے میر صاحبؒ کی دیدہ دلیری پر کہ وہ  
 کس بے احتیاطی سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ غرض تمام محدثین بالاتفاق اس حدیث کو ہر نماز اور ہر  
 نمازی پر شامل کہتے ہیں مولانا خود ہی از راہ بزرگی اور انصاف فرمائیں کہ ایک شخص مادرزاد گونگا ہے  
 وہ نماز تو ادا کرتا ہے لیکن دوسری قرآن کی طرح وہ سورۃ فاتحہ کی قرآن سے بھی عاجز ہے کیا اس کی نماز  
 ہو جائے گی؟ اگر نہ ہوگی تو کس دلیل سے؟ اور اگر ہو جائے گی تو آپ کے قاعدہ کے مطابق یہ روایت تو  
 ہر نمازی کو شامل ہے وہ گونگا کیسے مستثنیٰ قرار پایا؟ اس گونگے کو بھی جانے دیجئے یہ بتلائیے کہ سو سال  
 کا بوڑھا کافر مسلمان ہوتا ہے نہ حافظ ساتھ دیتا ہے اور نہ زبان وہ نماز کے ظاہری ارکان تو ادا کرتا ہے  
 مگر سورۃ فاتحہ یاد نہیں کر سکتا کیا اس کی نماز جائز ہے، اگر ہے تو یہ خود اور اس کی نماز ہر نماز اور ہر  
 نمازی کی زنجیروں سے کیسے خارج تصور ہوں گے؟ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت  
 صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور کہنے لگا حضرت میں قرآن کریم کا کوئی  
 بھی حصہ یاد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا مجھے کوئی ایسی چیز ارشاد فرمائیے جو اس کے قائم مقام ہو اپنے



ارشاد فرماتم یہ پڑھا کرو مَبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ (الحديث) (رواه البوداؤد واحمد والنسائی وصححه ابن حبان والدارقطنی والحاکم سبل السلام جلد ۱ ص ۲۹۷) امیر ایمانی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اذکار قرأت کے قائم مقام ہیں خواہ سورۃ فاتحہ کی قرأت ہو یا قرآن کریم کے کسی اور حصہ کی اور یہ حکم اس شخص کے لیے ہوگا جو قرأت پر قادر نہ ہو اور بہ نظر ظاہر یہ روایت صاف بتاتی ہے کہ ایسے شخص پر قرآن کریم کا سیکھنا واجب نہیں ہے تاکہ وہ اس کو نمازیں پڑھ سکے کیونکہ میں طاقت نہیں رکھتا کا مطلب یہی ہے کہ میں اب قرآن کریم کا کوئی حصہ یاد نہیں کر سکتا معذرا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو قرآن کریم کا کوئی حصہ یاد کرنے کا حکم نہیں دیا اور ان کلمات کی تلقین فرمائی ہے حالانکہ جو شخص یہ الفاظ یاد کر سکتا ہے وہ سورۃ فاتحہ بھی یاد کر سکتا ہے اگر سورۃ فاتحہ وغیرہ کا سیکھنا واجب ہوتا تو آپ ضرور اس کا حکم دیتے۔ (سبل السلام جلد ۱ ص ۲۵۱) لیجئے ایک غیر مقلد عالم صاحب نے ساری نمازوں کے لیے ایسے شخص کو چھٹی ٹیڑھی دی ہے جو سورۃ فاتحہ پر قادر نہیں ہے گا ایں گناہیست کہ در شہر شمانیز کنند

مولف خیر الکلام کہتے ہیں کہ ایسا مقتدی معذور ہے اور عذر کا حکم الگ ہے جیسے منفرد گونگا جس پر اخاف کے نزدیک بھی قرأت فرض ہے مگر عذر کی وجہ سے مستثنیٰ ہے (محصلا ص ۱۳۷) الجواب :- ہمارے نزدیک تو یہ حدیث عام نہیں لیکن مولف خیر الکلام اس کو عام تسلیم کر کے معذور کو اس سے مستثنیٰ کرتے ہیں تو یہ حدیث ہر نمازی کو شامل تو نہ ہوئی عموم کی رٹ تو ٹوٹی عام مخصوص البعض قطعی نہیں رہتا اور مقتدی بھی جمہور کے نزدیک شرعی طور پر معذور ہے کہ اس کو امام کے پیچھے قرأت کرنے کی ممانعت ہے۔

امام نووی لکھتے کہ جو شخص سورۃ فاتحہ نہیں پڑھ سکتا اور اس کے لیے اس کا سیکھنا بھی ممکن نہ ہو تو اس کے علاوہ کوئی اور سورت ہی وہ پڑھ لیا کرے۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۶۹) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں جس کو سورۃ فاتحہ یاد ہو اس کے لیے فاتحہ متعین ہے اگر وہ یاد نہیں تو قرآن کریم کا کوئی حصہ لازم

ہے وہ بھی نہ ہو تو ذکر پڑھ لینا کافی ہے (فتح الباری جلد ۲ ص ۱۹۳) اب آپ خود میر صاحب کی سن لیجئے وہ خود لکھتے ہیں کہ جسے فاتحہ یاد نہ ہو وہ کسی اور مقام سے پڑھ لے اور اگر دیگر مقام سے بھی یاد نہیں تو تحمید، تکبیر، تہلیل پڑھے الا بلفظ پھر آگے لکھتے ہیں اسورۃ فاتحہ اس شخص پر لازم ہے جو اُنے بخوبی پڑھ سکے لیکن جو بخوبی نہ پڑھ سکتا ہو وہ جہاں سے چاہے قرأت کر سکتے (بلفظہ تفسیر واضح البیان ص ۲۴ و ص ۲۵) دیکھئے مولانا خود ہر نمازی اور ہر نماز کی تخصیص کر کے جمہور کے زمرہ میں شامل ہو گئے ہیں ع۔ یہ بھی لگا کے خونِ شہیدوں میں مل گیا۔

تمام محدثین بالاتفاق الا کا قصہ تو رہا اپنی جگہ کیا میر صاحب خود بھی محدث ہیں یا نہیں ؟ دیکھئے کیا لب کشائی فرماتے ہیں ؟ جمہور محدثین نے تو مدرک رکوع کو اس حدیث سے (حضرت ابو بکرؓ وغیرہ کی صحیح روایت جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) مخصوص کیا ہے حضرت امام بخاریؒ وغیرہ نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ مدرک رکوع کو مدرک رکعت تصور نہیں کیا جائیگا یہ بات بڑی نا انصافی پر مبنی ہوگی کہ ہم ان کی پیش کردہ دلیل اور اس کا پس منظر آپسے عرض نہ کریں، حضرت امام بخاریؒ کوئی صحیح مرفوع اور صریح روایت اس دعویٰ پر پیش کرنے سے سو فیصد ہی قاصر ہے ہیں کہ جس نے رکوع کی حالت میں امام کو پالیا اس کی وہ رکعت شمار نہ ہوگی بخلاف اس کے ہم نے حضرت ابو بکرؓ کی صحیح، صریح اور مرفوع روایت سے جو حسن کے درجہ سے فروتر نہ ہوگی اور دیگر بعض آثار حضرات صحابہ کرامؓ سے اس مسئلہ کو پہلے مبرہن کر دیا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے امام بخاریؒ کا استدلال ملاحظہ ہو، امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے معقل بن مالکؓ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو عوانہؒ نے بیان کیا وہ محمد بن اسحاقؒ سے روایت کرتے ہیں وہ عبد الرحمن بن اعرجؒ سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے انہوں نے فرمایا قال اذا ادركت القوم ركوعا لم تعتد بتلك الركعة (جزا القراءۃ ص ۵۹) کہ جب تم جماعت کے ساتھ اس حالت میں شریک ہو کہ وہ رکوع میں جا چکی ہو تو تمہاری اس رکعت کا اعتباد نہ ہوگا۔ لیکن اس روایت سے استدلال مخدوش ہے اولاً اس لیے کہ معقل بن مالکؓ کو علامہ ابو الفتح ازہویؒ متروک کہتے ہیں۔ (میزان جلد ۳ ص ۱۸۵) و تہذیب التہذیب ص ۲۳۴ و ثانیاً اس کی سند میں محمد بن اسحاقؒ ہے جس پر پوری جرح (اور کلام) اپنے مقام پر بیان کی جائے گی و ثالثاً ابن اسحاقؒ مدلس ہے اور عنعنہ سے روایت کرتا ہے جو قابل التفات



نہیں ہے ورنہ ایسا یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ پر موقوف ہے اور موقوف روایت کو حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ کی مرفوع حدیث (جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے) کے مقابلہ میں کون سنتے ہے؟ اور مرفوع اور صحیح روایت کے مقابلہ میں ایسی ضعیف کمزور اور موقوف روایت حجت کیسے ہو سکتی ہے؟ و خلاصہ! حضرت ابوہریرہؓ کا خود اپنا فتویٰ یہ ہے کہ ہر رکوع ہر رکعت کے بعد دیکھئے سنان الکبریٰ جلد ۲ ص ۲۰ وغیرہ) اندر میں حالات حضرت امام بخاریؒ کا اس سے استدلال کہ نا بڑی عجیب بات ہے اگر ہمارے جیسا کوئی تہی مایہ ایسا استدلال کرتا تو اور بات تھی۔ کیونکہ

دیوانے روزِ حشر کو چھ نہ جانیں گے خالی ہے سرفروشت ہمارے حساب سے  
اسی طرح ایک دوسری سند سے حضرت ابوہریرہؓ کا موقوف اثر امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے (جنات القراءۃ ص ۱۱) لیکن اس کی سند میں بھی محمد بن اسحاقؒ ہے اسی مضمون کا ایک اثر انہوں نے حضرت ابوسعید بن الخدریؒ سے بھی نقل کیا ہے (الایضاً) اور اس کے الفاظ یہ ہیں، لا یدکح احدہم حتی یقعد بام القدرانی یعنی سورہ فاتحہ پڑھنے سے پہلے کسی کو رکوع نہیں کرنا چاہیے۔ مگر یہ تواتر بھی ان کو چندال مفید نہیں ہے اولاً اس میں بعض متکلم فیہ راوی ہیں وثانیاً یہ بھی موقوف ہے اور ثالثاً اس میں مقتدی اور خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور منفرذ پر بہر حال یہ لازم ہے کہ پہلے سورہ فاتحہ پڑھے اور پھر وہ رکوع کرے اس کا کون منکر ہے؟ امام بخاریؒ مجاہدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ جب سورہ فاتحہ بھول جائے تو اس رکعت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ (جنات القراءۃ ص ۱۳) لیکن ایک تو اس میں ریث ہے جو کمزور اور ضعیف ہے (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۶) پھر یہ بھی یہ مجاہدؒ کا قول۔ الغرض کتب حدیث میں کوئی صحیح صریح اور مرفوع روایت موجود نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ رکوع میں امام کے ساتھ شامل ہونے والے کی وہ رکعت قابل اعتبار نہیں ہے بخلاف اس کے صحیح اور مرفوع حدیث اور جمہور اہل اسلام کی محبت سے ان حضرات کا دامن تحقیق والبتہ ہے جن کی نماز کو فریق ثانی بیکار، ناقص، کالعدم، اور باطل کہتا ہے حیف بر حیف ہے ایسے تعصب اور غنادیہ۔

جواب پنجم :- جب قطعی دلائل سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حرف متعموم میں نص قطعی نہیں ہے اور یہ کہ اسی حدیث کے بعض صحیح اور مرفوع طرق میں فضاغداً ما تیسر اور ما زاد

کی زیادت بھی موجود ہے اور یہ زیادت اس کو متعین کر دیتی ہے کہ یہ روایت مقتدی سے متعلق نہیں ہے بلکہ منفرد وغیرہ کے حق میں ہے اور یہ کہ حضرت جابرؓ، حضرت ابن عمرؓ، امام احمد بن حنبلؓ، امام سفیان بن عیینہؓ، حافظ اسمعیلیؓ، امام موفق الدینؓ ابن قدامہؓ اور علامہ شمس الدین الحنبلیؓ وغیرہ اس روایت کا مصداق منفرد بیان کرتے ہیں اور یہ کہ جمہور اہل اسلام اور حضرات ائمہ اربعہؓ وغیرہ ہر رکہ کو اس حدیث کے عموم سے مستثنیٰ کرتے ہیں اور یہ کہ گونگا یا وہ شخص جو مدت العمر سورہ فاتحہ یا نہیں کر سکتا یا کچھ عرصہ اس کو یاد نہیں ہو سکتی اور معذوہ نماز ادا کرتا ہے۔ تو ایسا شخص بھی باتفاق فریق ثانی اس حدیث کے عموم سے خارج ہے۔ ان تمام اندرونی اور بیرونی قرآن اور دلائل کی موجودگی میں ہر نماز پر اور ہر نماز میں اس سے سورہ فاتحہ کے ہر رکعت میں واجب اور رکن ہونے پر استدلال کرنا نہایت حیرت اور تعجب کی بات ہے۔ خیر یہ سب باتیں عرض کی جا چکی ہیں نمبر ہذا میں جو بات کہنے کی ہے وہ یہ ہے کہ حضرات محدثین کرامؓ کا ایک ضابطہ ہے اور جس کو فریق ثانی بڑی شہرہ سے بیان کرتا ہے چنانچہ قاضی شوکانیؒ صاحبؒ لکھتے ہیں درای الحدیث اعرف بالمراد من غیرہ (نیل الاوطار جلد ۱ ص ۲۵۶) حدیث کا راوی اپنی مروی حدیث کا مطلب دوسروں سے زیادہ بہتر جانتا ہے اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں ان تفسیر الراوی ارجح من تفسیر غیرہ (عون الباری جلد ۱ ص ۲۴۷ علی النیل) راوی کی تفسیر دوسروں کی تفسیر سے راجح تر ہے اور مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں۔ وقد تقرن راوی الحدیث اور بی بمراد الحدیث من غیرہ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷) یہ بات طے شدہ ہے کہ حدیث کا راوی اپنی مروی حدیث کی مراد کو دوسروں سے زیادہ بہتر سمجھتا ہے اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں ومذہب الشافعی ومحقق الاصولین ان تفسیر الراوی مقدمہ اذالم یخالف الظاہر قالہ النووی (تحفۃ الاحوذی جلد ۲ ص ۲۳۵) کہ حضرت امام شافعیؒ اور محقق اصولیوں کا یہ مذہب ہے کہ راوی کی تفسیر جب کہ ظاہر کے خلاف نہ ہو دوسروں کی تفسیر سے مقدم ہوگی جیسا کہ امام نوویؒ نے کہا ہے، اس قاعدہ کو سامنے رکھ کر جب ہم حضرت عباد بن الصامتؓ وغیرہ کی وہ صحیح حدیثیں جن میں حروف مت مذکور ہے، دیکھتے ہیں تو ان کے مختلف طرق اور اسانید میں ہمیں یہ مرکزی راوی نظر آتے ہیں۔ امام ابو بکرؓ بن ابی شیبہؒ، امام سفیان بن عیینہؒ، امام زہریؒ



امام اسحاق بن راہویہ، امام عبد اللہ بن وہب، امام مالک بن انس، امام احمد بن حنبل، امام عبد الرزاق،  
 بن حاتم، امام معمر بن راشد، امام اوزاعی، اور حضرت امام شافعی وغیرہ اور یہ تمام اکابر حروف صحت  
 کے عموم کے قائل نہیں ہیں کوئی اس حدیث سے صرف منفرد مراد لیتا ہے اور کوئی منفرد اور امام دونوں  
 اور کوئی امام کے پیچھے سب سے سبب نمازوں کو مستثنیٰ قرار دیتا ہے اور کوئی جہری نمازوں کو  
 اس سے خارج کرتا ہے اور مدرک رکوع وغیرہ تو سب کے نزدیک مستثنیٰ ہے اور لطف کی بات  
 یہ ہے کہ حضرت محمود بن ربیع جو صفار صحابہ میں تھے اور اس حدیث کے راوی ہیں مگر وہ بھی قرآنہ  
 خلف الامم کے قائل تھے جس کی پوری تفصیل اپنے مقام پر آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ اور لطف  
 بالائے لطف یہ ہے کہ حضرت عبادہ بن الصامت بھی وجوب قرآنہ خلف الامم کے قائل نہ تھے  
 جیسا کہ ذکر ہوگا اور ایک اور بات بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ مشہور محدث امام اعظمؒ فرماتے ہیں۔  
 انتم الاطباء ونحن الصيادلة (کتاب العلم جلد ۲ ص ۱۳۱) اے فقہاء کے گروہ  
 تم طبیب ہو اور ہم ہنساری ہیں۔ امام سیوطیؒ اس کی تفسیر کرتے ہیں کہ اگرچہ ہنساری کے پاس  
 مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں ہوتی ہیں مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ کس کام آتی ہیں؟ طبیب اور حکیم  
 ہی ان کی خاصیت اور مزاج سے واقف ہو سکتے ہیں، اسی طرح حضرات محدثین کے کام کے حافظ  
 میں اگرچہ بے شمار حدیثیں محفوظ ہوتی ہیں لیکن وہ ان سے استنباط مسائل کا طریقہ نہیں جانتے  
 بلکہ یہ کام حضرات فقہاء کے کام ہے (محصلہ مسائل المختلصۃ ص ۵۵) اور امام سفیان بن عیینہؒ  
 لکھتے ہیں کہ فقہاء کی بات کو تسلیم کرنا ہی دین کی سلامتی ہے (الجواهر المضية جلد ۱ ص ۱۶)  
 امام ترمذیؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں وكذلك قال الفقهاء وهم اعلیٰ بمعانی الحديث  
 (جلد ۱ ص ۱۱۸) کہ فقہاء نے اس حدیث کا یہ معنی بیان کیا ہے اور وہی حدیث کا مطلب زیادہ بہتر  
 سمجھتے ہیں اور امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں ما اقل الفقہ فی اہل الحديث (طبقات  
 ابو یعلیٰ ص ۲۴) فقہ اور سمجھ کی باتوں سے اہل حدیث کو کوئی سروکار نہیں ہے، امام حاکمؒ اور  
 علامہ حازمیؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو جس کو فقہاء روایت کرتے ہیں اس حدیث پر ترجیح  
 ہوگی جس کو محدثین نقل کرتے ہیں (معرفت علوم الحديث ص ۱۱) و کتاب الاعتبار  
 ص ۱۵) اور یہ اکابر جن کے انامی نقل کئے گئے ہیں بلا اختلاف مسلم فقہ تھے، اس لیے راوی

حدیث ہونے کے علاوہ ان کی فقہانیت کی وجہ سے بھی ان کا بیان کردہ مطلب اور معنی قابل ترجیح ہوگا  
الغرض تمام اندرونی اور بیرونی شہادتیں اس امر کو بلاشک و شبہ متعین کر دیتی ہیں کہ حضرت عبادہؓ وغیرہ  
کی اس روایت کو جس میں حرف مت ہے مقتدی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ فریق ثانی کا اس سے  
استدلال و احتجاج صحیح ہو سکتا ہے۔

قارئین کرام! ابھی متعدد صحیح جوابات اس روایت کے جو جمہور کی طرف سے پیش کیے گئے  
ہیں باقی ہیں مگر سلسلہ کلام دراز سے دراز تر ہوتا جا رہا ہے اس لیے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں تاکہ آپ  
اگتا نہ جائیں، ہاں البتہ ادب اور احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف ایک جواب اور عرض کرتے ہیں اور  
فریق ثانی سے انصاف کی توقع رکھتے ہیں۔

جواب ششم۔ اگر فریق ثانی خواہ مخواہ اس پر اصرار کرتا ہے کہ حضرت عبادہ بن الصامت کی یہ  
روایت مقتدی کے حق میں بھی عام ہے تو اس کو چاہیے کہ امام کے پیچھے بآواز بلند اور جہر سے قرأت کیا  
کرنے کیونکہ حضرت عبادہؓ جہر سے قرأت کرتے تھے۔ چنانچہ امیر یحییٰ صاحب حدیث قدس  
تَقَرُّوا بِشَيْءٍ مِنَ الْقُرْآنِ إِذَا جَهَرْتُمُ الْإِبْرَامَ الْقُرْآنَ (کہ جب میں جہر سے قرأت کیا کروں  
تو تم قرآن کریم کا کوئی حصہ میرے پیچھے نہ پڑھا کرو، مگر سورۃ فاتحہ کی شرح میں لکھتے ہیں۔

فہذا عبادہؓ راوی الحدیث قراہا جہراً خلف الامام لانہ فہو من کلامہ  
صلی اللہ علیہ وسلم انہ یقرأ بہا خلف الامام جہراً وان نازعہ (سبل السلام جلد ۱ ص ۲۳۷)  
حضرت عبادہؓ بن الصامت نے جو اس روایت کے  
راوی ہیں، امام کے پیچھے بلند آواز سے سورۃ فاتحہ پڑھی اس لیے  
کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد سے  
یہی سمجھا تھا کہ امام کے پیچھے بلند آواز سے سورۃ فاتحہ پڑھی  
جا سکتی ہے، اگرچہ امام کے ساتھ منازعت اور ملٹھا پائی ہی  
کیوں نہ ہو۔

اور یہ روایت فریق ثانی کے نزدیک صحیح ہے۔ امام دارقطنیؒ لکھتے ہیں کہ ہذا اسناد حسن  
ورجالہ ثقات کلہم (جلد ۱ ص ۱۲۱) اور یہ معنی ابھی ایک غیر مقلد عالم صاحب نے بیان  
کیا ہے اس لیے ان کو امام کے پیچھے خوب زور و شور کے ساتھ ام القرآن کی قرأت کرنی چاہیے



اگرچہ کھلے طور پر منازعت اور مخالفت بھی ہوتی ہے اگر حضرت عبادۃ بن الصامت کی اس روایت پر ان کا عمل نہیں ہے اور ترک جہر کرتے ہوئے بھی ان کی نماز جائز اور صحیح ہے اور ان کے اہل حدیث ہونے میں کوئی شک نہیں ہے تو دوسروں سے یہ الزام مطالبہ کیسے صحیح ہے؟ اور ان کی نماز کیوں ناقص، بیکار، کا عدم اور باطل ہے؟ آنچہ برخود مہندی بردیگر اہل مہند، ہم اس حدیث کے انہیں جوابات پر اکتفا کرتے ہوئے آگے چلتے ہیں گو ابھی بہت سی باتیں کہنے کی باقی ہیں وہ فیہ کفایۃ لمن لہ ہدایۃ۔ مؤلف خیر الکلام نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حضرت عبادۃ نے فاتحہ آہستہ پڑھی تھی مگر بعض علماء نے جہر کا لفظ اس لیے بولا ہے کہ محمود نے جو حضرت عبادۃ کے ساتھ کھڑے تھے سُن لیا تھا الخ (ص ۱۸) الجواب :- یہ نرمی دفع الوقتی ہے کیونکہ عبارت میں قرأہا جہراً کے الفاظ ہیں پھر اس کا یہ مطلب کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ فاتحہ آہستہ پڑھی؟ اور یہ قرأت صرف پہلو میں حضرت محمود ہی نے سُنی بلکہ یہ اہم نے بھی سُنی اس لیے کہ امیر میانیؒ وان نازعہ کا جملہ بول رہے ہیں کہ اگرچہ اہم کے ساتھ منازعت اور سرکشی ہوتی ہے حضرت عبادۃ کے نزدیک مقتدی جہراً فاتحہ پڑھ سکتا ہے۔

دوسری روایت :- ابو اسائبؒ (جو ہشام بن زہرہ کے غلام تھے) فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔  
 مَنْ صَلَّى صَلَاةً لَمْ يَقْرَأْ فِيهَا بِأَمِّ الْقُرْآنِ  
 کہ جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اسی  
 ذمہی خداج ہی خداج ہی خداج غیر تمام نماز ناقص ہے ناقص ہے ناقص ہے وہ نام نہ ہوگی

۱۔ حضرت ہشام بن عامرؒ بھی اہم کے پیچھے جہر سے قرأت کیا کرتے تھے (دیکھئے مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۱) علامہ ہشیمیؒ فرماتے ہیں رجالہ موثقون کہ اس روایت کے سب راوی ثقہ ہیں حضرت ہشامؒ کو علامہ ذہبیؒ بھی بڑے میں ذکر کرتے ہیں اور ان کے والد بھی صحابی تھے جو غزوہ احد میں شہید ہوئے (تجدید أسماء الصحابة ج ۱ ص ۱۲۹)  
 ۲۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ان کا نام عبد اللہ تھا اور وہ الانصاری اور المہدنی ہونے کے ساتھ قبیلہ جہینہ سے تعلق رکھتے تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۲۸) لیکن صاحب کشف اللغظی کہتے ہیں کہ شاید وہ دراصل شیراز (ایران) کے رہنے والے تھے (ادجزہ المسالك جلد ۱ ص ۲۴۲)

فقلت لا بی ہریرۃ اتی اکون و زاد الامام  
قال فغض ذراعی فقال اقرا بھا فی نفسک  
یا فارسی - (مسلم جلد ۱ ص ۶۹)

ابو السائب کہتے ہیں۔ میں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے  
دریافت کیا حضرت! میں جب اہم کے پیچھے ہوں تو کیا کروں؟  
تو انہوں نے میرا بازو دبا کر جواب دیا اسے فارسی (اور عجمی)  
اپنے دل میں پڑھ لیا کرو۔

فریق ثانی اہم کے پیچھے سورہ فاتحہ کے وجوب اور اس کی رکینیت پر اس روایت کو نص سمجھتا ہے۔  
جواب :- فریق ثانی کا اس روایت سے استدلال ان امور پر موقوف ہے (۱) حرف مئن عموم کے لیے  
ہے (۲) جس چیز پر لفظ خذاج کا اطلاق ہو وہ کالعدم ہوتی ہے (۳) لفظ غیر تمام رکینیت پر دلالت  
کرتا ہے (۴) اقرا بھا فی نفسک حتمی اور قطعی طور پر آہستہ پڑھنے پر دلالت کرتا ہے، یہ وہ چار  
اصولی نقطے ہیں جن پر ہمیں بحث کرنی ہے پوری توجہ اور دلجمعی کے ساتھ بخود کریں، اس سے قبل  
کہ ہم ترتیب وار ان شقوق کا جواب دیں، یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ذرا فریق ثانی کی طرف سے  
پیش کردہ روایتوں کے راویوں کا جمہور کی طرف سے پیش کردہ روایتوں اور ان کے راویوں کا اجمالی  
طور پر تقابل کر دیکھیں، فریق ثانی نے قتادہ، سیماں تمیمی، ابواسحاق البیہقی، اسرائیل بن یونس اور اہم نہری  
لے علامہ ابوالولید الباجی (المتوفی ۴۹۲ھ) کہتے ہیں کہ ابو السائب کے سوال کرنے کا سبب یہ تھا و ہذا اعتراض

من ابی السائب علی العموم بالغل الشائع عنده وما شاہدہ من الاثمة فی ترک القراءۃ و زاد الامام  
(عجوالہ اوجز المسالك جلد ۱ ص ۱۴) کہ انہوں نے جب بڑے بڑے اماموں کو اور دیگر اکثریت کو اہم کے پیچھے ترک  
قراءہ پر عامل پایا تو عموم الفاظ کے پیش نظر حضرت ابو ہریرہؓ پر یہ اعتراض کیا۔ عہ وقال ابن القیم فی تہذیب  
سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۳۹۲) اقرا بھا فی نفسک و ہذا مطلق لیس فیہ بیان ان یقرأ بھا حال الجہد  
ولعلہ قال لہ یقرأ بھا فی السر و المسکات ولو کان علما فہذا ادائی لہ خالفہ فیہ غیرہ من  
من الصحابۃ والخذیر وایتہ اولی اہر حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ اس میں اس کا ذکر نہیں کہ حالت جہد میں  
پڑھے اور ممکن ہے کہ انہوں نے سری نمازوں اور سکات میں پڑھنے کا حکم دیا ہو اور اگر یہ عام ہے تو یہ ان کی اپنی  
روایت اور دیگر حضرات صحابہؓ کے مسلک کے خلاف ہے لہذا ان کی روایت ان کی رائے سے زیادہ بہتر ہے۔

لکھ یہ روایت ابو عوانہ جلد ۲ ص ۳۳، ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۱۹، خط امام، لکھ ۲۹، ترمذی جلد ۱ ص ۱۱، ابن ماجہ ص ۱۱،  
طیلسی ص ۳۳، جزا القراءۃ ص ۱ اور کتاب الاعتبار ص ۹۹ وغیرہ کتابوں میں موجود ہے۔



جیسے ثقہ ثبت اور حجت راویوں پر محض تخیط، تفرد، تدلیس اور ارسال وغیرہ کے ایسے الزام عائد کئے ہیں جو اصول حدیث کے رو سے مردود ہیں جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں اور انہوں نے امام معمرؒ، سفیان بن عیینہؒ، امام ازہریؒ، شعبہ بن ابی حمزہؒ، عبد الرحمن بن اسحاق مدنیؒ اور صالح بن کیسانؒ جیسے جلیل القدر ائمہ ثقات اور حفاظ کی صحیح اسانید سے مروی زیادت فضلہذا کو ٹھکرا دیا ہے اور وہ بھی محض اپنی مرضی سے بلا دلیل، اس روایت کے صحیح الفاظ یہ تھے۔ کل صلوٰۃ لا یقرأ فیہا بام الکتاب فہی خداج الا صلوٰۃ خلف امام کہ ہر وہ نماز جو سورۃ فاتحہ کے بغیر پڑھی جائے وہ ناقص ہے، ہاں مگر وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی جائے اور یہ استثناء الا صلوٰۃ خلف امام علاء بن عبد الرحمن کی غلطی سے چھوٹ گئی ہے جس کی پوری تفصیل پہلے عرض کی جا چکی ہے اور یہ بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ امام ابن معینؒ کہتے ہیں کہ ان کی حدیث حجت نہیں ہے، ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ وہ قوی نہ تھے ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ ان کی بعض حدیثیں منکر ہیں ابو زرہؒ کہتے ہیں کہ وہ زیادہ قوی نہ تھے، ابو داؤدؒ فرماتے ہیں کہ محدثین صیام شعبان کی روایت کو ان کی منکر روایتوں میں شمار کرتے ہیں اور حافظ ابو عمرؒ بن عبد البرؒ کہتے ہیں کہ:-

العلاء لیس بالمتین عندهم وقد	علاء بن عبد الرحمن محدثین کے نزدیک چنناں قابل اعتبار
انفرد بهذا الحدیث لیس یوجد الا له	نہیں ہیں اور اس حدیث کو بیان کرنے میں متفرد ہیں
ولا تروی الفاظۃ عن احد سواہ۔ واللہ اعلم	ان کے بغیر کسی اور سے یہ الفاظ مروی نہیں ہیں۔
(کتاب الانصاف ص ۷۷)	اور یہ صرف انہیں سے مروی ہیں۔

پس یہ روایت بلاشبہ شاذ ہے کہ ضعیف راوی تمام ثقات کی روایت کے خلاف کرتا ہے امت مسلمہ کا ایسی روایتوں کی صحت پر اجماع منعقد نہیں ہوا اور نہ آج تک جمہور نے ان کو قبول کیا ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام کا غلط دعویٰ ہے۔ فریق ثانی کا انصاف ملاحظہ کیجئے کہ ثقہ ثبت اور حجت راویوں کی روایتیں تو ان کے نزدیک صحیح نہیں ہیں لیکن جس روایت کو کمزور

سہ مؤلف خیر الکلام نے ارسال والفظاع وغیرہ کا ردنا پھر دیا ہے (ملاحظہ ہو ص ۱۸۳ و ص ۱۸۴) مگر ہم ان کا باوجود افضل جواب پہلے عرض کر چکے ہیں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اور ضعیف راوی بیان کرنا ہو اور بقول حافظ ابن عبد البرؒ اس کے بغیر ان الفاظ کو خدا کی دنیا میں کوئی ایک راوی بھی بیان کرنے والا نہ ہو تو وہ ان کے نزدیک حجت ہے، اور اس کے خلاف کریموں کی نماز بیکار، ناقص، کالعدم اور باطل ہے۔ فواسقا ترجمان الحدیث ص ۲۹ تا ۲۹۶ ماہ جولائی ۱۹۷۳ء میں اس کا خوب روزنا رویا ہے کہ مولف احسن الکلام ایک طرف تو بخاری و مسلم کو صحیح مانتے ہیں اور دوسری طرف مسلم کے راوی پر کلام کرتے ہیں اور یہ ان کا مذہبی تعصب ہے اور تضاد بیانی ہے محصلہ الجواب :- یہ سبق ہم نے آپ حضرات ہی سے سیکھا ہے کہ حضرت قتادہؒ اور سلیمانؒ تیسری وغیرہ جو ثقہ اور ثبوت اور بخاری اور مسلم کے مرکزی راوی ہیں مگر آپ حضرات نے باوجود ان کے ثقہ متابع ہونے کے ان کو معاف نہیں کیا حالانکہ صحیحین کی صحت آپ حضرات کے ہاں بھی براہ نام مسلم ہے سچ ہے سچ۔ ایں گناہ ہسیت کہ در شہر شامیز کنند۔ تو اگر ہم نے ٹھوس حوالوں کے ساتھ علماء بن عبد الرحمنؒ کی غلطی واضح کر دی ہے تو کیا جرم کیا ہے! اور جہاں حضرات محدثین کرامؒ نے العلماء کی کسی روایت کو صحیح کہا ہو گا تو یقین جانئے کہ وہاں ان کے مقابلہ میں خالد الطائفؒ جیسا ثقہ اور ثبوت راوی ہرگز نہ ہو گا اس بات کو بھی ضرور ذہن مبارک میں رکھئے۔ اور یہ بات بھی ملحوظ خاطر ہے کہ اس حدیث کا جو حصہ مرفوع ہے اس میں یہاں دو دالامام کے الفاظ موجود نہیں ہیں یہ الفاظ صرف اس حصہ میں ہیں جو حضرت ابو ہریرہؓ کا موقوف قول اور فتویٰ ہے۔ اور پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ فریق ثانی کا یہ نظریہ ہے کہ در موقوفات صحابہؓ حجت نیست اگرچہ بصحت رسد، اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مقابلہ میں تو کسی کا قول پیش ہی نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ایک مقام پر امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ بھلا حضرت علیؓ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کوئی بات کہہ سکتے ہیں؟ اور اگر آپ کے خلاف ان سے کوئی سند صحیح بھی ہو تب بھی حضورؐ کی بات ان پر اور دوسروں پر حجت ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے ہوتے ہوئے کسی امتی کے قول کو کیسے حجت قرار دیا جاسکتا ہے۔؟ (سنن الکبیری جلد ۲ ص ۱۷۳) آپ تہ تیغ وار جوابات سنئے۔

۱۔ حروف مت کے عموم میں نص قطعی نہ ہونے پر سیر حاصل بحث پہلے کی جا چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے وہاں ہی ملاحظہ کر لیں، اور امام موفق الدینؒ ابن قدامہؒ اور علامہ شمس الدینؒ الحنبلیؒ



کے حوالہ سے عرض کیا گیا ہے کہ حضرت عبادۃ کی سابق حدیث کی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث بھی منفرد سے متعلق ہے۔

۲۔ لفظ خداج سے وجوب اور رکینیت پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے، چنانچہ بعض مرفوع حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الصلوة مثني امثني وتشهد في كل ركعتين وتبأس وتمسكن واقع يديك  
نماز کی دو رکعتیں میں اور ہر دو رکعتوں میں تشہد ہے اور اپنی عاجزی فقر اور احتیاج کا اقرار کرنا ہے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر یا اللہ یا اللہ کہ جس نے ایسا نہ کیا تو  
وقل اللهم فمن لم يفعل فہی خداج  
اس کی نماز ناقص اور خداج ہوگی۔

ظاہر ہے کہ نفس نماز تو عاجزی، تمسک ہاتھ اٹھانے اور اللهم اللهم وغیرہ کہنے کے بغیر بھی بالاتفاق جائز ہے اور فرقی ثانی کے نزدیک نماز وتر کی دو رکعتوں کے بعد تشہد بھی نہیں ہے حالانکہ اس حدیث میں ایسا نہ کرنے والے کی نماز پر خداج کا اطلاق ہوا ہے اگر خداج رکینیت کو چاہتا ہے تو ایسا کیوں فرمایا ہے اور فرقی ثانی لفظ کل کے عموم سے بھی استدلال کرتا ہے جس کا ذکر عمقریب کیا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔

**اعترض:** مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ اس روایت میں عبد اللہ بن مافع بن عیاض راوی کمزور ہے، ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ مجہول ہے (تقریب ص ۲۱۸) علاوہ بریں امام لیثؒ بن سعدؒ لفظ خداج کے بجائے کذا و کذا کے الفاظ نقل کرتے ہیں، اور امام شعبہؒ لفظ خداج نقل کرتے ہیں اور امام بخاریؒ لیث بن سعدؒ کی تصویب کرتے ہیں (بعناہ تحقیق الکلام جلد ۵ ص ۴۸) جواب :- یہ ٹھیک ہے کہ بعض حضرات محدثین کرامؒ نے ان کو مجہول کہا ہے اور بعض

لہ یہ روایت ترمذی جلد ۱ ص ۵، ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۸۳، ابن ماجہ ص ۹۵، متداحد جلد ۱ ص ۲۶، طیبی ص ۱۹۵، سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۴۸۸، نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۶

اند التاج الجامع للاصول جلد ۱ ص ۲ وغیرہ کتابوں میں ہے۔

تے ان کی حدیث کی صحت کا بھی انکار کیا ہے مگر اہم البو حاتم اس حدیث کی تحقیر کرتے ہیں۔  
 (کتاب العلل جلد ۱ ص ۱۳۲) اور غایۃ المأمول جلد ۱ ص ۲ میں لکھا ہے بسند صحیح کہ اس کی سند صحیح ہے۔ اور مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ اگر کسی راوی پر جہالت کا الزام ہو اور ابن حبان اس کو ثقات میں بیان کر دیں تو اس کی جہالت رفع ہو جاتی ہے (ایکاد الممنون ص ۱۳) اور ان کو ابن حبان بھی ثقات میں بتاتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۵۸) تو ان کے مسلم قاعدہ کے مطابق یہ روایت صحیح ہے۔ رہا امام لیث بن سعد کا قصہ تو وہ بھی سن لیجئے امام لیث بن سعد بھی اس روایت کو لفظ خداج سے روایت کرتے ہیں (دیلمی سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۴۷ وغیرہ) اور لیث بن سعد کے ایک شاگرد عبد اللہ کے علاوہ باقی سب لفظ خداج ہی سے اس روایت کو نقل کرتے ہیں، اس روایت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ہر دو کعتوں کے بعد تشدد ضروری ہے، لہذا وتروں کا بھی یہ حکم ہو گا اور فریق ثانی کا انکار باطل ہے خصوصاً جب کہ لفظ کل کے عموم کے بھی مدعی ہیں پھر وہ وتشہد فی کل رکعتین کا کیونکر انکار کرتے یا کر سکتے ہیں؟ مگر اس کو کیا کہا جائے کہ وہ اپنی رائے کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اس میں شبہ نہیں اور صریح صحیح و مرفوع روایتوں میں اس کی بڑی تشدید آئی ہے کہ رکوع وغیرہ میں اہم سے پہلے مقتدی کو سر اٹھانے کی گنجائش اور اجازت نہیں ہے مگر ایسا کرنا رکن شکنی نہیں ہے جس سے سکر سے نماز ہی نہ ہو معذرا! حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو جس نے آپ سے قبل ہی سر رکوع سے اٹھالیا تھا۔ خطاب کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا اتقوا خداج الصلوٰۃ۔ (مسند احمد جلد ۳ ص ۴۳) کہ تم ناقص (اور خداج) نماز سے بچو اس حدیث میں بھی غیر رکن پر لفظ خداج کا اطلاق ہوا ہے مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ان احادیث میں خداج کا معنی نقصان و صافی کے لیے کیا گیا ہے اور یہ مجازی معنی ہے اور فاتحہ کو حنفی بھی واجب کہتے ہیں (محصلہ ص ۱۱) الجواب: حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں بھی نقصان و صافی ہی مراد لیں کیونکہ وہاں بھی قوی قرآن موجود ہیں اور خود حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت بھی ایک قرینہ ہے جو آثار صحابہؓ میں گزر چکی ہے کہ وہ جہری نمازوں میں قرأت غلف الایم کے قائل نہ تھے اور حنفیوں کے نزدیک مقتدی پر فاتحہ واجب ہی نہیں ہے اور بحث اسی میں ہے منفرد اور اہم کی بات نہیں ہو رہی۔



۳۔ جیسے لفظ خداج کا اطلاق ایسے موقع اور محل پر ہوا ہے جو رکن نہیں اسی طرح لفظ غیر تمام بھی غیر رکن کے ترک پر بولا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا اقامة الصف من تمام الصلوة (بخاری جلد ۱ ص ۱۸۳) کہ صف کو سیدھا کرنا نماز کے اتمام میں داخل ہے۔ فان تسوية الصفون من تمام الصلوة (مسلم جلد ۱ ص ۱۸۳) و مستند احمد جلد ۱ ص ۱۶۶ کہ بلا شک صفوں کا درست کرنا اتمام صلوٰۃ سے ہے اور اسی قسم کے الفاظ منوطیاسی ص ۱۶۶ وغیرہ میں مروی ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ صفوں کی درستگی کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اس کا خاص لحاظ فرمایا کرتے تھے لیکن تسویہ صفوں آخر رکن صلوٰۃ بھی تو نہیں ہے کہ اس کے بغیر مطلقاً نماز ہی صحیح نہ ہو اسی طرح ایک روایت میں یوں ارشاد ہوا ہے۔ لا تتعد صلوٰۃ احدكم حتى يسبغ الوضوء (دارقطنی جلد ۱ ص ۲۵) تم میں کسی کی نماز مکمل نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ وضو کی تکمیل نہ کر لے ظاہر ہے کہ اسباغ وضو میں تین تین بار دھونا اور اطالہ وغیرہ کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ نماز کے لیے ضروری نہیں ہے، ایک دفعہ وضو کرنا کافی ہے اور دو مرتبہ کامل وضو ہے اور تین مرتبہ کامل جیسا کہ حضرات محدثین کرام نے باب الوضوء مرة مرة۔ باب الوضوء مرتین مرتین اور باب الوضوء ثلاثا ثلاثا قائم کر کے اور ان کے تحت مرفوع قولی اور فعلی حدیثیں راجع کر کے یہ بات واضح کر دی ہے، اس حدیث میں بھی غیر رکن پر لا تتعد کے الفاظ اطلاق کئے گئے ہیں، ایک حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ من تمام الصلوة، الصلوة فی النعلین (مجمع الزوائد جلد ۱ ص ۱۶۳) کہ نماز کا اتمام اور اس کی تکمیل یہ ہے کہ جو تلوں میں نماز پڑھی جائے اگر من تمام الصلوة یا غیر تمام وغیرہ الفاظ رکینت کو چاہتے ہیں تو جو تلوں میں نماز پڑھنا بھی رکن ہونا چاہیے، اور حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں غیر تمام تفسیر لقوله عليه السلام وهذا اللفظ لا يقتضي الركنية (فتاویٰ میرزا) کہ غیر تمام کا جملہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد (خداج) کی تفسیر ہے لیکن یہ لفظ رکینت کو نہیں چاہتا، امام ابن دقیق العید ایک مقام پر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ تمام الشئ امداندا علی وجود حقیقتہ (احکام الاحکام جلد ۱ ص ۱۹۵) کہ اصل شے کی حقیقت سے تمام کا مفہوم زائد ہے، اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ لنگڑا پا ہج اور اندھا وغیرہ بھی تو

آخر انسان ہے، ان نقائص کی وجہ سے اس کی انسانیت کا انکار تو ہرگز نہیں ہو سکتا، ہاں البتہ اگر یہ اعضاء بھی صحیح ہوتے تو وہ کامل اور مکمل انسان کہلاتا۔ آپ ملاحظہ کر چکے کہ لفظ خداج کی طرح غیر تمام کا جملہ بھی رکبیت کو نہیں چاہتا اور اس پر فریق ثانی کے استدلال کی عمارت قائم تھی۔

۴۔ قرآۃ فی النفس کے معنی عربی قواعد کے لحاظ سے زبان کے ساتھ آہستہ پڑھنے کے علاوہ

اپنے دل ہی دل میں تدبر اور غور کرنے اور منفرد اور اکیلے ہو کر پڑھنے کے بھی آتے ہیں اور جب تک یہ دو معنی اور بھی موجود ہیں تو فریق ثانی کا قطعی اور حتمی طور پر یہ دعویٰ کیسے مسموع ہو سکتا ہے کہ قرأت فی النفس سے آہستہ زبان کے ساتھ پڑھنا ہی مراد ہے یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابوہریرہؓ کے اس موقف اثر اور فتوے کا مطلب یہ ہو کر لے سائل جب تم امام کے پیچھے اقتدار کر چکے ہو تو اپنے دل ہی دل میں سورۃ فاتحہ کا تدبر اور غور کیا کرو اور قرآہا فی نفسک اور زبان کو حرکت تک نہ

دینا۔ اس روایت کا یہی مطلب حافظ المغرب امام ابن عبد البرؒ نے بیان کیا ہے اور اس کا بھی قوی

احتمال ہے اور یہ معنی ہو کر لے سائل تم نے امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کا سوال کیا ہے لیکن

قرآہا فی نفسک جب تم اکیلے اور منفرد ہو کر تو اس وقت سورۃ فاتحہ پڑھا کر دو اس اعتبار

سے اسلوب حکیم کے پیش نظر حضرت ابوہریرہؓ نے سائل کو یہ بتایا کہ جب تم منفرد اور اکیلے ہوتے

ہو تو اس وقت سورۃ فاتحہ پڑھا کر دو۔ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کی گنجائش نہیں ہے اس کا بھی

قوی احتمال ہے اور اگر اس کو آپ معنی اور مطلب کہنے پر آمادہ نہیں تو صحیح احادیث کے ساتھ

تطبیق مینے کی ایک جائز تاویل ہی کہ لیجئے، امام نوویؒ، حضرت ابوہریرہؓ ہی کے ایک موقف اثر

کے بارے میں جو ایک مرفوع حدیث کے مخالف ہے، لکھتے ہیں۔ متا قول او مردود و شرح

مسلم جلد ۲ ص ۲۵۵) اس کی کوئی مناسب تاویل کر لی جائے گی یا اس کو رد کر دیا جائے گا پہلے تو

اس اثر میں علامہ ابن عبد الرحمنؒ موجود ہے جس کا حال آپ سُن چکے ہیں پھر یہ ابوہریرہؓ پر موقف

ہے اگر یہ اثر صحیح بھی ہو تب بھی مرفوع روایت کے مقابلہ میں قابل التفات نہیں ہے اور اس کا

ایک صحیح محل بیان کر کے صحیح روایات کے ساتھ منطبق کرنا یہ تو انتہائی خوش عقیدتی اور حسن

ظنی ہے قرآۃ فی النفس تدبر کے معنی میں آتا ہے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد

فرمایا یوم القوم اقرأہم لکتاب اللہ (مسلم جلد ۱ ص ۲۳۶) البداء و ص ۹۳ (ترمذی ص ۳۱)



قوم کا امام وہی ہو جو بڑا عالم کتاب اللہ ہو۔ امام نوویؒ اقوال کا معنی افتہ بھی نقل کرتے ہیں اصل عبارت  
یوں ہے ولجاہوا عن الحديث بان الاقراء من الصحابة كان هو الافتہ اور (ذوی ص ۳۱)  
اور انہوں نے حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ میں جو اقوال ہوا تھا وہی افتہ  
ہوا تھا، یعنی جو شخص قرآن کریم کا سب سے بڑا عالم اور اس کے معانی پر غور اور فکر و تدبر کرنے والا ہو تو وہی  
شخص قوم کا امام ہونا چاہیے اور اگر علم قرأت اور تجوید پر بھی اس کی گہری نگاہ ہو تو نور علیٰ نور، اور  
صاحب تاج العروس اس کا معنی کرتے ہیں اقراء اصحابہ واتقن للقرآن واحفظ کہ وہ شخص امام  
ہو جو دوسروں سے زیادہ معیاری عبور اور تدبر کرنے والا اور الفاظ و معانی کا حافظ ہو۔ حضرت ابن عباسؓ  
فرماتے ہیں اذا قراءتها في نفسك لم يكتبها ربه اليه جلد ۴ ص ۱۱۱ جب تم دل میں  
پڑھتے ہو تو وہ دونوں فرشتے اس کو نہیں لکھتے، دل میں پڑھنے کا مطلب جس کو کرام کا تبین بھی نہ  
لکھیں غور کرنے اور تدبر کرنے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ حضرت ابوسعید بن الخدريؓ سے روایت  
ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھ  
رہا ہو اور شیطان اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالے کہ تمہارا وضو ٹوٹ چکا ہے تو محض اس وسوسہ  
کی بنا پر نماز نہ چھوڑ دینا بلکہ یہ کہہ دیا کرو کذبت لے شیطان تم جھوٹ بک رہے ہو مگر یہ کہنا  
فی نفسه ہو امام ابن حبانؒ نے اپنے صحیح میں فی نفسه کی زیادت روایت کی ہے (بلوغ المرام)  
سوچئے کہ سحالت نماز دل میں شیطان لعین کو یہ کہنا کہ تم جھوٹ بک رہے ہو میرا وضو نہیں ٹوٹا بغیر تدبر  
اور غور کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ مشہور تابعی حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں اذا طلق فی نفسه فليس  
بشيء (بخاری جلد ۲ ص ۹۲) جب کوئی شخص اپنے دل میں طلاق دے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں  
ہے طلق فی النفس کا مطلب بغیر تدبر اور غور کے اور کیا ہو سکتا ہے زبان سے طلاق کا لفظ کہنے  
سے گو مسخرہ پن سے کیوں نہ ہو طلاق واقع ہو جاتی ہے حضرت عمرؓ نے ایک مشورہ کے موقع  
پر یہ ارشاد فرمایا تھا وکنت ذريرة مقالة (بخاری جلد ۲ ص ۱۱۱) میں نے اپنے دل میں ایک  
مقالہ تیار کیا تھا، ظاہر ہے کہ قلبی مقالہ تدبر اور غور کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ حضرات ائمہ متکلمین  
نے کلام لفظی اور کلام نفسی پر روشنی ڈالی ہے اور اس پر متفق ہیں کہ کلام نفسی پر بھی کلام کا اطلاق صحیح  
ہے بلکہ حقیقت شناسی سے کام لیا جائے تو اصل کلام ہی دل کا کلام ہے۔





دل میں غور و فکر اور تدبیر بھی قنات فی النفس کا اطلاق صحیح ہے تو اس احتمال کی موجودگی میں فریق ثانی کا استدلال صحیح نہیں ہو سکتا، قاضی شوکانی فرماتے ہیں ومع الاحتمال یسقط الاستدلال رنیل الاوطار جلد ۱ ص ۱۹۱ احتمال کے ہوتے ہوئے استدلال ساقط اعتبار ہے یعنی ایسا احتمال جو ناشی عن دلیل ہو محض احتمال سے استدلال پر کوئی زد نہیں پڑتی (غیث الغمام ص ۱۲۲) اور یہاں احتمال ناشی عن دلیل ہی ہے کما لا یخفی۔ یہاں تک جو بحث ہوئی وہ اس امر کی تھی کہ اس حدیث کا مطلب حافظ ابن عبد البر وغیرہ نے یہ بیان کیا ہے کہ اقربا بہا فی نفسک کا معنی ہے دل میں اس پر غور و فکر اور تدبیر کرنا ہے، اور قواعد شرعیہ سے اس کا ثبوت موجود ہے جو عرض کر دیا گیا ہے۔ اب آپ اقربا بہا فی نفسک کا دوسرا معنی بھی سن لیں کہ فی نفس کے معنی اکیلے اور منفرد کے بھی آتے ہیں چند نظائر اور نقول عرض ہیں غور کریں اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتا ہے کہ آپ جب ان (خاص قسم کے) لوگوں کو غلط کریں تو قُلْ لَّهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَتْلٌ بَلِیْغًا (پ، نسا) آپ ان میں سے ہر ایک ایک اور اکیلے اکیلے کو انتہائی بلیغ بات کہہ دیجئے اس آیت میں فی نفس کا معنی امام عربیت علامہ زمخشری نے تفسیر کشاف جلد ۲ ص ۳۷۱ میں اور امام رازی نے تفسیر کبیر جلد ۳ ص ۲۷۱ میں اور اسی طرح دوسرے بعض مفسرین نے جن میں قاضی بیضاوی اور صاحبی روح المعانی وغیرہ شامل ہیں یہی معنی کئے ہیں اور اسی طرح کا معنی حضرت عبد اللہ بن عباس سے بھی منقول ہے (دیکھئے فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۸ وغیرہ) ایک حدیث قدسی میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ جل شانہ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

فان ذکر فی نفسہ ذکر تہ فی نفسی      میرا کوئی بندہ جب مجھے تنہائی میں یاد کرے تبہ تو میں  
وان ذکر فی ملائکہ ذکر تہ فی ملائکہ      بھی اس کو تنہائی میں یاد کرتا ہوں اور جب وہ مجھے  
منہم الحدیث (بخاری جلد ۲ ص ۱۱۱)      کسی جماعت میں یاد کرے تبہ تو میں اس جماعت سے  
مسلم جلد ۲ ص ۲۳۲، مسند احمد جلد ۳ ص ۱۳۸      بہتر جماعت میں اس کو یاد کرتا ہوں۔

اس حدیث میں فی نفسہ تنہا اور اکیلے کے معنی میں ہے کیونکہ اس کا مقابل فی ملاء جماعت سے کیا گیا ہے اور کنز العمال جلد ۱ ص ۱۱۱ میں فی نفسہ کے بجائے خالی

اکیلہ اور منفرد کا لفظ آیا ہے جو صراحت سے اس مفہوم کو ادا کرتا ہے اور قاموس میں فی نفس کے معنی اکیلے کے بیان کئے گئے ہیں (فصل الخطاب ص ۷۷) اور فن نحو کی کتابوں میں اسم فعل اور حرف کی جو تعریف کی گئی ہے اس سے کون طالب علم ناواقف ہو سکتا ہے؟ اسم وہ کلمہ ہے جو فی نفسہ اپنے معنی پر دلالت کرے، اور ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو فعل وہ کلمہ ہے جو فی نفسہ اپنا معنی دے اور ضم ضمیمہ کا مفتقر نہ ہو لیکن ماضی و حال اور استقبال میں سے کوئی زمانہ اس میں پایا جائے اور حرف وہ کلمہ ہے جو فی نفسہ اپنا معنی ادا نہ کر سکے بلکہ اسم اور فعل سے مل کر اپنا مفہوم ادا کرے، ان مواقع میں فی نفسہ کا معنی اکیلہ اور منفرد ہی ہے کہ اسم و فعل اکیلے اور تنہا اپنا معنی دیتے ہیں مگر حرف اکیلہ معنی نہیں ادا کرتا عرف عام میں بھی فی نفسہ کا معنی اکیلے اور منفرد کے آتے ہیں کیا لوگ یہ نہیں کہا کرتے فلاں شخص فی نفسہ بڑا شریف (یا بُرا) ہے یعنی اگر اس کو اس کے رفقاء جماعت، ہوائی اور گرد و پیش کے ماحول سے الگ کر کے اکیلہ دیکھا جائے تو بڑا شریف (یا بُرا) ہے جب قرآن کریم، صحیح حدیث ائمہ لغت و تفسیر اور علم نحو بلکہ عرف عام سے یہ ثابت ہے کہ فی نفس کے معنی اکیلے اور منفرد کے بھی آتے ہیں تو حضرت ابوہریرہؓ کے اس موقف اثر کا یہ معنی کیوں نہ ہو جائے کہ اقربا بہا فی نفسک جب تم اکیلے اور منفرد ہو کر تو اس وقت سورہ فاتحہ پڑھا کرو تاکہ نہ توجیب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح اور صریح و مرفوع حدیثوں سے اس کا تعارض پیدا ہو اور نہ مخالفت لازم آئے، شاید ایسے ہی موقع کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی، آخر حضرت ابوہریرہؓ نے ابوالسائب کا بازو دفعن ذراعی بلا وجہ تھوڑا ہی دبایا تھا جواب کوئی مخصوص ہی ہو گا مہ

اور ہوں گے جو سہیں اُن کی جنائیں بے محل

ہم کسی کا غم نہ بے جا اٹھا سکتے نہیں

قارئین کرام! حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت کا پس منظر آپ ملاحظہ کر چکے ہیں، زیادہ کتاب معلوم ہوتا ہے کہ ہم لفظ خداج کی مناسبت وہ جملہ روایتیں جو ہماری نظر سے گزری ہیں یہیں ہی نقل کر کے ان پر روایتی اور درایتی کلام کرتے جائیں اور پھر حدیث تہریتین کا ذکر کریں۔



## احادیث خداج اور مخدجہ کی بحث

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا  
 كل صلاة لا يقرأ فيها بفتحه الكتاب وشئ فہی خداج (کتاب القراءۃ ص ۳)  
 جس نماز میں سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور نہ پڑھا جائے تو وہ نماز خداج اور ناقص ہوگی۔

جواب :- اس روایت سے استدلال صحیح نہیں ہے اولاً اس لئے کہ اس کی سند میں جبارہ  
 بن المغلس راوی ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ وہ مضطرب الحدیث تھا امام ابن معینؒ اس کو کذاب

کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۱۹۷) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کی حدیثیں بعض جعلی اور موضوع

بھی ہیں، ابو زرۃؒ نے ان سے روایت ترک کر دی تھی، ابن سعدؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں، ابو داؤدؒ

نے اس سے ترک روایت کا یہ عذر پیش کیا ہے کہ وہ صاحب منکیر تھا محدث بڑا اس کو کثیر الخطا

کہتے ہیں ابن جبارؒ کا بیان ہے کہ وہ اسانید میں ہمیر پھیر کر دیا کرتا تھا اور اس کی حدیث سے

احتجاج صحیح نہیں ہے، دارقطنیؒ اس کو مسترک کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۵۸) دوسرا

راوی اس سند کا شیبہ بن شیبہؒ ہے امام بخاریؒ اس کو لیس بشقہ اور امام نسائیؒ و دارقطنیؒ

اس کو ضعیف کہتے ہیں، امام ابو حاتمؒ اور ابو زرۃؒ اس کو لیس بالقوی اور ابو داؤدؒ اس کو

لیس بشی کہتے ہیں (میزان جلد ۱ ص ۱۹۷) وثالثاً اس میں خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے اور

لفظ کک کی بحث عنقریب آ رہی ہے وثالثاً اس میں وشئ کی زیادت بھی موجود ہے مگر

فرق ثانی اس کا قائل نہیں ہے وراثتاً باند صحیح و حسن حضرت عائشہؓ سے ایک روایت پہلے

عرض کی جا چکی ہے کہ وہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآن سورۃ فاتحہ کی قائل نہ تھیں، اگر یہ

روایت ان کے نزدیک صحیح ہوتی تو ہرگز اس کے خلاف نہ کرتے، حضرت عائشہؓ سے ایک

روایت مرفوعاً ان الفاظ سے مروی ہے كل صلاة لا يقرأ فيها بام القرآن فہی خداج

فہی خداج فہی خداج (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۳۱۱ و کتاب القراءۃ ص ۳) ہر وہ نماز جس

میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہے، ناقص ہے، لیکن اس کی سندیں عبد اللہ بن

لیبۃؒ ہے، امام مسلمؒ فرماتے ہیں کہ امام ابن مدنیؒ اور یحییٰ بن سعیدؒ اور وکیعؒ نے ان سے روایت

بالکل ترک کر دی تھی ابو احمد حاکمؒ ان کو ذہاب الحدیث کہتے ہیں، ابن جبارؒ ان کی روایت کو

واجب ترک کہتے ہیں۔ اور ابن سعد کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے، ابو زرہ کا بیان ہے کہ وہ صاحب ضبط نہ تھے، امام نسائی ان کو لیس بفقہ کہتے ہیں، ابو حاتم کہتے ہیں کہ ان کی روایت حجت نہیں ہو سکتی، ابن قتیبہ ان کی تضعیف کرتے ہیں علامہ خطیب کہتے ہیں کہ وہ تساہل کی وجہ سے کثرت منکر کا شکار ہو گئے تھے، ابن معین کہتے ہیں کہ ان کی حدیث سے احتجاج صحیح نہیں ہے۔

(تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۳۴۹) مصلح امام ترمذی کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے جلد ۱ ص ۱۱۱ حضرت عائشہؓ کی ایک مرفوع روایت ان الفاظ سے مروی ہے کل صلوٰۃ لا یقرأ فیہا بام الکتاب فہی خداج (ابن ماجہ ص ۳۱ و کتاب القراءۃ ص ۳) ہر وہ نماز جس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو وہ ناقص ہوگی۔

لیکن اس کی سند میں محمد بن اسحاق ہے جس کا ذکر عنقریب کیا جائے گا نیز وہ عنعنہ بھی کرتا ہے اور جزا القراءۃ (ص ۳) میں بھی حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً یوں مروی ہے کل صلوٰۃ لا یقرأ فیہا فہی خداج اور اس کی سند میں بھی محمد بن اسحاق ہے اور متن میں فاتحہ کی تعیین نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مرفوعاً روایت ہے من صلی صلوٰۃ لم یقرأ فیہا بام القرآن فہی خداج غیر تمام (کتاب القراءۃ ص ۳ و توجیہ النظر ص ۲۴۲) جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز ناقص اور نامکمل ہوگی، لیکن اس روایت میں ایک راوی محمد بن حمیر ہے اگرچہ ابو محمد شین کرام اس کی توثیق کرتے ہیں لیکن امام ابو حاتم فرماتے ہیں کہ ان کی حدیث لکھی جاسکتی ہے اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے فسوی کہتے ہیں کہ وہ قوی نہ تھا علامہ ذہبی انکو صاحب غرائب اور افراد کہتے ہیں (میزان ص ۱۱۱) حافظ ابن حجرؒ بھی امام یعقوب بن سفیان القسوسی سے یہی قول نقل کرتے ہیں کہ وہ قوی نہیں ہے۔ (تہذیب التہذیب ص ۱۳۵) دوسرا راوی اس سند کا عبداللہ بن عمرؓ ہے، امام یحییٰ ان سے روایت نہیں لیتے تھے، امام نسائی انکو لیس بالقوی کہتے ہیں۔

ابن مدینی ان کو ضعیف کہتے ہیں، ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ کثرت خطا کی وجہ سے قابل ترک تھے (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۵۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے (تقریب ص ۲۰۵) قیصر راوی اس کثری کا اتعیل بن عیاش ہے امام مسلم لکھتے ہیں کہ ان کی کوئی روایت قابل حجت نہیں ہے معروف راویوں سے ہو یا مجہول سے (جلد ۱ ص ۱۸) لیکن محدث وحیم وغیرہ نے یہ



فیصلہ درج کیا ہے کہ اسمعیلؑ مذکور کی ہر وہ روایت جو اہل مدینہ سے ہو ضعیف اور کمزور ہوتی ہے  
 (میزان جلد ۱ ص ۱۱۲) و تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۲۴) اور یہ روایت بھی عبد اللہ بن  
 عمر رضی اللہ عنہ سے ہے۔ دوسری سند میں اگرچہ عبد الرحیم بن سلیمانؒ، اسمعیلؑ مذکور کا تابع ہے اور وہ خود  
 ثقہ ہے مگر اس کی سند کمزور ہے لہذا اس کی متابعت کا عدم ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے مرفوعاً روایت ہے كل صلوة لا یقرأ فیہا بام  
 القرآن فخذجة فخذجة (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۳) ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ  
 نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہے، ناقص ہے، ناقص ہے لیکن اس کی سند میں سعید بن سلیمان النشیطی  
 ہے، امام ابو زرہؒ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ سے سلامت کے خواہاں ہیں وہ قوی نہیں ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۱۳) ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ اس میں کلام اور نظر ہے، ابو داؤدؒ کہتے ہیں کہ میں اس سے  
 روایت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں وار قطنیؒ کہتے ہیں کہ محدثینؒ اس میں کلام کرتے ہیں۔

(تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۴۴۴) حضرت عبد اللہ بن عمروؒ سے مرفوعاً ایک روایت یوں مروی ہے  
 كل صلوة لا یقرأ فیہا بفاتحة الكتاب فہی خداج (ابن ماجہ ص ۱۱۳) ہر وہ نماز جس میں

سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہے، ناقص ہے لیکن اس کی سند یوں ہے عن عمر بن شعیب  
 عن ابیہ عن جیدہ اور جلد اول بحث سکات امام میں اس پر سیر حاصل بحث گزر چکی ہے، اعادہ  
 کی ضرورت نہیں ہے وہاں ہی ملاحظہ کر لیں حضرت عبد اللہ بن عمروؒ سے مرفوعاً ایک روایت  
 اس طرح مروی ہے كل صلوة لا یقرأ فیہا بفاتحة الكتاب فہی خداج (کتب البقرة

ص ۳۲) جس نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی

عبدالوہاب بن عطاءؒ ہے، امام ساجیؒ اور ابو حاتمؒ کہتے ہیں لیس بالقوی عندہم محدثین کے  
 نزدیک یہ قوی نہیں ہے، امام نسائیؒ ان کو لیس بالقوی کہتے ہیں امام احمدؒ ان کو ضعیف

الحديث کہتے ہیں، امام بزارؒ کہتے ہیں لیس بالقوی، امام ابن حبانؒ ان کی ایک روایت کو

موضوع اور جعلی بتاتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۵۵۴) دوسرا راوی اس سند کا محمد بن

اسحاقؒ ہے جس کا ذکر عنقریب آئے گا (انشار اللہ تعالیٰ) اور تیسرا راوی (بلکہ کڑی) عمرو بن

شعیبؒ عن ابیہ عن جیدہ ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے ان کی ایک روایت مرفوعاً یوں ہے

كل صلوة لا يقرأ فيها بام القرآن فهي خداج (كتاب القراءة ص ۶۹) اس کی سند میں  
 عمرو بن شعيبؓ کے علاوہ ابوالصلت ہمدانی، امام ساجیؒ، نسائیؒ، ابوزرعہؒ، ابوعاتمؒ  
 اس کو ضعیف کہتے ہیں مسلمہ اور ابن طاہرؒ اس کو کذاب کہتے ہیں، دارقطنیؒ اور عقیلیؒ اس کو راہضی  
 خبیث کہتے ہیں (ترمذی جلد ۳۲) حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی ایک مرفوع روایت یوں  
 ہے كل صلوة لا يقرأ فيها بفتح الكتابة فهي مخدجة مخدجة، (كتاب القراءة ص ۳۲)  
 جس نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی گئی وہ ناقص ہے، ناقص ہے، ناقص ہے  
 لیکن اس میں عمرو بن شعیبؓ عن ابیہ عن جابرؓ واقع ہے اور علاوہ بریں اس سند کا ایک راوی عالم حوالہ  
 ہے امام احمد ان کو لیس بالقوی اور ضعیف الحدیث کہتے ہیں امام نسائیؒ کا بیان ہے کہ وہ قوی  
 نہ تھے، محدث حمید بن اسودؒ اس کو کمزور اور ضعیف کہتے ہیں رمیزان جلد ۲ ص ۲۷ و ترمذی الترمذی  
 جلد ۵ ص ۱۷ امام ابوعاتمؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث منکر ہے (توجیہ النظر ص ۲۴۵) مبارکپوری صاحبؒ  
 لکھتے ہیں کہ منکر وہ حدیث ہے جس میں ضعیف اور کمزور راوی متفرد ہو (تحفۃ الخواری ص ۶۴)  
 پس یہ جرح مبہم نہیں بلکہ مفسر ہے مولف "خیر الکلام" کا اس کو مبہم کہہ کر ٹال دینا غیر مقبول ہے  
 ان کی ایک روایت ان الفاظ سے بھی مروی ہے کہ سورۃ فاتحہ سکات امام میں پڑھنی چاہیے  
 ورنہ نماز خداج غیر تمام ہوگی (كتاب القراءة ص ۵۴) اس میں بھی عمرو بن شعیبؓ واقع ہے اور  
 دوسرا راوی محمد بن عبد اللہ بن عبیدہ بن عمیرؓ ہے سکات امام کی بحث دیکھیے۔ اس پر باحوالہ  
 جرح دہاں نقل کر دی گئی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً مروی ہے الركعتين اللتين لا يقرأ فيهما خداج  
 فقتل رجل يا رسول الله ارايت ان لم يكن معي الا ام القرآن قال هي حسبك  
 هي السبع المثاني (كتاب القراءة ص ۳۷) وہ دو رکعتیں جن میں قرأت نہ کی جائے وہ ناقص  
 ہوں گی ایک شخص نے دریافت کیا یا رسول اللہ یہ فرمائیے کہ اگر مجھے صرف سورۃ فاتحہ ہی یاد ہو؟  
 آپ نے فرمایا تجھے یہی کافی ہے کیونکہ یہ سبع مثانی ہے اس کی سند میں ابراہیم بن فضلؒ ہے  
 امام نسائیؒ کہتے ہیں وہ متروک ہے (ضعفاء ص ۳۲) علامہ ذہبیؒ امام ابن معینؒ امام احمدؒ ابوزرعہؒ اور دیگر  
 محدثین اس کو ضعیف الحدیث کہتے ہیں، ترمذیؒ کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں کہ وہ ضعیف الحدیث



ہے ابو احمد الحاکم کا بیان ہے کہ وہ قوی نہیں ابن حبانؒ ان کو کثیر الخطا کہتے ہیں، ازہریؒ اور دارقطنیؒ اس کو متروک کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں متروک، - (تقریب منہ) علاوہ انہیں حسب کتاب صرف کفایت پر دال ہے مگر فریق ثانی اس کی رکبیت اور وجوب کا مدعی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک موقوف روایت یوں ہے اقراوا اذا استکثروا و استکثروا اذا اقراوا فان الصلوة المندرجة التي لا قراة فيها (کتاب القراة ص ۶۶) تم قرأت کیا کہ وجوب امام خاموش ہوں اور جب وہ پڑھیں تو تم خاموش رہو کیونکہ جس نماز میں قرأت نہ ہو وہ ناقص ہے، اس روایت میں باوجود موقوف ہونے کے سورہ فاتحہ کا ذکر نہیں ہے علاوہ ہمیں اس میں اسحاق بن عبد اللہ بن ابی فروہؒ ہے امام علی بن المدینیؒ اس کو منکر الحدیث کہتے ہیں، ابن عمارؒ اس کو ضعیف اور ذاہب الحدیث کہتے ہیں ابو زرعہؒ، ابو حاتمؒ، نسائیؒ، دارقطنیؒ اور برقانیؒ اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں۔ ابن خزیمرہؒ کہتے ہیں اس کی حدیث سے احتجاج صحیح نہیں ہے خلیلیؒ کا بیان ہے کہ وہ محدثین کے نزدیک بہت زیادہ ضعیف ہے، امام مالکؒ اور شافعیؒ نے اس کو متروک قرار دیا ہے بزارؒ، ابن جاردؒ، عقیلیؒ، دعلجیؒ، ابو العربؒ، ساجیؒ ابو حاتمؒ، ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ سب اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۵ ص ۲۴۲)

حضرت ابو امامہؒ مرفوعاً روایت کرتے ہیں من لم یقرأ خلف الامام مفصلۃ قد خداج۔ (کتاب القداة وتحقیق الکلام جلد ۹۵) جس نے امام کے پیچھے قرأت نہ کی تو اس کی نماز ناقص ہوگی اس کی سند میں سلیمان بن سلمہؒ موصیؒ ہے امام ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ وہ متروک ہے ابن حنیہؒ کا بیان ہے کہ وہ جھوٹا ہے نسائیؒ اس کو لیس لیشیؒ کہتے ہیں ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ اس کی بے شمار حدیثیں منکر ہیں خطیبؒ کہتے ہیں کہ مشہور بالضعف یعنی ع بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا رمیزان جلد ۱۶ و لسان جلد ۳ ص ۹۳ علاوہ ہمیں اس میں سورہ فاتحہ کا ذکر بھی نہیں ہے۔

ایک دیہاتی گنوار (رجل من اهل بادية) اپنے والد سے مرفوعاً روایت کرتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا قیدی تھا کل صلوٰۃ لا یقرأ فیہا فاتحۃ الکتاب

فہی خداج لم تقبل (کتاب القراءة ص ۵۵) وتحقیق الکلام جلد ۱ ص ۹۵) ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو تو وہ ناقص ہوگی اور قابل قبول نہ ہوگی۔ مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۱ میں بھی یہ روایت ہے لیکن اس میں خداج کا لفظ نہیں ہے اس روایت میں یہ دیہاتی گنوار خود کون اور کیسا تھا؟ اور اس کا باپ کون تھا اور کیسا تھا؟ فن رجال اس سے خاموش ہے علامہ ہاشمیؒ لکھتے ہیں فیہ رجل لم یستہ اس میں مجہول راوی ہیں، آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قیدی اکثر کافر ہوتے تھے نہ معلوم یہ قیدی کس حالت میں تھا؟ اور کون تھا؟

حضرت مہرانؒ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا من لم یقرأ یاہ کتاب خلف الامام فصلاتہ، خداج (کتاب القراءة و مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۱) کہ جس شخص نے امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز ناقص ہوگی، اس روایت کی سند میں عبد الرحمن بن سوارؒ وغیرہ مجہول راوی موجود ہیں جن کا کتب رجال سے کوئی پتہ نہیں چلتا علامہ ہاشمیؒ لکھتے ہیں فی اسنادہ جماعۃ لا اعرفہم (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۱) کہ اس کی سند میں مجہول راویوں کا ایک گروہ ہے جن کا مجھے علم نہیں ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہؒ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کل صلوۃ لا یقرأ فیہا یاہ القرآن فہی خداج الا ان یکون وراء الامام (دارقطنی جلد ۴ ص ۱۴) ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہوگی ہاں مگر وہ نماز جو امام کے پیچھے ہو، امام دارقطنیؒ لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں یحییٰ بن سلامؒ ہے جو ضعیف ہے، اور یہ حدیث موقوف ہے (عبد الصمد ص ۱۲) علاوہ ہمیں اس روایت میں الا ان یکون وراء الامام کی استثناء بھی ہے جو فرق ثانی کو سرسری مخالفت پڑتی ہے خداج کی بعض روایات پر عبد اول کی بحث سکات امام میں کلام کیا جا چکا ہے وہاں ہی ملاحظہ کر لیں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

قاریین کہہ رہے ہیں خداج کی وہ ضعیف، کمزور معلل ہو سکتا، متروک اور لیست ہجۃ حدیثیں جن کے بل بوتے پر فرق ثانی نے تمام دنیا کے علماء احناف کو کھلا انعامی چیلنج کیا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے،



بیکار ہے اور باطل ہے (ملفوظ) اور ازراہ انصاف اور دیانت اس پر غور نہ کیا کہ جو جماعت اور فریق قرآن کریم، صحیح احادیث، صحیح آثارِ حضرات صحابہؓ اور اکثر سلف و خلف (اور جہری نمازوں میں تو بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہ جو شخص امام کے پیچھے قرات کرتا ہے وہ قرآنِ احادیث اور اجماع کا مخالف اور منکر ہے) کے خلاف چلتا ہے کہیں انہیں کی نماز میں خرابی نہ ہوتی ہو، دنیا کو چیلنج دینے سے قبل ٹھنڈے دل سے سوچنے کا پہلو یہ تھا۔

اے چشمِ اشکبار ذرا دیکھنے تو دے ہوتا ہے جو خراب وہ میرا ہی گھر نہ ہو

تصویر کا دوسرا رخ

آئیے ملاحظہ کر لیا کہ خداجِ مخدجۃ اور خندجۃ کی روایات کا روایتی پہلو کیا ہے؟ اور

ان کی اسانید کسی ہیں؟ اور ان کے راویوں کا کیا پایہ اور درجہ ہے؟

حضرات! اصل روایت یوں نہیں ہے جس طرح ان کمزور اور ضعیف راویوں نے نقل کی ہے

اور استثناء مبہم کر گئے ہیں، اصل حدیث کے الفاظ یوں ہیں (اس مضمون کی بسینل سے زائد حدیث پیش کی جاسکتی ہیں مگر سروسٹ ہم صرف چار روایتیں عرض کرتے ہیں)

پہلی روایت: كل صلاة لا يقرأ فيها بام القرآن فهي خداج الا صلاة خلف امام

(کتاب القراءۃ ص ۱۳) ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہوگی مگر ہاں جو امام کے

پیچھے پڑھی جائے، اس روایت کا ایک ایک راوی ثقہ ہے جیسا کہ جلد اول باب دوم میں عرض

ہو چکا ہے اور الا صلاة خلف امام کی زیادت کو بیان کرنے والے خالد بن عبد اللہ الطحان ہیں

جو بالاتفاق ثقہ، ثبت، حافظ اور الامام تھے، دوسری روایت یوں ہے كل صلاة لا يقرأ

فيها بام القرآن فهي خداج الا واد الامام (کتاب القراءۃ ص ۱۳) ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ

نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہوگی مگر ہاں وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی جائے اس کی سند بھی صحیح ہے اور

اس زیادت کو عبد اللہ بن محمود محدثی نقل کرتے ہیں جو ثقہ اور حافظ تھے جس کی پوری تفصیل پہلی

جلد میں نقل کی جا چکی ہے۔ تیسری روایت یوں ہے كل صلاة لا يقرأ فيها بفاتحة الكتاب

فلا صلاة له الا واد الامام (کتاب القراءۃ ص ۱۳) ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے

وہ ناقص ہوگی مگر امام کے پیچھے اس روایت میں اس زیادت کو علی بن کیسان نے بیان کیا ہے اور

یہ باقی روایتوں کی تائید میں پیش کی جا رہی ہے، چوتھی روایت حضرت جابرؓ کے حوالہ سے ابھی نقل کی جا چکی ہے جس میں إِلَّا وَدَّاءُ الْإِمَامِ کی استثناء موجود ہے، یہ روایت کتاب الفرائض میں اور دارقطنی جلد ۱۲ میں ہے دارقطنی کہتے ہیں کہ یحییٰ بن سلام ضعیف ہے اور یحییٰ کہتے ہیں کہ اس میں یحییٰ بن سلام کا وہم ہے یہ ٹھیک ہے کہ وہم اور خطا سے کوئی راوی نہیں بچ سکتا اگر یحییٰ بن سلام کو بھی کبھی وہم اور خطا سے دوچار ہوا پڑا ہے تو اس میں تعجب کی بات کون سی ہے؟ لیکن ذرا اس راوی کا خلع والے راویوں سے مقابل تو کر دیکھیں؟ ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ ان کی حدیث بھی جاسکتی ہے ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں ابوزرعةؒ ان کی لا بائس بلکہ لکھتے ہوئے توثیق کرتے ہیں ابوحاتمؒ ان کو شیخ اور صدوق کہتے ہیں ابوالعربؒ کہتے ہیں کہ وہ مفسر اور کان من الحفاظ ومن خیار خلق اللہ (لسان المیزان جلد ۲ ص ۶۶) حفاظ حدیث میں اور اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے بندوں میں تھے اگر فریق ثانی کے نزدیک محض اس وجہ سے کہ یہ إِلَّا أَنْ يَكُونَ وَدَّاءُ الْإِمَامِ کی استثناء نقل کرتے ہیں ضعیف ہیں تو یہ نہایت ہی تعجب اور حیرت و افسوس کی بات ہے، بلکہ ہم فریق ثانی کے معاملہ فہم اور اصحاب علم اور طبقات روایت رجال پر یقین اور گہری نگاہ رکھنے والے حضرات کو دعوت فحریہ ہے کہ وہ جن جن راویوں نے إِلَّا وَدَّاءُ الْإِمَامِ یا إِلَّا خَلْفَ الْإِمَامِ وغیرہ کی زیادت نقل کی ہے، ان کا ان راویوں سے موازنہ اور مقابل کر دیکھیں جو اس استثناء کو شیر مادر سمجھ کر ہضم کر بیٹھے ہیں مگر افسوس ہے کہ پھر بھی ان کی حدیثیں قابل اعتبار ہیں اور یہ زیادت نقل کرنے والے باوجود ثقہ، حافظ اور ثبت ہونے کے قابل ملامت ہیں خواہ اسفا۔

## لفظ کل کی تحقیق

بعض روایات میں (كُلُّ صَلَاةٍ) لفظ کل آیا ہے اور بہت سی روایات میں مقتدی کا یا خلف الامام کا ذکر نہیں ہے اور فریق ثانی کی طرف سے لفظ کل کے عموم کو لے کر ان سے استدلال کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے، بایں طور کہ گو ان روایتوں میں صراحت کے ساتھ مقتدی پر سورۃ فاتحہ کی قرأت نہیں سمجھی جاتی لیکن لفظ کل عام ہے جس سے ہر نماز مراد ہوگی، مقتدی کی نماز ہو یا منفرہ کی اگرچہ اصولی طور پر ہمارے ذمہ اس کی تحقیق ضروری نہیں ہے کیونکہ



سند کے لحاظ سے ایسی کوئی روایت صحیح نہیں ہے جس میں مقتدی پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہو حوت  
 سن کی بحث آپ پڑھ چکے ہیں اور لفظ خذّاج وغیرہ کے ساتھ جو روایتیں مروی ہیں وہ کمزور اور ضعیف  
 ہیں جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں اور سند کے لحاظ سے خذّاج وغیرہ کی جو روایتیں زیادہ صحیح ہیں ان میں  
 ثقات، حفاظ اور ائمہ سے اِذَا نَیْکُونُ وِیاءَ الْاِمَامِ اور اَلْاِیاءُ الْاِیْمَامِ کی زیادت بھی مروی ہے  
 جب اس زیادت اور استثناء کے بغیر خذّاج اور کل کے الفاظ سے پیش کی گئی کوئی روایت  
 صحیح نہیں ہے تو اصولی طور پر معنوی اور روایتی کلام کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے مگر ہم صرف  
 تکمیل کتاب اور افادہ طلبہ کے لیے چند اقتباسات درج کرتے ہیں جن سے یہ بتلانا مقصود ہے  
 کہ گو لفظ کل اپنے لغوی مفہوم کے لحاظ سے عام ہے لیکن استعمال میں کل اور بعض کے لیے اور عموم  
 وخصوص کے لیے برابر آتا رہتا ہے اور اگر وہ عموم و استغراق حقیقی کے لیے آتا ہے تو موقع اور محل  
 اور داخلی و خارجی قرینہ کا محتاج ہوتا ہے اور اگر کہیں اضافی استغراق اور بعضیت کے لیے استعمال  
 ہوتا ہے تب بھی قرینہ سے مستغنی نہیں ہو سکتا چند اقتباسات ہدیہ کئے جاتے ہیں بغور ملاحظہ کریں۔  
 ۱۔ اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک خاص موقع پر ارشاد فرماتا ہے۔ ثُمَّ  
 اجْعَلْ عَلَیْ کُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جَبْلًا (پ ۳۰) کہ ان کوفتہ چڑیلوں کی ایک ایک جڑ و ہر پہاڑ  
 پر رکھ دیں۔ ظاہر امر ہے کہ علیٰ کُلِّ جَبَل سے روئے زمین کے چھوٹے بڑے اور قریب و بعید کے  
 سب پہاڑ مراد نہیں ہیں اور نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہمالیہ اور نانگا پربت وغیرہ کی چوٹیوں پر  
 کوفتہ چڑیلوں کی بوٹیاں بلکہ قیمہ رکھنے کا تکلف ٹھہرایا گیا تھا اس موقع پر بھی کُل جَبَل سے بعض  
 مراد ہیں جو بالکل قریب ہوں گے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے کفر و شرک اور دیگر معاصی کا ارتکاب کرنے والی قوموں  
 پر بطور تنبیہ بعض آفاقی اور انفسی تکلیفیں مسلط کیں تاکہ وہ اپنی حرکات باز آجائیں جب انہوں  
 نے اثر پذیری کا ثبوت نہ دیا فَتَحْنَا عَلَیْہُمْ الْاَبْوَابَ کُلِّ شَیْءٍ (پ ۵، انعام ۵) تو ہم  
 نے ان پر ہر قسم کے دروازے کھول دیے قطعی بات ہے کہ بعض نعمتوں کے دروازے اُن پر  
 کھولے گئے ہوں گے نہ یہ کہ نبوت، رسالت اور مقبولیت درضا وغیرہ کے دروازے  
 بھی ان پر کھول دیے گئے تھے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ مکہ مکرمہ اور وادی غدیری ذریعہ کی مقبولیت کا ذکر یوں ارشاد فرماتا ہے  
 يُجِبِي إِلَيْكَ شَكَاتُ كُلِّ شَيْءٍ (پتا رکھو) ہر قسم کے میوے و ماں پہنچائے جاتے ہیں ،  
 آج کل کے اس دور ترقی میں بھی جب کہ مختلف طرق سے میوے خشک کر لیے جاتے ہیں اور  
 سیر و سیاحت و نقل و حرکت کے اسباب فراوانی سے موجود ہیں ، سال کے بارہ مہینے مکہ مکرمہ میں  
 پھل و پھل کی طرح کیا ہر قسم کے میوے و ماں پہنچتے ہیں ، بلکہ بعض میووں کے نام تک سے اہل مکہ واقف  
 نہ ہوں گے یہی کہا جائے گا کہ اس بے آب و گیاہ زمین میں ان کی روزی کا یہ سامان کیا گیا کہ بعض میوے  
 بعض اکناف سے پہنچائے جاتے ہیں۔

۴۔ حضرت ہود علیہ السلام کی مجرم قوم پر اللہ تعالیٰ نے باد صحر اور تیز و تند ہوا کے جھونکے  
 بھیجے تَدْمِرُ كُلَّ شَيْءٍ (پٹا، احقاف ۳۱) جو ہر چیز کو ہلاک کر گئے ، اور یہ بالکل عیاں ہے  
 کہ زمین و آسمان وغیرہ کے علاوہ حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے مومن ساتھی بھی تباہ نہ ہوئے تھے۔  
 ۵۔ تورات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (پٹا، احقاف ۳۱)  
 کہ اس میں ہر چیز کی تفصیل موجود ہے ، یہ بات آشکارا ہے کہ نہ تو واقعہ تورات میں ہر چیز کی تفصیل  
 موجود تھی کہ زمین کا ایک ایک ذرہ اُس میں درج ہوتا اور نہ تو علوم و معارف کے لحاظ سے وہ سب  
 احکام اس میں درج تھے جو قرآن کریم میں موجود ہیں ورنہ قرآن کریم کی تورات پر فوقیت اور  
 مزیت کیا ہوگی۔

۶۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔ تَفْصِيلًا لِّكُلِّ  
 شَيْءٍ اور تَبَيَّنًا لِّكُلِّ شَيْءٍ کہ قرآن کریم ہر چیز کی تفصیل اور ہر چیز کا واضح بیان ہے  
 یہ بالکل ٹھیک ہے کہ قرآن کریم میں عمائد و اعمال اخلاق و معاملات وغیرہ کے اصول اور قوانین  
 وضاحت اور صراحت کے ساتھ درج ہیں لیکن نماز کی جملہ رکعات ، زکوٰۃ کا نصاب ، حج اطواف  
 اور سعی وغیرہ وغیرہ کی تفصیل اور بیان قرآن میں نہیں ہے بلکہ یہ قرآن کی شرح اور اس کی تفسیر  
 حدیث شریف میں درج ہے اور صحیح حدیث بھی ویسے ہی منزل من اللہ ہے جیسے قرآن کریم۔  
 حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے انعامات کو پیش نظر رکھ کر تحدیث بالنعمة کے  
 طور پر فرماتے ہیں وَلَوْ بَيَّنَّا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (پٹا، نمل ۲۰) اور ہمیں ہر چیز دی گئی ہے۔ یہ



صحیح ہے کہ نبوت و رسالت، خلافت و سلطنت اور دیگر جو ساز و سامان ان کی شان کے لائق تھا وہ ان کو عطا کیا گیا تھا لیکن بے شمار اشیاء کے علاوہ نہ تو ان کو قرآن کریم عطا ہوا تھا اور نہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جلالت شان اور ختم نبوت اور نہ آپ کے حضرات صحابہ کرام ان کو عطا ہوئے تھے؟

۸۔ ذوالقرنین کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ اَتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ رِبًّا (پکا، کہفت) ہم نے اس کو ہر قسم کا سامان دیا تھا۔ یہ واضح بات ہے کہ وہی سامان ان کو ملا ہوگا جو ان کے حال اور شان کے مناسب ہو گا نہ یہ کہ آج کل نہ مانہ سائنس کے آلات واسلحہ اور ہلاکت خیز اٹیم بم اور بائیو روجن بم وغیرہ بھی ان کو ملے تھے۔

۹۔ ملکہ سبا (بلیس) کے بارے میں ارشاد ہوا ہے وَأَوْتَيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ رِبًّا (سورہ نمل، ۲۰) کہ ہر چیز اس کو عطا کر دی گئی تھی۔ اس کو بہت کچھ ملا ہوگا، مگر نبوت و رسالت اور ملک سلیمان علیہ السلام تو ہرگز نہیں ملا تھا۔ بلکہ علامہ ذہبیؒ تو لکھتے ہیں کہ کیا بلیس کو مخصوص مردانہ عضو اور ڈاڑھی بھی مل گئی تھی؟ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۵۷) قرآن کریم کے ان اقتباسات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ لفظ کُلِّ ہمیشہ اور ہر مقام پر کُلِّ ہی کے معنی میں نہیں آتا بلکہ عموم اضافی اور بعض کے لیے بھی آتا ہے ممکن ہے کسی کو تاہم کو یہ وہم پیدا ہو جائے کہ آخر میں پیش کردہ مقامات میں لفظ کُلِّ پر حرف مِّن داخل ہے جو بعض کے لیے آتا ہے لہذا بعضیت تو حرف مِّن سے ثابت ہوتی نہ کہ لفظ کُل سے، سو اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ لفظ کُل کو ہمیشہ اور ہر مقام میں عموم کے لیے نص قطعی سمجھتے ہیں ان کو حرف مِّن کا بہانہ بھی مفید نہیں ہوگا کیونکہ اس صورت میں مِّن کُلِّ شَيْءٍ کا معنی یہ ہوگا کہ ہر چیز سے کچھ اور بعض ان کو عطا ہوا ہو۔ کیا یہ صحیح ہوگا کہ دنیا میں جتنے بھی مرد گئے ہیں یا موجود ہیں ہر ایک کی ڈاڑھی اور ہر ایک کی مونچھوں سے بلیس کو کچھ حصہ عطا ہوا تھا؟ اور کیا یہ صحیح ہوگا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو سورہ فاتحہ میں سے اور سورہ بقرہ میں سے وعلیٰ ذلک لقیاس قرآن کریم کی جملہ سورتوں میں سے کچھ کچھ ملا تھا؟ کون اس جھیلے میں پڑے، بہت سی چیزیں کہنے کی بھی نہیں ہیں سمجھ دار خود سمجھ سکتے ہیں کہ ہر ہر چیز سے کچھ اور بعض ملنے کا مفہوم کہاں تک وسیع ہے اور اس سے کیا کچھ مراد نہیں لی جاسکتی؟ اب آپ دو تین حدیثیں بھی ملاحظہ کر لیں۔

۱۔ اس مضمون کی ایک روایت آتی ہے کہ ایک مرتبہ ایسی سخت اور زیادہ بارش ہوئی کہ حصّۃ کُلّ مشائی (بخاری جلد ۱ ص ۱۲ وغیرہ) اُس نے ہر چیز کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا کافی نقصان ہوا ہوگا لیکن آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور حضرات صحابہ کرامؓ و دیگر انسان اور جاندار بلکہ مدینہ طیبہ کے مکانات اور مسجد نبوی وغیرہ اس تباہی اور بربادی سے یقیناً محفوظ رہے تھے۔

۲۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کا بیان ہے کہ ایک موقع پر ہم ایک قوم کے مہمان بنے مگر ان لوگوں نے ہماری ضیافت وغیرہ کی مطلقاً پرواہ نہ کی، خدا تعالیٰ کی قدرت کہ ان میں سے ایک بڑے سردار کو کوئی ذمہ داری چیز ڈس گئی، انہوں نے اس پر جھاڑ پھونک کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ فَسَعَوْا لَهُ بِكُلِّ شَيْءٍ (بخاری ج ۱ ص ۳۴) وہ مجبور ہو کر ہمارے پاس آئے کہ تم میں کوئی جھاڑ پھونک (دوم) کرنے والا ہے ہم نے کہا ہے چنانچہ ان سے کچھ بچیاں لیکر (جو تیس تیس تھیں بخاری ج ۱ ص ۳۹) بات طے ہوئی اُس پر سورۃ فاتحہ پڑھو پھونکی گئی تو باذن اللہ تعالیٰ وہ بالکل تندرست ہو گیا (المختصر) ان صحابہ کرامؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سرب (جھاڑ رست) کی صورت میں ایک فوجی نم پر بھیجا تھا جہاں تیس سوار تھے (واقعی ص ۳۱۵) ان لوگوں نے اپنے سردار کو بچانے کے لیے ہر امکان کی کوشش کی ہوگی لیکن سورۃ فاتحہ نہ ان کے پاس تھی اور نہ انہوں نے پڑھی کیونکہ بظاہر وہ کافر و مشرک تھے اور کُلّ شئی کا ایک فرد سورۃ فاتحہ بھی ہے۔

۳۔ ایک حدیث اس مضمون کی آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کان یصومہ، کُلّہ (ترمذی جلد ۱ ص ۱۱۱ وغیرہ) یعنی سارے ماہ شعبان کے روزے رکھتے تھے، امام ترمذی نقل کرتے ہیں کہ دوسری احادیث کے پیش نظر حضرت امام عبد اللہ ابن مبارکؒ نے اس حدیث کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ لفظ کُلّ سے مراد یہاں اکثر ہے یعنی آپ نے سارے ماہ شعبان کے روزے نہیں رکھے بلکہ اکثر ماہ کے روزے رکھے ہیں۔ اس قسم کی حدیثیں اگر نقل کی جائیں تو یقیناً آپ اکتا جائیں گے ہم انہیں پر اکتفا کرتے ہیں، امام سرخسیؒ لکھتے ہیں۔ وکلمۃ کل وہی تحتل الخصوص نحو کلمۃ من اھ (اصول سرخسی جلد ۱ ص ۱۵) کہ کُلّ کا لفظ حرف من کی طرح خصوص کا احتمال رکھتا ہے علامہ محمد طاہر اور علامہ زبیدیؒ لکھتے ہیں کہ۔ قد يستعمل کل الموضوع للاحاطة بمعنى البعض (مجمع البحار جلد ۳ ص ۲۲۷) و تاج

لفظ کل جو احاطہ اور شمول کے لیے موضوع ہے کبھی کبھی بعض کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے



اور مشہور لغوی علامہ فیروز آبادی لکھتے ہیں کہ :-

وقد جاء بمعنى بعض ضد - لفظ کل کبھی بعض کے معنی میں آتا ہے جو اضداد

(القاموس جلد ۴ ص ۴۷) میں سے ہے۔

اور علامہ زبیدی تحریر فرماتے ہیں کہ

وقد جاء استعماله بمعنى بعض - کل کا استعمال کبھی بعض پر بھی ہوتا ہے اور یہ

(تاج العروس جلد ۸ ص ۱)

اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ لفظ کل اگرچہ وضع ترا حاط اور شمول کے لیے ہے مگر

اس کا استعمال کل اور بعض دونوں مندوں پر ہوتا رہتا ہے اور مشہور مفسر علامہ خازن لکھتے ہیں کہ

لفظة كل لا تقتضي الشمول والاحاطة لفظ کل شمول اور احاطہ کو نہیں چاہتا۔

(تفسیر خازن جلد ۱ ص ۲۸۶)

اور ملا جیون لکھتے ہیں کہ

وكملة كل يتحمل الخصوص (نور الانوار ص ۸) کہ کلمہ کل خصوص کا احتمال رکھتا ہے۔

اور فریق ثانی کو بھی اس کا اقرار ہے کہ لفظ کل اکثر کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے و مثله قول القائل

ان الشواخيرة طري . كل ذلك يفعل الوصي

(پرچہ اہلحدیث یکم ذوقعدہ ۱۳۴۷ھ)

اور مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں۔ والمراد بالكل اکثر وهو مجاز قليل الاستعمال

(تحفة الاحوذی جلد ۲ ص ۵۱) کہ لفظ کل سے مراد (یہاں) اکثر ہے اور لفظ کل کا اکثر کے

معنی میں استعمال مجازی ہے اور کم استعمال ہوتا ہے اتنی بات تو مبارکپوری صاحب کو بھی مسلم ہے

کہ لفظ کل سے کسی موقع اور محل پر مجازاً اکثر کا معنی بھی مراد لی جاسکتی ہے اور عموم کے معنی میں

یہ نص قطعی نہیں ہے لیکن اس کا اقرار کرتے ہوئے بھی ساتھ قلیل الاستعمال کا پیوند جوڑتے

ہیں۔ ہم نے چند مواقع قرآن کریم اور حدیث شریف سے صرف بطور نمونہ عرض کئے ہیں۔

اور اگر اس کے باوجود بھی یہ قلیل الاستعمال اور شاذ ہے تو شاید مبارکپوری صاحب اور ان کے

اتباع کا قلیل الاستعمال اور کثیر الاستعمال الفاظ کے لیے قاعدہ اور اصطلاح ہی جدا ہوگی۔

۴ رکھ لیا ہے نام اس کا آسمان تحریر میں

مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ان مثالوں میں یہ لفظ مجازی طور پر بعض کے لیے مستعمل ہے نہ یہ کہ اس کے اصلی اور حقیقی معنی ہی بدوں قرینہ یہ ہیں (محصلاً ص ۲۰۳)

الجواب :- ہم نے بھی تو یہی کہا ہے کہ لفظ کل اصل میں شمول اور احاطہ کے لیے ہے مگر احتمال کے لحاظ سے عموم و خصوص دونوں کا احتمال رکھتا ہے اور خصوص کی مثالیں یہ ہیں اس لیے کہ کل کے یہاں خصوص کے لیے ہے جہاں یہ صفت ہو جیسے حکم جو الملائکۃ کی صفت ہے تو وہاں عموم کے لیے ہے وہاں تخصیص کا احتمال بند ہے لہذا نور الانوار کا حوالہ مولف مذکور کو مفید نہیں ہے اور زیر بحث حدیث میں لفظ کل صفت نہیں ہے اس لیے خصوص کے لیے ہے۔

تیسری روایت :- جلد اول بحث سکتات اہم میں فریق ثانی کی بعض روایات پر کلام ہو چکا ہے اور بحث خداج میں متعدد حدیثیں نقل کر کے ان پر ملبوط جرح عرض کی جا چکی ہے گو کہ اس روایت کا درجہ تیسرا ہے مگر حقیقت میں اس کا نمبر پندرہ، سولہ سے کم نہ ہو گا ہم نے محض سہولت کی بنا پر نمبر شماری کا یہ سلسلہ اختیار کیا ہے، محمد بن اسحاق، المحول سے روایت کرتے ہیں اور وہ مؤرخ بن یعیسے اور وہ حضرت عبادہ بن الصامت سے وہ فرماتے ہیں۔

کنا خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
فی صلوۃ الفجر فقرأ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم فقلت علیہ القراءة فلما فرغ قال  
لعلکم تقرؤن خلف اما مکم قلنا  
نعم هذا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم قال لا تفعلوا الا بفاتحة الکتاب  
فانہ لا صلوۃ لمن لم یقرأ بہا۔  
(ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۱۹)

کہ صبح کے وقت ہم آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و  
سلم کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے اور آپ قرأت  
کر رہے تھے آپ پر قرأت ثقیل ہو گئی، جب آپ  
فارغ ہوئے تو فرمایا شاید تم اہم کے پیچھے قرأت  
کرتے ہو؟ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم جلدی  
جلدی پڑھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ صرف سورۃ فاتحہ  
پڑھا کرو کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی اور  
کچھ بھی نہ پڑھو۔

یہ روایت اسی پیش کردہ سند کے ساتھ ترمذی جلد ۱ ص ۱۱۹، دارقطنی ص ۱۲۰، مستدرک  
جلد ۱ ص ۲۳۸، جزء القراءۃ ص ۳۱۹، معجم صغیر ص ۱۳۳، للطبرانی اور سنن الکبریٰ



جلد ۲ ص ۱۶۲ وغیرہ میں موجود ہے اور نسائی جلد ۱ ص ۱۰۶ کی سند یوں ہے عن نافع بن محمد بن ربیعۃ عن عبادۃ بن الصامت الخ اور البوداذی جلد ۱ ص ۱۱۹ کی ایک سند یوں ہے عن مکحول عن نافع بن محمد بن ربیع الخ اور دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۱ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۵ میں بھی یوں ہی سند موجود ہے، اس حدیث کی سند کے مرکزی روایت یہی ہیں جن کا ذکر ہوا ہے کسی سند میں سب اکٹھے آجاتے ہیں اور کسی میں ان کی اکثریت اور کسی سند میں ان میں سے کوئی نہ کوئی آجاتا ہے۔

جواب :- فریق ثانی کا اس روایت سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے اور چونکہ یہ روایت ان کے دعوے کے لیے صریح دلیل ہے کیونکہ اس میں خلف الامام اور سورۃ فاتحہ کی خاص قید موجود ہے اور شاید اسی صریح روایت کے سہارے پدائوں نے تمام دنیا کے اصناف کو کھلا چیلنج کیا ہے اور غالباً ان کا یہ دعوے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے (بلفظہم) اس حدیث اور اس مضمون کی دوسری حدیثوں پر مبنی ہے اس لیے ہمیں اس پر قدرے تفصیل سے کلام کرنے کی اجازت دے دیجئے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی سامنے آجائے ہم نے جو باتیں اس حدیث کے سلسلہ میں عرض کرنی ہیں وہ یہ ہوں گی ۔

۱۔ محمد بن اسحاق پر کلام ۔ (۲) مکحول کا معیاری ثقہ نہ ہونا اور نیز اس کا مدلس ہونا اور یہ کہ نہ تو ان سے کسی صحیح سند سے تحدیث ثابت ہے اور نہ کوئی ثقہ متابع موجود ہے جس کی سند بھی صحیح ہو (۳) نافع بن محمد مجہول ہے (۴) روایت میں اضطراب موجود ہے (۵) یہ روایت موقوف ہے مرفوع نہیں ہے (۶) اَلَا بِاَمْرِ الْقُرْآن کی استثناء ضعیف ہے (۷) لفظ خلف الامام مدرج ہے (۸) بنا بر صحت خلف الامام کا معنی کیا ہے؟ آسانی اور سہولت کے لیے ہم ان آٹھ شقوں کو جواب تصور کرتے ہیں ۔

لہذا آٹھ جواب آپ ملاحظہ فرمائیں ۔

پہلا جواب :- محمد بن اسحاق کو گو تاریخ اور مغازی کا اہم سمجھا جاتا ہے لیکن محدثین اور ارباب جرح و تعدیل کا تقریباً پچانوے فیصدی گروہ اس بات پر متفق ہے کہ روایت حدیث میں اور خاص طور پر سنن اور احکام میں ان کی روایت کسی طرح بھی حجت نہیں ہو سکتی اور اس لحاظ سے ان کی روایت کا وجود اور عدم بالکل برابر ہے، تصریحات ملاحظہ کریں ۔

امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ وہ قوی نہیں ہے (ضعفاء صغیر ص ۵۲) ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے (کتاب العلل جلد ۱ ص ۲۳) ابن نمیرؒ یہ کہنے کے بعد بھی کہ جب وہ معروف راویوں سے روایت کرے تو حسن الحدیث اور صدوق ہے یہ بھی تصریح فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ مجہول روایت سے باطل روایات نقل کرتا ہے (بخاری جلد ۱ ص ۲۲) دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے۔ (ایضاً جلد ۱ ص ۲۳) سلیمان تمیمیؒ کہتے ہیں کہ وہ کذاب ہے، ہشام بن عروہؒ کہتے ہیں کہ وہ کذاب ہے، امام جرح و تعدیل یحییٰ قطانؒ کہتے ہیں کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ کذاب ہے (میزان جلد ۲ ص ۲۱) وریب بن خالدؒ اس کو کاذب اور جھوٹا کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۵۵) امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ وہ دجالوں میں ایک دجال تھا (میزان جلد ۲ ص ۲۱) و تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۵۵) نیز امام امام مالکؒ نے اس کو کذاب کہا ہے (بخاری جلد ۱ ص ۲۳) جریر بن عبد الحمیدؒ کا بیان ہے کہ میرا یہ خیال نہ تھا کہ میں اس زمانہ تک زندہ رہوں گا جس میں لوگ محمد بن اسحاقؒ سے احادیث کی سماعت کریں گے (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۱) ابو زرہؒ کا بیان ہے کہ بھلا ابن اسحاقؒ کے بارے میں بھی کوئی صحیح نظریہ قائم کیا جاسکتا ہے؟ وہ تو محض بیچ تھا (توجیہ النظر ص ۲۸) امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ محدثین اور

لے تقریب النواوی میں ہے واذا قالوا متروک الحدیث او واہیہ او کذاب فہو ساقط لا یتکب حدیثہ ص ۲۳) کہ جب محدثین کسی راوی کے بارے میں متروک الحدیث یا واہی الحدیث یا کذاب کہتے ہیں تو وہ ساقط الاعتبار ہوتا ہے اس کی روایت لکھی بھی نہیں جاسکتی اور اس کی شرح تدریب الراوی میں لکھا ہے کہ وان یعتبر بلہ ولا یستشہد ص ۲۳) ایسے راوی کی حدیث کو اعتبار و متابعت اور شاہد کے لیے بھی پیش نہیں کیا جاسکتا لیکن افسوس ہے کہ فرقی مخافت نہ صرف یہ کہ اس سے استدلال کرتا ہے بلکہ اس کے بل بوتے پر مسلمانوں کی اکثریت کی نماز کو باطل، بیکار اور کالعدم قرار دینے کا ادھر ادھر کھائے بیٹھا ہے۔ ترجمان الحدیث ماہ ستمبر ۱۹۷۲ء ص ۲۱ تا ۲۳ وغیرہ میں محمد بن اسحاقؒ کی توثیق پر ادھر ادھر کے چند حوالے نقل کر کے خاصاً زور صرف کیا ہے لیکن ائمہ جرح و تعدیل کی اس کڑی جرح کا کہ محمد بن اسحاقؒ کذاب ہے کوئی جواب نہیں دے سکے اور نہ اس کا جواب دے سکے ہیں کہ احکام و سنن میں ان کی روایت محبت نہیں ہے باقی جن حضرات نے ان کو صدوق اور حسن الحدیث وغیرہ کہا ہے تو وہ تاریخ اور مغازی وغیرہ سے متعلق ہے نہ کہ بنیادی احکام اور سنن وغیرہ سے۔



حفاظ حدیث ابن اسحاق کے تفردات سے گریز کرتے ہیں (سنن الکبریٰ بحوالہ الجوہر النقی جلد ۱۵۵) علامہ ماروینی لکھتے ہیں کہ ابن اسحاق میں محدثین کے نزدیک مشہور کلام ہے (الجوہر النقی جلد ۱۵۵) عبد اللہ فرماتے ہیں کہ میرے والد امام احمد بن حنبلؒ لہ یکن یحییٰ بہ فی السنن (بغدادی جلد ۲۱) و تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۴۴) سنن اور احکام میں وہ ان سے اختلاج نہیں کرتے تھے حنبلؒ بن اسحاق کا بیان ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا ابن اسحاق لیس بجحۃ (بغدادی جلد ۲۱) و تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۴۴) ابن اسحاق حجت نہیں ہے، ابو بکر بن اسحاق کا بیان ہے کہ میں نے امام احمدؒ سے دریافت کیا ابن اسحاق جب کسی حدیث کے بیان کرنے میں متفرد ہو تو اس کی حدیث حجت ہوگی؟ قال لا واللہ (بغدادی جلد ۲۱) فرمایا بخدا ہرگز نہیں، ابن ابی خثیمہ کا بیان ہے کہ ابن معینؒ نے اس کو لیس بذالک، ضعیف اور لیس بالقوی کہا میمونؒ کا بیان ہے کہ ابن معینؒ نے اس کو ضعیف کہا ہے (بغدادی جلد ۲۱) و تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۴۴) علی بن المدینی کا بیان ہے لہ یضعفہ عندی الا روایتہ، عن اہل الکتاب (تہذیب جلد ۹ ص ۴۴۴) میرے نزدیک ابن اسحاق کو صرف اس بات نے ضعیف کر دیا ہے کہ وہ یہود اور نصاریٰ سے روایتیں لے لے کر بیان کرتا ہے۔ مشہور اور قدیم مؤرخ علامہ ابوالفرج محمد بن اسحاقؒ بن ندیمؒ (المتوفی ۳۸۵ھ) اپنی کتاب الفہرست میں محمد بن اسحاقؒ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ۔

مطعون علیہ غیر مرضی الطریقتہ  
الی ان قال وکان یحی عن الیہود والنصارا  
ولیسیمہم فی کتبہم اہل العلم الاول و  
اصحاب الحدیث یضعفونہ ویہمونہ  
(الفہرست لابن التدیہ ص ۱۲۲ طبع مصر)  
اس پر طعن کیا گیا ہے اور اس کا طریقہ ناپسندیدہ  
تھا (پھر آگے فرمایا کیونکہ) وہ یہود اور نصاریٰ سے  
روایات لیتا تھا اور اپنی کتابوں میں ان کو پہلے علم  
دولے کہا کرتا تھا اور اہل حدیث اس کو ضعیف  
کہتے ہیں اور اس کو مستحکم قرار دیتے ہیں۔

امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ بعض محدثین نے ان کے حافظ کی خرابی کی وجہ سے اس میں کلام کیا ہے  
(کتاب العلل جلد ۲ ص ۲۳) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ جو راوی صحیح کی شرطوں کے مطابق نہیں ہیں۔  
ان میں ایک محمد بن اسحاقؒ بھی ہے (مقدمۃ نووی ص ۱) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ ابن اسحاقؒ

کی روایت درجہ صحت سے گری ہوئی ہے اور حلال و حرام میں اس سے احتجاج درست نہیں ہے  
 (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۶۳) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں ابن اسحاقؒ احکام کی روایات میں حجت نہیں ہے۔  
 خصوصاً جب کہ متفرد ہو اور جب کوئی ثقہ راوی اس کے خلاف روایت کرتا ہو تو ابن اسحاقؒ کی روایت  
 قابل توجہ ہی نہیں ہو سکتی (درایہ ص ۱۹۱) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ نے ابن اسحاقؒ کی روایت  
 کو منکر کلمہ ہے اور اس کو ضعیف بتایا ہے (زاد المعاد جلد ۱ ص ۱۲۳) علامہ منذریؒ اور حافظ سخاویؒ لکھتے  
 ہیں کہ امام احمدؒ نے فرمایا مغازی میں ابن اسحاقؒ کی روایات تو کھسی جاسکتی ہیں لیکن جب حلال و حرام  
 کا مسئلہ ہو تو اس میں ایسے ایسے راوی (یعنی ثقہ اور ثبت) درکار ہیں (الترغیب والترہیب جلد ۴  
 ص ۲۹ و فتح المغیث ص ۱۲) قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ ابن اسحاقؒ لیس بحجة لا سیما اذا عنعن  
 (نیل الاوطار جلد ۱ ص ۲۳۲) ابن اسحاقؒ کی روایت حجت نہیں ہے خصوصاً جب کہ وہ عنفہ  
 سے روایت کرتا ہو نو اب صدیق حسن خان صاحبؒ ایک حدیث کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ در سندش نیز  
 ہماں محمد اسحاقؒ است و محمد بن اسحاقؒ حجت نیست (دلیل الطالب ص ۲۳۹) حضرت مولانا شیخ السنہ  
 الحسن صاحبؒ (المتوفی ۱۳۳۹ھ) نے (ایضاح الادلة ص ۵۷) میں ابن اسحاقؒ پر سیر حاصل کلام کیا ہے  
 اور ان تمام رکیک اور ضعیف تاویلوں کے دندان شکن جوابات دیے ہیں جو اس کو ثقہ قرار دینے کے  
 لیے اختیار کی گئی ہیں طلبہ ضرور اس کا مطالعہ کریں۔ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ شاید ہی جرح کا کوئی  
 ادنیٰ سے اعلیٰ تک ایسا لفظ ملے گا جو جمہور محدثینؒ اور ارباب جرح و تعدیل نے محمد بن اسحاقؒ کے بارے  
 میں نہ کہا ہو محمد بن اسحاقؒ فریق ثانی کے نزدیک ثقہ ہے اور حضرت امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ  
 ضعیف ہیں (مدد الاہلۃ ص ۲۳۵) فوا اسحاق۔ حافظ ابن حجرؒ نے نہایت ضعیف اور رکیک  
 تاویلیں کرنے کی بے جا سعی کی ہے تاکہ ابن اسحاقؒ کو قابل اعتبار بنانے کی کوشش کامیاب ہو  
 سکے مثلاً یہ کہ سلیمان بن یحییٰ ائمہ جرح و تعدیل میں نہ تھے اور امام مالکؒ نے اپنے الفاظ سے رجوع کر  
 لیا تھا وغیرہ وغیرہ مگر یہ سب کوشش بیکار اور کالعدم ہے۔ اگر بالفرض سلیمان بن یحییٰ ائمہ جرح و تعدیل  
 میں نہ تھے تو کیا بشام بن عروہؒ، امام الحرمینؒ، امام القطانؒ، دہیبؒ بن خالدؒ، امام احمدؒ  
 بن حنبلؒ، یحییٰ بن معینؒ، علی بن المدینیؒ، جریر بن عبد الحمیدؒ، امام نسائیؒ، خطیبؒ، ابن غیرؒ، دارقطنیؒ  
 البرزعیؒ اور علامہ ذہبیؒ وغیرہ بھی ائمہ جرح و تعدیل میں نہیں ہیں؟ اور کیا ان سب نے ان



صرحی الزامات سے رجوع کر لیا ہے؛ باقی امام مالکؒ کا رجوع کرنا بھی محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے خطیبؒ لکھتے ہیں اما کلام مالکؒ فی ابن اسحاقؒ فمشہور غیہ خاف علیٰ احد من اهل العلم بالحديث (ریغدادی جلد ۱ ص ۲۲۴) امام مالکؒ نے ابن اسحاقؒ میں کلام کیا ہے وہ کسی بھی ایسے شخص سے مخفی نہیں ہے جس کو فن حدیث کا علم حاصل ہے امام ابن الجوزیؒ (المؤنی، ۵۹ھ) اپنی کتاب الموضوعات میں لکھتے ہیں کہ۔

اما محمد بن اسحاقؒ فمخرج شہد بکذبہ مالکؒ وسليمان التيمي ووهيب بن خالد وهشام بن عرفة ويحيى بن سعيد وقال ابن المديني يحدث عن الجمهورين بأحاديث باطلة (نصب الراية جلد ۲ ص ۲۸۱) بہر حال محمد بن اسحاقؒ مجروح ہے اس کے جھوٹا ہونے کی امام مالکؒ سلیمان تیمیؒ، وہیب بن خالدؒ، ہشام بن عروہؒ اور یحییٰ بن سعید بن العطانؒ نے گواہی دی ہے، اور امام ابن المدينيؒ فرماتے ہیں کہ وہ مجہول راویوں سے باطل حدیثیں بیان کرتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اس شدید قسم کی مفسر جرح سے رجوع کا ثبوت امام ابن جوزیؒ کے علم میں نہیں ہے اور امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ:-

وكان مالك بن النضر لا يرضاه ويحيى بن سعيد بن القطان لا يروى عنه ويحيى بن معين يقول ليس هو بحجة ولحمد بن حنبل يقول يكتب عنه هذا لأحاديث اعني المغاذي فاذا جأ الحلال والحرام اردنا قوما هكذا يريد اقوامي منه فاذا كان لا يحج به في الحلال والحرام فاولى ان لا يحج به في صفات الله سبحانه وتعالى وانما نقموا عليه في روايته عن اهل الكتاب ثم عن متفقاء الناس وقد ليس اساميه فاذا روى عن ثقة وبيّن امام مالکؒ اس کو درجائے روایت (پند نہیں کرتے تھے اور یحییٰ بن سعید بن العطانؒ اس سے روایت نہیں لیتے تھے اور ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ وہ حجت نہیں اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مخازی کی حدیثیں تو لکھی جاسکتی ہیں لیکن حلال و حرام کی روایتوں میں ہم قوی راویوں کو تلاش کریں گے پس جب حلال و حرام میں ابن اسحاقؒ کی روایت حجت نہیں تو صفات اللہ تعالیٰ میں بطریق اولیٰ اس کی روایت حجت نہیں ہو سکتی اور محدثینؒ نے اس پر جو عیب لگایا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اہل کتاب کے روایت کرتا ہے اور ضعیف قسم کے لوگوں سے بھی روایت

سماعہ، منہ فی جماعة من الامة له  
یرواہ یاساھ  
کتاب الاسماء والصفات ص ۲۹  
کر تا ہے اور ان کے ناموں میں تدلیس سے کام لیتے  
پس جب وہ ثقہ سے روایت کرے اور سماع کی تصریح  
بھی کرے تو ائمہ کی ایک جماعت اس میں مضائقہ  
نہیں سمجھتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام احمد نے ابن اسحاق کو جو حسن الحدیث کہا ہے تو مغازی وغیرہ کی حدیثوں  
سے متعلق کہا ہے نہ کہ احکام اور حلال و حرام کی حدیثوں کے بارے میں اور علامہ ذہبی نے سفیان بن  
حسین کے ترجمہ میں نقل کیا ہے کہ لایحتاج بہ کتھو محمد بن اسحاق یعنی محمد بن اسحاق کی طرح  
اس سے بھی احتیاج درست نہیں ہے اور کتاب العلویں اس کو صاحب مناکیر وغرائب بتایا ہے  
ائمہ جرح و تعدیل نے ان میں جو کلام کیا ہے وہ فن روایت کے رُوسے ہے اور محض دیانتہ ہے اس  
کو حالت غصہ پر حمل کرنا جیسا کہ مولف خیر الکلام نے ص ۱۹۵ میں کیا ہے صرف رام کہانی ہے اور ص ۱۹۹ و  
ص ۲۰۰ میں بحوالہ تحفۃ الاحوذی جلد ۲ ص ۲۵۳ وغیرہ رجوع کے لیے جو قصہ نقل کیا ہے اس سے ان کا رجوع  
رجوع ہرگز ثابت نہیں ہوا محض کثیر ہے ہاں بعد کے محدثین نے اپنے ظن اور تخمینہ سے رجوع پر  
حمل کیا ہے۔ مگر یہ ان کی اپنی صوابدید ہے مولف خیر الکلام کا ص ۲۱۱ میں امام مالک اور یحییٰ بن سعید  
کی جرح کو مفسر قرار دینا اور باقی حضرات کی جرح کو مبہم کہہ کر گلو خلاصی کہ نامحض تکلیف کا سامان ہے  
غرضیکہ ان تمام حضرات کی جرح مفسر کڑی اور شدید ہے اور کسی کا تاریخی طور پر صراحت کے ساتھ رجوع  
ثابت نہیں ہے مولف خیر الکلام کا ص ۲۱۲ میں یہ لکھنا کہ محمد بن اسحاق پر ایک الزام اہل کتاب سے روایت  
لینا بھی ہے حالانکہ اہل کتاب سے روایات لینا کوئی جرم نہیں تو ان کی بے خبری اور غفلت کی  
واضح دلیل ہے کہ وہ مطلقاً اہل کتاب کی روایت کو جائز سمجھتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب  
تقریر لکھتے ہیں کہ :-

اقوال الروایة عن اهل الکتاب تجوز فیما سبیلہ  
سبیل الاعتبار و حیث یکون الامن عن الاختلاط  
فی شرائع الدین ولا تجوز فیما سوی ذالک -  
میں کہتا ہوں کہ اہل کتاب کے روایت الیہ معاملات میں  
جہاں غیرت مظلوم ہو اور جہاں دین کے احکام میں اختلاط  
واقع نہ ہوتا ہو درست ہے، اور اس کے علاوہ ان سے  
روایت جائز نہیں ہے۔  
(حجة الله البالغة جلد ۱ ص ۱۷۱)



اور اسی لیے امام المدینیؒ نے اس کو ضعیف کہا ہے کہ وہ اہل کتاب کے روایت کرتا ہے جیسا کہ تہذیب  
التہذیب کے حوالہ سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ مولف خیر الکلام نے جن بعض ائمہ کی بسند ابن اسحاقؒ توثیق  
نقل کی ہے تو وہ مسلم ہے مگر وہ صرف تاریخ اور مخازی وغیرہ کے بارے میں نہ کہ صفات اللہ، حلال و  
حرام، احکام اور سنن کے بارے میں اور مخازی میں وہ ثقہ بھی ہیں اور امام بھی اس میں نزاع نہیں ہے اور  
بلا شک حافظ ابن ہمامؒ اور علامہ علیؒ وغیرہ نے محمد بن اسحاقؒ کی توثیق کی ہے مگر ائمہ جرح و تعدیل کی کڑی  
اور سنگین جرح کے مقابلہ میں ان کی توثیق مسلم نہیں ہے۔ فریق ثانی کے شیخ الكل مولانا سید نذیر حسین صاحب  
دہلویؒ (المتوفی ۱۳۲۰ھ) لکھتے ہیں کہ۔ اور ضعیف کہنا غزالیؒ کا اور ربیانیؒ کا اور دہلویؒ کا اور صاحب  
ہدایہؒ کا اور شیخ ابن الہمامؒ کا اور بعض مالکیوں کا حدیث کو ضعیف نہیں کر دیتا کیونکہ یہ لوگ مقلدین  
ہیں ائمہ جرح و تعدیل میں سے نہیں ہیں الی ان قال اب رہا ضعیف کہنا ابن عبد البرؒ کا اور البوداؤدؒ کا اور  
علی بن المدینیؒ کا۔ سو البتہ جرح ان کا پایہ اعتبار میں ہے لیکن اگر با بیان سبب اور بادل ہو تو معتبر  
ہے درجہ بیان سبب ان کا جرح بھی مقبول نہیں ہونے کا الخ (معیار الحق ص ۲۴۲) اور مولانا محمد عبداللہ  
صاحب روپڑیؒ (المتوفی ۱۳۵۰ھ) لکھتے ہیں کہ جرح تعدیل تاریخ کی قسم سے ہے اور تاریخ اس  
وقت کے لوگوں کی معتبر ہوتی ہے پچھلے لوگ نقل ہوتے ہیں اس لیے پہلے لوگوں کے خلاف کسی  
کی جرح تعدیل کا اعتبار نہیں اس کے لیے مقدمہ ابن الصلاحؒ کا مطالعہ مفید رہے گا۔ انشاء اللہ  
اللہ (مودودیت اور احادیث نبویہ ص ۹) رہا محمد بن اسحاقؒ کا مدلس ہونا تو یہ سب کے نزدیک  
مسلم ہے چنانچہ علامہ بیہقیؒ، حافظ ابن حجرؒ، قاضی شوکانیؒ، نواب صدیق حسن خاںؒ، مولانا شمس الحقؒ  
عظیم آبادیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ کو اس کا صاف اقرار ہے۔ دیکھئے جمیع الزوائد  
جلد ۱۵ و تقریب ص ۳۱۳، نیل الاوطار جلد ۴ ص ۴۳، دلیل الطالب ص ۲۳۹، تعلیق  
المقنی جلد ۱ ص ۱۲، ابکار المصنف ص ۴۵ و تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۹۱

اعتراض :- مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ محمد بن اسحاقؒ ثقہ ہے اور دلائل یہ ہیں۔  
(۱) امام بخاریؒ اس کو ثقہ کہتے ہیں (۲) امام شعبہؒ اس کو امیر المحدثین کہتے ہیں (۳) ابن مدینیؒ  
اور احمد بن حنبلؒ وغیرہ اس کو ثقہ کہتے ہیں (۴) اگر یہ ثقہ نہیں تو احادیث اذان، قطع شمرقہ اور  
تجیل افطار میں ابن اسحاقؒ کی روایتوں سے احتجاج کیوں کرتے ہیں (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۱۰)

جواب :- مبارکپوری صاحب کے یہ جملہ اعذار بار دہونے کے سبب مطلقاً قابل التفات نہیں ہیں ہر شق کا جواب سنئے (۱) ایسے کذاب اور دجال راوی کے ہائے میں امام بخاریؒ وغیرہ کی رائے کیا وقعت رکھتی ہے؟ خصوصاً جب کہ امام بخاریؒ نے ابن اسحاقؒ کا زمانہ نہیں پایا اور ہشام بن عروہؒ امام مالکؒ اور یحییٰ القطانؒ وغیرہ اس کا زمانہ پائے والے انتہائی سنگین الزام اس پر عائد کرتے ہیں اور یہ بڑے محتاط اور عارف باسباب المخرج بھی ہیں۔ علاوہ بریں اگر واقعی محمد بن اسحاقؒ ثقہ ہے تو حضرت امام بخاریؒ نے باوجود اشد ضرورت کے صحیح بخاری میں اس سے احتجاج کیوں نہیں کیا؟

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

یہ حضرت امام بخاریؒ وغیرہ کی ذاتی رائے ہے حق وہی ہے جو جمہور نے کہا ہے چنانچہ نواب صاحب ایک مقام پر لکھتے ہیں جمہور اہل اسلام کے نزدیک ایسی حدیث سے جو حسن ہو احتجاج صحیح ہے لیکن امام بخاریؒ حدیث حسن سے احتجاج کے قابل نہیں ہیں آگے نواب صاحب لکھتے ہیں والحق ماقالہ الجمہور (دلیل الطالب ص ۸۲) حق بات صرف وہی ہے جو جمہور نے کہی ہے قاضی شوکانیؒ نے بھی امام بخاریؒ اور ابن العربیؒ کا یہ مسلک نقل کر کے آگے لکھا ہے والحق ماقالہ الجمہور (در نیل الاوطار جلد ۱ ص ۲۲) کہ حق وہی ہے جو جمہور نے کہا ہے (۲) امام شعبہؒ کی بات اگر محمد بن اسحاقؒ کے ہائے میں محبت ہے تو جابر جعفیؒ و حویرۃ خلف الامام ہی کی ایک روایت کا راوی ہے مگر ہم نے اس سے احتجاج نہیں کیا کہ ہائے میں کیوں محبت نہیں ہے؟ امام شعبہؒ ان کو بھی ثقہ کہتے ہیں و کتاب التقرۃ ص ۱۷۰ میزان جلد ۱ ص ۱۶۹، تہذیب جلد ۲ ص ۲۷۰ و توجیہ النظر ص ۲۹۱ وغیرہ علاوہ بریں مبارک پوری صاحب کے نزدیک امیر المحدثین ہونے سے تشریح کیسے لازم آتی ہے؟ مبارک پوری صاحب تو لکھتے ہیں کہ علامہ تاج الدینؒ نے ابو طہر فقیہ کو گو شیخ، ادیب، عارف اور امام المحدثین والفقہاء لکھا ہے۔ قلت لا دلالۃ فی هذا علی کونہ ثقہ قابلاً للاحتجاج (تعمت الاحوذی جلد ۵ ص ۱۷) لیکن میں کہتا ہوں کہ امام المحدثین والفقہاء ہونے سے یہ کیسے لازم آیا کہ وہ ثقہ اور قابل احتجاج بھی تھے، محقق نیمویؒ نے ابو عبد اللہ فخر بن جوزیؒ کو کبار محدثین میں لکھا ہے مبارک پوری صاحب ان پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فان مجرد کونہ من کبار المحدثین لا یتلزم ان کے صرف کبار محدثین میں ہونے سے یہ کیسے لازم



کو نہ ثقہ (انتہی بلفظ تحفۃ الاحوذی جلد ۲) آیا کہ وہ ثقہ بھی تھے؟

مبارک پوری صاحب ہی ازراہ بزرگی وانصاف فرمائیں کہ جن کے بارے میں جرح کا ایک لفظ بھی موجود نہ ہو اور علامہ تاج الدین سیکی وغیرہ جیسے اہم اور ثقہ علم ان کو اہم المحدثین اور کبار المحدثین کہیں مگر معذرا ان کی ثقاہت ثابت نہ ہو سکے اور محمد بن اسحاق کو ائمہ جرح وتعدیل کذاب اور دجال تک کہتے ہوں تو اس کے (بقول اہم شعبر) امیر المحدثین ہونے سے اس کی ثقاہت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟

ٹھوکر میں مت کھائیے چلے سنبھل کر دیکھ کر چال سب چلتے ہیں لیکن بندہ پروردگار کے  
(۳) اہم ابن ہدیسیؒ اور اہم احمد بن حنبلؒ وغیرہ کو مطلقاً ابن اسحاق کے موثقین میں شامل کرنا انتہائی غفلت اور طبقات روایت سے بے خبری پر مبنی ہے باحوالہ ان کے اقوال نقل کئے جا چکے ہیں کہ یہ بھی ابن اسحاق کو مجروح اور ضعیف قرار دیتے ہیں لہذا ان کا ذکر مطلقاً محدثین میں جہالت پر مبنی ہے اہم نوویؒ فرماتے ہیں کہ اگر جرح وتعدیل کا تعارض ہو اور جرح امر خفی پر مطلع ہو چکا ہو جس کی اطلاع معدل کو نہیں تو جرح تعدیل پر مقدم ہے اور یہی محققین اور جمہور کا مختار ہے (شرح مسلم ج ۱ ص ۲۱) اور نیز وہ کہتے ہیں کہ فانہم متفقون علی انہ لا یخرج بالضعیف فی الاحکام (ایضاً) یعنی محدثین کرامؒ اس بات پر متفق ہیں کہ ضعیف راوی سے احکام میں احتجاج واستدلال کرنا درست نہیں ہے اور ابن اسحاقؒ پر جرح مفسر اور یابیان سبب اور یہ روایت احکام شرعیہ میں سے ایک حکم سے متعلق ہے اور بھی تو فریق ثانی احناف کی نماز کو بیکار باطل اور کالعدم قرار دے کر اعاذ اللہ تعالیٰ ان کو فی السقر پہنچانے کا اُدھار کھائے بیٹھا ہے اور چیلنج دیتا ہے اندر میں حالات ابن اسحاقؒ کی روایت کی کیا وقعت ہے؟

(۴) علماء احناف نے اذان، قطع سرقہ اور تعجیل افطار وغیرہ کے بارے میں اگر محمد بن اسحاقؒ سے استدلال کیا ہے تو کیا صرف استدلال ہی کیا ہے یا فریق ثانی کو مباہلہ اور مفیدین عمل ہونے کا چیلنج بھی کیا ہے؟ اور کیا محمد بن اسحاقؒ کی روایات کو لے کر تمام ردائے زمین کے غیر مقلدوں پر اشتہاری رعب بھی قائم کرنے کی کوشش کی ہے؟ اور کیا یہ کہا ہے کہ فریق ثانی کا فلاں فلاں عمل ناقص اور بیکار باطل اور کالعدم ہے؟ اگر محمد بن اسحاقؒ جیسے ضعیف اور کمزور راوی کی روایت کو احناف نے دلیل بنا کر ایسا کیا ہے تو خطا کی ہے اور کیا احناف نے محمد بن اسحاقؒ کی روایت کو نص قرآنی اور

صحیح احادیث کے خلاف حجت سمجھا ہے اگر احناف نے اس کی روایت کو کسی موقع پر بطور حجت بھی پیش کیا ہو تو یقین جانتے کہ تمام روئے زمین کے غیر مقلدین کو لٹکارا اور کھلا چیلنج بھی ہرگز نہ کیا ہوگا اور نہ حلفیہ طور پر ان کو بے عمل کہا ہوگا؛ انصاف شرط ہے باقی جو حدیثیں مبارکہ پوری کتاب نے ہماری دلیلیں تصور کر لی ہیں ان کی کوتاہ فہمی ہے ہم سے پوچھئے کہ ان مسائل میں ہمارے پاس کون سی حدیثیں موجود ہیں پھر آپ کو کچھ کہنے کا حق ہے۔

یہ کاوشیں بے سبب ہیں کیسی کہ درتوں کی کچھ انتہا بھی زبان رکھتے ہیں ہم بھی آخر کبھی تو پوچھو سوال کیا ہے مسئلہ اذان :- علماء احناف کی یہ تحقیق ہے کہ اذان بھی دوہرے کلمات پر مشتمل ہے اور اقامت بھی بالفاظ دیگر اذان میں ترجیح نہیں اور اقامت و تکبیر میں ایسا نہیں ہے بطور نمونہ چند حدیثیں ملاحظہ ہوں۔

پہلی حدیث :- امام ابو عوانہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے عمر بن شہبہؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے عبد الصمد بن عبد الوارثؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے شہبہؒ نے بیان کیا وہ مغیرہؒ سے اور وہ شعبیؒ سے اور وہ حضرت عبد اللہ بن زید انصاریؒ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

سمعت اذان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فكان اذانه واقامته مثنیٰ مثنیٰ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اذان سنی آپ کی اذان اور آپ کی اقامت دوہرے دوہرے کلمات پر مشتمل تھی۔ (ابو عوانہ جلد ۱ ص ۳۳)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اذان اور تکبیر سے آپ کے مؤذن اور مکیب کی اذان و اقامت مراد ہے کیونکہ آپ نے خود کبھی اذان نہیں کہی حضرت عبد اللہ بن زید انصاریؒ جلیل القدر صحابی ہیں امام شعبہؒ، مغیرہ بن مقسمؒ اور شعبیؒ کا ذکر جلد اول میں ہو چکا ہے کہ وہ سب ثقہ ثبت اور حجت تھے، عمر بن شہبہؒ کو امام دارقطنیؒ، خطیبؒ، مرزبانؒ، اور مسلمہ ثقہ کہتے ہیں محمد بن سہلؒ اور ابو حاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۶۶) عبد الصمد بن عبد الوارثؒ کو ابن نمیرؒ اور ابن قانعؒ ثقہ کہتے ہیں، ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور حاکمؒ ان کو ثقہ اور مامونؒ کہتے ہیں، ابن مدینیؒ کہتے ہیں کہ شعبہؒ کی روایت میں وہ ثبت تھے ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۱ ص ۲۲) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں ثبت فی شعبہ۔



(تقریب ص ۲۴) یہ روایت بھی امام شعبہ ہی سے ہے۔

دوسری حدیث بذ عبد الرزاق فرماتے ہیں کہ ہم سے معمر نے بیان کیا وہ حماد سے اور وہ ابراہیم سے اور وہ اسود بن یزید سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے مؤذن تھے، کان یشنی الاذان ویثنی الإقامة (طحاوی ص ۲۶۹) وہ اذان اور اقامت دوسری دوسری کہا کرتے تھے اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں اور پہلے مختلف مقامات میں ان کے تراجم نقل کئے جا چکے ہیں البتہ امام ابن جوزی وغیرہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اسود بن یزید کی حضرت بلال سے سماعت ثابت نہیں ہے لیکن ان کا یہ اعتراض غلط ہے علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ اسود بن یزید کی حضرت معاذ، حضرت ابن مسعود، حضرت حذیفہ اور حضرت بلال سے سماعت ثابت ہے (تذکرہ جلد ۱ ص ۴۸)۔

تیسری حدیث :- حضرت عبد اللہ بن زید کی روایت میں یہ آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے مؤذن نے فاذا ن مثنیٰ واقام مثنیٰ (مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۱ ص ۱۳۶ طحاوی جلد ۱ ص ۱۵۸ سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۴۲ محلی جلد ۳ ص ۱۵۸) اذان بھی دوسری دوسری کہی اور اقامت بھی دوسری دوسری کہی علامہ ابن حزم لکھتے ہیں ہذا اسناد فی غایۃ الصحۃ (جلد ۱ ص ۱۵۸) کی یہ سند اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔

چوتھی حدیث :- عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ عبد اللہ بن زید سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے فاذا ن مثنیٰ مثنیٰ ثم اقام مثنیٰ مثنیٰ (سنن ابی یوسف جلد ۱ ص ۲۱) مؤذن نے دوسری دوسری کہی پھر بیٹھ گیا پھر اٹھ کر دوسری دوسری کلمات سے اقامت اور تکبیر کہی اس کے بھی تمام راوی ثقہ ہیں، امام بیہقی نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ کی ملاقات عبد اللہ بن زید سے نہیں ہوئی مگر یہ اعتراض باطل ہے کیونکہ خطیب بغدادی وغیرہ لکھتے ہیں کہ عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ ثقہ تابعی تھے اور کاشعہ میں ان کی ولادت ہوئی ہے۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۲) اور عبد اللہ بن زید کی وفات جمہور کے نزدیک ۳۲ھ میں ہوئی ہے۔ (تذیب جلد ۵ ص ۲۲۴) پندرہ سال کے اس عرصہ میں امکان تقاریر یقینی ہے (الجمہور النقی فی الروایۃ البیہقی جلد ۱ ص ۲۱) اور جمہور کے نزدیک اتصال سند کے لیے امکان تقاریر ہی شرط ہے، دیکھئے صحیح مسلم شریف

کا مقدمہ۔ مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ کیونکہ صحت حدیث کے لیے صرف استاد اور شاگرد کی ملاقات کا ممکن ہونا کافی ہے عدم ثبوت سے نفی لازم نہیں آتی بلفظہ ص ۳۲۳

پانچویں حدیث :- ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ جس اذان (اور اقامت) کا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اجرا فرمایا الاذان مثنیٰ مثنیٰ والاقامۃ مثنیٰ مثنیٰ۔ اس اذان اور اقامت کے الفاظ دوہرے دوہرے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں اسنادہ صحیح (درایہ صلا) کہ اس روایت کی سند صحیح ہے۔

چھٹی حدیث :- حضرت ابو جحیفہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے اذان بلالؓ للنبی صلی اللہ علیہ وسلم مثنیٰ مثنیٰ واقام مثنیٰ مثنیٰ وذلك مجمع الزوائد جلد ۳۳ ورواہ ثقات) حضرت بلالؓ نے جو اذان کہی اس کے کلمات دوہرے دوہرے تھے اور اقامت بھی اسی طرح تھی۔

ساتویں حدیث :- حضرت بلالؓ مؤذن جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اذان اور اقامت کے الفاظ مدتین مرتین دوہرے دوہرے ہوتے تھے (الجوہر النقی جلد ۵ ص ۴۲۵) اس کے تمام راوی ثقہ اور ثبت ہیں اور جلد اول میں ان کے تراجم نقل ہو چکے ہیں، یہ تمام روایات صحیح ہیں اور ان میں کسی کی سند میں محمد بن اسحاقؒ موجود نہیں ہے مگر مبارکپوری صاحب سود فہم کی وجہ سے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ احناف کا استدلال ابو داؤد وغیرہ کی اس روایت سے ہے جس کی سند میں محمد بن اسحاقؒ ہے، باقی اس باب کی مختلف روایات کی تطبیق اور ترجیح کا یہ مقام نہیں ہے۔

نصاب سرقہ کا مسئلہ :- تمام اہل اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ چور کا ہاتھ نص قرآنی کے تحت قطع کیا جائے گا لیکن کتنی مالیت کی چوری ہو تو ہاتھ کاٹا جائے گا؟ اس میں حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں بیس ہذا بہ نقل کئے ہیں حضرت امام ابو حنیفہؒ کی تحقیق یہ ہے کہ قطع یہ کا ادنیٰ نص دس درہم ہے (ہاتھ کی قیمت جب کہ وہ امین تھا بہت کافی تھی مگر جب اس نے خیانت کا ارتکاب کیا تو کوڑی کے مول نہ رہا) کانت امینۃ کانت ثمینۃ فلما خانت هانت) آج اس دور تمذیب و تمدن میں جب کسی اعلیٰ حاکم کے خلاف ناکام ارادہ قتل کی سزا سنائے موت ہو سکتی ہے تو بالفعل خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والے اور قانون شکن کا ہاتھ کیوں نہیں کاٹا جاسکتا اگر



علماء اخاف نے محمد بن اسحاق کی روایت سے اس باب میں استدلال کیا ہے تو فریق ثانی کو کب مباہلہ کا چیلنج کیا ہے؟ یا کب ان کے عمل کو باطل اور کالعدم قرار دیا ہے؟ یا کب تمام دنیا کے باشندوں کو لٹکار کر ان پر اشتہاری رعب قائم کیا ہے؟ باوجود اس کے کہ بالاتفاق میدان جہاد اور قحط سالی وغیرہ کے موقع پر چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا۔ ہم پھر بھی یہ پیش کش کرتے ہیں کہ فریق ثانی ربیع دینار کے نصاب کو ہی حکومت وقت سے اجرا کرتے ہیں ان کے ساتھ ہیں آخر باطل اور غیر معصوم قانون کے بجائے حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہی پر تو عمل ہو گا۔ لیکن مبارکپوری صاحب نے اس مقام پر بھی ٹھوکر کھائی ہے۔ اخاف کا استدلال اس روایت سے ہے ملاحظہ کیجئے۔

امام نسائی فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن بشر نے بیان کیا وہ عبد الرحمن سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سفیان نے بیان کیا وہ منصور سے وہ مجاہد سے اور وہ حضرت امین سے روایت کرتے ہیں قال لم تکن تقطع اليد علی عهد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم الا فی ثمن المجن و قیمتہ دینار (نسائی جلد ۲ ص ۲۵۷) وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں ڈھال کی قیمت میں ہاتھ کاٹا جاتا تھا اور ڈھال کی قیمت ایک دینار ہوتی تھی حضرت امینؓ صحابی ہیں اور بقیہ جملہ روایات محمد بن بشرؓ عبد الرحمن بن مہدیؓ امام سفیانؓ منصورؓ اور مجاہدؓ کے تراجم جلد اول میں اپنے اپنے موقع پر عرض کئے گئے ہیں کہ تمام ثقہ ثبت اور محبت تھے، امام نسائیؓ فرماتے ہیں کہ ہم سے ہارون بن عبد اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسود بن عامر نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حسن بن حی نے بیان کیا وہ منصور سے اور وہ حکم سے اور وہ عطاء اور مجاہد سے روایت کرتے ہیں اور وہ دونوں حضرت امینؓ سے وہ فرماتے ہیں۔

یقطع السارق فی ثمن المجن وکان ثمن المجن	کہ چور کا ہاتھ ڈھال کی قیمت اور مالیت کے سوا مال
علی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	میں کاٹا جاتا اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
دینار او عشرة دراهم (نسائی جلد ۲ ص ۲۵۷)	کے زمانہ مبارک میں ڈھال کی قیمت ایک دینار یا دس درہم ہوتی تھی

ہارون بن عبد اللہ (ثقة تھے ص ۳۷۸) امام نسائی فرماتے ہیں وہ ثقہ تھے ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب ص ۹۱) اور حکم بن عنبہ بھی ثقہ اور ثبت تھے (تذکرہ ص ۱۱۱) اور باقی سب روایات ثقہ اور ثبت ہیں اور حلیہ اول میں حسن بن صالح بن حمی وغیرہ کے تراجم نقل کئے جا چکے ہیں امام نسائی فرماتے ہیں کہ ہم سے محمود بن غیلان نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے معاویہ (ابن ہشام) نے بیان کیا وہ سفیان (ثوری) سے اور وہ منصور (بن معمر) سے اور وہ مجاہد سے اور وہ عطاء سے اور وہ حضرت ایمن سے روایت کرتے ہیں۔ قال لعل یقطع النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم السارق الا فی ثمن المجن وثمن المجن یومئذ دینار (نسائی ص ۲۲) وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ڈھال کی قیمت سے محم چوری کے مال میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹا اور ڈھال کی قیمت اس زمانہ میں ایک دینار تھی محمود بن غیلان کو امام نسائی اور مسلمہ ثقہ کہتے ہیں ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب جلد ۱ ص ۶۵) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص ۳۴۸) معاویہ بن ہشام کو ابوحاتم اور ساجی صدوق کہتے ہیں ابوداؤد ان کو ثقہ کہتے ہیں ابن حبان اور ابن شاہین ان کو ثقات میں لکھتے ہیں ابن سعد ان کو صدوق اور کثیر الحدیث کہتے ہیں (تہذیب ص ۲۱۸) کسی نے ان کے متعلق یہ کہا تھا کہ وہ مترک ہیں علامہ ذہبی فرماتے ہیں۔ قلت هذا خطأ منك ما تتركه احد (میزان جلد ۳ ص ۱۸) میں کہتا ہوں اے قائل تیرا یہ قول سراسر خطا ہے ان کو کسی نے ترک نہیں کیا عطاء بن ابی رباح ثقہ فقیہ اور فعال تھے (تقریب ص ۲۶۸) بقیہ روایات کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے یہ ہیں وہ صحیح احادیث جن سے علماء احناف نے ادنیٰ نصاب سرفہ کے بلے میں (جس میں چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے) استدلال کیا ہے اور ان میں سے کوئی سنا ایسی نہیں جس میں محمد بن اسحاق ہو۔ اور یہ روایت دارقطنی جلد ۳ ص ۳۶۹ سنن الکبریٰ جلد ۸ ص ۲۵ مستدرک جلد ۴ ص ۳۷۹ اور طحاوی جلد ۲ ص ۹۳ وغیرہ حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ امام نسائی اور امام بیہقی وغیرہ نے یہ کہل ہے کہ ایمن صحابی نہیں ہیں لہذا ان کی روایت مرسل ہوگی لیکن یہ اعتراض بے کار ہے اولاً اگر مرسل بھی ہو تب بھی جمهور محدثین کے نزدیک حجت ہے اس پر حلیہ اول میں سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے وثانیاً محمد بن اسحاق (دفریق ثانی کے امیر المحدثین) اور علامہ ابن سعد، حافظ ابوالقاسم بغوی، محدث ابوالفرح



حافظ ابن مندہ حافظ ابن قانع اور امام ابن عبد البر وغیرہ سب ان کو صحابی کہتے ہیں (زیلعی جلد ۲ ص ۲۵)  
 علامہ ذہبی بھی ان کا شمار صحابہ میں کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم  
 کی خاتنہ (جس نے آپ کی بچپن میں پرورش کی تھی) حضرت امّ یمن کے صاحبزادے تھے (تخرید  
 اسماء الصحابة جلد ۱ ص ۳۳) ابن اسحاق کا یہ بیان ہے کہ غزوہ حنین میں ان کی شہادت ہو  
 چکی تھی لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد عرصہ  
 تک زندہ رہے ہیں (المجموع النقی جلد ۸ ص ۲۵۸ علی السنن) حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ عطاء کی امین  
 سے روایت اگر مدلس نہ ہو تو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ امین آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم  
 کے بعد عرصہ تک زندہ رہے ہیں (البدایہ جلد ۵ ص ۳۱۳) الحاصل حضرات محدثین کرام کے قواعد کے  
 لحاظ سے اس روایت کے صحیح اور حجت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے ہاں البتہ نہ ماننے والے کے  
 منوانے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے امام طبرانی (اپنے معجم وسط میں) محمد بن نوح بن حرب  
 سے اور وہ خالد بن مہران سے اور وہ ابو مطیع سے اور وہ قائم بن عبد الرحمن سے اور وہ اپنے والد  
 عبد الرحمن سے اور وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:-

عن النبي صلى الله عليه وسلم قال لا قطع الا في عشرة دراهم (نصب الرأية ص ۲۵۹) کم میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جاسکتا۔

امام طبرانی وغیرہ نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس روایت کو بیان کرنے میں ابو مطیع متفرغ ہے  
 اور وہ کمزور تھا لیکن مولانا شمس الحق صاحب عظیم آبادی لکھتے ہیں کہ امام محمد بن الحسن (جو بقول امام دارقطنی  
 ثقافت اور حفاظ میں تھے) اس روایت کے بیان کرنے میں ابو مطیع کے متابع ہیں (تعلیق المغنی ص ۲۶۹)  
 یہ روایت امام دارقطنی (ص ۲۶۹) وغیرہ نے بھی بیان کی ہے، بہر حال احناف کا مسلک اس میں بھی قوی ہے۔

تعمیل افطار کا مسئلہ: تعمیل افطار جمہور اہل اسلام کا مسلک ہے احناف کا اس مسئلہ میں کسی سے  
 کوئی اختلاف نہیں ہے اور جمہور حضرت سہل بن سعد کی مرفوع اور صحیح روایت پیش کرتے ہیں۔

قال لا يزال الناس بخير ما عجلوا الفطر (بخاری جلد ۱ ص ۲۶۳) و مسلم جلد ۱ ص ۲۵  
 کہ امت اس وقت تک بھلائی سے موصوف ہے گی جب تک روزہ افطار کرنے میں جلدی کئے  
 گی، نہ اس روایت میں ابن اسحاق ہے اور نہ اس کی صحت میں کلام ہو سکتا ہے کیونکہ یہ متفق علیہ

حدیث ہے مبارکپوری صاحب نے بلا وجہ ابن اسحاق کی روایت کی اڑ لی ہے۔

محمد بن اسحاق کی تحدیث اور متابعت

حضرات محدثین کرام کا یہ قاعدہ اور اصول ہے اگر ثقہ راوی ہو اور اس پر صرف تدلیس کا الزام نہ کیا گیا ہو تو اس کی تحدیث سے یا کسی اور ثقہ راوی کی متابعت سے یہ الزام رفع ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی راوی میں معمولی ضعف اور کمزوری ہو اور کوئی ثقہ یا قریب بہ ثقہ راوی اس کی متابعت کرے تو اس کی روایت تعدد طرق کی وجہ سے حسن لغیرہ کے درجہ کو پہنچ سکتی ہے۔ فریق ثانی نے محمد بن اسحاق سے متعلق اس قاعدہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے مگر بالکل بے سود ہے چنانچہ مولانا شمس الحق صاحب اور مبارکپوری صاحب وغیرہ نے یہ کہا ہے کہ محمد بن اسحاق نے تحدیث کی ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۱ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۳ و مسند احمد جلد ۵ ص ۳۲۲) لہذا اس کی روایت قابل قبول ہو سکتی ہے (تعلیق الملغنی جلد ۱ ص ۱۲ و تحقیق الکلام ص ۵۸) اگر محمد بن اسحاق ثقہ ہوتا اور اس پر صرف تدلیس کا الزام ہوتا تو پھر یہ بات صحیح تھی کہ اس کی تحدیث سے تدلیس کا شبہ جاتا رہتا مگر وہ تو پرے درجہ کا ضعیف کمزور اور متروک ہے لہذا وہ تحدیث بھی کرتا ہے اس کی روایت کو کون سنتا ہے؟ وعلیٰ هذا القیاس اگر اس میں معمولی کمزوری اور ضعف ہوتا اور اس کا کوئی ثقہ متابع موجود ہوتا اور اس کی سند بھی صحیح ہوتی تو الگ بات تھی مگر آپ سُن چکے ہیں کہ ائمہ جرح و تعدیل نے جرح کے انتہائی اور سنگین الفاظ (کذاب و دجال وغیرہ) اس کے حق میں استعمال کئے ہیں اور ان ائمہ کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ابن اسحاق کی روایات حلال و حرام احکام و سنن میں تو مطلقاً قابل قبول ہی نہیں ہیں اس لیے اس کی متابعت کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا معذرتاً آپ ان روایات پر اور ان کے سند کے روات پر سرسری نگاہ ڈال لیجئے تاکہ آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ محمد بن اسحاق کے متابع اور جن سند سے متابعت ثابت کی جاتی ہے ان میں کیسے کیسے شیر خفتہ ہیں؟

ہر بیشہ گمال مبرکہ خالی است شاید کہ پلنگ خفتہ باشد  
متابعت کی پہلی روایت

امام بیہقی اپنی سند سے بطریق عبید اللہ بن سعید بن کثیر بن عیینہ روایت کرتے ہیں اور وہ ابراہیم



بن ابی یحییٰ سے اور وہ یزید بن یزید بن جابر سے اور وہ محمول سے روایت کرتے ہیں (کتاب القراءة ص ۳)  
 حدیث کا مضمون وہی ہے جو پہلے گذر چکا ہے اس سند میں یزید بن یزید محمد بن اسحاق کا متابع ہے اگرچہ  
 بعض محدثین اس میں کلام کرتے ہیں لیکن زیادہ تر اس کی توثیق کے قائل ہیں۔ اس میں عبید اللہ  
 بن سعید بن کثیر بھی ہیں جن میں امام ابن حبان اور محدث ابن عدی کلام کرتے ہیں۔ (لسان  
 ج ۲ ص ۱۶ وج ۴ ص ۳) اور دوسرا راوی اس میں ابراہیم بن ابی یحییٰ ہے۔  
 علامہ ذہبیؒ ان کو احد الضعفاء کہتے ہیں یحییٰ ابن سعید کا بیان ہے کہ میں نے امام مالک سے سوال  
 کیا کیا وہ حدیث میں ثقہ ہے؟ امام مالک نے فرمایا کہ حدیث میں تو کیا ثقہ ہو تا دین میں بھی قابل اعتبار  
 نہ تھا، قطانؒ کہتے ہیں کہ وہ کذاب تھا امام احمد فرماتے ہیں کہ محدثین نے اس سے روایت ترک کر دی  
 ہے اور وہ ایسی بے بنیاد روایتیں کیا کرتا تھا جن کی کوئی اصل نہیں ہوتی۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ امام  
 ابن مبارکؒ اور دیگر محدثین نے اس سے روایت ترک کر دی تھی۔ ابن معینؒ کہتے ہیں کہ وہ کذاب  
 اور رافضی تھا۔ علی بن مدینیؒ کہتے ہیں وہ کذاب تھا۔ امام نسائیؒ اور دارقطنیؒ اس کو مترک کہتے ہیں  
 (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۲) اس سند سے فریق ثانی محمد بن اسحاقؒ کی متابعت ثابت کرتا ہے افسوس  
 اور تعجب ہے۔

دوسری روایت :۔ اسی مضمون کی ایک روایت امام دارقطنیؒ اور امام بیہقیؒ نے نقل کی ہے اور  
 اس میں زبیدیؒ کو محمد بن اسحاقؒ کا متابع بتلایا ہے (دارقطنی ج ۱ ص ۱۲۱ و کتاب القراءة ص ۱۵) لیکن  
 سند کی مدار بقیہ پر ہے، امام عبد اللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ بقیہ بن ولید صدوق تو تھا مگر ہر کہ وہ  
 سے روایت کر لیا کرتا تھا، ابن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ احکام میں اس کی کوئی روایت نہیں قبول کی جا  
 سکتی ہاں فضائل کا باب الگ ہے ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے ابو  
 مسہر غسانیؒ کہتے ہیں کہ بقیہؒ کی حدیثیں صحیح نہیں ہوتیں ان سے بہر حال اجتناب کرنا چاہیے امام  
 بیہقیؒ کہتے ہیں کہ تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ بقیہؒ حجت نہیں ہے عبد الرحمنؒ کہتے ہیں کہ اس سے  
 احتجاج صحیح نہیں ہے (میزان جلد ۱ ص ۱۵۴ و تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۴۴) نواب صاحبؒ  
 لکھتے ہیں کہ درودے جماعتے سخن کردہ (بدور الاصلہ ص ۲۱۹) امام دارقطنیؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ  
 متابعت کی اس روایت کی مدار سالم بن نویرؒ پر ہے جو کمزور ہے پھر اس کی متابعت کا کیا اعتبار

ہے؟ (جلد ۱۲۵) اور مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ بے شک حسن بن عمارہؒ نے ابو حنیفہؒ کی متابعت کی ہے لیکن اس کی متابعت کا عدم ہے کیونکہ یہ متردک ہیں (بلفظہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۳۷) فریق ثانی کے نزدیک حضرت امام ابو حنیفہؒ کی متابعت میں نو حسن بن عمارہؒ کی روایت کا عدم ہے مگر افسوس ہے کہ محمد بن اسحاقؒ ایسے کذاب و دجال کی متابعت ایسے راویوں کی سند سے جو حقیقین کے نزدیک قابل احتجاج ہی نہیں ہیں بالکل صحیح ہے فوالسفا علاوہ بریں امام دارقطنیؒ اور امام بیہقیؒ اس کو مرسل کہتے ہیں اور ہمارے نزدیک بلکہ جمہور محدثین کے نزدیک مرسل حجت ہے جس کی بحث جلد اول میں گذر چکی ہے لیکن فریق ثانی کے نزدیک مرسل حجت نہیں ہے امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ مرسل سے حجت درست نہیں ہے (جزأ القراءة ص ۱) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں وہ وضعیف من حیث انہ مرسل (کتاب القراءة ص ۱۳) نواب صاحب لکھتے ہیں و مرسل از قسم ضعیف است (دلیل الطالب ص ۲۹۳) دوسری جگہ لکھتے ہیں و مرسل حجت نیست (بدور الاصلہ ص ۴۹) اور مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں۔ والمرسل وان كان حجة عند الحنفية لكن المحقق انه ليس بنحو (تحفة الاحوذی جلد ۱ ص ۳۶۵) احناف مرسل کو حجت کہتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ مرسل حجت نہیں ہے۔ پھر یہ روایت ان کے نزدیک کیسے صحیح اور قابل حجت ہو سکتی ہے؟ مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ محقق مذہب محدثین کے ہاں ہی ہے کہ مرسل حجت نہیں ہوتی الخ (ص ۴۷۸)

تیسری روایت :- مبارکپوری صاحب کتاب القراءة ص ۴ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ ملک شام کے ثقہ راوی محمد بن اسحاقؒ کے متابع ہیں (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۹۵) و ابکار المنن ص ۱۲۸) لیکن اس سند میں ایک راوی محمد بن ابی السریؒ ہے اعلاء السنن جلد ۱ ص ۹ میں اس کا نام محمد بن متولؒ نقل کیا گیا ہے اور علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی چند حدیثیں ہیں جو منکر خیال کی جاتی ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۱۲۸) ابو حاتمؒ انکو لدین الحدیث کہتے ہیں ابن عدیؒ ان کو کثیر الخلط کہتے ہیں اور مسلم بن قاسمؒ ان کی توثیق کرتے ہوئے بھی ان کو کثیر الوہم کہتے ہیں ابن وضاحؒ ان کو کثیر الخفظ اور کثیر الخلط کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۱۲۵) دوسرا راوی اس سند کا علامہ بن الحارثؒ ہے امام ابو داؤدؒ کہتے ہیں کہ اس کا حافظہ متغیر ہو چکا تھا امام بخاریؒ اس کو منکر الحدیث کہتے ہیں (میزان جلد ۲ ص ۱۲۸) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ جس راوی کو امام بخاریؒ منکر الحدیث کہتے ہوں



اس سے احتجاج جائز نہیں ہے حوالہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے تمیز راوی اس سند کا احمد بن عمیر بن حوصاً ہے علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی چند حدیثیں غریب ہیں، دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ یہ قوی نہیں حمزہ کتانیؒ نے اس سے بالکل روایت ترک کر دی تھی (میزان جلد ۱ ص ۵۹) محدث زبیر بن عبد الواحدؒ اس کو ضعیف سمجھتے تھے (لسان جلد ۱ ص ۲۴) مولف خیر الکلام نے ص ۲۱۶ میں اس کا یہ ناکام جواب دیا ہے کہ یہ جرحیں مبہم ہیں پھر آگے ان روایت کے بارے بعض توصیفی کلمات نقل کئے ہیں الجواب اصول حدیث میں اس امر کی صراحت ہے کہ کثیر الغلط، کثیر الوهم ہونا جرح مفسر ہے۔ اور ایسے راوی کی حدیث مردود روایتوں میں شامل ہے اور امام بخاریؒ کا منکر الحدیث کہنا تو اپنی جگہ مستقل شدید جرح ہے۔

چوتھی روایت :- امام دارقطنیؒ، حاکمؒ اور ہیثمیؒ ایک روایت نقل کرتے ہیں جس میں سعید بن عبد العزیز تنوخیؒ کو محمد بن اسحاقؒ کا متابع کیا گیا ہے۔ (دارقطنیؒ جلد ۱ ص ۱۲، مستدرک جلد ۱ ص ۲۳۸۔ سنن الکبریٰ ص ۱۶۵ جلد ۲) لیکن اس سند کی مدار ولید بن مسلمؒ پر ہے، امام احمدؒ اس کو کثیر الخطا کہتے ہیں امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ وہ ابو السفرؒ سے روایتیں لیا کرتا تھا اور ابو السفرؒ کذاب تھا ابوہریرہؒ کہتے ہیں کہ وہ امام اوزاعیؒ کی روایتیں کذابین سے لیا کرتا تھا۔ دارقطنیؒ کا بیان ہے کہ وہ ضعیف اور کمزور راویوں کے نام ساقط کر دیتا تھا اور اوزاعیؒ وغیرہ کے نام ساتھ جوڑ دیتا تھا ابو داؤدؒ کہتے ہیں کہ دس حدیثیں اس نے ایسی بیان کی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اسکی مسموع وغیرہ مسموع تمام روایتیں غلط ملط ہو چکی تھیں اور بہت سی روایتیں اس کی منکر ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۵۴) مولف خیر الکلام نے یہ کہا کہ امام ذہریؒ اور ابن جریرؒ کی روایت میں اس پر جرح ہے اور یہاں سعیدؒ سے روایت کہہ رہا ہے اور بعض ائمہؒ نے اس کی توثیق اور توصیف کی ہے (محصلاً ص ۲۱۸، ۲۱۹) الجواب :- امام احمدؒ وغیرہ نے تصریح فرمادی ہے کہ اسکی روایتیں غلط ملط ہو چکی تھیں مسموع وغیرہ مسموع میں کوئی تمیز نہیں تو پھر حدیثنا اور سعیدؒ وغیرہ کی آڑ لینا بالکل بے سود ہے۔

پانچویں روایت :- دارقطنیؒ ص ۱۲، ہیثمیؒ ص ۱۶۴ اور تلخیص الحیرۃ ص ۸ وغیرہ میں زید بن داؤدؒ کو محمد بن اسحقؒ کا متابع بتایا ہے لیکن اس کی ایک سند میں ابیہم بن حمیدؒ وغیرہ بعض محدثین کے نزدیک متکلم فیہ راوی ہیں علاوہ بریں اس میں عن مکحول عن نافع الخ ہے اور ان دونوں کو

مطرب کلام آرہا ہے اور دوسری سند میں محمد بن مبارک ہے علامہ ذہبی لکھتے ہیں احادیثہ تستنکر (بحوالہ تہذیب جلد ۹ ص ۲۴۷) کہ اس سے منکر روایتیں بھی مروی ہیں اور ایک تیسری سند میں یحییٰ بن عبد اللہ بن الضحاک ہے (یہ دونوں سندیں دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ میں موجود ہیں) امام ابو حاتم (اس کو ساقط الاحتجاج کہتے ہیں، ابن عدنی کہتے ہیں اشار الضعف علی حدیثہ بکینہ ضعیف اور کمزوری کا نشان اس کی حدیث پر بالکل آشکارا ہے محدث خلیلی بھی ان پر محدثین کا طعن نقل کرتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۴۷) مولف خیر الکلام نے لکھا ہے کہ اس کی جرح مسلم ہے مگر متابعت میں کوئی حرج نہیں (ص ۲۲۱) یہ ہے فریق ثانی کے وکیل اعظم اور محدث جلیل کا استدلال؛ سبحان اللہ تعالیٰ ثقہ راویوں کی حدیث تو ان کے نزدیک مسلم نہیں جیسا کہ جلد اول میں مفصل عرض کیا گیا ہے اور ضعیف حجت ہیں، رہا امام دارقطنی کا اس سند کو حسن کہنا اور روایت کی توثیق کرنا تو لاحقہ حاصل ہے، امام دارقطنی کا قاعدہ یہی جہاں ہے جو آگے آرہا ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔

قارئین کرام! آپ نے ائمہ جرح و تعدیل کی زبانی محمد بن اسحاق کا رتبہ اور درجہ بھی ملاحظہ کر لیا کہ وہ اس کو کذاب اور دجال وغیرہ کہتے ہیں اور جو راوی اس کی متابعت میں پیش کئے گئے ہیں اور جو سندیں اس کی متابعات کی ہیں ان میں بھی کذاب، متروک، منکر الحدیث لایجوز بہ الاحتجاج۔ ساقط الاعتبار، ضعیف، کمزور اور غیر معتبر راوی ہیں جن کی کوئی روایت فی نفسہ معتبر نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ نص قرآنی اور صحیح اور مرفوع احادیث کے مقابلہ میں قبول کی جاسکے حاشا وکلا ثم حاشا وکلا۔

دوسرا جواب :- اس روایت میں ایک راوی مکحول بھی ہیں یہ معیاری ثقہ بھی نہ تھے نیز تدلیس بھی ہیں اہم حاکم لکھتے ہیں :- ان عامة حدیث مکحول عن الصحابة حوالہ (معرفت علوم الحدیث ص ۱۱۱) کہ مکحول کی حضرات صحابہ کرام سے اکثر حدیثیں صرف تدلیس و ارسال کے حوالہ نظر ہیں، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ مکحول حضرت ابی بن کعب، حضرت عبادہ بن الصامت، حضرت عائشہؓ اور دیگر کبار سے بکثرت ارسال اور تدلیس کرتے تھے (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۱) علامہ ابن سعد فرماتے ہیں کہ محدثین کی ایک جماعت نے مکحول کی تضعیف کی ہیں اور وہ صاحب تدلیس بھی تھے (میزان جلد ۳ ص ۱۹۸) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ مکحول نے دیگر حضرات صحابہ کرامؓ



سے عموماً اور حضرت عبادہؓ سے خصوصاً کوئی حدیث نہیں سنی وہ محض تدلیس سے کام لیتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۲۹۱) امام ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ وہ لیس بالمتین چنداں قابل اعتبار نہ تھے اور باوجود اس کے مدلس بھی تھے (قانون الموضوعات ص ۲۹۸) مبارکپوری صاحبؒ بھی ان کو مدلس لکھتے ہیں (ابکار المنن ص ۱۱۱) اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں دس اقسام الضعیف المدلس (دلیل الطالب ص ۸۸۲) کہ مدلس روایت ضعیف روایتوں میں شمار ہوتی ہے اور مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں وعنعنہ المدلس غیر مقبولة (ابکار المنن ص ۱۲۵) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں اور عنعنہ مدلس کا مقبول نہیں (بلفظہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۲۵) یہ بھی مت بھولیے کہ کسی قابل اعتبار سند سے محمول کی محمود بن ربیع سے سماعت اور تحدیث ثابت نہیں ہے۔ (بعیۃ الملعی جلد ۲ ص ۱۱۱)

مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ محمول کبار صحابہؓ سے ارسال کرتے تھے اور یہاں محمود بن ربیع صغار صحابہؓ میں ہیں اور تدلیس سے اصطلاحی مراد نہیں اور امکان لقار کے بعد معاملہ رفع ہو جاتا ہے (مجموعہ ص ۲۲۳) الجواب بدجلال ان لایعنی باتوں کو کون تسلیم کرتا ہے، امام حاکمؒ کہاں کی کوئی قید نہیں لگاتے مطلق حضرات صحابہؓ کا ذکر کرتے ہیں اور محمول اصطلاحی مدلس ہیں اسی کتاب المدلسین میں اسکا ذکر ہے جس میں قتادہؓ کا ذکر ہے اور تیسرے درجہ کا مدلس لکھا ہے امکان لقار کافی ہوتا ہے مگر مدلس کے لیے یہ قاعدہ ہرگز نہیں ہے اور مؤلف مذکور نے ان کی جو توشیح نقل کی ہے وہ بے سود ہم نے معیاری ثقہ کا لفظ بولایا ہے فریق ثانی کے لیے نہایت بصر کی بات ہے کہ وہ قتادہؓ وغیرہ ثقہ حافظ اور ثبوت راویوں کی تدلیس کو تو قبول نہیں کرتا مگر ضعیف کمزور اور لیس بالمتین کی تدلیس سے قطع نظر کر جاتا ہے، فریق ثانی نے محمول کی تدلیس کا جواب دیتے ہوئے جو کہہ رہے ہیں ان کی متابعت میں جو روایتیں اور راوی اور جو نہیں پیش کی ہیں اجمالاً ان کا ذکر بھی سنی لیجئے۔ امام بیہقیؒ نے احمد بن عمیرؒ بن جو صائد کے طریق سے موسیٰ بن سہل رملیؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ محمول کی محمود بن ربیع سے سماعت ثابت ہے۔ (کتاب القراءة ص ۱۱۱) اور ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اس روایت سے ثابت ہو سکتا ہے کہ محمول کی محمود بن ربیع سے سماعت ہوئی تھی (ایضاً ص ۱۱۱) لیکن یہ تمام باتیں بے بنیاد ہیں کیونکہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ احمد بن عمیرؒ بن جو صائد کمزور اور

ضعیف ہے، اس کی سند کیونکہ قابل حجت ہو سکتی ہے؟ علاوہ ازیں امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ محمول،  
 حرام بن حکیمؒ اور جابر بن حیوہؒ میں سے کسی نے محمود بن ریح نے سماع کا ذکر نہیں کیا (جزء ۱ القرۃ ص ۳۲)  
 محمول کی متابعت میں پہلی روایت :-

مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمرو بن الحارثؒ (جن کی روایت دارقطنی  
 جلد ۱ ص ۱۲، مستدرک جلد ۱ ص ۲۳۹ اور کتاب القرۃ ص ۳۲ وغیرہ میں موجود ہے) محمول کے  
 متابع ہیں (ابکار المنن ص ۱۲) لیکن یہ متابعت بھی کالعدم ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی  
 معاویہ بن یحییٰ ہے۔ امام بخاریؒ اس کی تضعیف کرتے ہیں (ضعفاء صغیر ص ۲۹) نسائیؒ فرماتے  
 ہیں کہ وہ ضعیف الحدیث تھا (ضعفاء صغیر نسائی ص ۳) حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف  
 ہے (تقریب ص ۲۵۸) دارقطنیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں (ص ۱۲) ابن حینؒ اس کو لیس لشیٰ کہتے ہیں امام البزوریؒ کہتے ہیں کہ اس کی  
 حدیثیں محمول ہیں (میزان الاعتدال ص ۱۸) جوزقانیؒ اس کو ذاہب الحدیث اور الوحاتم، البدوؤد اور ابو علی نیشاپوریؒ اس کو  
 ضعیف کہتے ہیں ابن عدنیؒ کا بیان ہے کہ اس کی حدیثوں میں کلام ہے، مساجیؒ اس کو ضعیف الحدیث  
 اور بنیادؒ اس کو لیس الحدیث کہتے ہیں امام احمدؒ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کو ترک کر دیا تھا (تہذیب  
 التہذیب جلد ۱ ص ۲۱۹) دوسرا راوی اس کا اسحاق بن ابی فردہؒ ہے۔ امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ  
 محدثین نے اس کو ترک کر دیا ہے (ضعفاء ص ۴) نسائیؒ اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں (ضعفاء ص ۲۸)  
 علامہ ذہبیؒ اس کو ہاک اور تباہ شدہ لکھتے ہیں (تلخیص المستدرک جلد ۱ ص ۲۳۹) حافظ ابن حجرؒ اس کو  
 متروک لکھتے ہیں (تقریب ص ۲) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ تمام محدثین نے اس سے احتجاج  
 ترک کر دیا تھا (تہذیب جلد ۱ ص ۹) دارقطنیؒ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے (جلد ۱ ص ۱۲) بیہقیؒ  
 لکھتے ہیں کہ وہ قابل احتجاج نہیں ہے (سنن البکری جلد ۱ ص ۲۲) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں :-  
 ولم اراحہ داما مشاہد (میزان جلد ۱ ص ۱) مجھے معلوم نہیں کہ کسی ایک محدث نے  
 بھی اس کی حدیث قبول کی ہو اور تیسرا راوی عبد اللہ بن عمرو بن الحارثؒ (جو محمول کا متابع  
 بیان کیا جاتا ہے) خود مجہول ہے (تقریب ص ۲۹) یہ ہے فریق ثانی کا معیار استدلال افسوس  
 صد افسوس۔ مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۲۵ میں عبد اللہ بن عمرو بن الحارثؒ کو مجہول تسلیم کر کے  
 یہ جواب دیا ہے کہ مستور کی روایت کو متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی حرج نہیں۔ مگر سند کے



باقی راویوں کو بالکل پی گئے ہیں۔

دوسری روایت :- مبارکپوری صاحب کتاب القراءۃ ص ۱۱۱ کے حوالہ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں جس میں شعب بن ابی حمزہ کو محمول کا متابع بیان کیا ہے (ابکار المنن ص ۱۲۵) بلا شک یہ متابع ثقہ اور ثبت ہیں لیکن سند میں ایک تو اسحاق بن ابی فروہ ہے جس کا ذکر خیر ابھی ہو چکا ہے اور دوسرا راوی اس سند کا عمرو بن عثمان ہے ابو حاتم کہتے ہیں کہ محدثین اس میں کلام کرتے ہیں اور یہ مشکوٰۃ حدیث روایت کرتا ہے ابن حبان کہتے ہیں کہ بسا اوقات وہ حدیث میں خطا کرتا ہے۔ امام نسائی اور ازہری اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں (ترندیب التندیب جلد ۸ ص ۱۸۱) اور ایک اور سند ہے جس میں محمد بن حمیر ہے جس کا تذکرہ بحث حذاج میں ہو چکا ہے کہ وہ قابل احتجاج نہیں ہے اور ایک سند میں ابو عبد الرحمن محمد بن الحسین سلمیٰ ہے یہ صوفیوں کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ محدثین اس میں کلام کرتے ہیں اور یہ قابل اعتماد نہیں ہے (میزان جلد ۲ ص ۴۲) تیسری روایت :- مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کنز العمال جلد ۸ ص ۲۸ اور کتاب القراءۃ ص ۱۱۱ میں عن الزہری عن محمود بن الربیع الخ کی سند میں امام زہری محمول کے متابع ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۹۴) لیکن قطع نظر اس سے کہ اس کی سند کیسی ہے یہ بھی ان کے عقیدہ میں نہیں ہے اولاً اس لئے کہ مبارکپوری صاحب خود ایک مقام پر لکھتے ہیں زہری مدلس ہیں اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں تو ان کی حدیث کیسے صحیح ہو سکتی ہے۔ (ابکار المنن ص ۳۵) متابعت سے نہ لیس کاشیہ وہاں رفع ہوتا ہے جہاں اصل روایت کے راوی ثقہ ہوں اور شبہ صرف مذہب کا ہو اور یہاں اصل روایت ہی صحیح نہیں ہے، اس نکتہ کو مولف خیر الکلام بالکل ہضم کر گئے ہیں۔ وثانیاً فریق ثانی کی طرف سے جن میں خاص طور سے امام بخاری علیہ الرحمۃ بھی قابل ذکر ہیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ امام زہری اپنے کلام کو حدیث میں ملا دیا کرتے تھے (جزء القراءۃ ص ۲۳) تو ہم الزامی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ کیا بعید ہے کہ اس حدیث میں خلف الامام کا جملہ امام زہری نے مرفوع حدیث میں ملا دیا ہو۔ مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ زہری کی یہ عادت نہ تھی بلکہ ایک خاص حدیث میں فعل تھا (محصلہ ص ۲۲) الجواب :- مگر اس میں کوئی جان نہیں کیونکہ خود مولف خیر الکلام اسی صفحہ میں امام بخاری کی جزء القراءۃ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ قال ربیعہ للزہری اذا حدثت

فہمین کلامك الخ اس میں اذا شرطیہ ہے اور خود مولف مذکور ص ۸۲ میں بحوالہ قاضی شوکانی  
اسماء الشرط کو عام لکھتے ہیں پھر محض بات بندنے کے لیے یہ کہتا کہ عادت نہیں فعل ہے کیا  
وقعت رکھتا ہے اور مدرج کے لیے یہ دعویٰ کرتا کہ کلام متقل ہو بالکل بے دلیل ہے کیوں کہ  
ادراج جیسے متقل کلام سے ہوتا ہے غیر متقل سے بھی ہو سکتا ہے اور فتح الباری کا جو حوالہ انہوں  
نے نقل کیا ہے وہ اس دعویٰ کے لیے غیر صریح بلکہ صرف کشیدہ ہے، مولف مذکور کو جب  
خود اپنی اس کشیدگی کی کمزوری کا احساس ہوا تو یہ لکھا ہے کہ غیر متقل پر ادراج کا اطلاق مجازاً ہو سکتا ہے  
(محصلاً وثالثاً) اگر خلف الامام کا جملہ (جس کی وجہ سے ان کی متابعت کو مدنظر رکھا گیا ہے) امام زہریؒ  
کے نزدیک ثابت ہوتا تو وہ بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل ہوتے حالانکہ وہ جہری نمازوں میں  
سختی سے اس کا انکار کرتے ہیں اور سکناات کی کوئی روایت صحیح نہیں ہے کما مر و رابعاً  
اس روایت میں خلف الامام کا جملہ محمد بن یحییٰ الصفاؒ کا مدرج ہے جیسا کہ یہ تحقیقی جواب اپنے  
مقام پر ذکر کیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ الغرض دیگر حضرات محدثین کرامؒ کے طے شدہ قواعد کے  
محافظ سے عموماً اور فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ اصول کے پیش نظر سند کے اعتبار سے کوئی بھی  
ایسی صحیح روایت موجود نہیں ہے جس کو محمد بن اسحاقؒ اور محمولؒ کی متابعت میں پیش کیا جاسکے۔  
تیسرا جواب نافع بن محمودؒ کی جہالت :-

علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ نافع بن محمودؒ سے خلف الامام کی روایت کے علاوہ اور کوئی روایت  
مروی نہیں ہے۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور یہ تصریح کرتے ہیں کہ حدیث معلول  
کہ اس کی حدیث معلول ہے (میزان جلد ۲ ص ۲۲۷) امام طحاویؒ لکھتے ہیں کہ نافع بن محمودؒ مجہول ہے  
(الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۶۵) حافظ ابو عمرؒ بن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ وہ مجہول ہے (تندیب التندیب  
جلد ۱ ص ۵۱) شیخ الاسلام موفق الدینؒ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں لیس بمعروف (مغنی جلد ۱ ص ۶۶)  
کہ وہ مجہول ہے، حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ مستور ہے (تقریب ص ۳۷) محقق ینموئیؒ اس کا  
مجہول ہونا نقل کرتے ہیں (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۷۷) نافعؒ کے مجہول ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا  
ثبوت ہو سکتا ہے امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس امر کا ہرگز مکلف نہیں ٹھہرایا  
کہ ہم اپنا دین مجہول اور غیر معروف راویوں سے اخذ کریں (کتاب القراءة ص ۱۲۷) امام خطابیؒ



فرماتے شرھا الموضوع ثم المقلوب ثم المجهول (تدریب الراوی ص ۱۲) کہ بدترین حدیث جعلی ہے پھر مقلوب اور پھر مجہول اور فریق ثانی تو اس روایت کو لے کر تمام دنیا کو چیلنج دے کر ان کی نمازوں کو باطل ٹھہراتا ہے۔

اعتراف :- مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ نافع بن محمود ثقہ تھے اور اس کے دلائل یہ ہیں (۱) علامہ ذہبی نے اپنی کتاب کاشف میں ان کو ثقہ لکھا ہے (۲) امام ابن حبان اور دارقطنی ان کو ثقہ سمجھتے ہیں۔ امام دارقطنی کی توثیق کا حوالہ مؤلف خیر الکلام نے بھی ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو ص ۲۱۳) (۳) نافع سے محمول اور حرام بن حکیم روایت کرتے ہیں لہذا یہ مستور نہ ہوں گے (۴) اگر مستور بھی ہوں تب بھی امام ابو حنیفہ کے نزدیک مستور کی حدیث حجت ہے (شرح نخبۃ الفکر ص ۱) (۵) ابن حبان نے جو حدیث معلقہ لکھا ہے وہ نسخہ ثابت نہیں ہے (۶) بلکہ یہ علامہ ذہبی کا وہم ہے۔  
محصلہ تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۵۹ و ۱۲۹۔

الجواب :- مبارکپوری صاحب کی پیش کردہ یہ جملہ شقیں مردود ہیں علی الترتیب ہر ایک کا جواب نیچے (۱) کاشف ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی اگر علامہ ذہبی نے نافع کو اس میں ثقہ لکھا ہے تب بھی یہ میزان کے حوالہ حدیث معلقہ کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اصول حدیث کے رو سے ثقہ راویوں کی حدیث بھی معلق ہو سکتی ہے جس کا باحوالہ ذکر عنقریب آ رہا ہے انشاء اللہ تعالیٰ (۲) امام ابن حبان اور دارقطنی کا توثیق رجال کے بارے میں مسلک ہی جمہور محدثین سے الگ ہے جمہور تو یہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی راوی سے دو راویوں نے روایت کی ہو اور اس کی توثیق کسی سے ثابت نہ ہو (حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ متفرد و خود یا غیر جب کہ توثیق کا اہل ہو اور اس کی توثیق کرے تو صحیح قول پر وہ ثقہ ثابت ہو جائے گا۔ شرح نخبۃ الفکر ص ۱) اور اسی قاعدہ کے مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۳۶ میں سہارا لیا ہے لیکن شرح شرح نخبۃ الفکر ص ۱ میں اسی قول کے رد میں لکھا ہے کہ الصحیح الذی علیہ اکثر العلماء من اہل الحدیث وغیرہم انہ لا یقبل مطلقاً کہ اکثر محدثین وغیرہم کے نزدیک مطلقاً یہ توثیق غیر مقبول ہے) تو وہ مجہول اور مستور ہی رہتا ہے چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ

ان ردی عنہ اثنان فصاعداً ولو ان کسی شخص سے دو یا دو سے زیادہ راوی روایت

يُوثَّقُ فَهُوَ مَجْهُولُ الْحَالِ وَهُوَ الْمُسْتَوْرَاهُ

(شرح نجمة الفكر ص ۶)

ہوتا ہے اور وہی مستور کہلاتا ہے

اور امام ابن الصلاحؒ (المتوفی ۷۴۲ھ) نے نچلے درجہ والوں کے عادل ہونے کی قید بھی لگائی ہے  
(شرح نجمة الفكر ص ۵۲ طبع مصر) لیکن امام ابن حبانؒ اور دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص  
سے درجہ والوں نے راویت کی ہو تو وہ مجہول نہیں رہتا اور اس کی عدالت ثابت ہو جاتی ہے  
چنانچہ امام دارقطنیؒ لکھتے ہیں کہ

وارتفاع اسم الجہالة له عنه ان يروى عنه رجلاون فصاعداً فاذا كان هذه  
صفته ارتفع عنه اسم الجہالة و  
صار حينئذٍ معروفاً (دارقطنی طبع مصر ص ۳۱)  
راوی سے جہالت کا اسم اس وقت اٹھتا ہے جب کہ  
اس سے دو یا دو سے زیادہ راوی راویت کریں جب  
ایسا ہو تو اس سے جہالت کا اسم مرتفع ہو جاتا ہے  
اور وہ راوی معروف ہو جاتا ہے۔

اور علامہ سخاویؒ (المتوفی ۹۰۲ھ) نے ان کا مسلک یوں نقل کیا ہے کہ

من روى عنه ثقتان فقد ارتفعت جہالته  
وثبتت عدالته (فتح المغیث ص ۱۳)  
جس شخص سے دو ثقہ راوی راویت کریں تو اس سے جہالت  
رفع ہو جاتی ہے اور اس کی عدالت ثابت ہو جاتی ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ جمہور کے نزدیک اس صورت میں راوی اگرچہ مجہول العین نہیں رہا مگر مجہول الثبوت  
اور مجہول الحال بدستور ہے گا۔ لیکن امام دارقطنیؒ وغیرہ کے نزدیک باوجود مجہول الحال اور مستور ہونے کے  
وہ عادل ہو جاتا ہے اور اس کی حدیث حسن، صحیح اور جید ہو جاتی ہے اور جمہور نہ تو اس کو ثقہ اور عادل  
تسلیم کرتے ہیں اور نہ اس کی راویت کو قبول کرتے ہیں چنانچہ علامہ خطیب الشافعیؒ (۴۶۳ھ) لکھتے  
ہیں کہ :-

قلت الا انه لا يثبت له حكم العدالة  
بروايته ما عنه وقد نعم قوم ان  
عدالته تثبت بذلك ونحن نذكر  
فساد قولهم بمشيئة الله ولو فنيقه  
الكفاية في علم الرواية ص ۵۹  
میں کہتا ہوں کہ ایسے مجہول راوی سے درجہ والوں کی توثیق کر لینے  
سے اس کی عدالت ثابت نہیں ہو سکتی اور ایک قوم نے رسول ابن حبانؒ  
اور دارقطنیؒ وغیرہ مفسد یہ خیال کیا ہے کہ اس طرح اس کی عدالت  
ثابت ہو جائے گی مگر ہم انشاء اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ کی توفیق  
سے اس قول کا فساد اور بطلان ذکر کریں گے۔



اور جو مسک امام دارقطنی کا ہے سو وہی نظریہ امام ابن حبان کا ہے چنانچہ اسکی تصریح موجود ہے کہ۔

وتبعه ابن حبان اذ العدل عند من  
لا يعرف فيه الجرح رشح شرح نجدة الفكر ملك  
ابن حبان بھی اسی نظریہ کے حامی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک  
بھی ثقہ وہ ہے جس پر کوئی جرح معلوم نہ ہو۔

علامہ ذہبی عمارۃ بن حذیفہ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ

انه مجهول . ولا تفرح بذكر ابن حبان  
له في الثقات فان قاعدته 'معروفة من  
الاحتجاج لمن لا يعرف (میزان جلد ۲ ص ۲۲۲)  
اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ

ويحيى الكندي غير معروف ذكره البخاري  
وابن ابى حاتم ولم يذكر فيه جرحاً  
وذكره ابن حبان في الثقات كعادته  
فيمن لم يجرح رفتح الباري ۱۱ صاحب  
ما يجل من النساء وما يحرم  
یحییٰ الکندی مجهول ہے امام بخاری اور ابن ابی حاتم  
نے اسکا ذکر کیا ہے لیکن اس پر انہوں نے جرح ذکر  
نہیں کیا اور ابن حبان نے اس کو ثقات میں لکھا ہے  
جیسا کہ ان کی عادت ہے کہ جن راویوں پر جرح نہیں  
ہوتا وہ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔

ان تمام ٹھوس حوالوں سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ جس راوی کو امام دارقطنی اور امام ابن حبان  
ثقہ اور عادل کہتے ہیں وہ جمہور کے نزدیک بدستور مجہول الحال اور مستور رہتا ہے اس لیے ان  
کے نافع اگر ثقہ کہنے میں اور جمہور کے اس کو مستور اور مجہول کہنے میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ  
نقص میری اور رقیب کی راہیں جدا آخر کو ہم دونوں درجہ نام پر جا ملے

یہی وجہ ہے کہ ابن حبان کو متساہل گردانا گیا ہے چنانچہ علامہ سخاوی لکھتے ہیں کہ امام حاکم  
کی طرح ابن حبان بھی متساہل ہیں رفتح المغیث ص ۲۱ علامہ ابن الصلاح لکھتے ہیں کہ ابن حبان  
تساہل میں حاکم کی مانند ہیں (مقدمۃ ابن الصلاح ص ۱) امام سیوطی لکھتے ہیں کہ امام ابن حبان اور  
امام حاکم آہل میں ایک دوسرے کا نظیر ہیں (تدریب الراوی ص ۳۲) اور خود مبارکپوری صاحب  
لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابن حبان متساہل ہیں (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۱) اور مولف  
خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ابن حبان نے اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے مگر ابن حبان کا تساہل مشہور ہے

اور اس سے بھی بڑھ کر امام دارقطنیؒ بسا اوقات ضعیف راویوں کو ثقہ اور ان کی حدیث کو بھی حسن کہہ دیتے ہیں چنانچہ ایک سند میں عبد اللہ بن لبیعہؒ آیا ہے جو جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے اور خود امام دارقطنیؒ کو بھی اس کا اقرار ہے مگر وہ بایں ہمہ اس کی حدیث کو حسن کہتے ہیں ہذا اسناد حسن وابن لمیغۃ لیس بالقوی (دارقطنی ص ۱۳۳) محمد بن عبد الرحمن بن ابی یسلیٰ کو ایک جگہ ثقہ فی حفظہ شعی لکھتے ہیں (جلد ۱ ص ۷۶) اور دوسری جگہ ضعیف سنی الحفظ لکھتے ہیں (جلد ۱ ص ۸۹) عبد الرحمن بن ابراہیم القاصؒ کو پہلے ثقہ لکھتے ہیں اور پھر اسی صفحہ پر چند سطروں کے بعد ضعیف الحدیث لکھتے ہیں (جلد ۱ ص ۱۲۳) عبد اللہ بن مثنیٰؒ کو ایک موقع پر ثقہ لکھتے ہیں اور دوسرے پر کہتے ہیں کہ وہ ضعیف (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۳۸۸) اس جملہ بحث کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات بخوبی سمجھ آ سکتی ہے کہ امام دارقطنیؒ اپنی قائم کردہ اصطلاح پر بھی پورے مطمئن نہیں ہیں، اور روایات کی ثقاہت اور جرح کے بارے میں وہ متردد رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ توضیح کی جاسکتی ہے اور ہم اس کے منکر نہیں ہیں کہ ثقہ کسی اور وجہ سے کہا اور ضعیف کسی اور وجہ سے مگر رد و رد تو راہی اور ہم امام دارقطنیؒ کی فن حدیث میں امامت کے منکر نہیں ہیں مؤلف خیر الکلام نے بے سود عبارتیں ان کی امامت منوانے کے لیے نقل کی ہیں اختلاف صرف ان کی اصطلاح سے ہے اور صرف ہمیں ہی نہیں جمہور محدثین کو ہے۔ (۳) مبارکپوری صاحب نے امام دارقطنیؒ وغیرہ کی اصطلاح لے کر جمہور کے گلے بٹھانے کی بے جا سعی کی ہے تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے کہ جمہور کے نزدیک ایسا راوی مستور ہی رہتا ہے اور اس کی حدیث مقبول نہیں ہوتی اور خود امام ابن حبانؒ باوجود اس ہونے کے نافع کی حدیث کو معلول قرار دیتے ہیں مؤلف خیر الکلام کا یہ جواب کہ ابن حبانؒ نے معلل ہونے کی وجہ بیان نہیں کی اور وہ متشدد ہیں (ص ۲۳۱) بالکل غیر تسلی بخش ہے کیونکہ اس کی وجہ شیخ الاسلام نے بحوالہ امام احمدؒ وغیرہ ائمہ حدیث بیان کر دی ہے علاوہ ازیں اگر معلل کہنے میں متشدد ہیں تو ان کو ثقہ کہنے میں متساہل بھی تو ہیں کہ امامؒ اور بعد کے جن حضرات نے نافع کی سند کو صحیح یا حسن کہا ہے اس میں انہوں نے اعتماد دارقطنیؒ وغیرہ پر کیا ہے اور ان کی مستور کے بارے میں اصطلاح باحوالہ گذر چکی ہے جس کے رُوسے جمہور کے نزدیک مستور مستور ہی رہتا ہے اور جرح کرنے والے محتاط عارف باسباب الجرح اور غیر متعصب ہیں اس لیے قاعدہ کے



رو سے امام طحاوی، حافظ ابن عبد البر، امام ابن قدامہ علامہ ماریتی اور حافظ ابن حجر وغیرہ کی جرح مقدم ہوگی اور نافع بہر کیفیت مجہول ہی ہوں گے۔ مولانا میر صاحب نے علامہ ابن حزم کی کتاب محلی جلد ۲ ص ۲۴۱ سے نافع کی ثقاہت نقل کی ہے (ملاحظہ ہو گلدستہ ص ۱) لیکن علامہ ابن حزم کا معاملہ بھی روایت کی توثیق و تضعیف کے بارے میں بڑا ہی نزاع ہے، چنانچہ وہ امام ترمذی کو بھی ایک جگہ مجہول کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۲۸۸) یہی وجہ ہے کہ ناقدین رجال حافظ و بی سیر النبلاء میں لکھتے ہیں کہ میں ابن حزم سے محبت بھی کرتا ہوں کہ وہ صحیح حدیث سے محبت کرتے ہیں اور اس کی معرفت بھی رکھتے ہیں لیکن وان كنت له اوافقه، فی کثیر من ما یقولہ فی الرجال والعلل والمسائل البشعة فی الاصول والفروع واقطع بخطائہ فی غیر مسئلہ ولكن لا اقرہ ولا اضللہ، وارجوہ العفو والمسامحة اور بحوالہ مقدمہ تحفۃ العرفی ص ۱۶۹) میں ان کی موافقت نہیں کرتا ان بہت سے امور کے بارے میں جو وہ روایت اور علل کے بارے میں کہتے ہیں اور اسی طرح ان کے اصول و فروع میں بہت سے ناپسندیدہ نظریات ہیں اور میں بہت سے مسائل میں ان کو یقیناً خطا کا سمجھتا ہوں مگر پھر بھی ان کی تکفیر و تفسیل نہیں کرتا۔ اور اللہ تعالیٰ سے ان کی عفو و درگزر کا امیدوار ہوں (۴) یہ بالکل غلط ہے کہ امام ابو حنیفہ مستور کی روایت کو محبت سمجھتے ہیں۔ حافظ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ صحیح مسک یہ ہے کہ مستور کی روایت فاسق کی طرح مردود ہوگی جب تک اس کی عدالت ثابت نہ ہو جائے اس کی حدیث حجت نہیں ہو سکتی حضرت امام ابو حنیفہ سے ایک غیر ظاہر روایت یہ ہے کہ جس کو سلف نے رد نہ کیا ہو وہ مقبول ہے لیکن ظاہر روایت وہی ہے جو پہلے بیان ہوئی (تحریر الاصول ص ۳۱۶) امام سراج الدین ہندی حنفی لکھتے ہیں کہ مستور حدیث کے سلسلہ میں باتفاق علماء احناف فاسق کی طرح مردود ہے۔ اس لیے کہ حدیث میں کافی سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، اہل پانی کے مسئلہ میں اختلاف ہے کہ مستور کی خبر پانی کی نجاست اور طہارت کے سلسلہ میں مقبول ہے یا مردود؟ (ہامش تلویح ص ۴۴) مستور کی حدیث کے بارے میں یہی مسک صاحب حنفی ص ۱ (علامہ حسام الدین المتوفی ۶۴۴ھ) اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی (وغیرہ) بھی نقل کرتے ہیں (مقدمہ مشکوٰۃ ص ۵) اور علامہ زبیدی لکھتے ہیں کہ امام صاحب کے نزدیک مجہول کی روایت مردود ہے (عقود الجواہر المنیفة ص ۱) لہذا امام ابو حنیفہ

کا مستور کی حدیث کے بارے میں صحیح مسک وہ ہے جو علماء احناف نے پیش کیا ہے نہ کہ وہ جو حفظ ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے کیونکہ مشہور ہے صاحب البیت ادنیٰ بہا فیہ (۵) حدیثہ معلل کا نسخہ یقیناً ثابت ہے لہذا اس لیے کہ علماء احناف کی طرف سے جب یہ سوال ہوا کہ میزان الاعتدال کے بعض نسخوں میں وہ عبارت موجود نہیں ہے جس میں ابن عدیؒ نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کی تضعیف کی ہے اور جس کو علامہ ذہبیؒ نے میزان میں نقل کیا ہے (علامہ ذہبیؒ نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے متعلق اپنا فیصلہ مذکورۃ الحفظ میں درج کیا ہے جو مقدمہ میں نقل ہو چکا ہے اور اس مضمون پر ہماری مبسوط کتاب مقام ابی حنیفہؒ دیکھیں) تو مبارکپوریؒ صاحب اس کا جواب یوں ارقام فرماتے ہیں۔ تو جواب اس کا یہ ہے کہ امام صاحب کا ترجمہ بعض نسخوں میں ہونا اور بعض میں نہ ہونا اس کے الحاقی وغیر معتبر ہونے کی دلیل نہیں کتب حدیث میں متعدد روایات اور عبارات ایسی موجود ہیں جو بعض نسخوں میں نہیں اور بعض میں ہیں مگر کوئی بھی ان عبارات کو الحاقی نہیں بتلاتا الی ان قال الحاصل میزان کے بعض نسخوں میں امام صاحب کے ترجمہ کا ہونا اور بعض میں نہ ہونا اس کے الحاقی ہونے کی دلیل نہیں (بلفظہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۵۴ و مثله فی الالبکار ص ۱۱) مبارکپوریؒ صاحب ہی ازراہ النص فرمائیں کہ کیا یہ قاعدہ صرف حضرت امام ابو حنیفہؒ کے لیے ہی محدود ہے یا حدیثہ معلل کا نسخہ بھی اس سے ثابت ہو سکتا ہے؟ فرمائیے بات کیا ہے؟

وفا کا اپنی ثبوت کیا دوں یہ میری الفت کی انتہا۔ کہ جس کو وہ چاہتے ہیں مہم میں خیر اس کی منار ہا ہوں و ثانیاً حدیثہ معلل کا نسخہ صرف علامہ ذہبیؒ اور ابن حبانؒ ہی سے منقول نہیں بلکہ دیگر جلیل القدر محدثین بھی نقل کرتے ہیں چنانچہ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں و هذا الحديث معلل عن ائمة الحديث كاحمد وغيره من الائمة (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۵۴) کہ اس حدیث کو امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ دیگر ائمہ حدیث نے معلول قرار دیا ہے۔

مبارکپوریؒ صاحب کے نزدیک یہ نسخہ بھی ثابت ہے یا اس کے اثبات کا بھی کوئی اور ننگ ڈھنگ ہو گا؟ (۶) وہم خطا اور نسیان تو انسان کے خمیر میں داخل ہے ان سے وہی محفوظ ہے گا جس کو خدا تعالیٰ بچائے گا لیکن بلا دلیل علامہ ذہبیؒ جیسے ناقدین فن رجال پر وہم کا الزام سنا کون ہے؟ حافظ ابن حجرؒ نے تو یہ کہا ہی تھا لیکن مبارکپوریؒ صاحب بھی اس کے کہنے پر مجبور ہیں۔



الذہبی ہومن اہل استقرا التام فی نقد اسماء الرجال تحقیق جلد ۱ ص ۱۵۱ البکارت تحفۃ  
 الاحوذی جلد ۲ ص ۱۵۱ علامہ ذہبیؒ وہ ہیں جن کو نقد اسماء الرجال میں کامل ملکہ حاصل ہے، جب علامہ ذہبیؒ  
 کو روایت اور رجال کے پرکھنے کی مکمل مہارت حاصل ہے اور ان کے بعد آنے والے جملہ حضرات محدثین  
 کرامؒ ان پر اس فن میں کملی اعما د کرتے ہیں، تو ان پر بلا وجہ یہ الزام کیوں عائد کیا جاتا ہے کہ یہ ان کا  
 وہم ہے؟ بہر حال اگر نافع بن محمودؒ کو بعض محدثینؒ نے ثقہ بھی کہا ہو تب بھی اس کی حدیث معلل  
 ہو سکتی ہے چنانچہ امام حاکمؒ سیوطیؒ اور علامہ جزائریؒ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ بسا اوقات ثقہ  
 راوی کی حدیث بھی معلل ہو سکتی ہے (معرفة علوم الحديث ص ۵۹، تدریب الراوی ص ۴۸  
 توجيه النظر ص ۱۳) اور نواب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں کہ صحت سند صحت متن  
 کو مستلزم نہیں ہے اور یہ محدثینؒ کے نزدیک معروف و مشہور ہے۔ (دلیل الطالب ص ۶۱۸)  
 مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں صحت اسناد صحت متن کو مستلزم نہیں ہے (ابکار المنن ص ۲۰۲ و  
 تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۲) اور حافظ عبد اللہ صاحبؒ روپڑیؒ لکھتے ہیں کیونکہ یہ بات ظاہر ہے  
 کہ استاد کے حسن ہونے سے حدیث اس وقت حسن ہو سکتی ہے جب حدیث میں کوئی اور عیب  
 نہ ہو اور یہاں اور عیب موجود ہے چنانچہ صاحب ابن حجرؒ نے اس کو معلول کہا ہے۔ (ضمیمہ  
 تنظیم اہل حدیث روپڑی ص ۱۶) اور مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ پس اگر ایک متن شاذ ہو یا اس  
 میں کوئی علت ہو یا ارسال والقطاع کی صورت ہو تو یہ احادیث اگرچہ اول درجہ کے ثقہ راویوں سے  
 ہوں پھر بھی ضعیف ہونگی۔ (ص ۱۸۴) جب مذکورہ بالا دلائل اور براہین سے یہ بات ثابت ہو گئی  
 کہ نافع مذکور بدستور مستور میں تو نافعؒ کی حدیث کسی طرح بھی فریق ثانی کو نافع نہیں ہو سکتی بعض لوگ  
 اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ تعدد طرق سے جبر نقصان ہو جائے گا اور حدیث حسن لغیرہ کو پہنچ جائیگی  
 مگر یہ بھی باطل ہے، چنانچہ نواب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حدیث کے درال ضعف  
 اندرون کذب یا ترک یا جہالت راوی آمدہ است اس چہن حدیث باوجود تعدد طرق و درخور اخذ  
 عمل نیست خواه در احکام باشد خواه در فضائل اعمال (انتہی۔ بلفظہ دلیل الطالب ص ۸۸) نواب  
 صاحبؒ کے کلام نے جو در حقیقت کلام الملوک ملوک الکلام کا مصداق ہے یہ بات بالکل آشکارا  
 کر دی ہے کہ وہ روایات جن میں کذاب، دجال، متروک اور مجہول و مستور راوی ہوں خواہ وہ کتنی



ہی زیادہ کیوں نہ ہوں مگر باوجود تعدد طرق کے نہ تو اثبات احکام کے لیے وہ قابل التفات ہو سکتی ہیں اور نہ فضائل اعمال کے لیے وہ اس قابل ہی نہیں کہ ان کی طرف نگاہ بھی اٹھائی جائے۔ زندہ باد نواب صاحب :-

چوتھا جواب یہ حدیث مضطرب ہے

کیونکہ محول جو نویس بالمتین ہیں سند میں گر بڑی کرتے ہیں کبھی وہ تو براہ راست حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کرتے ہیں (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۱۱ و کتاب القراءة ص ۱۱۱) اور کبھی نافع بن محمود بن ریح کے واسطے سے (ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۱۱ و کتاب القراءة ص ۱۱۱) اور کبھی محمود بن ریح عن ابی نعیم عن عبادہ کے واسطے سے (مسند رک جلد ۱ ص ۲۳۸) اور کبھی نافع بن محمود عن محمود بن عبادہ کے طریق سے (اصابہ جلد ۱ ص ۱۱۱) اور کبھی رجاء بن حیوہ عن محمود بن ریح عن عبادہ کے طریق سے (ایضاً) مؤلف خیر الکلام نے کہا کہ ممکن ہے کہ محول اور نافع کی روایت بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طریق سے ہو (محصلہ ص ۲۳۸) الجواب :- ممکن تو ہے مگر کسی صحیح سند سے اس کا اثبات ضروری ہے جو ندارد۔ اور پھر ابو نعیم میں بھی اختلاف ہے، امام حاکم کہتے ہیں کہ یہ وہب بن کیسان تھے (مسند رک جلد ۱ ص ۲۳۸) اور ابوداؤد اور دارقطنی کہتے ہیں کہ یہ ابو نعیم مؤذن تھے جلد ۱ ص ۲۳۸) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ابو نعیم کے ذکر میں راوی نے غلطی کی ہے (ص ۲۳۸)

الجواب :- پس اسی طرح کی غلطی بعض شامی راویوں نے کہ ڈالی ہے کہ موقوف کو مرفوع سے خلط ملط کر دیل ہے قول اور فہم حضرت عبادہ کا تھا اور بنا حدیث ڈالی ہے، رافق کہتا ہے کہ ابو نعیم محمود بن ریح کی بھی کیفیت تھی (تذیب التذیب جلد ۱ ص ۱۱۱) حافظ ابن حجر نے اصابہ جلد ۱ ص ۳۸۶ میں بقول مؤلف خیر الکلام محمود کی کنیت ابو محمد بتائی ہے اور اس کو صحیح کہا ہے مگر اختلاف کی نفی تو نہیں کی جس روایت کی سند میں ایسا کھلا اضطراب ہو وہ کیونکر قابل احتجاج ہو سکتی ہے ؟۔ (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۶۲ و بذل المجہود جلد ۲ ص ۵۶ و فتح الملم جلد ۲ ص ۲۶ وغیرہ) نواب صاحب لکھتے ہیں کہ حدیث کا مضطرب ہونا اکثر اہل علم کے نزدیک حدیث کے مجروح اور کمزور ہونے کا سبب ہے (دلیل الطالب ص ۱۱۸) اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ضعیف حدیث کی قسموں میں سے ایک حدیث مضطرب بھی ہے (ایضاً ص ۸۸۲) اور مولانا مبارک پوری صاحب بھی دیگر



حضرات محدثین کو ائمہ کی طرح اس قاعدہ اور ضابطہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ حدیث مضطرب قابل احتجاج نہیں ہو سکتی (دریکھے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۰ وغیرہ)

اعترض :- مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ محض اختلاف کی وجہ سے اضطراب نہیں ہوتا اضطراب کے لیے دو شرطیں ہیں اور یہاں وہ دونوں مفقود ہیں (۱) اختلاف کے وجوہ برابر ہوں (۲) اختلاف کا جمع کرنا متعذر ہو اور یہاں جمع کرنا متعذر نہیں ہے کیونکہ جب حدیث کے سند اور مرسل ہونے کا اختلاف ہو تو حدیث مندرجہ ہوگی؟ لہذا اضطراب کیسے؟ (ابکار ص ۱۲۶ اور مؤلف خیر الکلام نے بھی یہی کچھ کہا ہے ص ۲۳۸)۔

جواب :- مبارکپوری صاحب کا یہ ارشاد بھی صرف دفع الوقتی ہے اور یہ دونوں شقین باطل ہیں پہلی تو اس لیے کہ طرفین کے نزدیک ان روایتوں کے وجوہ برابر ہیں، مبارکپوری صاحب اور ان کی جماعت کے نزدیک تو ما شاء اللہ تعالیٰ محمد بن اسحاق محمول نافع اور دیگر جو راوی ان کی متابعت میں پیش کئے گئے ہیں سب ثقہ اور قابل اعتماد ہیں ورنہ وہ ان کی روایتوں سے ہرگز استدلال نہ کرتے وہ ان روایات میں سے کس کو راجح اور کس کو مرجوح اور کس کو ثقہ اور ضعیف کہیں گے؟ اور ہمارے نزدیک بھی وہ ضعیف اور محذور اور غیر معتبر ہونے میں برابر ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان میں کوئی کذاب ہے اور کوئی دجال، کوئی مجہول ہے اور کوئی مترک کوئی لیس بالمتین ہے اور کوئی ضعیف اور ہمارے نزدیک بھی کسی پر ترجیح نہیں ہے لہذا اتفاق فریقین وجوہ برابر ہیں اور حدیث لقیثا مضطرب ہے اس میں شک نہیں مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ترجیح بعض دفعہ خارجی امور سے بھی ہوتی ہے (ص ۲۴) مگر اس وقت جب روایتیں صحت میں برابر ہوں ضعیف روایات میں تطبیق کی کیا ضرورت ہے؟ اور دوسری شق اس لیے مردود ہے کہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جب حدیث کے سند اور مرسل ہونے کا جھگڑا ہو تو حدیث مندرجہ ہوگی لیکن اس کے لیے اصولی اور بنیادی شرط یہ بھی تو ہے کہ رفع کرنے والا راوی ثقہ ہو اور اس کی سند صحیح ہو اور ان پیش کردہ روایات میں کوئی سند بھی صحیح نہیں ہے اور راوی کوئی کذاب و دجال ہے اور کوئی مجہول و مترک کوئی مدلس ہے اور کوئی غیر معتبر اندریں حالات ان روایت کو صحیح قرار دینا نہ صرف یہ کہ تعصب پر مبنی ہے بلکہ انصاف کا بھی خون کرنا ہے۔

پانچواں جواب یہ روایت مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے۔

یہ روایت خلف الامام کی قید سے موقوف ہے چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ لکھتے ہیں :-

وضعه ثابت بوجوده وانما هو قول عبادة<sup>۱۵</sup> کہ یہ حدیث کئی وجوہ سے ضعیف اور معطل ہے اور

بن الصامت (تنوع العبادات ص ۸۷) یہ مرفوع بھی نہیں بلکہ حضرت عبادة بن الصامت کا قول ہے۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ :-

وهذا الحديث معطل عن الثمة الحديث

کاحمد وغیره من الاثمة وقد بسط الکلام

على ضعفه في غير هذا الموضع وبين

ان الحديث الصحيح قول رسول الله صلى

عليه وسلم لا صلوة الا بام القرآن فهذا هو

الذي اخرجاه في الصحيح ورواه الزهري

عن محمد بن الربيع عن عبادة اما الحديث

فغلط فيه بعض الشاميين واصله ان

عبادة كان يوما في بيت المقدس فقال

هذا فاشتبه عليهم المرفوع بما موقوف

على عبادة اه

(فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۵۷)

قول مشتبہ اور غلط غلط ہو گیا۔

شیخ الاسلام کی یہ عبارت نص صریح ہے کہ کمزور ضعیف اور یسین بالمتین قسم کے راویوں

نے حضرت عبادة بن الصامت کے موقوف قول کو جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مرفوع

حدیث میں ملا دیا ہے حالانکہ مرفوع حدیث میں خلف الامام کا ذکر تک نہیں ہے۔ القصہ

خلف الامام کی قید سے روایت مرفوع نہیں بلکہ یہ غلط کار راویوں کی کرم فرمائی ہے۔ اور اسی

کے بل بوتے پر فریق ثانی چیلنج کرتا ہے مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلام کے اس حدیث

کو معطل کہنے کی وجہ ان کے خیال میں محمول کا تفسر ہے اور مرفوع و موقوف میں کوئی تعارض



نہیں مرفوع کو ترجیح ہوتی ہے خود بعض حنفیہ کو اس کا اقرار ہے (محصلاً ص ۲۴) الجواب :- شیخ الاسلام  
تقریباً کی وجہ سے نہیں بلکہ اس راوی کی کھلی غلطی کی وجہ سے اس حدیث کو معطل کہتے ہیں اور مرفوع کو موقوف  
پر وہاں پر ترجیح ہوتی ہے جہاں مرفوع کی سند بھی صحیح ہو اور یہاں بخاری وغیرہ کی روایت کو وہ صحیح اور غلط  
والی کو معطل قرار دے رہے ہیں۔

### چھٹا جواب الإبائیم القرآن کی استثناء ضعیف ہے

جن حدیثوں میں خلف الامام اور الابام القرآن وغیرہ کی زیادت مروی ہے اور جو نقل کی جا چکی  
ہیں ان کی روایتی حقیقت تو آپ کو معلوم ہو چکی ہے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے بقیہ کا حال  
سن لیجئے، ایک روایت حضرت ابو قتادہؓ سے مرفوعہ مروی ہے جس میں الابام القرآن کی استثناء  
مذکور ہے لیکن علامہ بیہقیؒ لکھتے ہیں فیہ رجل لم یسمہ (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱) کہ اس میں مجہول  
راوی ہے۔ ایک مرفوع روایت حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے اور اس میں بھی الابام القرآن  
کی زیادت مروی ہے لیکن سند میں مسلمہ بن علیؓ ہے جو ضعیف ہے (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱) امام  
ابن معینؒ اور دحیمؒ اس کو یس بستی کہتے ہیں امام بخاریؒ اور ابو زرہؓ منکر الحدیث کہتے ہیں،  
ابن حبانؒ اس کو ضعیف الحدیث اور منکر الحدیث کہتے ہیں، جوزقانیؒ، یعقوب بن سفیانؒ،  
نسائیؒ، دارقطنیؒ اور برقانیؒ سب اس کو موقوف الحدیث کہتے ہیں ابو علی نیشاپوریؒ، ابن عدیؒ اور  
ابن یونسؒ سب اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ ابو احمد حاکمؒ اس کو ذاہب الحدیث کہتے ہیں ازہبیؒ  
ابن المنادیؒ، ساجیؒ، ابوداؤدؒ، اور حاکم تمام اس کی تضعیف کرتے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ منکر اور جعلی  
ومن گھڑت روایتیں بیان کیا کرتا تھا۔ (تذیب التذیب جلد ۱ ص ۱۴۶) ایک روایت اسی  
مضمون کی معجم صغیر طبرانی ص ۱۳۳ میں آتی ہے لیکن سند میں عبداللہ بن لیثؓ ہے جس کا ذکر کبریٰ  
خدا ج میں ہو چکا ہے اسی مضمون کی ایک روایت جزا القرآۃ ص ۱۴ کتاب القرآۃ ص ۴۶، ص ۵۳  
اور تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۹۳ میں ہے لیکن اس کی سند میں عمرو بن شعیبؓ الخ کے علاوہ عکرمہ بن عمارؓ  
ابن حجرؒ ان کو غلط کاربہتے ہیں (تقریب ص ۲۶۸) امام احمدؒ اس کو ضعیف الحدیث کہتے ہیں۔  
(میزان جلد ۲ ص ۲۰) ایک روایت یہ پیش کی گئی ہے کہ حضرت جبرائیلؑ نے فرمایا میں نے آنحضرت صلی  
اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کی آپ نے فرمایا اے جبرائیلؑ اپنے پروردگار کو سناؤ مجھے نہ سناؤ

اَقْلًا تو اس روایت میں اَلْاَيَّامُ الْقُرْآنُ کی استثناء مذکور نہیں ہے و ثانیاً علامہ مٹھی لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں عبد اللہ بن جبر بن جبر مجہول ہے لہٰذا احمد من ذکرہ (جمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۸) اس کا ذکر مجھے کہیں نہیں مل سکا الغرض الایام القرآن کی استثناء کسی صحیح سند سے ثابت نہیں ہے چنانچہ اہم الجرح والتعديل امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ الایام القرآن کی استثناء کسی بھی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے (ہامش نسائی جلد ۱ ص ۱۰۶ و اعلام السنن جلد ۳ ص ۱۸) الحاصل صحیح روایت صرف وہی ہے جو بخاری اور مسلم وغیرہ میں موجود ہے جس میں نہ تو خلف الامام کا ذکر ہے اور نہ خلف الامام کے بعد الایام القرآن کا پیوند موجود ہے، ہاں اس کے دیگر طرق میں فصاعداً ما تيسر اور ما زاد کی زیادت بند صحیح موجود ہے اور یہ ضعیف، کمزور اور لیس بالمتین قسم کے راویوں کی کارستانی ہے کہ وہ کبھی تو الایام القرآن کا اضافہ کر دیتے ہیں اور کبھی خلف الامام کا پنچر ساتھ لگا دیتے ہیں خلاف ثقہ، ثبت اور حجت قسم کے راویوں کے کہ وہ پوری دیانت اور صداقت کے ساتھ مرفوع روایت کو اس طرح نقل کرتے ہیں :-

كل صلاة لا يقرأ فيها بام الكتاب فهي خداج الا خلفت امام (كما امر مفضل)  
کہ ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو وہ ناقص ہوتی ہے ہاں البتہ وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی جائے۔

ساتواں جواب لفظ خلف امام مدرج ہے

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ خلف الامام کا جملہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان نہیں بلکہ یہ حضرت عبادۃ بن الصامت کا قول ہے اور بعض غلط کاراویوں نے اس کو مرفوع حدیث میں درج کر دیا ہے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری (المتوفی ۱۳۴۲ھ) فرماتے ہیں کہ خلف الامام کا لفظ شاذ ہے کیونکہ ثقافت محدثین اس کو نقل نہیں کرتے امام بیہقی وغیرہ نے گو اس حدیث کے صحیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ (اور اس کے اثبات کیلئے ہاتھ پاؤں بھی مائے ہیں۔ ص ۵۵)

مگر یہ زیادت بہر حال ضعیف ہے (بذل المجموع جلد ۲ ص ۵۵) حضرت مولانا سید محمد النور شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ لفظ خلف الامام یقیناً اور قطعاً مدرج ہے اگر کوئی شخص اس کے مدرج ہونے پر قسم کھائے تو وہ ہرگز حائث نہ ہوگا (فصل الخطاب ص ۱۸) مولف خیر الکلام کا اس دعوائی اور ارج کو صریح جھوٹ کہنا (ملاحظہ ہو ص ۲۲۹) نہ انصاف ہے جو قطعاً مردود ہے شیخ الاسلام کی عبارت پہلے گزر چکی ہے اور



اس پر ائمہ حدیث کے ٹھوس دلائل قائم کیے ہیں نرے احتمال سے اور ارجح کا دعویٰ نہیں ہے۔ اور حافظ ابن حجر کے حوالے کہ محض احتمال سے اور ارجح ثابت نہیں ہو سکتا بالکل صحیح ہیں مگر یہ اور ارجح احتمال سے نہیں بلکہ دلائل سے ثابت ہے۔ فریق ثانی کے نزدیک زہریؒ بھی اپنا قول حدیث میں بلا دیا کرتے تھے شاید کہ خلف الامام کا لفظ انہوں نے بلا دیا ہو اور بقول شیخ الاسلام شامی راویوں کی غلطی بھی کوئی محض بات نہیں اور کیا بعید ہے کہ یہ محمد بن اسحاقؒ کے دجل اور کذب کا ہی کرشمہ ہو اور محمد بن یحییٰ الصفاؒ پر کس نے یہ پابندی عائد کی ہے کہ وہ اس زیادت کو بطور تفقہ کے استاد محترم کی طرح اس حدیث میں مدرج نہ کر سکیں؟ بہر حال کوئی بھی اس کا مرتکب ہوا ہو یہ یقینی بات ہے کہ خلف الامام کا لفظ مدرج ہے اور ائمہ کتابت کے قرین قیاس یہ ہے کہ یہ محمول کا مدرج ہے کیونکہ محدثین کی ایک جماعت ان میں کلام کرتی ہے اور وہ لیس بالمتین بھی تھے اور محمول کا شامی ہونا اظہر من الشمس ہے اور نظریہ ظاہر شیخ الاسلام کی عبارت کا رُخ بھی انہیں کی طرف ہے اور یہ قرین انصاف بھی ہے اس لیے کہ امام زہریؒ سے ثقات اور حفاظ کی ایک جماعت یہ روایت نقل کرتی ہے اور ان کی روایت میں خلف الامام کا لفظ نہیں لیکن جب محمول روایت کرتے ہیں تو اس میں خلف الامام کا یہوند بھی ساتھ ہی ملتا ہے۔ اب آپ نہایت اختصار کے ساتھ اجمالی طور پر ان راویوں کا ذکر سن لیں جو امام زہریؒ سے روایت کرتے ہیں مگر خلف الامام کا پہنچر ساتھ نہیں ملائے۔

- (۱) امام سفیان بن عیینہ (مسلم جلد ۱۹ و البوعوانہ جلد ۲ ص ۲۷۴ و جزأ القراءة ص ۲) (۲)  
 امام یونس (مسلم و البوعوانہ جلد ۲ ص ۱۲۵) (۳) امام صالح (مسلم و البوعوانہ ص ۱۲۴) (۴)  
 امام عمر (مسلم جلد ۱۹ و البوعوانہ جلد ۲ ص ۱۲۴) (۵) امام مالک (موطأ ص ۲۹ و جزأ القراءة ص ۲۳ و ۵۵) (۶) امام ابن جریر (کتاب القراءة ص ۹) (۷) امام لیث بن سعد (جزأ القراءة ص ۲۳)  
 (۸) امام قرۃ بن عبد الرحمن (کتاب القراءة ص ۱۱) (۹) امام عقیل (ایضاً) (۱۰) امام اسحاق بن عبد الرحمن مدنی (ایضاً) (۱۱) امام اوزاعی (ایضاً) (۱۲) امام شعب بن ابی حمزہ (ایضاً) (۱۳) امام موسیٰ بن عقبہ (معجم صغیر طبرانی ص ۲۲) (۱۴) امام عثمان بن عمر بواسط یونس (مسند ص ۱۴۶ و کتاب القراءة ص ۲۳) وغیرہ وغیرہ  
 یہ تمام جو حدیث فقہ کے ستم امام ہیں امام زہریؒ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں۔ لیکن ان میں کوئی بھی خلف الامام کا ذکر نہیں کرتا اور جب محمول اور ابن اسحاقؒ وغیرہ ضعیف کمزور اور لیس بالمتین راویوں کی



باری آتی ہے تو ان کی روایت میں خلف الامام کا بیوند اور پکچر بھی ساتھ ہی ملتا ہے اگر ابن اسحاق وغیرہ ثقہ اور ثبت ہوتے تو ان کی یہ زیادت قابل قبول ہوتی اور جہور کا اس پر عمل نہ مگر ان حالات میں جن کا فصل ذکر ہو چکا ہے۔ کہ وہ ضعیف اور لیس بالمتین ہیں اس زیادت کی کیا وقعت باقی رہ جاتی ہے؟ اور اس کو سننے کے لیے کون آمادہ ہے؟ امام بیہقی لکھتے ہیں کہ محدث ابن خزیمہ کا بیان ہے کہ اگر کوئی ثقہ اور حافظ راوی زیادت بیان کرے اور دیگر ثقات حفاظ اور متقین نے وہ بیان نہ کی ہو تو ہم ایسی زیادت کا انکار نہیں کرتے لیکن اگر کوئی ایسا راوی زیادت نقل کرتا ہو جو حفظ و اتقان میں ان حفاظ اور ثقات کا ہم پلہ نہ ہو تو اس کی زیادت قبول نہیں کی جاسکتی (کتاب القراءۃ ص ۹۵) خیر یہ تو عام ثقات کی زیادت کا ذکر ہوا امام زہریؒ کی روایت میں زیادت کا ضابطہ بھی سن لیجئے جو حضرت امام سلمؒ نے اپنے صحیح کے مقدمہ میں بیان کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ حضرات محدثین کرامؒ کا زیادت کے بارے میں مسلک یہ ہے کہ اگر چند ثقات اور حفاظ کسی حدیث کو بیان کریں پھر ان ہی ثقات میں کوئی ثقہ زیادت نقل کرے جو دوسروں کے پاس نہیں ہے تو یہ زیادت قابل قبول ہوگی لیکن اگر کوئی راوی امام زہریؒ جیسے امام سے جن کے بکثرت تلامذہ موجود ہیں اور حفاظ اور متقین بھی ہیں یا ہشام بن عروہؒ جیسے امام سے ان کی مروی حدیث میں کوئی ایسی زیادت نقل کرے جو ان کے تلمذ دیگر ثقات تلامذہ بیان نہیں کرتے اور ان کی یہ حدیث بھی اہل علم کے ہاں مشہور و معروف ہو اور زیادت نقل کرنے والا ان ثقات کے ساتھ شریک بھی نہ ہو۔ فقیر جائز قبول هذا الضرب من الناس ومقدمہ مسندو جلد ۱ ص ۵) تو اس قسم کے راویوں کی زیادت ہرگز جائز نہیں ہے کہ قبول کی جائے انہیں حالات امام زہریؒ کی حدیث میں محمد بن اسحاقؒ، مکحولؒ اور نافعؒ وغیرہ کذاب و دجال ضعیف و کمزور مجہول و مستور دلس اور لیس بالمتین وغیرہ کی زیادت کون قبول کرے؟ اس پوری تشریح کے بعد مزید کسی بحث کی ضرورت تو نہیں لیکن ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے وہ یہ کہ مبارک پوری صاحب حضرت عبادہ بن الصامتؓ کی روایت (بزیادت لفظ خلف الامام) کی تصحیح اور تحسین کا یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کی تحسین کی ہے امام حاکمؒ اور دارقطنیؒ اس کی تصحیح کرتے ہیں امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند جید ہے اور اس میں کوئی طعن نہیں ہے لامطعن فیہ مولانا محمد عبد الحمی صاحب لکھنؤیؒ لکھتے ہیں اس کی سند قوی ہے اس لیے یہ حدیث صحیح اور حسن ہے



درمصلہ ابکار المن وغیرہ ص ۱۲۳) اگر اس سند کے راوی ثقہ ہوتے یا ان میں معمولی کلام اور جرح ہوتی یا ائمہ جرح و تعدیل میں اکثریت نے ان کی توثیق کی ہوتی اور یہ اکابر اس سند کو صحیح، حسن، جید اور قوی کہتے تو سرور آنکھوں پر ان کی بات حجت تھی مگر اس کو کیا کیا جاتے کہ کذاب و دجال قسم کے راوی اس میں موجود ہیں اور تصریح حضرات محدثین احکام و سنن میں ان کی روایت حجت ہی نہیں ہو سکتی اور اس سند کی کڑی میں مجہول و مستور اور ایسے بالمتین قسم کے اور راوی بھی ساتھ شریک ہو جائیں تو اس سند میں کیا قوت باقی رہ جاتی ہے؟ خصوصاً جب کہ تصحیح اور تحسین کرنے والے متقابل بھی ہوں۔

امام ترمذی کی تحسین :- علامہ ذہبیؒ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اس مقام میں امام ترمذیؒ نے اس حدیث کی تحسین کی ہے لیکن اچھا نہیں کیا (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۱۲۱) اسی طرح ابو غالبؒ کی حدیث کی امام ترمذیؒ نے تصحیح کی ہے علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ امام نسائیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں اور ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج ہی صحیح نہیں ہے (ایضاً جلد ۱ ص ۲۲۱) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ کثیر بن عبد اللہؒ کی حدیث پر امام احمدؒ نے قلم پھیر دیا تھا اور یہ فرماتے تھے کہ وہ محض ایسے ہے لیکن امام ترمذیؒ کبھی اس کی حدیث کی تصحیح کرتے ہیں اور کبھی تحسین (زاد المعاد جلد ۱ ص ۱۴۳) مولانا شمس الحق صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں امام ترمذیؒ کی تصحیح و تحسین پر کسی نے ان سے اتفاق نہیں کیا (تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۲۲۲) شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں کہ محدثین امام ترمذیؒ کی تصحیح پر اعتماد نہیں کرتے (فتح الملکم جلد ۲ ص ۴۳) آثار متبوعہ میں (جو ایک غیر مقلد عالم کی تالیف ہے) لکھا ہے کہ تصحیح و تحسین تو امام ترمذیؒ اس میں متقابل ہیں (بکاۃ الزہار ج ۱ ص ۱۰۰) مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام ترمذیؒ کی تحسین پر کوئی اعتبار نہیں کیونکہ وہ متقابل تھے (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۲ و ص ۲۲۰ و ص ۲۴۶ و ابکار المن ص ۱۱۵ و ص ۱۲۳ اور یہ عبارت ابکار ص ۱۱۵ کی ہے) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ اگرچہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے لیکن ان کی تصحیح میں کلام ہے۔

(ابکار المن ص ۱۱۵) امام ترمذیؒ کی تصحیح قابل تفتید ہے کیونکہ وہ معصوم نہیں (الخصم ص ۲۴۲)

امام حاکمؒ کی تصحیح :- علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ امام حاکمؒ مستدرک میں موضوع اور جعلی حدیثوں تک کی تصحیح کر جاتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۳۱) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ امام حاکمؒ ساقط الاعتبار حدیثوں کی بھی تصحیح کر جاتے ہیں (میزان جلد ۳ ص ۱۵۵) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ امام حاکمؒ موضوع اور جعلی حدیثوں کی بھی تصحیح کر جاتے ہیں (کتاب التوسل ص ۱۱۵) علامہ ابن دبیہؒ کہتے ہیں کہ امام حاکمؒ



کثیر الغلط تھے ان کے قول سے گریز کرنا چاہیے (مقدمہ زیلعی ص ۱۱) ثواب صدیقی حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ تصحیح حاکم پیش علماء حدیث بدون شہادت دیگر ائمہ فن لیس بستی است (ردلیل الطالب ص ۶۱) مبارکپوری صاحب ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ حاکم کی تصحیح میں کلام ہے (ابکار ص ۶۱) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ امام حاکم کا تہاہل علماء فن کے نزدیک معروف و مشہور ہے (ایضاً ص ۲۳۶) مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اسی طرح امام حاکم کی تصحیح بھی قابل تنقید ہے الخ (ص ۲۳۳) امام دارقطنیؒ کی تصحیح کا بھی چنداں اعتبار نہیں ہے۔ وہ ایک ہی راوی کو کبھی ثقہ اور کبھی ضعیف کہہ دیتے ہیں جیسا کہ پہلے اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اور محمد بن اسحاقؒ کے بارے میں تو امام دارقطنیؒ نے یہ فرمایا کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے پھر ان کی ایسی تصحیح کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ خصوصاً جب کہ جمہور ائمہ جرح و تعدیل دوسری طرف ہوں۔

امام خطابیؒ کا یہ فرمانا کہ اس حدیث کی سند جید ہے محل تعجب ہے، محمد بن اسحاقؒ پر اشد جرح موجود ہے محمول لیس یا ملتین اور مدلس تھے، نافع مجہول و متور ہے، حدیث مضطرب ہے بقیہ خلف اللام یہ حدیث موقوف ہے اور یہ زیادت درج ہے اتنی خرابیاں ہوتے ہوئے بھی اگر یہ حدیث جید ہے تو اسی تصحیح و تضعیف کے بارے میں شاید اصطلاح ہی کوئی الگ اور جدا گانہ ہوگی۔ بل البتہ امام خطابیؒ کا یہ ارشاد مبینی بر النصات ہے کہ اس میں طعن نہیں ہے لا مطعن فیہ یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ اس میں مطعن نہیں ہے کسی مطاعن میں بلکہ یہ گنجینہ مطاعن ہے جیسا کہ آپ تفصیلاً ملاحظہ کر چکے ہیں۔

مولانا ابوالحنات محمد عبدالحی صاحب لکھنویؒ اپنے وقت کے متحر عالم اور وسیع النظر فقیہ اور مفتی تھے لیکن نہ تو وہ ائمہ جرح و تعدیل میں تھے اور نہ بغیر کسی سند کے ان کا کوئی قول معتبر ہو سکتا ہے (دیکھئے مقدمہ زیلعی ص ۱۱ وغیرہ) روایات کی جرح و تعدیل میں وہ تو صرف ہماری طرح کے ناقل ہیں۔ لہذا ان اکابر کا اس حدیث کو صحیح حسن جید اور قوی کہنا کوئی معنی اور پوزیشن نہیں رکھتا اور نہ ان کے کہنے سے کذاب و جہال مجہول و متور راوی ثقہ ہو سکتے ہیں۔

امام بیہقیؒ نے بھی اس حدیث کی تصحیح کی ہے مگر ان کی یہ تصحیح بھی قابل اعتماد نہیں ہے کیونکہ سند کا حال آپ دیکھ ہی چکے ہیں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ قاعدہ جلیلہ میں لکھتے ہیں کہ امام بیہقیؒ تعصب سے کام لیتے ہیں اور لبا اوقات ایسی روایات سے احتجاج کرتے ہیں کہ اگر ان کا کوئی مخالف ان سے



استدلال کرے تو اس کی تمام کمزوریاں ظاہر کئے بغیر ان کو عین نہ آئے (دیکھئے بغیۃ الملعی جلد ۲ ص ۸) امام بیہقی ایک مقام پر صلوة وتر کے عدم وجوب پر عاصم بن ضمرہ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۸) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ عاصم بن ضمرہ یس بالقوی (ایضاً جلد ۲ ص ۱۷) اور ایک سند کے متعلق جس میں جواب تمیمی ہے لکھتے ہیں رواہ کلمہ ثقات کہ اس کے سب راوی ثقہ ہیں (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۸) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں جواب التیمی غیر قوی (جلد ۵ ص ۲۳۵) جواب تمیمی قوی نہیں ہے وغیرہ وغیرہ مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں: امام بیہقی اگرچہ محدث مشہور ہیں مگر ان کا کوئی قول بلا دلیل معتبر نہیں ہو سکتا (ملفوظ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۳۲) بلاشبہ ان اکابرین کا امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف تحیة) پر بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کے علاوہ اپنے پیارے نبی کی پیاری حدیثیں بھی امت تک پہنچائیں اور ساری عمریں اس خدمت میں صرف کر دیں لیکن تحقیق و تفحص کے میدان میں جب قدم آگے بڑھایا تو بسا اوقات کسی راوی اور حدیث کے متعلق ان کو نظر یہ پڑنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اپنی سابق رائے کو ترک کرنا پڑا اور کسی موقع پر بمقتضائے بشریت فروعی مسائل میں تعصب بھی کام لیا گیا ہے لیکن حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے بغیر معصوم کون ہے؟ اور تحویلی طور پر بغیر اس تنازع کے احادیث کی چھان بین بھی کہاں ہو سکتی تھی؟ باوجود اس جبروئی اور فروعی اختلاف کے ہمارے لیے وہ قابلِ صدا احترام ہیں جہاں انہوں نے سونے کی بوریاں کمائیں مٹھی خاک کی بھی ان میں ڈال دی مگر ہمارے پاس نیکیوں کا کون سا ذخیرہ ہے؟ اس لیے ہمیں اپنے گناہوں میں اضافہ کرنے کی غرض سے چُن چُن کر ان کی خطائیں اور لغزشیں ملانے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔

آٹھواں جواب:- آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ خلف الامام کی قید کے ساتھ حضرت عباد بن الصامت کی یہ روایت نہ صرف یہ کہ انتہائی درجہ کی ضعیف کمزور اور معلول ہے بلکہ یہ الفاظ ہی مدرج ہیں اور یہ درج بھی یس بالمتین قسم کے راویوں کی غلطی کا شاخسانہ ہے جو بہر حال مردود ہے اندریں حالات اس روایت کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن اگر بالفرض یہ روایت صحیح بھی ہو تو اس کا ایسا مطلب اور معنی کیوں نہ کر لیا جائے جو قواعد عربی کے موافق ہو اور ایسا معنی امر دینے سے صحیح احادیث کے ساتھ تطبیق کی صورت بھی نکل آئے اور صحیح احادیث کی مخالفت لازم نہ آئے اور یہ بات زیادہ قرین انصاف ہے کہ واذا قرأوا نعتوا وغیرہ کی صحیح روایات کو اپنے مقابل پر رکھا جائے



اور کمزور قسم کی روایات میں مناسب تاویل کر لی جائے نہ یہ کہ کمزور اور محلول روایتوں کو اصل قرار دیا جائے اور صحیح احادیث میں بیجا تاویلات کا دروازہ کھول دیا جائے۔ غلط کا معنی مکانی بھی ہو سکتا ہے اور زمانی بھی غلط الامام کا ثانی معنی مد نظر رکھ کر مطلب یہ ہو گا کہ جس آدمی نے اہم کے فارغ ہونے کے بعد اپنی بقیہ رکعات میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز نہ ہوگی اس لحاظ سے یہ روایت مسبوق کے حق میں ہوگی۔ فن حدیث سے تعلق رکھنے والے اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ مختلف احادیث کی آپس میں تطبیق کے لیے بسا اوقات محض فرضی باتیں بھی اختیار کی جاتی ہیں اور یہ معنی تو روزمرہ کے معمولات اور مشاہدات میں ہے کہ اہم کے فارغ ہونے کے بعد وہ مقتدی پر مسبوق ہوتا ہے اپنی بقیہ رکعات میں باقاعدہ سورۃ فاتحہ پڑھتا ہے اور کون نمازی ایسا ہو گا جس کے ساتھ کبھی یہ صورت نہ پیش آئی ہو۔ راوی مقتدی جو اول سے آخر تک حقیقۃً اہم کے پیچھے کھڑا ہو یا حکماً اہم کے پیچھے ہو جیسے لاحق وغیرہ تو اس کا مسئلہ ہی الگ ہے اس کو اہم کے پیچھے قرأت کرنے کی مطلقاً گنجائش نہیں جس کی پوری تفصیل جلد اول میں گذر چکی ہے۔ مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ یہ تاویل راوی حدیث حضرت عبادہ کے مسلک کے خلاف ہے اور خود حنفی مسلک میں فراغت اہم کے بعد سورۃ فاتحہ کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنے کا حکم ہے یہ تاویل نہیں بلکہ تحریف ہے (محصلہ ص ۱۲۴) الجواب ۱۔ یہ تاویل چونکہ دیگر صحیح روایات کے مطابق ہے اس لیے درست ہے روایت کے مقابلہ میں راوی کی رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اور احناف سورۃ فاتحہ کے علاوہ مزید قرأت کے بھی فراغت کے بعد مسبوق کے لیے قائل ہیں مگر وہ مزید قرأت فصلاً۔ مائتیر اور مازاد وغیرہ سے ثابت ہے اور ہم نے اس کا باقاعدہ (جلد ۱ ص ۱۰ طبع اول میں) حوالہ دیا ہے جس کو مؤلف مذکور بالکل ہضم کر گئے ہیں لہذا یہ بالکل مناسب تاویل ہے جس میں بھیجیں ہونے کی ضرورت نہیں غلط الامام میں لفظ غلط مکان کے معنی میں مستعمل ہونا تو فریق ثانی کے نزدیک بھی مسلم ہے البتہ غلط ثانی محل غور ہو سکتا ہے ۱۔ اس کی چند مثالیں سن لیں۔ (۱) فَقَدْ خَلَّتِ التُّدْرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ (پ ۳۔ حقاۃ ۲) اور بے شک بہت سے ڈرانے والے حضرت ہو علیہ السلام کے آگے اور ان کے پیچھے گند چکے ہیں۔ یہاں مِنْ خَلْفِهِ میں غلط زمانی مراد ہے کیونکہ ڈرانے والے پیغمبر حضرت ہو علیہ السلام کے پیچھے صاف بندی کر کے کھڑے نہ تھے جیسا کہ ظاہر ہے بلکہ وہ ڈرانے والے، رسول اور نبی مراد ہیں جو ان کے زمانہ کے بعد دنیا میں آئے (۲) یتامی کے اموال میں بے اعتدالی کرنے والوں کو



اللہ تعالیٰ اپنا شاہی حکم سناتا ہے لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا (النساء، ۱) یعنی اگر وہ لوگ اپنے پیچھے کمزور اور ضعیف اولاد چھوڑ جاتے اور خود راہی ملک بچا ہو جاتے تو ان کو اپنی اولاد کی ضرورت نہ ہوتی اسی طرح دوسروں کے یتیموں کا خیال بھی کرنا چاہیے اس مقام میں بھی من خلفہم سے خلف زمانی مراد ہے کیونکہ اولاد اپنے والدین کی وفات کے بعد دنیا میں اپنے بچے بڑے دن پورے کر کے اپنی زندگی کا زمانہ گذرتی ہے نہ یہ کہ جس مقام پر والدین ہوتے ہیں وہاں ان کے پیچھے لام بندی کر کے صف آرا ہوتی ہے اسی طرح حضرات شہداء کرام کے بچے میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ (پ۔ ال عمران ۱۶۰) اور وہ شہداء غوش وقت ہوتے ہیں ان کے بارے میں جو ان کے پیچھے ہیں اور ابھی ان سے نہیں ملے۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چھوٹے چھوٹے لشکروں میں جہاد کے لیے شریک نہ ہونے کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں لَوْ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ سَرِيَّةً وَلَوْ دُونَ الْاِقْتِلَافِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الْحَدِيث (بخاری جلد ۱ ص ۱۰۸) اگر مجھے یہ خوف نہ ہو کہ میرے شریک ہونے کی وجہ سے اس میں بھی ضرر شریک ہوگی اور مشقت میں مبتلا ہوگی تو میں کسی چھوٹے لشکر کے پیچھے بھی نہ رہتا اور میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں شہادت پاؤں۔ واضح امر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مجاہدین کے لشکروں کو روانہ کر کے جتنا زمانہ وہ جہاد میں مشغول رہتے تھے۔ آپ مدینہ طیبہ میں وہ زمانہ گزارتے تھے نہ یہ کہ آگے مجاہد کھڑے ہوتے تھے اور پیچھے آپ کھڑے ہوتے تھے۔ یہاں بھی خلف زمانی ہے نہ کہ مکانی۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔  
وَتَجِبُونَ وَتُجَدُّونَ وَتَكْبَرُونَ خَلْفَكُمْ كُلَّ صَلَوةٍ الْحَدِيث (بخاری جلد ۱ ص ۱۱۰)  
تم ہر (فرضی) نماز سے فارغ ہو کر (۳۳ مرتبہ) سبحان اللہ اور (۳۳ مرتبہ) الحمد للہ اور (۳۴ بار) اللہ اکبر کہنا کرو۔

اس روایت میں بھی خلف زمانی ہے کیونکہ سبحان اللہ وغیرہ کلمات نماز سے فارغ ہونے کے بعد پڑھنے کا حکم ہے یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہے کہ بحالت نماز امام کے پیچھے یہ کلمات پڑھنے کی اجازت ہے۔ حافظ ابن حجر اس کا معنی یوں کرتے ہیں يُقَالُ عِنْدَ الْفَرَغِ مِنَ الصَّلَاةِ (رفع الباری ص ۲۳)



یہ کلمات نماز سے فارغ ہونے کے بعد پڑھنے چاہئیں اور نواب صاحب لکھتے ہیں :- مراد خلف میں  
 باد پر صلاۃ است عقب خروج ازاں (دلیل الطالب ص ۲۲۴) (۵) صراح ص ۲۳۱ میں لکھا ہے خلف  
 قرآن بعد قرآن یعنی ایک زمانہ کے بعد دوسرا زمانہ (۶) امام ابن جریر طبری مابینہا وما خلفہا  
 کا معنی کرتے ہیں لما قبلہا وما بعدہا من الامم (تفسیر ابن جریر جلد ۱ ص ۲۶۵)  
 یعنی جو قومیں زمانہ کے لحاظ سے پہلے گذر چکیں اور جو بعد کو آئیں گی و علیٰ ہذا القیاس قاضی بیضاویؒ  
 امام سیوطیؒ اور شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (المستوفی ۱۲۳۹ھ) وغیرہ حضرات مفسرین کرامؒ اس آیت میں خلف  
 سے خلف زمانی مراد لیتے ہیں یعنی بعد کو آنے والی قومیں (دیکھئے بیضاوی ص ۸۱، جلالین ص ۱۰۸ اور عزیزی  
 جلد ۱ ص ۱۶۸ وغیرہ) اور مشہور تابعی ابو العالیہ الریاضیؒ بھی خلف زمانی ہی مراد لیتے ہیں (بخاری ص ۴۲۳)  
 اسی طرح مشہور حدیث کما ہلک بنی خلفہ بنی الحدیث (بخاری جلد ۱ ص ۴۹) اور حدیث  
 من کل خلف عدولہ الحدیث (مشکوٰۃ جلد ۳) وغیرہ میں خلف زمانی کا معنی ہی متعین  
 ہے علاوہ بریں سلف و خلف کا جملہ کس سے مخفی ہے؟ یعنی جو لوگ زمانہ کے لحاظ سے پہلے ہوئے۔ وہ  
 سلف اور جو بعد کو آئے وہ خلف۔ نواب صاحب قاضی شوکانیؒ کو فخر خلف و بقیۃ سلف لکھتے ہیں۔  
 (تقصیر ص ۸۲) اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ اور اس قسم کی دیگر مثالیں دیکھ کر یہ قومی وہم پیدا ہو  
 جاتا ہے کہ خلف کا زیادہ تر استعمال خلف زمانی کے معنی میں ہوتا رہا اور ہوتا ہے اس لیے فریق ثانی  
 کا اس حدیث میں لفظ خلف کے خلف مکانی کے معنی میں متعین ہونے پر ضد اور اصرار کرنا اس ضد سے کس طرح  
 بھی کم نہیں ہے جو وہ اس معلول حدیث کے صحیح اور قابل احتجاج ہونے پر کمر رہا ہے۔  
 نوابؒ جواب :- حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ فرماتے ہیں کہ :-

فان قيل حديث عبادة لا تفعلوا الا بام  
 القرآن فانه لا صلوٰة لمن لم يقرأ بها  
 صريح في الزام الفاتحة على المؤتم قلنا  
 نعم هو اصرح الروايات التي ذكرتم  
 لكن دلالتہ على ما هو مطلوبكم غير  
 مسلم لان الالزام ان كان بقوله لا تفعلوا الا بام  
 اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عبادہؓ کی حدیث کہ تم ام القرآن  
 کے سوا کچھ اور نہ پڑھو اس لیے کہ جس نے سورۃ فاتحہ  
 پڑھی اس کی نماز نہیں ہوتی اس بات میں صریح ہے کہ  
 مقتدی پر سورۃ فاتحہ لازم ہے تو ہم جواب میں کہیں گے  
 کہ ہاں تمہاری پیش کردہ روایات میں سے یہ صریح  
 ہے لیکن تمہارے مطلوب پر اس کی دلالت مسلم نہیں



القرآن فهو غير تام لما تقر في مقتره ان  
الاستثناء عن النهي لا يدل إلا على خروج  
المستثنى عن جواز المنهي لا على الزامه و  
ركنيته او وجوبه وان كان بقوله فانه  
لا صلوة الخ فهو لا يدل على الركنية  
كنظائره من الاحاديث السابقة

(امام الكلام ص ۲۲۳)

کیونکہ اگر لازم ہونے پر استدلال لا فاعلوا الا بام القرآن  
سے ہے تو یہ نام نہیں کیونکہ اپنی جگہ یہ بات ثابت شدہ  
ہے کہ نہی سے استثناء صرف مستثنیٰ کے منہی کے حق سے  
نکلنے پر دلالت کرتی ہے لازم اور رکن ہونے یا وجوب  
پر دلالت نہیں کرتی اور اگر یہ استدلال لا صلوة الخ  
سے ہے تو بھی یہ کیفیت پر دال نہیں جیسا کہ پہلے بیان  
کی ہوئی اس کی تطاّر سے ثابت نہیں ہے۔

یعنی فریق ثانی مقتدی پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا لازم رکن اور ضروری قرار دیتا ہے جیسی تو مقتدی کے سورہ  
فاتحہ کے نہ پڑھنے کی صورت میں اس کی نماز کو وہ باطل بیکار اور کالعدم ٹھہراتا ہے لیکن عربی اور گرائمر کے  
لحاظ سے ان کا مطلب اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے اس لیے کہ نہی کے بعد اگر  
استثناء آئے تو اس سے صرف اباحت ثابت ہو سکتی ہے اور ظاہر امر ہے کہ ترک مباح کی وجہ سے کسی  
طرح بھی نماز کا بطلان اور فساد لازم نہیں آتا لہذا اس روایت سے نہ تو روایت فریق مخالف کا بے بنیاد  
دعویٰ ثابت ہوتا ہے اور نہ روایت اور کجاء اللہ تعالیٰ ہم نے بھی اس کے اس غلو کو توڑنے کے لیے یہ کتاب  
لکھی ہے ورنہ ایک اختلافی مسئلہ کے سلسلہ میں اتنی کاوش کی ضرورت نہ تھی۔

یہ ہے خلف الامم کی حدیث کا پس منظر جس کے بل بوتے پر فریق ثانی کی طرف سے تمام روئے زمین  
کے علماء احناف کو کھٹلا اور انعامی چیلنج کیا جا رہا ہے اگر فریق ثانی گستاخی نہ سمجھے تو ایک جائزہ قسم کا در عرض  
کرتا ہوں وہ اس کو پڑھا کرے (اور وہ یا شیخ عبدالقادر جیلانی شفیث اللہ تعالیٰ کے خالص مُشرک نہ درود  
سے کوئی تعلق نہیں رکھتا) وہ درود شریف یہ ہے

اے میرے بارخ آرزو کیسا ہے بارخ ہائے تو

کلکلیاں تو گوہیں چار سو کوئی کلی کھلی نہیں

چوتھی روایت :- امام بیہقی نے اپنی سند سے یہ روایت نقل کی ہے کہ محمد بن ابی عائشہ آنحضرت  
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک صحابی سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ  
علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-



لعلکم تقرؤن والامام یقرأ قالوا انتا  
لنفعل قال فلا تفعلوا الا ان یقرأ احدکم  
بفتح الکتاب۔

(سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۸۵)

شاید تم اس وقت قرأت کیا کرتے ہو جس وقت ام  
قرآن کر رہا ہوتا ہے، حضرات صحابہ کرام نے فرمایاں ہم  
قرأت کیا کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ تم قرأت نہ کیا کرو یاں  
مگر یہ کہ سورۃ فاتحہ کی قرأت کر لیا کرو۔

ام یہ بھی فرماتے ہیں ہذا السناد جید کہ اس کی سند جید کھری اور عمدہ ہے

الجواب: نہ مضمون امام حق نے کس طرح اس مذکور حدیث کو دیا ہے کیونکہ اسکی سندیں ابراہیم بن ابی الیثیم سے صلح جزیرہ  
کہتے ہیں کہ بیس سال تک وہ جھوٹ کنتا رہا ہے ابن معین فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور احمق تھا ساجی  
اس کو متروک کہتے ہیں ابن معین نے بعد کو اسے کذاب اور غیث کہا ہے سب سے پہلے اس کے جھوٹ  
کی حقیقت دور قی نے واضح کی تھی یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے پہلے اس سے روایتیں لکھی  
تھیں مگر بعد کو سب سے ترک کر دیا تھا اس میں اتنی جرأت بڑھ گئی تھی کہ وہ جعلی اور موضوع حدیثیں  
بھی بیان کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ ام نسائی کہتے ہیں کہ وہ ثقہ نہیں ہے، ابن سعد کہتے ہیں کہ  
حدیث میں وہ ضعیف سمجھا جاتا ہے (لسان المیزان جلد ۱ ص ۹۲) علامہ خطیب کہتے ہیں کہ ابن معین نے  
پہلے اس کی توثیق کی تھی لیکن بعد کو جب تحقیق کر لی تو اس کی انتہائی مذمت کی حتیٰ کہ اسے کذاب اور غیث  
کہا اور فرمایا خدا تعالیٰ اس کا ستیاناس کرے حدیث میں جھوٹ بولتا ہے۔ ام احمد بن حنبل اور علی بن المدینی پر  
ابتداءً اس کا معاملہ مشکل رہا لیکن بعد کو اس کا جھوٹ واضح ہو گیا اور انہوں نے اس کی روایت کو ترک کر دیا۔  
(بخاری جلد ۱ ص ۱۹۶ تا ۱۹۷ مطلقاً) یہ ہے ام یہ بھی کی اسناد جید بخلاف غیر الکلام یہ جواب دیتے ہیں کہ کثرت شواہد  
کی بنا پر مذکور حدیث کہا ہے (ص ۲۴۴) الجواب: اگر اصل روایت میں معمولی ضعف ہوتا تو کثرت شواہد کی بات درست  
تھی مگر یہاں تو کذاب، غیث اور افضی ہے اس کو سارا دینے کا کیا معنی ہے؟ یہ روایت جزاۃ القراءۃ ص ۱  
و کتاب القراءۃ ص ۱، دار قطنی جلد ۱ ص ۱۲۹، مستدرک احمد ج ۳ و جلد ۵ ص ۱۲۴ وغیرہ میں مذکور ہے اور ابی  
اسانید میں ابراہیم بن ابی الیثیم کہتے ہیں ان تمام میں عن ابی قلابۃ عن الاسبغیہ۔ اور تمام کی اسانید  
مخلاف غیر الکلام لکھتے ہیں کہ اس روایت کا مدر سفیان ثوری پر ہے ان سے بہت سے ثقات روایت کرتے ہیں اور  
شعبہ سفیان کے متابع ہیں اور پھر ام یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے (محصلاً ص ۲۴۴) الجواب: مفصل گذر چکا  
ہے کہ ام سفیان ثوری قراءۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے اگر یہ روایت ان کے نزدیک صحیح ہوتی تو اس کے خلاف کبھی ذکر کرتے  
ہاں حاشیہ ص ۱۲۳ پر



میں رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے، ابو قتادہؓ کہتے تھے مگر غضب کے  
 مدلس تھے علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں۔ مدلس عن من لحقہم وعن من لم یلحقہم (میزان ص ۳۶)  
 ابو قتادہؓ کی جن سے ملاقات ہوئی ہے ان سے بھی اور جن سے نہیں ہوئی ان سے بھی سب سے تالیس  
 کرتے ہیں اور مبارکپوری صاحب کے حوالہ سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ نہ تو مدلس کا عفتہ مقبول ہے  
 اور نہ اس کی کوئی روایت اتصال پر عمل کی جاسکتی ہے، مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ابو قتادہؓ پہلے طبقہ  
 کے مدلس ہیں اور محدثین نے ان کی تالیس کو برداشت کیا ہے (محصلا ص ۲۶۲) مگر مؤلف مذکور نے بالکل  
 غور نہیں کیا ابو قتادہؓ جب عن من لم یلحقہم سے بھی تالیس کرتے ہیں تو پھر کسی طبقہ میں بھی ہوں  
 کیونکہ وہ قابل برداشت ہوں گے؟ اس صریح عبارت کو بھی دیکھیں نہ اہل طبقہ ہی نہ دیکھیں امام نوویؒ  
 حضرت ام شعبہؓ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ زنا تالیس سے ہلکا گناہ ہے (الزنا اھون من التالیس  
 شرح مسلم ص ۱۶۳) اور مبارکپوری صاحب ام شعبہؓ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ تالیس حرام ہے اور مدلس  
 ساقط العتلت ہے (تحتہ الاحوزی ص ۱) ہاں مگر صحیحین میں مدلس ہوں یا قتادہؓ اعمشؓ اور ابو الزبیرؓ  
 محمد بن مسلمؓ وغیرہ کی تالیس ہو تو وہ قطعاً مفر نہیں ہے کما مر مفصلاً۔ علاوہ بریں رجل من اصحابہ  
 کے بارے میں خود امام بیہقیؒ وغیرہ کے نزدیک کلام ہے۔ امام بیہقیؒ رجل من اصحاب النبی صلی  
 اللہ علیہ وسلم کو مرسل کہتے ہیں (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۸۱) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: حمید بن ابی  
 نے جو یہ کہا ہے لقیت رجلاً معب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ  
 تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک صحابی سے ملا۔ اس نے صحابی کا نام نہیں بتایا اس لیے یہ روایت مرسل ہوگی۔  
 (جلد ۱ ص ۸۱) ایک حدیث اس مضمون کی آتی ہے کہ قبیلہ بنی عبد لاشمل کی ایک عورت کہتی ہے کہ  
 میں نے جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ مسئلہ دریافت کیا الا امام خطابیؒ لکھتے ہیں کہ یہ  
 عورت مجہول ہے (معادہ السنن جلد ۱ ص ۱۹۸) علامہ ابن حزمؒ رجل من اصحاب النبی  
 صلی اللہ علیہ وسلم پر کلام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مجہول ہے (محلّی ص ۳۱۶ و ص ۳۳۸)  
 (۱) کا بقیہ حاشیہ) اور جن دیگر ثقات کا حوالہ دیا ہے ان کی اسانید و کار ہیں جو اول سے آخر تک صحیح ہوں امام شعبہؓ  
 کے طریق سے جو روایت امام بیہقیؒ نے نقل کر کے اس کی تصحیح کی ہے اس میں وہی خرابی ہے کیونکہ حضرت انسؓ کے  
 طریق کو وہ خود غیر معتد کہتے ہیں ابو قتادہؓ کی روایت مرسل ہے اور مرسل کو وہ صحیح نہیں مانتے پھر وہ کیونکر صحیح ہے۔



اور اسی کے قریب مسک المختار جلد ۱۱ میں ہے، خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب تک صحابی کا نام نہ بتایا جائے گا روایت صحیح نہ ہوگی چنانچہ امام حاکم امام نووی، حافظ ابن حجر اور علامہ جزائری صحیح حدیث کی تعریف یوں کرتے ہیں (واللفظ لاتحد)

وصفة الحديث الصحيح ان يروى عن النبي صلى الله عليه وسلم صحابي زكوا عنه اسما له (معرفت علوم الحديث) صحیح حدیث کی تعریف یہ ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ایسا صحابی روایت کرے جس سے جمالت کا اسم دور ہو (یعنی مقبول نہ ہو)

علامہ عراقی اور محقق جزائری اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافق بھی ہوتے تھے اور مرتد بھی جب تک راوی صحابی کا نام نہ بیان کرے اور اس کا صحابی ہونا نہ معلوم ہو جائے تو اس کی روایت قابل قبول نہ ہوگی خواہ وہ راوی عن رجل من الصحابة کہے یا حدثنی من سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہے (التنقید والایضاح ص ۱۲۵) وتوجيه النظر ص ۱۶۶) امام سیوطی ایک وجہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بسا اوقات صحابی کو تابعی اور تابعی کو صحابی سمجھ لینے کی غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ امام محمد بن ربيع نے عبد الرحمن بن غنم کو صحابی سمجھ لیا ہے لیکن علی الاصح (صحیح ترین قول یہ ہے کہ) یہ صحابی نہ تھے (تدریب الراوی ص ۱۲۳) اس لیے نام کی ضرورت سمجھی گئی کہ اگر واقعی وہ صحابی ہیں تو الصحابة کلمہ عدول کے قاعدہ کے تحت داخل ہوں گے اور اگر وہ دوسری شق میں داخل ہیں تو اختلاط اور اشتباہ سے نجات مل جائے گی اور علامہ صیرفی نے اس کی بھی تصریح کی ہے کہ جب تابعی ایسے ہی رجل من الصحابة سے عنعنہ کرے تو وہ روایت کسی صورت میں قابل قبول نہ ہوگی (تدریب الراوی ص ۱۲۵ والایضاح ص ۵۸)

۱۔ اور جو حضرات اس صورت کو صحیح سمجھتے ہیں وہ شرط لگاتے ہیں چنانچہ مولف خیر الکلام نے بحوالہ تدریب الراوی ص ۱۲۵ لکھا ہے کہ اور جہاں صحابی کا نام مذکور نہ ہو تو وہاں صحیح مذہب یہی ہے کہ اگر مذکور کا پہلا حصہ صحیح ہو تو قند صحیح ہوتی ہے الخ ص ۲۵۸ مگر امام بیہقی جس مذہب کو جید کہتے ہیں اس کا حال آپ دیکھ چکے ہیں اور دوسری اسانید بھی کلام سے خالی نہیں ہیں۔



بہر کیفیت امام بیہقی وغیرہ کے قاعدہ کے رو سے فی نفسہ یہ روایت قابل نہیں ہے چہ جائیکہ اس کو لے کر تمام دنیا کو کھلا اور انعامی چیلنج کیا جائے فریق ثانی کو اس معنی کے لیے صحیح روایت تلاش کرنی چاہیے امام بیہقی لکھتے ہیں ہذا السناد صحیح لیکن ابوقلابہ کی تدلیس کے علاوہ بھی عن رجل من اصحاب الخ کی سند کو خود امام بیہقی مرسل کہتے ہیں اور پہلے امام بیہقی ہی کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ مرسل ضعیف ہوتی ہے پھر ان کے اہل اس کی سند کیسے صحیح ہوئی؟ مرسل کو حجت ماننے والے یہ چاہتے ہیں کہ امام بیہقی وغیرہ اپنے قائم کردہ اصول کی پابندی کریں یہ محض فائدہ ہے علاوہ بریں ان ان یقرأ احدکم کے الفاظ صرف اجازت کا پہلو ظاہر کرتے ہیں اور فریق ثانی کا دعویٰ اس سے بہت اونچا ہے وہ تو ترک قرأت سورہ فاتحہ کی بنا پر نماز کے ناقص، بیکار باطل بلکہ کالعدم ہونے کا قائل ہے اور خاص طور پر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا فلا تفعلوا ان یقرأ احدکم بفتحة الکتاب فی نفسه (جزاۃ ۱۵) تم امام کے پیچھے قرأت نہ کیا کرو الا یہ کہ جب تم میں کوئی تنہا اور اکیلا ہو تو سورہ فاتحہ پڑھا کرے فی نفسہ کا معنی اکیلا بھی ہو سکتا ہے جس کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے اور اگر انصاف سے کام لیا جائے تو سورہ فاتحہ کی قرأت کو منفرود سے مقید کرنا چاہیے اس لیے کہ جملہ روایات میں اس کا ذکر آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد یہ فرمایا تم نے میرے پیچھے قرأت کی ہے؟ جب جواب ملا کہ ہاں تو آپ نے فرمایا جی تو میں نے کہا کہ میرے ساتھ مخالفت، منازعت اور ہاتھ پائی ہوتی رہی ہے تم ایسا نہ کرو سوال یہ ہے کہ آپ نے مقتدیوں کو سورہ فاتحہ پڑھنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ فریق ثانی کے خیال کے مطابق حکم بھی دیا تو یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ جو چیز آپ کی تشریح اور منازعت کا سبب بنی اور آپ نے تحقیق حال کے لیے حضرات صحابہؓ سے دریافت بھی کیا اور ان کی اس حرکت کو ناپسند کرتے ہوئے ناراضگی کا اظہار بھی کیا اور پھر اسی چیز کا حکم بھی دے دیا؟ فریق ثانی ہی ازراہ انصاف فرمائے کہ بات کیا ہے؟ اور پہلی جگہ میں اس کی پوری صراحت گزر چکی ہے کہ موجب منازعت اور مخالفت نفس قرأت تھی جو سورہ فاتحہ وغیرہ سب کو شامل ہے اور یہ قرأت بھی آہستہ کی گئی تھی مگر باوجود اس کے آپ نے لے مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ فاتحہ رکن ہے اور ہر نمازی کو یاد ہوتی ہے باقی قرآن اصح مذہب پر نہ رکن نہ واجب (مصلح)

(۲۸) الجواب: سب کے نزدیک فاتحہ رکن نہیں بلکہ بعض کے نزدیک نفس قرأت رکن ہے اور سب نمازیوں (بقیہ حاشیہ ص ۱۲۹ پر)



اس کو پسند نہ کیا فریق ثانی کے نزدیک مطلب یہ ہوگا کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پتے پیچھے قرأت کو ناپسند بھی کیا اور پسند بھی کیا اس سے منع بھی کیا اور اس کا حکم بھی دیا قرأت سے مخالفت اور منازعت ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی ہوتی اس سے نہی بھی ہے اور استثنا بھی ہے حاشا وگلا رسول اور نبی کی شان اس سے بہت اونچی ہے کہ بیک وقت وہ دو متضاد حکم دیں۔ قصہ یہ ہے کہ آپؐ نمازیوں کو مطلقاً قرأت قرآن کرنے سے منع کیا ہے اور تنہائی اور حالت انفراد میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا ہے **اَلَا اِنْ يٰقُرْ اَحَدُكُمْ بِنَاحْتِ الْكِتَابِ فِي نَفْسِهِ** اور چونکہ دیگر صحیح روایات میں فصاعداً ماتیسر اور ما زاد کی زیادت بھی مروی ہے اس لیے منفرد کے لیے سورۃ فاتحہ کے علاوہ کچھ زیادہ بھی پڑھنے کا حکم ہے اور امام کو بین بین نہیں چھوڑا گیا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۸۵ میں کہا ہے بلکہ دیگر صحیح روایات میں امام کا فریضہ قرأت بتایا ہے اذ قرأ الحدیث اور قرأت الامام الحدیث۔ یہی وہ مطلب اور معنی ہے جس سے فتنائے خداوندی اور مولد رسول سمجھ آ سکتی ہے اور قرآن کریم صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرام اور جہور سلف و خلف کی مخالفت بھی لازم نہیں آتی اور یہی صحیح ہے **ولیس وراء عباد ان قریۃ**۔

ترے مذول پر سارے کھل گئے اسرار دین ساقی

ہو اعلم الیقین، عین الیقین، حق الیقین ساقی

پانچویں روایت: مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرات صحابہؓ کو ایک نماز پڑھانی جب نماز سے فارغ ہوئے اور مقتدیوں کی طرف اپنا رخ مبارک پھیرا تو ارشاد فرمایا:۔

**اَلْقُرْآنُ فِی صَلَاتِکُمْ وَالْاِمَامُ یَقْرَأُ فَکُنُو** کیا تم امام کے پیچھے قرأت کرتے ہو؟ حضرات صحابہؓ خاموش  
**فَقَالَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَقَالَ قَائِلٌ اَوْ قَائِلُونَ** ہو گئے آپؐ نے تین مرتبہ یہی سوال کیا ایک نے یا کئی آدمیوں نے

بقیہ حاشیہ ۱۲۵ کا

کو سورۃ اخلاص وغیرہ کوئی اور سورت بھی اکثر یاد ہوتی ہے اور ما زاد علی الفاتحہ کے وجوب کے دلائل بھی گزچکے ہیں اس لیے فاتحہ کی تخصیص کی یہ وجہ قابل قبول نہیں ہے، منازعت اور قرأت کی فرضی تقسیم اور پھر فاتحہ کو ممانعت سے مستثنیٰ کرنا جیسا کہ مؤلف مذکور نے کیا ہے محض طفلانہ ہے۔



انا لنفعل قال فلا تفعلوا وليقوا احدكم  
بفاتحة الكتاب في نفسه (جزء القراءة ص ۵)  
کتاب القراءة ص ۴ سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۶  
دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۹ وغیرہ)

مبارکپوری صاحبؒ کہتے ہیں کہ علامہ بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں روایت  
ثقات (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۸) اس لیے یہ روایت بالکل صحیح ہے (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۰ وغیرہ)  
جواب :- اگر محض بلا دلیل کہنے سے روایت صحیح ہو سکتی ہے تو یہ صحیح ہوگی ورنہ اس کی صحت  
پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور یہ روایت بھی ضعیف ہے، اولاً اس میں ابو قتلابہؒ غضب کا مدلس ہے  
اور عنعنہ سے روایت کرتا ہے اور مدلس کا عنعنہ مقبول نہیں ہوتا۔ وثانیاً اس کی سند  
میں اضطراب ہے بعض طرق میں عن ابی قلابہ عن النبیؐ (جزء القراءة ص ۵)، کتاب  
القراءة ص ۴۸ دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۹) اور بعض طرق میں عن ابی قلابہ عن النبی صلی اللہ علیہ  
وسلم ہے (جزء القراءة ص ۵۴، کتاب القراءة ص ۱۲۹) و بیہقی جلد ۲ صفحہ ۱۶۶) اور بعض طرق میں  
عن ابی قلابہ عن محمد بن ابی عائشہ عن رجل من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم ہے (دارقطنی ص ۱۲۹، بیہقی جلد ۲ ص ۱۶۶ تلخیص الجبیر ص ۸۴) اور بعض طرق میں عن ابی  
ہریرہؓ ہے (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۹) اور پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حدیث مضطرب فریق ثانی کے  
نزدیک بھی ضعیف ہوتی ہے اور اس میں شدید اختلاف ہے پھر یہ کیسے قابل استدلال ہو سکتی ہے؟  
وثالثاً اس کے متن میں بھی اضطراب ہے بعض طرق میں یہ روایت فلا تفعلوا پر ختم ہو جاتی ہے  
اور اس میں جملہ استثنائے موجود نہیں ہے۔ (کتاب القراءة ص ۲۹ والمجملہ النقی جلد ۲ ص ۱۶۷) اور بعض طرق  
میں یہ جملہ استثنائے بھی موجود ہے (کتاب القراءة ص ۱۲۲) اور بیہقی جلد ۲ ص ۱۶۶ و طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۸ وغیرہ)  
اور ایک روایت میں صرف لیقرأ بفاتحة الكتاب کا ذکر ہے (جزء القراءة ص ۵) امام بیہقیؒ نے  
یوسف بن عدیؒ پر یہ الزام لگایا ہے کہ یہ جملہ نہ ذکر کرنے کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے لیکن  
وہ تو ثقہ تھے، ابو زرہؓ ان کو ثقہ کہتے ہیں مسلمہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے  
ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۱۸) اس لیے یہ الزام کسی اور راوی پر ہونا چاہیے کیوں نہ ہو کہ یہ الزام



عبد اللہ بن عمر و الرقی پر عامہ کر دیا جائے علامہ ابن سعد کہتے ہیں کہ وہ صاحب خطا تھے (تہذیب  
جلد ۲ ص ۲۲) حافظ ابن حجر ان کو صاحب دہم کہتے ہیں (تقریب ص ۲۵۳) اور امام بیہقی اسی روایت  
میں ان کا دہم بیان کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ حضرت انسؓ کی طرف اس روایت کی نسبت محفوظ نہیں  
ہے۔ اور اس میں عبد اللہ کا دہم ہے (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۲۹) مؤلف غیر الکلام کا یہ کہنا کہ مگر کتاب  
القرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے رجوع کر چکے ہیں (ص ۲۵۵) محض بلا دلیل دعویٰ اور سینہ  
زوری ہے صاحب تعلیق المعنی جلد ۱ ص ۱۲ میں اس کو نقل کرتے ہیں اور امام ابو حاتم کہتے ہیں کہ یہ  
طریق محفوظ نہیں ہے بلکہ یہ (وہم) دہم ہے (کتاب العلل جلد ۱ ص ۱۵۵) مبارکپوری صاحب  
بحوالہ حافظ ابن حجر ابن حبان سے یہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت انسؓ اور محمد بن ابی عائشہ دونوں کے طریق  
محفوظ ہیں لیکن یہ مبارکپوری صاحب کی کھلی غلطی ہے۔ حافظ ابن حجر نے تو یہ لکھا ہے و زعم ابن  
حبان ان الطریقین محفوظان الخ (تلخیص الجبر ص ۵) ابن حبان کا یہ زعم ہے کہ یہ دونوں طریق  
محفوظ ہیں۔ حافظ ابن حجر نے درحقیقت لفظ زعم بول کر ابن حبان کی تردید کر دی ہے، اور امام  
بیہقی نے بھی اس کی تردید کی ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ وقد قيل عن ابی قلابہ عن انس بن  
مالک و لیس بہ محفوظ انتہی (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۶) اور خود مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ  
امام بیہقی نے اگرچہ انسؓ کے طریق کو ایک جگہ غیر محفوظ قرار دیا ہے مگر کتاب القرآت سے معلوم ہوتا  
ہے کہ ان کے ہاں یہ طریق بھی محفوظ ہے الخ (ص ۲۵۳) مگر کتاب القرآن سے ان کا یہ بیہ بنیاد دعویٰ  
ہرگز ثابت نہیں ہوتا لفظ زعم اگرچہ حق و باطل دونوں کے لیے آتا ہے مگر یہاں اس کے باطل  
ہونے کا قرینہ موجود ہے لیس بہ محفوظ وغیرہ و لعل فی نفسہ کا محض پہلے بیان ہو چکا ہے  
اس روایت کو صحیح تسلیم کر کے وہ مطلب بھی ملو ہو سکتی ہے وخامساً جلد اول میں ابنہ صحیح حضرت  
انسؓ سے مرفوع روایت عرض کی جا چکی ہے کہ واذا قرأ فانصتوا جب امام قرآن کرے تو تم (تمام)  
مقتدی اس کے پیچھے خاموش رہو۔ رہا علامہ بیہقی کا رواۃ ثقات کہنا تو اپنے موقع پر صحیح ہے  
عبد اللہ بن عمرؓ ثقہ ہے مگر صاحب خطا اور دہم ہے اور ابو قلابہ ثقہ ہے مگر غضب کا  
مدرس ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا خود مبارکپوری صاحب جواب دے گئے ہیں چنانچہ انہیں  
کا خود نوشت جواب ملاحظہ ہو ایک مقام پر لکھتے ہیں واما قول الہیثمی رجالہ ثقات الخ فلا دلیل



علیٰ صحتہ الحدیث را البکار المنہن ص ۲۴۲) علامہ بیہقی کا یہ فرمانا کہ اس سند کے جملہ راوی ثقہ ہیں۔ اس سے حدیث کی صحت ثابت نہیں ہو سکتی یہ روایت بھی جمہور امت کی نمازوں کو ناقص، بیکار، باطل اور کالعدم قرار دینے کی اہمیت نہیں رکھتی۔

چھٹی روایت :- اہم بیہقی اپنی سند سے حضرت ابو قتادہؓ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال  
ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میرے  
القرآن خلقی قالوا نعم قال فلا تفعلوا  
یہیچے قرأت کرتے ہو حضرت صحابہؓ نے کہا جی ہاں فرمایا  
الابفاۃ الکتاب (سنن الکبریٰ ص ۳۶)  
سورہ فاتحہ کے بغیر اور کچھ بھی نہ پڑھا کرو

جواب :- یہ روایت بھی احتجاج کے قابل نہیں ہے اڑلا اس لیے کہ سند میں مالک بن یحییٰؒ

ہے ابن حبانؒ ان میں کلام کرتے ہیں اہم بخاریؒ فرماتے ہیں کہ اس کی حدیث میں نظر اور کلام ہے عقیلیؒ

اور ابن حبانؒ اس کو ضعیفیں لکھتے ہیں اور اس کو منکر الحدیث کہتے ہیں نیز ثانی الذکر کہتے ہیں کہ اس سے

احتجاج جائز نہیں ہے کیونکہ یہ ثقات سے ایسی روایتیں بیان کرتا ہے جن کی کوئی بھی اصلیت

نہیں ہوتی ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ اس کی حدیثیں محفوظ نہیں ہیں (لسان المیزان جلد ۵ ص ۶) علامہ ابن

خلدونؒ لکھتے ہیں کہ اہم بخاریؒ کی اصطلاح ہے کہ جب وہ کسی راوی کے بارے میں فیہ نظر کہتے

ہیں تو وہ انتہائی درجہ کا کمزور اور ضعیف ہوتا ہے (مقدمہ ص ۳۱۸) وثانیاً سلیمان تیمیؒ حدیث کے

لفظ سے روایت کرتے ہیں اور کتاب القراءۃ ص ۱۵۱ میں بھی حدیث سے یہ روایت ہے نہ معلوم

یہ بیان کرنے والا کون اور کیا تھا؟ عادل تھا یا فاسق؟ ثقہ تھا یا ضعیف؟ اہم حاکمؒ منہ حدیث کی شرط

لکھتے ہیں۔ ان لا یكون فی اسنادہ اُخبرت عن فلان ولا حدیثت عن فلان (معرفت علوم

الحدیث ص ۱۹) کہ اس میں اُخبرت اور حدیثت عن فلان (کہ مجھ کو خبر دی گئی اور مجھ سے بیان کیا

گیا، نہ ہو۔ وثالثاً خود اہم بیہقیؒ اس کو مرسل کہتے ہیں (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۶) اور حدیث مرسل ان کے

نزدیک ضعیف ہوتی ہے کما مہم بیہقیؒ نے اس کی کڑی یوں جوڑنے کی کوشش کی ہے عن یحییٰ بن

ابی کثیر عن عبد اللہ بن ابی قتادہؓ الخ والیضؒ لیکن ایک تو حسب تصریح علامہ عقیلیؒ اور ابن حبانؒ

وغیرہ یحییٰؒ مرسل تھے (دیکھئے تہذیب جلد ۱ ص ۲۶۹) اور یہاں عن غندر سے روایت کرتے ہیں اور دوسرے

اس روایت کا دار و مدار بھی مالک بن یحییٰؒ پر ہے۔

ساتویں روایت :- امام بیہقی نے کتاب القراءۃ ص ۵۵ میں ایک باب قائم کیا ہے اور یہ فرماتے ہیں کہ مقتدیوں کو ممانعت نفس قرأت سے نہیں بلکہ ان کو جہر سے ممانعت ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن خدا فہ نے نماز پڑھی اور اس میں جہر سے قرأت کی ۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا یا ابن خدا فہ لا تمعنی واسمع اللہ اے ابن خدا فہ مجھے نہ سناؤ بلکہ خدا تعالیٰ کو سناؤ ۔

جواب :- اس روایت سے بھی استدلال باطل ہے اولاً اس لیے کہ سند میں نعمان بن راشد ہے امام بخاری فرماتے ہیں کہ ان کی حدیث میں بکثرت وہم ہوتا ہے امام احمد ان کو مضطرب الحدیث کہتے ہیں اور نیز کہتے ہیں کہ یہ صاحب مناکیر بھی ہیں ، امام ابن معین ، ابو داؤد ، نسائی ، اور یحییٰ بن سعید تمام ان کی تضعیف کرتے ہیں (میزان جلد ۲ ص ۲۳۹) و ثانیاً اس میں زہری عنہ سے روایت کرتے ہیں اور مبارکپوری صاحب کہتے ہیں کہ ان کی معضن حدیث صحیح نہیں ہے و ثالثاً روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ ابن خدا فہ آپ کے پیچھے بحالت اقتدار نماز پڑھتے ہوئے جہر کر رہے تھے ہو سکتا ہے کہ سنن و نوافل وغیرہ کی نماز میں انفرادی حالت میں انہوں نے ایسا کیا ہو اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو قریب ہوں گے ان کی ایصال فرمائی ہو بلکہ یہی قرین قیاس ہے ۔ قارئین کرام نمبر شماری کے لحاظ سے گورق ثانی کی طرف سے سات روایتیں پیش کی گئی ہیں لیکن جو روایتیں ان کی طرف سے پیش کی گئی ہیں اور پھر ان کے جوابات دیے گئے ہیں ۔ غالباً چالیس سے کم نہ ہوں گی اور آپ جلد اول میں پیش کردہ احادیث میں روات کا اور جلد ثانی میں پیش کردہ روایتوں میں راویوں کا توازن خوب ملاحظہ کر چکے ہیں اور یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عبادہ بن الصامت کی بخاری و مسلم وغیرہ کی اس روایت کے علاوہ جو نمبر اول پر پیش کی گئی ہے اور جس میں فصاعداً ، ماتیسر اور ما زاد کی زیادت بھی موجود ہے اور کوئی روایت صحیح نہیں ہے خصوصاً بقید خلف الامام اور جملہ استثنائیہ کی روایت پر سیر حاصل بحث آپ ملاحظہ کر چکے ہیں عیاں راہہ بیاں اور شنیدہ کے بود مانند دیدہ ماب ہم دوسرے باب کو ختم کر کے تیسرے باب شروع کرتے ہیں ۔



## تیسرا باب

### آثار حضرات صحابہ و تابعین وغیرہم

مرفوع روایات کا جن کو فریق ثانی نے مقتدی کے لیے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے وجوب کے لیے اور امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے والوں کی نماز کے ناقص، بیکار، کالعدم اور باطل ہونے کے لیے پیش کیا تھا، روایتی اور درایتی حال تو آپ اچھی طرح معلوم کر چکے ہیں کہ بغیر محدودے چند مرفوع روایات کے (جن میں خلف الامام کا لفظ موجود نہیں ہے اور ان میں قصاعداً، ماتیسر اور ما زاد، کی زیادت یا لا و زاد الامام کی قید مذکور ہے) اور کوئی روایت صحیح نہیں ہے خصوصاً وہ روایات جن میں خلف الامام کی زیادت اور الایام القرآن کی استثناء موجود ہے وہ تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہیں۔ ان مرفوع روایات پر کلام کرنے کے بعد مزید حاجت تو باقی نہیں رہتی کہ ہم آثار حضرات صحابہؓ و تابعینؓ وغیرہم کو نقل کر کے ان کے جوابات عرض کریں خاص کر کے جب کہ فریق ثانی کے نزدیک قاعدہ یہ ہے کہ درموقوفات صحابہؓ حجت نیست اگرچہ بصحت رسد اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اور تابعینؓ کے اقوال بلکہ صحابہؓ کے اقوال اختلافی امور میں حجت نہیں ہوتے خصوصاً جب کہ ایک طرف صحیح حدیث موجود ہو الخ (ص ۳۴) مگر صرف تکمیل کتاب اور افادۃ طلبہ کے لیے آثار حضرات صحابہؓ کرشم اور تابعینؓ وغیرہم پر کلام نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ اس مسئلہ کا کوئی پہلو اور گوشہ عامۃ المسلمین کی نگاہ سے بھی اوجھل نہ رہے۔

حضرت عمرؓ کا اثر :- پزیرد شریکؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ بن الخطابؓ سے سوال کیا۔

اقتل خلف الامام قال نعم قال وان قرأت یا امیر المؤمنین قال وان قرأت (جزءاً) القرآۃ ص ۱۳۱

طحاوی جلد ۱۲۹ کتاب القراءة ص ۱۲۹ کیا میں اہم کے پیچھے قرأت کر سکتا ہوں؟ فرمایا ہاں سائل نے پوچھا اگرچہ آپ پڑھ رہے ہوں اے امیر المؤمنین؟ فرمایا ہاں اگرچہ میں پڑھتا ہوں اور مستند ص ۲۳۹ دارقطنی ص ۱۲۹ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶ وغیرہ میں یہ بھی مذکور ہے تم سورۃ فاتحہ پڑھ لیا کرو سائل نے دریافت کیا اگرچہ آپ جہر سے قرأت کر رہے ہوں؟ فرمایا ہاں اگرچہ میں جہر سے قرأت کیا کروں۔

جواب: فریق ثانی کا اس روایت سے وجوب فاتحہ پر استدلال صحیح نہیں ہے اس لیے کہ ہم نے جلد اول میں حضرت عمرؓ کا اثر ترک قرأت کا نقل کیا ہے اگر یہ اثر صحیح ہو جیسا کہ بعض ائمہ نے اس کو صحیح کہا ہے تو اس کا جواب وہی بہتر ہے جو مولف خیر الکلام نے ص ۲۹۳ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کتاب ازالۃ الخفاء جلد ۲ ص ۲۹۳ سے نقل کیا ہے اور پھر مولف مذکور نے یہ لکھا ہے کہ یعنی قرأت فی نفسہ منع نہیں صرف منازعت منع ہے جو شخص فاتحہ بدون منازعت پڑھ سکتا ہو پڑھے جس میں اتنی طاقت نہیں وہ نہ پڑھے اس تطبیق کی اس وقت ضرورت ہوتی جب حضرت عمرؓ سے منع کی روایت صحیح ہوتی مگر وہ روایت صحیح نہیں الخ آگے لکھا ہے کہ وہ مرسل ہے اور محقق مذہب محدثین کا یہ ہے کہ مرسل حجت نہیں (محصلا ص ۲۹۳) مگر ہم باحوالہ محدثین کا مذہب نقل کر آئے ہیں کہ مرسل صحیح ہوتی ہے لہذا تطبیق کی ضرورت پیش آئے گی اور یہ بہتر تطبیق ہے لیکن اس اثر سے فریق ثانی کو چنداں فائدہ نہ ہو گا کیونکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ جو شخص اہم کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے کالعدم ہے بیکار ہے اور باطل ہے اور اس اثر سے صرف اجازت اور اختیار ثابت ہوتا ہے حضرت عمرؓ سے اسی مضمون کا ایک اثر کتاب القراءة ص ۵۹ میں موجود ہے لیکن سند میں محمد بن حسن ابو جبر بہارؒ ہے ام دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ ان کا ایک بیاض صحیح اور دوسرا بالکل رومی تھا، انہوں نے دونوں کو خلط ملط کر دیا تھا حتیٰ کہ صحیح اور ضعیف کی کوئی تمیز باقی نہ رہی تھی، علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ معروف و مشہور و معروف ضعیف ہے، علامہ برقانیؒ اور ابن سرہنیؒ کہتے ہیں کہ وہ کذاب تھا (بغدادی جلد ۲ ص ۲۱، کتاب الانساب ص ۲۵۵ و لسان جلد ۵ ص ۱۳) کتاب القراءة ص ۱۶ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶ وغیرہ میں حضرت عمرؓ کا اس مضمون سے ایک اثر آتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کوئی نماز صحیح نہیں ہے مگر یہ کہ اس میں سورۃ فاتحہ اور کچھ اور بھی پڑھا جائے سائل نے کہا اگرچہ میں اہم کے پیچھے کھڑا



ہوا کروں فرمایا ہاں اقرا فی نفس مگر اسکی سند میں عبا یہ ہے حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ غالی شیعہ تھا۔ ابو بکر بن عیاشؒ کا بیان ہے کہ میں نے ام اعمشؒ سے پوچھا آپ عبا یہ سے کیوں روایت کرتے ہیں؟ فرمایا خدا کی قسم میں تو اس کی روایت کو علی وجہ الاستہزاء نقل کرتا ہوں میں نے اس کو کب حجب سمجھا ہے عقلی اس کو منعفا میں لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ غالی اور ملحد تھا (لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۴۷) اور ابوا اگر حضرت عمرؓ کے یہ آثار صحیح بھی تسلیم کر لیے جائیں تو پھر بھی یہ فریق ثانی کے سرسرخ خلاف پڑتے ہیں۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کے ان آثار میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ قرآن کریم کے کسی اور حصہ کا بھی ذکر موجود ہے چنانچہ ایک روایت میں یوں ہے فاتحۃ الكتاب وشيئاً (كتاب القراءة ص ۱) ایک روایت میں ہے بفاتحة الكتاب ومعها (كتاب القراءة ص ۱) وسنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶) اور ایک روایت میں ہے بفاتحة الكتاب وشيئاً معها (كتاب

القراءة) اور ایک روایت میں ہے بفاتحة الكتاب ومعها شيئاً (جامع المسانيد جلد ۳ ص ۳۷۷) اگر فریق ثانی حضرت عمرؓ کے اس اثر کو صحیح سمجھتا ہے تو معہا شيئاً کی زیادت کو کیوں مضمّن کر جاتا ہے؟ مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اس زیادت کو بیان کرنے والا عبا یہ ہے پھر یہ کس طرح صحیح ہو سکتی ہے؟ (محصلہ ص ۲۹۸) الجواب: جامع المسانيد کی سند میں عبا یہ نہیں ہے اسی طرح مؤلف مذکور کا اس روایت کو سری نمازوں پر محمول کرنا بے دلیل ہے اور معہا سے اذکار اور لینا بھی خلاف اصل ہے کیونکہ جب بات قرأت قرآن ہو رہی ہے تو بلا قوی قرینہ کے کیوں اصل کو چھوڑ جائے بلا شک فرض اور مستحب ایک امر میں جمع ہو سکتے ہیں مگر حضرت عمرؓ مازاد کو واجب سمجھتے ہیں کما مر۔ بہر حال ان کی طرف سے جو محقول جواب و معہا کی زیادت کا دیا جائے گا وہی جواب ہماری طرف سے قرأت فاتحہ کا سمجھ لیں اور فتح الباری کے حوالہ سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت عمرؓ مازاد علی الفاتحہ کے وجوب کے قائل تھے۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ مازاد کو حضرت عمرؓ فرض نہیں سمجھتے ہوں گے اھ (ص ۲۹۲) مردود ہے کیونکہ باحوالہ عرض کیا گیا ہے کہ وہ مازاد کو واجب سمجھتے ہیں، اخلاف کے نزدیک ثبوت اور دلالت کے لحاظ سے فرض اور واجب میں فرق ہے لیکن دو سر حضرت ان میں فرق ملحوظ نہیں رکھتے یا محض برائے نام فرق سمجھتے ہیں۔ چنانچہ خود مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ کیونکہ شریعت میں واجب اور فرض میں

کوئی فرق نہیں الخ (ص ۱۳۲) یا تو فرق ثانی حضرت عمرؓ کے اثر کے پیش نظر مازاد علی الفاتحة کے وجوب کا بھی قائل ہو جائے اور یا یہ تحقیق قبول کرے کہ حضرت عمرؓ کا یہ اثر منفرد کے حق میں ہے جس پر سورۃ فاتحہ کے علاوہ مازاد بھی واجب ہے اور چونکہ حضرت عمرؓ اہم کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے حتیٰ کہ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ کاش جو شخص اہم کے پیچھے قرأت کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر ڈال جائے جیسا کہ پہلی جلد میں گزر چکا ہے تو اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ بعض راویوں کی غلطی ہے اور یہ اثر منفرد کے حق میں ہے نہ کہ مقتدیوں کے حق میں۔

حضرت علیؓ کا اثر بہ سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۸۔ مستدرک جلد ۱ ص ۲۳۹، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۲، طحاوی جلد ۱ ص ۱۳۳، کتاب القراءة ص ۱۲۲ اور جن القراءة ص ۱۳۳ وغیرہ میں روایت ہے (واللفظ للآخر)

عن علی بن ابی طالب انه کان یأمر  
ویجب ان یقرأ خلف الامام فی الظهر  
والعصر بفاتحة الكتاب وسورة  
وفي الاخيرین بفاتحة الكتاب۔  
حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ وہ اس بات کو پسند کرتے  
اور اس کا حکم دیا کرتے تھے کہ اہم کے پیچھے ظہر اور عصر کی پہلی رکعتوں  
میں سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی اور سورت بھی پڑھ لی  
دونوں رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھی جائے۔

مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اہم دارقطنی، اہم بیہقی، اور علامہ ذہبی اس اثر کو صحیح کہتے ہیں (مجلد ۲ ص ۲۹۸)  
جواب :- یہ روایت بھی قابل استدلال اور فرق ثانی کو مفید نہیں ہو سکتی اولاً اس لیے کہ سند میں سفیان  
بن حسین ہے امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ زہریؒ کی روایت میں وہ نہایت ضعیف اور کمزور ہے ایچ بی القطن  
اور ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ زہریؒ کی روایت میں یہ ثقہ نہ تھے ابن سعدؒ کہتے ہیں کہ اس کی حدیث میں بکثرت  
خطا ہوتی ہے یہی بات ان سے متعلق یعقوب بن شیبہؒ نے بھی کہی ہے۔ ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ اس سے  
احتجاج صحیح نہیں ہے۔ اہم نسائیؒ کہتے ہیں کہ زہریؒ کی روایت میں ضعیف ہے، ابن حبانؒ کہتے  
ہیں کہ اہم زہریؒ سے الٹ پلٹ روایتیں بیان کرتے ہیں ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ زہریؒ کی حدیث میں  
قابل احتجاج نہیں ہے (میزان جلد ۱ ص ۲۹۸) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ زہریؒ کی روایت میں ضعیف  
ہے (تقریب ص ۱۸۱) قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ زہریؒ کی روایت میں یہ ضعیف ہے (نیل الاوطار ص ۱۹)  
شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ زہریؒ کی روایت میں یہ ضعیف ہے



اس کی جو روایت زہری کے طریق سے ہوگی وہ محض بیچ ہے (فتاویٰ جلد ۱۵ ص ۴۱۵) اور یہ روایت بھی زہری ہی کے طریق سے ہے اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ زہری میں اس کے ضعف کی یہ وجہ ہے کہ زہری کا صحیفہ اس پر خطا ملط ہو گیا تھا (ص ۲۹۹) کچھ بھی ہو اس کا ضعف ان کو مسلم ہے مبارکپوری صاحب نے یہ کہا ہے کہ اس روایت کو امام شعبہ نے روایت کیا ہے اور محدثین نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ شعبہ ثقہ مشائخ سے ہی روایت کرتے ہیں لہذا یہ روایت بھی صحیح ہوگی لیکن یہ ان کا دہم ہے اور آخر میں خود مبارکپوری صاحب کو اس کا احساس بھی ہو گیا تھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ امام بیہقی امام شعبہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب میں تم سے اعمش ابو اسحاق اور قتادہ کے طریق سے روایت بیان کروں تو اگرچہ وہ عنعنہ سے ہو تب بھی اس کو سماع پر عمل کرنا حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہ عمدہ قاعدہ ہے کہ جب امام شعبہ کی روایت ان تینوں سے مروی ہو تو تدلیس مضر نہ ہوگی اگرچہ وہ روایت معنعن ہی کیوں نہ ہو (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۱) معلوم ہوا کہ امام شعبہ کا یہ ارشاد ان تینوں کی تدلیس سے متعلق ہے نہ کہ جملہ روایت کی توثیق سے متعلق امام دارقطنی نے معمر کے طریق سے بھی روایت نقل کی ہے اور اس کو صحیح کہا ہے اور مؤلف خیر الکلام نے اس کو متابع کہا ہے مگر اس میں بھی مدار زہری پر ہے اور وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں افریق ثانی کے نزدیک یہ قاعدہ مسلم ہے چنانچہ مبارکپوری صاحب ان کی معنعن حدیث کو اس لیے رد کرتے ہیں کہ وہ مدلس تھے اور یہاں بھی وہ عنعنہ سے روایت کیے تھے و ثانیاً اگر یہ اثر صحیح ہے تو اس سے صرف ظہر اور عصر کی نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کا ثبوت ہوگا اور یہ دونوں سری نمازیں ہیں حالانکہ فریق ثانی تمام نمازوں میں اس کا مدعی ہے و ثانیاً اس اثر میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا بھی حکم موجود ہے مگر فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے۔ مبارکپوری صاحب نے سفیان بن حسین کا ایک متابع اسحاق بن راشد (جس کی روایت جزء القراءۃ ص ۲ وغیرہ میں ہے) بیان کیا ہے (ابکار المنن ص ۱۴۲) لیکن محدث ابن خزیمرہ فرماتے ہیں کہ اسحاق بن راشد سے احتجاج درست نہیں ہے (میزان جلد ۱ ص ۸۹) امام نسائی اس کو ضعیف کہتے ہیں (تہذیب جلد ۱ ص ۲۳) ابن معین کہتے ہیں کہ زہری کی روایت میں یہ ضعیف ہے (ایضاً) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ زہری سے جو جو یہ روایت کرتا ہے اس میں وہم ہوتا ہے (تقریب ص ۲) اور یہ روایت بھی زہری ہی سے ہے مبارکپوری صاحب نے امام معمر کو بھی ان کا متابع بیان ہے ان کی روایت دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲ میں

ہے اور دارقطنی اس کی تصحیح کرتے ہیں، لیکن اس میں بھی زہری عن غندہ سے روایت کرتے ہیں اور مدارائیں پر ہے اور مبارکپوری صاحب کے حوالہ سے گذر چکا ہے کہ وہ ان کی معنعن حدیث کو صحیح اور حسن سمجھنے پر آمادہ نہیں ہیں سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۸ میں بھی یہ روایت ہے اور اس میں بھی یہ روایت معنعن ہے علاوہ ازیں اس روایت میں بھی ظہر اور عصر کی نماز کا ذکر ہے اور سورۃ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا بھی ذکر ہے حالانکہ فریق ثانی فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا قائل نہیں ہے اس لیے اس اثر سے صرف سورۃ فاتحہ کی اجازت پر اور خصوصاً جملہ نمازوں میں اس کے ضروری ہونے پر استدلال ہرگز صحیح نہیں ہے۔ حضرت علیؓ کا ایک اثر کتاب القراءۃ ص ۶۱ اور سنن الکبریٰ ص ۱۶۸ وغیرہ میں بھی (ان سے یہ اثر حکمؓ اور حمادؓ کے طریق سے) مروی ہے لیکن خود امام بیہقیؒ اس کو مرسل کہتے ہیں (ص ۱۶۸) امام حادؓ بھی اس کو منقطع کہتے ہیں (احکام القرآن جلد ۲ ص ۵۳) اور فریق ثانی مرسل کو ضعیف سمجھتا ہے اور یہ تو لغوی مرسل (یعنی منقطع) ہے ان کا ایک اثر کتاب القراءۃ ص ۵۸ اور ص ۶۲ میں بھی مذکور ہے لیکن ایک سند میں محمد بن خیرہ بن عبد الرحمنؒ مجہول ہے۔ دوسرا راوی اس سند کا حسین بن محمد مروزیؒ ہے حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ مجہول ہے (تقریب ص ۹۴) تیسرا راوی اس سند کا معتزل بن عبید اللہؒ ہے حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ وہ صدوق یحیٰی تھا (تقریب ص ۲۵۹) اور دوسری سند میں ابو علی بن ابراہیمؒ اور احمد بن محمدؒ وغیرہ راوی ہیں کتب رجال سے ان کا پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کیسے تھے؟ مبارکپوری صاحب نے کتاب القراءۃ ص ۱۳۲ کے حوالہ سے حضرت علیؓ کا یہ فتویٰ بھی نقل کیا ہے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنی چاہیے اور یہ بھی نقل کیا ہے کہ وہذا الاسناد من اصح الاسانید فی الدنیاء تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶) یہ دنیا کی تمام سندوں سے صحیح ہے۔ الجواب :- اگرچہ اس کے اور بھی سند اور معنی کے لحاظ سے کئی جوابات دیے جاسکتے ہیں مگر ہم صرف وہی جواب عرض کرتے ہیں جو خود مبارکپوری صاحب کے قلم سے نکلا ہے۔ اس روایت میں زہریؒ عن غندہ سے روایت کرتے ہیں اور مبارکپوری صاحب نے ایک مقام پر لکھتے ہیں۔ فی اسنادہ الزہری وهو مدلس ورواہ عن سالمہ بالعتعنة فکیف یکون اسنادہ صحیحاً؟ البکار المن ص ۵۸) اس کی سند میں زہریؒ ہیں جو مدلس تھے اور سالمہ سے عن غندہ کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔ تو اس کی اسناد کیسے صحیح ہو سکتی ہیں؟ اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔ فی سندہ الزہری وروی



عن طلحة بن عبد الله باللعنة فكيف يكون اسنادہ صحیحاً (ص ۳۵) اس کی سند میں زہریؒ ہیں جو مدلس تھے اور وہ طلحہؒ سے عنعنہ کے ساتھ روایت کرتے ہیں پھر کنونکر اس کی سند صحیح ہو سکتی ہے؟ مبارکپوری صاحبؒ ہی ازراہ کرم و انصاف فرمائیں کہ جب زہریؒ کی منعن روایت صحیح تک نہیں ہو سکتی تو وہ اصح الاسانید کیسے ہوگی؟ اور پھر تمام روئے زمین کی اسانید سے وہ اصح کیسے ہوگی؟ الغرض دیگر حضرات محدثین کرامؒ کے اصول کے تحت بھی اور خود فریق ثانی کے نزدیک بھی حضرت علیؑ کے پیش کردہ جملہ آثار ضعیف کمزور اور محلول ہیں اور مزید برآں ان میں جہر نمازوں کا ذکر تک نہیں اور دوسری نمازوں میں بھی سورۃ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا بھی ساتھ ذکر ہے۔ مگر فریق ثانی اس کی مطلقاً پروا نہیں کرتا۔

حضرت ابی بن کعب کا اثر :-

ان سے یہ روایت لی گئی ہے إِنَّهُ كَانَ يَقْرَأُ خَلْفَ الْإِمَامِ رَجُلًا الْقُرْآنَ وَكِتَابُ الْقُرْآنِ (ص ۱۶) کہ وہ امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے۔

جواب :- اس کی سند میں زیاد بکائی ہے امام نسائیؒ لکھتے ہیں کہ وہ قوی نہ تھا (ضعفاء) ابوحاتمؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے۔ ابن مدینیؒ اور ابن سعدؒ وغیرہ اس کی تضعیف کرتے ہیں (میزان جلد ۱ ص ۱۳۵) ابن معینؒ کہتے ہیں کہ حدیث میں یہ قابل اعتبار نہیں صالح کا بیان ہے کہ وہ فی نفسه ضعیف ہے، ابن حبانؒ اس کو فاحش الغلط اور کثیر الوهم کہتے ہیں اور کہتے ہیں جب یہ متفرد ہو تو اس سے احتجاج درست نہیں ہے (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۷۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ یہ کمزور ہے (تقریب ص ۱۳) کتاب القراءۃ ص ۶۲ دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۸ وغیرہ میں ایک دوسری سند سے یہ روایت منقول ہے لیکن اس کی سند میں ابوجعفر رازیؒ ہے جس کا نام عیسیٰ بن ابی عیسیٰ مالان ہے۔ امام احمدؒ اور نسائیؒ کہتے ہیں کہ وہ قوی نہ تھا ابن مدینیؒ اس کو صاحب غلط اور خطا کہتے ہیں۔ فلاسؒ اس کو سخی الحفظ کہتے ہیں ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ مشہور راویوں سے منکر روایتیں بیان کرتا ہے۔ البزرجیؒ کہتے ہیں کہ وہ بکثرت وہم کا شکار تھا (میزان جلد ۲ ص ۲۱۵) ذکر یاساجیؒ کہتے ہیں کہ وہ صاحب اتقان نہ تھا۔ ابن خراشؒ اس کو سخی الحفظ کہتے ہیں عیسیٰؒ کہتے ہیں کہ وہ قوی نہ تھا۔ حافظ ابن حجرؒ اس کو سخی الحفظ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۲ ص ۵)

یہ اثر بھی انتہائی ضعیف اور کمزور ہے نیز یہ بھی نہ بھولنے کے مطلق قرأت سے سورہ فاتحہ کی قرأت کیے ثابت ہوگی؟ کیونکہ اس اثر میں سورہ فاتحہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور فرق ثانی کی رٹ سورہ فاتحہ کی ہے۔ مولف خیر الکلام نے بعض توشیحی کلمات نقل کر کے آگے لکھا ہے کہ توشیح کے بعد جرح مذکور کا کوئی اعتبار نہ ہو گا کیونکہ وہ مبہم ہے اور اس کی دوسندیں اور ہیں تعدد طرق سے حسن روایت صحیح ہو جاتی ہے (محصلاً ص ۲۴) الجواب: فاحش الغلط اور کثیر الہتم وغیرہ جرح مفسر ہے اس کو مبہم کہنا اصول حدیث سے بے خبری کی دلیل ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر و حدیث کی مردود قسموں پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فن فحش غلطہ، او کثرت غفلة او ظہر فسقہ، فدیثہ، منکر (شرح نجۃ الفکر ص ۵۹) ہو یا اس کا فحش ظاہر ہو تو اس کی حدیث منکر ہوتی ہے۔

پھر آگے راوی کے وہم کی بحث کی ہے اور اس کی حدیث کو محلل کہا ہے۔ اور آخر میں راوی کے سوء حفظ پر کلام کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ اگر سوء حفظ تمام حالات میں راوی کو لازم ہے تو اس کی حدیث شاذ کہلاتی ہے اور اگر سوء حفظ ظاہری ہو تو اس کی مختلط کہتے ہیں اور تقریب النواوی میں ہے کہ۔

واذا قالوا متروک الحدیث او واهیہ او کذاب فہو ساقط لا یکتب حدیثہ (مع التدریب ص ۲۱۳)

جب محدثین کسی راوی کو متروک الحدیث، یا واهی الحدیث یا کذاب کہیں تو وہ ساقط الاعتبار ہوتا ہے اور اس کی لکھی بھی نہیں جاسکتی۔

اور اس کی شرح میں لکھا ہے کہ۔ ولا یعتبر بہ ولا یتشمہد (تدریب الراوی ص ۲۳۳)

اور نہ تو اس کو اعتبار (ومتابعیت) میں پیش کیا جاسکتا ہے اور نہ شاہد ہیں۔

اور تقریب النواوی اور اس کی شرح میں اس کی تصریح موجود ہے کہ۔

واذا اجتمع فیہ ای الراوی جرح مفسر وتعديل فالجرح مقدم ولو زاد عدد المعدل هذا هو الاصح عند الفقهاء والاصولیین ونقله الخطیب عن جمہور العلماء (تدریب الراوی ص ۲۴۴)

اگر راوی میں جرح اور تعدیل جمع ہو جائیں تو جرح مقدم ہوگی اگرچہ تعدیل کرنے والوں کی تعداد زیادہ بھی کیوں نہ ہو فقہاء اور ارباب اصول حدیث کے نزدیک یہی صحیح ہے اور خطیب بغدادی نے جمہور علماء سے یہی نقل کیا ہے۔



مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۸ میں الرفع والتکمیل کے حوالہ سے جو عبارتیں نقل کی ہیں اولاً تو اس میں منکر الحدیث وغیرہ کو جو جرح مبہم کے تحت درج کیا ہے قابل تعلیم نہیں ہے کیونکہ ابھی ہم باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ منکر الحدیث ایسی مفسر جرح ہے کہ بطور اعتقاد اور شاہد بھی ایسے راوی کی روایت نہیں پیش کی جاسکتی و ثانیاً الرفع والتکمیل ص ۱ کی عبارت میں جس کو خود مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۴ میں لکھا ہے یہ شرط بھی ہے کہ من غیر ان بیذکر سبب الطعن۔ یہ الفاظ بولے مگر اس کے طعن کا سبب بیان نہ کرے اور زیادہ بکائی وغیرہ کے بارے میں فاحش الغلط اور کثیر الوہم وغیرہ کی مفسر جرح موجود ہے اور اگر نے صراحت کے ساتھ سبب طعن ان میں ذکر کیا ہے پھر مؤلف خیر الکلام اس کو جرح مبہم کہہ کر کس طرح کستی گلو خلاصی کر سکتے ہیں؟ اور تعدد طرق کا بہانہ بھی بڑا عجیب ہے، تعدد طرق سے حدیث وہاں صحیح یا حسن وغیرہ ہو سکتی ہے جہاں ہر ایک سند کی روایت پر قابل برداشت جرح ہو نہ یہ کہ وہاں مفسر اور کڑی جرح بھی موجود ہو اور پھر بھی تعدد طرق سے حدیث صحیح یا حسن قرار پائے نواب صاحب کا حوالہ اس سلسلہ میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے، بہر حال یہ روایت ضعیف ہے اور معاملہ احکام کا ہے۔ اور امام نووی تصریح کرتے ہیں کہ:-

فانہم متفقون علی انہ لا یحتاج بالضعیف تمام حضرات محدثین کو کم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ فی الاحکام (شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۸) ضعیف احکام میں احتجاج درست نہیں ہے۔

فائدہ:- اس اثر کی سند میں ابوسنان کا ذکر آیا ہے محقق نیموی فرماتے ہیں کہ مجھے اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا (تعلیق جلد ۲ ص ۸۳) راقم کتاب ہے کہ ان کا نام ضرار بن مرہ تھا (تہذیب جلد ۱ ص ۱۶)

اور یہ بالاتفاق ثقہ اور ثبت تھے (تہذیب جلد ۱ ص ۱۶) حضرت ابی بن کعب کی ایک روایت ان الفاظ سے مروی ہے۔ کان یقدر خلف الامام فی ظہرہ والعصر (کتاب الفرائد ص ۶۲) کہ وہ ظہر

اور عصر کی نماز میں امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے لیکن اس سے بھی فرقی ثانی کا احتجاج باطل ہے۔ اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں یحییٰ بن العلاء ہے امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ یہ کذاب جعلی حدیث

بنایا کرتا تھا۔ ابن معین اس کو لیس بشقہ اور لیس بشتی کہتے ہیں عمرو بن علی، نسائی، دولابی اور دارقطنی اس کو مترک الحدیث کہتے ہیں امام وکیع، البزرعی، ابو حاتم اور ابو داؤد اس کو ضعیف

کہتے ہیں، ابن حبان کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے ابن عدی کہتے ہیں کہ اس کی

حدیثیں موضوع اور جعلی ہیں، اساجی اس کو منکر الحدیث کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶۲) مؤلف خیر الکلام نے یہاں بھی یہ لکھ کر گلو خلاصی چاہی ہے کہ یہ سب جرحیں مبہم ہیں سبحان اللہ تعالیٰ (ص ۲۵) و ثانیاً اس اثر میں ظہر اور عصر کی قید ہے اور فرق ثانی تمام نمازوں میں قرأت کا مدعی ہے و ثالثاً اس میں مطلق قرأت کا ذکر ہے سورہ فاتحہ کی تخصیص اس میں موجود نہیں ہے لہذا معنوی اعتبار سے بھی یہ اثر ان کو کسی طرح بھی مفید نہیں ہو سکتا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ

ہذیل بن شریحؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ امام کے پیچھے عصر کی نماز میں پہلی دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی اور سورت بھی پڑھا کرتے تھے (کتاب القراءة ص ۶۴ و ابکار ص ۱۴۳)

جواب :- یہ اثر بھی ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی لیث بن ابی سلیمؓ ہے امام درقطنیؒ (جلد ۱ ص ۱۲۶ میں) امام بیہقیؒ (کتاب القراءة ص ۱۱۱ میں) اور امام احمدؒ، امام یحییٰؒ اور امام نسائیؒ وغیرہ سب اس کو ضعیف اور کمزور کہتے ہیں (میزان جلد ۲ ص ۲۶، تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۶۸، قانون المصنوع ص ۲۸) اور دوسرا راوی اس سند کا عبد الرحمن بن ثروانؓ ہے امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے (میزان جلد ۲ ص ۲) نیز اس اثر میں ظہر و عصر کی نماز کی تخصیص ہے اور وہ بھی صرف پہلی دو رکعتوں میں اور فاتحہ کے ساتھ کسی اور سورت کا بھی ذکر ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے ایک روایت یوں ہے کہ وہ امام کے پیچھے ظہر اور عصر کی نماز میں قرأت کرتے تھے۔ مسند الکبریٰ ص ۱۶۹ کتاب القراءة ص ۶۴، تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۵۳، ابکار المنہن ص ۱۴ اور جزأ القراءة ص ۱۳ (جزأ القراءة

میں ظہر اور عصر کا لفظ موجود نہیں ہے) لیکن اس روایت کا مرکزی راوی شریحؓ ہے، امام بیہقیؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اگر محمد بن اس سے احتجاج نہیں کرتے (جلد ۱ ص ۱۰۲) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ یحییٰ قتانؓ اس کی اشد تضعیف کرتے تھے (جلد ۶ ص ۱۳۶) عبد اللہ بن مبارکؓ فرماتے ہیں کہ اس کی حدیث قابل قبول نہیں ہے جوز قانیؒ اس کو سنی الحفظ اور مضطرب الحدیث کہتے ہیں ابوالہثم بن سعیدؒ کہتے ہیں کہ شریحؓ نے چار تنوہا حدیث میں غلطی کی ہے (میزان جلد ۱ ص ۴۴) و تہذیب جلد ۸ ص ۲۳، علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں کہ ان کی حدیث مردود اور غیر مقبول ہے (توجیہ النظر ص ۲۵) حافظ ابن حجرؒ اس کو کثیر الخطأ لکھتے ہیں (تقریب ص ۱۶۹) مبارکپوریؒ صاحب ایک مقام پر لکھتے ہیں یہ حدیث حسن



کیسے ہو سکتی ہے اس کی سند میں شریک متفرد ہے اور وہ صاحب خطا کثیر الغلط اور خراب حافظہ کے مالک تھے (تحفۃ الاحوذی جلد ۲۸ ص ۲۸۸) نیز اس روایت میں قرأت کا ذکر ہے سورہ فاتحہ کی تخصیص نہیں ہے اور وہ بھی صرف ظہر اور عصر کی نماز میں اور جلد اول میں صحیح اسانید کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود کا محقق مسلک نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ کسی نماز میں امام کے پیچھے کسی قرأت کے قائل نہ تھے نہ سورہ فاتحہ کے اور نہ کسی اور سورت کے اس لیے فریق ثانی کا حضرت ابن مسعود کے اثم سے استدلال روایت و درایت ہر طرح سے مردود ہے۔ مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ان آثار میں اگرچہ کچھ ضعف ہے مگر مجموعی طور پر ان سے احتجاج درست ہے اور جن آثار میں ظہر و عصر کی قید ہے وہ اتفاقی ہے اور اس کے خلاف جو ان کا فتویٰ ہے وہ جہر پر محمول ہے (محصلہ ص ۳۳۱)۔

الجواب :- جن آثار میں کچھ ضعف ہے ان کی بجائے آپ وہ آثار کیوں نہیں لے لیتے جو بالکل صحیح ہیں جو جلد اول میں گزر چکے ہیں اور ظہر و عصر کی قید خالص احترازی ہے کیونکہ اس کے اتفاقی ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور ان کے قول کو جہر پر محمول کرنا خالص سیدہ زوری ہے وہ امام کے پیچھے نفس قرأت کے ہی منکر ہیں جو صحیح روایات سے ثابت ہے کما آمد حضرت عبداللہ بن مغفل کا اثر :- امام بخاری اپنی سند کے ساتھ یہ روایت نقل کرتے ہیں۔

عن عبد الله بن مغفل انه كان يقرأ في الظهر والعصر خلف الامام في الاولين بفتحة الكتاب وسورتين وفي الاخيرين بفتحة الكتاب (جزء القراءة ص ۳۱) کہ حضرت عبداللہ بن مغفل ظہر اور عصر کی پہلی دونوں رکعتوں میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ اور دو اور سورتیں بھی پڑھا کرتے تھے اور پچھلی دونوں رکعتوں میں صرف سورہ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔

جواب :- اس اثر سے بھی فریق ثانی کا احتجاج درست نہیں ہے۔ اولاً اس لیے کہ اس سند میں عمر بن ابی کحیمؓ ہے علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ راوی مجہول ہے چنانچہ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں وقال الذہبی لا يعرف انہی کہ علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ وہ مجہول ہے (تذیب ص ۴۵) ابن جانؒ اس کو ثقات میں لکھتے ہیں لیکن مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ انہیں کوئی خبر نہیں کہ ابن جانؒ متناہل ہیں (تحقیق الکلام ص ۴۵) وثانیاً اس اثر سے صرف ظہر اور عصر کی سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کا ثبوت سے حالانکہ فریق ثانی سب نمازوں اور سب رکعتوں کے لیے دعویٰ کرتا ہے وثالثاً اس اثر میں سورہ فاتحہ کے علاوہ اور سورتوں کی قرأت کا بھی ذکر ہے اور فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے اس لیے اثر بھی انکو چنداں فائدہ نہیں ہو سکتا مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اگرچہ اس اثر میں ظہر اور عصر کا ذکر ہے مگر ثانی کی نفی میں منہم مخالف کا اعتبار نہیں (محصلہ ص ۳۲۶)

الجواب: ظہر و عسر کی قید استرازی ہے جو باقی کی نفی پر دال ہے اور مفہوم مخالف پر یہ وضع دلیل ہے پھر کیوں حجت نہیں؟ ہاں اگر اخلاف کی طرح وہ مفہوم مخالف کو حجت نہیں سمجھتے تو صاف کہتے ہیں۔ تاکہ ہم ان کی پسند کا کوئی اور جواب عرض کر سکیں۔  
حضرت ابوسعید الخدریؓ کا اثر:

حضرت ابونضرؓ کہتے ہیں میں نے حضرت ابوسعید بن الخدریؓ سے پوچھا عن القراءة خلف الامام فقال بفتحها الكتاب (جزء القراءة ۱۳) کہ امام کے پیچھے قرأت صحیح ہے فرمایا ہاں سورۃ فاتحہ۔  
جواب: سند میں عوام بن حمزہؓ ہے ابن جوزیؒ اس کوضعفاریں لکھتے ہیں (الحجۃ النقیۃ ص ۱۶۱) امام یحییٰؒ فرماتے ہیں کہ اس کی حدیث محض ایچ ہے (میزان جلد ۲ ص ۲۵۸) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ صاحب مناکیر تھے (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۱۶۳) مبارکپوری صاحبؒ کہتے ہیں کہ عوام ثقہ ہے کیونکہ جرح مبہم ہے لہذا یہ اثر صحیح ہے (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۵۸) امام الجرح والتعديل یحییٰؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ اس کی حدیث یسبشیؒ ہے اور امام احمدؒ اس کو صاحب مناکیر کہہ کر منکر الحدیث بتاتے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ مبارکپوری صاحبؒ کے نزدیک یہ جرح مبہم ہے، کیا مولانا کو اپنا لکھی ہوئیہ اراشا یاد نہیں کہ جس راوی سے متعلق منکر الحدیث ہونیکا الزام ہوا کی حدیث قابل ترک ہے کیونکہ یہ جرح مضرب (ابکار الملتن ص ۱۹۱) الغرض یہ روایت اور اثر بھی فریق ثانی کو مفید نہیں۔  
حضرت انسؓ بن مالک کا اثر: حضرت ثابتؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں:

عن انسؓ قال کان یأمرنا بالقراءة خلف الامام وکنت اقوم الی جنب انسؓ فیقرأ بفتحها الكتاب وسورة من المفصل  
کہ حضرت انسؓ ہمیں امام کے پیچھے قرأت کرنے کا حکم دیا کرتے اور میں حضرت انسؓ کے پہلو میں کھڑا ہوتا تھا اور وہ سورۃ فاتحہ اور مفصل ہس سے کوئی سورت بھی ساتھ پڑھا کرتے تھے۔  
(کتاب القراءت ص ۶۸ و ص ۱۲۴)

جواب: یہ اثر بھی فریق ثانی کو مفید نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں وہی عوام بن حمزہؓ ہے جس پر جرح گذر چکی ہے یہ روایت سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۱ میں بھی مذکور ہے اور اس کی سند میں عوام بن حوشبؓ ہے اور گو وہ ثقہ ثبت اور فاضل تھے (تقریب ص ۲۹۲) لیکن امام سیوطیؒ امام ابن خزیمہؒ وغیرہ کے حوالہ سے یہ نقل کرتے ہیں کہ عوام بن حوشبؓ کا نام لینا صحیح نہیں ہے صحیح یہ ہے کہ یہ راوی عوام بن حمزہؓ ہی ہے و ہذا اصح صحیح ترین بات صرف یہی ہے و ثانیاً اس اثر میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ کسی اور مفصل سورت کا بھی ذکر ہے حالانکہ فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے جو جواب وہ ترک



سورة من المفصل کا غنایت فرمائے گا وہی ہماری طرف سے ترک سورۃ فاتحہ کا کچھ لے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا اثر، حضرت مجاہدؒ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں۔

سمعت عبد اللہ بن عمروؓ ویقرأ فی الظہر کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کو ظہر اور عصر کی نماز میں اہم کے پیچھے قرأت کرتے سنا۔

والعصر خلف الامام (سنن الکبریٰ جلد ۲)

ص ۱۶۹ و کتاب القراءة ص ۶۵

جواب: اگر مبارکپوری صاحب کا قاعدہ پیش نظر رکھا جائے (جیسا کہ انہوں نے ابوالسحاق

اور حاتم بن سلمہ وغیرہ کے متعلق اختیار کیا ہے) تو یہ اثر سنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی سند میں حصینؒ ہیں گو وہ ثقہ تھے لیکن حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ آخر عمر میں ان کا حافظہ خراب ہو گیا تھا (تقریباً ۹۵)

ام ابومعقلم نام ناسیؒ اور یزید بن ہارونؒ بھی فرماتے ہیں کہ آخر میں ان کا حافظہ خراب ہو گیا تھا (تہذیب جلد ۲ ص ۳۸۲) اور اگر اس اثر کو صحیح تسلیم کر لیا جائے جیسا کہ اہم بیہقیؒ نے اس کی تصریح کی ہے تو فریق

ثانی کو پھر بھی یہ اثر کلیتاً مفید نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں ظہر اور عصر کی قید ہے اور سورۃ فاتحہ کی قرأت کا ذکر نہیں ہے بلکہ دوسری روایت میں اس کی تصریح ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ ظہر کی نماز میں

اہم کے پیچھے سورۃ مریم پڑھتے تھے (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۶۹) اہم بیہقیؒ کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے محقق نیوٹن لکھتے ہیں اسنادہ صحیح (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۸۳) کہ اس کی سند صحیح ہے لہذا اس اثر کو

اہم کے پیچھے جملہ نمازوں میں قرأت سورۃ فاتحہ کے اثبات کے لیے پیش کرنا دو ازار کا رباست اہم بیہقیؒ نے ایک اور سند نقل کی ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت عبداللہ بن عقبہ

سے روایت نقل کی ہے کہ وہ دونوں اہم کے پیچھے قرأت کرتے تھے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۹)

لیکن اس کی سند میں عبدالملک بن محمدؒ ہے اہم دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ وہ صدوق تھے لیکن اسناد اور متون میں بجز خطا کرتے تھے وہ زبانی روایت بیان کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے احادیث

بہت زیادہ ہو چکے تھے (تہذیب جلد ۲ ص ۴۲) اہم حاکمؒ نقل کرتے ہیں کہ جن روایتوں میں یہ منفرد ہوں ان سے احتجاج صحیح نہیں ہے علامہ ابوالقاسمؒ فرماتے ہیں کہ میرے پاس ان کی حدیثوں کی

دس جلدیں موجود ہیں لیکن ان میں ایک حدیث بھی ایسی نہیں ہے جو ان کے دہم سے بچ سکی ہو، کسی کی سند میں خرابی ہے تو کسی کے متن میں وہ زبانی روایتیں بیان کیا کرتے تھے، اس لیے

ان کے اوصاف بہت زیادہ ہو گئے ہیں (ایضاً ص ۲۱۱) اور ان کا وہم اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اسی اثر میں یہ تین متضاد نام آتے ہیں عبد اللہ بن عمرؓ، عبد اللہ بن عقبہؓ اور عبد اللہ بن عمروؓ چنانچہ امام بیہقیؒ (بلکہ حضرت امام بخاریؒ) بھی لکھتے جزاء القرآۃ ص ۱۱) مؤخر الذکر کے نام کو صحیح سمجھتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۹ و کتاب القرآۃ ص ۶۵) حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا محقق مسلک بلند صحیح جلد اول میں نقل کیا جا چکا ہے اور ان کی اس کے خلاف پیش کردہ روایتوں پر کلام آ رہا ہے۔  
انشاء اللہ العزیز۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ کا اثر: یزید فقیرؒ حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں:-  
قال كنا نقرأ في الظهر والعصر خلف الامم وہ فرماتے ہیں کہ ہم ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں فی الركعتین الاولیین بفاتحة الكتاب سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی اور سورت بھی اور وسورۃ وفي الآخريین بفاتحة الكتاب پچھلی دونوں رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھا (ابن ماجہ ص ۱۱ و سنن الکبریٰ ص ۱۱۱ کتاب القلۃ) کرتے تھے۔

جواب:- اس اثر سے بھی فریق ثانی کا استدلال صحیح نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں سعید بن عامرؒ ہے گو وہ ثقہ تھے لیکن ابویہؒ کہتے ہیں کہ ان کی حدیث میں بعض غلطیاں بھی ہوتی ہیں (تذیب جلد ۵ ص ۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ کبھی وہم کا شکار ہو جاتے تھے (تقریب ص ۱۱۱) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ امام ابویہؒ متعنت ہیں اس لیے ان کی جرح کا کوئی اعتبار نہیں (ص ۲۰۶)

الجواب:- ان کا تعنت دہل ہوتا ہے جہاں وہ متفرد ہوں اور یہاں تو حافظ ابن حجرؒ بھی ان کو وہمی بتاتے ہیں اس کا معارضہ ان کے اُس اثر سے جو بسند صحیح مؤطا اہم مالک اور ترمذی کے حوالے سے نقل کیا جا چکا ہے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مبارکپوری صاحب ایک مقام پر لکھتے ہیں، سورۃ معارضہ بھی صحیح نہیں کیونکہ اس اثر کی سند میں حماد بن سلمہؒ کا واقع ہے (گو وہ ثقہ تھے تقریب ص ۱۱۱) مگر آخر میں حافظ متغیر ہو گیا تھا (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۱۱) مؤلف خیر الکلام کا پس یہ حدیث صحیح ہے (ص ۲۰۶) کنا کوئی وزن نہیں رکھتا و ثانیاً علامہ ماردیچیؒ لکھتے ہیں کہ یہ اثر مضطرب المتن ہے کیونکہ ایک روایت میں خلف الامم کا جملہ نہیں ہے (جزاء القرآۃ ص ۶۵ سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۹) اور دوسری روایت میں اس کا ذکر ہے (ایضاً جلد ۲ ص ۱۶۹ و ص ۱۱۱) (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۱۱) زیادت ثقہ مقبول ہوتی ہے



جب کہ وہ خطا اور وہم کا شکار نہ ہو مولف خیر الکلام یہ نکتہ کھانگتے ہیں، نیز ایک مقام میں فاتحۃ الكتاب کے بعد فمافوق ذلک اوقال ما اکثر من ذلک کا ذکر ہے اور دوسرے مقام پر مافوق کے بجائے سورۃ کا ذکر ہے اور ایک روایت میں فمافوقہا ہے (بیہقی جلد ۲ ص ۶۳) مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ مقتدی کے لیے سب سے بڑی نمازوں میں ما زاد پڑھنا منع نہیں لہذا اضطراب کیسا؟ (محصلا ص ۳۲) الجواب اولاً تو ما زاد کا مقتدی کے لیے سب سے بڑی نمازوں میں پڑھنے کا جواز محل نظر ہے وثانیاً وہی راوی کے الفاظ میں اس نمایاں اضطراب کا یہ جواب غیر تسلی بخش ہے وثالثاً حضرت شاہ عبد الغنی مجددی رحمہ اللہ (۱۲۶۶ھ) لکھتے ہیں۔ حضرت جابرؓ کا یہ اثر اس وقت کہ ہے جب کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے قرآن خلف الامام کی ممانعت نہیں سنی تھی اور اپنے اجتہاد کے موافق امام کے پیچھے قرأت کرتے رہے جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے منع کر دیا تو باز آگئے (انجام الحاجۃ) اور یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ حضرت جابرؓ کا پہلا قول اور عمل ہے بعد کہ وہ قرآن خلف الامام کے قائل نہ رہے تھے اور ان کا یہی مسلک حضرت امام مالکؒ، حضرت احمدؒ اور حضرت امام ترمذیؒ وغیرہ ائمہ فقہ و حدیث نے سمجھا اور اس کو روایت کیا ہے اور ہم نے ان کی صحیح اور منقول روایت بھی پہلے بیان کی جو صراحت سے منع پر دال ہے۔ مولف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ منع خیالی بات ہے (ص ۳۲) خود ایک خیالی پلاؤ ہے۔ ودا بجا چونکہ اس اثر میں خلف الامام کا جملہ صرف سعید بن عامرؒ نقل کرتے ہیں۔ اور ان کی روایت میں غلطی اور وہم ہوتا ہے اس لیے یہ لفظ ان کی غلطی سے زیادہ ہوا ہے کیونکہ دوسرے راوی اس کو نقل نہیں کرتے چنانچہ یہ روایت یحییٰ بن سعیدؒ سے بھی مروی ہے (سنن الکبیری جلد ۲ ص ۶۳ و کتاب القراءة ص ۵۱) اور معاویہ بن ہشامؒ سے بھی (کتاب القراءة ص ۵۱) مگر ان کی روایت میں خلف الامام کا جملہ مذکور نہیں ہے اور چونکہ صحیح روایات میں مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت سے منع کا حکم آیا ہے اس لیے اصل روایت منفرد کے حق میں تھی لیکن ان کی غلطی اور وہم سے منفرد کے بجائے مقتدی سے جوڑ دی گئی ہے وخامساً اس اثر میں صرف ظہر اور عصر کی نماز کا ذکر ہے اور فرق ثانی کا دعویٰ عموم کا ہے وسادساً اس اثر میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا بھی ذکر ہے حالانکہ فرق ثانی اس کا قائل نہیں ہے اگر یہ اثر ان کے نزدیک صحیح ہے تو جو جواب وہ اس میں سورت کی نفی کا ارشاد فرمائیں گے وہی ہماری طرف سے سورۃ فاتحہ کی نفی اور

ترک کا جواب سمجھ لیں حضرت جابرؓ سے ایک اثر یوں مروی ہے کہ ان کے ایک غلام نے کہا کہ مجھے میرے آقا نے یہ حکم دیا اِقْرَأْ فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ خَلْفَ الْإِمَامِ (جزء القراءۃ ص ۱۱) وایک اور جگہ کہ میں ظہر اور عصر کی نماز میں امام کے پیچھے قرأت کروں لیکن اس سے بھی استدلال صحیح نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند یوں ہے سفیان بن حسین عن الزہریؓ اور حضرت علیؓ کے اثر کے تحت اس کی پوری تحقیق گزر چکی ہے کہ یہ ضعیف ہے وثانیاً محقق نیویؓ لکھتے ہیں کہ مولیٰ جابرؓ اس سند میں مجہول ہے نہ معلوم وہ کون اور کیسا تھا؟ (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۱۲) وثالثاً اس میں ظہر اور عصر کی قید ہے اور فریق ثانی کا دعویٰ عام ہے حضرت جابرؓ کا مسلک صحیح سند کے ساتھ جلد اول میں نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ امام کے پیچھے کسی نماز میں کسی قسم کی قرأت کے عموماً اور سورۃ فاتحہ کے خصوصاً ہرگز قائل نہ تھے ان کا ایک اور اثر سن لیجئے امام ابو بکرؓ بن ابی شیبہؓ فرماتے ہیں کہ ہم سے وکیعؓ نے بیان کیا وہ ضحاکؓ بن عثمانؓ سے روایت کرتے اور وہ عبید اللہؓ بن مقسمؓ سے اور وہ حضرت جابرؓ بن عبد اللہؓ سے وہ فرماتے ہیں لا یقرأ خلف الإمام (المجہد النقی جلد ۲ ص ۱۶۱ مع البیہقی) کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کی جاسکتی، اس سند کے سب زوای ثقہ اور ثبت ہیں بقیہ روایت کا ترجمہ پہلے اپنے اپنے موقع پر گزر چکا ہے۔ البتہ ضحاکؓ بن عثمانؓ کا ترجمہ باقی ہے، امام احمد بن محمدؓ مصعب زبیریؓ، ابو داؤدؓ، ابن بکرؓ اور علی بن المدینیؓ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں ابو حاتمؓ ان کو صدوق کہتے ہیں ابن حبانؓ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں ابن سعدؓ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں ابن نمیرؓ ان کو لا بأس بہ اور جائز الحدیث کہتے ہیں (تہذیب جلد ۴ ص ۴۴) علامہ ابن ترکانیؓ فرماتے ہیں یہ سند متصل اور علی شرط مسلم صحیح ہے (المجہد جلد ۲ ص ۱۶۱)

حضرت عبد اللہؓ بن عباسؓ کا اثر :-

امام بیہقیؒ اپنی سند کے ساتھ عبد الوہابؓ بن فلیح المکیؓ کے طریق سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سروان بن معاویہ الفزاریؓ نے اسماعیل بن ابی خالدؓ سے روایت کی وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے الفراء بن حربؓ نے روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ :-

سمعت ابن عباسؓ یقول اقرأ خلف الإمام میں نے حضرت ابن عباسؓ سے سنا انہوں نے فرمایا کہ امام بفاتحة الكتاب هذا اسناد صحيح لا غبار عليه کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھا کرو یہ سند صحیح ہے اس



کتاب القراءة ص ۱۳۷ طبع دہلی و کٹر الحال ج ۲ ص ۲۵۳ و پر کوئی غبار نہیں ہے۔

تحقیق الکلام ج ۲ ص ۱۵۹ و ابکار ص ۱۴۵

الجواب :- اس اثر سے فریق ثانی کا استدلال صحیح نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سندیں مولانا بن معاویہ الفزاری ہی ہیں اور وہ عن کے ساتھ روایت کرتے ہیں وہ اگرچہ ثقہ اور ثبت تھے لیکن وہ مجہول راویوں سے روایت کرنے میں تدلیس کرنے اور روات اور شیوخ کے نام بدل دینے کے عیب میں مبتلا تھے امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ وہ اگر معروف راویوں سے روایت کریں تو ثقہ ہیں (تذکرہ ص ۲۶۲) اور اگر مجہول راویوں سے روایت کریں تو ضعیف ہیں (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۰۸) امام ابن معینؒ ہی فرماتے ہیں کہ وہ گلیوں سے ہمارے لیے شیوخ اور روات چن لیتے تھے (تذکرہ ص ۲۶۲) اور ایسا ہی محدث ابن نمیر نے فرمایا (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۰۸) امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ میں نے تدلیس کرنے میں ان سے بڑا حیلہ گزارا کوئی نہیں دیکھا (ایضاً) نیز انہوں نے فرمایا کہ وہ لوگوں سے مخفی رکھنے کے لیے راویوں کے نام بدل دیتے تھے چنانچہ انہوں نے ہم سے الحکم بن ابی خالدؒ سے روایت بیان کی جو درحقیقت الحکم بن ظمیرؒ ہیں (ایضاً) امام ابو داؤدؒ فرماتے ہیں کہ وہ راویوں کے نام بدل دیتے تھے۔ اس کارروائی کو اصول حدیث والے تدلیس شیوخ کہتے ہیں۔ (صحفہ) امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ وہ سچے تو ہیں مگر بکثرت مجہول راویوں سے روایت کرتے ہیں (ایضاً) علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ وہ (بے تحاشا) زندوں اور مردوں سے روایت کر لیتے تھے یہ رویہ عن وب و درج (ایضاً) اور حفاظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ وہ مدلس ہونے کے ساتھ شیعہ بھی تھے (تقریب ص ۲۶۳) اور مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ وہ تدلیس شیوخ کرتے تھے اور اس کا امر ہلکا ہے (محصلا ص ۳۱) لیکن اسی پیش نظر کتاب میں باحوالہ اس کی تصریح موجود ہے کہ تدلیس زنا سے بھی بدتر ہے (مگر صحیحین میں روات کی تدلیس اور بعض مخصوص روات مثلاً قتادہؒ، اعشؒ اور ابو الزبیر محمد بن مسلم بن مدرّسؒ وغیرہ کی تدلیس اس کی زواہر میں نہیں ہے کما مر) اور امام نوویؒ تدلیس شیوخ کے بارے لکھتے ہیں وہو قبیح مذموم الخ (شرح مسلم ج ۱ ص ۱۹) کہ وہ قبیح اور مذموم ہے اور اس روایت کو الفزاریؒ عن غنہ سے بیان کرتے ہیں جس پر خاصا غبار ہے اور یہ صحیح نہیں ہے وثانیاً اصل سندیں امام بیہقیؒ نے راوی کا نام الفزار بن حرب نقل کیا ہے جو مجہول ہے معلوم نہیں کہ وہ کون اور کیسا تھا؛ جب تک

کتب اسماء الرجال سے باحوالہ اس کی توثیق سامنے نہ آجائے اس کی صحت ثابت نہیں ہو سکتی۔ امام بیہقیؒ نے اگرچہ اس اسناد کو صحیح لاغبار علیہ فرمایا ہے مگر امام بیہقیؒ کا روایت کی توثیق اور تضعیف کے بارے نظر یہ خود ان کے اپنے حوالوں کی روشنی میں پہلے بیان ہو چکا ہے اور حاشیہ پر نسخہ کا عنوان دے کر امام بیہقیؒ نے اس راوی کے بدلے العینزر بن حریثؒ لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود امام بیہقیؒ اس راوی کی تعیین کے بارے میں متردد ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ الفزارعیؒ کی تدلیس اور روایت کے نام بدلنے کا اثر اور نتیجہ ہوا امام بیہقیؒ نے کتاب القراءۃ ص ۶۴ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۹ میں بلا تردد العینزر بن حریثؒ کا نام لیا ہے اور اس سند میں الفزارعیؒ بھی نہیں لیکن اس کی سند میں ابوبکر برہاریؒ ہے اور پہلے بیان ہو چکا ہے وہ کذاب تھا و ثالثاً اس کی سند میں اسماعیل بن ابی خالدؒ ہیں جو الکوفی تھے (تذکرہ ص ۱۴۲) اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ جب اہل کوفہ کی نقل صحیح نہیں تو تطبیق کی بھی ضرورت نہیں بلقظہ (ص ۲۹۲) لہذا کسی کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ اس روایت کی حضرت ابن عباسؓ کی ان صحیح روایات سے تطبیق ٹینے کے لئے وجوہ تلاش کئے جو جلد اول میں بیان ہو چکی ہیں و دلیلاً قطع نظر اس بحث سے اگر یہ روایت صحیح بھی ثابت ہو جائے تو اس سے تمام نمازوں میں قرأت سورہ فاتحہ کا ثبوت نہیں ہو سکتا کیونکہ طحاوی ص ۱۱۱ میں اسماعیل بن ابی خالدؒ سے غنہ کے ساتھ العینزر بن حریثؒ کی حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے جس میں آتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ تم امام کے پیچھے فاتحہ الکتاب ظہر اور عصر کی نماز میں پڑھو اس سے معلوم ہوا کہ ان کی طرف سے اجازت صرف سری نمازوں میں تھی نہ کہ جہری نمازوں میں جیسا کہ مخفی نہیں وغامضا طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۱ کی روایت میں یونس بن ابی اسحاقؒ کی العینزر بن حریثؒ سے غنہ کے ساتھ روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے سنا انہوں نے فرمایا کہ لا تصل صلوۃ الا قرأت فیہا ولو لبناحۃ الکتاب کوئی نماز تم قرأت کے بغیر نہ پڑھو اگرچہ فاتحہ الکتاب ہی کیوں نہ ہو فرقی ثانی چونکہ مقتدی کے لیے سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض اور لازم قرار دیتا ہے اور ولو لبناحۃ الکتاب کے الفاظ اس فرضیت کے اثبات سے بالکل قاصر ہیں جیسا کہ واضح ہے حضرت ابن عباسؓ سے کتاب القراءۃ ص ۶۴ اور اعلام السنن جلد ۲ ص ۸۱ میں ایک روایت یوں آتی ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرو امام جہر کرے یا نہ کرے مگر اس کی سند میں عتبہ بن عبد اللہؒ ہے امام ابن معینؒ اس کو لیس بشی اور امام نسائیؒ لیس بشقۃ



اور فلاس و اہل الحدیث اور ابو حاتمؒ لین الحدیث اور امام ابو داؤدؒ و ضعیف کہتے ہیں (تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۴۴) ابن حبانؒ ان کو عفا میں لکھتے ہیں اور ساجیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی حدیث سے احتجاج صحیح نہیں اور اس میں ضعف ہے (ایضاً ص ۲۴۵) علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ وہ مشہور ضعیف ہے (میزان ص ۲۴۲) حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت اس طرح مروی ہے کہ فاتحۃ الکتاب کسی رکعت میں نہ چھوڑو امام جہر کرے یا نہ کرے (کتاب القراءۃ ص ۶۴ و سنن البکری جلد ۲ ص ۱۶۹) لیکن سند میں لیث بن ابی سلیم ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کے اثر کے تحت گذر چکا ہے کہ وہ ضعیف ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت کتاب القراءۃ ص ۶۴ میں بھی ہے لیکن اس کی سند میں عبد اللہ بن لیثؒ ہے بحث خراج میں نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ ضعیف تھا ان کی ایک اور روایت کتاب القراءۃ ص ۱۳۱ میں ہے لیکن سند میں زہیرؒ نا ابو اسحاقؒ الحسنیؒ امام بیہقیؒ امام البزرجیؒ علامہ ذہبیؒ اور ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ زہیرؒ کی روایت ابو اسحاقؒ سے ضعیف اور کمزور ہے (دیلمی سنن البکری جلد ۱ ص ۱۰۸، میزان جلد ۳ ص ۳۵۵ و تہذیب جلد ۲ ص ۳۵۲ وغیرہ) علاوہ بریں مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ابو اسحاقؒ قحط تھے اور مدلس بھی تھے اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں تو ان کی سند کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ تو ان کے قاعدہ کے مطابق یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ (ابکار ص ۱۶۶) جلد اول میں اس کی پوری بحث عرض کی جا چکی ہے۔ الغرض حضرت ابن عباسؓ کی ایک سند صحیح نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنی چاہیے۔ بخلاف اس کے ہم جلد اول میں آیت کی تفسیر میں اور آثار حضرات صحابہؓ کرام میں ان کی صحیح سند سے کئی روایتیں اس کے خلاف عرض کی چکی ہیں۔

قائدہ بر عقبہ بن الاصمؒ کی سند میں ایک روای ہے جس کا نام بشر بن موسیٰؒ ہے صاحب اعلام السنن (جلد ۴ ص ۸۵) اس کو مجہول کہتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے بشر بن موسیٰؒ جلیل القدر محدث تھے علامہ ذہبیؒ ان کو المحدث الامام اور الثبت لکھتے ہیں، امام دارقطنیؒ ان کو ثقہ بنیل کہتے ہیں (المتوفی ۲۸۸ھ، تذکرہ جلد ۲ ص ۱۶۵ و ص ۱۶۹)

حضرت ابو الدرداءؒ کا اثر :- ان سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ لا یترک قراءۃ فاتحۃ الکتاب خلف الامام جہر اولم یجہر (کتاب القراءۃ ص ۶۴ و سنن البیہقی ج ۲ ص ۲۴۴)

اہم کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرأت نہ ترک کی جائے اہم جہر کرے یا آہستہ پڑھے۔

جواب :- سند میں ولید بن مسلم عن الازاعی الخ ہے، ولید مذکور مدلس ہے ابو سہر کہتے ہیں کہ وہ جھوٹے راویوں سے بھی تدلیس کر لیا کرتا ہے۔ علامہ ذہبیؒ اس کے بارے میں یوں فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ جب یہ عن سے روایت کرے خصوصاً ابن جریرؒ یا الازاعیؒ سے تو اس کی حدیث کا قطعاً کوئی اعتبار نہ ہوگا (میزان جلد ۳ ص ۲۴۵ و تہذیب جلد ۱ ص ۵۴) اور یہ روایت ان کی الازاعیؒ سے ہے اور جلد اول میں حضرت ابوالدرداءؒ کا بلند صحیح اثر اس کے خلاف عرض کیا جا چکا ہے حضرت ابوالدرداءؒ کا اثر ہونے میں فریق ثانی کو بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حضرت ام بیہقیؒ نے ولید بن مسلم کا ایک متابع بھی ذکر کیا ہے جس کے سہارے پر مولانا مبارکپوری صاحبؒ نے اس کو اپنا مستدل قرار دیا ہے اور اس سے استدلال کرتے ہوئے اس کو

متابع محمد بن کثیر الشافعی ہے اور ام بیہقیؒ نے ان کی روایت کتاب القراءۃ (ص ۶۸ طبع دہلی) میں نقل کی ہے لیکن اس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں اس لیے کہ محمد بن کثیرؒ کی اگرچہ بعض حضرات محدثین کرامؒ نے توثیق کی ہے لیکن امام احمدؒ نے ان کی سخت تضعیف کی ہے اور اسے منکر الحدیث کہا ہے اور نیز انہوں نے فرمایا ہے کہ اس نے ایسی منکر احادیث بیان کی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے امام صالح بن محمدؒ اس کو صدوق کثیر الخطا کہتے ہیں، امام بخاریؒ نے بھی اس کو بہت ضعیف بتایا ہے امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ وہ قوی نہیں اور کثیر الخطا ہے امام ساجیؒ فرماتے ہیں کہ صدوق اور کثیر الغلط ہے امام ابو احمد الحاکمؒ فرماتے ہیں کہ محدثین کے نزدیک وہ قوی نہیں امام ابن عدیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی بیان کردہ روایات میں کوئی اس کی متابعت اور تائید نہیں کرتا (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۱۶ و ص ۴۱۷) اور حافظ ابن حجرؒ ان کو صدوق کثیر الغلط کہتے ہیں (تقریب ص) جب یہ راوی نہایت ضعیف اور کثیر الغلط ہے تو اس کی روایت اور اس کی تائید سے کیا فائدہ؟ ترجمان الحدیث ماہ جنوری ۱۹۴۵ء ص ۲۸۲ میں بلاوجہ ایسے راوی کا تذکرہ کر کے اس کی روایت سے سہارا تلاش کیا گیا ہے۔

حضرت عمران بن حصینؒ کا اثر :- ان سے مروی ہے انہوں نے ارشاد فرمایا :-

لا تزکو صلوٰۃ مسلم الا بطہور و رکوع کسی مسلمان کی نماز مقبول نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ طہارت و سجود و فاتحۃ الكتاب و رکوع رکوع، سجود اور سورۃ فاتحہ کا اس میں خاص اہتمام نہ کرے



وغیر الامام (کتاب القراءۃ ص ۱۱۱ جزا القراءۃ مثلاً) امام کے پیچھے ہو یا اکیلا۔

جواب :- اس کی سند میں زیاد بن ابی زیاد جصاص ہے امام ابن معین اور ابن مدینی اس کو لیس بشیئہ کہتے ہیں نسائی اور دارقطنی اس کو متروک کہتے ہیں البزرجی اس کو واہمی کہتے ہیں علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ اس کے ضعیف ہونے پر سب کا اجماع اور اتفاق ہے (میزان جلد ۱ ص ۳۵۶) و تہذیب جلد ۲ ص ۳۶۸) مولف خیر الکلام نے بھی علامہ ذہبی کا حوالہ نقل کیا ہے (ص ۲۲) یہ روایت بھی نہایت کمزور اور ضعیف ہے اور ان کی ایک روایت یوں ہے لا تجوز صلاۃ الا بفاتحة الكتاب و آیتین فصاعداً (کتاب القراءۃ ص ۱۱۱) کہ نماز سورۃ فاتحہ اور دو آیتوں اور اس سے کچھ زیادہ کے بغیر صحیح نہیں ہوتی۔ لیکن اس میں ایک تو خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے اور دوسرا اس میں دو آیتین فصاعداً کی زیادت موجود ہے۔

لطیفہ :- حضرت عمران بن حصینؓ سے مرفوعاً ایک روایت مروی ہے کہ ظہر کی نماز میں ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ نے فرمایا کس نے میرے ساتھ نماز سخت اور ہاتھ پائی کی ہے؟ غرضیکہ آپؐ نے امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کر دیا (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۳) اس روایت پر فریق ثانی کی طرف سے جن میں امام دارقطنی بھی ہیں یہ اعتراض ہوا ہے کہ سند میں حجاج بن ارطاة ہے اور وہ ضعیف ہے ہم نے حجاج بن ارطاة سے کوئی روایت نہیں لی۔ لیکن فریق ثانی کی ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ حجاج بن ارطاة، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور مسلم وغیرہ کے روایت میں ہیں (ازالہ ستر ص ۱۲۱) علامہ ذہبی ان کچھ احاد الاعلام اور علم کا ظرف لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۴۵) البزرجی اور نووی ان کی توثیق کرتے ہیں (تہذیب جلد ۱ ص ۱۹۶) امام نووی لکھتے ہیں کان بارعانی الحفظ والعلم کہ حفظ اور علم میں وہ بلند پایہ رکھتے تھے۔

تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۱۵۳) امام ترمذی ان کی ایک حدیث کو حسن کہتے ہوئے تحسین کرتے ہیں (جلد ۱ ص ۱۵۳) بلکہ ایک حدیث کو حسن صحیح کہتے ہیں (جلد ۱ ص ۱۱۱) افسوس ہے کہ ان کی روایت تو فریق ثانی کے نزدیک حجت نہیں ہے لیکن زیادہ کی روایت حجت ہے جو لیس بشیئہ ہے اور اس کی تضعیف پر اجماع ہے ان کی ایک روایت یوں ہے کہ ظہر کی نماز میں ایک شخص نے سبح اسمہ و بکراۃ کی سورت آپؐ کے پیچھے پڑھی تھی (مسلم جلد ۱ ص ۱۴۲، نسائی جلد ۱ ص ۱۰۶، ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۲۴) چوتھ لغت

توفیق ہے اس لیے قرآن کو جہد کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا اور پڑھنے والا بھی صرف ایک شخص تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس نے قرآن طہ کی نماز میں کی تھی جو ستری ہے مگر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو بھی گوارا نہیں کیا اور پوری تحقیق گزر چکی ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اور منازعت و مخالفت میں قرأت سورۃ فاتحہ اور دوسری تمام سورتیں یکساں ہیں کیونکہ علت ایک ہے اور ما زاد علی الفاتحۃ کو منازعت کے لیے متعین کر دینا اور سورۃ فاتحہ کو اس سے خارج تصور کرنا دعویٰ بلا دلیل ہے جو بہر حال مردود ہے۔

حضرت ہشام بن عامر کا اثر: حمید بن ہلال سے مروی ہے وہ کہتے ہیں۔  
 ان ہشام بن عامر قرا فقیل لہ القراءۃ کہ ہشام بن عامر نے قرأت کی ان سے پوچھا گیا کہ  
 خلف الامام قال انا لنفعل رکتاب القراءۃ آپ اہم کے تیجھے قرأت کرتے ہیں؟ فرمایا ہاں ہم  
 ۶۷۱ سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۸۱ یوں ہی کرتے ہیں۔

جواب: یہ اثر بھی قابل التفات نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں ابو جبر بہاری ہے اور عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ کذاب تھا وثانیاً اس بات میں اختلاف ہے کہ حمید بن ہلال کی ہشام بن عامر سے ملاقات ثابت ہے یا نہیں؟ اہم ابو حاتم کہتے ہیں ملاقات ثابت نہیں ہے اور ان کی روایت مرسل ہے (دیکھئے تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۱۸۱ و جلد ۱۱ ص ۱۸۱ و ثالثاً اس اثر میں سورۃ فاتحہ کا ذکر نہیں بلکہ مطلق قرأت کا ذکر ہے فریق ثانی کا دعویٰ صرف سورۃ فاتحہ کی قرأت کا ہے نہ کہ مطلق قرأت کا۔

حضرت معاذ بن جبل کا اثر: ایک سائل نے حضرت معاذ سے قرآن خلف الامام کے متعلق سوال کیا۔

قال اذا قرأ فاتحاً بفاتحة الكتاب وقل هو الله احد واذا لم تسمع قارأ ف نفسك ولا تؤذ من عن يمينك ولا من عن شمالك السنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۹  
 انہوں نے فرمایا کہ جب اہم قرأت کرے تو تم بھی سورۃ فاتحہ اور قل هو الله احد پڑھا کر و اور جب اس کی قرآن نہ سنو تو دل میں پڑھا کر و دائیں اور بائیں پہلو والوں کو اذیت نہ دیا کرو۔

جواب: یہ اثر بھی قابل استدلال نہیں ہو سکتا اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں احمد بن محمد



واقع ہے حافظ ابن حجرؒ ایک سند کے متعلق جس میں احمد بن محمد واقع ہے لکھتے ہیں کہ سند باطل ہے اور اس سند کے راوی ضعیف ہیں دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ مجہول ہیں (لسان المیزان جلد ۶ ص ۲۱۴) و ثانیاً اس کی سند میں ابوشیبہ مہریؒ ہے علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ بلج مہریؒ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ بدری من ذاولا من شیخہ بلج مہریؒ اور اس کا استاد ابوشیبہ مہریؒ پتہ نہیں یہ دونوں کون تھے؟ اہم بخاریؒ فرماتے ہیں اس کی سند مجہول ہے (میزان جلد ۱ ص ۱۲۷ و لسان ص ۲۱۴) و ثالثاً اس سند میں علی بن یونسؒ واقع ہے اگر یہ علی بن یونس بلخیؒ ہے تب بھی کمزور ہے (میزان جلد ۲ ص ۱۲۷ و لسان ص ۲۱۴) اور اگر علی بن یونس مدینیؒ ہے تب بھی ضعیف ہے (الایضہ والایضہ ص ۲۶۹) اگر کوئی اور ہے تو اس کی توثیق درکار ہے و رابعاً اس اثر سے نظر بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاذؒ نے صرف ستر نمازوں میں اجازت دی ہے و خامساً اس میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ قل هو اللہ احد کی قرأت کا بھی ذکر ہے اور فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اثر: حضرت سالمؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں ان ابن عمرؓ کان یمنعت للامام فیما جہر فیہ ولا یقلع معہ (کتاب القراءة ص ۱۷۱ و تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۷۱) کہ حضرت ابن عمرؓ جہری نمازوں میں اہم کے پیچھے خاموش رہا کرتے تھے اور قرأت نہیں کرتے تھے، فریق ثانی کا کہنا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر نمازوں میں وہ اہم کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے۔

جواب ۱۔ یہ اثر بھی فریق ثانی کو مفید نہیں اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں ابن جریجؒ ہیں، اہم دارقطنیؒ علامہ ذہبیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ وہ مدلس تھے (تہذیب جلد ۶ ص ۴۰۵، میزان جلد ۱ ص ۱۵۷، البکار ص ۲۳۴) اور یہاں وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں اور عنعنہ مدلس کا مقبول نہیں و ثانیاً اس میں زہریؒ ہیں اور مبارکپوری صاحبؒ ان کی مدلس روایت کو بھی صحیح تسلیم نہیں کرتے اور یہاں بھی وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں و ثالثاً یہ اثر عبارتہ النص کے طور پر ہماری دلیل ہے کہ حضرت ابن عمرؓ جہری نمازوں میں قرأت کے قائل نہ تھے رہا ستر نمازوں میں اس سے قرأت کا اثبات کہنا تو مفہوم مخالف پر مبنی ہے اور ہمارے نزدیک مفہوم مخالفت حجت نہیں ہے (تعلیق المجملہ ص ۹۲ و اعلام السنن جلد ۴ ص ۱) و رابعاً اگر مفہوم مخالف کو بعض فقہاء

کے قول کے مطابق صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی اس سے اتنا ہی ثابت ہوگا کہ حضرت ابن عمرؓ  
 برتری نمازوں میں اہم کی بجائے قرأت کرتے تھے اور فریق ثانی کا دعویٰ اس سے خاص ہے کیونکہ  
 ان کا دعویٰ صرف سورۃ فاتحہ پڑھنے کا ہے وخامساً موطا امام مالکؒ وغیرہ کے حوالہ سے بلند صحیح ان  
 کا یہ اثر نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ اہم کے پیچھے کسی نماز میں کسی قسم کی قرأت کے قائل نہ تھے اور ان کا یہ  
 مسلک ایک مسلم حقیقت ہے اور ان سے ایک روایت یوں ہے انہ کانینہی عن القراءۃ  
 خلف الامام (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۳۳) کہ حضرت ابن عمرؓ اہم کے پیچھے قرأت کرنے سے منع  
 کیا کرتے تھے۔ مولانا سید ندیم حسین صاحب دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ) جو فریق ثانی کے مقتدر اور  
 پیشوا ہیں تحریر فرماتے ہیں کہ مقتدی کو سورۃ فاتحہ پڑھنے کی علماء احناف کے نزدیک اجازت نہیں ہے  
 اور ان کا استدلال ان صحابہ کرامؓ کی روایات سے ہے اور یہ قرأت خلف الامام کے قائل نہ تھے۔  
 حضرت جابر بن عبد اللہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت  
 ابو سعیدؓ، الخدیؓ، حضرت انسؓ، مالکؓ، حضرت عمرؓ بن الخطابؓ، حضرت زید بن ثابتؓ،  
 حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ وغیرہم (منع قرائت خلف الامام بحوالہ  
 ایضاً الادلۃ ص ۱) اور صحیح اسانید کے ساتھ علماء اہل ان اکابر کے آثار نقل کئے جا چکے ہیں کہ یہ  
 جملہ حضرات اہم کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور یہی بات مولانا ندیم حسین صاحبؒ فرماتے ہیں  
 حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا ایک اثر کتاب القراءۃ ص ۱۲۹ و ص ۱۳۰ میں ہے لیکن اس میں محول مدرس ہیں  
 اور غنہ سے روایت کرتے ہیں علاوہ انہی امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ عبد اللہ بن عمرؓ نہیں بلکہ  
 عبد اللہ بن عمرؓ بن العاص ہیں (ص ۱۲۹) اور مستزاد برال اس میں خلف الامام کا جملہ بھی مذکور نہیں ہے  
 لہذا یہ روایت منفرد کے حق میں ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے ابو العالیہؒ نے مکہ مکرمہ میں  
 دریافت کیا کہ کیا میں نماز میں قرأت کیا کروں؟ فرمایا میں بیت اللہ کے رب سے جیسا کہ تہا ہوں کہ نماز  
 میں قرأت نہ کروں ولو بام الکتاب اگرچہ ام القرآن ہی ہو (جزء القراءۃ ص ۱) لیکن اس میں  
 بھی خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ علاوہ ہمیں کتاب القراءۃ ص ۶۵ میں اسی اثر کے آخر میں  
 فاتحۃ الکتاب کے بعد ہاتھ کی زیادت بھی موجود ہے اور یہ زیادت اس بات کو متعین کر  
 کر دیتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کا یہ اثر مقتدی کے حق میں نہیں ہے کیونکہ فریق ثانی کے نزدیک



بھی اس کو مازاد علی الفاتحہ پڑھنے کی گنجائش نہیں ہے اور کتاب القراءۃ ص ۶۷ میں ان کی اسی روایت میں بام الکتاب کے بعد فزائد یا فضاء کی زیادت بھی مروی ہے حضرت ابن عمرؓ سے ایک اثر ان الفاظ سے مروی ہے۔

مسئل ابن عمرؓ عن القراءۃ خلف الامام فقال ما کانوا یرون بأسا ان یقرأ بقلعۃ الکتاب فی نفسہ (جزء القراءۃ ص ۷۱) کہ اپنے دل میں سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔

لیکن اس کی سند میں ایک تو ابو جعفر رازیؒ ہے جس کا نام عیسیٰ بن ماہان ہے جس کا ترجمہ نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ ضعیف ہے اور دوسرا راوی اس سند کا یحییٰ البکاؒ ہے ام احمد، ابو داؤد، البوزعہ اور ابن عدیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں، دارقطنیؒ اس کو ضعیف اور علی بن الجندیؒ اس کو مختلط کہتے ہیں، اردویؒ کہتے ہیں کہ یہ متروک ہے، ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶۹) ام نسائیؒ اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں (ضعفاً صغیراً ص ۵۵) حافظ ابن حجرؒ اس کو ضعیف الحدیث لکھتے ہیں (تقریب ص ۲۹۵) مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ عیسیٰ بن ماہان متکلم فیہ ہے مگر حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ صدوق ہے اس کا حافظ چھانچا نہیں تقریباً ص ۳۲۳ اور یحییٰ البکاؒ کو ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ ہے انشاء اللہ جب راوی مختلف فیہ ہو تو اس کی حدیث حسن ہوتی ہے (محصلہ ص ۳۲۳) الجواب ہاں بس ایسے ہی راویوں کی ایسی ہی حسن قسم کی حدیثوں پر آپ کے مذہب کی بنیاد ہے اور مسلمانوں کی اکثریت کی نمازوں کو باطل اور کالعدم ٹھہرانے والوں کی وکالت فرما رہے ہیں۔ سبحان اللہ تعالیٰ اور آگے لکھتے ہیں کہ تطبیق کی یہی صورت ہے کہ نفی سے مراد جہری نماز میں فاتحہ سے مازاد کی نفی مراد لی جائے اور فاتحہ کو اس نفی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے انتہا ص ۳۲۵ الجواب نہ معلوم یہ حضرات کس روایت کی کس سے تطبیق دے رہے ہیں؟ صحیح اور ضعیف کی تطبیق کا کیا معنی؟ الحاصل حضرت ابن عمرؓ ہوں یا کوئی اور صحابی ہو ان میں کسی سے بسند صحیح یہ ثابت نہیں کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو سورۃ فاتحہ پڑھنی ضروری اور واجب ہے۔

حضرت عبادۃ بن الصامت کا اثر۔

حضرت محمود بن ربیع فرماتے ہیں کہ:-

سمعت عبادۃ بن الصامت یقرأ خلف الامام فقلت له تقرأ خلف الامام فقال عبادۃ لا صلوة الا بقراءة (سنن الکبیری جلد ۲ ص ۱۶۸)

میں نے حضرت عبادۃ کو امام کے پیچھے قرأت کرتے سنا میں نے دریافت کیا کہ آپ امام کے پیچھے قرأت کرتے ہیں؟ حضرت عبادۃ نے فرمایا قرأت کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی۔

امام بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ ان کی ایک اور روایت بھی نقل کی ہے جس میں امام کے پیچھے آہستہ قرأت کرنے کی اجازت ہے اور پھر لکھا ہے۔

ومذهب عبادۃ فی ذلك مشہور (ص ۱۶۸)

حضرت عبادۃ کا مذہب اس میں مشہور و معروف ہے۔

جواب :- سند کے لحاظ سے گو کلام کرنے کی کافی گنجائش ہے مگر ہم سند کے لحاظ سے اس پر کوئی کلام نہیں کرتے حضرت عبادۃ بن الصامت نے صحیح سمجھا یا غلط بہر حال یہ بالکل صحیح بات ہے کہ حضرت عبادۃ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے اور ان کی یہی تحقیق اور یہی مسلک مذہب تھا مگر فہم صحابی اور موقوف صحابی حجت نہیں ہے خصوصاً قرآن کریم، صحیح احادیث اور جمہور حضرات صحابہ کرام کے آثار کے مقابلہ میں لیکن یہ روایت خود اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ حضرت صحابہ کرام اور تابعین میں امام کے پیچھے قرأت کرنے کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور یہ مسلک ان میں رائج بھی نہ تھا ورنہ محمود بن ریح جو خود صغار صحابہ میں تھے حضرت عبادۃ بن الصامت کی امام کے پیچھے قرأت سے کبھی تعجب نہ کرتے اور نہ یہ پوچھنے کی نوبت ہی آتی کہ حضرت آپ امام کے پیچھے کیوں قرأت کرتے ہیں؟ یقینی امر ہے کہ حضرت عبادۃ بن الصامت نے نماز میں تکبیر، قیام، رکوع، سجود، تشهد، اور سلام وغیرہ جملہ امور ادا کئے ہوں گے مگر ان میں سے کسی چیز کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی کہ حضرت آپ نے رکوع کیوں کیا ہے؟ سجود کیوں کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ اگر سوال کیا ہے تو اس چیز کے بارے میں کچھ آپ کے امام کے پیچھے قرأت کیوں کرتے ہیں؟ یہ بھی مت بھولیے کہ حضرت عبادۃ بن الصامت نے محمود بن ریح کو یہ نہیں فرمایا کہ برنحوہ ہمارے تمام سابق نمازیں بے کار کا لعدم اور باطل ہیں کیونکہ تم نے قرأت نہیں کی اور تمام نمازیں واجب الاعادہ ہیں اور نہ سہی تو یہی نماز جو تم نے ابھی ابھی میرے ساتھ بغیر قرأت کے ادا کی ہے وہی دوبارہ پڑھ لو اور لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت محمود بن ریح حضرت عبادۃ کے داماد تھے و تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۶۲، انہوں نے ان کو یہ بھی نہ فرمایا کہ تم امام کے پیچھے ترک قرأت کے مرتکب



ہوئے ہو اور تارکِ قرأت کی نماز باطل اور کالعدم ہے اور من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر  
لہذا میری لختِ جگر کو میرے گھر پہنچا دو اور خود منے اڑاتے پھرو۔ حضرت عبادہؓ وہی جلیل القدر صحابی  
ہیں جو فرماتے ہیں کہ ہم نے جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک پر اس شرط سے  
بیعت کی ہے کہ ان لا تخاف فی اللہ لومة لائمہ (مستدرک وقال صحیح جلد ۳ ص ۳۵۶) اللہ  
تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ہرگز نہ گھبرائیں گے اور ایک معمولی قسم  
کے مسئلہ میں حضرت امیر معاویہؓ سے اُلجھ کر ملک شام ترک کر دیا تھا اور یہ فرمایا کہ ہمارا اجتماع ناممکن ہے  
لیکن حضرت عمرؓ کی زبردست مداخلت سے اپنے ارادہ سے باز آئے (میکھے مستدرک جلد ۳ ص ۳۵۵)۔  
مسند دارمی ص ۳۳ اور ابن ماجہ ص ۷ وغیرہ) مگر جب قرأت خلف الامام کے مسئلہ کی باری آتی ہے تو اپنے  
پڑھنے کی وجہ تو بتلاتے ہیں لیکن اس اہم مسئلہ کے اظہار پر کماحقہ وہ جوش و خروش ظاہر نہیں کرتے جو  
اس کے رکن اور ضروری ہونے پر کرنا چاہیے تھا۔ اگر حضرت عبادہؓ کے نزدیک قرأت خلف الامام واجب  
فرض اور رکن ہوتی تو اس کے اظہار میں پوری قوت اور طاقت صرف کرتے اور اس میں کسی قسم کی کوئی  
کو تاہی نہ کرتے اس بحث کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات بخوبی سمجھ آ سکتی ہے کہ حضرت محمود بن ریح  
مطلقاً امام کے پیچھے قرأت فاتحہ کے قائل نہ تھے اور حضرت عبادہؓ کو قائل تو تھے لیکن محض استحباب کے  
طور پر اور اگر کسی کو حکم بھی کیسا ہے تو صرف استحبابی امر سمجھ کر۔ اگر اس کو رکن اور فرض سمجھتے تو کتمان حق سے  
بچتے ہوئے حضرت ابن مسعودؓ کی طرح (جنہوں نے قرآن کریم کی دوسو تلوں کے تقدم و تأخر فی النزول  
کے بارے میں اعلان کیا تھا) یہ اعلان فرماتے من شاء باہلتہ جس کا جی چاہے میں اس کے ساتھ  
مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہوں جب حضرت عبادہؓ نے ایسا نہیں کیا تو قطعی بات ہے کہ وہ امام کے پیچھے  
بلا شک سورۃ فاتحہ پڑھتے تو تھے (اور جہری نمازوں میں پڑھتے بھی صرف تنہا اور اکیلے تھے دوسرے  
حضرات صحابہؓ کا ان سے اتفاق نہ تھا) مگر صرف مستحب سمجھ کر ہم نے جو یہ کہا ہے کہ دوسرے صحابہؓ کو امام  
حضرت عبادہؓ بن الصامت سے جہری نمازوں میں قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں اتفاق رائے  
نہیں رکھتے تھے، سینہ زوری نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ چنانچہ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ۔

وانما تعجب من تعجب من قرأت عبادہ بن الصامت جو لوگ امام کے پیچھے جہری نمازوں میں قرأت کے قائل  
خلف الامام فیما یجہر فیہ بالقرآن لہذا نہ تھے انہوں نے حضرت عبادہؓ کی جہری نمازوں میں قرأت

من ذهب الى ترك القراءة خلف الامام فيما  
يجهر الامام فيه بالقراءة حين قال النبي  
صلى الله عليه وسلم مالي انا زرع القرآن  
ولو يسمع استثناء النبي صلى الله عليه  
وسلم قراءة فاتحة الكتاب سرًا وقوله  
صلى الله عليه وسلم فاتة لا صلوة لمن  
لم يقرأ بها وسمعه عبادة بن الصامت  
واقته واداه وظهره فوجب الرجوع  
اليه في ذلك (انتهى بلفظه كتاب القراءة ص ۷۷)

پر تعجب کا اظہار کیا اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آنحضرت  
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا کہ میرے ساتھ قرآن  
میں منازعت کیوں کی جا رہی ہے؟ اور اس کے بعد آپ نے  
آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا اور اسی طرح آپ نے یہ  
فرمایا کہ جس آدمی نے نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز  
نہ ہوگی تو یہ استثناء صرف حضرت عبادہ بن الصامت نے  
سُنی اور دیگر حضرات صحابہؓ نہ سُن سکے اور اس کو حضرت  
عبادہؓ نے خوب محفوظ رکھا اس کو ادا کیا اور ظاہر کیا سوائے  
بات کی طرف رجوع کرنا ضروری نہ تھا۔

صحابی اور تارک نماز؟ یہ دو متضاد باتیں ہیں اور واقعہ صبح کی نماز کا ہے جس میں سینکڑوں حضرات  
صحابہؓ شریک ہوں گے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مالی انا زرع القرآن سے تنبیہ فرما کر سب  
حضرات صحابہؓ کو اہم کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی اور یہ حکم بھی پیش نظر تھا۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ  
يَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ اور فَاصْلَحْ بِمَا وَكَّلْنَا بِكَ یعنی اے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم  
اللہ تعالیٰ کے حکموں کو کھول کر بیان کریں جن میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے، مگر بایں ہمہ جناب رسول  
خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ حکم آہستہ (دہرا) بیان کرتے ہیں اور حضرت عبادہؓ کے بغیر اس حکم کو کوئی  
دوسرا سنتا ہی نہیں؟ پھر حضرت عبادہؓ پر لوگ متعجب کیوں نہ ہوں کہ حضرات صحابہؓ کرامؓ جو آنحضرت صلی  
اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک ایک حکم اور ارشاد کو عزیز از جان سمجھتے تھے اور ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے  
کوئی بات نہیں سمجھ آتی تو پھر استدعا کرتے تھے اور کوئی ضروری امر ہوتا تو آپ تین تین مرتبہ ایک ایک  
جملہ کو دہراتے تھے لیکن جب اہم کے پیچھے قرأت سورۃ فاتحہ کے حکم کے بیان کرنے کا فیرا آتا ہے تو  
آپ آہستہ بیان کرتے ہیں؟ تین مرتبہ بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے؟ اور یہ حکم صرف  
حضرت عبادہؓ سنتے ہیں کسی دوسرے کے پٹے کچھ نہیں پڑتا؟ اور دیگر حضرات صحابہؓ کرامؓ آپ سے  
دریافت کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے کہ حضرت آپ نے کیا ارشاد فرمایا ہے؟ اگر اہم کے پیچھے  
سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کا مسئلہ ضروری فرض، واجب اور رکن ہوتا تو یقیناً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم



سلم ایک بار نہ فرماتے بلکہ کئی بار فرماتے سترانہ فرماتے بلکہ جبراً فرماتے صرف حضرت عبادہؓ کو نہ سناتے بلکہ تمام حضرات صحابہؓ کو سناتے اور اگر حضرت عبادہؓ بھی اس حکم کو ضروری سمجھتے تو یقیناً بغیر خوفِ بعدہؓ کے اس کی خوب نشر و اشاعت کرتے اور حضرات صحابہ کرامؓ کو اس بات کا قائل کر لیتے کہ وہ بھی جبری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتے۔ یہ حکم تو ضروری نہ تھا اس لیے اس کی پُر زور اشاعت کی ضرورت ہی انہوں نے نہ سمجھی، بخلاف اس کے ترک قرأت کا حکم ضروری تھا اس لیے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے صرف ایک شخص نے قرأت کی تو آپ نے فرمایا میرے پیچھے کس نے قرأت کی ہے؟ کیوں میرے ساتھ نماز عت اور مخالفت ہوتی رہی ہے؟ حتیٰ کہ آپ نے بیاناگ دہل یا ارشاد فرمایا مالی انا نزع القرآن نتیجہ ہوا کہ یہ ارشاد سب نے سنا اور یہ ارشاد سن کر تمام حضرات صحابہ کرامؓ نے جبری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت ترک کر دی۔ جیسا کہ مفصل پہلے گزر چکا ہے۔ باقی اگر حضرت عبادہؓ سے پسندِ صحیح یا کسی اور صحابی سے بلا قیل وقال خلف الامم کی قید سے کوئی روایت صحیح ہوتی تو یقیناً اس کی طرف رجوع کیا جاتا مگر روایات کا حال آپ ملاحظہ کر ہی چکے ہیں اور بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ حضرت عبادہؓ کے موقفِ قول سے ہی غلطی در غلطی پیدا ہوئی ہے الغرض حضرت صحابہ کرامؓ کے یہ آثار پہلے تو سنداً ہی صحیح نہیں ہیں اور اگر کچھ صحیح بھی ہیں تو ان میں صرف بری نمازوں کا ذکر ہے کسی میں مطلق قرأت کا ذکر ہے اور اکثر میں ما زاد، ما تیسر اور فصاعداً وغیرہ کی زیاد بھی موجود ہے لہذا یہ آثار فریقِ ثانی کو ہرگز مفید نہیں ہو سکتے۔

## آثار حضرات تابعینؓ وغیرہم

فریقِ ثانی نے اپنے اس دعویٰ پر کہ امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے درجہ نماز ناقص، بیکار، کالعدم اور باطل ہوگی، حضرات تابعینؓ و اتباع تابعینؓ وغیرہم کے آثار اور اقوال سے بھی استدلال کیا ہے حالانکہ ان کے نزدیک درموقوفات صحابہؓ حجت نیست اگرچہ بصحت رسد پھر آثار حضرات تابعینؓ وغیرہم سے استدلال کیونکر صحیح ہو سکتا ہے جب کہ وہ سنداً اور روایتاً بھی صحت کے معیار پر پورے نہیں اُترتے اور معنوی اور دلائلی پہلو کے پیش نظر بھی وہ ان کو چنڈاں مفید نہیں ہو سکتے مگر مشور ہے ڈوبتے کو تینکے کا سہارا، حضرات تابعینؓ وغیرہم کے وہ آثار جو بحثِ سنّت

وغیرہ اور دیگر مواقع پر نقل کئے جا چکے ہیں اور جن پر کلام بھی کیا جا چکا ہے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے اس موقع پر صرف وہ آثار پیش ہوں گے جو پہلے نقل نہیں ہوئے۔

حضرت محولہ کا اثر :- ان سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ مغرب عشاء اور صبح کی نمازیں ہر رکعت میں آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھی جائے اور جہری نمازوں میں جب اہم سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد سکوت اختیار کرے تو اس وقت آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھی جائے اور اگر اہم خاموش نہ ہو تو اس کے ساتھ یا اس کے بعد یا اس سے پہلے ہر حالت میں سورۃ فاتحہ پڑھو اور کسی حالت میں نہ چھوڑو (بیہقی جلد ۲ ص ۱۴)

جواب :- یہ اثر بھی قابل التفات نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اگر بالفرض یہ اثر صحیح بھی ہو تب بھی نص قرآنی، صحیح احادیث اور جمہور حضرات صحابہ کرامؓ کے صحیح آثار کے مقابلہ میں اس کو سنتا کون ہے؟ وثانیاً قرأت سورۃ فاتحہ کے لیے سکتے کی کوئی گنجائش نہیں ہے جیسا کہ بحث سکتات اہم میں اس کی سیر حاصل تحقیق پیش ہو چکی ہے اور جہرام کے ساتھ ساتھ پڑھتے جانا مندرجہ اور محبت کا موجب ہے جو کتاب و سنت اور اجماع امت سے مردود ہے۔

حضرت عمرو بن زبیرؓ کا اثر :- ان سے مروی ہے انہوں نے ارشاد فرمایا کہ

لَا تَتَمَصِّلَا لِحَدَمِنَ النَّاسِ لَا يَقْرَأُ فِيهَا كَسِي شَخْصٍ كِي كُوْنِي نَازِئُوْهُ وَهُ فَرَضِيْ هُوَ يَقْلِيْ اِسْ وَقْتُ بِلَفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَصَاعِدًا مَّكْتُوبَةً وَلَا سَبْحَةً تَمَكْمَلُ نِيْلِيْ هُوَ سَجِيْ جَبْ تَمَكْمَلُ اِسْ مِيْنِ سُوْرَةِ فَاتِحَةٍ اُوْر اِسْ سِيْ كُحْرَ زِيَادَةِ كِي قُرْأَتِ ذِكْ جَائِيْ۔ (کتاب القراءة ص ۶)

جواب :- یہ اثر بھی قابل استدلال نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں محمد بن العباسؓ ہے کتب اسماء الرجال سے اس کی تعیین نہیں ہو سکی کہ یہ کون اور کیسا ہے؟ وثانیاً اس میں احمد بن حنبلؓ ہے جس کا کتب رجال میں کوئی نام و نشان ہی نہیں ملتا، مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ مگر عدم علم سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مجہول ہوا ۳۳۹ جواب :- یہ ٹھیک ہے مگر مولف مذکور کا یہ علمی اور اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ اس راوی کی نشاندہی کرتے اور کتب رجال سے اس کی توثیق نقل کرتے وثالثاً اس کی سند میں حماد بن سلمہؓ ہے ان کے اس اثر کا مقابلہ اس اثر سے نہیں ہو سکتا جو جلد اول میں لہجہ صحیح نقل کیا جا چکا ہے مبارکپوری صاحبؓ لکھتے ہیں۔ سو یہ معارضہ بھی صحیح نہیں



ہے کیونکہ اس اثر کی سند میں حماد بن سلمہ واقع ہے آخر میں حافظ متغیر ہو گیا تھا (انتہی بلفظہ تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۸) ورنہ اس اثر میں خلف الامام کا کوئی لفظ نہیں ہے اور مبیحۃ فعلی نماز کا لفظ اس امر کا قوی قرینہ ہے کہ یہ اثر منفرد کے حق میں ہے کیونکہ عام زافل میں جماعت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔  
 وضاحتاً اگر یہ اثر صحیح اور قابل عمل ہے تو سارا ہی صحیح اور قابل عمل ہوگا اور اس میں فصاعداً کی زیادت بھی ہے اس کے علاوہ کتاب القراءة ص ۸۶ و ۸۷ میں بھی فصاعداً کی زیادت مروی ہے حالانکہ فریق ثانی فصاعداً وغیرہ کی زیادت پر عمل پیرا نہیں ہے بلکہ ما زاد کو جائز ہی نہیں سمجھتا۔  
 سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۸ میں بھی یہ روایت ہے اور یہی راوی ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے البتہ اس میں فصاعداً کی زیادت نہیں ہے اور روایت کا مضمون بھی اس سے قدے مختلف ہے کیونکہ اس میں اہم اور سکتہ کا ذکر ہے لیکن ایک تو سکتہ کا حکم آپ کو معلوم ہے اور دوسرے ان کے دیگر آثار میں فصاعداً کی زیادت بھی نظر انداز نہیں ہو سکتی۔

حضرت حسن بصریؒ کا اثر :- ان سے مروی ہے انہوں نے فرمایا۔ اقرأ خلف الامام فی کل صلوۃ بفاتحة الكتاب فی نفسک (کتاب القراءة ص ۱۸) والسنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۸ کہ امام کے پیچھے ہر نماز میں اپنے دل میں آہستہ سورت فاتحہ پڑھا کر اور

جواب :- اس اثر میں بھی محمد بن العباسؒ ہے معلوم نہیں وہ کون اور کیسا ہے؛ بخلاف اس کے جلد اول میں بسند صحیح و اذقوی القرآن الآتہ کی تفسیر میں ان کا اثر اس کے برعکس نقل کیا جا چکا ہے۔ چونکہ وہی اثر صحیح ہے اور قرآن کریم صحیح احادیث اور مجہور حضرات صحابہ و تابعین کے مسند کے عین مطابق ہے لہذا وہی قابل اخذ ہے اس کی یہ تاویل جو مولف خیر الکلام نے (ص ۳۷) میں کی ہے کہ مقتدی کو اہم کے پیچھے بلند آواز سے پڑھنے اور شور ڈالنے سے منع کیا گیا ہے (مصلیٰ بالکل ان کے قول کی تحریف ہے۔ کیونکہ حسن بصریؒ اہم کے پیچھے کسی قسم کی قرأت کے قائل نہ تھے وہ تو آیت و اذقوی الآتہ کو خلف الامام کے بارے میں مانتے ہیں جس میں استماع و انصات کا وجوبی حکم ہے جیسا کہ تفصیل کے ساتھ جلد اول میں گزر چکا ہے۔

حضرت اہم شعبیؒ کا اثر :- مالک بن مغولؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اہم شعبیؒ کو سنا یحسن القداء خلف الامام رسنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۸ و کتاب القراءة ص ۱۸ کہ وہ اہم کے پیچھے قرأت

کو پسند کرتے تھے۔

جواب :- یہ اثر بھی قابل احتجاج نہیں اؤلا اس کی سندیں ابو جہر بہاریؒ ہے اور گذر چکا ہے کہ وہ کذاب تھا و ثانیاً اس اثر میں مطلق قرأت کا ذکر ہے اور فریق ثانی کا دعویٰ خاص سورہ فاتحہ سے متعلق ہے امام شعبیؒ کا ایک دوسرا اثر اس طرح مروی ہے انہوں نے فرمایا یعنی یقول اقل فی خمسین یقول الصلوات کلمہ (بیہقی جلد ۲ ص ۱۷۸) پانچوں نمازوں میں قرأت کرنی چاہیے۔ لیکن اس کی سند میں بھی وہی ابو جہر بہاریؒ ہے علاوہ ازیں اس میں اسمعیل بن ابی خالدؒ بھی ہے جن کی نقل ہی کوئی ہونے کے لحاظ سے مؤلف خیر الکلام کے نزدیک صحیح نہیں ہے کما مرقہ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ بسا اوقات یہ امام شعبیؒ سے ارسال بھی کرتے تھے اور یحییٰ بن سعیدؒ فرماتے ہیں کہ ان کی مرسل روایتیں محض ایچ ہیں (تذیب التذیب جلد ۲ ص ۲۹) ان کی ایک اور روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ظہر اور عصر کی پہلی دونوں رکعتوں میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی اور سورت بھی اور پچھلی دونوں رکعتوں میں صرف سورہ فاتحہ پڑھنی چاہیے (بیہقی جلد ۲ ص ۱۷۸) اگر یہ اثر صحیح بھی ہو تب بھی فریق ثانی کو مفید نہیں ہے کیونکہ اس میں صرف ظہر اور عصر کی قید ہے اور سورہ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا بھی صریح ذکر ہے حالانکہ ان کا دعویٰ تمام نمازوں میں قرأت کا ہے اور ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت کو وہ جانتے ہی نہیں سمجھتا مؤلف خیر الکلام کا اس اثر کو روای کے مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے حسن قرار دینا (دیکھئے ص ۳۴) مضحکہ خیز ہے اور وہ اکثر اسی قاعدہ کے سہارا پر چلتے ہیں فواصفنا

حضرت امام اوزاعیؒ کا اثر :- امام بیہقیؒ اپنی سند کے ساتھ امام موصوفؒ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ امام کو سورت فاتحہ کی قرأت کے بعد سکوت کرنا چاہیے تاکہ مقتدی سورہ فاتحہ پڑھ لیں اور اگر وہ سکوت نہ کرے تو قراءۃ بفاتحۃ الکتاب اذا قراہا ہا واسرع القراءة ثم استمع (کتاب القراءة ص ۱) اس کے ساتھ ساتھ سورہ فاتحہ کی قرأت کر لی جائے اور عبدی سے قرأت کر چکنے کے بعد پھر استماع اور توجہ کیجئے۔

جواب :- اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ اس کی سند کیسی ہے؟ اور یہ صحیح بھی ہو تب بھی قرآن کریم صحیح احادیث اور حضرات صحابہ کرام کے صحیح آثار کے مقابلہ میں یہ کیونکر حجت ہے؟



اور جلد اول کے مقدمہ میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابن قدامہؒ کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ جو حضرات ائمہ کرامؒ امام کے پیچھے ترک قرأت کی وجہ سے نماز کو باطل اور فاسد نہیں سمجھتے تھے ان میں حضرت امام اوزاعیؒ بھی ہیں اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ امام کے پیچھے قرأت کو صرف مستحب سمجھتے تھے وجوب کے قائل نہ تھے اور فریق ثانی کا دعویٰ بڑا سنگین ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

حضرت مجاہدؒ کا اثر :- امام بخاریؒ نقل کرتے ہیں :-

قال مجاهد اذا لم يقرأ خلف الامام مجاہد نے فرمایا جس نے امام کے پیچھے قرأت نہ کی تو اس اعاد الصلوۃ (جزء القراءة ص ۹) کو نماز دہرائی چاہیے۔

جواب :- حضرت امام بخاریؒ نے اس کی کوئی سند نقل نہیں کی اور بغیر سند کے ایسا سنگین جزم کون سنتا ہے خصوصاً قرآن کریم اور صحیح احادیث کے مقابلہ میں اور پھر یہ قرأت بھی محمل ہے اس میں سورۃ فاتحہ کا کوئی ذکر نہیں ہے اور جلد اول میں بسند صحیح مجاہدؒ کا اثر اور آیت کا شان نزول اس کے خلاف عرض کیا جا چکا ہے۔

حضرت قاسم بن محمدؒ کا اثر :- ان سے مروی ہے انہوں نے ارشاد فرمایا :-

كان رجال ائمة يقرؤون خلف الامام کہ بڑے بڑے امام، امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے (کتاب القراءة ص ۱۲ جزء القراءة ص ۱۲ سنن الکبریٰ ص ۱۲) تھے۔

جواب :- یہ اثر بھی حجت نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں اسامہؓ ہے امام احمدؒ ان کو لیس بشیئہ کہتے ہیں نہائیؒ ان کو لیس بالقوی کہتے ہیں ابو حاتمؒ کہتے ہیں ان سے احتجاج صحیح نہیں ہے امام یحییٰ بن سعیدؒ نے ان کو ضعیف سمجھ کر بالآخر مطلقاً ترک کر دیا تھا امام ابن معینؒ کہتے ہیں کہ ان کی احادیث کا محدثین نے انکار کیا ہے اور وہ ان کے مناکیر میں شمار کی ہیں امام دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ جب انہوں نے عطارؒ کے طریق سے جابرؒ کی یہ روایت مرفوعاً بیان کی منحنی کلمہ منحدریٰ یعنی قربانی چاروں تک جائز ہے اور غیر مقلدین حضرات کا اس پر عمل اس پر راقم الحروف کا رسالہ مسئلہ قربانی دیکھئے تو امام یحییٰ بن سعیدؒ نے فرمایا تم گواہ ہو جاؤ کہ میں نے اس کی حدیث بالکل ترک کر دی ہے امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ اسی حدیث کی وجہ سے امام بخاریؒ نے اس

کو تسلیم کر دیا تھا (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۲۹) و ثانیاً اس میں سورۃ فاتحہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے اور بغیر اس کے فریق ثانی کا مدعی اصل نہیں ہو سکتا و ثالثاً بسند صحیح جلد اول میں حضرت قاسم بن محمد کا اثر نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ جہری نمازوں میں اہم کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔

قاریین کرام! آپ نے آثار حضرت تابعین وغیرہم کی حقیقت بھی معلوم کر لی ہے کہ ان میں اکثر و بیشتر سند کے لحاظ سے ضعیف اور کمزور ہیں اور بعض میں ظہر اور عصر کی نماز کی تخصیص ہے اور بعض میں فصحاء اور سورت وغیرہ کی زیادت بھی ساتھ ہی موجود ہے اور بعض میں مطلق قرأت کا ذکر ہے مخصوص طور پر سورۃ فاتحہ کا ذکر ان میں نہیں ہے اور ان واضح اور غیر مبہم قرآن کے ہوتے ہوئے فریق ثانی کا دعویٰ یقیناً باطل ہو جاتا ہے ان آثار کے علاوہ بعض اور بھی ہیں لیکن نہ ان کا سر ہے نہ پاؤں لہذا ایسے بے سرو پا اور بے اصل اور غیر مستند آثار کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ اس لیے ان کے نقل کرنے اور پھر ان کا جواب دینے کی کوئی حاجت معلوم نہیں ہوتی خلاصہ اس یہ ہے کہ جمہور نے جو روایات و آثار اپنے استدلال میں پیش کئے ہیں ان میں سچا نوٹھے فیصدی راوی ثقہ ثبت اور حجت ہیں اور تقریباً پانچ فیصدی راوی متکلم فیہ ہیں لیکن جمہور اکثر جرح و تعدیل ان کی بھی توثیق کرتے ہیں بخلاف اس کے جن روایات اور آثار سے فریق ثانی نے استدلال کیا ہے ان میں تقریباً سچا نوٹھے فیصدی راوی کذاب، دجال، مجہول، مترکک، مستور، لیس، بشقۃ، لیس بالقوی، لا یحتج بہ اور کشیں التذلیس والارسال وغیرہ اوصاف سے موصوف ہیں اور پانچ فیصدی ایسے ہیں جو ثقہ ہیں مگر جرح سے خالی نہیں ہیں اور یہ بھی آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ جن روایات میں فصحاء، ماتیسر، ما زاد اور الا ولاء الامام کی زیادت موجود ہے ان کے علاوہ اور کوئی روایت صحیح نہیں ہے اور خاص طور پر وہ روایات جن میں خلف الامام اور الا بفاتحۃ الكتاب کی قید موجود ہے وہ تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہیں تو ان ضعیف احادیث سے شریعت کے روئے صحیح نمازیں کیونکر باطل، بیکار، ناقص اور کالعدم ہو سکتی ہیں؟ اور ایسی ضعیف روایات و آثار پر بنیاد رکھ کر مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ کی فرضیت اور رکعت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟ اور حنفیوں کو مفیدین صلوٰۃ کا خسروانہ خطاب کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ اور ان کی بیبیوں سے بغیر ان کے خاوندوں کے طلاق دینے اور عدت گزارنے نکاح کیسے درست ہو سکتا ہے؟



## چوتھا باب قیاسی دلائل

فریق ثانی نے قرآن کریم کی جن آیات سے اہم کے پیچھے قرأت سورہ فاتحہ پر استدلال کیا ہے اس کی حقیقت آپ معلوم کر چکے ہیں کہ ان آیات سے ان کا استدلال تو نہیں ہو سکتا البتہ انہوں نے بعض آیات سے غلط استدلال اور بعض میں تفسیر بالرائے کا ارتکاب ضرور کیا ہے اسی طرح آپ یہ بھی معلوم کر گئے ہیں کہ بغیر ان روایات کے جن میں فصحاء، ماترین اور مازاد وغیرہ کی زیادت اور اِلَّا وَرَاءَ الْاِمَامِ کی استثناء موجود ہے اور کوئی روایت صحیح نہیں ہے اور خاص طور پر وہ روایات جن میں خلف الائم کی قید اور اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وغیرہ کی استثناء ہے وہ تو انتہائی درجہ کی ضعیف، معلول اور کمزور ہیں اور ان کی اسانید پر جو جرح اور کلام کیا گیا ہے وہ کتب اسماء الرجال اور فریق ثانی کے مسلم اور طے شدہ قواعد کے لحاظ سے واضح دلائل سے کیا گیا ہے جس سے ان کو کوئی مفر نہیں ہے نیز آثار حضرت صحابہ کرام و تابعین وغیرہم پر جو تنقید کی گئی ہے وہ بھی حضرات محدثین کرام اور خاص طور پر فریق ثانی کے مسلمات کے عین مطابق ہے اور کوئی بات حوالہ کے بغیر نہیں کہی گئی ہے اب اس باب میں ان کا قیاس اور اجتہاد بھی ملاحظہ کر لیجئے۔

### پہلی قیاسی دلیل

اہم دارقطنیؒ اور امام بیہقیؒ وغیرہ اپنی سند سے یہ مرفوع روایت نقل کرتے ہیں اِلَّا مَامُ ضَامِنٌ فَاَصْنَعُ فَاَصْنَعُوا (دارقطنی جلد ۱۲ و کتاب القراءۃ ص ۵۸) امام ضامنؒ ہے جو وہ کرے سو تم بھی کرو اور یہ روایت مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۶۶ وغیرہ میں بھی مذکور ہے امام بیہقیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ جبری نمازوں میں ہمارا مشاہدہ ہے اور سب سے بھی ہمیں یقین ہے کہ امام سورہ فاتحہ پڑھتا ہے

اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو تمہارا امام کرے سو وہ تم بھی کرو لہذا ہمیں بھی سورہ فاتحہ پڑھنا ہوگی۔

جواب : نہ تو یہ روایت صحیح ہے اور نہ یہ قیاس صحیح ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں موسیٰ بن شیبہ ہے امام احمد اس کو ضعیف کہتے ہیں (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۶۶) نیز یہ مندرجہ بالا احادیث مناکبہ اس کی روایتیں منکر ہیں۔ نیز ان جلد ۳ ص ۲۱۱) حافظ ابن حجرہ لکھتے ہیں لین الحدیث (تقدیب ص ۳۶) کہ حدیث میں وہ ضعیف ہے اور ثانیاً اس لیے کہ معنی تو یہ ہیں کہ قابل اقتدار امور میں امام کی مخالفت نہ کی جائے بلکہ جو کچھ وہ کرے سو تم بھی کرو یہ مطلب تو ہرگز صحیح نہیں کہ جو امام کرے وہ تم بھی کرو ورنہ امام نے یہ کیا ہے کہ مقتدیوں کے آگے کھڑا ہوا ہے بلند آواز سے تکبیر کہتا ہے سمیع اللہ لمن حمدہ اور سلام کہتا ہے جہر سے قرأت کرتا ہے اور سورہ فاتحہ کے بعد کی لمبی لمبی سورتیں پڑھتا ہے تو کیا یہ سب کچھ مقتدی بھی کر سکتے ہیں؟ اس قیاس کے رُو سے مقتدیوں کو چاہیے کہ جیسے امام مقتدیوں کے آگے کھڑا ہوا ہے وہ بھی آگے نکل جائیں حتیٰ کہ امام بیچارہ بھی منہ تکتا رہ جائے اور امام کی طرح مقتدی بھی جہر سے قرأت کریں حتیٰ کہ مسجد گونج اٹھے اور کان پڑھ ہی قرأت نہ سنائی دے اور لطف کی بات یہ ہے ہا زاد علی الفاتحۃ میں بھی جیسا امام نے کیا ہے ویسا ہی کرنا ہوگا آخر حدیث کے الفاظ ہیں فاصنعوا کما صنع الامام (او کما قال) اس کی مخالفت کون کر سکتا ہے؟ علاوہ ازیں اگر یہ روایت صحیح بھی ہو تو اس میں قرأت کا کوئی لفظ نہیں بلکہ صنع (صنعت) کا ذکر ہے جو عملی کارروائی پر اطلاق کیا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ امام قیام کرے تم بھی قیام کرو، امام رکوع کرے تم بھی رکوع کرو، امام سجدہ کرے تم بھی سجدہ کرو وغیرہ وغیرہ عملی طور پر اس کی مخالفت نہ کرو، یہی قولی بات تو اس کے متعلق ارشاد یہ ہے اذا قرا فانصتوا جب امام پڑھے تو تم خاموش رہو غرضیکہ اس روایت سے مقتدیوں کے لیے سورہ فاتحہ کی قرأت پر استدلال کرنا ردیہ ودرایتہ باطل ہے۔

دوسری قیاسی دلیل

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اَلْمُصَلِّيُ مَنَاجِحُ رَبِّکَ نمازی اپنے رب سے مناجات کرتا ہے۔



اور مناجات نطق سے ہوتی ہے سوکت سے نہیں ہوتی معلوم ہوا کہ مقتدی کو امام کے پیچھے  
سورت فاتحہ پڑھنی چاہیے (محصلاً کتاب القراءۃ ص ۵۶)

جواب :- امام بیہقیؒ ہی ازراہ انصاف فرماتے ہیں کہ کیا یہ مناجات صرف سورۃ فاتحہ کی مختصر سی سنت  
آیتوں سے ہی ہو سکتی ہے قرآن کریم کی باقی ایک سو تیرہ سورتوں سے مناجات نہیں ہو سکتی؟ اور کیا خدا تعالیٰ  
کی مناجات کا وقت صرف سورۃ فاتحہ کے وقفہ تک محدود ہے اس کے بعد سورۃ بقرہ جیسی طویل سورتوں  
کے وقفہ میں خدا تعالیٰ کی مناجات کی ضرورت باقی نہیں رہتی؟ اور یہ آداب مناجات کا کوئی ناسپلو اور طریقہ  
ہے کہ وفد کا امیر اور پارٹی کالیڈر (امام) جب قوم کی نمائندگی کرتا ہے تو ہر طرف سے محفل اور مجلس کے آداب  
سے قطع نظر کرتے ہوئے وفد کا ایک ایک رکن درخواست کا ایک ایک لفظ دہراتا ہے؟ ہاں یہ ضروری  
ہے کہ سب اپنے نمائندہ کی آئین کہتے ہوئے تائید کریں لیکن جس سچی سرکار سے نمازیں مناجات ہوتی ہے  
وہ تو دلوں کے بھیدوں سے بخوبی واقف ہے اور وہ بے ریا اور مخفی دعا کو زیادہ پسند کرتی ہے اس  
لیے امام کی آہستہ آہستہ تائید زیادہ بہتر اور جن ہوگی اور مناجات اور درخواست کے پیش کرنے کے لیے  
امام ہی کافی ہوگا۔

### تیسری قیاسی دلیل

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ایک روایت آتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے نماز میں کلام  
کیا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نماز میں گفتگو اور کلام نہیں کرنا چاہیے نماز تو تسبیح  
تکبیر اور تلاوت قرآن کا نام ہے۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی کو امام کے پیچھے  
(سورۃ فاتحہ کی) قرأت کرنی چاہیے۔ (محصلاً کتاب القراءۃ ص ۵۶)

جواب :- امام بیہقیؒ کا یہ قیاس بھی مردود ہے اولاً اس لیے کہ نماز میں تلاوت قرآن باقاعدہ  
ہوتی ہے اور امام قرآن کریم پڑھتا ہے مقتدیوں کا فریضہ تلاوت نہیں بلکہ استماع اور انصات ہے  
جیسا کہ نص قرآنی اور صحیح احادیث سے معلوم ہو چکا ہے وثانیاً کیا تلاوت قرآن کا اطلاق صرف  
سورۃ فاتحہ پر ہی ہوتا ہے اور مازد علی الفاتحہ میں قرآن کریم کی تلاوت نہیں ہے؟ پھر دوسرے  
حضرات عموماً اور حضرت امام بیہقیؒ خصوصاً کیوں یہ فرماتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ کے علاوہ مقتدی کے لیے  
کسی اور قرأت کی اجازت نہیں ہے اور یہ حدیث فلا تَقْرَأُوا بَشَیْئًا مِنَ الْقُرْآنِ کے تحت ممنوع ہے؟

## چوتھی قیاسی دلیل

اہم بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس مضمون کی ایک حدیث آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک شخص سے دریافت فرمایا تم کس طرح نماز پڑھتے ہو اُس نے جواب دیا میں فاتحۃ الكتاب پڑھتا ہوں جنت کا سوال کرتا ہوں، دوزخ سے پناہ مانگتا ہوں اور مجھے معلوم نہیں آپ کا طریقہ اس میں کیا ہے؟ اہم بیہقیؒ فرماتے ہیں اس میں اہم و مقتدی کی کوئی قید نہیں لہذا اس سے مقتدی کے لیے بھی قرآن ثابت ہو گئی۔ (کتاب القراءۃ ص ۵)

جواب :- اگر یہ روایت صحیح ہے تو اتنی طویل مسافت طے کرنے اور چکر کاٹنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ کیوں نہ ہو جائے کہ یہ روایت صرف منفرد کے حق میں ہو اور وہ بھی محض نفلی نماز میں جیسا کہ ابوداؤد جلد ۱۸ وغیرہ ہی کی ایک روایت اس کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صلوۃ تطوع (نفلی نماز) میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّرِّ وغیرہ پڑھا کرتے تھے، چونکہ اس روایت میں خلف الامم کی کوئی قید نہیں اس لیے یہی بات متعین ہے کہ یہ حکم منفرد کے لیے ہو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صاف اور صریح الفاظ میں یہ ارشاد فرمایا ہے اِذَا قَرَأْتَ فَانصِتْ وَاجِب اہم قرآن کرے تو تم خاموش رہو اور یہ محال ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دو متضاد حکم صادر فرمائیں کہنے والے نے کیا ہی سچ کہا ہے۔

نمی باشد مخالفت قول و فعل راستاں باہم

کہ گفتار قلم باشد ز رفتار قلم پیدا

یہ ہیں وہ قیاسات جو حضرت اہم بیہقیؒ وغیرہ نے مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ پڑھنے پر پیش کئے ہیں حضرت امام بخاریؒ نے جو قیاسات کئے ہیں وہ ان سے بھی عجیب تر ہیں جن کی پوری تشریح جلد اول میں قرآن کریم کی آیت کے تحت نقل کر کے ان کے جوابات دیے گئے ہیں اور قرآن کریم کی آیات سے جو قیاسات کئے گئے ہیں ان کے جوابات بھی باب اول میں عرض کر دیے گئے ہیں اور باقی جو قیاسات پیش کئے گئے ہیں وہ ضعیف، کمزور اور بے کار ہیں، اس لیے وہ قابل التفات ہی نہیں ہیں الغرض حق اور منصور مسلک صرف یہی ہے کہ امام کے پیچھے ساری نمازیں ہوں یا جہری کسی نماز میں کسی قسم کی قرأت ٹھوگا اور سورۃ فاتحہ کی قرأت خصوصاً ممنوع ہے قرآن کریم صحیح احادیث آثار حضرات صحابہ کرام



وَابْعِیْنِ وَاَتْبَاعِیْنِ اور دیگر جمہور اہل اسلام کا یہی مسلک ہے اور ہماری نمازوں میں ترک قرآن خلف  
الام کا مسلک حضرات ائمہ اربعہ اور دیگر بالغ نظر حضرات فقہائے اہل سنت کا متفق علیہ مسلک ہے  
اور فریق ثانی کا یہ دعویٰ ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے  
کا عدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے (بلفظہ) قطعاً مردود اور باطل ہے اس دعویٰ پر ان کے پاس  
ایک بھی صحیح صریح اور مرفوع حدیث موجود نہیں ہے اور اس کے خلاف جمہور علماء کا عموماً اور احناف کا دامن  
بخصوصاً احادیث اور دلائل سے مالا مال اور پُر ہے مگر فریق ثانی کا تعصب اور عناد دیکھئے کہ صحیح حدیثوں  
کو ٹھکراتے ہوئے بھی وہ اہل حدیث ہیں اور ہم لوگ صرف اہل الرائے ہیں اور صرف فقہ اور اماموں کے ماننے  
والے ہیں تعصب کی اس سے بدترین مثال شاید ہی دنیا میں کوئی اور موجود ہوگی باوجودیکہ فریق ثانی کا دامن  
مسئلہ زیر بحث میں دلائل سے یکسر خالی ہے مگر ہم پھر بھی ان کی قدر کرنے ہیں اور کوئی ایسا لفظ جو موسوم تکفیر  
ہو کہنے کے لیے تیار نہیں ہے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کے حق میں کیا ہی خوب  
ارشاد فرمایا ہے کہ گو آپ صاحب کیسی ہی بدزبانی سے پیش آویں مگر ہم انشاء اللہ تعالیٰ کلمات موسوم  
تکفیر و تفسیق بر گزشتہ آپ کی شان میں نہ کہیں گے بلکہ اللہ آپ کے اسلام ہی کا اظہار کریں گے ولنفعہ ما قبل  
اگر خواندی مرا کا فر عنی نیست چراغ کذب را بنود فروغی  
مسلمات بگویم در جوابش دہم شیرت بجائے ترش دوغی  
اگر خود مومنی نہی و مگر نہ  
دروغی را جزا باشد دروغی (ایضاح الادلۃ ص ۷)

راقم الحروف نے ایک مجلس کی تین طلاقیں پر عمدۃ الاثاث ملحق حکم طلاقات الثلاث  
اور مسئلہ تقلید پر الکلام المفید اور اسی طرح مسئلہ تراویح اور رفع یدین وغیرہ پر پٹوس معلومات یکجا  
کئے ہیں اور ان کی ترتیب دی جا رہی ہے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اشاعت کے اسباب بھی پیدا کرے۔  
آخر میں ہم پھر یہ گزارش کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت امام بخاری، حضرت امام بیہقی، اور امام قسطلی  
وغیرہ کے پیش کردہ دلائل پر جو گرفت کی ہے تو اس سے مقصد صرف ان کے دلائل کی خامی کا اظہار ہے  
ورنہ خدا تعالیٰ شام ہے کہ ہمارے دل میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے  
علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی کتاب طبع ہو کر حق پڑے ہی عرصہ میں ختم ہو گئی ہے اب طبع سوم کی تیسری جلد ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔

اپنی وسعت اور طاقت کے مطابق احادیث اور دین کی بڑی خدمت کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ معصوم  
 صرف حضرات انبیاء کریم علیہم السلام ہی ہوتے ہیں اور فریق ثانی کی خدمت میں نہایت ہی ادب سے  
 مخلصانہ اپیل ہے کہ وہ اپنے اس غلو سے باز آجائے اور تمام مسلمانوں کی صحیح نمازوں کو ناقص، کالعدم  
 اور باطل نہ ٹھہرائے۔ اللہ تعالیٰ ان کو حق کے قبول کرنے کی توفیق دے اور ہمیں بھی حق پر ثابت قدم رکھے  
 یہی دل ناتواں کی دیرینہ آرزو ہے اور اسی پر دائم و قائم رہنے کی دلی خواہش ہے۔

یہ دیکھ کر میرا دیدہ نہ سمجھ لو خود حالِ قلب مضطر  
 کہ ہوگا کس جوش میں سمندر جو یہ تلاطم بجا میں ہے

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد خاتم النبیین و امام الرسل و سید  
 ولد آدم و علی آلہ و اصحابہ و جمیع امتہ الی یوم القیمۃ آمین ثم آمین

ابوالنہاد

محمد سرفراز خاں صفدر خطیب جامع گکھڑ

ضلع گوجرانوالہ (پاکستان)

۹ جمادی الاخریٰ ۱۴۴۲ھ ۳ فروری ۱۹۵۵ء





وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (القرآن)  
 وَكَذَا لَامُ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ / الإجماع على أنها نزلت في الصلوة. (فتاوى ابن تيمية ١٣٣/٢)  
 وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَمِعُوا لَهُ -  
 (مسلم ١٤٢/١ ، والبغوات ١٣٣/٢)

مقدمہ

# تدقيق الكلام

از: شیخ الحدیث حضرت مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خان صفدر دام مجدم

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دام مجدم کے استاد و معتمد جامع المقبول و المنقول حضرت مولانا عبدالقدیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق شیخ الحدیث مدرسہ تعلیم القرآن راجہ بازار راوالپنڈی نے مسئلہ قاسمہ خلف الامام پر علمی و تحقیقی کتاب تدقیق الکلام تصنیف فرمائی جو دو جلدوں میں کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راوالپنڈی نے شائع کی۔ اس سے کتاب میں مؤلف خیر الکلام و مؤلف توضیح الکلام کے شکوک و شبہات کا علمی انداز میں جواب دیا گیا ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ حضرت شیخ الحدیث صاحب دام مجدم نے تحریر فرمایا تھا۔ اس مقدمہ میں بیان کردہ بحث کا احسن الکلام کی مباحث سے گہر التعلق ہے جس کی وجہ سے بہت سے اہل علم حضرات نے فرمائش کی کہ اس مقدمہ کو احسن الکلام کے ساتھ بھی شائع کیا جائے تو ان حضرات کی فرمائش کا احترام کرتے ہوئے اس مقدمہ کو احسن الکلام کیساتھ شائع کیا جا رہا ہے (بشکریہ نامہ تدقیق الکلام)

حافظ عبد القدوس خان قاری

# مقدمہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ  
 اَمَّا بَعْدُ ؟ مذہب اسلام کے مسائل اصولاً دو حصوں میں منقسم ہیں۔ (۱) اصول،  
 (۲) فروع۔ اصول دین میں اختلاف انتہائی مذموم اور قبیح ہے اور اس اختلاف کی وجہ  
 آدمی یا تو سرے سے دین ہی سے خارج ہو جاتا ہے اور یا اہل حق سے کٹ اور ہٹ  
 کر اہل بدعت کے فرقوں میں شامل ہو جاتا ہے اور فروع دین میں اختلاف اگر مجتہد سے  
 رونا ہو تو وہ معذور بلکہ مأجور ہوگا اور اگر غیر مجتہد یہ کاروائی کرے اور اس میں تعصب مذہبی  
 بھی شامل ہو تو وہ گنہگار ہوگا۔ حضرات ائمہ دینؒ کے فرعی اختلافات سے جو خالص نیت  
 اور خلوص نیت پر مبنی ہیں۔ کتب فقہ، شرح حدیث اور کتب تفسیر بھری پڑی ہیں۔ ان  
 اختلافی اور فروعی مسائل میں سے ایک مسئلہ قرأت یا ترک القرأت خلف الامام کا بھی ہے  
 جو حد نبوت سے تاہنوز اختلافی چلا آ رہا ہے۔ ہر فریق اپنی علمی تحقیق پر عمل کرتا رہا، کرتا  
 ہے اور کرتا رہے گا۔ مگر غیر مقلدین حضرات نے اس میں بھی نہایت غلو اور تعصب کا مظاہرہ  
 کیا اور تمام دنیا کے احناف کثر اللہ تعالیٰ جماعہ عظم کو چیلنج کیا اور ان کی نماز کو باطل بلکہ کار  
 اور کالعدم قرار دے کر ان کو فی السار والسقر تک کا حکم خسروانہ سنایا ان کے یہ باطل  
 دعاوی اور ان کے الفاظ سبب تالیف احسن الکلام میں مذکور ہیں وہاں ہی ان کو  
 دیکھ لیا جائے۔ الحمد للہ تعالیٰ احسن الکلام کے مضبوط اور واضح دلائل اور حوالوں کا یہ اثر  
 ہوا کہ مصنف خیر الکلام اور مؤلف توفیح الکلام یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ہمارا تو یہ مسلک  
 ہے کہ فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ فروعی اختلافی ہونے کی بنا پر اجتہادی ہے پس جو شخص  
 حتیٰ الامکان تحقیق کرے اور یہ سمجھے کہ فاتحہ فرض نہیں خواہ نماز جبری ہو یا سبزی، اپنی تحقیق



پر عمل کرے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ ذخیر الکلام ص ۳۳۲ و توضیح الکلام ص ۴۵۸ کاش کہ یہ حضرات پہلے ہی اس حق گوئی سے کام لیتے اور اپنے غالی دوستوں کو چیلنج بازی اور احزاب کی صحیح نماز کے باطل بے کار اور کالعدم ہونے کے ناروا فتویٰ سے باز رکھتے تو ہمیں احسن الکلام لکھنے کی سرے سے ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ بفضلہ تعالیٰ یہ احسن الکلام کے ٹھوس اور محکم دلائل ہی کا نتیجہ ہے کہ ان حضرات نے ترک القراءت خلف الامام کر لے والوں کی نماز کے باطل نہ ہونے کا اقرار کیا۔ ورنہ غیر مقلدین حضرات کبھی کھلے لفظوں میں اپنی شکست فاش کو تسلیم نہ کرتے اور نہ یہ ان کا شیوہ اور عادت ہے۔ اس عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ جن آیات اور احادیث کو وہ قراءت خلف الامام کے سلسلہ میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں وہ نقص اور قطعیت کے ساتھ ان کے نزدیک بھی اس دعویٰ پر دال نہیں ہیں ورنہ وہ اس مسئلہ کو اجتہادی مسئلہ کبھی نہ کہتے کیونکہ اجتہاد وہاں ہوتا ہے جہاں صراحت نہ ہو اور ان حضرات کا اس مسئلہ کو اجتہادی کہنا ہی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ صریح، صحیح اور منطوق طور پر ان کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے چھی تو یہ مسئلہ ان کے نزدیک اجتہادی ہے لہذا آیات و احادیث کو ترک کرنے کا احناف پر الزام اور طعن بالکل بے جا ہے اس لیے کہ بقول ان حضرات کے احناف نے ان دلائل اور احادیث کو ترک نہیں کیا۔ بلکہ ان کے اس مفہوم اور معنی کو ترک کیا ہے۔ جس کو مجوزین حضرات اپنے اجتہادی رنگ میں اپناتے ہیں اور اس کے برعکس احناف نقص قطعی اور صریح و صحیح احادیث سے مقتدی کا وظیفہ ترک القراءت خلف الامام بتاتے ہیں جیسا کہ پیش نظر کتاب تدقیق الکلام میں اس کی محققانہ و علمانہ بحث کی گئی ہے۔ لہذا مصنف خیر الکلام اور مؤلف توضیح الکلام کا چند آیات و احادیث کو پیش کر کے احناف پر طعن و الزام قائم کرنا کہ ہمارے پاس تو یہ یہ دلائل ہیں اور احناف ان کے قائل نہیں محض تفسیع وقت اور سمع خراشی ہے اس لیے کہ وہ تو ان کے نزدیک بھی ان کے مدعی پر نقص قطعی نہیں۔ ورنہ وہ اس مسئلہ کو اجتہادی کبھی نہ کہتے :

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے سستی میں فقہہ مصلحت بین سے وہ رند بادہ خوار اچھا

## مؤلف توضیح الکلام کی لائبریری

موصوف لکھتے ہیں کہ امام بخاری سے لے کر دور قریب کے محققین علمائے اہل حدیث تک کسی کی تصنیف میں یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ فاتحہ نہ پڑھنے والے کی نماز باطل ہے۔ وہ بے نماز ہے وغیرہ (توضیح الکلام ص ۴۳)۔ بجائے اس کے کہ ہم طویل راستہ اختیار کریں اختصاراً صرف دور حاضر کے بعض غیر مقلدین حضرات کی چند کتابوں کے حوالے ہی عرض کرتے ہیں۔ غور فرمائیں کہ انھوں نے کیا کہا؟

(۱) پہلے باب میں احادیث صحیحہ صریحہ سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے الحمد پڑھنا واجب ہے بغیر الحمد پڑھے اس کی نماز درست نہیں۔ (تحقیق الکلام ص ۱۲۱) ظاہر بات ہے کہ جب نماز درست نہ ہوئی تو باطل ہی ٹھہرے گی اور جب نماز نہ ہوئی تو پڑھنے والا بے نماز ہی تصور ہوگا۔

(۲) سوال: فاتحہ خلف الامام فرض ہے یا واجب یا سنت یا مستحب ہے؟  
الجواب: فاتحہ خلف الامام پڑھنا فرض ہے بغیر فاتحہ پڑھے ہوئے نماز نہیں ہوتی تمام کتب احادیث میں مرقوم ہے۔ واللہ اعلم۔ حررہ السید محمد عبدالغنیظ غفرلہ۔ سید محمد نذیر حسین، سید محمد ابوالحسن، سید محمد عبدالسلام غفرلہ۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۳۹۸ و فتاویٰ علمائے اہل حدیث ص ۱۲۱)  
(۳) سوال: جو شخص امام کے پیچھے کسی رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھ سکا اس کی وہ رکعت ہوئی یا نہ؟

الجواب: بغیر سورۃ فاتحہ کے رکعت پوری نہیں ہوتی۔ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھنا فرض ہے پس صورت مسئلہ میں اس شخص کی وہ رکعت نہیں ہوئی اس کو دہرانا چاہیئے۔ الخ حررہ محمد عبدالحق ملتان، سید محمد نذیر حسین۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۳۹۸، فتاویٰ علمائے اہل حدیث ص ۱۲۱)  
(۴) خلاصہ تمام مضمون کا یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بامر اللہ تعالیٰ صحابہ کرام کو فرمایا میرے پیچھے سورۃ فاتحہ ضرور پڑھا کرو ورنہ تمہاری نماز باطل ہو جائے گی۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۴۸۹)



سوال: امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کے متعلق آپ کی تحقیق از روئے قرآن و حدیث کیا ہے؟ کیا فاتحہ کے بغیر نماز ہو جاتی ہے؟

الجواب: میں سورۃ فاتحہ کو امام کے پیچھے پڑھنے کو ضروری جانتا ہوں۔ از روئے قرآن و حدیث میری تحقیق ہے کہ فاتحہ کے بغیر منفرد ہو یا مقتدی، کسی کی نماز نہیں ہوتی۔ (تفسیر ثنائی ۱۵ جولائی ۱۹۳۸ء و فتاویٰ ثنائیہ ص ۵۵۵)

صاف عیاں ہو گیا کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے والے کی نماز باطل ہے، اور جب نماز نہ ہوئی تو پڑھنے والا بے نماز ہی رہا۔

(۵) سوال: سورۃ فاتحہ کا امام کے پیچھے پڑھنا ان الفاظ میں ثابت کر دیا جائے کہ رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو یہ ارشاد فرمایا ہو کہ امام کے پیچھے ہر نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھا کرو؟

جواب: کتاب القراءت ہیئت ۴ میں یہ حدیث ہے لا صلوة لمن لم یقرأ بفاتحة الكتاب خلف الامام۔ یعنی جو امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں لیجے مگر الفاظ کا آپ نے سوال کیا ہے۔ ان سے بھی یہ سخت ہیں کیونکہ آپ نے امر کا سوال کیا ہے اور یہاں سرے سے نماز ہی کی نفی ہے۔ (فتاویٰ اہل حدیث عبداللہ روپڑی ص ۱۲۲ و تنظیم اہل حدیث جلد ۱۵ شمارہ ۲ بحوالہ فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۱۱)

جب سرے سے نماز ہی نہ ہوئی تو پڑھنے والا بے نماز ہی رہا۔

(نوٹ) اس روایت میں خلف الامام کا جملہ بعض روایت کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ ملاحظہ

ہو فصل الخطاب ص ۷۹

(۶) فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے، ”نہیں ہوتی نماز اس شخص کی جس نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی“ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کو نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنی ضروری ہے تنہا ہو یا امام یا مقتدی، بغیر سورۃ فاتحہ پڑھے کسی کی کوئی نماز نہیں ہوتی، خواہ فرض ہو یا نفل ہر ایک میں سورۃ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے کیونکہ حکم عام ہے۔ (از مولانا عبدالسلام بستی مدرس مدرسہ ریاض العلوم دہلی۔ اخبار اہل حدیث دہلی جلد ۹، شمارہ ۲۳)

بحوالہ فتاویٰ علمائے حدیث (۱۲۲)۔

مؤلف توضیح الکلام ہی از نئے انصاف و دیانت و اگر ان کے نزدیک انصاف و دیانت نامی کوئی چیز ہے اور اس کی ان کے ہاں قدر بھی ہے، یہ فرمائیں کہ کیا یہ تمام محققین علمائے اہل حدیث امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھنے والے کو بے نماز نہیں کہہ رہے اور کیا اسکی نماز کو باطل نہیں کہہ رہے؟ یہ احسن الکلام کے محکم براہین و ادلہ ہی کا نتیجہ اور اثر ہے کہ مؤلف خیر الکلام و توضیح الکلام عدم بطلان کے فیصلہ پر مجبور ہوئے ہیں۔ ورنہ غیر مقلدین حضرات کا فیصلہ اور فتویٰ یہی ہے کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھنے والوں کی نماز باطل ہے اور وہ بے نماز ہیں اور بے نماز کا ٹھکانہ ہی سقر ہے۔

استاذ محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالقدیر صاحب دامت برکاتہم نے دجو تقریباً ساٹھ سال تک علوم نقلیہ اور عقلیہ کے کامیاب مدرس رہے ہیں۔ ڈابھیل میں بھی استاد حدیث رہ چکے ہیں اور اب بھی مدرسہ تعلیم القرآن راولپنڈی میں شیخ الحدیث ہیں، انوکھے اور علمی انداز میں ترک القرأت خلف الامام کے دلائل پیش نظر کتاب تدقیق الکلام میں بیان فرمائے ہیں۔ علمائے کرام کے لیے یہ انمول موتی ہیں اور ایسے انداز سے پیش کیے ہیں جو حقیقت کی خوب خوب گرہ کشائی کرتے ہیں اور خیر الکلام میں نقل کردہ دلائل کا باحوالہ تانا بانا بھی روشن کیا گیا ہے اور بعض مقامات پر نام لے کر توضیح الکلام میں نقل کردہ دلائل کا بھی خوب تعاقب کیا ہے مگر زیادہ تر ترویج خیر الکلام کے شبہات کی کی گئی ہے۔ کیونکہ توضیح الکلام، خیر الکلام کا علمی سقر اور اسی کا چرہ ہے۔ جب اصل کارد ہو گیا تو فرع کا خود بخود ہو جاتا، قارئین کرام کو تدقیق الکلام میں بعض بعض مقامات میں تکرار بھی نظر آئے گا۔ مگر کہیں بھی تکرار نامدہ سے خالی نہ ہوگا۔ پڑھنے والے اہل علم حضرات اس کا بخوبی اندازہ لگالیں گے۔ مسئلہ کے جن جن گوشوں کو حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے اُجاگر کیا ہے اور جن دلائل کو سلی اور تحقیقی طور پر روشن کیا ہے بلا خوف و لومۃ لازم یہ کہا سکتا ہے کہ وہ انہی کا حصہ ہے اور اسی ہی کتاب میں آپ پر وہ عیاں ہوں گے۔ غیر مقلدین حضرات کو اس سے ناگواری تو ضرور ہوگی مگر ٹھنڈے دل سے اس کتاب کو اول سے آخر تک ایک بار پڑھ لیں، چھوڑیں نہیں۔



رٹھا ہے وہ مجھ سے مجھے منظور ہے لیکن  
یلداسے سمجھاؤ میرا شہر نہ چھوڑے

غیر مقلدین حضرات کے تعصب اور خیانیوں کو تدقیق الکلام میں جس طرح نمایاں کیا گیا ہے اور ان کی علمی غلطیوں کو واشگاف کیا گیا ہے وہ اسی کتاب کا خاصہ ہے۔ عیاں را چہ بیان مصنف خیر الکلام اور ان کے شاگرد درشید مؤلف توضیح الکلام پر جو علمی تنقید کی گئی ہے اور ان کی سوقیانہ اور غیر عالمانہ زبان سے انماض کیا گیا ہے وہ کتاب کی قدر و قیمت کو اور دوبالا کر دیتا ہے۔ دونوں مؤلفوں نے اپنے عوام کو اندھیرے میں رکھنے کی بے فائدہ کوشش کی ہے اور محقق اقبال کو محض تاریک بکوت قسم کے شبہات سے رد کرنے کی نامحسوس کوشش کی ہے۔ مؤلف توضیح الکلام کا کتاب میں اکثر یہی طریقہ اور وتیرہ ہے مثال کے طور پر بعض باتیں ملاحظہ ہوں:

اول: حضرت امام مالکؒ مؤطا امام مالکؒ ۲۹ طبع مجتبائی دہلی میں الامر عندنا فرما کر یہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں طے شدہ بات اور ہمارا مذہب یہ ہے کہ امام کے پیچھے ساری نمازوں میں قرأت کی جائے مگر جہری نمازوں میں نہ کی جائے۔ (محصلاً)

اس عبارت کو کاٹنے کے لیے مؤلف توضیح الکلام ۶۵ میں تفسیر قرطبی ۱۱۹ کا یہ حوالہ پیش کرتے ہیں اور ایک قول امام مالکؒ کا یہ ہے کہ فاتحہ ہر رکعت میں ہر ایک کے لیے ضروری ہے... الخ اور لکھتے ہیں کہ علامہ قرطبیؒ فقہ مالکی کے مسئلہ امام ہیں۔ ان کے کلام کو بلا دلیل رد کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔

کیوں جناب؟ حضرت امام مالکؒ جو بلا اختلاف مجتہد مطلق اور مسلم امام ہیں، اور وہ الامر عندنا فرما کر اپنا فیصلہ خود سناتے ہیں اور طبقہ اولیٰ کی کتاب مؤطا امام مالکؒ میں یہ موجود ہے ان کے اس فیصلہ کو ساتویں صدی کے (محمد بن احمد بن ابی بکر الاندلسی القرطبیؒ المتوفی ۴۷۱ھ) بقول مؤلف توضیح الکلام مسئلہ امام کے بلا سند منقول ایک قول سے رد کرنا کون سا انصاف و دیانت ہے؟ کیا یہ اس کا مصداق نہیں کہ: صر میں وہ جواں ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں

دوم: احسن الکلام میں ہم نے حضرت امام شافعیؒ کی یہ عبارت نقل کی تھی: و نحن نقول كل صلاة صليت خلف الامام والامام يقرأ لا يسمع فيها قرأ فيها (کتاب الام ۱۵۳) یعنی ہم کہتے ہیں کہ تمام شری نمازوں میں مقتدی قرأت کرے۔ (جہری میں نہ کرے)

اس کے جواب میں مصنف خیر الکلام اور مؤلف توضیح الکلام نے جو جو شکوے چھوڑے اور پاپڑیلے ہیں وہ قابل دیدنی ہیں۔ (۱) یہ کہ کتاب الام کے مطبوعہ نسخوں میں یہ عبارت موجود نہیں ہے۔ معارف السنن ۱۸۶ میں ہے کہ یہ عبارت مطبوعہ نسخہ سے گر گئی ہے۔ (۲) فلاں اور فلاں اور فلاں بزرگ لکھتے ہیں کہ امام شافعیؒ تمام نمازوں میں قرأت خلف الامام کے قائل تھے۔ (۳) کتاب الام کے نام سے جو مجموعہ سات جلدوں میں مطبوع ہے۔ اس میں امام شافعیؒ کے مختلف رسائل بھی آگئے ہیں۔ یہ عبارت امام شافعیؒ کے دوسرے رسالہ اختلاف علیٰ وجہ اللہ کی ہے۔ جنہیں کتاب الام کو حصہ شمار کرنا ظلم و عقل کا ماتم کرنا ہے۔ (محصہ توضیح الکلام ص ۶۵ تا ۷۵)

الجواب: غیر مقلدین حضرات کے ان وکیلوں نے جس بہانہ سازی اور حیلہ دری کا ثبوت دیا ہے وہ صرف انہی کا خاصہ لازمہ ہے۔ ترتیب وار جوابات ملاحظہ ہوں:

(۱) مشہور تو یہی ہے کہ النقد خیر من الفسئۃ کہ نقد ادھار سے بہتر ہے ہم نقد حوالہ بتاتے ہیں اور آپ اس کو سینہ زوری سے ٹالنے کے لیے بہانہ سازی سے کام لیتے ہیں کہ عبارت کتاب الام سے ساقط ہو گئی ہے یہ وہ معمودہ عبارت نہیں ہے جناب! یہی وہ معمودہ عبارت ہے جس کا حضرت امام شافعیؒ نے وعدہ فرمایا ہے: لا تریب فیہ۔ جو حضرات اس کو مسقوطہ اور گرہی ہوئی فرماتے ہیں وہ خود وہم کا شکار ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ معمودہ عبارت صلوٰۃ کے باب میں ہوگی جو جلد اول میں ہے مگر چونکہ یہ عبارت ساتویں جلد میں ہے اس لیے ان کا ذہن اس طرف نہیں گیا۔

(۲) حضرت امام شافعیؒ کی اپنی صریح اور واضح عبارت کو چھوڑ کر دوسروں کا سہارا لینا جو قول قدیم کے چکر میں پڑ کر خود غلطی کا شکار ہیں۔ کہاں کا انصاف ہے! حضرت امام شافعیؒ



کامسک سمجھنے کے لیے خود اپنی عبارت ہی واضح اور کافی و دافی ہے۔

(۳) کتاب الام متداول کتاب ہے اور تمام اہل علم جانتے ہیں کہ اس کی سات جلدیں ہیں اس میں قطع و برید اور اختلاط کا دعویٰ کرنا بعینہ ایسا ہے جیسا کہ رافضی قرآن کریم کے بارے یا منکرین حدیث کتب حدیث کے بارے کرتے ہیں لیکن ایسے لایعنی دعویٰ اور قول سے ان پر کیا زد پڑتی؟ یا پڑ سکتی ہے؟ کتاب الام فقہ کی کتاب ہے اس میں کسی مقام پر کسی کے اختلاف کا ذکر ہے اور کسی دوسرے مقام میں کسی اور سے اختلاف کا تذکرہ آجاتا ہے۔

خود مؤلف توضیح الکلام نقل کرتے ہیں کہ ۲۸۳ تا ۲۹۳ میں سیر الادزاعی اختلاف علی و عبد اللہ، اختلاف العراقرین اور اختلاف مالک و شافعی کے مباحث ہیں (مصلہ توضیح الکلام ص ۱) علاوہ ازیں ذیل کے حوالے بھی ملاحظہ کریں:

(۱) کتاب الام ص ۶۳ میں ہے باب فی العمری من کتاب اختلاف مالک و الشافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

(۲) ص ۶۹ میں ہے: و فی اختلاف مالک و الشافعی اللقطۃ

(۳) ص ۶۶ میں ہے و ترجمہ فی کتاب اختلاف علی و ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

(۴) ص ۶۶ میں ہے و ترجمہ فی اختلاف مالک و الشافعی باب المنبوذ و غیر ذلک۔

کیا ہر مقام پر یہ ناروا دعویٰ کیا جائے گا کہ کتاب الام میں ان کے مختلف رسائل کا اختلاط ہو گیا ہے اس لیے کتاب الام قابل اعتبار نہیں؟ ماشا وکلا کہ کسی بھی ذی علم کے ذہن میں یہ شیطانی وسوسہ آتا ہو۔ سبھی ہی جانتے ہیں کہ کتاب الام حضرت امام شافعیؒ کی اپنی تالیف ہے اور اس میں درج شدہ تمام مسائل کتاب الام ہی کے ہیں ایسی لایعنی باتوں سے نہ تو رافضی قرآن کریم پر سے اعتماد اٹھا سکے ہیں اور نہ منکرین حدیث کتب حدیث سے اور نہ غیر مقلدین کتب فقہ اور کتاب الام پر سے اعتبار اٹھا سکتے

ہیں اور نہ کوئی ایسی بیہودہ گوئی کو تسلیم کرتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَقُولُ الْحَقُّ وَهُوَ  
يَهْدِي السَّبِيلَ۔ اللہ تعالیٰ سب کو سمجھ عطا فرمائے۔

۔ دل بیسنا بھی کر خدا سے طلب  
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

سوم: مؤلف توضیح الکلام ص ۵۴ میں خود امام محمدؒ کی اپنی کتاب موطا ص ۹۴  
اور کتاب الآثار ص ۱۶۴ کے حوالہ سے ان کا یہ مسلک نقل کرتے ہیں لا قرأۃ خلف  
الامام فیما یجہر فیہ ولا فیما لم یجہر وهو قول ابی حنیفۃؒ  
اور معنی یہ کرتے ہیں امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہیے خواہ امام باواز بلند قرأت  
کرتا ہو یا آہستہ امام ابو حنیفہؒ کا یہی قول ہے ؟

اس کے بعد مؤلف توضیح الکلام نے ص ۵۴ تا ص ۶۴ تک متعدد حضرات کے حوالے  
درج کیے ہیں اور آخر میں لکھا ہے ص ۶۴ کہ امام محمدؒ (بلکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی) سب سے  
نمازوں میں فاتحہ پڑھنا محسن اور جائز کہتے ہیں۔ (مجلس) مگر یہ صرف دفع الوقتی اور مغالطہ  
آفرینی ہے کیونکہ جب حضرت امام محمدؒ جو حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے براہ  
راست شاگرد ہیں اور خود اپنی کتابوں میں بائگ دہل واشکاف الفاظ میں اپنا اور حضرت  
امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کا یہی مسلک بتاتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے  
نہ تو جہری نمازوں میں قرأت ہے اور نہ سب سے نمازوں میں۔ تو ان کے اپنے قول اور  
ارشاد کے مقابلہ میں فلاں نے یہ کہا اور فلاں نے یہ کہا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ تمام  
حقل مند اس کے قائل ہیں کہ توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ نالیندیہ  
امر ہے اور مشہور ہے کہ صاحب البیت ادرای بما فیہ۔

غرضیکہ مؤلف توضیح الکلام اور ان کے استاد محترم شیخ الحدیث گرامی قدر نے آیات  
اور صحیح و صریح احادیث اور اقوال راجح کو تعصب کی بنا پر ترک کے محتمل معانی ضعیف  
اور غیر صریح احادیث اور اقوال مرجوحہ پر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی ہے اور بلاوجہ غیر متعلق  
حوالے اور اقوال درج کر کے اپنے حواریوں کو یہ باور کرانے کے درپے ہیں کہ ہم بھی



دلائل سے یس ہیں۔ لیکن مجد اللہ تعالیٰ کتاب تدقیق الکلام کو پڑھنے والے قوی و ضعیف دلائل اور راجح و مرجوح اقوال کا اچھی طرح سے موازنہ کر سکیں گے اور مسئلہ قرأت خلف الامام کی پوری حقیقت انشاء اللہ العزیز ان پر منکشف ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الحدیث دام مجدہم مؤلف تدقیق الکلام کو اُمت مسلمہ کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے خالص علمی اور تحقیقی انداز میں مسئلہ کی حقیقت واضح کی ہے اور اس کتاب کو اللہ تعالیٰ علماء کے لیے استفادہ کا ذریعہ اور موصوف کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے۔ آمین ثم آمین۔ وصلى الله تعالى وسلم على خاتم الانبياء والمرسلين وعليهم وعلى اله واصحابهم وازواجهم واتباعهم الى يوم الدين۔

احقر العباد

ابوالزاهد محمد سرفراز

مدد مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ و خطیب مرکزی جامع مسجد گکھڑ

۲، ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

۱۳، نومبر ۱۹۸۸ء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

# خزان السنن

## مع مقصد دفائن السنن

ترمذی شریف کی مع اضافات ان تقریروں کا مجموعہ جو شیخ الحدیث حضرت مولانا ابوالزاہد محمد سرفر از خان صفدر ترمذی شریف پڑھاتے وقت مختلف سالوں میں بیان کرتے رہے جن کو عزیزم المولوی الحافظ القاری شید الحق خان عابد سابق مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ نے مرتب کیا اور کئی مقامات پر اصل عبارت کے ساتھ قابل بری محنت کے ساتھ رقم الحروف نے کیا اور بعض اغلاط کی تصحیح کی مگر پھر بھی طبع اول میں کتابت اور بعض حوالہ جات کی اغلاط رہ گئی تھیں طبع دوم کے لیے حضرت شیخ الحدیث صاحب دام مجدہم نے بیماری پیرائے سالی اور گونا گوں مصروفیات کے باوجود خود ان اغلاط کی تصحیح فرمائی اور فتح حدیث اور سند سے متعلق ضروری اصطلاحات پر مشتمل نہایت علمی مقدمہ کا اضافہ فرمایا شاہقین علم حدیث کے لیے یہ تقاریر اگر انقدر علمی فنیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق بخشے۔ آمین

حافظ عبد القدوس خان قاری

مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ



# مکتبہ صفدریہ نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ کی مطبوعات

خزائن السنن تقریر ترمذی	احسن الکلام مسئلہ فاتحہ خلف الامام کی مدلل بحث	تسکین الصدور مسئلہ حیات النبی پر مدلل بحث	الکلام المفید مسئلہ تعلید پر مدلل بحث	ازالۃ الریب مسئلہ علم غیب پر مدلل بحث
راہِ سنت روایات پر لا جواب کتاب	مقامِ ابنِ حنیفہ	اسماءِ منقہ	طائفہ منصورہ نجات پائندائے کردہ کی علامت	ارشاد الشیعہ شیعہ نظریات کا مدلل جواب
آنکھوں کی ٹھنڈک مسئلہ حاضر و ناظر پر مدلل بحث	عبارات اکابر اسرار علماء دیوبند کی عبارات پر ۱۰۰ رسالت کے جوابات	صرف ایک اسلام	گلدستہ توحید مسئلہ توحید کی وضاحت	دل کا سرور مسئلہ مختار کل کی مدلل بحث
درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ	احسان الباری بخاری شریف کی ابتدائی اسحاث	تبلیغ اسلام ضروریات دین پر مختصر بحث	چراغ کی روشنی سراج النجم کے بارہ میں قادیانی وغیرہ کے اعتراضات کے جوابات	مسئلہ قربانی قربانی کی فضیلت اور ایام قربانی پر مدلل بحث
عیسائیت کا پس منظر عیسائیوں کے عقائد کا رد	مقالہ ختم نبوت فرقانِ سنت کی روشنی میں	بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم دیوبندی کے حالات زندگی اور ان پر اعتراضات کے جوابات	راہِ ہدایت کرامات و معجزات کے بارہ میں صحیح عقیدہ کی وضاحت	بینا بیج غیر مقلد عالم مولانا نظام رسول کے رسالہ تراویح کا اردو ترجمہ
آئینہ محمدی سیرت پر مختصر رسالہ	تفریح الخواطر بجواب تنویر الخواطر	انعامِ اہلِ حق روایتِ صحیح البیان	صلیہ المسلمین داڑھی کا مسئلہ	توضیح المرام نزدول مسیح علیہ السلام
ثبوت جہاد	الکلام الخاوی سادات کے لئے زکوٰۃ وغیرہ لینے کی مدلل بحث	ملا علی قاری اور مسلم غیب حاضرہ نظر	المسلک المنصور	الشہاب المبین بجواب الشہاب الثاقب
ثبوت حدیث حجیت حدیث پر مدلل بحث	انکار حدیث کے قریبی مکرمین حدیث کا رد	سودودی صاحب کا غلط فتویٰ	چالیس دعائیں	اختفاء الذکر ذکر آہستہ کرنا چاہیے
حکم الذکر بالجہر	اظہار العیب بجواب اثبات علم الغیب	اطیب الکلام مخلص احسن الکلام	چہل مسئلہ حضرات بریلویہ	مولانا ارشاد الحق اثری صاحبؒ کا مہذب دہانہ داوانا
عمر اکادمی کی مطبوعات	خزائن السنن جلد دوم کتاب المبعوث غیر مقلدین کی نظر میں	بخاری شریف غیر مقلدین کی نظر میں	حمید یہ مناظرہ کی کتاب و شیعہ کا اردو ترجمہ	جنت کے نظارے علامہ ابن القیم کی کتاب عادۃ الارواح کا اردو ترجمہ
تین طلاقیں کے مسئلہ پر مقالہ کا جواب مقالہ		علامہ کوثریؒ کی تائید الخطیب کا اردو ترجمہ امام ابو حنیفہؒ کا عادلانہ دفاع		